

حیات نعمانی

سوانح حیات حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

از

عتیق الرحمن سنبھلی



افغان بکڈپو ۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ

حیاتِ نعمانی

سوانح حیات حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(۱۳۲۳-۱۳۱۷ھ/۱۹۰۵-۱۹۹۷ء)

از

عتیق الرحمن سنبھلی

ناشر

افغان بکڈپو ۱۱۲ نظیر آباد لکھنؤ

حقوق طبع محفوظ ہیں

نام کتاب حیات نعمانی

مؤلف عتیق الرحمن سنہلی

صفحات ۶۹۲

دوسرا ایڈیشن اپریل ۲۰۱۳ء

کمپیوٹر سیٹنگ ایس. ایف. گرافکس لکھنؤ

طباعت کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

قیمت 450/- روپے

ناشر

انفستان بک ڈپو ۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ

ملتِ اسلامیہ کے نام

جس کی ہر ممکن خدمت کو اپنا فرض صاحبِ سوانح نے ٹھہرایا
پھر اس عہد و فاسے وفاداری ہی کو تاحیات زندگی جانا!
اور وہ نقشِ وفا چھوڑا کہ اگلی نسلوں کی راہوں کو روشنی بخشنے۔
اللّٰهُمَّ بَرِّدْ مَضْجَعَهُ وَاَعْلِ دَرَجَتَهُ وَقَدْ سَبَّرْهُ

عتیق سنہجلی

فہرست مضامین حیاتِ نعمانی

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۵۶	دارالعلوم کی طالب علمی کا آخری دن	حصہ اول	
۵۷	دارالعلوم کی دینی فضا	۱۵	مقدمہ (از مرتب)
۵۹	اس دینی فضا کا اثر آپ کے والد ماجد پر	۲۲	ہدیہ تبریک (از خلیل الرحمن سجاد ندوی)
	دوسرا باب	۲۷	دیباچہ طبع دوم (از مرتب)
	درس و تدریس اور دین حق کا دفاع		پہلا باب
۶۳	درس و تدریس کے چار سال		وطن، خاندان، پیدائش، تعلیم
۶۳	اس زمانے کے بعض تجربات	۲۹	وطنِ مالوف
۶۵ درکے سندانِ عشق	۳۰	سنجیل کا علمی مقام
۶۶	ایک جذبہ، ایک طوفان	۳۴	اور اب کا سنجیل
۶۷	مناظرانہ معرکے اور اُن کی کچھ جھلکیاں	۳۴	خاندانی ماحول
۶۷	پہلا مناظرہ، درو (ضلع نینی تال)	۳۵	والد ماجد صوفی احمد حسین صاحب
۶۸	مناظرہ سنجیل	۳۶	دنیا پر ترجیح دین کی یادگار مثال
۷۰	مناظرہ لاہور، یا فیصلہ کن مناظرہ	۳۸	اہل قرابت اور ارباب حاجت کی حق شناسی
۷۲	”فتحِ مبین“ کا اشتہار	۴۰	پیدائش
۷۲	روحِ عمل	۴۱	تعلیم
۷۵	بریلی کا قیام اور اجرائے الفرقان	۴۸	صاحبِ سوانح اور اُن کی تعلیم
۷۶	مناظرہ بریلی	۴۹	سنجیل سے باہر کی تعلیم
۷۷	مناظرہ گمیا (صوبہ بہار)	۵۱	آخری دو سال دارالعلوم دیوبند میں
۷۸	”یہ بے انجام“ مناظرے! فائدہ؟	۵۳	دارالعلوم میں آپ کے اساتذہ
۷۹	مناظرہ سلاوالی	۵۴	حضرت شاہ صاحب سے بیعت
		۵۵	دوسرے خاص اساتذہ

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۱۱۶	شاہ ولی اللہ نمبر	۸۰	اس مناظرہ کی روشنی میں آپ کی کچھ خصوصیات
۱۱۹	نمبروں کے اس سلسلے کا مقصد	۸۲	یہ مناظرے اور مشیتِ الہی
	چوتھا باب	۸۳	ان مناظروں کا ایک خاص پہلو
مولانا مودودی سے جماعتِ اسلامی تک		۸۴	مناظرہ ادبی (ضلع اعظم گڑھ)
۱۲۵	مولانا مودودی سے ملاقات	۸۵	کچھ دوسرے میدانوں کے مناظرے
۱۲۶	”دارالاسلام“ کا سفر اور دوسری ملاقات	۸۶	قادیانیوں سے مناظرہ
۱۲۷	بیاب جذبہ کی ایک نئی کوشش	۸۷	آریہ سماج سے مناظرے اور ایک قابلِ توجہ پہلو
۱۲۹	مودودی صاحب سے پھر ایک رابطہ	۸۷	ان مناظروں کا باعث
۱۳۰	جماعتِ اسلامی کی تشکیل	۹۱	اس سلسلہ کا پہلا مناظرہ
۱۳۰	مرکزِ جماعت کا قیام اور ہجرت	۹۱	دوسرا مناظرہ
۱۳۱	ہمہ شوق آمدہ بودم	۹۴	تیسرا مناظرہ
۱۳۲	صدمہ اور سخت بیماری		تیسرا باب
۱۳۳	ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر		الفرقان: اخلاص و استقامت کی یادگار
۱۳۳	عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ	۱۰۱	الفرقان کا خیر مقدم
۱۳۳	تا ہم جماعت سے ہمدردی برقرار	۱۰۳	مشکلات، استقامت اور
۱۳۴	دو مثالیں	۱۰۵	ایک تجربہ کارانہ مشورہ
۱۳۶	اپنوں کے مقابلہ میں جماعت کا دفاع	۱۰۷	تین مہینے کا ایک وقفہ، ادنیٰ زندگی
۱۳۶	جماعت کے بارے میں ذہن کی تبدیلی	۱۰۸	الفرقان سے آپ کی دلی وابستگی
۱۳۶	”مجبوری“ کا فیصلہ یا فاضل حق کی دست گیری؟	۱۰۹	ہوئے گو تند و تیز لیکن
۱۳۷	حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی دعا	۱۱۰	ہندوستان میں نئے حالات کی نمود اور الفرقان
۱۳۹	”دارالاسلام“ کی پختی کا راز	۱۱۱	مجددِ الف ثانی نمبر
۱۳۹	نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی	۱۱۴	خاکسار تحریک نمبر
		۱۱۵	نمبر کی تاثر

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۱۲۹	صد سالہ اجلاس (۱۹۸۰ء) اور آپ کا ابتلاء	۱۳۲	اشارے شروع ہی سے چل رہے تھے
۱۷۱	فرض ادا کیا، مگر دی ڈکھ کے ساتھ	۱۳۲	مولانا مودودی: فکری تجزیہ
۱۷۲	حضرت مولانا قاری محمد طیب الی رحمۃ اللہ		پانچواں باب
	ساتواں باب		خانقاہ رائے پور سے
	آزادی کے بعد کے نئے ملی مسائل و تقاضے		حضرت مولانا محمد الیاس تک
	اور آپ کا فکری و عملی کردار		بیعت کی درخواست اور ”فتح باب“
۱۸۰	مسلمانوں کو خوف و ہراس سے نکالنے کا	۱۵۲	”عظیم نعمت“
	ایک غیر معمولی اقدام	۱۵۳	حضرت مولانا الیاس کی طرف رہنمائی کی نعمت
۱۸۶	دیوبند سے دہلی	۱۵۳	”آمد آں یارے کہ مای خواستیم“
۱۸۹	کچھ دوسرے سنگین مسائل کا ایک نیا دور	۱۵۶	انتظارِ حقیقت اور بھی پہلے سے تھا
۱۸۹	اولین مسئلہ - ارتداد	۱۵۷	پرو عارنگ لے ہی آئی اور دل گھل گیا
۱۹۰	دوسرا مسئلہ: بچوں کی اسکولی تعلیم	۱۵۸	حضرت مولانا کی دعوتی تحریک کی حقیقت
۱۹۲	مسلم کشی کا ایک نیا سلسلہ اور اس کا تقاضہ	۱۵۹	تحریک اور اس کے طریقہ کار کی ہمہ گیری
۱۹۳	ہفت روزہ ہندائے ملت	۱۶۰	اب الفرقان بھی اس دعوت کا نقیب
۱۹۴	جنوری ۱۹۶۳ء کے نئے ہوشربا فسادات		چھٹا باب
۱۹۶	ایک نئی راہِ عمل کا طلوع		مادر علمی دیوبند کی خدمت کا دور
۱۹۷	مسلم مجلس مشاورت		اور ایک منفرد کردار
۱۹۹	مجلس مشاورت کے اس تجربے کا منفی اثر		دارالعلوم سے ضابطہ کی اطلاع اور آپ کا جواب
۱۹۹	مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک		شوریٰ میں آپ کا مقام اور طرزِ عمل
	آٹھواں باب		دارالعلوم کا ایک سفر اور آخر عمر کی معذوری
	معذوری کا ۲۰ سالہ دور		
	اور اس کے سبق آموز احوال		
۲۰۱	۶۷ء کی اس تکلیف کا ظاہری سبب		

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۲۳۳	فیصلہ کن مناظرہ	۲۰۴	تو وہ ”اہم ملی خدمت“؟
۲۳۴	مسئلہ حیات النبیؐ کی حقیقت	۲۰۶	ایرانی انقلاب اور خمینی امامت [
۲۳۵	ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت		ایک اور بساط کارزار
۲۳۶	مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا تاثر	۲۰۹	اہل حرم کے کانوں میں اذان
۲۳۶	اس سے بھی بڑی تاثیر	۲۱۰	جناب خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں استثناء
۲۳۷	ایک نصابی کتاب — الفیۃ الحدیث	۲۱۰	حضرات علمائے کرام کی خدمت میں
۲۳۸	آپ کی مکمل دستیاب تصانیف کی فہرست		نواں باب
	دسواں باب		(تصنیفات و تالیفات)
	بیرون ہند کے اسفار و افادات	۲۱۳	دور اول کی تصانیف
	پہلا بیرون سفر ۱۹۵۲ء (سفر پاکستان)	۲۱۳	سیفِ یمانی
۲۴۰	کراچی میں تبلیغی کام	۲۱۵	بوارق الغیب
۲۴۱	افتخار علماء اسلام	۲۱۶	دوسرا اور تیسرا دور
۲۴۲	کراچی کے عام حالات	۲۱۷	آپ کی تصانیف کی اہم خصوصیت
۲۴۳	مہاجرین کی حالت	۲۱۸	خاص خاص تصنیفات کا کچھ تعارف
۲۴۳	پاکستان میں دینی مدارس	۲۱۸	اسلام کیا ہے؟
۲۴۵	دو ہفتے پنجاب اور سرحد میں	۲۲۰	کتاب کی اس خصوصیت کا راز
۲۴۷	اس دورہ کے اجتماعات اور خطابات کی خاص دعوت	۲۲۱	دین و شریعت
۲۴۸	تبلیغی رفقاء کو چند خاص اہم مشورے	۲۲۳	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
۲۵۰	لاہور کی ملاقاتیں	۲۲۴	درس قرآن
۲۵۳	لاہور سے کراچی کی راہ میں [۲۲۸	معارف الحدیث
	ایک بڑے حادثہ کی اطلاع]	۲۲۹	تصوف کیا ہے؟
۲۵۴	واپسی اور اہل پاکستان کو الوداعی پیغام و اعتباہ	۲۳۱	قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
۲۵۷	پاکستان کا دوسرا سفر (۱۹۵۷ء)	۲۳۲	شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی خلاف پروپیگنڈہ
۲۵۷	نامہ غم		

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۲۹۴	احباب و مخلصین کا تانتا	۲۵۹	جنوب مشرقی افریقہ کا سفر (۱۹۶۸ء)
۲۹۵	چند اہم مجالس اور ملاقاتیں	۲۶۰	ری یونین
۲۹۶	مکی مسجد میں بیان	۲۶۱	ری یونین کے بعد کینیا اور پھر حجاز مقدس
۲۹۷	مولانا مفتی محمود صاحب سے ملاقات	۲۶۱	حجاز مقدس کی ایک خاص تقریب
۲۹۹	پروفیسر غفور احمد صاحب	۲۶۳	جنوبی افریقہ کا سفر (۱۹۷۲ء)
۲۹۹	بریلی کے عزیزوں سے ملاقات	۲۷۰	جنوبی افریقہ سے مارشس
۳۰۰	کراچی سے فیصل آباد اور لاہور	۲۷۱	مارشس سے ری یونین
۳۰۱	فیصل آباد کی دوروزہ مصروفیات	۲۷۱	ری یونین سے کینیا
۳۰۲	ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ	۲۷۲	مہاسہ کی ایک قابل ذکر شخصیت
۳۰۳	بھائی ابراہیم اور اسماعیل کے یہاں	۲۷۳	کینیا سے جدہ
۳۰۴	قدیم شہر کی جامع مسجد میں اجتماع اور تقریر	۲۷۴	مکہ مکرمہ کا قیام
۳۰۴	مولانا عبدالکلیل و مولانا عبدالوحید کی تشریف آوری	۲۷۶	مدینہ منورہ کی حاضری
۳۰۵	ایک اور قابل ذکر شخصیت	۲۷۷	مسجد نبوی کا خطبہ جمعہ اور تاثر
۳۰۵	لاہور کے لئے روانگی	۲۷۸	اس سفر کے کچھ مشاہدات و تاثرات
۳۰۶	لاہور میں دوستوں، مخلصوں سے ملاقاتیں	۲۷۹	جنوبی افریقہ اور اس کی خصوصیات
۳۰۶	بلال پارک کا اجتماع اور تقریر	۲۸۰	ملک کے صوبے اور مسلم آبادی
۳۰۷	گورنر صاحب پنجاب کا پیام	۲۸۱	کیپ ٹاؤن کے سلیمان جعفر
۳۰۷	مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات	۲۸۲	مسلمانوں کی زندگی کا ایک قابل فکر تضاد
۳۰۹	رفیق سفر کی روایت	۲۸۵	دو قابل ذکر دینی مدرسے
۳۰۹	اس سفر کی آخری برکت	۲۸۷	تبلیغی جماعت کا کام
۳۱۰	پاکستان کے حالات اور امیدیں	۲۸۸	جوہانسبرگ کی آخری تقریر
۳۱۰	استدراک	۲۹۰	پاکستان کا تیسرا سفر (۱۹۷۸ء)
۳۱۱	ضمیمہ متعلقہ مولانا اصلاحی (میری غلطیاں)	۲۹۳	ہوٹل سے بخوری ٹاؤن میں
۳۱۶	آخری پیراگراف	۲۹۴	حسن اتفاق

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۳۳۵	۳۔ حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کا علم	۳۱۷	حجاز مقدس کا سفر (۱۹۸۵ء)
۳۳۶	۴۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید کی سوانح	۳۲۸	مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ
۳۳۶	۵۔ شیخ محمد ابن عبد الوہاب اور چند دیگر مسائل		گیارہواں باب
۳۳۷	۶۔ فقہ: متعدي اور غیر متعدي		ملفوظات، مکتوبات اور خطابات
	۲۔ توازن و اعتدال		ملفوظات
۳۳۸	۱۔ تبلیغی کام اور غلطیاں	۳۳۷	۱۔ تبلیغی مخلصین کو بشارت
۳۵۰	۲۔ ایک اعتراض کا جواب	۳۳۸	۲۔ دین کی بات، نیت صحیح کر کے
	۳۔ حمیت حق	۳۳۸	۳۔ رمضان المبارک کی نعمت
۳۵۰	۱۔ کچھ بھی ہو، ”ہم سب مسلمان“ کا نظریہ	۳۳۸	۴۔ رمضان المبارک کی قدر
۳۵۲	۲۔ آپ کی کتاب ”ایرانی انقلاب....“	۳۳۸	۵۔ دعوت و تبلیغ اور اعتکاف
	۴۔ فکر آخرت و فقی ذات	۳۳۹	۶۔ نفلی اعتکاف کا طریقہ
۳۵۳	۱۔ بنام معظمی مولانا اشرف سلیمانی صاحب	۳۳۹	۷۔ شکستہ دلی بڑی نعمت ہے
۳۵۴	۲۔ بنام جناب عبدالرشید صاحب لدھیانوی	۳۳۹	۸۔ عمل کو قابل قبول بنانے کا طریقہ
۳۵۵	۳۔ بنام حافظ قاری عبدالحق صاحب	۳۳۹	۹۔ خود کو دوسروں سے بہتر نہ جانے
	۵۔ اصلاح و ارشاد	۳۳۹	۱۰۔ آزمائش بھی نعمت ہے
۳۵۶	۱۔ بنام اعجاز الدین صاحب انصاری، بھوپال	۳۴۰	۱۱۔ ابتلاء و آزمائش اور اہل ایمان
۳۵۶	۲۔ بنام قطب الدین مٹلا صاحب۔ بیلگام	۳۴۰	آخر میں ایک ملفوظ، الفرقان بابت [
۳۵۷	۳۔ بنام قطب الدین مٹلا صاحب۔ بیلگام		ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ سے]
۳۵۷	۴۔ بنام قطب الدین مٹلا صاحب۔ بیلگام	۳۴۱	حکمت نصیحت
۳۵۸	۵۔ بنام خدادی ایوب احمد صاحب۔ جودھ پور		مکتوبات
۳۵۹	۶۔ بنام انیس احمد صاحب		۱۔ علمی افکار و افادات
	۶۔ اصلاح رسوم	۳۴۳	۱۔ پاکستان اور نفاذ شریعت
۳۶۰	۱۔ بنام جناب عبدالرحمن کوندو صاحب، سری نگر	۳۴۴	۲۔ حضرت تھانویؒ کی تالیف ”نشر الطیب“

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۴۰۱	خادم نہ کہ مخدوم	۳۶۰	۲۔ بنام عائشہ بی بی بنت حافظ محمد اقبال صاحب
۴۰۲	شیخ بے مشیت		۷۔ تعزیت و تسلی
۴۰۳	مشیت کو بھلا کیوں کر راہ ملے؟	۳۶۱	بنام مولانا محفوظ الرحمن صاحب۔ سنبھل
۴۰۳	زیادہ سے زیادہ ”مدظلہ“		۸۔ فکر ملت
۴۰۴	خود کو کمتر سمجھنے کی طلب و دعا	۳۶۲	بخدمت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۴۰۵	تقید و تنقیص کی برداشت		خطابات
۴۰۶	حزبیت اور گروہ بندانہ ذہنیت سے بالاتری	۳۶۳	۱۔ ہماری دعوت اور اس کا طریق کار
۴۰۷	اعتدال فکر	۳۷۵	۲۔ آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور آپ کی منزل کیا ہے؟
۴۰۸	فکر آخرت	۳۸۳	۳۔ عید سعید کے موقع کا ایک خطاب
	حقوق اللہ اور حقوق العباد		بارہواں باب
	حقوق اللہ		مذاق و مزاج، عادات و معمولات
۴۰۹	نماز		ازواج و اولاد
۴۱۰	جماعت کا اہتمام	۳۹۱	جوان عمری کا حال
۴۱۲	روزہ	۳۹۲	مرد کار
۴۱۳	زکوٰۃ	۳۹۳	اس مزاج و افتاد طبع کی فتوحات
۴۱۳	حج بیت اللہ	۳۹۴	وقت کے معاملہ میں حساسیت
۴۱۴	دین کی نصرت و خدمت	۳۹۴	بعد عصر کی مجالس
	حقوق العباد	۳۹۵	ایک کیفیت استغراق
۴۱۵	آپ کی معاشرتی زندگی	۳۹۶	دین و ملت کی راہ میں بے نفسی
۴۲۱	مہمان نوازی	۳۹۷	دیگر ناگزیر مشاغل
۴۲۱	معاملاتی زندگی	۳۹۸	رسمیات سے بعد کی کیفیت
	ازواج و اولاد	۳۹۹	سادگی و بے تکلفی سے انس
۴۲۳	عقد عانی		

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۴۴۳	جوبادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں	۴۲۵	تدریس حدیث
۴۴۴	ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند	۴۲۷	زندگی کے اس ورق کی اہمیت
۴۴۶	ایک مدبر عالم اور دردمند مصلح کی وفات	۴۲۹	بریلی کا قرآنی اسکول
۴۴۷	ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ	۴۳۱	بریلی کا مسکن اور اہل محلہ
۴۴۸	مسلمانان ہند کیلئے ایک بڑا حادثہ	۴۳۳	گھیر سے باہر کے خاص اہل تعلق
۴۴۸	ماہنامہ ”اشراق“ لاہور		تیر ہواں باب
۴۴۸	برمر قد نعمانی		بندہ اپنے رب کے بلا وے پر!
۴۵۲	محمد ارشادند خیالی نو گانوی	۴۳۷	تد فین
۴۵۵	اور۔۔ خود اپنی نگاہ میں!		مقامی اخبارات کے خراج عقیدت سے
۴۵۷	ایک وصیت اور چند گزارشات		چند چند سطریں
۴۵۷	الفرقان اور کتب خانہ الفرقان سے متعلق حقوق	۴۳۸	روزنامہ ”قومی آواز“
۴۵۸	دعائے مغفرت کی التجا	۴۳۸	روزنامہ ”صحافت“
	چودھواں باب	۴۳۸	روزنامہ ”ان دنوں“
	کچھ خاص رشتوں کے معاصرین		بیرونی اخبارات و مجلات سے
۴۶۰	مولانا محمد اسماعیل سنبھلی		تقریبی مضامین کی جھلکیاں
۴۶۳	مولانا ابولوفاشا جہانپوری	۴۳۹	”اٹھ گیا علم و عمل کا آفتاب“
۴۶۵	مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی		ہفت روزہ نئی دنیا، دہلی
۴۶۷	مولانا نسیم احمد فریدی	۴۴۰	”علم دین کا ایک چراغ اور بجھا“
۴۷۳	مولانا مناظر حسن گیلانی		مجلہ ”الماثر“ ممبئی
۴۸۰	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۴۴۱	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا سانحہ ارتحال
۴۸۵	صوفی عبدالرب صاحب		ماہنامہ الحق (اکوڑہ خٹک، پاکستان)
۴۹۲	مولانا ابوالحسن سجاد	۴۴۲	ایک اور چراغ گل ہو گیا
			ماہنامہ ”الرشاد“ اعظم گڑھ

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۵۵۳	علمی اطمینان اور اتقان		حصہ دوم
۵۵۳	فقہ حنفی کے بارے میں اطمینان		بندگانِ حق کی یافت
۵۵۴	فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول		کس کو پایا ؟ کیا پایا ؟
۵۵۵	بعض مسائل میں آپ کی خاص تحقیق	۵۰۳	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی زیارت
۵۵۶	علم اسرار و حقائق	۵۰۷	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ
۵۵۷	جدید مغربی علوم پر بھی نظر	۵۱۰	حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ
۵۵۷	سلسلہ درس کی بعض قابل ذکر چیزیں	۵۱۵	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ
۵۵۸	دو فتنوں کا شدید احساس	۵۱۵	پہلی زیارت
۵۵۸	قادیانی فتنہ سے آپ کی غیر معمولی بے چینی	۵۲۰	حضرت کی خدمت میں پہلی حاضری
۵۶۲	سلوک و تصوف	۵۲۱	دوسری حاضری اور ایک غیر معمولی واقعہ
۵۶۳	اپنے بعض اکابر سے خصوصی تاثر	۵۳۳	تیسری حاضری اور ایک قابل ذکر واقعہ
۵۶۴	بعض شائل نبویؐ کی جھلک	۵۳۸	چوتھی بار حاضری
۵۶۵	حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں	۵۴۲	آخری حاضری
۵۶۷	اپنے خیال پر نئے سرے سے غور اور نتیجہ	۵۴۵	حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ قدس اللہ سرہ
۵۷۲	بیعت کی درخواست اور فتح باب	۵۴۵	خدا داد اور انیت و محبوبیت
۵۷۷	حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں	۵۴۶	کمال علمی اور علوم میں جامعیت
۵۸۰	مرض و فوات کا آنکھوں دیکھا حال	۵۴۷	وسعتِ علم کے ساتھ دقتِ نظر
۵۸۵	مولانا محمد الیاسؒ کے ایک خاص رفیق اور نیازمند	۵۴۸	قرآن مجید میں تدبر و تفکر
	حاجی عبدالرحمن صاحب نو مسلم	۵۴۸	حدیث میں غور و تدبر
۵۹۱	حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددیؒ	۵۴۹	علامہ نیویؒ کی آثار السنن اور حضرت استاذ
۵۹۶	دوسری اور آخری زیارت و ملاقات	۵۵۰	علامہ نیویؒ حضرت استاذ کی نظر میں
۵۹۷	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	۵۵۰	حیرت انگیز یادداشت
	میری واقفیت اور تاثرات	۵۵۱	یادداشت کے متعلق اپنے بعض تجربے
۶۰۰	نماز کا امتیاز		

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۶۴۶	دوسرا حج اور اہلیہ کی دروناک موت	۶۰۱	رسول اللہ (ﷺ) کی محبت اور اتباع سنت
۶۴۸	اشرف منزل	۶۰۲	حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری
۶۵۰	حضرت حاجی صاحب کی موجودہ زندگی	۶۰۵	عزیمت یا شدت فی امر اللہ
۶۵۱	چند ایمانی صفات	۶۰۵	ایثار و فیاضی اور مہمان نوازی
۶۵۱	اخلاص و للہیت	۶۱۰	عند اللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی
۶۵۱	دعا اور شکر کا غلبہ	۶۱۱	حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمۃ والرضوان
۶۵۱	بے نفسی	۶۱۸	کچھ صفات و امتیازات
۶۵۳	دین کا صحیح فہم اور اعتدال	۶۱۸	جلال و جمال
۶۵۵	حضرت حکم الامت کی طرف سے اجازت	۶۱۹	غیر معمولی تاثیر
۶۵۶	حضرت مولانا محمد عبدالککور صاحب فاروقی مجددی	۶۲۰	علمی رسوخ اور وسعت مطالعہ
۶۵۸	علمی رسوخ	۶۲۰	ایک نیا انداز اور جذب و سلوک کا امتزاج
۶۵۹	تحریر و تقریر کا امتیاز	۶۲۱	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ
۶۵۹	مناظرہ کا امتیاز		کچھ یادیں - کچھ باتیں
۶۶۰	خاص موضوع	۶۳۹	حضرت حاجی عبدالغفور جوہر چوری
۶۶۰	رد شیعہ میں مولانا کی نیت اور اس موضوع سے	۶۴۱	بچپن
	ان کے غیر معمولی شغف کا اصل باعث	۶۴۲	یتیمی
۶۶۱	غیر معمولی اعتدال	۶۴۲	مزدوری کا آغاز
۶۶۱	نماز کے ساتھ قلبی تعلق اور نسبت نبوی	۶۴۲	دین سے لگاؤ کا آغاز
۶۶۳	قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق	۶۴۳	حضرت تھانویؒ کی زیارت اور بیعت
۶۶۳	اہل و عیال سے محبت اور ان کی جدائی پر	۶۴۳	”تارک الدنیا“ بننے کا غلط شوق اور داعیہ
	صبر والی نبوی وراثت	۶۴۴	بیٹی کی شادی میں رسوم سے انکار اور
۶۶۵	آپ کے مضامین الفرقان کا اشاریہ		اس کی بنا پر مقاطعہ اور برادری سے اخراج
		۶۴۵	پہلاج

مقدمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محاورہ کی زبان میں ایک ”اتفاق“ تھا کہ حضرت والد ماجد نور اللہ مرقدہ کی خیر وفات (۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء) کے ساتھ ہی ساتھ، آپ کی مختصر سوانح حیات ”تحدیثِ نعت“ (مرتبہ راقم) شائقین کے ہاتھوں میں پہنچی، اربابِ خلوص و محبت کے لئے دونوں چیزوں کی یہ ہم وقتی نفسیاتی طور پر مفصل اور مکمل سوانح حیات کی طلب کا باعث بن گئی۔ برطانیہ کے باشی بعض محبین نے تو گویا بیڑا ہی اٹھالیا کہ وہ یہ کام جتنی جلد ممکن ہو کر اکر رہیں گے۔ لچنا چکوئی چار سال ہوئے کہ اس سلسلہ میں کچھ کام کرنے کا موقع مل گیا اور سو صفحات کے قریب لکھ گئے، پھر آگے کہانی ہے کہ بات کہاں رک گئی۔

۲۰۰۹ء تا ۲۰۱۰ء کے موسمِ سرما میں محفلِ قرآن جلد دوم کی طباعت کے سلسلہ میں لکھنؤ کا قیام تھا۔ اسی دوران میں ایک ایسا کام ہاتھ میں لے لیا جو محنتِ طلب تھا، اس نے ہمیشہ کی اعصابی کمزوری کو وہ نقصان پہنچایا کہ ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۱ء تقریباً پورے کے پورے ہی اس حال میں گزرے کہ صحت کی واپسی کی (بلکہ زندگی کی بھی) امید نہ رہی تھی۔ محفلِ جلد دوم طبع ہو کر چھ مہینے ایک دو صفحے کے ”پیش لفظ“ کے لئے پریس میں رکھی رہی، حتیٰ کہ مجبور ہو کر براڈریم میاں سجاد سے کہنا پڑا کہ وہ میری طرف سے کچھ لکھ دیں کہ کتاب پریس سے باہر آئے۔ جب اللہ اللہ کر کے کتاب کئی ماہ بعد مکتبہ الفرقان میں آسکی۔

بالخصوص محبتِ محترم مولانا یعقوب قاسمی

بالکل مایوسی کے عالم میں اپنے بڑے بیٹے عبید الرحمن سلمہ کے یہاں دہلی میں پڑا وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ عزیزی مولوی بیچی سلمہ عیادت کو آئے اور حال دیکھ کر لکھنؤ کے اپنے ایک ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیا۔ مشورہ، اللہ سلامت رکھے بڑا مبارک ثابت ہوا۔ بزرگوں اور احباب و مخلصین کی وہ ہر سو دعائیں جن کی خبروں سے گنہگار بندہ زیر بار احسان تھا انسان کی تاثیر کا ظہور شاید اسی اسبابی عمل کے انتظار میں رکھا ہوا تھا، کہ ۲۰۱۱ء کے خاتمہ پر مجھے نئی زندگی نئی صحت مل گئی۔ اَللّٰہُ یَرْجِعُ اَلْاَمْرُ کُلُّہُ

سمجھا تو یہ تھا کہ یہ زندگی ”محفل قرآن“ کے لئے عطا ہوئی ہے، کہ زندگی کی خواہش اگر تھی تو وہ صرف محفل قرآن کے حوالہ سے، کہ اب عمر کسی اور خواہش کی نہ تھی۔ مگر محفل کا کام محنت طلب تھا، فوراً اس میں لگ جانا خلاف احتیاط معلوم ہوا، تو توجہ سوانح کے نامکمل کام کی طرف ملتفت ہوئی کہ یہ ایسی زیادہ محنت کا کام نہ تھا۔ کہنا چاہئے کہ تقدیر الہی میں وقت آگیا تھا کہ یہ نامکمل کام، جو یقیناً ایک مبارک کام تھا اور جس کی چاہت میں اہل محبت دن گن رہے تھے، تکمیل پا جائے اور راقم اپنے ذمہ لئے ہوئے فرض سے سبکدوش ہو۔ الحمد للہ کہ صحت نے ساتھ دیا اور کتاب بغیر کسی بڑی دقت کے اس کے باوجود مکمل ہو گئی کہ کام میرے اندازہ سے کہیں زیادہ بڑا نکلا، اور تقریباً ایک سال کا وقت لے لیا۔ دعا کرتا ہوں اور قارئین کرام سے دعا کا طالب کہ محفل قرآن کی طرف واپسی میسر آئے۔ اور بقیہ زندگی اسی مبارک محفل کی نذر ہو۔

حضرت والد ماجد کو قریب سے دیکھنے والے، برتنے اور مستفیض ہونے والے ابھی خاصی تعداد میں زندہ ہیں، کتاب کے بارے میں وہی صحیح فیصلہ کریں گے کہ آپ کی زندگی کی تصویر دکھانے میں یہ کہاں تک کامیاب ہے۔ ایسی شش جہت اور پارے کی طرح گرداں وہ زندگی دین و ملت کے مسائل میں تھی کہ اس کے تمام پہلوؤں کا پورا پورا احاطہ آساں نہیں۔ یہی ہمہ گیریت سامنے تھی کہ آپ کی یاد میں نکلنے والے الفرقان خاص لے ان ارباب غلو و محبت میں سے جن حضرات کو میں نام سے جانتا ہوں وہ سب میرے یقین میں اس طلب سے بلند ہیں کہ ان کا نام لیا جائے، مگر مخدوم و محترم امیر جماعت پاکستان حضرت حاجی عبدالوہاب صاحب مدظلہ نے اس دو سال کے عرصہ میں جیسی فکر اس بے مایہ کی رکھی، اس کا بصد تشکر اظہار کئے بغیر گزر جانے پر طبیعت راضی نہیں ہے، اور یہ سب صدقہ حضرت صاحب سوانح کا ہے۔

نمبر (۱۹۹۸ء) کے اپنے (دو میں سے) ایک مضمون کے لئے عنوان بے ساختہ ”وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہاں“ ذہن میں آیا تھا، مگر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ادب نے (کہ یہ مصرعہ آپ ہی کی شان میں کہا گیا تھا) اس کے استعمال کی ہمت نہ ہونے دی، بعد میں برادر م سجاد میاں نے اپنا مضمون دیا تو وہ یہی عنوان لئے ہوئے تھا۔ تو گویا بات کسی تصنع اور تکلف کی نہ تھی، یہ آؤر نہیں آد تھی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ حضرت مجددؒ کے ادب کو مانع نہ سمجھا جائے تو اس مصرعہ سے حضرت مرحوم کی زندگی کی ترجمانی میں ذرا مبالغہ نہیں۔ آپ کی زندگی میں حضرت مجددؒ کی زندگی کا پرتو جیسا نمایاں رہا اس کو بیان کی حاجت کہاں؟ اسی سے تو یہ سعادت آپ کے حصہ میں آئی کہ حضرت مجددؒ کے پیام کو مدتوں کے بعد ہند میں دوبارہ زندہ کریں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ آپ کی زندگی میں آپ کی زندگی کی ترجمانی اس عنوان سے اگر کوئی کرتا تو اللہ ہی جانتا ہے اس کو کیا سننا ہوتا، کہ ان سارے کمالات کے ساتھ، جن کے لئے مایہ ناز شہادتیں، آپ کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں، خود کو ہمیشہ وہی ”ناچیز“ اور ”عاجز“ سمجھا، جس سے اپنے کو تعبیر کرنے کی عادت تھی، اپنے مسترشدین تک سے ”سیدی و مولائی“ جیسے عام مروّج القاب بھی سننے کے روادار نہ تھے۔ اپنی اولاد تک کے قلم سے ”دامت برکاتہم“ جیسے پامال احترامی الفاظ بھی اپنے لئے زیادہ ٹھیرائے جاتے۔ (جیسا کہ کتاب میں آپ دیکھیں گے) آنحضرت (ﷺ) سے مآثور دعا اللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ عِیْنِیْ صَغِيرًا۔۔۔ (اے اللہ مجھے میری نظر میں چھوٹا بنا۔۔۔) جو خاص دعاؤں میں سے تھی، راقم نے تو آپ کا حال ہی بنی ہوئی دیکھی۔

۲۱ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہی سے، بلکہ کچھ قبل ہی سے، دین و ملت کی خدمت کی لائن جو اپنے اکابر کے طرز پر پکڑی، تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، اور آگے اللہ کے دئے ستر بہتر (۷۰-۷۲) سال اپنے امکان بھر اس طرح اسی کی نذر کئے کہ کسی بھی ضروری خدمت کا وہ محاذ جس میں کچھ کر سکنے کی اہلیت آپ نے اپنے اندر پائی، اس محاذ پہ آپ اپنا کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی آخری درجہ کی مثال یہ ہے کہ تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے نتیجہ میں بکشت و خون کی جو گرم بازاری ہوئی اور مسلمانان ہند پر ملک کے زمین و آسمان تنگ ہوئے، ٹرین کے سفر میں ان کے لئے مخصوص ڈبے لگنے لگے جس میں پولیس کا محافظ دستہ متعین ہوتا اور مسلمان اگر سفر کرتے تو مارے خوف کے انہی ڈبوں میں محصور ہو کر کرتے۔ اہل ملت کی اس بے ہمتی اور خوف زدگی نے آپ کو بے چین کیا، سوچا کہ اس شرمناک حال سے ان کو

نکالنے کے لئے وہ کیا کر سکتے ہیں؟ وہ کوئی جماعت اور ادارہ نہ رکھتے تھے، فرد واحد تھے۔ طے کیا کہ اپنے ذاتی عمل ہی سے مسلمانوں کو ہمت دے، غوغائی کا سبق دینے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ خطرناک فیصلہ عمل میں آیا۔ تفصیل پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، کتاب میں آپ کی نظر سے گزرے گی۔

آپ کی اسی ”ہمہ جہتی“ کے حوالہ سے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نے آپ کی وفات پر اپنے تعزیتی ادارے میں لکھا تھا کہ

”وہ مذہبی، اصلاحی، قومی، ملی، تعلیمی اور اجتماعی جدوجہد کے ہر محاذ پر سرگرم و متحرک دکھائی دیتے تھے، انھیں مسلمانوں کی موجودہ پستی زبوں حالی کا پوری طرح احساس بھی تھا اور وہ اس کے ازالہ کے لئے فکر مند بھی رہتے تھے۔ آزاد ہندوستان میں جن مسائل نے مسلمانان ہند کی زندگی تلخ و مکدر کر رکھی ہے ان پر شور و غوغا مچانے، لچھے دار باتیں اور دھواں دھار تقریریں کرنے اور پُرجوش تحریریں لکھنے والے تو بہت سارے لوگ ہیں لیکن ان پر مولانا کی طرح تڑپنے، بچپن ہو جانے، درد و کرب اور خلش و اضطراب میں مبتلا ہونے والے بہت کم لوگ ہیں۔ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے دعا و مناجات میں بھی مصروف رہتے تھے اور ملک کے گوشہ گوشہ کی خاک بھی چھانتے رہتے تھے، ان کے گریہ شب اور دعا ہائے سحر گاہی سے گھبرا کر ابلیس بھی پکارتا رہا ہوگا کہ۔“

خال خال اس قوم میں اب بھی نظر آتے ہیں وہ

کرتے ہیں اھک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

الغرض دین و ملت کے لئے وقف رہنے کے اسی حال میں، بانوے رچورنوے سال کی عمر پر (۱۳۱۷ھ۔ ۱۹۹۷ء میں) جان، جان آفریں کے سپرد کر کے عالم بقا کی راہ لی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابواب الصالحین۔ اسی جہد و عمل بھری زندگی کی تاریخ یہ کتاب ہے۔ اور بلا اس اندیشہ کے کہ کہیں مبالغہ پر نہ محمول کیا جائے، کہنا چاہئے کہ ہماری نئی نسل کے لئے اس تاریخ میں وہ روشنی ہے جس کی اسے بلاشبہ حاجت ہے۔ زمانہ، ملت اسلامیہ کے لئے بالخصوص، جس قدر سخت ہوتا جا رہا ہے وہ کھلی کتاب کی طرح سامنے ہے، اس سے عہدہ برآئی باضی کے معتبر نشانہائے قدم کو نگاہ میں رکھ کر ہی کچھ آسان ہو سکتی ہے۔ اور یہی اس محنت کی، جو تقریباً

ستر (۷۰) سال پر پھیلی ہوئی سراپا عمل زندگی کو قید تحریر میں لانے میں ہوئی چاہئے تھی قیمت ہے۔ حضرت صاحب سوانح کی دینی و ملی زندگی کا ایک حصہ تو وہ ہے جس کی نمائندگی آپ کی تعنیفات کرتی ہیں۔ اس سے لوگ اتنے بڑے پیمانہ پر واقف ہیں اور مستفید ہو رہے ہیں کہ اس کے بیان کی زیادہ حاجت نہ تھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ اس زندگی کے وہ پہلو جنہیں ذاتیات اور اجتماعیات سے تعبیر کیا جائے گا، وہ سوانح میں حتی الامکان تفصیل سے لئے گئے ہیں۔ اور ان کا بیشتر مواد خود آپ کے قلم سے الفرقان کی فائلوں میں محفوظ تھا۔ (اس طرح یہ سوانح بڑی حد تک ”خودنوشت“ کی حیثیت رکھتی ہے، اور راقم کی حیثیت زیادہ تر اس کے مرتب کی۔)

آپ کی وفات پر اہل علم و قلم کے تاثرات و بیانات بھی بڑی تعداد میں ”موت العالم موت العالم“ کے انداز پر سامنے آئے۔ یہ بھی ایک حیثیت سے سوانح کا حصہ بنتے تھے چنانچہ کچھ شامل کئے گئے ہیں۔ اور الحمد للہ، کہ جو کچھ ان تاثرات و بیانات سے پہلے آپ کی اپنی تحریروں اور آپ کے اہل خانہ کے حوالوں سے سوانح میں درج ہوا ہے، یہ پس وفات تاثرات و بیانات اس سب پر مبر تصدیق ہی ثابت کرنے والے نہیں، کچھ اور بھی بڑھ کر شہادتیں مہیا کرنے والے ہوئے ہیں۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ چودہ (۱۴) ابواب پر تمام ہوا ہے۔ دوسرے حصہ میں اولاً ”بندگانِ حق کی یافت“ کے عنوان سے حضرت صاحب سوانح کے چودہ (۱۴) مضامین ہیں۔ ان کے بعد آپ کے اُن مضامین کا مکمل اشارہ یہ ہے جو الفرقان میں شائع ہوتے رہے۔ راقم کی نظر میں یہ اشارہ یہ علمی لحاظ سے اس کتاب کی اہم ترین چیز ہے، اور یقین ہے کہ اہل علم اسے نعمت غیر مترقبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔ راقم اس کے لئے شکر گزار ہے جناب قطب الدین ملا صاحب کا، کہ لمبی بیماری کے بعد کی کمزوری کے حال میں یہ پر مشقت کام انہوں نے انجام دیا۔ اللہ انہیں شفاء عاجل اور اجرِ کامل سے نوازے۔ اس حصہ دوم کا اصل حصہ (یعنی ”بندگانِ خدا کی یافت“ والے مضامین) اس سے پہلے ”تحدیثِ نعمت“ میں یکجا شائع ہو چکے ہیں، پس بہت سے قارئین کی نظر سے گزر بھی چکے ہوں گے۔ مگر اس سوانح کے قارئین میں ایسے بھی بہت سے حضرات ضرور ہوں گے جن کی نظر سے تحدیث نہ گزری ہو، دوسرے یہ کہ ان مضامین میں جو کچھ ہے وہ حضرت صاحب سوانح کی نظر میں یقیناً ان کی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ، بلکہ سرمایہ اور حاصل حیات تھا، اسے ان کی سوانح سے

الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اور خود سابق قارئین بھی ان میں یقیناً کافی حصہ ایسا پائیں گے کہ قد بکر کا مصداق ٹھہرے۔ بقول ایک شاعر عربی۔ ع

”هو الميسك ما كوزته يحضوع“

یہ سوانح نہیں تیار ہو سکتی تھی اگر برادر عزیز میاں حسان نعمانی کی بھرپور مدد مجھے نہ حاصل ہوتی۔ اتنی تاخیر اس کام میں ہونے کی سب سے بڑی وجہ میرا یہ خیال تھا کہ لکھنؤ میں قیام کے بغیر یہ کام انجام نہیں پاسکتا، اس لئے کہ اس کا انحصار الفرقان کی فائلوں پر تھا۔ اور کام جتنا لمبا قیام چاہتا تھا اس کی گنجائش میرے لئے نہ تھی، مگر اس بار جو وہ حالات ہوئے جن کا اوپر ذکر آیا، کہ مجھے محفل قرآن سے ہلکا کام درکار تھا، جو یہ سوانح ہی کا کام ہو سکتا تھا، اور تھا میں لندن میں، تو لندن ہی میں بیٹھے بیٹھے یہ کام انجام دینا برادر حسان نے میرے لئے اس طرح ممکن بنادیا کہ مطلوبہ مضامین الفرقان کے فائلوں سے نکال نکال کر کمپوز کرنا اور ای میل سے مجھے بھیجنا اپنے ذمہ لے لیا، اور پوری تن دہی سے یہ سلسلہ لگائے رکھا حتیٰ کہ امکان اور عدم امکان میں پھنسی ہوئی چیز اللہ کے کرم سے وجود میں آگئی۔ اس بڑے کام کے علاوہ ان سے کافی وہ معلومات حاصل ہوئیں جو ساتھ رہائش کی بنا پر انہی کے علم میں ہو سکتی تھیں۔ پس حسان میاں اگر دعویٰ اس کام کے آدھے حصہ دار ہونے کا کریں تو غلط نہ ہوگا۔ اللہ دنیا و آخرت کی نعمتوں سے انھیں نوازے۔

دوسرے نمبر پر مددگار ہونے والے میاں ظلیل الرحمن سجاد تھے، جو فی الجملہ شیر کار رہے۔ چند سال پہلے سوانح کا کام شروع کر کے جب میں لندن لوٹے لگا تھا تو اس کی تکمیل ہی کو سوچا تھا کہ عزیز بی سجاد کردیں، اور انھوں نے بخوشی اسے اپنے ہاتھ میں لے بھی لیا تھا۔ مگر اپنی دوسری مشغولیتوں میں وہ کام کر نہ پائے۔ اب بہر حال میری وقتاً فوقتاً طلب پر مناسب مشوروں ہی سے انھوں نے میری مدد دینے کی بلکہ الفرقان کی فائلوں پر اچھی نظر ہونے کی بنا پر متعدد اہم چیزوں کی نشاندہی بھی انھوں نے کی اور ضرورت ہوئی تو بلال سجاد سلمہ کے ذریعہ ان کی کمپوزنگ کا کام بھی کرایا۔ کاش سوانح کی تکمیل انہی کے ہاتھ سے ہوتی تو موجودہ سے ضرور کچھ بہتری امید کی جاسکتی تھی۔

اے ایسے ہی موقع کا ایک عربی مصرع، جس میں ”قد بکر“ کی جگہ ”مبک مکر“ باندھ کر شاعر نے کہا کہ ”یہ مشک ہے جتنی بار بھی اسے دہراؤ مشام جاں معطر کرے گا۔“

تیسرے نمبر پر قابل ذکر مدد اور دلچسپی عزیزم عبید الرحمن سلمہ کی رہی۔ ان کی لائن تو ہم لوگوں کی ”لکھنے پڑھنے“ والی نہ رہ سکی، دفتری قسم کی سرکاری نوکری ان کو لکھی گئی، مگر آبائی ذوق نے دامن نہیں چھوڑا۔ بعض ایسے اچھے مشورے مجھے عزیزم سے ملے جو کسی پختہ کار مصنف ہی سے مل سکتے تھے، اور پھر کام کے آخری اسٹیج پر دس دن کی چھٹی لیکر سری نگر سے لکھنؤ اسی سلسلہ میں آکر مزید مددگار ہوئے۔

”خوب سے خوب تر“ کی جستجو کے تحت امید تھی کہ برادر عزیز حفظ میاں نعمانی کی شرکت بھی اس کام کو ضرور حاصل ہوگی، کہ لکھنؤ میں قیام انہی کے یہاں ہوتا ہے، مگر ان دنوں میں ان کی صحت نے کچھ ایسی صورت اختیار کی ہوئی ہے کہ کسی غور خوض کے کام میں انہیں نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔ پھر بھی ایک آدھ کی انہوں نے پوری کرائی ہے، اور ابھی جو دس بارہ دن کا موقع اور ہے شاید کہ اس میں کچھ مزید شرکت ان کی ہو جائے۔ اللہ ان کی صحت بحال کرے۔

لندن میں اس کام کے دوران کمپیوٹر کے کچھ مسائل میں مجھے کسی ماہر کی مدد کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، دل سے دعا ہے کہ اس خدمت کے لئے بے عذر دستیاب ہونے کے لئے اللہ برادر عزیز غلام جعفر کو بیش از بیش جزا سے نوازے۔ جعفر ایک پاکستانی نوجوان ہیں، کمپیوٹر ٹریننگ کے سلسلہ سے لندن آکر وہیں رہ گئے ہیں۔ دینی ذوق کے ساتھ مطالعہ کے سجد شوقین، اسی راہ سے مجھ سے عائشہ واقفیت اور محبت رکھتے تھے، پھر لندن آکر تو گویا وابستہ ہو گئے ہیں، قیام کافی دور ہے مگر دل سے قریب۔

تشکر و اعتراف کے ان کلمات کے بعد اللہ رب العزت کے حضور دعا ہے کہ یہ کام آخرت میں کام آنے والا بھی بنے اور وہ نفع بھی اس سے اپنائے ملت کو پہنچے جس نفع کے لئے حضرت صاحب سوانح عمر بھر حریص رہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

عتیق الرحمن سنہ ۱۴۳۳ھ

بیٹ حسان

۶ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ - ۱۹ جنوری ۲۰۱۳ء

ہدیہ تبریک

[مقدمہ میں آپ نے پڑھ لیا ہے کہ راقم نے چاہا تھا کہ سوانح کی تکمیل کا کام برادرِ مہجاری میاں کے ہاتھوں انجام پائے، مگر یہ مقدمہ نہ ہوا۔ تو اب تکمیل کا رپر جب اس کی تقدیم (یا مقدمہ لکھنے) کے لئے نظر دوڑائی اور وہ مایوسی کے ساتھ لوٹی کہ اب اس درجہ کی کوئی شخصیت باقی نہیں رہ گئی ہے اور اس لئے یہ کام بھی خود ہی کرنا ہے تو چاہا کہ تکمیل نہ سہی تقدیم ہی کا کام برادرِ عزیز کے ہاتھ سے ہو۔ اس سے پیشتر حضرت مرحوم کے ”درسِ قرآن“ میں جب یہی صورت بنی تھی تو مقدمہ کا کام میں ان سے کرایہ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس دفعہ نہ جانے کیا ہوا کہ مقدمہ کی جگہ عزیزم نے مجھے یہ ”ہدیہ تبریک“ لکھ کر دیا۔ یعنی مقدمہ خود لکھنا ہوگا، جو آپ نے پڑھ لیا۔ اب یہ ”ہدیہ تبریک“ آپ پڑھنا چاہیں تو پڑھ لیں، بلاشبہ مفید ہوگا۔]

”سلطانین کہتے ہیں؛ کہ شاہی دربار تھا، کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاؤ تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔ مولوی کہتے ہیں؛ خانہقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھی، درد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا شغل تھا، تخت (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس سے جو کہہ دیا جاتا ہے پورا ہوتا ہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لئے کہ وہ سب کے لئے تھا، آئندہ جس کی کو چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا اسی کی روشنی میں چلنا تھا۔“

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی مشہور زمانہ کتاب ”النبی الخاتم“ کا یہ اقتباس اس عبارت سے ماخوذ ہے جس میں انھوں نے خاتم النبیین محمد رسول اللہ (ﷺ) کے دربار کی شانِ جامعیت کی منظر کشی کرنے کی سعی کی ہے۔ آپ (ﷺ) کی سیرت کے اس امتیازی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے والے نے کہا تھا:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
انچ خوباں ہمدار رند تو تنہا داری

اس شانِ جامعیت کی جلوہ گری آپ کو حضرات خلفاء راشدین، صحابہ و تابعین، اور اُن کے بعد آنے والے مجددین و مصلحین اور علماء ربانین میں بھی، اپنے اپنے ”لون“ یا ”رنگ“ کے غلبے کے ساتھ نظر آئے گی۔ اور ایسا ہونا بالکل فطری امر ہے، کیونکہ جس شمع ہدایت سے، بلا واسطہ یا بالواسطہ، یہ سب چراغ روشن ہوئے تھے، اُن پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔

خصوصاً سرزمین ہند میں تقدیر الہی نے دورِ محکومی میں اسلام کی حفاظت، اشاعت اور اقامت کی ذمہ داری ”شاہانِ دہلی“ کے جس سلسلہ کے سپرد فرمائی، اس سلسلے سے وابستہ افراد میں جامعیت کی یہ شان اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

اگر آپ کھلے دل و دماغ سے اس سلسلے کے امام، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت پر نظر ڈالیں گے، یا اُن کی اولاد و احفاد کی زندگی کے احوال پڑھیں گے اور پھر اُن کے سلسلے کے ممتاز علماء کی سوانح حیات پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ایک طرف وہ علوم و فنون کے ماہر اور محقق اساتذہ و مصنفین ہیں، تو دوسری طرف وہ تزکیہ و احسان اور عشق و محبت کی اس دولت باطنی کے بھی امین و وارث ہیں جس کو دین و شریعت کے رمز شناسوں نے اسلام کی روح اور اس کا اصل جوہر قرار دیا ہے۔ بلکہ یہ حضرات درس و تدریس، تحقیق و تصنیف اور تزکیہ و ارشاد کی مسندوں کے علاوہ کبھی آپ کو میدانِ کارزار میں اُتر کر ملت کے وجود اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور اللہ کے کلمہ کی بلندی اور دینِ حق کی طرف دعوت کے عظیم مقصد کے لئے سرگرم عمل نظر آئیں گے۔ سلسلہ ولی اللہی یا فکر ولی اللہی کی اسی جامعیت کے بارے میں حضرت صوفی سید عبدالزب نے کہا تھا:

جسے تو مدرسہ و خانقاہ، اُٹھے تو سپاہ
یہی ہے مختصراً حکمتِ ولی اللہ

یہ کتاب، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، جس بندہ خدا کی حیات و خدمات کی کچھ جھلکیاں آپ کو دکھانے کے لئے لکھی گئی ہے، وہ بھی اسی شجرہ طوبیٰ کا ایک شمرہ تھا، صاحبِ سوانح، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کتاب و سنت کے ایسے بلند پایا محقق اور راسخ العلم عالم و شارح تھے، جن کے علم کے رسوخ، فکر و فہم کی سلامتی اور جن کی تمہیمات و تشریحات کے معتبر و مستند اور متوازن و معتدل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سہل اور سلیس ہونے کی گواہی، ان کے زمانے کے بڑے بڑے اہل علم و فکر نے دی، اس علمی رسوخ کے ساتھ بڑے بڑے اہل اختصاص کی نظر میں وہ اس نسبتِ باطنی اور اس مقامِ عبدیت کے حاملین میں سے بھی تھے، جو اہل فن کی نگاہ میں اذکار و اشغال کا اصل مقصد ہے۔ اور اس سب کے ساتھ، دینی حمیت، غیرت و جرأت، حق گوئی و بیباکی اور دین کے بنیادی اصول و عقائد کے تحفظ و دفاع اور ہر قسم کی تحریفات و تلبیسات سے دین حق کی حفاظت کے معاملے میں اُن کی مثالی حساسیت اور فولادی صلابت جیسے اوصاف بھی اُن کی سیرت کا ایک نہایت اہم اور نمایاں حصہ ہیں، اور اس سب کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو درپیش خطروں کو محسوس کرنے اور اُن کے مقابلے کے لئے فکری رہنمائی اور عملی تدبیروں کے سلسلے میں بھی اُن کی نہایت بیش قیمت خدمات رہی ہیں۔ پھر مختلف بلکہ متضاد میدانوں میں اُن کی خدمات کے علاوہ اُن کی ذاتی سیرت کے وہ روشن پہلو بھی بہت تفصیلی تذکرہ چاہتے ہیں جن سے آج کے ہم جیسے طالب علم اور اس نسل کے وہ ہزاروں علماء اور دینی کارکن بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، مثلاً اُن کی تواضع و بے نفسی، اُن کا اخلاص و للہیت، مال و جاہ کی محبت اور داد و تحسین کی طلب سے اُن کے دل کی سلامتی، اُن کی عالی ہمتی و بلند حوصلگی، اُن کا گریو نیکا اور سوزِ دروں، اُن کا ذوقِ دعا و مناجات، اُن کی غیر معمولی ذکی الحسی، اپنے چھوٹوں خاص کر غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ اُن کا شفقت بھرا برتاؤ، اپنی غلطیوں کے اعتراف و رجوع اور اپنی کمزوریوں کی تشخیص اور استحضار کے سلسلے میں اُن کا مثالی طرزِ عمل، اُن کی سادگی اور ہمہ وقتی مشغولیت، ہر قسم کی عصبیت

(۱) اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا تھا ”تقسیم ہند کے بعد یہاں ہندوستانی مسلمانوں کے دینی وجود کے متعلق جتنا مولانا کا ذہن صاف اور واضح تھا، اتنا کسی بڑے سے بڑے عالم کا نہیں تھا، مولانا نے یہاں کے جو حالات سمجھے اور خطرات اور اندیشوں کا جو ادراک کیا وہ مولانا ہی کا حصہ تھا۔“ (ملاحظہ ہو الفرقان کے خاص نمبر ”بیاد بانی الفرقان ۱۹۹۸ء“ میں حضرت مولانا کا مضمون ”رفیق محترم“ صفحہ ۱۰۲)

سے اُن کے دل دو ماغ کی پاکی وغیرہ..... پھر اس سب کے باوجود اور ان کے علاوہ اور بھی خوبیوں کے باوصف، دل کی گہرائیوں سے اپنے کو بالکل ہی ”خالی ہاتھ“ اور ”لا شے“ سمجھتے رہنے کی وہ مستقل قلبی کیفیت، جس کی کما حقہ منظر کشی کرنا، میرا تو ذکر ہی کیا، شاید اچھے اچھے اہل قلم کے لئے بھی آسان نہیں۔۔۔۔۔

اب آپ خود سوچیں ایسی جامع الکمالات شخصیت کی سوانح لکھنا، اور ۶۰ سال سے کچھ زیادہ ہی عرصے کے زمانی، اور ہزاروں میل کے مکانی، رقبے پر پھیلی ہوئی، مختلف بلکہ بظاہر متضاد میدانوں میں، اس کی خدمات کا بیان کوئی آسان کام ہے؟ لیکن دوسری طرف اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ پست ہمتی اور ہوئی و ہوس کے غلبے کے اس دور میں ضرورت ہے کہ ایسی شخصیتوں کے چراغ روشن کئے جائیں جو شاید ہماری تمناؤں کے قبلے کو درست کر دیں اور شاید ہم اور ہم جیسے لوگ ان سے ہی کچھ روشنی لے لیں۔ برادرِ گرامی جناب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی مدظلہ نے اپنی عمر اور صحت کی اس منزل میں جب کہ ہم میں کسی کو یہ امید نہیں رہ گئی تھی کہ وہ یہ عظیم کام انجام دے سکیں گے، اس عظیم و دشوار و نازک کام کا بار گراں اٹھا کر اور باذن اللہ اسے تکمیل تک پہنچا کر اس ضرورت کی جو خدمت انجام دی ہے اور خانوادہ نعمانی کے سر سے ایک بھاری قرض جس حسن و خوبی کے ساتھ اتارا ہے اللہ ہی اس کی جزا انھیں عطا فرمائے۔ واقعہ میں وہی اس کے اہل و حق دار بھی ہم سب کے احساس کے مطابق تھے، کہ سب سے زیادہ صاحبِ سوانح سے فیضیاب ہوئے تھے اور ان کے بہت سے کمالات کے وارث و امین ہیں، اور آج ہم سب اپنے رب کی حمد و ثنائیں رطب اللسان ہیں جس کی توفیق سے ان کی سال بھر کی شبانہ روز کی کاوش کا ثمر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف ہی کے قلم سے نکلے ہوئے وہ الفاظ قارئین کے سامنے آجائیں جو صاحبِ سوانح کی وفات کے بعد ان کی یاد میں شائع ہونے والی الفرقان کی اشاعتِ خاص کے شروع میں ان کے قلم سے نکلے تھے:

”یہ عاجز مرتب گواہی دیتا ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف اللہ وحدہ لا شریک کے لئے ہے، اور اُسی کو زیبا ہے، پس اگر کبھی اس خاص اشاعت کے سلسلے میں یہ خیال اور شیطانی دوسرہ ذہن کے کسی گوشے میں گذرا ہو کہ اس کے ذریعہ ہمارے والد ماجد علیہ الرحمہ کی بزرگی و بڑائی کا نقش لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگا، تو رب غفور و رحیم سے التجا ہے کہ اپنے کرم سے معاف فرمادے، جہاں تک اصلی ارادے اور نیت کا تعلق اور اس کا شعور ہے، وہ سوائے اس

کے کچھ نہیں رہا کہ اُن کی زندگی میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا تذکرہ اور جن کا تحریری شکل میں محفوظ کر دیا جانا لوگوں کے لئے مفید۔ بلکہ بے حد مفید ہوگا اور خود ہمارے لئے ایک مستقل نصیحت اور وصیت کا کام دے گا، اور اسی لئے اس کی پوری احتیاط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جو کچھ چھپے اس کا اصلی رُخ اسی افادیت کی طرف ہو۔ (ملاحظہ ہو الفرقان کی اشاعت خاص ”بیاد بانی الفرقان“ ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۳)

آپ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں محسوس کریں گے کہ اس کی بھی ایک ایک سطر پر اسی نیت اور اسی ارادہ کی گہری چھاپ ہے۔ عام طور پر لوگوں کو بزرگوں کی سوانح میں مبالغے اور تفصیل و اطباء کا شکوہ ہوتا ہے، اس کے برعکس یہاں آپ کو اگر شکوہ ہوگا تو ایجاز و اختصار کا اور حد سے زیادہ احتیاط کا۔ تاہم اگر یہ قانون برحق ہے کہ ”انسانوں کے غملوں کا وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو ان اعمال کے کرنے والوں کا اصل مقصود ہوتا ہے“ تو ہمیں امید ہے کہ ان شاء اللہ اس کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والوں کو فائدہ ضرور ہوگا۔۔۔ اللہ کرے کہ اللہ کے یہاں قبولیت اور اس کے بندوں کے لئے افادیت کے لحاظ سے سوانحی ادب میں اسے خاص مقام ملے۔

آخر میں اپنی طرف سے اور پورے خانوادہ نعمانی کی طرف سے سب کا یہ چھوٹا اور ہر لحاظ سے کھوٹا مصنف کتاب اور بزرگ خاندان کی خدمت میں اس سعادت کے حصول پر صدق دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اُن کا سایہ عاطفت ہم سب پر طویل عرصہ تک قائم و دائم رہے اور روزِ محشر ہمیں اپنے بزرگوں کے سامنے شرمندگی و رسوائی سے بچائے۔

رَبِّ اَوْزُغْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَاَنْ
اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ ۝ آمین

طالب دعا

خلیل الرحمن سجاد نعمانی
لکھنؤ

۲۳ مفر مظفر ۱۳۴۲ھ ۶ جنوری ۲۰۲۱ء (بروزِ دو شنبہ)

دوبیاچہ طبع دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب کے اجراء کے ایک ہفتہ بعد لندن پہنچ کر اس غرض سے اُس پر نظر ڈالنی شروع کی تھی کہ کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو جائے، لیکن مشکل سے ابھی ایک ہفتہ گزر رہا تھا کہ برادرِ مہمانِ نعمانی کا ای میل پہنچتا ہے کہ کتاب ختم ہو گئی ہے، دوسرا ایڈیشن تیار کرنا ہے، اس میں کچھ گھٹانا بڑھانا ہو تو فوراً چاہئے۔ اطمینان تو تھا کہ کتاب انشاء اللہ مقبول ہوگی مگر یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ بات اس درجہ کی نکل۔ لک الحمد یا ربی، حمدا لا یزید فائدہ الا رضاک!

تصحیح کے بہانے کتاب کو اول سے آخر تک اطمینان سے پڑھنے کا موقع ملا تو اول تو اس بات کا اطمینان ہوا کہ سوانح کا دائرہ اگرچہ بہت وسیع اور کثیر الجہات تھا تاہم مشکل ہی سے کوئی کسر رہ گئی ہوگی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ خود یہ خاکسار اپنے والد ماجد کی شخصیت سے اتنا واقف پہلے نہیں تھا جتنا اس کتاب کی تالیف و تدوین کے دوران ہوا۔ نیز یہ بھی اطمینان ہوا کہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی تھی اس مقصد کے ساتھ اس کی مطابقت میں بھی کوئی کمی بظاہر نہیں رہی ہے، کتاب کا مزاج مقصد سے اچھی طرح ہم آہنگ ہے۔ اور اس لئے خدا نے چاہا تو اپنے مقصد کو پورا کرے گی، کتنے ہی جوانوں کی زندگیاں ان شاء اللہ سنوریں گی، اپنے رب کی رضا کی راہ پر پڑیں گی اور دین و ملت کی خدمت کا ایمانی طریقہ اس سے سیکھیں گی۔ اور یہ سب حضرت صاحبِ سوانح کے حسنات میں مسلسل اضافہ کا ذریعہ بھی انشاء اللہ بنے گا۔ اعلیٰ اللہ درجاء۔ خود یہ خاکسار اگرچہ آپ کی زندگی میں بھی اُس کے فیض سے کچھ بہت محروم نہیں رہا، لیکن سوانح کی ترتیب و تالیف کے دوران اس فیضِ یابی کا جیسا واضح احساس ہوتا رہا، ایسا زندگی میں بس خال خال موقعوں ہی پر ہونا یاد آتا ہے۔ اللہ اس کیفیت کو قیام و دوام عطا فرمائے۔

ان پہلوؤں سے مسرت کے احساس کے ساتھ اس موقع کا ایک زنجیرہ احساس بھی ہی، کہ بھائی قطب الدین مٹلا صاحب جن کا ایک خاص حصہ اس سوانح تکمیل میں ہے، یعنی حضرتؒ کے مضامین الفرقان کا مکمل اشاریہ (ایڈکس)۔ وہ کتاب کی عین طباعت کے دوران انتقال فرما گئے۔ اور سوانح، جس کے وہ یوں بھی بہت مشتاق تھے اس سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہ کر سکے۔ لیکن اصل ٹھنڈک تو واقعہ میں اس عالم سے آنکھیں بند ہونے کے بعد ہی کی ٹھنڈک ہے۔ امید ہے کہ وہ ان کے حصہ میں آئی ہوگی۔ **بغفر اللہ لہ ویرحمہ**

.....

آخر میں ایک بھول کی معذرت اور تلافی۔ مقدمہ میں گزر چکا ہے کہ سوانح کے کام کا آغاز کئی سال قبل ہو گیا تھا لیکن تھوڑا سا ہو کر رہ گیا، پھر سال گزشتہ تک رُکا رہا۔ اس ابتدائی کام میں سب سے پہلا عنوان حضرت صاحب سوانح کے وطن سنبھل کا تھا، سنبھل کے سلسلہ میں جو معلومات سوانح میں آئے ہیں وہ تمام تردو صاحبان کے تعاون کا نتیجہ ہیں۔ مگر مقدمہ میں جہاں اُن عزیز اشخاص کا ذکر تشکر کے ساتھ کیا گیا جن سے کسی قسم کا تعاون اس کام میں ملا تھا، وہاں ان دو صاحبان کا نام کئی سال پرانی بات ہو جانے کی وجہ سے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ اور اس صحیحی نظر ثانی کے دوران میں اس بھول کا خیال آیا۔ تو ان مہربانوں سے معذرت کئے ساتھ، یہ ہیں (۱) میرے عزیز پھوپھی زاد میاں نفیس الرحمن، اور (۲) ایک ہم محلہ نو جوان، محمد فاضل صاحب، جن سے میں پہلے کبھی واقف نہ تھا، مگر وہ بڑے کام کے اور علمی دلچسپی والے نکلے۔

اور ان دو کے ساتھ پتہ نہیں کیسے میں اپنے عزیز بھائی مولوی زکریا صاحب کا نام بھی اس فہرست میں لانا بھول گیا حالانکہ ان کا تعاون بالکل تازہ تھا، والد ماجد کی کتاب ”الفیہ الحدیث“ میری دیکھی ہوئی تہمتی اور نہ کام کے وقت دستیاب ہو سکی، تو وہی اس سے بالواسطہ واقفیت کا ذریعہ بنے، کہ استاذ حدیث ہونے کی بنا پر واقفیت رکھتے تھے۔ اور اس طرح یہ کتاب بھی سلسلہ تالیفات میں متعارف ہو سکی۔

عقیق الرحمن - لاڈ

لندن ۹ اپریل ۲۰۱۳ء

الرحمن

پہلا باب (وطن، خاندان، پیدائش، تعلیم)

وطن مالوف

جمہوریہ ہند کی شمالی ریاست اتر پردیش (یوپی) کا ایک قدیم مشہور و معروف قصبہ سنجل آپ کا آبائی وطن ہے، ہند کے پایہ تخت دہلی سے ۱۶۰ کلومیٹر بجانب شمال۔ یہ نہ صرف قدیم بلکہ تاریخی بیانات کے مطابق ملک کی قدیم ترین اور اہم ترین آبادیوں میں سے ایک ہے۔ اور بڑی دھارک اہمیت بھی رکھتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں مسلم غلبہ کے بعد رفتہ رفتہ غالب مسلم اکثریت کی آبادی میں بدل گئی۔ سیاسی طور پر بھی مسلمانوں ہی کا وزن زیادہ رہتا ہے۔ میونسپل بورڈ کا چیرمین ہمیشہ مسلمان۔ اقتصادی طور پر بھی مسلمان خاصی اچھی حیثیت میں ہیں۔ اب تک تو یہ صرف ایک قصبہ، اور ضلع مراد آباد کی ایک تحصیل کی حیثیت رکھتا رہا ہے، البتہ اب ضلع بن گیا ہے۔ گزشتہ ہندو عہد اور پھر مسلم عہد دونوں میں، اس کی بڑی حیثیت رہی ہے۔ یہ اُس معروف ہندو حکمران، پرتھوی راج، کا پایہ تخت تھا کہ شہاب الدین غوری کے ہاتھوں جس کی شکست (۱۱۹۲ء) کے بعد ہندوستان میں مسلم عہد شروع ہوا۔ اُس زمانہ میں مراد آباد نام کی کوئی جگہ نہیں تھی، اس نام کا شہر عہد مغلیہ میں شاہجہاں کے دور حکومت سے وجود میں آیا۔ نام بھی شہادت دے رہا ہے کہ یہ مسلم عہد کی یادگار ہے، اور مراد آباد گزیٹر کے مطابق اس نام کی ایک دلچسپ کہانی ہے کہ یہ سرزمین جواب مراد آباد کہلاتی ہے اصلاً کٹھیر کہی جاتی تھی اور کچھ شورش پسند ہندو قبائل کا مرکز تھی۔ شاہجہاں نے ان کی سرکوبی کے لئے اپنے ایک رستم نامی کمانڈر کو بھیجا۔ رستم نے اس شورش کا قلع قمع کر کے اس علاقے کا نام رستم نگر ٹھیرایا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی تو یہ خود مختارانہ جرأت لائق بدشعور ٹھیری۔ نتیجے میں رستم نے شہر کا نام شہزادہ مراد کے نام پر مراد آباد بنا کر عزت بچائی۔

سنجھل کا علمی مقام

مغلیہ عہد جو بابر کی فتوحات (۱۵۲۶ء) سے شروع ہوتا ہے، اس کے بارے میں یہ معروف حقیقت ہے کہ سنجھل اس عہد کے آغاز ہی میں شہزادہ ہمایوں کی جاگیر قرار پایا تھا۔ عہد اکبری میں اسے صوبہ دہلی کی تین سرکاروں (کمشنریوں) میں سے ”سرکار سنجھل“ کے مرکزی مقام کا درجہ حاصل ہوا۔ اس ’سرکار‘ میں موجودہ مراد آباد اور ارد گرد کے مزید کافی علاقے شامل تھے۔ مراد آباد گزیٹ کے مطابق، سنجھل کی یہ حیثیت عہد شاہجہانی میں مراد آباد نامی شہر وجود میں آنے پر اس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مغلوں سے پہلے سکندر لودھی نے تو اسے اپنا پایہ تخت ہی بنائے رکھا تھا۔ اور کسی مقام کی ایسی شانہ منزلت اہل علم کو خوب راس آتی ہے۔ اس دور کا سنجھل بھی اس کی شہادت دیتا ہوا ملتا ہے، بقول مؤلف تاریخ سنجھل (احسن التواریخ) غلام احمد شوق فریدی:

”قدیم ہندو عہد کی طرح مسلم دور حکومت میں بھی سنجھل برصغیر کا اہم علمی و سیاسی مرکز رہا اور لودھی فرمانرواؤں سے لیکر مغل حکمرانوں تک تاریخ میں کہیں بھی اس کی عظمت و مرکزیت مدہم پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔“

اور اس کے لئے شہادت میں فریدی صاحب پھر میسوں موقر اہل علم نام بنام مع تعارف گناتے ہیں۔ اس میں سے چند نام تھوڑے تھوڑے تعارف کے ساتھ، یہاں ملاحظہ ہوں:

شیخ حمید الدین مفتر

شیخ حمید سنجھلی عہد ہمایوں کے ممتاز عالم تھے، مصنف ”تذکرہ علمائے ہند“ نے انھیں ”علامہ زمان و یکتائے دوراں“ لکھا ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر اور اس کے اسرار و رموز پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ ہمایوں کو ان سے بحد عقیدت تھی، وہ بھی اسے عزیز رکھتے تھے۔ ایک دن یہ کہہ کر اس پر ناراض ہوئے کہ میں نے تمہارے سپاہیوں کے نام یار علی، کشف علی اور حیدر علی پائے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ یار ان پیمر (علیؑ) کے نام پر اس کا نام ہو۔ محرم ۹۸۳ھ (مطابق ۱۵۷۴ء) سنجھل ہی میں وفات پائی۔

شیخ محمد کنبور سنجھلی

اپنے زمانے کے ممتاز و معروف عالم تھے۔ قادر یہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خود بھی صوفی منش تھے۔ علوم و فنون کی تحصیل میں دیگر اکابر سنجھل کی طرح ریاضت سے کام لیا۔ ملا عبد القادر بدایونی نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ۹۸۵ھ (مطابق ۱۵۷۶ء) میں وفات پائی۔

شیخ تاج الدین سنہلی

۹۵۳ھ میں سنہلی میں پیدا ہوئے اور علوم شرعیہ پر دسترس حاصل کر کے باطنی اصلاح کے لئے شہرہ آفاق بزرگ خواجہ باقی باللہ سے رجوع کیا، اور سلوک کی تکمیل کے بعد ان سے خلافت بھی حاصل کی، حضرت مجدد الف ثانی بھی انہیں (خواجہ صاحب) کے مجاز اور آپ کے پیر بھائی ہیں۔ نناوے سال کی عمر پر ۱۰۵۱ھ میں انتقال فرمایا۔

شیخ حاتم سنہلی

مغلیہ دور میں ہندوستان کے چوٹی کے عالم تھے، علم و فضل میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، اور حدیث و فقہ میں اتنی گہری نظر تھی کہ مشہور مؤرخ ملا عبد القادر بدایونی نے انہیں اپنے وقت کا ابو حنیفہ قرار دیا ہے، ان کے کتب خانے میں دیگر فنون کے علاوہ صرف فقہ کے موضوع پر ہی سات ہزار سے زائد کتابیں موجود تھیں، سنہلی میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ ۴۰ سال تک ایسا فاضلانہ درس دیا کہ پورے ملک میں اس کی گونج سنائی دی، اور دور دراز خطوں سے آ کر طالبان علوم نبوت نے اس یکتائے زمانہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، عثمان شاہ بنگالی، ابوالفتح خیر آبادی، عبد القادر بدایونی اور سید محمد کمال امروہی، آپ کے شاگرد ہیں، اور اکبری دربار کا منہ چڑھاؤ زیر ابوالفضل بھی اسی فہرست میں داخل ہے، وہ عرصہ دراز تک سنہلی کے قاضی اور مفتی رہے، ۹۶۹ھ میں وفات ہوئی خود اپنے ہی آباد کردہ محلے حاتم سرائے میں مدفون ہیں، اور قبر بھی آج تک محفوظ ہے۔

سید کمال سنہلی

آبائی وطن امروہہ ہے، لیکن ان کے آباء واجداد نے سنہلی میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۰۱۰ھ کو سنہلی میں پیدا ہوئے، نہایت بلند مقام کے حامل تھے، ان کی کتاب ”اسرار یہ“ مخطوطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آپ کے علم و فضل کی شہادت دیتی ہے اور بعض ایسی شخصیات کے احوال پر بھی روشنی ڈالتی ہے جن کی بابت دوسرے تاریخی مصادر خاموش ہیں مشہور مؤرخ ملا عبد القادر بدایونی نے موصوف سے امروہہ میں ملاقات کی اور اپنی مشہور کتاب ”منتخب التواریخ“ میں ان کا نہایت عقیدت و تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ گیارہویں صدی ہجری کے آخر میں انتقال ہوا، چودھری سرائے (سنہلی) میں کہیں لب سرک دفن ہیں۔

مولانا خلیل احمد

قدیم اسرائیلی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، علم و فضل کی بلندیوں کے علاوہ باری تعالیٰ نے انہیں

فطرت کی پاکیزگی، اخلاق کے حسن اور قناعت جیسے بلند صفات سے بھی نوازا تھا، آپ کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا، ہندوستان کی عظیم شخصیت سمجھے جاتے تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک تدریس کے فرائض انجام دیئے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی شہرہ آفاق تصنیف ”حجتہ اللہ البالغہ“ کا ”آیۃ اللہ الکاملہ“ کے نام سے وقیع اور بلیغ ترجمہ کیا، ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۰ھ کو مولانا کا انتقال ہوا۔

مولانا عبد الوحید

۱۲۹۲ھ میں سرائے ترین میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر لاہور تشریف لے گئے اور وہاں کئی سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں انہوں نے دورہ حدیث کیا، فراغت کے بعد سنبھل، امرتسر، فتح پور، دہلی، دارالعلوم مئو، شاہی مراد آباد اور مظاہر علوم سہارنپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، شاگردوں کی فہرست میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا، حضرت مولانا اسعد اللہ ناظم مظاہر علوم، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا نادر لیس کا ندھلوی اور مولانا عبد الرحمن کیمپوری جیسے نابغہ روزگار علماء نظر آتے ہیں۔

مولانا محمد حسن

والد شیخ ظہور الحسن ہیں، اسرائیلی خاندان میں پیدا ہوئے، تعلیم سنبھل کے بعد رامپور میں حاصل کی، قوتِ حفظ، ذہانت و فقاہت، تحقیق و سلاست، اور علم و فضل میں اپنے عہد کی مسلم شخصیت تھے، انہوں نے مسند احمد، مسند ابی حنیفہ، ہدایہ، شرح عقائد، اصول الشاشی اور طحاوی پر تعلیق و حواشی کے علاوہ مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ وفات ۱۳۰۵ھ۔

مولانا مراد اللہ انصاری

بارہویں صدی ہجری کے علماء میں ہیں، قدیم انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، نسبی سلسلہ شیخ عزیز اللہ تلبنی تک پہنچتا ہے، علم و فضل میں بلند مقام حاصل تھا خلافت مرزا مظہر جان جانا شہید سے حاصل کی۔ وہ بزرگوار کے بایں حیثیت ایک منفرد عالم ہیں کہ اردو زبان میں انہیں سب سے پہلے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا شرف حاصل ہوا جو ”خدائی نعمت“ کے نام سے مختلف ادوار میں طبع ہوتی رہی ہے، یہ صرف تیسویں پارے پر مشتمل ہے۔

مولانا عبد المجید سنبھلی

(یہ نام احسن التواریخ میں نہیں پایا جاتا ہے جو بڑی بھول ہے۔ اس لئے اس کا اضافہ ہم نے کیا ہے) ۱۸۶۰ء میں محلہ دیہا سرائے میں پیدا ہوئے۔ سنبھل کے جید علماء میں آپ کا شمار تھا۔ حضرت صاحب

سوانح نے بھی منطق و فلسفہ کی ایک دو کتابیں مدرسہ سے باہر آپ سے پڑھی تھیں۔ اور آپ ہی کا بیان ہے کہ حضرت مولانا (اور آگے مذکور، مولانا کریم بخش صاحب) کی علمی شہرت اس پائے کی تھی کہ غیر ممالک کے شوقین طلبہ آپ دونوں حضرات سے استفادہ کے لئے آتے تھے، لیکن علم اور شہرت کے باوجود بود و باش میں سادگی اس درجہ کی تھی کہ آج اس پر یقین کیا جانا مشکل۔ طویل عمر پاکر ۱۹۵۲ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا مبارک حسین

۱۸۷۸ء میں دیپا سرائے میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر دیوبند میں داخلہ لیا۔ اساتذہ میں حضرت شیخ الہندؒ اور علامہ کشمیریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف ذہین، الوالعزم اور کامیاب مناظر تھے، انہوں نے خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جمعیتہ العلماء کی مجلس عاملہ کے بھی رکن رہے، سنبھل کی مشہور ”انجمن معاون الاسلام“ کے بانی مہمانی آپ ہی تھے۔ ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

مولانا کریم بخش

آپ حضرت شیخ الہندؒ کے لائق شاگرد، دیوبند کے بلند مقام فاضل اور درسیات پر مکمل عبور رکھنے والے عالم تھے۔ انہوں نے مدرسہ عبدالرب دہلی اور دارالعلوم ممبئی میں ایک عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ انہی کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھے اور محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے حدیث کی بیشتر کتابیں انہیں سے پڑھی ہیں۔ خوب طویل عمر اللہ نے عنایت فرمائی ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء سال وفات ہے۔

مولانا محمد حیات

۱۸۷۶ء کو سرائے ترین (سنبھل) میں پیدا ہوئے، والد کا نام ملاظہور تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر دیگر مدارس میں ثانوی مراحل طے کئے اور ۱۸۹۶ء میں وہ مظاہر علوم سے فارغ ہوئے حضرت مولانا غلیل احمد نہاجر کی آپ کے استاذ اور مولانا محمد زکریا ساتھی تھے۔ برسہا برس تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۷۵ء میں حیات العلوم مراد آباد کی بنیاد رکھی۔ علماء اور طلبہ کی بڑی تعداد نے مولانا سے استفادہ کیا۔ ۱۹۸۷ء میں بھرم ۱۱ سال انتقال ہوا۔

اس فہرست میں آخر کے متعدد علماء دورِ شاہانہ گزر جانے کے بہت بعد کے ہیں۔ اور ان میں پہلے تین (مولانا عبد المجید صاحب، مولانا مبارک حسین اور مولانا کریم بخش) صاحب سوانح کے محلق سے تعلق رکھتے

ہیں، نیز جیسا کہ آگے معلوم ہوگا حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ تو صاحب سوانح کے خاص الخصاص استاد اور مربی رہے ہیں۔ ان حضرات کے زمانے کے متعلق حضرت صاحب سوانح کا قول ہے کہ اس زمانہ میں اکابر علماء و اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد سنبھلی میں تھی کہ نہ صرف صوبہ یوپی بلکہ پورے ہندوستان میں ایک شرف امتیاز حاصل تھا۔

اور اب کا سنبھل!

تو یہ شاہانہ دور کا سنبھل تھا، بعد میں اپنی سابقہ عظمتوں کا مزار بنی ایک پسماندہ قسم کی بستی رُہ گئی۔ اور کافی وقت لگا کہ اس کی عظمت رفتہ کے کچھ نشان پھر زندہ ہوں، اس کا آغاز مولانا مبارک حسین صاحب کی نسل سے ہوا۔ ان کی قائم کردہ انجمن معاون الاسلام برسوں بڑی جاندار انجمن رہی۔ سالانہ جلسے ہوتے تھے اور اکابر دیوبند میں کوئی بچا نہیں جس کے درودِ مسعود کا اعزاز اس بستی کو نہ ملا ہو۔ پھر ایک زمانہ اس انجمن پر ایسی بد حالی اور کسمپرسی کا گزرنے بعد، کہ کوئی صاحب علم دیکھے تو قرآن پاک کی آیت: اَنّٰی یُنٰحِیْ ہٰذِہَ اللّٰہُ بَعِیْذُہُمْ بِہَا کا قصہ یاد آنے لگے۔ اس کی شاندار حیات نو کا انتظام الحمد للہ ہوا۔ اور یہ حضرت صاحب سوانح ہی کے گھر سے، جس کی قدرے تفصیل آگے ایک موقع پر آئے گی، الغرض سنبھل کی مغربی سمت کا آخری محلہ جو دیہہ سرائے کے نام سے معروف ہے تمام تر مسلم آبادی پر مشتمل۔ اور یہ آبادی پوری کی پوری اُس ایک برادری کی ہے جو ”ٹرک“ کہلاتی ہے، اور مغربی یوپی کے متعدد اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس برادری کا سلسلہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی اولین فاتحانہ آمد (۱۱۹۳ء) سے جڑتا ہے۔ یعنی وہ وقت جب شہاب الدین غوری کو اپنی دوسری مہم میں کامیابی میسر آئی، اور اس کے غلام قطب الدین ایک سے یہاں مسلم حکومت کا آغاز ہوا۔ مراد آباد گز بیڑ کے مطابق امر وہہ اور سنبھل خود ایک کے مفتوحہ مقامات میں سے ہیں۔

خاندانی ماحول

اسی ترک برادری میں ایک گھرانہ حاجی سعد اللہ صاحبؒ کا تھا، جو قریب کے دیہات سے یہاں منتقل ہوا تھا۔ صاحب سوانح انہی حاجی سعد اللہ صاحب کے منجھلے بیٹے صوفی احمد حسین صاحب کی اولاد میں ہیں۔ حاجی سعد اللہ صاحب مرحوم نے تین بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں تھیں۔ بیٹوں میں صوفی احمد حسین

(۱) یہ ابھیاء بنی اسرائیل کے ایک نبی (علیہ السلام) کا قول ہے (البقرہ ۲۵۹) اپنے ایک شہر پر گزر رہا تھا کہ جو چھوٹوں کے بل گرفتار ہو چکا تھا، اسے دیکھ کر بڑی حسرت سے فرماتے ہیں: اسے کیونکر اب ایک نئی زندگی مل سکتی ہے؟ اور پھر اللہ نے دکھایا کہ اس کی قدرت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ (یہ غالباً بیت المقدس تھا جو دشمنوں کی تاخت و تاراج سے تباہ ہوا پڑا تھا)

صاحب بچھے تھے۔ بڑے بھائی شیخ محمد اسماعیل صاحب تھے (متوفی ۱۹۵۴ء بمطابق ۹۴ سال) اور چھوٹے مولوی حکیم محمد ایوب صاحب (م ۱۹۳۶ء بمطابق ۶۷ سال) حاجی سعد اللہ صاحب ایک خوشحال تجارت پیشہ اور دیندار مسلمان تھے۔ آن مرحوم کی مادی وراثت تو ان کی سب اولاد کو حسب حصہ پہنچی، لیکن ان کی کاروباری دلچسپی اور گہرے دینی رجحان کے لئے ان کے بچھے بیٹے (احمد حسین صاحب) کی قسمت ہی یاوری کر سکی۔ ایک طرف ان کے گہرے متصوفانہ رجحان کی بنا پر صوفی ان کے نام کا جزو ٹھہرا، دوسری طرف والد مرحوم (حاجی سعد اللہ صاحب) کے زمانے کی خوشحالی ان کے ہاتھوں اضافاً مضاعف ہوئی۔ حضرت صاحب سوانح نے اپنی کتاب ”تحدیثِ نعمت“ میں اپنے والد صوفی احمد حسین صاحب کے بارے میں فرمایا ہے کہ

والد ماجد صوفی احمد حسین صاحب

میرے والد (صوفی احمد حسین صاحب مرحوم) ایک متوسط درجے کے دولتمند تھے۔ زمینداری بھی اچھی خاصی تھی اور تجارتی کاروبار بھی خاصا وسیع۔ اور اس میں اچھے کامیاب۔ اسی کے ساتھ ان کی فکر آخرت فکر دنیا پر غالب تھی۔ اور وہ کاروبار میں پوری مشغولی کے ساتھ ”الذاکرین اللہ کثیراً“ (اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے بندوں) میں سے تھے۔ مختلف اوقات میں جو اذکار ان کے مستقل معمولات میں داخل تھے ان کی مجموعی تعداد میں ہزار کے قریب تھی۔ ایک زمانے میں رات کو بعد نمازِ عشاء کھڑے ہو کر چار ہزار بار درود شریف کا معمول تھا۔ تہجد کے ایسے پابند تھے کہ میں نے ان کے انتقال کے بعد والدہ ماجدہ مرحومہ سے پوچھا کہ کیا ابھی کا تہجد قضا ہوتا آپ کے علم میں ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ ہاں کبھی بہت عرصہ پہلے ایسا ہو جاتا تھا لیکن اس دن لازماً روزہ رکھتے تھے۔ مگر تیس سال سے غالباً تہجد قضا نہیں ہوا۔ والد ماجد نے ماہ رمضان ۱۳۶۵ھ (مئی ۱۳۶۵ء) میں ایسے حال میں انتقال فرمایا کہ ہاتھ میں تسبیح تھی اور ذکر جاری تھا۔“

”تحدیثِ نعمت“ میں بہت اختصار ہے۔ کما جہ تفصیل آپ کے اس مضمون میں ملتی ہے جو حضرت دادا جی مرحوم کے انتقال پر الفرقان (رمضان مبارک ۱۳۶۵ھ) میں پر آپ نے تحریر فرمایا، اور جو الفرقان کی اشاعت خاص ”وفیاتِ نمبر“ (اپریل مئی جون ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے۔ مثال کے طور پر ”تحدیث“ کے مذکورہ بالا اقتباس میں نمازِ عشاء کے بعد درود شریف کا جو معمول ایک زمانے میں بتایا گیا ہے، ۶۷ھ کے مضمون میں اس کے ضمن میں مزید یہ بھی درج ہوا تھا کہ

”۔۔۔۔۔ ذکر فرماتے تھے کہ انہی ایام میں ایک دن پڑھتے پڑھتے ایک خفیف غنودگی سی

طاری ہوئی اور ایک ایسی حالت ہو گئی کہ جو نہ نیند تھی نہ پوری بیداری، اسی عالم میں حضور (ﷺ) کی زیارت نصیب ہوئی اور حضور نے مجھے دو رکعات (پلٹیں) عطا فرمائیں، ایک مٹی کی اور ایک چاندی کی۔ فرماتے تھے کہ میں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مٹی کی رکابی دینا ہے اور چاندی کی رکابی دین ہے، اور مجھے یہ دونوں عطا ہوں گی۔ پھر فرماتے تھے دنیا تو الحمد للہ خوب مل گئی، اللہ تعالیٰ نے گزارے کا پورا سامان دے رکھا ہے لیکن دین ابھی نصیب نہیں ہوا، شاید میری اولاد میں کوئی ”شام کی اڑان کا“ پیدا ہو جائے اور یہ بشارت اسکے ذریعہ پوری ہو جائے۔“ (یہ شام کی اڑان کا کبوتر بازی کی اصطلاح ہے، جس کا مطلب ہے وہ کبوتر جو صبح کو اڑے اور پھر دن بھر اڑتا ہی رہے شام ہونے پر اپنے اڈہ پہ اترے، اُن زمانہ میں شہر اور محلہ میں کبوتر بازی کا خوب رواج تھا۔ اور اس کی یہ اصطلاح ایک عام محاورہ بن گئی تھی۔ اب بھی کبھی کبھی اس کا استعمال سننے میں آ جاتا ہے۔ ع)

الغرض، اللہ کی یاد میں اس دلچسپی نے آپ کے والد ماجد کو دنیوی طمطراق سے بالکل بیگانہ رکھا تھا۔ زندگی اس قدر سادہ تھی کہ مثالی کہی جاسکتی ہے۔ تاہم عزت و وجاہت بھی اللہ کی دین سے ایسی حاصل تھی کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی جو اُن کے محلے میں قدم رکھتا لازم تھا کہ ان کے دروازہ پہ تھوڑی دیر ضرور بیٹھے۔ ”دروازہ“ بھی قدرت نے انھیں کرم سے ایسی جگہ عطا فرمایا تھا کہ بستی میں داخلے کی شاہراہ پر سب سے پہلے وہی پڑتا تھا اور ممکن نہ تھا کہ کوئی آدمی نظر چرا سکے۔ اور دروازہ تھا بھی ایسا نہیں کہ کسی بڑے آدمی کو شاہان شاں نہ لگے۔ یہ ایک ایسی بڑی حویلی کا صدر دروازہ تھا جس میں کبھی ہاتھی بندھتا تھا۔ ہاتھی خانہ کے نام سے باقاعدہ ایک حصہ اس میں ابھی چند سال پہلے تک موجود تھا۔ (جواب اس کے مکینوت کے درمیان تقسیم کی نذر ہو گیا) حضرت دادا صاحب (صوفی احمد حسین صاحب) نے یہ حویلی ایک پڑانے رئیس خاندان سے خریدی تھی۔ مگر یہاں تو تصوف تھا، ہاتھی سے وابستہ شان و شوکت کا کہاں گزر؟ بس ہاتھی خانہ ہی رہا۔ اور جب تک موجود رہا کچھ مختلف ضرورتوں کے استعمال میں آتا رہا۔

دنیا پر ترجیح دین کی یادگار مثال!

یاد حق سے وابستگی کی اس کیفیت نے دین کے مقابلہ میں دنیا کی کیا حیثیت ان کی نظر میں کر رکھی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے خود صاحب سوانح سے تعلق رکھنے والے ایک سبق آموز واقعہ کا ذکر کافی ہوگا۔ جس کا ذکر ہمیں صاحب سوانح سے آپ کی ابتدائی طالب علمی کے بیان میں ملتا ہے:

دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے ایک تقریر (جمادی الاخریٰ ۱۳۹۰ھ) میں اپنی عربی فارسی کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتدائی سات سال ایسے گزرے کہ تقریباً ہر سال مدرسہ بدل جاتا تھا اور وہی کتابیں (میزان مشعب وغیرہ) پھر سے شروع ہو جاتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ میری عمر اتنی کم تھی کہ صرف ونحو کی کتابیں سمجھنے کے لائق نہیں تھا۔ اس چیز نے بددلی اور بدشوقی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس بات کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ

”اسی زمانے میں جبکہ میری عمر قریباً بارہ سال ہو چکی تھی ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ہمارے ضلع مراد آباد کے انگریز کلکٹر نے جو کسی خوش گمانی کی بنا پر میرے والد ماجد کا بہت قدر شناس تھا ایک ملاقات میں والد ماجد سے ان کی اولاد کے بارے میں پوچھا، والد نے بتایا کہ خدا کے دئے ہوئے میرے پانچ لڑکے ہیں۔ اس نے تعلیم کے بارے میں دریافت کیا تو اسے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ اور نہ کوئی اب انگریزی پڑھ رہا ہے۔ اُس وقت میری عمر اور تعلیم کی منزل ایسی تھی کہ میرے ہی بارے میں اس طرح کا فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ کلکٹر نے اصرار سے کہا کہ کل ہی اس بچے کو مقامی ہائی سکول بھیج دیا جائے اور ساتھ ہی کہا کہ میں ہیڈ ماسٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ پانچ سال میں انٹریس کرادے اور والد سے کہا پھر میں اس کو نائب تحصیلداری دے دوں گا۔ اُس زمانے میں نائب تحصیلداری بڑی چیز تھی، پہلی ترقی کر کے آدمی تحصیلدار ہو جاتا تھا اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر۔ بس یہی ہندوستانیوں کی معرّج تھی۔ اس سے آگے کلکٹر اور کمشنر تو صرف انگریز ہوتے تھے۔ تو کلکٹر نے والد صاحب کو بہت اصرار سے یہ مشورہ دیا۔ والد صاحب نے گھر میں آکر یہ قصہ سنایا اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ انھوں نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن ان کے بعض ملنے والوں اور گھر کے بھی بعض لوگوں کی رائے ہوئی کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے والد صاحب کو اس کے لئے راضی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ ان کا آخری جواب یہ تھا کہ ”مجھے اللہ تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ اپنی اولاد سے مجھے کچھ لینے کی ضرورت نہ ہوگی، ان شاء اللہ میں ان کو ہمیشہ کھلاتا اور دیتا رہوں گا۔ ہاں مرنے بعد قبر میں مجھے ضرورت ہوگی، اس لئے میں تو ان کو وہی تعلیم دلانے کی کوشش کروں گا جس سے مجھے قبر میں اور اس کے بعد کچھ ملتا رہے۔“ الغرض انھوں نے کسی کی ایک نہیں سنی۔“

(۱) ضلع مراد آباد کی مشہور شخصیت سر رضا علی مرحوم (م ۱۹۴۴ء) نے اپنی سوانح حیات ”اعمال نامہ“ میں ان کلکٹر صاحب کا نام مسٹر جے۔ یو۔ لپٹن لکھا ہے اور ان کی خصوصیات میں ذکر کیا ہے کہ ہندوستانیوں سے خوشگوار تعلقات رکھتا اور بااثر ہندوستانیوں کی عزت کو اپنا فرض اور سلطنت کی خیر خواہی سمجھتے تھے۔ (صفحہ ۳۰۴)

(حقیقت تو اللہ ہی جانے، پر دل کہتا ہے کہ اوپر جو آپ کے بعد عشاء درود شریف کے معمول کے ذکر میں ایک دن حضور ﷺ کی زیارت اور اس میں سونے اور چاندی کی دور کا بیان عطا ہونا مذکور ہوا ہے جس کی تعبیر آپ کے دل نے دین اور دنیا دونوں عطا کئے جانے سے کی، اور دین کے حوالہ سے اس کو آپ نے اس بات کی بشارت سمجھا کہ اللہ آپ کی اولاد میں کوئی ”شام کی اڑان کا“ پیدا فرمائے گا، سو، دل یہ کہتا ہے کہ یہ قابلِ صدر شک بشارت دنیا پر دین کی اس درویشانہ ترجیح ہی کا صلہ رہی ہوگی کہ کلکٹر صاحب کی اس غیر معمولی دنیاوی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کے خیال کو بھی آپ کے دل میں راہ نہ ملی۔ اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ٹھیکرا ہی سمجھا۔ واللہ، کیا لوگ تھے! کیا نشانات راہِ مثبت کر گئے، اَللّٰهُمَّ بَرِّدْ مَضْجِعَهُ وَاعْغِلْ دَرَجَتَهُ وَاحْشُرْهُ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ۔

اہلِ قرابت اور ارباب حاجت کی حق شناسی

یادِ حق کے ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال انھیں کم نہ تھا۔ ان کی وفات پر لکھے گئے حضرت صاحبِ سوانح کے مضمون میں آتا ہے:-

”انکی زندگی کی ایک قابلِ قدر خصوصیت صلہ رحمی بھی تھی۔ قرابتداروں میں اگر کوئی ضرورت مند ہوتا تو برابر اس کی خدمت کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خاندان کا کوئی بوڑھا بیمار ہے اور اس کے گھر والے اس کی اچھی خبر گیری نہیں کر رہے یا اپنے حالات سے مجبور ہیں تو والد ماجد ان کو اپنے گھر لے آئے۔۔۔“

”فقراء و مساکین اور عام سائلین کو دینے میں ان کا ہاتھ جتنا کھلا ہوا تھا اور اللہ نے اس کا جو حوصلہ دیا تھا (اللہ کے مخصوص ترین بندوں کو مستثنیٰ کر کے) کم از کم میں نے اس کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کوئی سائل آیا اور ہماری نظر میں وہ مستحق نہیں ہے اور ہم نے اپنی یہ رائے ظاہر بھی کر دی لیکن وہ اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیدیتے تھے۔ کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس کرنا ان کا اصول نہ تھا۔۔۔“

”انتقال سے کچھ ہی روز پہلے کا واقعہ ہے کہ اپنے ہی شہر کے ایک دوسرے محلہ کے ایک صاحب تشریف لائے اور کچھ حاجت ظاہر کی۔ والد نے کسی بچے سے فرمایا کہ گھر میں ایک روپیہ یاد روپیہ کا نوٹ ہوتو لے آؤ (واضح رہے کہ یہ اُس زمانہ ۱۹۳۷ء/۱۳۵۷ھ) کے روپیہ دورو پے کی بات ہے۔ آج کی نہیں، ع) بچہ والدہ ماجدہ کے پاس آیا۔ اتفاق سے اس وقت ایک یاد روپیہ والا کوئی نوٹ موجود نہ تھا۔ بچے نے آکر یہی عرض کر دیا۔ فرمایا اچھا پانچ روپیہ کا ہو تو لے

آؤ۔ اتفاقاً پانچ روپیہ کا بھی کوئی نوٹ موجود نہ تھا۔ والدہ نے اس سے کہہ دیا کہ پانچ کا بھی نہیں ہے دس کا ہے۔ بچے نے آکر یہی عرض کر دیا۔ فرمایا اچھا دس کا ہی لے آؤ۔ چنانچہ بچہ دس کا نوٹ والدہ ماجدہ سے لے گیا اور والد ماجد نے وہی نوٹ ان صاحب حاجت سائل کو دے دیا۔ اور گھر میں آکر فرمایا کہ میں تو ایک یا دو روپیہ ہی دینا چاہتا تھا لیکن کیا کیا جائے اس کی قسمت میں دس ہی تھے۔

”ہر سال گھر کے خرچ کے اندازہ کے علاوہ صرف فقراء و مساکین کے لئے غلہ کی ایک مقدار ضرور رہتی تھی، حتیٰ کہ اگر اپنی کاشت کی پیداوار میں اتنی منگوائش نہ ہوتی تو خرید کر رکھا جاتا۔ خاص قسم کے ان سالکوں کے ماسوا جو روپیہ ہی کے سائل ہوتے اکثر اہل حاجت کو وہ غلہ ہی دلواتے تھے۔ اور جس کو بھوکا سمجھتے حتیٰ الامکان اس کو پکا پکا کھانا کھلاتے تھے۔ ہمیشہ کی عادت تھی کہ گھر میں آکر بار بار تاکید فرماتے کہ سالن میں پانی زیادہ ڈالو، تاکہ وقت پر کوئی آجائے تو کمی نہ پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ حاجتمندوں اور مسافروں کو کھانا کھلانے کا اللہ تعالیٰ نے جو وصلہ والد ماجد کو دیا تھا اور اس میں ان کو جوازت آتی تھی وہ اس دور میں اگلے زمانوں کے قصوں کا ایک نمونہ تھا۔“

حضرت صاحب سوانح کی تحریر ہمارے دادا جی مرحوم کی زندگی کے صرف دینی و اخلاقی پہلوؤں تک محدود رہی ہے۔ جبکہ اللہ نے گھرے دینی رجحان کے ساتھ آپ کو دنیوی معاملات کے فہم اور تہقیق سے بھی اس حد تک نوازا تھا کہ کم از کم اس کی ایک مثال ضرور ذکر میں لے آئی جانی چاہئے۔ ۱۹۳۶ء میں انڈیا ایکٹ کے ماتحت جوائنکشن ہوا۔ اور اس میں کانگریس نے بڑی کامیابی حاصل کی، جس کے انتخابی منشور کی اہم ترین دفعہ خاتمہ زمینداری تھی۔ تو آپ نے آنے والے دنوں میں زمینداری کے خاتمہ کو ایک یقینی چیز سمجھتے ہوئے اپنی زمینوں میں سے اتنی زمینیں اپنی ذاتی کاشت میں لے لینے کا فیصلہ فوراً کر لیا جتنی پر آپ سمجھتے تھے کہ خود کاشت کی جاسکے گی۔ جبکہ حملہ کے دیگر زمینداروں نے بالعموم اس ہونے والی کو خاطر میں لانے کے قابل نہ سمجھا۔ وہ اپنی زمیندارانہ سوچ ہی کے اسیر رہے کہ بھلا ان سے بھی بڑی کوئی چیز ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ دادا صاحب مرحوم نے اپنی وراثت میں سینکڑوں ایکڑ زمین اولاد کے لئے چھوڑی جبکہ دوسرے اپنی قسمت کا تماشا دیکھتے رہ گئے اور ان کی اولادیں ناگفتہ بہ دن دیکھنے کے لئے رہ گئیں۔

الغرض یہ تھے صوفی احمد حسین صاحب جن کے گھر میں آپ نے آنکھ کھولی۔ آپ کی والدہ ہمارے

دادا صوفی احمد حسین صاحب کی دوسری اہلیہ تھیں، اور آپ اُن سے اپنے والد ماجد کی پہلی اولاد۔ آپ سے بڑے دو بھائی، غلام امام اور محمد حسن صاحب اور ایک بہن ہماری بڑی دادی صاحبہ مرحومہ سے تھے۔ اپنی والدہ سے آپ چھ بھائی بہن ہوئے۔ خود آپ، پھر، علی الترتیب، محمود حسین، حلیمہ بیگم، محمد احسن، ساجدہ بیگم، محمد عارف۔ راقم سطور (مرتب سوانح) نے سوائے محمد عارف صاحب کے، کہ وہ بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے، اور سب کو پایا اور اچھی طرح دیکھا۔ صرف ایک، چچا محمود حسین صاحب تھے جن کو زیادہ دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ راقم کی عمر پندرہ سال بھی نہ تھی کہ ایک مختصر علالت میں انتقال فرما گئے۔ یہ ۱۳۶۱ھ کی بات ہے۔ بہنوں کو چھوڑ کر، دوسرے سب بھائیوں نے اللہ کے فضل سے اپنے باپ دادا اور تایا چچا والی عمر پائی، کہ وہ سب بالعموم اسی کے آس پاس کی عمر پانے والے بزرگ تھے۔ سب سے بڑے بھائی شیخ غلام امام صاحب، ان سے چھوٹے مولانا محمد حسن صاحب اور سب سے چھوٹے مولانا حکیم محمد احسن صاحب سبھی اسی سے اوپر کاسن پا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور سب سے آخر میں حضرت صاحب سوانح ۷ اذی الحجۃ ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۹۷ء شنبہ کو (قرری حساب سے ۱۹۴ اور ششی حساب سے ۹۲ سال کی عمر) میں۔ غفر اللہ لہ۔

پیدائش

سنہ ۱۳۲۳ھ میں بورڈ کے انڈراجاٹ کے مطابق ۱۸ جنوری ۱۹۰۶ء (مطابق ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ) وہ تاریخ ہے جس میں آپ نے اس خاکدانِ عالم میں قدم رکھا۔ لیکن خود آپ کی ایک تحریر ”میری زندگی کے تجربے“ (مطبوعہ الفرقان ذیقعدہ و ذی الحجۃ ۱۳۶۳ھ) کی رو سے آپ کی پیدائش کا مہینہ شوال (۱۳۲۳ھ) ہے۔ جس کی مطابقت جنوری ۱۹۰۶ء کے بجائے دسمبر ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہے۔ تحریر فرمایا ہے کہ ”اس نامہ سیاہ محمد منظور (عفا عنہ ربہ الغفور) کی عمر بھی اس گزرے ہوئے شوال میں چالیس سال پوری ہو گئی۔“ اس کے مطابق آپ کی پیدائش کا مہینہ شوال ہی ہے نہ کہ ذیقعدہ۔ اور پھر شوال کی مطابقت عیسوی مہینہ دسمبر (۱۹۰۵ء) سے ہوتی ہے نہ کہ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء سے۔ نیز آپ کی زبان سے بھی عیسوی سنہ پیدائش ہمیشہ ۱۹۰۵ء ہی سنا گیا اور یہی آپ کے قلم سے بھی بعض جگہ نکلا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میونسپل بورڈ کے کاغذات میں اندراج کچھ دیر سے ہو پایا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد برہان الدین سنہلی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ایک روایت بھی قابل ذکر ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک صحبت میں ان کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ ”میری تاریخ پیدائش ۱۸ شوال ۱۳۲۳ھ ہے“ اور انھوں نے اس کو نوٹ کر لیا تھا۔ اس بیان سے جہاں

قمری مہینے کی تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے وہاں دسبر کی تاریخ بھی نکل آتی ہے کہ ۱۶ مئی ۱۸۶۰ء ہے۔

تعلیم

ترکوں کی اس آبادی میں بڑی بڑی زمیندار یوں والے، پر شکوہ حویلیوں والے اور دیگر سامان کر و فر والے تھے، مگر تعلیمی لحاظ سے بڑی پسماندگی۔ خود اپنے والد ماجد کے بارے میں حضرت صاحب سوانح نے، بعد وفات والے مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ ”معمولی اردو فارسی جانتے تھے۔“ اُن سے بڑے بھائی شیخ محمد اسماعیل صاحب کے بارے میں ایسی تحقیق سے تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن آں مرحوم کے نواسہ (راقم کے عموزاد) برادر محمد عمر میاں نے میرے سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ تفصیل تو نہیں معلوم لیکن یہ مجھے یاد ہے کہ اردو فارسی کے اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے۔ البتہ سب سے چھوٹے محمد ایوب صاحب کا معاملہ مختلف ہوا۔ انھوں نے پوری دینی تعلیم بھی دہلی کے مدرسہ عبدالرب اور مدرسہ امینیہ سے حاصل کی، اور علم طب کی تحصیل بھی فرمائی۔ سنبھل کے حاذق اطباء میں اُن کا شمار ہوتا تھا، اور علم دین میں راسخ القدم۔ اللہ نے ذہانت و فطانت میں بھی ممتاز کیا تھا، جو اُس دور کے خاص حالات کے زیر اثر بالعموم مناظرانہ رنگ میں کام آئی اور طبابت میں بھی اس نے ان کو ممتاز کیا۔ حضرت صاحب سوانح نے اپنے ان چچا صاحب کا ایک واقعہ اپنی کتاب ”دین و شریعت“ میں درج فرمایا ہے جو ان کی مناظرانہ ذہانت و فطانت کا ایک دلچسپ نمونہ اور ایک کارآمد شے ہے۔ یہ واقعہ ان کے اور مشہور اہل قلم نیاز فتحپوری صاحب (مدیر ”نگار“ لکھنؤ) کے درمیان مکالمے کا ہے۔

”دین و شریعت“ میں درج مکالمہ جو بہت مفصل ہے اس کو قدرے اختصار کے ساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”۔۔۔ وہ سفر میں تھے اور لکھنؤ کے اسٹیشن پر انھیں کسی ٹرین کے انتظار میں دو تین گھنٹے ٹھہرنا تھا، انھوں نے سوچا کہ یہ وقت کسی کام میں لگنا چاہئے، اور غور کرنے کے بعد طے کیا کہ رسالہ نگار کا دفتر تلاش کر کے نیاز فتحپوری صاحب سے ملا جائے اور معجزہ کے بارے میں ان سے گفتگو ہو جس کا ان کو انکار ہے۔ چنانچہ نگار کے دفتر پہنچ گئے، نیاز صاحب موجود تھے، چچا صاحب نے ان سے کہا کہ میں ایک نہایت اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لئے آپ کا ایک گھنٹہ لینا چاہتا ہوں۔ نیاز صاحب نے (شاید ان کی مولویانہ صورت دیکھ کر) پہلے تو اتنا وقت دینے سے انکار کیا، لیکن بالآخر ان کے اصرار اور اُن کی منطق نے انھیں مجبور کر دیا اور وہ متوجہ ہو کر بیٹھ گئے۔ چچا صاحب نے ان سے کہا کہ میں کبھی کبھی آپ کا رسالہ ”نگار“ دیکھتا ہوں، اس لئے آپ کی ذہانت اور آپ کے زور قلم اور آپ کی علمی خصوصیات سے واقف ہوں۔ میں اس

وقت آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اس صلاحیت اور قابلیت کو ایک بڑے اور بہت مفید کام میں لگانے کی آپ سے درخواست کروں۔ اس بڑے اور مفید کام کی وضاحت کرتے ہوئے چچا صاحب نے دنیا میں پھیلی ہوئی برائیوں اور اخلاقی گراؤوں اور معاشرتی پستیوں کا حوالہ دیا کہ کس غیر معمولی حد تک بڑھ گئی ہیں۔ اور فرمایا:

”غرض جو چیزیں انسانوں میں نہیں ہونی چاہئیں وہ سب موجود ہیں۔ اور جو اچھی باتیں ہونی چاہئیں وہ بالکل نہیں ہیں، تہذیب نہیں، شرافت نہیں، امانت نہیں، سچائی نہیں، انصاف نہیں، ایسی حالت میں آپ جیسے اعلیٰ قابلیت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ سب کام چھوڑ کے اس بگڑی ہوئی انسانیت کو درست کرنے پر اپنی ساری قوتیں لگا دیں۔ آپ جیسے حضرات اگر اس کام کے لئے کھڑے ہو جائیں اور جس طرح منصوبے بنا کر قوموں اور ملکوں میں بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں اس طرح اس کام کو آپ کریں تو بہت کچھ سدھار ہو سکتا ہے۔ یہ کام سب سے پہلے اسی لکھنؤ سے شروع کیجئے۔ میں اپنی پوری خدمات آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ امید ہے کہ بس سال دو سال میں ہم لکھنؤ کو تو ایک نیا اور ساری دنیا کے لئے نمونہ کا لکھنؤ بنا دیں گے۔ ہمیں اس مہم میں ہر شریف اور معقول آدمی کی ہمدردی اور اس کا تعاون حاصل ہوگا۔۔۔“

نیاز صاحب نے یہ سن کر کہا، مولانا آپ کس خواب و خیال میں ہیں، آپ بڑے سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میرے اور آپ کے جیسے اگر سینکڑوں آدمی بھی ہوں تو یہ کام پھر بھی نہیں ہو سکتا۔

چچا صاحب نے کہا کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ بہترین لکھنے والے ہیں، آپ کے ہاتھ میں پریس کی طاقت ہے، اور غالباً آپ تقریر بھی بہترین کرتے ہوں گے۔ اور مجھے بھی کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھنا بولنا آتا ہے۔ اور جس دن ہم نے یہ کام شروع کیا ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ اخبارات و رسائل ہمارا ساتھ دیں گے۔ اور کتنے ہی لکھنے بولنے والے ہمارے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگر ہم ساری دنیا کو نہیں بدل سکتے تو کم از کم اپنے ملک کو یا اپنے صوبے کو تو بدل ہی ڈالیں گے۔۔۔

نیاز صاحب نے پھر کہا، مولانا آپ بہت ہی سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور اس دنیا کو شاید آپ بالکل نہیں جانتے۔ اس دنیا کا بدلنا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔ چچا صاحب نے کہا اچھا میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ تاریخ پر آپ کی خوب نظر ہے۔ اور آپ یقیناً اس سے واقف ہوں گے کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایک دفعہ ایسا کام ہوا تھا اور اس قوم میں ہوا تھا جو تعلیم و تہذیب میں بالکل کوری تھی،

— اور ایک ایسی شخصیت کے ذریعہ ہوا تھا جو نوشت و خواند سے بالکل نا آشنا تھی، نہ اس کے ہاتھ میں پریس تھا نہ کوئی اخبار یا رسالہ، نہ اس کے ساتھ مقررہ کی کوئی ٹیم تھی۔ تو جب اس بے سروسامانی کی حالت میں ایک اُمی انسان نے ایک پوری قوم کو بدل دیا تو ہم اور آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی جن کے ہاتھ میں قلم اور پریس کی طاقت بھی ہے اور حکومتیں بھی ضرور ہمارے اس کام میں ہم سے تعاون کریں گی، تو پھر آپ کیوں مایوس ہیں؟۔۔۔

نیاز صاحب نے کہا مولانا میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا۔ لیکن بات یہی ہے کہ یہ کام میرے آپ کے بس کا نہیں ہے، اور آپ میرے اور اپنے متعلق اور اس دنیا کے متعلق بڑی غلط قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

چچا صاحب نے کہا اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ اس تاریخی واقعہ کو تسلیم بھی کرتے ہیں یا نہیں کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایسا انقلاب ہو چکا ہے؟

نیاز صاحب: ہاں یہ ایک مسلم واقعہ ہے، اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

چچا صاحب: مجھے آپ سے بس یہی جواب لینا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے معجزات کے انکار پر آپ کا ایک مضمون پڑھا تھا، یہ وقت میں نے آپ سے اسی لئے لیا تھا کہ آپ کو معجزے کی حقیقت سمجھا دوں۔ اور آپ کو بتا دوں کہ آپ بھی معجزہ کے قائل ہیں۔ اللہ کے پیغمبر کے ذریعہ جو ایسی چیز ظاہر ہو جس کے کرنے سے اس جیسے دوسرے انسان عاجز ہوں، بس وہی معجزہ ہے۔۔۔

اب نیاز صاحب چونکے اور چاہا کہ کچھ مزید بات کریں، چچا صاحب نے معذرت کی کہ بس اتنا ہی وقت میرے پاس تھا اب میری ٹرین کا وقت ہے۔

یہ واقعہ تو مولانا حکیم محمد ایوب صاحب کی ذہانت و فطانت کے ایک کارآمد نمونہ کے طور پر ذکر میں آگیا اور نہ حصولِ علم کی جو طرح ان کے ذریعہ پڑی اُس کے حوالہ سے یہ کہنا مقصود تھا کہ خاندان پر اس کا اثر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور یوں بھی ایک نسل سے دوسری نسل کا فاصلہ طے ہونے پر تبدیلیاں آتی ہی ہیں۔ دوسری نسل میں صاحب سوانح کے برادر اکبر جناب شیخ غلام امام صاحب نے ڈل تک باقاعدہ تعلیم پائی اور اس کے بعد اپنے والد صاحب کے کاموں میں مددگاری کی ضرورت پوری کرنے میں لگ گئے۔ (۱۹۷۷ء میں ۸۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔) برادر ممولوی محمد زکریا صاحب (شیخ الحدیث و عمید کلیۃ الشریعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) آپ ہی کی یادگار ہیں، اولاد میں سب سے چھوٹے۔ اور آپ کے علاوہ اب آپ سے

بڑے صرف دو بھائی بہن، محمد شعیب اور عائشہ بیگم حیات ہیں۔ باقی تین بڑے بھائی (مولانا محمد فضیل صاحب، اصغر امام صاحب اور مولوی ظہیر عالم) اور ایک بڑی بہن (بلیقیس بیگم) اب دنیا میں نہیں ہیں۔

حضرت صاحب سوانح نے الفرقان میں جو نوٹ اپنے ان بھائی صاحب کے انتقال پر لکھا، اس میں آپ کی خصوصیات و معمولات کا حصہ ایک مومن کی زندگی کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے:

”عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے وہ توحید میں بڑے راسخ اور پختہ تھے، اس میں ذرا چلک گوارا نہ تھی۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان میں قرآن مجید کی دعوت توحید اور ردّ شرک کی جو ترجمانی فرمائی ہے وہی بھائی صاحب کا ظاہری و باطنی حال تھا۔ نماز باجماعت کا بڑا اہتمام تھا۔ ترجمہ کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت اور دینی کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شغف تھا، یہی گویا ان کی روح کی غذا تھی۔ آخری دنوں میں سیرۃ النبی کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ دیکھنے والوں نے بتایا کہ اس کے مطالعہ کے وقت آنکھوں سے اکثر آنسو ٹپکتے رہتے۔ کبھی کبھی گریہ کے غلبہ سے پڑھنے کے قابل نہ رہتے۔ لیکن طبیعت سنبھل جانے پر پھر مطالعہ شروع کر دیتے۔“

راقم مزید عرض کرتا ہے کہ زندگی میں سادگی شاید اپنے والد ماجد سے بھی بڑھ کر تھی، لذت کام و دہن کو تو شاید منہ ہی نہ لگایا تھا، پر ذہانت فطانت اپنے چچا حکیم ایوب صاحب جیسی، اور مزید نہایت لطیف مزاح۔ ان دونوں چیزوں کا اظہار ”پیروں فقیروں“ اور تعویذ گنڈوں والوں کے ہاتھ چڑھے ہوئے غریب نادانوں کے ساتھ عموماً ہوتا تھا۔ نہایت لطیف مزاحیہ انداز میں انھیں عقل سمجھانے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ وہی شاہ اسماعیلیؒ، توحید تھی جو ادھام و خرافات میں گرفتار لوگوں کو دیکھ کر کچھ کئے بغیر چین نہ پاتی تھی۔ برادر مر مولوی زکریا صاحب اس کے بڑے پر لطف قصے سناتے ہیں۔ اور انہی سے آپ کے ذوق عبادت کے سلسلہ میں اس سبق آموز معمول کا بھی علم ہوا کہ رات کو دو ڈھائی بجے مسجد تشریف لیجاتے تھے اور صلوٰۃ اشراق پڑھ کر واپس ہوتے، خواہ کیسی ہی سردی کا زمانہ ہو۔ بتاتے ہیں کہ سردی سے ہاتھ نیلے ہو جا یا کرتے تھے۔ گویا حضرت والد ماجد کی پوری ہی جانشینی پائی تھی کہ وہ بھی دو بجے سے یا اللہ میں لگ جانے کے عادی تھے۔ اور تہجد گزاری تو ان کے طفیل الحمد للہ سب ہی اولاد میں آئی، اور ایک حد تک اتحاد میں بھی محرومی بھگدڑ نہیں ہے۔ مگر یہ نصف شب والا مجاہدہ شاید صرف انہی (ہمارے بڑے ابا) کا حصہ رہا۔ اور اللہ کے فضل سے حج بیت اللہ کا شرف بھی پالیا تھا۔“

آپ سے چھوٹے بھائی جناب مولانا محمد حسن صاحب بدر نے دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کے

علاوہ فاضل وغیرہ کے امتحانات بھی پاس کئے اور اس زمانے میں اسکولوں میں جو ہیڈ مولوی کی اسامی ہوتی تھی اس کی راہ سے معلیٰ کا پیشہ اختیار فرمایا۔ اسی سلسلہ میں ریٹائر میٹ تک کی زیادہ عمر سنبھل سے باہر گزری۔ بڑے بھائی صاحب کے ایک ہی سال بعد، ۱۹۷۵ء میں اسی (۸۰) سے کچھ اوپر عمر میں وفات پائی۔ اور، جیسا کہ حضرت صاحب سوانح نے آپ کے انتقال پر لکھا۔ بڑے منتظم اور اپنے اوقات و اصول کے بڑے پابند تھے۔ قاعدہ قرینہ طبیعت میں بسا ہوا تھا۔ نماز باجماعت اور مقررہ وقت پر تلاوت قرآن وغیرہ کے ہمیشہ پابند رہے، حج کی سعادت اللہ نے آپ کو بھی نصیب فرمائی، کسی اللہ والے سے بیعت کی طرف رجحان ہوا تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے بیعت کا شرف بھی، آپ کی وفات سے چند سال قبل، حاصل کر لیا۔“ دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں تھیں، بڑی صاحبزادی کا پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اب یہ بعد والی دونوں بھی رخصت ہو چکی ہیں اولاد زینہؒ میں ایک صاحبزادہ تھے مگر کم عمری ہی میں انتقال کر گئے۔ بیٹیوں کو آپ نے باقاعدہ ترجمہ قرآن پڑھانے کا اہتمام کیا۔ کچھ شعری ذوق کے زیر اثر بدرِ مخلص فرماتے تھے۔ لیکن آپ کی شاعری زیادہ تر تاریخی نمائے وفات و پیدائش تک محدود رہی۔

صاحب سوانح سے نیچے کے ہمارے چچا محمود حسین صاحب بعض عوارض صحت کے سبب گھر میں بڑھتے ہوئے تعلیمی رجحان کا ساتھ نہ دے سکے، انکی تعلیم بھی مڈل ہی تک رہ گئی کی۔ اور صرف ۳۶ سال کی عمر میں کوچ کا پیام آگیا (۱۹۴۲ء تا ۱۹۶۱ء سال وفات ہے)۔ چار بھائیوں میں تنہا یہی چچا محمود صاحب تھے جن کی وفات کے وقت حضرت صاحب سوانح ان کے پاس ہو سکے۔ آپ سے دو سال چھوٹے تھے اور کچھ قابل رشک خصوصیات کے تہا وارث۔ الفرقان میں ان کی بابت کافی تفصیل سے آپ نے لکھا تھا۔ اس سب کو نہیں تو کچھ کو اس سوانح کا جزو بننا چاہئے۔ تحریر فرمایا کہ

”قریباً دو تین سال سے انابت الی اللہ اور رغبت فی الآخرۃ کی خاص دولت نصیب ہو گئی

تھی، نفل نماز، نفل روزوں اور تلاوت قرآن کی قابل رشک کثرت کے علاوہ غرباء و مساکین

و یتامیٰ کی خدمت و اعانت ان کا خاص شغل تھا اور یہ خدمت بھی عموماً اخفا کے ساتھ ہوتی تھی۔ کسی

غریب کی تکلیف یا کسی خاص ضرورت کا علم ہو جاتا تو اس کی ضرورت کی چیز بازار سے لا کر یا

اگر گھر میں موجود ہوتی تو گھر سے لیجا کر خود ہی اس کے یہاں پہنچا آتے۔ اور اس قسم کے کام عموماً

رات کی تاریکی میں کرتے۔۔۔ سینے کے ہمیشہ سے کمزور تھے اور سانس یا کھانسی کی تکلیف اکثر

ہو جایا کرتی تھی اس لئے موسم سرما میں صبح کو دواغ ایک انڈیا تیار کر کے اکثر کھاتے۔ لیکن ایک یتیم

کو (جو اپنے گھر ہی میں رکھ لیا تھا) اس میں بھی ضرور شریک کر لیتے۔ حالانکہ خود اپنے بچے اللہ

کے دئے چار تھے۔ لیکن صبح کے اس انڈے میں صرف اس یتیم ہی کا حصہ ہوتا۔“

اس کے علاوہ ان کے حج کا قصہ بڑا غیر معمولی تھا جو الفرقان میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں مختصر اپنے الفاظ میں بیان کرنا مناسب ہوگا کہ مفید ہے۔ انتقال سے ایک ہی سال قبل بالکل یکا یک اس سفر عشق کا داعیہ پیدا ہوا، اور بس گھنٹے بھر کے اندر بالکل عاشقانہ انداز ہی میں اس کی تیاری ہوئی اور روانگی ہو گئی۔ آپ کے ماموں (نذیر احمد صاحب) عازم حج تھے۔ عین ان کی روانگی کے دن، بلکہ ایک آدھ گھنٹہ قبل اپنے چھوٹے بھائی حکیم محمد احسن صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ بھی میرا بھی جی جانے کو چاہتا ہے، پھر خدا جانے موقع ملے نہ ملے، کہو کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا اس معاملہ میں خلاف مشورہ کون دے سکتا ہے؟ بڑا مبارک خیال ہے، لیکن یہ آپ خود سوچ لیں آپ کا موقع بھی ہے یا نہیں؟ فرمایا کہ اس وقت اتنا روپیہ موجود ہے کہ میں جا سکتا ہوں اور انشاء اللہ تین چار مہینے تک گھر کا کام بھی چل سکتا ہے۔ پھر نہ معلوم کبھی اتنا روپیہ پاس ہو یا نہ ہو اس لئے یہی جی میں آ رہا ہے کہ چلا ہی جاؤں، ماموں صاحب کا ساتھ بھی ہے۔ اتنی گفتگو کرنے کے بعد بھائی سے کہا کہ اچھا تم اباجی سے اور ذکر کر دیکھو اگر انھوں نے اجازت دیدی تو بس یہی فیصلہ ہے۔

وہاں سے بخوشی اجازت مل گئی۔ اب صرف دس پندرہ منٹ کا وقت ہے۔ گھر میں آ کے اہلیہ سے بتایا۔ انھوں نے بالکل مذاق سمجھا۔ لیکن پتہ چلا کہ سچ ارادہ ہے تو انھوں نے بھی خدا حافظ کہا۔ کئی لیکر روپیہ صندوق سے نکالا، صرف ایک پتلی فرد، ایک تہ بند اور ایک ٹین کا لوٹا گھر میں سے لیا، باہر آئے، بھائی سے کہا کہ ایک قمیص اور ایک پاجامہ اپنا لا دو۔ اور ایک صدری جس میں کئی جیبیں ہوں (یہ صدری اس لئے متوقع تھی کہ چھوٹے چچا حکیم احسن صاحب شکار کا شوق رکھتے تھے)، گھر بالکل وہیں تھا، وہ فوراً ہی لے کر آئے۔ آپ نے پاجامہ پر پاجامہ اور قمیص پر قمیص پہنی، صدری اوپر ڈالی اور روانہ ہو گئے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دل میں یہ یکا یک داعیہ اللہ کی طرف سے القاء تھا۔ آقائے کریم کی ذرہ نوازی مہرباں ہوئی کہ بندے کا اعمال نامہ حج کی مشقت و سعادت سے خالی نہ رہ جائے۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم

ہمارے مولوی محمد عارف مرحوم (استاذ تفسیر ندوۃ العلماء) آپ ہی کے فرزند تھے، اور خاندانی خصوصیات کے بدرجہ اتم وارث۔ جن کے دو بھائی (ایک بڑے ایک چھوٹے) الحاج محمد عمر اور محمد زہیر الحمد اللہ حیات ہیں، سب سے بڑے محمد عامر میاں بھی عارف میاں سے چند سال بعد انتقال کر گئے۔ ان کی جماعت کی پابندی قابلِ زحمت تھی۔ اور توحید کی حس غضب کی تیز۔ یغفر اللہ لنا ولہ۔

چچا محمود صاحبؒ سے چھوٹے مولانا حکیم محمد احسن صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت بھی کی اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے طب کی تعلیم بھی پائی۔ اور پھر وطن ہی میں ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے پوری عمر گزاری۔ نیز مقامی حالات میں ایک دیوبندی عالم کی حیثیت سے اپنے جو فرائض انھوں نے جانے انھیں ہر چیز پر مقدم رکھتے ہوئے ۱۹۹۳ء میں (بہ عمر ۸۳ برس) اپنے رب سے جا ملے۔ بطور طبیب، اللہ نے دستِ شفاء تو دیا ہی تھا، مزید آباء و اجداد کی غرباء نوازی کی خصلت بھی۔ کسی مریض کو کچھ قوت کی غذا کی ہدایت کرتے اور وہ اپنی عدم استطاعت کا عذر پیش کرتا یا صورت ہی سے اس کی غربت ظاہر ہو رہی ہوتی تو دو اتو دو خانے سے مفت دلاتے ہی تھے مناسب رقم کا ایک نوٹ بھی اسے تھماتے کہ اس سے اس ضروری غذا کا اہتمام کرے۔ اور ایک دیوبندی عالم، بلکہ مزید برادر مولانا نعمانی، کی حیثیت سے جو جماعتی فرائض حسب استطاعت وہ ادا کرتے رہے، ان کے ضمن میں اپنی جو بہترین یادگار پیچھے چھوڑی ہے وہ مدرسہ مدنیۃ العلوم (تحت انجمن معاون الاسلام) ہے، جس نے سنبھل کے قدیم دینی مدارس میں عرصہ دراز سے پیدا شدہ انحطاط کی کیفیت کے بعد سے ایک تازہ دم تعلیم گاہ کی ضرورت کو، ایسے اعلیٰ طریقہ سے پورا کیا ہے کہ شہر اور اطراف شہر کے لئے وہ الحمد للہ ایک جماعتی مرکز اور مرجع کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مدرسہ کے ساتھ ایک شاندار مسجد بھی اس مرجعیت کا باعث ہوئی ہے۔ آپ کے فرزند اصغر مولوی عبدالمومن میاں کی زندگی، آپ کی وصیت کے مطابق، اس مرکز کے لئے (بلا معاوضہ) وقف ہے۔ ان کے اخراجات کی کفالت گھر کے مشترکہ کاروبار سے ہوتی ہے۔

انجمن معاون الاسلام کا ذکر ابھی اوپر گزرا ہے کہ مدتوں کی رونق کے بعد اس کی عمارت اور جلسہ گاہ بد حالی و ویرانی کا شکار ہوئی پڑی تھی۔ ایک دفعہ اسے بحال کرنے کی کوشش میں جلسہ بلایا گیا تو محلہ کا بریلوی عنصر اپنی لاشی ڈنڈے والی سیاست سے اس جلسہ کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر انجمن کی تقدیر پر مہر سی لگ گئی، کہ اس قابض عنصر کو انجمن کے صرف اوقاف سے مالی استفادہ میں دلچسپی رہی۔ اور عمارت کھنڈر سے کھنڈر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ مرحوم چچا حکیم محمد احسن صاحب کے دل میں اللہ نے اس 'مرحوم' انجمن کو مع اس کے دینی مقاصد کے زندہ کرنے کا خیال نہیں بلکہ جذبہ ڈالا، اور پھر اس نے اس وقت تک چین ہی انھیں نہ لینے دیا جب تک یہ مقصد حاصل نہیں ہو گیا۔ اسکے لئے مقدمہ بازی کی ضرورت تھی، پورے دس بارہ سال اس مشقت میں لگائے اور بالآخر "حق بہ حق دار رسید"، یعنی انجمن قبضہ گیر مافیائے ہاتھ سے نکل کر اس کے اصل داروں کے ہاتھ میں آگئی۔ اور اس کے ماضی کا جو حق تھا اس حق کو وہ آج بہتر سے

بہتر شکل میں پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اللہ بے پایاں رحمتوں سے چچا صاحب مرحوم کو نوازے، مجھ راقم کے ساتھ خاص طور سے بہت لگاؤ اور شفقت کا معاملہ تھا۔ برادر ممولوی عبدالمومن کے علاوہ پانچ بھائی اور دو بہنیں آپ نے چھوڑی تھیں۔ (جن میں سے ایک راقم کی شریک حیات) ایک بھائی (محمد راشد) نے جلد ہی دنیا چھوڑ دی۔ اب جو باقی ہیں ان ہی سے اب حضرت دادا صاحب کی چھوڑی حویلی کی رونق و آبادی ہے۔ اللہ اسے ہمیشہ ہی آباد اور مینوں کو شاد رکھے۔ آمین

صاحب سوانح اور اُن کی تعلیم

حضرت صاحب سوانح، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے بھائیوں میں منجھلے (درمیان کے) اور اپنی والدہ سے ہمارے دادا (صوفی احمد حسین صاحب) کی پہلی اولاد تھے۔ آپ کے والد صاحب کے احوال میں آپ کی تعلیم کے ابتدائی سات سال کے مختصر حال کا ذکر طلبہ دارالعلوم دیوبند کے سامنے کی گئی ایک تقریر (جمادی الاخریٰ ۱۳۹۰ھ) کے حوالہ سے گزرا ہے۔ اس کی تفصیل آپ ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

”ناظرہ قرآن شریف اور تھوڑی سی اردو تعلیم کے بعد (مجھ کو) فارسی اور پھر عربی پر لگادیا

گیا۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ میری عمر بہت کم تھی اور ابھی میں صرف ونچو پڑھنے اور سمجھنے کے

لائق نہیں ہوا تھا۔ (خاص کر میزان و منشعب اور نحو میر جیسی کتابوں کے ذریعہ) اور زیادہ تر اس وجہ

سے کہ میرے اندر اس تعلیم کا کوئی شوق و داعیہ نہیں تھا، میں نہایت بے دلی سے پڑھتا رہا۔ بلکہ

واقعہ یہ ہے کہ پٹائی کے ڈر سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وقتی طور پر یاد کر کے سنا دیا کرتا تھا، سمجھتا کچھ

نہیں تھا۔ کئی سال تک میرا یہی حال رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال میری میزان نئے سرے سے

شروع ہوتی تھی۔ ہمارے سنجل میں اس وقت تین عربی مدرسے تھے، ہوتا یہ تھا کہ ایک سال میں

ایک عربی مدرسے میں پڑھتا رہتا۔ سال ختم ہونے تک میزان منشعب ختم ہو کر کبھی کبھی پنج گنج اور نحو

میر بھی شروع ہو جاتی، لیکن والد ماجد اور گھر والے محسوس کرتے کہ میری پڑھائی ٹھیک نہیں ہو رہی

ہے تو دوسرے سال مجھے دوسرے مدرسے میں بھیج دیا جاتا۔ وہاں کے استاد جب یہ دیکھتے کہ مجھے

کچھ بھی نہیں آیا تو وہ پھر سے وہی میزان شروع کر دیتے اور پھر میں سال بھر میں میزان منشعب ختم

کر کے پنج گنج یا نحو میر تک پہنچ جاتا لیکن مجھے آتا کچھ نہیں تھا۔ اس لئے اگلے سال پھر میں تیسرے

مدرسے میں بھیج دیا جاتا وہاں کے استاد بھی میری خیر خواہی میں یہی طے کرتے کہ مجھے پھر میزان

سے پڑھایا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ چکر برسوں تک اسی طرح چلتا رہا۔ اور ہر سال میری تعلیم

”بداں سعدک اللہ فی الدارین“ سے شروع ہوتی رہی۔“ آگے فرماتے ہیں:

”(اس چکر میں) میری عمر پندرہ سال ہو چکی تھی کہ والد صاحب کو معلوم ہوا کہ فلاں مدرسے میں ایک نئے پنجابی استاد آئے ہیں اور وہ بہت توجہ سے پڑھاتے ہیں، والد صاحب نے مجھے ان کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے پڑھ رہا ہوں؟ میں نے بتایا کہ میں اتنے دن سے اس طرح پڑھ رہا ہوں، اب میں سمجھدار ہو چکا تھا۔ انھوں نے مجھ سے باتیں کیں تو اندازہ کیا کہ میں کند ذہن نہیں ہوں۔ اس سے انھوں نے سمجھ لیا کہ میرا اتنا وقت صرف اس لئے برباد ہوا اور ہو رہا ہے کہ میں نے خود پڑھنے کا ارادہ نہیں کیا ہے بلکہ صرف جبراً پڑھ رہا ہوں انھوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ واقعہ بالکل یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے اور ان کے درجے بلند فرمائے انھوں نے بڑی شفقت اور بے تکلفی سے فرمایا کہ ابھی تم خود ہی اپنے بارے میں فیصلہ کرو، اگر اب بھی تمہارا ارادہ پڑھنے کا نہ ہو تو تم تمہارے والد صاحب سے مل کر انھیں سمجھائیں گے کہ وہ تمہارا وقت برباد نہ کریں، کسی اور لاکن میں لگا دیں۔ اور اگر تمہارا ارادہ پڑھنے کا ہو تو پھر ہم تمہیں پڑھائیں گے اور ان شاء اللہ تم بہت جلدی پڑھ لو گے۔ اس وقت اللہ نے میرے دل میں ڈالا اور میں نے ان سے کہا اچھا ان شاء اللہ اب میں پڑھوں گا۔ انھوں نے مجھے اس طرح پڑھانا شروع کیا کہ میزان کے چند صفحات مقرر کر کے فرمایا کہ ان کو فور سے دیکھ لو اور ان کا مضمون یاد کر لو جو بات سمجھ میں نہ آئے مجھ سے پوچھ لو۔ دوسرے اسباق سے فارغ ہو کر میں تمہاری جانچ کر لوں گا۔ اس طرح انھوں نے ۸-۱۰ دن میں میری میزان منشعب ختم کرادی۔ اور میں نے اب سمجھا کہ میزان منشعب میں کیا ہے۔ اور پھر اسی طرح مینے دو مینے میں پنج گنج اور نحو میر ختم کرادی۔ میں درمیان سال میں ان کے پاس گیا تھا اور شعبان تک انھوں نے علم الصیغہ اور ہدایت النحو تک پہنچا دیا۔ اب میں جی لگا کر اور اپنے ارادہ سے پڑھنے لگا۔ لیکن اس کے بعد مولانا مفتی محمد نعیم صاحب سننہل نہیں تشریف لائے اور مجھے پڑھنے کیلئے سننہل سے باہر بھیج دیا گیا۔“

سننہل سے باہر کی تعلیم

”اس کے بعد چار سال میں میں نے متوسطات پوری کر لیں۔ اس وقت ہمارے مدرسوں

میں منطق و فلسفہ کا بہت زور تھا اس لئے میں نے سب سے زیادہ کتابیں منطق اور فلسفہ کی پڑھیں۔

اور اب اس کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے اپنے ساتھیوں میں ممتاز رہتا تھا۔“

”سنجھل سے باہر“ کی تفصیل اس تقریر میں نہیں آئی ہے، وہ ”میری زندگی کے تجربات“ والی تحریر

میں بایں الفاظ ملتی ہے:

”۔۔۔۔۔ اس کے بعد سنجھل کے مشہور درسی عالم حضرت مولانا کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی اور خدمت میں دے کر مصلح اعظم گڑھ بھجد یا گیا جہاں کے ایک مدرسے میں مولانا موصوف صدر مدرس تھے۔ میں پورے تین سال اس مدرسے کا طالب علم رہا اور ان تین سالوں میں درسی متوسلطات قریب قریب پوری کر لیں۔“ (یہاں کچھ سو بیان ہے جس کی تصحیح آگے آرہی ہے۔ غ)

مذکورہ مدرسہ دارالعلوم مونا نام کا تھا۔ مونا کا قیام صرف تین سال کا تھا۔ اس کے بعد مزید ایک سال کی تعلیم ”میری زندگی کے تجربات“ کے مطابق سنجھل ہی میں ہوئی۔

”مونا کے تین سالہ قیام میں معقولات میں بھی میرزا ہد رسالہ اور میڈی وغیرہ پڑھ چکا تھا۔

اس کے بعد استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب مرحوم وطن عزیز سنجھل ہی کے ایک مدرسے میں صدر مدرس ہو کر وہیں رہ گئے۔ میں بھی اس سال وہیں رہا اور اس تمام سال میں صرف معقول کی درسی (اور بعض غیر درسی کتابیں بھی) پڑھیں۔ یعنی حمد اللہ، قاضی مبارک، بحر العلوم، شرح مسلم، میرزا ہد ملال، اس کا حاشیہ، بحر العلوم، صدر، شمس بازغہ، خیالی، میرزا ہد امور عامہ، توضیح تلویح، اس کے علاوہ دینیات میں اس سال جلالین کے صرف ابتدائی چند پارے بھی پڑھے۔ چونکہ حضرت استاذ مرحوم کی مجھ پر خاص عنایت تھی اور ان معقولی کتابوں کے درس میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا اور میں بھی اس زمانے میں واقعی طالب علم بنا ہوا تھا، یعنی مطالعہ وغیرہ میں بہت محنت صرف کرتا تھا۔ اس لئے ان معقولات میں مجھے امتیاز حاصل تھا۔ یہاں تک کہ شمس بازغہ اور میرزا ہد امور عامہ کے تو غالباً دو ہی چار سبق پڑھ کے حضرت استاذ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ اور خود ہی ان دونوں کتابوں کو اس طرح دیکھ ڈالا کہ چند مہینے کے بعد جب دارالعلوم دیوبند جانا ہوا تو داخلے کے امتحان میں بھی ان دونوں کتابوں کو میں نے لکھا تھا۔“

بیرون سنجھل کے دور طالب علمی کی اس تفصیل میں سنجھل سے باہر گزرے ہوئے بس دارالعلوم مونا کے تین ہی سال کا بیان آیا ہے جبکہ شروع میں وہ چار سال بتائے گئے تھے۔ تو جو ایک سال رہ گیا وہ اصل میں شروع کا ایک سال ہے جو مونا سے پہلے دہلی میں گزرا۔ اس کا پتہ ”تحدیثِ نعمت“ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے بیان میں ملتا ہے۔ وہاں تحریر ہوا ہے کہ

”۔۔۔ مالتا سے حضرت کی واپسی رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کے اواخر میں ہوئی تھی۔ ٹھیک ان ہی دنوں میں میرے بارے میں فیصلہ ہوا کہ آگے کی تعلیم کے لئے مجھے حضرت مولانا کریم بخش صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اس زمانے میں دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں مدرس تھے اور رمضان المبارک کی تعطیل میں حسب معمول وطن تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا سے ہم وطنی کے علاوہ قریبی رشتہ داری کا بھی تعلق تھا، ان سے جب میرے بارے میں عرض کیا گیا تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنا منظور فرمایا اور بتلایا کہ شوال کی فلاں تاریخ کو میں دہلی کے لئے روانہ ہونے والا ہوں، حضرت مولانا کے ساتھ میرا جانا بھی طے ہو گیا۔۔۔“

حضرت شیخ الہند کی زیارت کے بیان میں اس تعلیمی سفر کا یہ ذکر اس مناسبت سے آیا ہے کہ دہلی کا یہی سفر حضرت کی زیارت کا ایک بے وہم و گمان وسیلہ بن گیا تھا۔ اس موقع پر بس اتنا ہی تذکرہ ہے کہ ”حضرت مولانا کریم بخش صاحب“ کے ساتھ برائے تعلیم دہلی جانا ہوا جہاں حضرت مولانا مدرسہ عبدالرب میں مدرس تھے۔“ اور جب جانا ہوا تو کم از کم ایک سال تو وہاں گزرا ہی ہوگا۔ اس طرح سنبھل سے باہر کے چار سالوں کو جو حوالہ دیا تھا وہ اس پہلے ایک سال کو ملا کر پورے چار ہو جاتے ہیں۔ اور ان چار سال کے بعد وہ سال پانچواں ہو جاتا ہے جو وطن ہی میں حضرت مولانا کریم بخش صاحب (م۔ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء) کے ساتھ گزرا۔ (اس سال حضرت مولانا سنبھل کے مدرسۃ الشریعہ میں رہے تھے۔ ع)

آخری دو سال دارالعلوم دیوبند میں

ان پانچ سالوں کے بعد اس تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند جانا مقدر ہو گیا۔ یہ ”مقدر ہو گیا“ کے الفاظ اس بنا پر استعمال کئے جا رہے ہیں کہ آپ کے والد صاحب اپنے پورے اخلاص و دلالت کے ساتھ اس تہوف کی لائن کے صوفی تھے جس میں گیارہویں شریف بارہویں شریف اور عرس و میلاد شریف کا بڑا مقام قرب الہی کے لئے ہے۔ اور اس لئے قدرتی طور پر دیوبند سے بعد۔ چنانچہ دارالعلوم میں کی گئی اسی مذکورہ تقریر میں دیوبند داخلہ کے بیان میں آتا ہے کہ

”یہاں تک میں نے جن اساتذہ سے پڑھا تھا وہ سب اسی دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ

اور فیض یافتہ تھے، اسی لئے میرا ذہن بالکل دیوبندی تھا اور آگے کی تعلیم میں دارالعلوم ہی میں حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اپنے والد صاحب کے بارے میں ابھی بتایا کہ ان کے

عقائد کچھ دوسری طرح کے تھے، ان کو ہمارے اکابر دیوبند سے بہت بُعد تھا، لیکن نہ معلوم کس طرح ان کے دل میں یہ بات اللہ نے بٹھادی تھی کہ حدیث دیوبند والے ہی اچھی پڑھاتے ہیں، اس لئے جب میں نے ان سے عرض کیا کہ میں اب حدیث شریف پڑھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند جانا چاہتا ہوں تو انھوں نے مجھے اجازت دیدی۔ جب یہ بات عام طور پر مشہور ہوئی کہ میں پڑھنے کے لئے دیوبند جاؤں گا تو والد صاحب کے گیارہویں شریف بارہویں شریف اور عرس کی محفلوں والے یارانِ طریقت نے ان سے کہا کہ صوفی جی، کیا غضب ہے! سنا ہے آپ کا لڑکا دیوبند پڑھنے جائے گا؟ تو وہ صرف یہ فرمادیتے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ہی راستہ پہ رہے گا۔ الغرض انھوں نے اپنی رائے نہیں بدلی اور میں شوال ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم آکر داخل ہو گیا یہاں صرف دو سال باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے پہلے سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین پڑھیں اور اگلے سال دورہ۔“

دارالعلوم کے دو سالہ دور طالب علمی کی کچھ زیادہ تفصیل اگرچہ نہیں ملتی مگر چند سطریں۔ ”حدیثِ نعمت“ میں ملتی ہیں وہ بہت کچھ بتا دینے کو کافی ہیں ارشاد ہوا ہے:

”میں طالب علمی کے زمانے میں خاص کر دارالعلوم کی طالب علمی کے دو سالوں میں، صرف طالب علم تھا اور اول و آخر دلچسپی بس درس و مطالعہ سے تھی۔ تعلیمی سال کے خاتمے پر جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا۔ نتیجہ میں بھی امتیاز حاصل رہا۔“ مزید فرمایا: ”دورہ حدیث کا پورا سال اس طرح گزرا تھا کہ دن رات کے اکثر اوقات میں حدیث شریف کی کتابوں ہی سے اشتغال رہتا تھا۔“

مجمیع امتحان میں اس امتیاز کی تفصیل جاننے سے اگر دلچسپی ہو تو وہ بھی دارالعلوم کے سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے اس مضمون سے دستیاب ہے جو حضرت موصوف نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں شائع ہونے والے الفرقان کے خاص نمبر (۱۹۹۸ء) کے لئے تحریر فرمایا تھا۔ اسکے مطابق امتحان کے گیارہ پرچوں میں سے پانچ میں آپ کے نمبر اعلیٰ ترین مفروضہ (۵۰) سے بھی زیادہ تھے (دارالعلوم کی ایک روایت ہے کہ ممتحن اگر جوابات سے بہت خوش ہوتا ہے تو کچھ نمبر اپنی طرف سے بڑھا سکتا ہے) تین

(۱) غالباً کہیں لکھا بھی ہے ورنہ زبانی ارشاد یاد آتا ہے ذمہ دارانِ امتحان سے درخواست کی تھی کہ آپ کو وقت کی پابندی سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ چنانچہ کچھ وقت بڑھا دیا گیا تھا۔ جی یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ جواب میں رسالے لکھ دئے جائیں۔“

میں پورے پچاس تھے اور صرف تین میں ایک یا دو چار نمبر ۵۰ سے کم رہ گئے تھے۔۔۔
اس سے پہلے سال میں پڑھی گئی کتابیں حسب ذیل تھیں، جن کا تذکرہ ”میری زندگی کے تجربات“ میں ملتا ہے:

- ۱۔ مشکوٰۃ شریف ۲۔ شرح نخبۃ الفکر ۳۔ ہدایا آخرین ۴۔ دیوان حماسہ
- ۵۔ سبغہ معلقہ (درس کے نظام الاوقات میں) نیز ۶۔ تصریح ۷۔ شرح چھٹی اور
- ۸۔ شرح اشارات طوسی (بعض اساتذہ کرام سے خارج میں۔)

دارالعلوم میں آپ کے اساتذہ

دارالعلوم میں آپ کے اساتذہ کی تفصیل الفرقان بابت اپریل ۱۹۸۰ء میں ملتی ہے: حضرت العلام مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں، حضرت مولانا سراج احمد رشیدی، حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی، حضرت مولانا اعجاز علی امرہ ہوئی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی۔ یوں تو یہ تمام ہی اساتذہ آپ کے دل میں غایت عظمت کا مقام رکھتے تھے، پر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ایک الگ خاص ہی مقام تھا۔ ”تحدیثِ نعت“ میں ارشاد ہوا ہے:

”یوں تو اس وقت دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ باکمال، اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ میں صاحب مقام تھے۔ لیکن ان میں اس وقت کے صدر المدرسین شیخ الحدیث استاذ العلام حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا۔ جنہوں نے نہیں دیکھا وہ غالباً یہ تصور بھی نہ کر سکیں گے کہ چودھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا بھی کوئی بحر عالم ہو سکتا ہے۔ ان کی علمی جلالت کا کچھ اندازہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی اس شہادت سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں ایک جگہ ان الفاظ میں ادا کی ہے:

الشیخ التقی النقی الذی لم تر العیون مثله و لم یروہو مثل نفسه
ولو کان فی سالف الزمان لکان
لہ شأن فی طبقۃ اہل العلم.
(فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۵)

”اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا یہ ملفوظ مشہور و معروف ہے اور غالباً حضرت کے ملفوظات کے کسی مجموعہ میں شائع بھی ہو چکا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ ”اُن کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے۔“

حضرت شاہ صاحب سے بیعت

مزید ارشاد ہوا ہے کہ ”جن اصحاب نے حضرت مددوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا ہے ان سب کا یہی احساس ہو گا کہ وہ علوم دین کے بحر ذخار اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے اُن خاصانِ خدا میں سے تھے جن کی منجانب اللہ منکرات و معصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے۔ صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین و جمیل اور معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اٹھیں ”إِنَّ هَذَا إِلَهٌ مَلَكَ كَرِيمٌ“ اور پھر اسی عقیدت کے زیر اثر فراغت کے بعد آپ حضرت شاہ صاحب سے بیعت بھی ہوئے۔ تحریر فرمایا ہے کہ

”اس زمانے میں دارالعلوم کے جو طلباء اپنی اصلاح کے لئے کسی صاحب ارشاد شیخ سے تعلق قائم کرنا چاہتے تھے وہ یا تو دیوبند ہی میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب مجددی نقشبندی سے تعلق قائم کر لیتے تھے، یا پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون جایا کرتے تھے، بعض طلباء سہارنپور جا کر حضرت مولانا ظلیل احمد سہارنپوریؒ سے بھی بیعت ہوتے تھے۔ لیکن دارالعلوم میں میرا جو آخری سال ذورہ حدیث کا تھا اس سال کے شروع ہی میں حضرت سہارنپوری قدس سرہ مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے تھے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد وہیں وصال ہو گیا۔ جب سال کا اختتام قریب آیا تو میں نے بیعت کے مسئلہ پر سوچا، میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے زندہ اکابر میں سب سے زیادہ عقیدت و محبت حضرت استاذ (رحمۃ اللہ علیہ) سے ہے، اس لئے مجھے حضرت ہی سے بیعت کی درخواست کرنی چاہئے۔ لیکن یہ بات مشہور تھی اور ہم دیکھتے بھی تھے کہ وہ کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے اپنے حق میں یہی طے کیا۔ جس دن سالانہ امتحان کا آخری پرچہ ہوا، جس سے اگلے دن مجھے دیوبند سے وطن روانہ ہو جانا تھا، میں رات کو بعدِ عشاء حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت اس وقت تہا تھے، میں نے درخواست پیش کی، حضرت نے مجھے دوسرے اکابر کی طرف رجوع کرنے کے لئے فرمایا، لیکن جب میں نے اس کے بعد بھی اپنی ہی بات عرض کی اور ایک درجہ میں نیاز مندانہ اصرار کیا تو قبول فرمایا، تو بہ کی تلقین اور تسبیحات و شغل پاس انفاس کی تعلیم فرمائی۔۔۔“

شاگرد کو حضرت شاہ صاحب سے اس درجہ عقیدت تھی تو دوسری طرف شاہ صاحب بھی دورہ حدیث کی اس سال کی جماعت سے اس قدر خوش بتائے گئے ہیں کہ فرمایا تھا: ”۷۱ سال بعد ایسی جماعت دورہ میں آئی ہے!“ ہو سکتا ہے یہی چیز اس خصوصیت کا باعث ہوئی ہو کہ عام طور پر اگرچہ کسی کو بیعت نہ فرماتے ہوں مگر اس جماعت کے افراد کو اس اعزاز سے محروم نہ رکھیں۔ واللہ اعلم

دوسرے خاص اساتذہ

دوسرے اساتذہ میں آپ خاص طور پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ الادب والفقہ مولانا اعجاز علی صاحب امر وہوی اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی سے زیادہ متاثر رہے تھے۔ ان میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی شخصیت تو اولاً آپ کی گراف قدر تالیف ”فتح الملہم“، شرح ”صحیح مسلم“ کی وجہ سے اور پھر تحریک پاکستان کی پر جوش تائید و حمایت کے سبب سے ایسی معروف و مسلم ہو چکی ہے کہ مزید کچھ کہنا تحصیل حاصل۔ البتہ باقی دونوں حضرات سے واقفیت کا حلقہ چونکہ اہل درس ہی تک عموماً محدود ہے اس لئے ان کے بارہ میں آپ کے تاثرات کا ذکر موزوں ہے۔

حضرت مولانا اعجاز علی صاحب کی وفات پر تحریر (الفرقان رجب ۴۷ھ - مئی رجون ۱۹۵۵ء)

میں آتا ہے:

”شوال ۱۳۴۳ھ میں یہ ناچیز دارالعلوم دیوبند گیا اور دو سال وہاں رہا، پہلے سال میں ”ہدایہ اخیرین“ ”سبعہ معلقہ“ اور دوسرے سال میں ”تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ (جو اس وقت دورہ حدیث کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی) اور شمائل ترمذی مولانا ہی سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ اس وقت کا اپنا خیال اور اندازہ یہ تھا اور آج تک بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا ہے کہ مولانا مرحوم ان کتابوں کو اس طرح پڑھاتے تھے کہ اگر ان کے مولفین و مصنفین علامہ مرغینانی، اور امام ترمذی اور قاضی بیضاوی اور امر القیس وغیرہ اصحاب ”معلقات“ مولانا کا درس سنتے تو انھیں یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوتی کہ ان کی کتابوں کا کیسا حق ادا کیا جا رہا ہے، خاص کر ”ہدایہ اخیرین“ کا درس تو اتنا ممتاز ہوتا تھا کہ علمی اور درسی ذوق رکھنے والے اہل علم جنھوں نے بار بار ”ہدایہ اخیرین“ پڑھائی ہوتی، مولانا کا درس سن کر ان کا بھی جی چاہنے لگتا کہ ایک دفعہ ”ہدایہ اخیرین“ مولانا سے پڑھیں اور بعض حضرات نے ایسا کیا بھی۔“

حضرت العلامة مولانا محمد ابراہیم بلیاوی کی وفات پر الفرقان شوال ۱۳۸۷ھ / جنوری ۱۹۶۸ء میں

تحریر فرمایا ہے:

خالی اوقات میں انھیں کتابوں کے یا ان کے حواشی و شروح کے مطالعہ میں لگے رہنا، گویا سارا وقت اللہ کی رحمت و توفیق سے صرف حدیث یا تفسیر ہی کے اشتغال میں گزرتا تھا۔ ۱۸۱۹ اشعبان ۱۲۳۵ھ کو بخاری شریف کا آخری سبق سیدنا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا بلکہ خود ہی قرأت فرمائی، حتم پر دعا ہوئی، بہت سے اساتذہ بھی اس دن شریک درس تھے۔ جہاں تک یاد آتا ہے سبق کے اختتام تک ہم لوگوں پر حزن و الم کا غالب کوئی اثر نہ تھا۔ لیکن سبق ختم کرتے ہی سب ہی طلبہ پر جن کی تعداد غالباً سو سے کچھ اوپر تھی اک عجب غمناک احساس غالب ہو گیا۔ سب ہی یہ سوچ سوچ کر روتے تھے کہ ہائے آج اس سعادت اور ان برکات کا سلسلہ ختم ہو گیا کہ ہم دن رات صرف حدیث و تفسیر میں مشغول رہتے تھے۔ روزانہ کئی گھنٹے دینی استفادہ کے لئے ان مقدس اساتذہ کے سامنے بیٹھنا نصیب ہوتا تھا جن کی خدمت میں حاضر ہونا بجائے خود اللہ پاک کی ایک نعمت ہے اور معلوم نہیں اب یہ نعت پھر کبھی نصیب ہوگی یا نہیں۔ پورے سال بھر تک (اور بعض اس سے بھی زیادہ مدت تک) تعلیم دین کے اس سفر میں جو رفیق رہے۔ اور جن میں سے بہت سوں میں بڑی محبتیں بھی قائم ہو گئیں، رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ بس آج کے بعد ہم سب بچھڑ جائیں گے اور شاید پھر زندگی بھر ایک دوسرے کو نہ پا سکیں گے۔ ان احسانات نے اتنا زلایا کہ وطن جا کر گھر والوں سے ملنے کی خوشی جو بالکل ایک فطری چیز ہے شاید دل کے کسی گوشے میں بھی اس وقت اس کا اثر نہیں رہا تھا۔ سوئے اوپر اپنے ساتھیوں میں سے مجھے کوئی ایک بھی ایسا یاد نہیں جس کو میں نے اس وقت دیکھا ہو اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی نہ بندھ رہی ہو۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر زار و قطار روتے تھے۔ تا آنکہ اسی طرح روتے دھوتے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔“

دارالعلوم کی دینی فضا

دارالعلوم کی طالب علمی کے ضمن میں وہاں کی دینی فضا کا بھی تذکرہ ”میری زندگی کے تجربات“ میں

(۱) یہ بیان پڑھتے ہوئے آپ سے بارہا کاخا ہوا یہ قول یاد آتا ہے کہ بانیان دارالعلوم دیوبند کچھ علم میں اپنے زمانہ کے یکتانہ تھے کہ دارالعلوم کو اس کی وجہ سے یکتائی ملی، البتہ وہ اخلاص اللہ میں خصوصیت رکھتے، بس اسی کی برکت تھی۔ بانیان کے دور پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد تک کے طلبہ کے دلوں کا جہاں یہ حال ہو وہاں کے اکابر و بانیان کے دلوں کی دنیا کا حال جو کچھ نہ ہو کم ہے۔ رحمہم اللہ و رفع درجاتہم۔

فرمایا گیا ہے۔ حق ہے کہ ذکر میں لایا جائے۔ فرمایا ہے:-

”اب تک جن مدرسوں کی طالب علمی میں میرا زمانہ گزرا تھا، ان میں — کوئی خاص دینی رفیق نہیں تھی اور نہ اس کا اہتمام ہی تھا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند میں رہ کر دیکھا کہ اگرچہ انفرادی سیرتوں کا تجربہ کرنے والوں کو یہاں بھی ہر کیر کڑ اور ہر طرح کی سیرت کا طالب علم مل سکتا تھا مگر یہاں کی اجتماعی فضائل و تقویٰ کے آثار اور انوار ہی کا غلبہ نظر آتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے ہر نو وارد یہاں آ کر دینی لحاظ سے کچھ اچھائی اثر لے سکتا تھا۔ دارالعلوم کی عام فضا کے اس دینی رنگ میں بڑا دخل میرے نزدیک دو چیزوں کو تھا، ایک عام اساتذہ کی مؤثر اور متعدد دیدارانہ سیرت اور دوسرے بعض اساتذہ کا درسوں میں بھی نصیحت کا التزام اور بعض اکابر کا کبھی کبھی مسجد میں یا طلبہ کے دوسرے عام مجامع میں اصلاحی و ارشادی خطاب۔“

اس ضمن کا ایک خاص واقعہ بھی آپ نے اپنے اس دور طالب علمی کے بیان میں تحریر فرمایا ہے۔ دارالعلوم میں پہلے سال کے اسباق میں آپ کی مشکوٰۃ شریف کا درس حضرت مولانا سراج احمد رشیدیؒ کے یہاں ہوتا تھا۔ اس درس کے حوالے سے فرماتے ہیں:-

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دیوبند میں جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو نماز کے کے لئے جنازہ دارالعلوم میں لے آتے ہیں اور درس گاہوں میں اطلاع کر دی جاتی ہے کہ نماز کے لئے جنازہ آیا ہوا ہے۔ اسی گھنٹے کے اختتام پر نماز جنازہ ہوگی۔ ایک دن مشکوٰۃ شریف کا سبق ہو رہا تھا، پہلا ہی گھنٹہ تھا، جنازہ کی اطلاع آئی۔ گھنٹہ پورا ہو جانے پر حضرت مولانا نے ہم لوگوں سے فرمایا، چلو جنازہ کی نماز پڑھ لیں، باقی سبق بعد میں ہوگا۔ اس جماعت میں قریباً ۳۵-۴۰ لڑکے رہے ہوں گے۔ ان میں سے صرف چار پانچ وضو کرنے کے لئے تیزی سے مسجد کی طرف چلے، باقی سب مولانا کے پیچھے پیچھے نو درہ کے گھنٹے میں آ گئے جہاں نماز جنازہ ہونے والی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا اور ہم سب پھر درس گاہ میں آ گئے۔ مولانا نے سبق شروع ہونے سے پہلے ہی بڑے در در اور تاثر کے ساتھ فرمایا: آج مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ آپ میں سے کچھ لوگ وضو کرنے کے لئے مسجد کی طرف دوڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ حدیث شریف کے سبق میں بغیر وضو بھی بیٹھ جاتے ہیں، ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ حدیث کی ہر کتیں جب ہی حاصل ہوں گی جب اس کو ادب سے پڑھا جائے گا۔“

اس دینی فضا کا اثر آپ کے والد ماجد پر

آپ کے والد ماجد (صوفی احمد حسین صاحب) کے بارے میں اوپر آچکا ہے کہ دینی جذبہ تو اس درجہ کا تھا کہ ضلع کلکٹر کی بڑی پُرکشش دنیوی ترغیب بھی انھیں اس پر آمادہ نہ کر سکی کہ دینی تعلیم کے بجائے دنیوی تعلیم اپنی اولاد کو دلائیں، لیکن ان کے دینی جذبہ کے پیچھے صحیح علم نہ تھا، نہ ہی صحیح العقیدہ اہل علم سے رابطہ میسر آیا تھا، اس لئے علماء دیوبند سے کوئی عقیدت نہ رکھتے تھے، اگرچہ صاحب سوانح کو حدیث کی تعلیم کے لئے انھوں نے دیوبند بھیج دیا تھا۔ اُن کا یہ قدم جس اخلاص اللہ پر دلالت کرتا تھا اس کی برکت سے یہ در توفیق بھی ان کے لئے ہوا کہ خود دیوبند کا سفر فرمائیں، اور وہاں کے اکابر سے عقیدت کی دولت پا جائیں۔ حضرت صاحب سوانح نے ”تحدیثِ نعت“ میں تفصیل سے اس کا بیان فرمایا ہے، کہ سبق آموز ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

”وہ مکان جس میں حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا، اور اب حضرت کے

گھر والوں کا قیام ہے ہمارے زمانہ طالب علمی میں اس میں مطبع قاسمی اور کتب خانہ قاسمی

تھا۔ جن بیچارے طالب علموں کو مدرسے میں حجرہ نہیں مل سکتا تھا ان کو اس کے ایک خستہ سے کمرہ

میں رہنے کی اجازت دیدی جاتی تھی۔ میں انہی بیچارے طالب علموں میں سے ایک تھا۔ دونوں

سال میرا قیام اسی میں رہا۔ پہلے سال ربیع الاول کا مہینہ تھا اور خوب یاد ہے چودھویں تاریخ تھی

اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا، عشا کی جماعت کا قرب تھا۔ میں اس مطبع قاسمی میں بیٹھا وضو کر رہا

تھا کہ اچانک والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ مطبع قاسمی کا پتہ پوچھتے ہوئے تشریف لے آئے۔ پہلے سے

کوئی اطلاع نہ تھی، بلکہ وہم و گمان بھی نہ تھا، لیکن میرا ذہن منتقل ہوا کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے

ان ہی تاریخوں میں میرا نکاح کلیر کا عرس ہوتا ہے، یہ وہاں عرس میں تشریف لائے ہوں گے، ان کی

بیراں کلیر کے عرس میں حاضری کبھی قصافہ ہوتی تھی، چنانچہ دریافت کرنے پر یہی بتایا کہ کلیر

شریف عرس میں آیا ہوا تھا خیال ہوا کہ دیوبند قریب ہی ہے اس لئے وہاں سے فارغ ہو کر آ گیا

ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ عشا کی جماعت کا وقت ہو چکا ہے وہ با وضو تھے ہم لوگوں کے ساتھ فوراً

جی مسجد تشریف لے آئے۔ اس زمانے میں حوض وہاں تھا جہاں اس وقت مسجد کے فرش کا آخری

حصہ ہے اور چونکہ مسجد میں تنگی ہوتی تھی اس لئے حوض کو کلوی کے تختوں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ اس

پر بھی کئی صفیں ہوتی تھیں۔ ہم لوگ ایسے وقت میں مسجد میں داخل ہوئے تھے کہ نماز شروع ہو چکی

تھی ہمیں آخری صفوں میں حوض پر جگہ ملی، چودھویں رات کی چاندنی کھلی ہوئی تھی اور جمعہ کا دن ہے۔

ہونے کی وجہ سے عام طور سے طلبہ صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، جب رکوع یا سجدے کا وقت ہوتا تو ہم لوگوں کو جو حوض کے اوپر بلندی پر کھڑے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے اترے ہوئے فرشتوں کی صفیں ہیں، میں والد صاحب کے بالکل برابر کھڑا تھا میں نے محسوس کیا کہ والد صاحب پر اس منظر کا کچھ خاص اثر پڑ رہا ہے، نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔ والد صاحب کی باتوں سے میرے اس احساس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ دارالعلوم کی نماز کے اس منظر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔“

مزید فرماتے ہیں:-

”صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کا اس مسجد میں قرآن مجید کا درس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ترجمہ قرآن دارالعلوم کے نصاب میں داخل نہیں تھا۔ مولانا کا یہ درس ان کے ذاتی شوق کا نتیجہ تھا، بڑی وسیع نظر تھی اور خوب بولتے تھے۔ میں نے موقع نکال کر مولانا کے کان میں اس دن عرض کر دیا کہ میرے والد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ عرس اور قوالی کے دلدادگان میں ہیں، ہمارے بزرگوں کے ہارے میں ان کو سخت بدگمانیاں ہیں اور نادہشتی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان دیوبند والوں کو تصوف اور بزرگان دین سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ آج کے درس میں اس کا لحاظ فرمایا جائے۔ حسن اتفاق سے اس دن سورہ یوسف کا وہ مقام زیر درس تھا جہاں یہ ذکر آیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے غلہ وغیرہ لانے کے لئے جب اپنے صاحبزادوں کو مصر کے لئے رخصت کیا۔ تو اس وقت یہ ہدایت بھی فرمائی کہ تم سب مصر میں ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا (یا نہی لا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ) جس کا مقصد اکثر مفسرین نے یہ بتایا کہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے، آخر میں یہ بھی فرمایا کہ وَمَا أُنْصِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ اِنَّ الْيُحْضِرُكُمْ اِلَّا بِاللَّهِ مولانا نے ان آیات پر تفریر کرتے ہوئے توکل کی حقیقت اور توکل اور اسباب کے تعلق پر بھی خوب روشنی ڈالی اور اس دن عارف رومی کے اشعار بھی اس سلسلے میں سنائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مضامین تصوف و معرفت ہی سے متعلق مولانا نے اس دن کے درس

میں ایسے بیان فرمائے جو والد ماجد کے ہی حسب حال تھے۔

آگے فرماتے ہیں کہ ”راویوں نے مولانا کے اس درس

”رات کی نماز میں انھوں نے جو منظر دیکھا — اور پھر صبح کے درس میں جو کچھ سنا اس

سے ان کا ذہن ہمارے اکابر کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا، درس سے فارغ ہو کر جب ہم اُٹھے تو فرمایا کہ میں یہاں کے بزرگوں کے مزارات پر جانا چاہتا ہوں، ہم لوگ ان کو قبرستان لے گئے وہ پہلے حضرت شیخ الہندؒ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور دیر تک بیٹھے رہے اس کے بعد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور ان کے چہرے کے رنگ سے ہم محسوس کرتے رہے کہ ان پر کوئی خاص اثر پڑ رہا ہے، وہاں سے واپسی پر فرمایا کہ ”ان حضرات کا مقام بہت ہی بلند ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہاں کے استادوں میں جو اللہ والے ہوں مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہم سب سے پہلے حضرت میاں صاحب یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے حضرت میاں صاحب کی زیارت اور ملاقات سے بھی والد صاحب بہت متاثر ہوئے اس کے بعد علامہ انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی زیارت کی، ان حضرات کی زیارت سے بھی بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ یہ ہر وقت ذکر میں مشغول اور صاحب نسبت ہیں۔ الغرض ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارے میں ان کی جو بدگمانیاں ہمیشہ سے تھیں وہ غالباً اسی دن ختم ہو گئیں۔ اور اس کے بعد تو ان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوا۔“

حضرت دادا صاحب کے جو حالات اوپر بیان میں آئے یوں تو انہی سے ظاہر تھا کہ وہ نام کے صوفی نہیں تھے، ”صوفیاء کرام“ میں سے تھے۔ (بعدِ عشاء چار ہزار بار درود شریف قبلہ رو کھڑے ہو کر مدتوں پڑھنا۔ تہجد نائغہ ہو جائے تو روزہ کی نیت کر کے اس کی تلائی کرنا۔ اس کے علاوہ حضرت صاحب سوانح کے بیان میں جو آنے سے رہ گیا، وہ ان کی چلہ کشی، یہ مجاہدہ انھوں نے جوانی میں کیا۔ اور ایسے مجاہدے ہی یہ روحانی طاقت پیدا کرتے ہیں جن سے نفس پر بلا سحری روزہ کی مشقت ڈال دی جائے، اور روزمرہ چار ہزار بار درود شریف کھڑے ہو کر مدتوں پڑھی جاسکے۔) اب یہ دارالعلوم میں ان کی آمد کے حوالہ سے جو بیان ہم پڑھ رہے ہیں اس سے یہ حقیقت بالکل ہی عیاں ہو رہی ہے کہ وہ صوفیاء کی اصطلاح میں ”صاحب ادراک“ ہستیوں میں سے بھی تھے۔ اکابر کے مزارات پر مراقب ہو کر بیٹھنا، ان کے مقامات عالیہ کا ادراک کرنا یہ ایک صاحب مقام ہی کا مرتبہ ہے۔ علیٰ ہذا دارالعلوم کے زندہ اکابر کی صحبت میں بیٹھ کر ان کے مشغول مع اللہ ہونے پر آگاہی۔ الغرض ان کے روحانی مراتب میں جو کچھ پوشیدہ تھا وہ دارالعلوم کی فضا میں بالکل

دوسرا باب

(درس و تدریس اور دین حق کا دفاع)

درس و تدریس کے چار سال

دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد آپ نے آئندہ ہی سال سے اپنے بزرگوں کا پسندیدہ شغل تدریس اختیار فرمایا۔ سنبھل کا مدرسہ محمدیہ جو آپ کے محلے ہی میں واقع تھا اور اسی میں آپ کی اپنی تعلیم کی ابتداء بھی ہوئی، شوال ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۷ء) میں وہیں سے آپ کی تدریسی خدمات کا آغاز ہوا۔ اگلے سال سے یہ خدمات آپ ہی کے ضلع کے دوسرے مشہور و معروف قصبے امر وہہ کے ایک مدرسے کی طرف منتقل ہو گئیں۔ اور وہاں یہ سلسلہ تین سال رہا۔ یہ مدرسہ اپنی جائے وقوع ”محلہ چلہ“ کی مناسبت سے مدرسہ اسلامیہ چلہ کے نام سے معروف تھا۔ اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر اس میں تدریسی خدمات انجام دے چکے تھے۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں ”تعلیم سے فراغت کے بعد“ کے زیر عنوان ارشاد ہوا ہے کہ:

”شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی۔ اس کے اگلے سال اپنے وطن کے مدرسہ محمدیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد یہی سلسلہ تین سال تک امر وہہ کے ایک مدرسے میں قائم رہا جو اپنے جائے وقوع محلہ چلہ کی مناسبت سے مدرسہ (اسلامیہ) چلہ کے نام سے معروف تھا۔“

اس زمانے کے بعض تجربات

تدریس کے زمانے کی اس سے زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ ”میری زندگی کے تجربات“ میں اس دور کے کچھ تجربات جن میں اہل مدارس کیلئے غور و فکر کا سامان ہے درج فرمائے ہیں۔ ان کا ایک حصہ یہاں نقل

کر دینا مناسب ہوگا۔ فرمایا ہے:

”طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے چار سال درس و تدریس کا مشغلہ رہا، اس سلسلہ کا کوئی قابل ذکر تجربہ اس وقت مجھے یاد نہیں بجز اس کے کہ جتنے طالب علموں سے واسطہ پڑا (اور نہ صرف اپنی مدرسے کے اس زمانہ میں بلکہ زمانہ طالب علمی میں بھی جن چھوٹے یا بڑے مدرسوں میں جتنے طلبہ کا ساتھ رہا) عام طور پر ان کو علم دین کے حقیقی مقصد اور اپنی زندگی کے نصب العین سے بڑی حد تک میں نے بے خبر اور نا آشنا ہی دیکھا۔ اور جن کو کچھ ہوشمند بھی پایا، جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ بھی اچھے عالم، اچھے مدرس، کامیاب خطیب یا کامیاب مصنف بننے سے بالاتر اپنی طالب علمانہ جدوجہد کا کوئی اہم مقصد عام طور سے غالباً اپنے پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔ اور اپنے حقیقی مقصد اور اعلیٰ نصب العین سے اس درجہ ہول اور غفلت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مستقبل کے متعلق ان کے خیالات اور عزائم میں کوئی عظمت بلکہ وضاحت بھی نہیں تھی۔ علیٰ ہذا جذبات اور حوصلوں میں جو بلندی ہونی چاہئے تھی قطعاً نہیں تھی۔ اور ایسے ہی مٹھی تھپڑوں کے شعور سے بھی ان کے دل و دماغ خالی تھے۔۔۔

”میرا خیال ہے کہ ہماری دینی درس گاہوں کے طالبین میں جو سطحیت، نظروں میں جونگی، عزائم میں جوابہام یا پستی اور اپنی قدرو قیمت سے نا آشنائی اور بیجا احساس کمتری اور کہتری کا جو عام طور سے مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ سب اسی مقصد فراموشی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہمارے مدارس اپنے طلبہ کو ان کے مقصد حیات اور دینی نصب العین سے واقف اور خاص ذہنی تربیت کے ذریعہ ان کو اس کا فدائی بنانا بھی اپنے کام کا جزو بنالیں تو ان شاء اللہ یہ افسوسناک صورت حال ہرگز باقی نہ رہنے گی۔“

اور پھر اس زمانے کے خود اپنے حال کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”میں چونکہ اس بارے میں ایک عرصہ تک خود اندھیرے میں رہا ہوں اور اپنے اس ذاتی تجربہ ہی کی وجہ سے جانتا ہوں کہ علم دین کے کسی طالب علم یا حامل کے لئے یہ اندھیرا کتنی بڑی محرومی اور کیسا خسران مبین ہے، اس لئے میرے نزدیک دینی مدرسوں کے سلسلہ کی ایک سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کی فضا میں مقصد سے عشق اور وابستگی کی روح پھونکنے کی خاص کوشش کی جائے اور ان کے ہر چھوٹے بڑے طالب علم کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں یہ اتار دیا جائے کہ تم کیا چیز ہو، کس راہ کے تم مسافر ہو اور تمہاری منزل کیا ہے۔ تمہاری ظاہری خلشگی اور خشکی کے باوجود، مقصد اور کام کے لحاظ سے اللہ کی مخلوق کے درمیان تمہارا مقام، تمہارا وزن اور تمہاری قدرو قیمت کیا ہے، اور کون تمہاری قیمت لگانے والا ہے۔“

.....در کفے سندانِ عشق!

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ”در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق“ کے مصداق ایک وہ مشغلہ بھی شروع ہوا جسے عمومی زبان میں ’منظرہ‘ کہا جاتا ہے، لیکن یہاں اس کی جو حقیقت تھی اس کا اظہار ”دین حق کا دفاع“ جیسی تعبیر ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور اس میدان میں خدمت کی تفصیلات سامنے آتی ہیں تو ایک کیفیتِ عشق کے سوا کوئی دوسرا نام اس کو نہیں دیا جاسکتا۔ ”تحدیدِ نعمت“ میں ارشاد ہوا ہے:

”یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کو چند شدید قسم کے فتنوں سے سابقہ تھا، جن میں سے بعض داخلی تھے اور بعض خارجی۔ خارجی فتنہ آریہ سماج کی ہندو متی تحریک کا تھا۔ داخلی فتنوں میں ایک طرف قادیانیت کی یلغار تھی، ہر طرف ان کے مناظر و مبلغ پھیل رہے تھے۔ اور دوسری طرف بریلوی مکتبِ شرک و بدعت نے سر اٹھا رکھا تھا۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک جو ان دنوں میں ملک اور ملت دونوں کے اندر فتنہ انگیز عناصر کے لئے سدا راہ بنی ہوئی تھی اس تحریک کا زور ٹوٹنے ہی ان فتنوں نے سر اٹھالیا۔ بریلوی مکتبِ خیال کو اس سلسلہ میں ایک تازہ بہ تازہ فتنہ انگیز عنوان بھی ہاتھ آ گیا۔ اور وہ یہ کہ ترکی خلافت عثمانیہ کا حجازی گورنر شریف حسین جو برطانوی حکومت کے دامِ فریب میں آکر حجاز کا خود مختار حاکم بن بیٹھا تھا، نجد کی سعودی حکومت کے سربراہ عبدالعزیز ابن سعود نے اس کے ہاتھ سے حجاز مقدس چھین کر اپنے دائرہ حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اور پھر اپنے مسلک کے مطابق انھوں نے وہاں کے مزارات کے قبوں کو منہدم کیا، جن کو وہ اسلامی نقطہ نظر سے منکر اور واجب الازالہ سمجھتے تھے۔ بریلوی فکر کے نمائندوں نے حجازِ پاک میں ہونے والے اس واقعہ پر اپنے ردِ عمل کے اظہار میں علماء دیوبند کو بھی نشانہ بنالیا۔ جنھیں وہ سعودیوں کا ہم مذہب ٹھہرا کر ”دہائی“ ہی قرار دیتے تھے۔ اور اس طرح توحید و سنت کے ان خادموں پر حملوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ ہمارا ضلع مراد آباد اس زمانہ میں بریلوی فرقہ کے مشہور زعمیم مولوی نعیم الدین صاحب کی وجہ سے اس فتنے کا خاص مرکز تھا۔ گلی کو چے بلکہ گھر گھر یہی چہچاہے۔

”اس فضا سے متاثر ہو کر اس عاجز نے بریلوی فتنے کے خلاف دیوبند کے زمانہ طالب علمی ہی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ باقی دونوں فتنوں (قادیانیت اور آریہ سماجیت) سے مقابلہ کا داعیہ اور اس کی صلاحیت بھی بفعیلِ خدا اپنے اندر پائی تو تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ان سب کے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہر مقابلے

مناظر اور اس کے مشیروں معاونوں تک کا سفر خرچ دینا بھی اپنے ذمہ کر لیا اور دیا۔ اور ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سب کچھ طے ہو جانے اور مناظرہ کے انتظامات مکمل ہو جانے کے بعد فریقِ ثانی کے مناظر وقت پر نہ پہنچے تو ان کو بذریعہ تار نوٹس دے کر، کہ اگر آپ نہیں آئیں گے تو سارا ہرجہ خرچہ ادا کرنا پڑے گا، آنے پر مجبور کر دیا اور مناظرہ کر کے چھوڑا۔ غرض مناظرے کا شوق کیا تھا اچھا خاصہ طوفان تھا جو روز افزوں طغیانی ہی پر تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ کی عنایت سے اور بظاہر اسباب اپنی تیاری اور اس راہ کے داؤ گھات سے واقف ہو جانے کی وجہ سے بھی ہر میدان میں پالی اپنے ہی ہاتھ رہتی تھی۔ غرض یہ چیز بھی اس شوق کی ہمت افزائی کا بڑا باعث ہوئی۔“

مناظرانہ معرکے اور اُن کی کچھ جھلکیاں

مناظروں کا یہ سلسلہ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء سے شروع ہو کر (جبکہ حضرت صاحبِ سوانح عمر کے تیسویں سال میں تھے) ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء تک جاتا ہے۔ شروعات بریلوی حضرات سے ہوئی۔ اور زیادہ تر یہ سلسلہ انہی کے ساتھ ہی رہا اور دوسرے نمبر پر آریہ سماج۔ ذیل میں اُن مناظروں میں سے ان مناظروں کی کچھ جھلکیاں دی جا رہی ہیں جن کی روداد چھپی یا آپ کے یا کسی دوسرے کے قلم سے ان کا کچھ بیان دستیاب ہے۔ ورنہ مناظروں کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے۔

پہلا مناظرہ، درو (ضلع نئی تال)

پہلا مناظرہ محرم ۱۳۴۷ھ/ جولائی ۱۹۲۸ء میں آپ کے ضلع مراد آباد سے متصل ضلع نئی تال کے ”درو“ نامی ایک گاؤں میں ہوا۔ مقابل میں بریلوی مسلک کے نمائندہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے مدرسہ منظر الاسلام بریلی کے شیخ الحدیث مولوی رحمہ اللہ صاحب تھے۔ مناظرے کا باعث دیکھتے تو ماتم کرنے کی جا ہے کہ، کیا فتنہ آرا ذہنیت کا تحفہ بریلوی مکتب فکر نے بے خبر مسلمانوں کو دے رکھا تھا! گاؤں کی ایک لڑکی کی شادی گاؤں کے باہر ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوئی جس کا تعلق دیوبندی مکتب فکر سے تھا۔ گاؤں بڑی طرح بریلویت زدہ تھا۔ لڑکی کی برادری کو روغلا یا گیا کہ نکاح فسخ کر لیا جائے کیونکہ دیوبندی تو مسلمان نہیں۔ لڑکی کے سرال والوں نے کہا کہ ہمارے عقیدوں کے بارے میں الزامات بالکل بے اصل ہیں۔ اور ہم ان سے بری ہیں۔ آپ لوگ نہیں مانتے تو اپنے ان عالموں کو بلائیں جن سے آپ ہمارے بارے میں یہ بے سرو پا باتیں سنتے ہیں۔ ہم اپنے عالموں کو بلا کر اس بات کی حقیقت سب کے سامنے صاف کر دیں گے۔ شادی کوئی

ہنسی کھیل نہیں کہ کل ہوئی اور آج تو زدی جائے۔ یہ بنا اس مناظرہ کی بنی۔

مناظرہ کے چار موضوع تھے، تین دن میں تین موضوع بنائے گئے۔ یہ تین موضوع تین اکابر دیوبند کی عبارتیں تھیں جن کے حوالہ سے ان بزرگوں کو کافر بتایا جاتا تھا۔ چوتھا موضوع تھا مسئلہ علم غیب (یعنی آنحضرت ﷺ) کو عالم الغیب ماننے کا مسئلہ اس کے بارے میں طے ہوا کہ یہ بحث درو کی آبادی کے فہم سے بالاتر ہے اس لئے اس کو پنپانے کے واسطے، بریلی، مراد آباد جیسا کوئی قریبی شہر رکھا جائے۔ اور بریلی کی صورت میں جملہ انتظامات کے ذمہ دار مولانا رحم الہی صاحب ہوں، مراد آباد منظور ہو تو ذمہ داری مشترکہ طور پر ہر دو فریق کی۔ مگر جناب رحم الہی صاحب ان میں سے کسی بات کے لئے بھی تیار نہ ہوئے۔ تب سنبھل کا نام یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ ”اگر جناب سنبھل کو منظور فرمائیں تو ہم انتظامات کے کفیل ہوں گے۔ حتیٰ کہ آپ چاہیں تو کرایہ بھی آپ کو دیا جائے گا۔“ یہ آخری بات منظور کی گئی، اور کوئی چار ماہ بعد، ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ میں، اس مناظرہ کے باقی ماندہ حصہ کی تکمیل ہو پائی۔

نما بقہ تین دن کے مناظرہ کا انجام کیا رہا؟ اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مناظرہ کے باقی حصہ کے بارے میں اپنی مرضی کی قرارداد کے باوجود مولانا رحم الہی صاحب نے کوئی دقیقہ اس کوشش میں اٹھا کے نہ رکھا کہ بات رفت گزشت ہو جائے اور ان کو سنبھل نہ جانا پڑے۔ رد واد میں پوری تفصیل ہے۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں قدرے اختصار کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ”صفر ۱۳۴۷ھ کے آغاز ہی سے اس مناظرے کے سلسلے میں تاریخ و شرائط جیسی باتیں طے کرنے کے لئے اہل بریلی سے خط و کتابت شروع کر دی گئی۔ ایک رجسٹری انکاری واپس آنے کے بعد دوسری رجسٹری کا جواب ۲۲ صفر کو ان الفاظ میں ملا ”خیر اب ہم بالکل تیار ہیں۔ اور آمد و رفت اور خورد و نوش کے خرچ کے منتظر ہیں۔ لہذا جلد از جلد تاریخ مناظرہ اور مقام مناظرہ کہ سنبھل میں کس جگہ ہوگا اور شرائط مناظرہ مقرر فرما کر اور اسکے ساتھ آمد و رفت اور خورد و نوش کا خرچ نقد روانہ فرمادیجئے۔“

مناظرہ سنبھل

اس کے جواب میں جو مزید خط و کتابت کی نوبت آئی اس کا مختصر حوالہ دیتے ہوئے آگے فرمایا ہے: ”۔۔۔ آخری بات یہ ہے کہ جب مناظرہ کے لئے ۲۲ تا ۲۳ جمادی الاولیٰ مقرر ہو گئی اور ادھر سے حسب وعدہ سفر خرچ کا مئی آرڈر بھی چلا گیا تو بجائے کسی رسیدی جواب کے ایک اشتہار بعنوان ”کھلا خط“ ٹھیک ۲۱ جمادی الاولیٰ کو موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا:۔۔۔

”جناب مولوی منظور حسن صاحب خصوصاً جمیع وہابیہ سنبھل عموماً، دروڈ میں جو قرآن اور اہل سنی
تھی اس کے مطابق میں آپ سے مناظرہ کے لئے تیار تھا اور ہوں لیکن معلوم ہوا کہ تلمیذ رشید
عزیز سعید شیر پیٹھ اہل سنت مولوی حشمت علی خاں صاحب کے مقابلے میں آپ کا سارا گروہ
عاجز رہا۔ خدا و رسول جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ نے عزیز موصوف کو آپ کے گروہ کے مقابلے
میں پانچ روشن تحسین اور آپ کے گروہ کو پانچ بار شرمناک شکستیں دیں۔ لہذا وہ مناظرہ
جو قرآن و ضلع نبی تال کے مطابق طے ہوا تھا ختم ہو چکا، کہ جو لوگ میرے تلمیذ سعید کے سامنے
اپنا اسلام ثابت کرنے میں عاجز رہے وہ میرے سامنے ایک فرعی مسئلے علم غیب میں لب کشائی
کا کیا حق رکھتے ہیں؟۔۔۔۔“

اس جوابی اشتہار کا صاف مطلب یہ تھا کہ شیخ الحدیث صاحب دروڈ کے بعد مزید تجربہ کے لئے تیار
نہیں ہیں، حتیٰ کہ سفر خرچ و وصول فرما کر بھی۔ دوسرے الفاظ میں انچ پیچ کے ساتھ اعتراف شکست۔ اور سنبھل
میں اُن کے اس اعتراف کی تشبیہ سے مدعا حاصل ہو جاتا تھا۔ کوئی ضرورت نہ رہتی تھی کہ مزید خط و کتابت کی
جائے۔ مگر یہاں تو میدان میں شکست دینے کی لگن وہ تھی، جو ادھر گزری، کہ ”کسی ذریعہ سے اطلاع ہوئی کہ
ان کا فلاں مشہور مقرر و مناظر فلاں جگہ پہنچا ہوا ہے تو اپنے ہی کرایہ سے ’مان نہ مان میں ترا مہمان بن کر
جادوہ کا‘ پس یہ اشتہار ملنے پر فوراً ہی ایک نوٹس ۲۲ تاریخ کو جوابی تار کے ذریعہ دیا گیا کہ
”فورا آئیے، ہر قسم کی بہانہ بازی چھوڑ دیجئے ورنہ جملہ ہرجے کے آپ ذمہ دار
ہوں گے۔“ (تحذیر نعت صفحہ ۴۵)

آگے بتایا گیا ہے کہ موصوف آتو گئے۔ مگر ساتھ میں ”تلمیذ رشید، شیر پیٹھ، اہل سنت“ کو بھی لائے
اور مناظرہ کے لئے خود کھڑے ہونے کو کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ بلکہ ”تلمیذ رشید“ ہی کو اپنا وکیل بنانے
کھڑا کرنے پر اصرار کیا۔ پر ظاہر ہے کہ جس مسئلے پر حضرت استاذ ہی بحث سے گریزاں تھے وہاں کسی تلمیذ
رشید و سعید سے کیا بات بنتی؟ رد و داد بتاتی ہے کہ ”ان“ ”عزیز سعید“ نے پورے دودن تو ”سوال کچھ اور جواب
کچھ“ کے میدان میں اپنی مہارت دکھانے کا وہ منظر پیش کیا کہ خود ان کی جماعت شرم سے پانی پانی ہونے
لگی۔ مسئلہ زیر بحث رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کا تھا اور وہ اپنی جوابی تقریر میں بحث کا موضوع بنا ڈالتے
تھے اکابر و پوہند کے اسلام اور کفر کو۔ موضوع بحث سے ان کے فرار کی یہ کیفیت دودن میں اتنی روشن ہو گئی کہ
بالآخر ان کی جماعت کے سرغنہ بھی تاب نہ لائے اور انھیں مجبور کیا کہ موضوع پر بات کریں۔ اس کے نتیجے
میں انھیں بھی کچھ شرم آہی گئی اور کوشش شروع کی کہ دوسری طرف کی انکاری آیات و احادیث کے مقابلے

میں کچھ ثبوت علم غیب والی دلیلیں لائیں۔“ مگر کہاں سے لاتے، اس مال سے تو ان کے ”شیخ الحدیث“ استاد کی گرہ بھی خالی نکلی تھی۔ اس لئے مناظرہ کے آخری دن محمد اللہ یہ بات بالکل روشن ہو گئی کہ عالم الغیب والہ شہادہ صرف اسی کی ذات وحدۃ لا شریک ہے، اور کوئی بھی بندہ چاہے وہ نبی و رسول کے مرتبہ کا ہو، بلکہ ان سب میں بھی افضل و اشرف کیوں نہ ہو اس کے لئے علم غیب کی صفت کا دعویٰ کرنا قطعی طور پر خلاف قرآن وحدیث ہے۔

مناظرہ لاہور، یا فیصلہ کن مناظرہ!

اس کے بعد ان حضرات سے جن مناظروں کی روداد دستیاب ہے وہ چار ہیں۔ ۱۳۵۲ھ میں لاہور کا مناظرہ ۱۳۵۴ھ میں گیا (صوبہ بہار) کا مناظرہ، اسی سنہ (۱۳۵۳ھ) میں بریلی کا مناظرہ۔ اور پھر ۱۳۵۶ھ میں سلاٹوالی (پنجاب) کا مناظرہ۔ یہ سب رودادیں اب اسے کچھ عرصہ قبل فتوحات نعمانیہ کے نام سے پاکستان میں تقریباً ۹۰۰ صفحات کی ایک جلد میں چھپ گئی ہیں، اور حسب دستور ہندوستان میں بھی بعض تاجران کتب نے چھاپ لی ہیں۔ پس دونوں جگہ دستیاب ہیں۔ چار مناظروں کی رودادوں کی مجموعی ضخامت ۹۰۰ صفحات سے بتا رہی ہے کہ ہر روداد ایک پوری کتاب تھی۔ اور ہونی بھی چاہئے تھی کیوں کہ مناظرے بالعموم تین تین دن کے تھے۔ سوائے مناظرہ لاہور کے کہ یہ شروع مشکل سے ہوا تھا کہ ختم بھی ہو گیا۔ پھر بھی ۱۰۰ سے اوپر صفحات اس کے نام سے بھی اس بنا پر ہیں کہ اس مناظرہ کی قرارداد ایک ”فیصلہ کن“ مناظرہ کی حیثیت سے بایں طور ہوئی تھی کہ اس کے نتیجہ کا فیصلہ تین مقرر حکم کریں گے۔ ان حضرات میں پہلا نام علامہ محمد اقبال مرحوم کا تھا، باقی دونام، مولانا اصغر علی زوجی اور شیخ صادق حسین بیرسٹریٹ لا۔ علامہ اقبال کا تو کہنا ہی کیا، باقی دونوں حضرات بھی لاہور کے نامور اصحاب میں تھے۔ اس خاص نوعیت کی قرارداد کا باعث یہ تھا کہ ہر مناظرہ اپنی اپنی فتح کے دعوے پر ختم ہو جاتا ہے اور جو مقصد ہے کہ قضیہ کا فیصلہ ہو، وہ پورا نہیں ہو پاتا۔ پس ایسے اصحاب کو جج اور حکم بنالیا جائے جن کی فہم و فراست بھی مسلم ہو اور غیر جانبداری بھی شک و شبہ سے بالاتر۔ یہ مناظرہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ اس میں جانشین مولانا احمد رضا خاں، مولانا حامد رضا خاں صاحب بھی شرکت فرمانے والے تھے۔ ۱۵ شوال ۱۳۵۲ھ اس کی تاریخ تھی۔ صاحب سوانح ”تحدیثِ نعمت“ میں رقمطراز ہیں:

”اس عاجز کی نظر میں یہ ہونے والا مناظرہ مسلمانان ہند کی تاریخ میں ایک یادگار ورق

منجانبے جارہا تھا۔ اور لازم تھا کہ کوئی چیز اس کی راہ میں اپنے امکان بھر حائل نہ ہونے دی

جائے، چنانچہ بریلوی فریق کی ایک ایسی شرط بھی اس سلسلہ میں منظور کی گئی جس کا کوئی جواز بھی ان کے لئے نہ تھا اور ہمارے لئے اس کا پورا کرنا آسان بھی نہ تھا۔ شرط یہ تھی کہ جس طرح وہ اپنے لئے طے کرتے ہیں کہ ان کی طرف سے مناظر مولانا حامد رضا خاں ہوں گے یا ان کا وکیل، اسی طرح ہم اہل دیوبند کی طرف سے بھی مانا جائے کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مناظر ہوں گے یا ان کا وکیل۔ یہ بات کہ ہماری طرف سے بھی مناظر کا نام ہمارا مقابل فریق طے کرے ایسی عجیب و غریب بات شاید ہی کبھی سننے میں آئی ہو! اور پھر جو نام تجویز فرمایا گیا تھا، یعنی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، ان کے بارے میں دنیا جانتی تھی کہ بریلوی جماعت کے معاندانہ اور مہذب دھرم اندرونیوں کا تجربہ فرمانے کے بعد اپنے اصولوں کی رو سے ان کو کبھی قابل خطاب ہی نہ سمجھا تھا، پس بذات خود ان کے مقابلہ میں مناظر بننے کے لئے لاہور تشریف لانے کا تو سوال ہی کیا تھا، اپنی طرف سے کسی کو وکیل اور مجاز بنادیں یہی مشکل بات تھی۔

”بظاہر اس قطعی نامعقول شرط کی وجہ یہی تھی کہ یہ بریلوی حضرات سمجھتے تھے کہ مولانا صاحب خود تو کیا آویں گے وہ اپنا وکیل بھی کسی کو بنانے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ پس مناظرہ ہی نہ ہوگا۔ اور ان کی یہ کوشش (کہ مناظرہ ٹل جائے) اس لئے ہوئی ہی چاہئے تھی کہ حج اور حکم والی ہماری شرط انھوں نے مان تو لی تھی مگر یہ بات ان کے مان کی نہ تھی۔ اس لئے کہ اکابر دیوبند کے خلاف ان کی تکفیری مہم کے کسی غلط فہمی اور سنجیدگی پر مبنی ہونے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی، اس کے برعکس تمام علامتیں اس بات کی تھیں کہ یہ ایک سوچے سمجھے کاروبار والی مہم ہے۔ لیکن چونکہ یہاں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کچھ بھی ہو اس تاریخی موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا ہے۔ اس لئے جب بریلوی فریق اپنی اس ناروا شرط کے بارے میں کچھ سننے کو تیار نہ ہوا تو یہ بھی بان لی گئی اور سوچ لیا گیا کہ ان شاء اللہ حضرت حکیم الامت (رحمۃ اللہ علیہ) معاملے کی اس خاص نوعیت کے پیش نظر خدام کی بات قبول فرمائیں گے۔

”الحمد للہ کہ یہ توقع پوری ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حسب ذیل وکالت نامہ تحریر

فرمادیا:

”مقام تھانہ بھون، ۱۵/۱۲/۱۳۵۲ھ

بعد حمد و صلوة۔۔۔ (اس کے بعد چند تمہیدی سطریں ہیں۔ بعد ازاں یہ الفاظ آتے ہیں): اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ رسالہ ”حفظ الایمان“ مؤلفہ احقر پر اعتراض کرنے والوں کے متعلق میرا عمل ہمیشہ سے اپنے مذاق کے مطابق یہ ہے کہ نفس مسئلہ کی تبلیغ اور متروک دین کی تشفی

کے لئے خود رسالہ ”حفظ الایمان، بطل البدان، تغیر العوان“ لکھ چکا اور معاندین کو کہیں خطاب نہیں کیا۔ مگر بعض احباب بعض مواقع میں دوسرے مذاق پر عمل کو نافع سمجھتے ہیں اور ان بعض مواقع پر بعض حالات کے اقتضاء سے اس نافعیت میں اس کی حاجت ہے کہ میں کسی کو اپنا وکیل بنادوں۔ اس لئے سردست میں اپنی طرف سے اس تفہیم کے لئے ان بزرگوں کو اپنا وکیل بنانا ہوں۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی۔ جناب مولانا محمد منظور صاحب سنہلی۔ مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب سنہلی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے ارشاد و تفہیم میں نفع و برکت بخشے۔ اِن اَرِید اَلَا اَصْلَاح و مَا تَوْفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰہِ۔
کتبہ اشرف علی تھانوی

”یہ وکالت نامہ لے کر خاکسار (محمد منظور نعمانی) اور مولانا ابوالوفا صاحب نیز مولانا محمد اسماعیل صاحب سنہلی تاریخ مناظرہ سے تین چار دن پہلے ہی لاہور پہنچ گئے۔ لیکن، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ دیوبندی مناظر کے لئے حضرت حکیم الامت کی طرف سے وکالت نامے کی شرط لگانے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ شرط پوری نہ ہو سکے گی، اور اس طرح اس مناظرے سے جان چھوٹ جائے گی جس میں ایسے معروف و موثر حضرات کو حکم بنانا مان لیا گیا ہے، اس اندازے کی پوری تصدیق ہم لوگوں کے لاہور پہنچنے پر اس طرح ہو گئی کہ وکالت نامہ سامنے آجانے پر مناظرے سے دو دن پیشتر بریلوی حضرات کا ایک وفد جس میں مولوی حشمت علی صاحب، مولوی عبدالحفیظ اور مولوی سید محمد صاحب وغیرہ شامل تھے ہمارے پاس آیا اور ایک نئی شرط یہ عائد کی کہ اس وکالت نامے کی تصدیق جماعت دیوبند کے دو مستند عالموں کو کرنی ہوگی۔ ہم نے تو ہر قیمت پر مناظرہ ہو جانا طے کیا ہوا تھا، اس لئے جب ان کو ہند دیکھا تو اس کو بھی مان لیا۔ یہاں بھی ان کو ناکامی ہوئی اور مناظرہ رہ جانے کا بہانہ نہ مل سکا تو اگلے دن ایک نیا شگوفہ کھلایا، کہ مناظرہ کی جگہ کے سلسلہ میں اگرچہ یہ طے ہو چکا تھا اور تحریر میں آچکا تھا کہ حج صاحبان اگر جمع عام والے مناظرہ میں حصہ لینے کو تیار نہ ہوئے تو بس ایک ایک مناظرہ اور دس دس معین مجلس مناظرہ میں شریک ہوں گے۔ مگر جب حج صاحبان نے اس تجویز اور معاہدہ کی روح اور اسپرٹ کے مطابق یہ بھی چاہا کہ مناظرہ کی مجلس کسی تحفے کی (پرائیویٹ) جگہ میں ہو، نہ کہ کسی ایسی جگہ میں جہاں عام مجمع ہو سکتا ہو، تو ان حضرات نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور بغیر ہمارے مشورے یا علم و اطلاع کے اشتہار شائع کر دیا کہ مناظرہ کا مقام مسجد وزیر خاں ہوگی، جو کہ لاہور میں بریلوی حضرات کا مرکز تھا۔ مزید برآں بالکل خلاف واقعہ طور پر یہ بھی شائع کیا کہ

علامہ اقبال اور مولانا روجی نے کسی حالت میں بھی ثالثی سے انکار کر دیا ہے جس کی تردید خود ان دونوں حضرات کی طرف سے اخبارات اور اشتہارات میں نکلی۔

”ہم نے اس سب کے باوجود طے کئے رکھا کہ مناظرہ سے انکار ہمیں نہیں کرنا ہے۔ چنانچہ ۱۵ ارشوال کی مقررہ تاریخ کو ہم لوگ مسجد وزیر خاں پہنچ گئے۔ اب مجمع عام میں حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا وکالت نامہ پیش کیا گیا تو مستند دیوبندی عالموں کی طرف سے اس کی تصدیق کی بریلوی شرط پوری کرنے کے لئے انھیں حضرات کی طرف سے لئے گئے ناموں کے مطابق حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا عبدالحنان صاحب خطیب آسٹریلیا مسجد نے وہیں اس کی تصدیق تحریر کر دی۔۔۔

”اس تحریری تصدیق کی بات سامنے آنے کے بعد کسی کے ذہن میں کوئی شبہ اس بارے میں نہ رہا ہوگا کہ اب مناظرہ کی بساط بچھ گئی ہوگی۔ مگر نہیں، اب ایک نیا مطالبہ ہوا۔ وہ یہ کہ لاہور کے دیوبندی علماء تحریر دیں کہ ”ہم محمد منظور کو مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کا وکیل تسلیم کرتے ہیں۔“ مطلوبہ تحریر مولانا حامد رضا خاں صاحب اور مولانا نعیم الدین صاحب کی تجویز فرمودہ تھی جو ان کی طرف سے صدر جلسہ جناب مولوی سید حبیب صاحب ایڈیٹر اخبار سیاست لاہور کے ذریعہ ہم لوگوں تک آئی۔ مگر اس کی نامعنویت سے بھی صرف نظر کر کے موجود علمائے دیوبندی طرف سے تحریر دیدی گئی تاکہ کسی طرح تو مناظرہ ہو۔ اور اسی لئے ان کی یہ مضحکہ خیز بات بھی قبول کر لی گئی کہ مولانا حامد رضا خاں صاحب جو بریلوی جماعت کے سربراہ تھے مناظرہ میں تو تشریف لائے مگر مناظرہ ان کی طرف سے ان کے وکیل کی حیثیت سے مولوی حشمت علی صاحب کریں گے، اسکے لئے موصوف نے تحریر عطا فرمائی کہ

”میں لاہور کے فیصلہ کن مناظرہ کے لئے اپنی طرف سے مولوی حشمت علی صاحب سلمہ کو اپنا وکیل مطلق بناتا ہوں، وکیل موصوف کا قول، قبول، عدول سب میرا اور ان کی فتح و شکست میری فتح و شکست ہے۔“

”یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد اس عاجز کے اور مولوی حشمت علی صاحب کے درمیان مناظرہ کے طریق کار پر باضابطہ گفتگو شروع ہوئی اور اس سلسلہ میں میری یہ شرط موصوف نے مان لی کہ مناظرہ میں مدعی کی پوزیشن میری ہوگی۔ لیکن اس کے بعد اپنے لئے وہ حق طلب کیا جو فن مناظرہ کی اصطلاح میں ”مجیب“ کا ہوتا ہے۔ یعنی ہر بحث میں آخری اور اختتامی تقریر کا حق۔ حالانکہ فن کے اصول و قواعد کی رو سے یہ حق مدعی کا ہوتا ہے اور اسی کو اصطلاحی ”مجیب“ کی پوزیشن حاصل ہوتی ہے۔ موصوف نے اس میں بحث کرنی چاہی تو ان کو اس فن کی مستند اور مسلم

کتاب رشیدیہ دکھائی گئی۔ لیکن وہ اپنی بے قاعدہ ضد سے باز آنے کو تیار نہ تھے۔ حتیٰ کہ ان کی طرف سے صدر جلسہ نے پوچھا کہ اچھا اب کیسے اس نزاع کا فیصلہ ہو؟ تب ان سے عرض کیا گیا کہ پروفیسر مولانا اصغر علی روجی جن کا نام آپ حضرات ہی کی تحریک پر ججوں میں شامل کیا گیا تھا میں اس معاملہ میں ان کو حکم تسلیم کرتا ہوں وہ جو فیصلہ فرمادیں گے میں قبول کر لوں گا، لیکن مولوی حشمت علی صاحب اس کو قبول کرنے کیلئے بھی آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہلا دن تمام ہو گیا۔“

اقتباس طویل ہوتا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ دوسرا دن پھر اسی نا تمام بحث سے شروع ہوا جسے ان حضرات کے صدر جلسہ کی یہ مصالحتی تجویز مان کر ختم کیا گیا کہ ”مجیب“ کے حق میں مولوی حشمت علی صاحب کی شرکت تسلیم کر لی جائے، کہ ایک بار وہ آخری تقریر کے حق کو استعمال کریں اور ایک بار آپ۔ لیکن شرطوں کی زنجیل سے پھر ایک شرط برآمد! اور اس پر ضبط و تحمل نے جواب دیدیا۔ فرماتے ہیں:

”مجبوراً اب اس عاجز نے کہا کہ شرطوں کا قصہ ختم کیجئے، میں بلا شرط مناظرہ شروع کرتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر خطبہ مسنونہ سے آغاز کر کے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے مرتب کردہ فتوائے حسام الحرمین کے خلاف اپنے دعوے کی تقریر شروع کر دی۔ (جس کی چار بحثوں پر مناظرہ طے ہوا تھا۔ یہ بحثیں اکابر دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا ظلیل احمد سہارنپوری اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (رحمۃ اللہ علیہم) پر الزامات سے متعلق تھیں) اس تقریر کا جواب بریلوی سمت سے اُس ہنگامہ آرائی اور شور کے ذریعہ دیا گیا جس نے پولیس کو مداخلت کرنے اور مناظرہ کا پروگرام ختم کرانے پر مجبور کر دیا۔ یعنی مناظرہ بہر حال نہ ہو سکا۔“

”فتح مبین“ کا اشتہار!

آگے جو ہوا، وہ اس سب قصے سے بڑھ کر لا جواب! فرماتے ہیں:

”اس کے بعد یہ عاجز لاہور سے واپس ہو کر جوہڑ شوال کو سنہ ۱۲۷۰ھ میں پینچا تو اس مناظرہ سے متعلق بریلوی ”فتح مبین“ کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ یا اللعجب! یہ اکابر بریلویت مولوی حامد رضا خاں صاحب اور مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی اس درجہ دروغ گوئی کو بھی پسند کر سکتے ہیں!“

رد عمل

اس ”فتح مبین“ کے عجوبے نے ایک نئے خیال کو حرکت دی۔ یعنی

”دوسرے دن یعنی ۲۱ رثوال کو مولانا حامد رضا خاں صاحب (سجادہ نشین آستانہ

رضویہ۔ بریلی) کو اس سستی اشتہار بازی پر شرم دلاتے ہوئے بطور نوٹس لکھا گیا کہ چلے بالمشافہ

مناظرہ نہ سہی، انھیں موضوعات پر تحریری مناظرہ کر لیا جائے جو لاہور کے لئے طے تھے۔ ”کوئی

جواب نہ آنے پر مکرر لکھا گیا۔ اور اس میں آن موصوف سے لوجہ اللہ ایل کی گئی کہ ”محض توفیق

خداوندی سے ہمارا آپ کا اتفاق ہندوستان کے تین مشہور اور قابل اعتماد اصحاب (یعنی ڈاکٹر سر

محمد اقبال، مولانا اصغر علی روجی اور شیخ صادق حسین بیرسٹریٹ لا) پر ہو گیا ہے، اور فریقین نے ان

کو حکم تسلیم کر لیا ہے۔ خدا را اس لطیفہ غیبی سے فائدہ اٹھائیے اور مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے

کا موقع دیجئے۔ اس کی آسان ترین صورت وہی ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ لاہور کے طے

شدہ مباحث پر انھیں شرائط کے ساتھ میرے آپ کے درمیان بذریعہ خط و کتابت تحریری مناظرہ

ہو اور بعد اختتام وہ تمام تحریریں حضرات ثالثین کی خدمت میں بغرض فیصلہ پیش کر دی

جائیں۔ اور اس کے بعد (وہ تحریریں) ان کے فیصلے کے ساتھ ملک میں شائع کر دی جائیں۔ اس

کے لئے فریقین کے یکجا اجتماع کی ضرورت بھی نہیں، اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے بھی یہ کام

ہو سکتا ہے۔ مکرر گزارش ہے کہ خدا را مسلمانوں کی پرانگندہ حالی پر رحم فرمائیے اور مسئلہ

فریقین ثالثوں کے فیصلہ پر اس تباہ کن جنگ کو ختم کر دیجئے۔ والسلام علی اہل الاسلام۔“

خاکسار محمد منظور نعمانی۔

بریلی کا قیام اور اجرائے الفرقان!

جواب تو پھر بھی کیا آتا تھا۔ مگر، مولانا حامد رضا خاں کو معلوم نہ تھا کہ اس لوجہ اللہ پیش کش پہ سکوت

اختیار فرما کر وہ صاحب پیش کش کے بریلی ہی آئے اسے کا انتظام کئے دے رہے ہیں۔ آگے آتا ہے:

”یہ دوسرا نوٹس جس وقت بھیجا گیا اس وقت یہ فیصلہ اللہ کے بھروسے پر کر لیا گیا تھا کہ

آئندہ محرم ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۲ء سے الفرقان نامی ماہنامہ جاری کیا جائے گا اور بریلی ہی سے جاری

کیا جائے گا۔ اور اگر اس دوسرے نوٹس کا جواب بھی نہ آیا، جیسا کہ بظاہر یقینی ہے۔ تو ان نوٹسوں

کے حوالے کے ساتھ اپنے اس بیان دعویٰ کی اشاعت بھی الفرقان میں شروع کر دی جائے گی

جس کو اس مجوزہ تحریری مناظرے میں پیش کرنا مقصود تھا۔ تاکہ عام مسلمانوں کے ساتھ ان تین

مؤقر حکم صاحبان کے سامنے بھی مولوی احمد رضا خاں صاحب کے فتویٰ حسام الحرمین کی حقیقت

آ سکے۔“

چنانچہ اس منصوبے پر عمل ہوا۔ محرم ۱۳۵۳ھ مارچ ۱۹۳۳ء سے ماہنامہ الفرقان بریلی سے نکلنا شروع ہوا۔ اور پھر مذکورہ بیان دعویٰ ”معرکتہ القلم“ کے نام سے قسط وار نکلتا رہا، بعد میں یہ ”فیصلہ کن مناظرہ“ کے نام سے کتابی شکل میں طبع ہوا، اور مذکورہ بالا ”فتوحات نعمانیہ“ میں دوسرے مناظروں کی رودادوں کے ساتھ شامل ہے۔

اوپر حضرت صاحب سوانح کے اپنے بیان میں گزرا ہے کہ ”بعض دفعہ مجھے کسی ذریعہ سے اطلاع ہوئی کہ ان (بریلویوں) میں کافلاں مشہور مقرر یا مناظر فلاں جگہ پہنچا ہوا ہے تو میں اپنے ہی کرایہ سے وہاں پہنچ گیا۔“ اس میں اگر کسی کو کچھ مبالغہ اور زیب داستانیت کا گمان گزرتا ہو تو سنبھل چھوڑ کر ان حضرات کے خاص مرکز، بریلی، ہی آنے کا یہ واقعہ تو محض بیان نہیں واقعہ ہے، اور علامہ اقبال کا شعر یاد دلاتا ہے۔

خالی تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا

یا اپنا گریباں چاک یا دامن ”یزداں“ چاک

مناظرہ بریلی

درد، سنبھل اور لاہور، یہ تین مناظرے ہوئے۔ چوتھے مناظرہ کی بساط، بریلی سے الفرقان کے اجراء کے اگلے ہی سال محرم کے مہینے میں، عین مرکز بریلویت، جامعہ رضویہ بریلی کے اندر چھٹی۔ اس میں فریق مناظرہ جامعہ کے صدر مدرس جناب مولانا سردار احمد صاحب تھے۔ جنہیں مولانا حامد رضا خاں صاحب نے اپنا وکیل ٹھیرایا تھا۔ لاہور کی مسجد وزیر خاں میں بے دھڑک پہنچ جانے کے بعد یہ جامعہ رضویہ میں مناظرہ کرنے پہنچ جانا صاحب سوانح کی بے مہابا جرات کا وہ نقطہ تھا کہ پھر رد عمل میں جو کچھ بھی سامنے نہ آجاتا تھا۔ چنانچہ وہ سامنے آکر رہا۔ مناظرہ کا چوتھا دن تھا، اور روداد کے مطابق حضرت صاحب سوانح نے مولانا سردار احمد صاحب کی اس بات کے جواب میں کہ حضرت مولانا تھانوی کی کتاب ”حفظ الایمان“ کی عبارت بعینہ کسی ترجمہ قرآن میں لکھی ہوئی دکھلا دو۔ ”فرمایا تھا کہ ”کیا کسی عبارت کے صحیح اور موافق قرآن و حدیث ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بعینہ ترجمہ ہو قرآن و حدیث کا؟ اگر آپ کا یہی اصول ہے تو پہلے اپنے اعلیٰ حضرت کے فاتحہ نامہ کو اسی معیار پر قرآن و حدیث کے موافق ثابت کر دیجئے۔ بتلائیے دودھ کا برف خانہ ساز، قرآن و حدیث کے کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ مرغ پلاؤ اور مرغ کی بریانی؟۔۔۔؟

—؟ اور خاں صاحب کی قبر پر جو تر حلو اچڑھتا ہے — وہ کس آیت کا ترجمہ ہے؟

اس پر جوابی تقریر میں مولانا سردار صاحب نے اس بارے میں اپنی سطح کے مطابق ارشاد فرمایا کہ ”آپ نے مجھ سے اعلیٰ حضرت کی فاتحہ اور حلوے کا ثبوت بھی طلب کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں اس پر تمسخر بھی کیا ہے۔ آپ تو تمسخر کریں گے ہی! — اور اصل بات یہ بھی ہے کہ آپ کو حلو انصیب ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمارے حلوے دیکھ کر آپ کے پیٹ میں آگ لگتی ہے“ حضرت صاحب سوانح نے اس پر اقرار کیا کہ ”بیشک مجھ کو چڑھاوے کا حلو نہیں ملتا۔ — مجھ کو تو پیٹ بھر کے روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ مگر خدا کی قسم جس قدر آپ کو اپنے حلوے پراٹھے۔ — پرناز ہے مجھے اپنی فاقہ کشی پرناز ہے۔ کیونکہ وہ میرے آقا (ﷺ) کی سنت ہے۔۔۔ میرے آقا بھی بھوکے رہتے تھے، خدا میرا حشر بھی انھیں کے ساتھ کرے۔“

روداد اس کے آگے بتاتی ہے:

”حضرت مولانا غیر معمولی ایمانی جوش کے ساتھ یہ تقریر فرما رہے تھے، کہ رضا خانیوں کے صدر مولوی حبیب الرحمن کھڑے ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا کہ توبہ کرو، توبہ کرو حضور کو بھوکا کہہ دیا تم مرتد ہو گئے، واجب القتل ہو۔“ (یہاں روداد نویس نے دلچسپ حاشیہ دیا ہے کہ ”کوئی پوچھے تمہارے نزدیک تو مسلمان ہی نہیں تھے۔ پھر یہ ارتداد کیسا؟)

صدر اہل سنت مولانا اسعد علی صاحب نے ان صاحب کو ٹوکا کہ آپ صدر ہیں، اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔ — لیکن وہ باز نہ آئے، بلکہ اب ان کے ساتھ ان کا سارا پلیٹ فارم کھڑا ہو گیا اور سب نے یہی شور مچانا شروع کر دیا۔ — پھر جب اس پلیٹ فارم سے سب نے یہی آواز بلند کی تو ان کے — ایک جتنے نے حضرت مولانا اور ان کے رفقاء پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن اہل سنت کی ایک کثیر جماعت نے اپنے علماء کرام کو ایک زبردست حصار میں لے لیا اور اسی حفاظت کے ساتھ مقام مناظرہ سے باہر لایا گیا۔“

یہ انجام اس مناظرہ بریلی کا ہوا۔

مناظرہ گیا (صوبہ بہار)

مرکز بریلویت کو اپنا مستقر بنالینے کی جرأت کیا کم تھی کہ پھر دوبارہ مناظرہ کے لئے ان کے مدرسے جانے لے! اس کی سزا اس سے کیا کم ہونی چاہئے تھی کہ واجب القتل ٹھیریں اور قصہ ہی پاک ہو جائے؟ مگر یہ وہ ”نفسہ“ کہاں تھا جسے ”ترشی“ اتار دے۔ چنانچہ ایک چوتھے مناظرہ کی بساط اسی سال (۱۳۵۴ھ) کے ذی الحجہ میں صوبہ بہار کے شہر گیا میں کھینچی۔ اس کی روداد ۱۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مگر خاتمہ اس کا بھی

بغیر کسی نتیجہ ہی کے ہوا۔ اس مناظرہ کا پس منظر مختصر اقبالؔی ذکر ہے۔ روداد کے مطابق جو وہیں کے حضرات کی مرتب کردہ ہے گیا میں بریلوی دیوبندی کوئی قصہ نہ تھا کہ بریلوی مولوی صاحبان (حشمت علی صاحب وغیرہ) کی آمد شروع ہوئی اور بریلوی دارالتفسیر کی شاخ قائم ہو گئی۔ ابتداءً منظر انداز کیا گیا، مگر بار بار آمد ہونے لگی تو مولوی حشمت علی صاحب کے ایک جلسے میں پہنچ کر مناظرہ کا چیلنج دینا پڑا۔ مولوی صاحب تو بغیر جواب دئے رخصت ہو گئے لیکن چیلنج جو اشتہاری شکل میں چھپوا لیا گیا تھا۔ اس سے حواریوں کو بھاری پڑی اور یقین دلایا کہ مولوی صاحب ایک فوری ضرورت سے چلے گئے ہیں اور ۲۰ جولائی (۱۳۵۷ء) کو صرف مناظرہ کے لئے تشریف لائیں گے۔ ہم نے مطمئن ہو کر کمرئیں المناظرین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے تشریف آوری کی استدعا کی۔ آپ ہماری مقرر کردہ ۲۱ جولائی کو تشریف لے آئے۔ لیکن مولوی حشمت علی صاحب نہیں آئے۔ مولانا کا پانچ چھ روز قیام رہا اور متعدد مقامات پر تقریریں ہوئیں۔ اختلافی مسائل پر روشنی ڈالی گئی جس سے بہت لوگ کا ذہن جوشک میں پڑ گئے تھے صاف ہو گیا اور ہماری پریشانی دور ہوئی۔ لیکن آٹھ ماہ بعد فروری ۱۳۶۷ء میں حشمت علی صاحب کا پھر دورہ ہوا اور کفر اکفری کا بازار پھر گرم۔ تو پھر مناظرہ کا چیلنج دیا گیا جو اس دفعہ ان کو منظور کرنا ہی پڑا۔ ہم نے حضرت مولانا نعمانی اور حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی کو تار دیا۔ یہ دونوں بزرگ ۲۰ فروری کو پہنچ گئے۔ اور اس طرح مناظرہ کی بساط آخر کار بچھ گئی۔ کئی روز سلسلہ جاری رہا۔ لیکن مولوی حشمت علی صاحب حسب عادت بار بار ایسی تہذیب سوز زبان استعمال فرما رہے تھے کہ حکام نے نقض امن کا خطرہ محسوس کیا جس سے وہ مناظرہ بند کرانے پر مجبور ہوئے۔ اور بات انجام تک نہ پہنچ پائی۔ یہی بریلوی فریق کی کامیابی تھی۔

یہ ”بے انجام“ مناظرے! فائدہ؟

مناظروں کے اس یکساں بے نتیجہ انجام پر ذہنوں میں سوال آسکتا ہے کہ یہ بے فائدہ عمل جاری رکھنے پر طبیعت راضی کیسے رہی؟ اس کا جواب تو وہی ہے کہ ایک نشہ تھا، کفر سازوں کو ان کے گھر تک پہنچا دینے کا۔ یہ جذبہ اس حد پہ پہنچا ہوا بتایا جا چکا ہے کہ کہیں کے بارے میں پتہ چل جائے کہ کوئی مشہور بریلوی مقرر یا مناظر وہاں پہنچا ہوا ہے تو خود بخود اپنے کرایہ سے وہاں جا پہنچتا۔ اصل بات تو واقعہ میں یہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ عمل فیصلہ کن اگرچہ نہیں ہو پاتا تھا مگر فائدہ سے خالی پھر بھی نہیں جاتا تھا۔ کچھ نہ کچھ افراد متاثر ہو کے رہتے تھے۔ بلکہ بعض جگہ تو بڑے پیمانے پر بھی لوگوں کا متاثر ہونا بتایا گیا ہے۔ (جس کی ایک مثال آگے ”مناظرہ ادبی“ کے زیر عنوان آتی ہے۔) اور پانچویں مناظرہ کا نتیجہ تو ایسا غیر معمولی نکلا کہ بریلوی

فریق کے خود صدر مناظرہ ہی بریلویت سے تابع ہو گئے۔ یہ مناظرہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں پنجاب میں سلاوالی (ضلع سرگودھا) کے مقام پر ہوا۔ اور وہی مولوی حشمت علی صاحب فریق ثانی کے مناظر تھے۔

مناظرہ سلاوالی

اس مناظرہ کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ ایسے وقت پیش آیا جب کہ ”۶۔۷ سال کے تجربہ کے بعد“ صاحب سوانح کی طبیعت دینی خدمت کی اس راہ سے ہٹ چکی تھی اور ”ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔“ (جیسا کہ اس مناظرہ کے تذکرہ میں خود تحریر فرمایا ہے)۔ لیکن اس مناظرہ کے لئے دعوت پنجاب کے ایسے بزرگوں کی طرف سے موصول ہوئی تھی جو حضرت والا کے لئے از حد قابل احترام تھے۔

”تحدیثِ نعمت“ میں آتا ہے کہ:

”اس (ترک کر دینے کے) فیصلے پر چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن لاہور سے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی ملا کہ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب (وال پتھر وال) ضلع میانوالی) سے آپ غالباً واقف ہوں گے۔ وہ اس علاقہ پنجاب میں ہمارے اور ہماری جماعت کے سب سے بڑے بزرگ ہیں۔ ہمارے تمام اکابر کی طرح وہ بھی آجکل کے مناظروں کو پسند نہیں کرتے، لیکن حضرت سے دینی تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اپنے علاقے کے خاص حالات سے مجبور ہو کر اہل بدعت سے مناظرہ منظور کر لیا ہے۔ حضرت مولانا اس ضعیف البعری میں چار سو میل کا سفر طے کر کے صرف اس کام کے لئے لاہور تشریف لائے ہیں کہ مناظرہ کے لئے آپ کا بلانا میرے ذمہ کریں۔ یہ مناظرہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر طے پایا ہے۔ اس کے لئے فلاں تاریخ کو آپ پہنچ جائیں۔“ (نوٹ: مکتوب گرامی کا یہ مضمون حافظہ کی مدد سے لکھا گیا ہے۔)

الغرض ان بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل بہر حال لازم ہوئی، اور سلاوالی میں یہ مناظرہ دو دن ہوا۔ مناظرہ کا موضوع رسول اللہ (ﷺ) کے لئے اللہ تعالیٰ کے جیسے علم غیب والا مشرک نہ عقیدہ تھا۔ اس مناظرہ کی روداد کے مطابق بھی مولوی حشمت علی صاحب نے وہی سب ہنر دکھائے جن کے وہ عادی اور ماہر تھے۔ تاہم یہ مناظرہ اپنے پیچھے تاثیر حق کا ایک ایسا نشان چھوڑ گیا جس نے ثابت کیا کہ باطل کے تمام حربوں کے باوجود حق کی نصرت اثر سے خالی بہر حال نہیں رہتی۔ بریلوی حضرات کی طرف سے جلے کی صدارت مولانا کرم دین نام ایک بزرگ کر رہے تھے۔ اس مناظرہ نے خود ان کے فرزند کے بیان کے مطابق یہ اثر ان پر چھوڑا کہ سو فی صد دیوبندیت کے قائل ہو گئے۔ یہ بزرگ حال ہی میں انتقال فرمانے والے پاکستان

کے نامور عالم مولانا قاضی مظہر حسین صاحب کے والد ماجد تھے۔ قاضی صاحب مرحوم اپنی کتاب ”آفتاب ہدایت“ میں بیان فرماتے ہیں:

”غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ سلاوالی ضلع سرگودھا میں علماء دیوبند اور علماء بریلی کے مابین آنحضرت (ﷺ) کے لئے ”علم گلسی ماکان وما یکون“ کے موضوع پر ایک محرکہ الّا مناظرہ ہوا جس میں مولانا مرحوم (مولانا کریم الدین) علماء بریلی کی طرف سے صدر مقرر ہوئے تھے، اس مناظرہ سے واپس آکر آپ نے راقم الحروف سے دیوبندی مناظر مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان کی تہذیب و متانت کی بہت تعریف فرمائی، اس کے علاوہ خدا جانے آپ نے اس مناظرہ سے کیا کیا اثرات لئے کہ اگلے سال رمضان ۱۳۵۶ھ میں احقر نے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے بخوشی اجازت دے دی اور خود اعلیٰ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کی خدمت میں اس مضمون کا عرضہ لکھا کہ میں اپنے فرزند کو دارالعلوم میں حضرت کے زیر سایہ تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔“ (فتوحات نعمانیہ، بحوالہ آفتاب ہدایت۔ از قاضی مظہر حسین صاحب مرحوم)

قاضی صاحب (مرحوم) نے اپنے والد ماجد کی نسبت مزید یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ”شعبان ۱۳۵۸ھ میں جب وہاں سے فارغ ہو کر گھر آیا تو جناب والد مرحوم سے اکابر دیوبند کے حالات بیان کئے، حضرت مدنی کے بعض حالات سنائے جو میں نے قلم بند کر لئے تھے تو آپ نے حضرت کے متعلق فرمایا کہ آپ دلی اللہ ہیں۔ قطب العارفین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ اور امام العالم حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند کے حالات سن کر فرط عقیدت سے والد صاحب کی آنکھیں بعض اوقات آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں۔۔۔“

اور پھر یہ قاضی مظہر حسین صاحب فضلاء دیوبند میں سے بس ایک عالم و فاضل ہو کر نہیں رہ گئے۔ حضرت مدنی کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اور اپنے علاقے (چکوال، ضلع جہلم) میں عمر بھر ایک نمایاں دیوبندی شخصیت کی حیثیت سے دینی و اصلاحی خدمات انجام دیتے رہے۔ اور اللہ ہی جانے کہ کتنوں کی اصلاح کا ذریعہ بنے ہوں گے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اس مناظرہ کی روشنی میں آپ کی کچھ خصوصیات!

مناظرہ کے اس فائدہ کے ضمن میں حضرت صاحب سوانح کے بارے میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ فریق ثانی کا جو بھی طرز کلام ہوا آپ اپنے بزرگوں کی عالمانہ تہذیب و متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ نیز مولانا (۱) حال ہی میں میرپور (آزاد کشمیر سے شائع ہونے والی کتاب ”عرفان حیات“ سے معلوم ہوا کہ مولانا کریم الدین صاحب ایک عام بریلوی عالم نہ تھے جماعت کے مناظر تھے۔

کرم الدین صاحب نے آپ کی تہذیب و متانت کی جو خاص طور پر تعریف، قاضی صاحب کے بیان کے مطابق، کی وہ صاف طور پر یہ معنی بھی رکھتی ہے کہ فریقِ ثانی کا رویہ اس کے برعکس ایسا تھا کہ اس کے مقابلہ میں تہذیب و متانت کو سنبھالے رکھنا معمولی آدمی کا کام نہ تھا۔ اور جن لوگوں نے مولوی حشمت علی صاحب کو سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے مقابل کے لئے تہذیب و متانت پہ قائم رہنا کتنا مشکل بنا دیتے تھے۔ الغرض یہ بریلوی حضرات سے حضرت صاحب سوانح کا آخری مناظرہ تھا۔ جسے اللہ نے ایک عظیم خیر کا ذریعہ بنا دیا۔ **فَلِلّٰهِ الْحَمْد**۔ اور اس مناظرہ سے حضرت صاحب سوانح کا یہ مقام و مرتبہ بھی کھل کر سامنے آیا کہ اس میدانِ مناظرہ میں وہ اپنے وقت میں ایسی شخصیت تھے کہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اعلان کر چکے تھے کہ اب انھیں اس میدان سے سروکار نہیں، مگر پنجاب کے بزرگوں کو ضرورت پیش آئی تو صاحبِ الفرقان کی شخصیت کے سوا کوئی اور نظر نہ آیا جس کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کیا جاسکے۔ **يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ**۔

حضرت مولانا علی میاں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کی گئی اپنی تعزیتی تقریر (۵/رمی ۱۹۹۷ء) میں حضرت صاحب سوانح کے جن علمی اور عملی امتیازات پر روشنی ڈالی وہاں اس خاص میدان میں آپ کے امتیاز کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ

”----- مولانا زبردست مناظر تھے وہ فرقی باطلہ اور فرقی منخرذ کی کتابوں سے بہت گہری واقفیت رکھتے تھے ان کی بہت سی عبارتوں تک کے حافظ تھے وہ اس طرح عبارت زبانی سناتے تھے کہ جیسے دیکھ کر پڑھ رہے ہوں۔ اس درجہ مولانا کا احتضار اور حافظ قوی تھا کہ اس

(۱) عبارت زبانی سنانے کے سلسلہ میں حضرت صاحب سوانح نے خود ایک موقع کا ذکر فرمایا ہے کہ ”رازم کا جو آخری مناظرہ پنجاب میں ہوا اس میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میرے مخاطب مناظر نے یعنی شریح بخاری سے ایک عبارت اپنے مدعا کی تائید میں پیش کی، میں نے اسی کتاب سے اس کا جواب دینے کے لئے یعنی کی وہی جلد ان مناظر صاحب سے مانگی کیونکہ میرے ساتھ وہاں اس وقت یعنی نہیں تھی۔ ان حضرت نے یعنی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے کہا اچھا میں عبارت پڑھتا ہوں آپ یعنی کافلاں صفحہ دیکھئے، یہ مناظر صاحب اتنے ”معقول“ اور معقولیت پسند“ آدمی تھے کہ فوراً بولے مولوی صاحب مناظرہ میں جس کتاب کی عبارت جس کو پیش کرنا ہو وہ کتاب ہی سے پڑھ کر سناؤ تو سنی جائے گی، اپنی یادداشت سے کوئی فریق کوئی عبارت نہیں پیش کر سکتا۔ ان سے ہر چند کہا گیا کہ آپ کی یہ شرط اصولی مناظرہ یکجہاں ہے، اصولی مناظرہ کی دوسری کتاب رشیدیہ بھی دکھائی گئی، لیکن وہ ایسے ہی بھلے آدمی تھے کہ یہ اندازہ کر کے کہ اس شرط کے عائد ہونے سے محمد منظور کے لئے میدانِ استدلال تنگ ہو جائے گا وہ اس لغو، لائینی اور بالکل جاہلانہ شرط پر اڑ گئے۔ لیکن (اللہ تعالیٰ معاف کرے) کیا یہ کہ جس کتاب کی جو عبارت پیش کرنی ہوئی اگر وہ کتاب ساتھ نہیں تھی یا ناکالے میں زحمت کبھی تو اس کی ہم تقطیع (ہم سائز) دوسری کوئی کتاب ہاتھ میں لیکر مگر کتاب کے نام اور صفحہ کا بھی حوالہ دے کے اصل عبارت حافظہ سے پڑھ دی اور آخر مناظرہ تک شاید دسوں دفعہ یہ کاروائی کرنا پڑی لیکن بیچارہ ان مناظر صاحب کو شاید آج تک بھی اس کی خبر نہ ہو۔“

(میری زندگی کے تجربے)

میں مولانا کوئی شریک نہیں۔ مولانا نے شرک و بدعات کا جم کر مقابلہ کیا، ہندوستان کے مسلمانوں کو شرک کے اثرات سے بچایا، بدعتیہ دینی، اشراک باللہ، عبادت قبور استغاثت بغیر اللہ، استغاثہ بغیر اللہ سے بچایا۔ ہندوستان جیسے ملک میں یہ کام بڑا خطرناک اور نازکاتوں سے بھرا ہوا تھا، عالم عربی میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور مصر و شام میں شیخ حسن البنا اور دوسرے علماء اٹھے اور انھوں نے کام کیا لیکن ہندوستان میں (حضرت سید صاحبؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور چند مصلحین کے بعد) کتنا و کتنا جتنا کام مولانا نے کیا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اور کسی کا کام ہو جو ہمارے علم میں نہیں۔“

یہی حقیقت ایک دوسرے پیرائے میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے قلم سے نکلی ہے۔ اپنے تعزیتی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

”... طالب علمی کے دوران علماء دیوبند اور علمائے بریلی کے مسلکی اختلاف پر متعدد کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی۔ اکابر علماء دیوبند کی جن تحریروں پر علمائے بریلی کی طرف سے سخت اعتراض کئے گئے تھے۔ ان کے بارے میں حقیقتِ حال کی وضاحت بہت سے حضرات نے کی، لیکن اس موضوع پر جس کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حضرت مولانا محمد منظور صاحب کی کتاب ”فیصلہ کن مناظرہ“ تھی۔ اس کتاب میں حضرت مولانا نے جس مدلل، دلنشین اور مستحکم انداز میں ان تحریروں کی وضاحت فرمائی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کسی بھی انصاف پسند انسان کے دل میں ان اکابر کے عقائد کے بارے میں کوئی ادنیٰ شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔“

حضرت مرحوم کے اوصاف میں ”نہی ذات“ کا ذکر آگے اپنے مقام پر آ رہا ہے، عمر بھر آپ کا یہ وصف دیکھتے دیکھتے دل میں ایسا پیوست ہو گیا ہے کہ وفات کے بعد بھی زبان سے تعریف کا کلمہ آپ کے حق میں نکالتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ روح پہ گراں نہ گزر جائے۔ لیکن یہ دونوں تحریریں یہ کہلائے بغیر نہیں مان رہیں کہ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

یہ مناظرے اور مشیتِ الہی

یہ مناظرے بظاہر تو حضرت والا کے اپنے ارادے اور اپنی تجویز سے ہو رہے تھے، مگر اللہ سلامت بعافیت رکھے برادر عزیز میاں خلیل الرحمن سجاد کو، ان کا ذہن اس معاملہ میں ایک ایسی سمت گیا جو سو فی صد دل کو لگنے والی ہے۔ حضرت کی وفات پر الفرقان کی خاص اشاعت میں انھوں نے لکھا:

”۔۔۔ آجکل تو شاید اس کام کی واقعی اہمیت و ضرورت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔
(پر) راقم الحروف کا احساس ہے کہ اگر بریلی کی وہ تکفیری مہم کسی مزاحمت کے بغیر اسی طرح چلتی
رہتی تو آج شاید کوئی قابل اعتبار گروہ یہاں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والا اور مختلف
اصلاحی، تعلیمی، دعوتی اور ملی کام کرنے والا باقی نہ رہتا۔۔۔ یہ کام جو اللہ نے حضرت والد ماجد
سے لیا، کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بعد کے بہت سے تبلیغی، اصلاحی، دعوتی دلی کاموں کے لئے راہ
ہموار ہوئی۔“

بظاہر تو خود حضرت مرحوم کو بھی اپنے کام کی قیمت کے اس پہلو کا احساس نہیں تھا، وہ اسے بس ایک
ناگزیر دفاعی کارروائی خیال فرماتے تھے۔ مگر غور کیجئے تو واقعہ بالکل یہی نظر آتا ہے کہ وہ بس دفاعی کارروائی نہ
تھی بلکہ تکفیری شور سے زمین ہند کو ”زمین شور“ بنا دی جانے کی مہم کو چیلنج کرنے کا کام تھا، کہ اس زمین میں یہ
صلاحیت رہے کہ اہل اصلاح اور ادایانِ دین حق کی جدوجہد بھی جڑ پکڑ سکے۔ اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ اللہ نے
اکابر اہل حق کے قلوب میں ایک بالکل نو عمر شخصیت کی وہ قدر ڈال دی تھی کہ باید و شاید، جیسا کہ اس سلسلہ سے
آگے بہت کچھ آئے گا۔ فللہ الحمد ولہ الشکر۔

ان مناظروں کا ایک خاص پہلو

بریلویت کے خلاف مناظروں کے اس بیان میں ایک بات یہ بھی نوٹ کر لئے جانے کے قابل ہے
کہ مناظرہ کا چیلنج ہمیشہ ادھر ہی سے دیا گیا اور ادھر سے ہمیشہ بچنے کی کوشش سامنے آئی۔ نہیں تو وہ حربے
استعمال کئے گئے کہ مناظرہ یا تو ہونے ہی نہ پائے، جیسے مناظرہ لاہور میں ہوا۔ یا انجام تک بہر حال نہ پہنچنے
پائے، جیسا کہ دوسرے ہر مناظرہ کی روداد بتا رہی ہے۔ بلکہ سنبھل کے مناظرہ کی روداد یاد کیجئے، وہ تو بس حد
ہی دکھاتی ہے۔ سنبھل آنے کے لئے شرط لگائی کہ بریلی سے سفر کا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچہ پیشگی بھیجا
جائے۔ اور وہ سب بھیج دئے جانے پر بھی فرار کی کیا عجیب و غریب صورت نکالی، کہ ایک اشتہار بنام حضرت
صاحب سوانح و جملہ وہابیان سنبھل چھاپ کر بھیج دیا کہ میں مناظرہ کے لئے تیار تھا لیکن معلوم ہوا کہ میرے
فلاں تلمیذ رشید کے آگے تو آپ کا سارا گروہ عاجز رہا ہے۔ اب اگر مناظرہ کرنا ہو تو ایک تحریر دو کہ ہمارا سارا
گروہ مولوی فلاں صاحب کے مقابلہ سے عاجز رہا الخ۔ سبحان اللہ! کیا فرمائش ہے! یہ لوگ بس اس میدان
کے ”مرد“ تھے کہ عوام میں یک طرفہ تقریریں کر کے انھیں مشائخ دیوبند سے بد اعتقاد کریں۔

مناظرہ ادری (ضلع اعظم گڑھ)

یہ بات (کہ یہ بس یکطرفہ تقریروں کے مرتب تھے) گیا کے مناظرہ کی تفصیل میں بہت صاف طور سے سامنے آچکی ہے۔ اور ایک دوسرا مناظرہ جس کی باقاعدہ رپورٹ تو نہیں مرتب ہوئی لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں الفرقان کا جو خاص نمبر نکلا اس کے ایک مضمون نگار جناب مولانا اسیر ادری نے اپنے مضمون میں اپنے وطن ادری ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک مناظرہ کا خاص تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جس میں تاریخ تو مذکور نہیں، لیکن یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مناظرہ ”بریلی کے مناظرہ کے کچھ ہی دنوں بعد ہوا۔“ اور اس کی حیثیت ”ہندوستان گیر شہرت“ کے مناظرے کی بتائی گئی ہے (اور اس کا جو نتیجہ بتایا گیا ہے اس کے اعتبار سے اس کو واقعہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا) اس میں بھی وہی گیا والی صورت حال سامنے آتی ہے۔ مولانا اسیر صاحب کے مطابق اس مناظرے کی تفصیل یہ ہے:

”یہاں بریلوی فکر کے دوسرے برآوردہ مولوی صاحبان ایک مولوی نعیم الدین مراد آبادی

دوسرے مولوی حشمت علی پہلی بھتی، یہ دونوں ایک جلسہ عام میں تقریر کے لئے بلائے گئے

تھے۔ دن میں جلسہ ہو رہا تھا، گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ ٹھیک اس صورت حال میں مولانا

عبداللطیف نعمانی نے جلسہ عام میں جا کر ان دونوں حضرات کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور ان کے فرار کا

راستہ بند کر دیا۔ اسکے باوجود مولوی نعیم الدین پہلی ٹرین سے فرار ہو گئے البتہ عوام نے مولوی

حشمت علی صاحب کو زبردستی روک لیا۔ پھر تین دنوں تک بڑا ہی ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا۔ ہمارا چھوٹا

سا گاؤں ادری آدمیوں کا جنگل بن گیا۔ پورا ضلع سمٹ آیا تھا۔ مناظرہ کا موضوع علم غیب تھا۔

لیکن فریق مخالف کبھی اصل موضوع پر گفتگو نہ کر سکا (جیسا کہ ہر مناظرہ میں ہوتا آیا تھا) جب

عقائد کی دقیق ترین بحثوں پر گفتگو آتی تو وہ حسام الحرمین (از مولانا احمد رضا صاحب) کے فتوؤں

کی بات لے آتے۔ علماء دیوبند کی کتابوں کی عبارتوں پر گفتگو شروع کر دیتے۔ جب جب

مولانا (محمد منظور) نعمانی اصل موضوع پر ان کو گھیر کر لے آتے تو اول فول بکنا شروع کر دیتے

۔ علماء دیوبند کے کفر کا اعلان دانت پیس پیس کر کرتے۔ مولانا نعمانی اس حرکت مذہبوحی پر

صرف مسکراتے رہتے۔ جب مولانا نعمانی کی گرفت سے نکلنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو اپنے ہم

شرابوں سے کہہ کر تیسرے دن بذریعہ پولیس مناظرہ بند کر دیا۔“

”تین دنوں کے بعد یہ مناظرہ بند تو ہو گیا لیکن اس کا اثر ہمارے ضلع اعظم گڑھ کے

مسلمانوں پر اتنا پڑا کہ یہاں کی نوے فی صدی آبادی جو بدعات و خرافات میں مبتلا تھی وہ اس

سے تائب ہوگئی۔۔۔ سوائے چند چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے پورا ضلع ان بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد سے پاک ہو گیا اور ان لاکھوں مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی جو توفیق ہوئی اس کے صلہ میں مولانا مرحوم اجرِ عظیم کے مستحق ہوئے۔“

پس اگر زیادہ نہیں، تو کم از کم ایک مناظرہ تو اتنے عظیم فائدہ کا باعث ہو کر الحمد للہ رہا۔ ورنہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ان مناظروں نے مستقبل کے اعتبار سے ایک نہایت اہم دینی خدمت اللہ کے فضل سے انجام دی۔

کچھ دوسرے میدانوں کے مناظرے

آپ کی مناظرانہ سرگرمیوں کا اصل میدان اگرچہ بریلویت ہی رہی لیکن، جیسا کہ اس سلسلے میں آپ کے اوپر نقل کئے گئے بیان میں آیا، آریہ سماج اور قادیانیت سے مناظروں کا جو میدان اس زمانے میں گرم تھا اس میں بھی آپ کافی الجملہ (بلکہ آریہ سماج سے تو بہت کافی) حصہ رہا۔ آریہ سماج سے آپ کے کئی مناظروں کی روداد جو الفرقان کے دور اشاعت میں پیش آئے، ہمیں الفرقان ہی کے صفحات میں ملتی ہے، اور اس ضمن میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض مناظرے الفرقان کے دور اشاعت سے پہلے ہو چکے تھے۔ اس سلسلے کے ایک مناظرے کی روداد الفرقان کی پہلی جلد کے شمارہ نمبر (۹-۱۰ اور ۱۲) میں ملتی ہے۔ یہ مناظرہ اسی سال یعنی ۱۹۵۳ء مطابق ۱۹۳۳ء پنڈت گوپی چند دہلوی سے بریلی ہی میں ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال انہی دنوں نومبر ۱۹۵۳ء میں ایک دوسرے آریہ سماجی مناظرہ پنڈت رام چندر دہلوی سے آپ کا مناظرہ بریلی ہی میں اور سابق مناظرے کی طرح کئی دن تک ہوا۔ اس کی روداد الفرقان کے متعدد شماروں میں قسط وار نکلی ہے۔ پہلی قسط شمارہ (۸-۹ جلد ۲) میں شائع ہوئی تھی۔ قادیانیوں سے کسی مناظرے کی روداد ہمیں الفرقان میں نہیں ملتی، اگرچہ قادیانیت کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ بظاہر اس گروہ سے آپ کا کوئی مناظرہ الفرقان کے دور میں نہیں ہوا۔ البتہ الفرقان ہی کی فائل سے معلوم ہوتا ہے کہ الفرقان کے اجراء سے قبل ۱۹۲۸ء میں جو کہ امر وہہ میں آپ کی مدرسے کا پہلا سال تھا ایک ایسے مناظرے کا اتفاق حضرت مولانا

(۱) مناظروں کے علاوہ آریہ سماج کے بارہ میں مضامین کا سلسلہ بھی الفرقان میں کافی رہا ہے۔ الفرقان کے مہینہ مقاصد کی پہلی ہی شق یہ تھی کہ ”الفرقان ان شاء اللہ اقوام عالم کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ محاسن پیش کرے گا جن کی نظیر سے دنیا کے مذاہب اور بائبان مذاہب کی تاریخ عاجز ہے۔“ یہ بظاہر اس ماحول ہی کے پیش نظر تھی جس کے نتیجے میں آریہ سماج سے متعلق مضامین نکلے۔

عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی اور حضرت مولانا مرغلی حسن صاحب چاند پوری کی معیت میں پیش آیا تھا۔

قادیانیوں سے مناظرہ

اس مناظرہ کا تذکرہ ہمیں اپریل ۱۹۸۰ء کے الفرقان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کی وفات پر لکھے گئے آپ کے تعزیتی مضمون میں ملتا ہے، تحریر فرمایا گیا ہے کہ:

”غالباً ۱۹۲۸ء کا کوئی مہینہ تھا کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی اچانک بغیر کسی اطلاع کے امر دہ تشریف لائے، کسی نے مجھے اطلاع دی اور بتلایا کہ تم سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔ میں خود فوراً ہی حاضر خدمت ہو گیا، فرمایا کہ اس وقت صرف تم کو ساتھ لینے کے لئے راتے میں ٹرین سے اترا ہوں۔ ضلع میرٹھ میں کوئی قصبہ اینچولی ہے۔ وہاں قادیانیوں سے مناظرہ طے ہو گیا ہے۔ اس مناظرے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ معلوم ہوا ہے کچھ لوگوں کے قادیانی ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ایک صاحب جو مولانا کے ساتھ تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کل ہی مجھے لینے کے لئے اینچولی سے لکھنؤ پہونچے تھے، میری طبیعت کئی دن سے خراب چل رہی تھی لیکن میں نے یہو پننا ضروری سمجھا اور یہ طے کر لیا کہ امر دہ سے تم کو ساتھ لے لوں گا۔ اب پہلی ٹرین سے تم کو میرے ساتھ میرٹھ چلنا ہے۔ ممکن ہے مناظرہ تمہیں کو کرنا ہو۔ الغرض ہم لوگ میرٹھ کے لئے روانہ ہو گئے وہاں سے رات کے وقت اینچولی پہونچے، معلوم ہوا مناظرہ تین دن ہوگا۔ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر اور دوسرے تیسرے دن صدق و کذب مرزا پر جس میں پہلے دن قادیانی مناظر مدعی ہوگا اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت و مسیحیت کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور دوسرے دن مسلمانوں کا نمائندہ مناظر مدعی ہوگا اور مرزا کا کذاب ہونا ثابت کرے گا۔ معلوم ہوا کہ مناظرے کے یہ موضوعات اور یہ ترتیب فریقین کے مقامی لوگوں نے پہلے سے طے کر رکھی ہے۔

”مشورے سے طے ہوا کہ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر مناظرہ مجھے کرنا ہوگا، دوسرے دن حضرت مولانا لکھنوی اور آخری دن حضرت مولانا چاند پوری مناظرہ فرمائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مناظرے میں ایک ایسے معاون کا وجود بہت مفید ہوتا ہے جس کی زیر بحث مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ پر خود بھی پوری نظر ہو اور حسب ضرورت و موقع کتابوں کے حوالے نکال کر مناظر کو دیتا رہے اور خود مناظر کو کتابوں سے حوالے نکالنے کا کام نہ کرنا پڑے۔ اس مناظرے میں یہ مدد مجھے جیسی مولانا محمد شفیع صاحبؒ سے ملی، کبھی کسی مناظرے میں کسی سے ایسی

مدد نہیں مل سکی، معلوم ہوتا تھا کہ ختم نبوت کے موضوع کے متعلق مجھے جن حوالوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی وہ مفتی صاحب کو گویا حفظ تھے۔“

مفتی صاحب کی اس مدد کی کچھ تفصیل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”اس مناظرے میں مناظروں میں ہی تھا لیکن مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے

گویا ”روح القدس“ بنا دیا تھا۔“

تعزیتی مضمون کے اس ضمنی حوالے کی بدولت قادیانیوں سے آپ کے ایک مناظرے کا علم ہمیں ہو جاتا ہے، لیکن اس کی کوئی مفصل روداد دستیاب نہیں اس لئے کہ یہ الفرقان کے اجراء سے بہت پہلے کا ہے۔ اس کے برعکس مناظرے کے میدان کے تیسرے گروہ آریہ سماج کے ساتھ آپ کے دو مناظروں کی بہت تفصیلی رودادیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، الفرقان کے صفحات میں موجود ہیں۔ ایک پنڈت گوپی چند دہلوی کے ساتھ، دوسرا پنڈت رام چندر کے ساتھ۔ یہ دونوں مناظرے بریلی ہی میں ہوئے۔

آریہ سماج سے مناظرے اور ایک قابل توجہ پہلو!

آریہ سماج کے ساتھ آپ کے مناظروں کا ایک خاص پہلو قابل توجہ ہے۔ قادیانیوں سے مناظرہ ہو یا بریلوی حضرات سے، دونوں کے بارے میں کسی بھی ایسے نو عمر عالم سے جس نے محنت سے تحصیل علم کی ہو اور ذہن و فطین بھی ہو مناظرے کے موضوعات پر باسانی حاوی ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں سے متعلق موضوعات کا تعلق اُسی علم دین سے ہے جس کی وہ بنیادی تحصیل کر چکا — اور جیسا کہ ذکر آچکا، بریلوی حضرات سے مناظرے کے موضوعات پر تو صاحبِ سوانح نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں تیاری کر لی تھی — لیکن آریہ سماج سے سنجیدہ مناظرے کے موضوعات ایک مختلف چیز ہوتے تھے۔ ان موضوعات پر جب ہم آریہ سماج سے مناظروں میں آپ کی بحثیں پڑھتے ہیں تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ آپ جیسے پیدائشی طور ہی پر مناظرانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہ آریہ سماج کی اسلام پر یورش کو دیکھتے ہوئے اس پر بھی پوری تیاری کا موقع آپ نے نکال لیا تھا۔ چنانچہ مناظروں کے علاوہ اس سلسلہ میں مضامین بھی آپ نے بکثرت لکھے اور سماج کو چیلنج کر کے لکھے۔

ان مناظروں کا باعث

خلافت تحریک کا زور ختم ہوتے ہی وہ ہندو مسلم اتحاد، جس میں ہندو بھی نعرہ بکیر بے تکلف لگاتے اور ہندو لیڈر تقریر کے لئے مسجدوں میں مدعو کئے جاتے تھے، برطانوی حکومت کی چستی و چالاکی سے ایسے

اختلاف میں یکا یک بدل گیا کہ ہندوؤں کے آریہ سماجی گروہ نے صاف صاف اسلام اور پیغمبر اسلام (ﷺ) پر حملے شروع کئے اور ان حملوں سے آگے بڑھ کر، انہی کے ضمن میں ”شدھی سنگھٹن“ نامی تحریک کے ماتحت پسماندہ مسلم اقوام، دھوبی، بھشتی، نائی، قصائی، نداف، نورباف وغیرہ کو ان کے دین اسلام کے خلاف درغلا یا جانے لگا۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ بریلوی فتنے سے بھی بڑھ کر تھی، پس آپ نے بریلوی یلغار کے سامنے سینہ سپر ہونے کے ساتھ ساتھ اس خارجی فتنے سے معرکہ آرائی کا بھی ذمہ اپنی بساط بھرا اٹھالیا۔ اور مضامین و مناظرے دونوں ہی میدانوں میں یہ فریضہ ادا ہونے لگا۔ برادر عزیز میاں غلیل سجاد نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں اس پہلو کو اچھی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، یہاں اس کو نقل کر دینا مناسب ہوگا۔

خلافت تحریک کے پیدا کردہ اتحادی ماحول کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں:

”مگر اس تیسری دہائی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ملک کا ماحول بدل دیا گیا تھا، تحریک خلافت ختم ہو چکی تھی، انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا کر دیا گیا تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لارہا تھا۔ آریہ سماج کی طرف سے اسلام پر حملے شروع کر دئیے گئے تھے، توفیق الہی نے حضرت والد ماجدؒ کو اس محاذ پر بھی دفاعی جنگ لڑنے کی ہمت و طاقت بخشی۔ الفرقان کے پہلے شمارے میں ”آریہ سماج کو ایک اصولی مباحثہ کی دعوت“ کے زیر عنوان پورے آریہ سماج کو چھ بنیادی مسائل پر ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز گفتگو و مباحثہ کی دعوت حضرت مولانا سید محمد رفیع حسن چاند پوری کی زبانی دی گئی ہے۔

پھر جو تھے شمارہ میں اس سلسلے کے دو مضامین ہیں ایک خود حضرت والد ماجدؒ کے قلم سے جس کا عنوان ہے، ”اسلام پر آریہ سماج کی نئی یورش، سماجی دنیا کو ہمارا انعامی چیلنج“، اس مضمون میں مسلمان ہند کے اک بہت بڑے طبقے کو ملت اسلامیہ سے الگ کر کے انہیں کفر و ارتداد کی کھلی دعوت پر مشتمل آریہ سماج کی طرف سے شائع شدہ اک اشتہار کو جواب دیا گیا ہے، اس اشتہار میں حضرت والد ماجدؒ کے بقول:

”مسلم پیشہ ورا قوام نورباف، نداف، موچی، منہیار، نائی، قصاب وغیرہ کو بڑے زور و شور کے ساتھ ویدک دھرم کی دعوت دی گئی ہے (یہ کہہ کر کہ) اسلام تم کو مساویانہ حقوق دینے کے لئے تیار نہیں مگر ویدک دھرم کامل مساوات کا حامل ہے، لہذا تم لوگ اسلام سے قطع تعلق کر کے ویدک دھرم میں آ جاؤ۔۔۔۔۔

اشتہار کا خلاصہ نقل کرنے کے بعد اور اس کی اصولی تردید کرنے کے بعد حضرت والد ماجدؒ

نے جس لب و لہجے میں اس مسئلہ پر اپنے درد و کرب کا اظہار کیا تھا اس سے ہمارے زیر بحث مضمون پر چونکہ روشنی پڑتی ہے اور ایک نمونہ بھی ان کے اس دور شباب کے طرز تحریر کا سامنے آ جاتا ہے اس لئے اس مضمون کی چند سطریں ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں۔

”اللہ اللہ! ویدک دھرم اور مساوات کا دعویٰ اور وہ بھی اسلام کے مقابلے میں، وہ اسلام جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ

(اے لوگوں! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے یعنی تم سب ایک ہی

ماں باپ کی اولاد ہو)۔۔۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

(بیشک تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ متقی، پرہیزگار ہو) خواہ وہ

کسی قبیلے سے ہو)

وہ اسلام جس کا عام اعلان یہ ہے:

انما المومنون اخوة

سارے مسلمان آپس میں بھائی ہیں خواہ سید ہوں یا شیخ، جھلے ہوں یا موچی، نائی

ہوں یا قصائی، کھال پکانیوالے ہوں یا بھٹیاریے۔

وہ اسلام جس کا داعی صاف صاف دنیا کو بتلا گیا:

لا فضل لعربی علیٰ عجمی - ولا لعجمی علیٰ عربی ولا لابیض علیٰ اسود

ولا لاسود علیٰ ابیض الا بالتقویٰ

عرب کے کسی باشندے کو عجم کے کسی باشندے پر اور عجم کے کسی شخص کو عرب کے کسی شخص

پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا دار و مدار خدا ترسی پر ہے۔

وہ اسلام جس نے دنیا کو مساوات کا سبق پڑھایا، ذلیل کو عزیز بنایا، دنیا کے دھکارتے

ہوؤں کو سینے سے لگایا، شاہ و گدا کو ایک صف میں کھڑا کیا، جس نے حبش کے سیاہ فام

غلام (حضرت بلالؓ) کو حضرت فاروق اعظم کی زبان سے سیدنا (ہمارے سردار) کہلایا، اس

اسلام کے مقابلے میں آج وہ دھرم جس نے اصول مساوات کا خون کیا، انسانوں کو چاروں روں

میں تقسیم کر کے غریب شورروں کو انسانی حقوق سے بھی محروم کیا، وہ دھرم اسلام ہی سے سیکھ کر

مساوات کا دعویٰ کر رہا ہے۔

کس نیا موخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ مکر دلا

یہ بندہ ناچیز پہلے تو اپنے پیشہ ور بھائیوں سے عرض کرتا ہے کہ تم سرور کو نین (ﷺ) کے نام لیوا ہو، تم قرآن کو صحیفہ خداوندی جانتے ہو، جس کے ایک ہاتھ میں اس محبوب خدا سید الانبیاء کا دامن ہو، اور دوسرے ہاتھ میں قرآن پاک، وہ ہرگز ذلیل نہیں، جو اس کو ذلیل کہتا ہے وہ خود ذلیل ہے، عزت کا معیار صرف ایمان و تقویٰ ہے، دیکھو قرآن کی صاف تعلیم ہے:

وَلِلّٰهِ الْغَزْوَةُ وَلِزُسُوْلِهِ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

عزت صرف اللہ کو ہے اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو، لیکن منافق لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔

بہر حال میرے پیشہ ور بھائیو! تم ایمان اور مومن کا مرتبہ خود قرآن میں دیکھو، صاحب قرآن علیہ الصلاۃ والسلام کے ملفوظات طیبہ (احادیث پاک) میں دیکھو اور دشمنان دین کی چالوں میں نہ آؤ اور خوب سمجھ لو کہ جو شخص تمہارے ہاتھ سے مدنی آقا کا دامن چھڑانا چاہتا ہے جو تمہارے ہاتھ میں قرآن کے بجائے وید دینا چاہتا ہے وہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔
الخذر! اے بھولے مومن الخذر!

مضمون کا اختتام ایک چیلنج اور ایک اعلان پر کرتے ہوئے اس مرد حق نے لکھا تھا:

”یہ بندہ آریہ سماجی و دونوں کو عموماً اور آریہ سماج امرتسر کے پردھان و منتری صاحبان کو خصوصاً کھلے لفظوں میں چیلنج کرتا ہے کہ اگر آپ حضرات اصول مساوات کے متعلق اسلام اور ویدک دھرم کی تعلیمات کا موازنہ کرنے کے لئے تیار ہوں اور اسی کو حق و باطل کا معیار قرار دیں تو بندہ اس کے لئے حاضر ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسلام حقیقی اور کامل مساوات کا حامی ہے اور ویدک دھرم اس کا سخت دشمن، میں انشاء اللہ عنقریب الفرقان میں اس موضوع پر ایک مستقل سلسلہ مضامین شروع کروں گا جس میں پوری طرح ہر دو مذہب کی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے گا، اگر کوئی سماجی دوست اس کا جواب لکھنے کے لئے تیار ہوں تو مجھ کو مطلع فرمائیں تاکہ دفتر سے الفرقان ان کے نام جاری ہو جائے اور وہ جس پرچہ میں اپنا جواب شائع فرمائیں وہ دفتر الفرقان میں بھجوائیں۔“

پھر الفرقان کے پانچویں شمارے (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ء) میں حضرت والد ماجدؒ نے

(۱) یعنی جس کسی نے بھی مجھ سے تیرا اندازی کا فن سیکھا بھی کو آخر میں نشانہ بنایا۔ یہ ترجمہ تھا مطلب یہ ہے کہ انسانی مساوات تو تم جانتے بھی نہ تھے یہ تو اسلام سے تم جانے اور اب اسی کو نشانہ بنارہے ہو!

”اسلام اور ویدک دھرم کا موازنہ، حقیقی مساوات کس میں ہے“ کے زیر عنوان اسی موضوع پر ایک طویل علمی مضمون لکھا جس میں ویدک دھرم کے بدنام زمانہ ورن آشرم (طبقاتی نظام) کا ویدوں اور منسوتی وغیرہ کے حوالوں کے ساتھ تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات بیان کیں۔“ (اقتباس ختم ہوا)

اس سلسلہ کا پہلا مناظرہ

تحفہٴ نعمت میں ”آریہ سماجیوں نے پہلا مناظرہ“ کے زیر عنوان آپ کا بیان بتاتا ہے کہ ”آریہ سماج والوں سے پہلے مناظرہ کی نوبت بریلی میں آئی۔ یہ دسمبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ میرا قیام تو اس وقت تک بریلی میں نہیں ہوا تھا لیکن وہاں کے مدرسہ مصباح العلوم میں میرے استاذ حضرت مولانا کریم بخش صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالحق صاحب کا صدر مدرس کی حیثیت سے تقرر ہو گیا تھا انھوں نے اس سلسلے اپنے مدرسے کے سالانہ جلسے میں تقریر کے لئے مدعو کیا تھا۔ میری تقریر کا عنوان تھا حضرت محمد (ﷺ) کی صداقت اور قرآن مجید کا وحی الہی ہونا۔ تقریر کے دوران میں ایک صاحب اعتراض کرنے یا کہنے سوال کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے اعتراض نے بتایا کہ آریہ سماجی ہندو ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میری تقریر کے بعد مجھ سے ملیں اور اپنی بات کہیں تب جواب دوں گا۔ وہ بعد میں ملے اور اپنا نام ماسٹر بلدیو پرشاد سوزن بتایا۔ اور مختصر گفتگو کے بعد انھوں نے مناظرہ کا چیلنج دیا۔ جس کے بارے میں شہر کے دو معزز مسلمانوں نے ان سے بات چیت کر کے میری منظوری سے چھ دن کا مناظرہ طے کیا، جس میں پہلے تین دن قرآن پاک کا وحی الہی ہونا موضوع بحث ہوگا اور دوسرے تین دن میں وید کے بارے میں یہی بحث ہوگی۔ مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد سے پہلے تین دن ہی میں یہ صورت حال ہوئی کہ خود ماسٹر صاحب کی طرف کے صدر جلسہ کو جو خود ہندو اور ایک کالج کے پرنسپل تھے چوتھے دن ماسٹر صاحب پر رحم کھا کر کہنا پڑا کہ مولانا صاحب آپ کا اور ماسٹر صاحب کا کوئی مقابلہ نہیں ہے، اس لئے مناظرے کے مزید جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، مناسب ہے کہ اب ختم کر دیا جائے۔ اس طرح چوتھے دن ہی یہ مناظرہ خود ماسٹر صاحب کے اپنے صدر جلسہ کی فرمائش پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں سے بعض اور مناظرے ہوئے جو ۲۴ مئی ۱۹۳۲ء میں الفرقان جاری ہونے کے بعد میں ہوئے۔ اور ان کی روداد الفرقان میں آئی۔ اس دور کا بھی پہلا (اور واقعہ میں دوسرا) مناظرہ بریلی ہی میں مشہور آریہ سماجی مناظرہ پنڈت گوپی چند سے ہوا۔“

دوسرا مناظرہ

یہ مناظرہ بریلی میں پنڈت گوپی چند دہلوی کے ساتھ نومبر ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ اور الفرقان جلد دوم شمارہ ۸-۹ میں اس کی روداد نکلی۔ اس کا موضوع تہا وید کی الہامیت اور اواگون (تناخ)۔ مناظرہ کی روداد بہت طویل ہے، یہاں صرف وید کے بارے میں الہامیت کے دعوے پر طرفین کے ابتدائی بیانات کا اقتباس دیا جا رہا ہے۔

”وید کو الہامی مانا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:
 ”ایک الہامی کتاب کے لئے لازمی طور پر یہ ضروری ہے کہ وہ مخلوق کے پاس ایسے ذریعہ سے پہونچے جو قابل اعتبار ہو۔ ورنہ خدائے پاک کی طرف سے (معاذ اللہ) یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ لوگوں کو اس کے ماننے کا پابند بنایا جائے۔ اور وید کے حق میں یہ انتہائی لازمی اور بنیادی شرط بھی نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ خود از روئے وید یہ بات ابھی تک طے نہیں ہے کہ وید کا الہام جن پر ہوا وہ انسان تھے یا کچھ اور۔ ان ملہمین کے بارے میں ویدوں کے اندر خود بانی آریہ سماج سوامی دیانند جی کے بقول چار لفظ ملتے ہیں ”اگنی، وایو، آوتھ، انگر“ اور از روئے لغت یہ چاروں لفظ غیر ذی شعور اور بے حس عناصر کے نام ہیں۔ علاوہ ازیں، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ انسان تھے تو ان کی شخصیتیں متعین نہیں ہیں۔ سماجی حضرات چار رشیوں کو مانتے ہیں۔ اور پورا ایک لوگ چار منہ والے برہما کو۔“

پنڈت گوپی چند جی

مولوی صاحب کا اعتراض میں نے سمجھا، اصل بات یہ ہے کہ مولوی صاحب سنسکرت زبان سے واقف نہیں ہیں۔ ورنہ آپ کو یہ شبہات پیدا ہی نہ ہوتے، مولوی صاحب! جس طرح عربی فارسی وغیرہ اور زبانوں میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں اسی طرح سنسکرت میں بھی لفظوں کے متعدد معانی آتے ہیں۔۔۔ پس اسی اصول پر اگنی، وایو، آوتھ، انگر عناصر کو بھی کہتے ہیں اور یہی رشیوں کے بھی نام ہیں۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کا نام اگنی ہے اور یہ بات کلام کے موقع سے معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ حق خدا کا بھی نام ہے اور حق ایک اخبار بھی نکلتا ہے۔ تو اگر کوئی شخص کہے کہ حق چھپ گیا یا حق پھٹ گیا تو کیا کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ خدا چھپ گیا یا پھٹ گیا؟ بس جیسے کہ یہاں یہ سمجھا

جاتا ہے کہ حق اخبار چھپ گیا یا پھٹ گیا ویسے ہی جب ویدوں میں یہ بتلایا گیا کہ اگنی، وایو، آوتھ اور انگریا پر ویدوں کا الہام ہوا تو خود بخود یہ سمجھ لیا جائے گا کہ یہ رشیوں کے نام ہیں۔ کیونکہ بے جان عناصر پر الہام نہیں ہوتا۔ اور برہما کسی شخص خاص کا نام نہیں ہے بلکہ وہ صفت ہے اور چونکہ یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع اس کے چار منہ تھے، کیونکہ یہ تو بالکل خلاف عقل ہے۔ آج تک ایسا کوئی آدمی بھی نہیں دیکھا گیا جس کے چار منہ ہوں، بلکہ جس طرح سات زبانوں کے جاننے والوں کو ہفت زبان کہہ دیتے ہیں اسی طرح جس شخص نے چار ویدوں کا علم رشیوں سے حاصل کیا تھا اس کو چونکہ برہما لکھ دیا گیا۔

”منوسرتی جس کو پورا تک لوگ بھی مانتے ہیں اس میں بھی ویدوں کا ظہور اگنی، وایو وغیرہ سے لکھا ہے نہ کہ خود برہما جی سے، تو یہ غلط ہے کہ برہما جی یا ویا س جی پر ویدوں کا الہام ہوا، بلکہ انھوں نے ویدوں کو رشیوں سے حاصل کیا تھا، لہذا آپ کا اعتراض صحیح نہیں۔“

مولانا نعمانی

پنڈت جی مجھے تو آپ کے ساتھ بہت حسن ظن تھا مگر افسوس کہ وہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔ میرے اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ اذروئے وید اگنی، وایو، آوتھ انگریا وغیرہ کا انسان ہونا ثابت نہیں، بلکہ یہ صرف سوامی جی کی انکل ہے۔ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اگنی وغیرہ کے معنی عناصر کے بھی آتے ہیں اور وہ رشیوں کے نام بھی ہیں، اور سمجھانے کے لئے آپ نے حق کی مثال بھی دی کہ وہ خدا کا نام بھی ہے اور اسی نام سے ایک اخبار لکھتا ہے۔ حالانکہ یہ آپ کا مغالطہ ہے، کیونکہ لفظ حق کے متعلق تو یہ معلوم ہے کہ وہ اخبار کا نام بھی ہے، لیکن اگنی وغیرہ کے متعلق اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ انسانوں کے بھی نام ہیں۔ بلکہ یہ صرف آپ کی اور سوامی جی کی انکل ہے اور وہ بھی صرف اس بنیاد پر کہ خدا کے کلام کا ظہور غیر ذی شعور پر نہیں ہو سکتا۔ گویا صرف اس مجبوری سے آپ ان کا انسان ہونا مان رہے ہیں کہ عناصر پر خدا کے کلام کا ظہور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا ورنہ ویدوں میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے۔ اور وہ عقلی وجہ بھی بالکل کمزور ہے۔ اس لئے کہ جب ایک انسان گراموفون کے بے جان ریکارڈ کے ذریعہ دوسروں کو اپنا کلام سناسکتا ہے، سینماؤں میں تصویروں کو گویا بولتا دکھلا سکتا ہے تو اگر پریشور بھی غیر ذی شعور عناصر کے ذریعہ سے دنیا کو کلام سنائے تو عقلاً اس میں کوئی استحالہ نہیں۔

بہر حال میرا یہ اعتراض بدستور باقی ہے کہ از روئے دید اگنی، وایو، آوتھ، انگریز کا انسان ہونا ابھی تک معلوم نہیں بلکہ وہ سوامی جی کا محض عقلی خیال ہے اور وہ بھی نہایت کمزور۔

دوسری بحث یہ تھی کہ ملہمین وید کو اگر انسان ہی فرض کر لیا جائے تب بھی خود حاملان وید میں ان کی شخصیتوں کے متعلق اختلاف ہے، آئپ حضرات چار رشیوں کو وید کا ملہم مانتے ہیں اور قدیم ہندو (پورانک) برہما جی کو اور بعضوں کا خیال ویاس جی کے متعلق ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہما جی درحقیقت ان رشیوں کے شاگرد ہیں اور انھوں نے وید کا علم انہی رشیوں سے حاصل کیا تھا۔ یہ جواب بھی غیر متعلق اور اصل بحث سے خارج۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ برہما جی کون تھے، بلکہ میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ حاملان وید میں بھی ملہمین کی شخصیت کے متعلق شدید اختلاف ہے اور آپ خود بھی اس اختلاف کا انکار نہیں کر سکتے، خود سوامی جی مہاراج نے اس اختلاف کا ذکر رگ وید آدی بھاش بھومکا (ص

۳۶) پر کیا ہے۔ پس آپ نے جو جواب دیا ہے وہ درحقیقت پورانک کو دینے کا ہے۔ میں تو صرف اختلاف کا ناقل ہوں اور آپ حضرات کا یہ اختلاف ہی میرے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وید کی تاریخ تاریکی میں ہے۔ اگر ملہمین وید کے متعلق کوئی صاف اور کھلی ہوئی تصریح ہوتی یا تو اثر سے معلوم ہوتا کہ فلاں پر وید کا نزول ہوا تو آج حاملان وید میں یہ اختلاف نہ ہوتا جس طرح کہ قرآن مجید کے متعلق آج کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اس کا پورا یقین رکھتے ہیں کہ اس کتاب کو الہام کے دعوے کے ساتھ دنیا کے سامنے داعی اسلام حضرت محمد رسول اللہ (ﷺ) نے پیش فرمایا۔ اور درحقیقت جو چیز تواتر کے ساتھ منقول ہو اس میں کبھی کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ پس الہام وید کے متعلق آپ لوگوں کا یہ اختلاف اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ مسئلہ پہلے ہی سے تاریکی میں رہا ہے۔

تیسرا اعتراض میرا یہ تھا کہ بحث سابق سے قطع نظر کر کے ویدوں کا ملہم خواہ بقول شماج

اگنی، وایو، آوتھ، انگریز، کو مانا جائے یا عام ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق برہما جی کو یا ویاس جی کو، بہر حال ان سب کی زندگی کے حالات نامعلوم ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس کیرکڑ کے اور کیسے چال چلن کے انسان تھے۔ اگر ویدوں میں اس کے متعلق کچھ ذکر ہو تو آپ فرمائیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ وید ابن ثارے میں بالکل خاموش ہیں، بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ویدوں سے تو یہ

بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ انسان بھی تھے یا نہیں، کیرکڑ تو بعد کی چیز ہے۔

تیسرا آریہ سماج مناظرہ

یہ مناظرہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں آریہ سماج بریلی کے سالانہ جلسہ کے موقع پر سماج کی دعوت پر ہوا، سماج کی طرف سے ان کے مشہور مناظرہ پنڈت رام چندر دہلوی تھے۔ اس مناظرہ کے موضوع بھی بعینہ وہی سابق مناظرہ والے دو تھے۔ سابق میں پہلے موضوع ”ویدوں کی الہامیت“ پر گفتگو دی جا چکی ہے۔ دوسرے موضوع ”تناخ“ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں پہلا موضوع چھوڑ کر، کہ بے فائدہ تکرار ہوگا، دوسرے موضوع تناخ پر گفتگو لی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی:

عقیدہ تناخ کے بنیادی اصولوں میں سے آریہ سماج کا مسلم اصول ایک یہ بھی ہے کہ کسی روح کو کوئی قالب بغیر عمل کے نہیں مل سکتا اور کوئی روح بغیر قالب کے کوئی عمل نہیں کر سکتی، گویا بالفاظ دیگر جنم ملنا موقوف ہے کرم کرنے پر اور کرم کرنا موقوف ہے جنم ملنے پر، اور منطقی حساب سے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جنم ملنا موقوف ہے جنم ملنے پر، اور کرم کرنا موقوف ہے کرم کرنے پر۔ اور یہی وہ دور ہے جو عقلاً بالکل محال ہے۔ تو آریہ سماج کے اس تناخ کے اصول پر لازم آتا ہے کہ روح کو قالب ملنا بالکل محال ہوا اور کوئی روح کبھی کوئی قالب نہ حاصل کر سکے گی۔ مزید توضیح کے لئے میں اس کی مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کسی شخص کو کوئی پینسل اس وقت تک نہیں دی جاتی جب تک کہ وہ پینسل ہی سے درخواست لکھ کر نہ دے۔ اور ظاہر ہے کہ پینسل سے درخواست جب ہی لکھی جاسکتی ہے جبکہ پینسل مل جائے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص پینسل سے درخواست لکھ سکے گا اور نہ پینسل حاصل کر سکے گا۔

اسی طرح جب آپ کے اصول پر یہ مان لیا گیا کہ کسی روح کو کوئی قالب اُس وقت تک نہیں دیا جائے گا جب تک کہ وہ اس قالب کے موافق عمل نہ کرے۔ اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کوئی روح بغیر قالب کے کسی طرح کا کوئی عمل ہی نہیں کر سکتی، تو انجام یہی ہوگا کہ روح کبھی کوئی عمل نہ کر سکے گی اور نہ کوئی قالب ہی پاسکے گی، پس اس سماجی اصول پر کسی روح کو قالب ملنا ہی محال ہے، حالانکہ ہمارا اور آپ کا وجود ہی اس کے خلاف شہادت دے رہا اور ثابت کر رہا ہے کہ آریہ سماج کا یہ اصول ہی غلط ہے۔

پنڈت رام چندر جی:

مولانا صاحب کو یہاں بھی ہمارے اصول کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ ہم جنم کو بیشک کرم کا پھل کہتے ہیں، مگر اس کرم کا نہیں جو وہ اس جنم میں کرے گا بلکہ پچھلے جنم میں وہ جو کرم کر چکا ہے اگلا جنم اس کا بدلہ ہے۔ تو چونکہ موقوف اور موقوف علیہ ایک نہیں رہے اس لئے دور لازم نہیں آتا۔ اور آپ نے مینسل والی جو مثال پیش کی ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ دیکھیے آپ کے ہاتھ میں مینسل ہے، اب آپ اعلان کریں کہ یہ مینسل اس کو دی جائے گی جو مینسل سے درخواست لکھ کر دے، تو اب ہر وہ شخص جس کے پاس پہلے سے مینسل موجود ہو اپنی مینسل سے درخواست لکھ کر دوسری مینسل آپ سے حاصل کر سکتا ہے، تو جس طرح آپ کی اس مثال میں پہلی مینسل سے درخواست لکھ کر دوسری مینسل حاصل کی جاسکتی ہے اسی طرح جو پہلے جنم میں کرم کر کے بعد والے جنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور کوئی دور لازم نہیں آتا۔ پس یہ مسئلہ صحیح ہو گیا جنم سے کرم ہے اور کرم سے جنم ہے۔

اسی کی ایک اور آسان مثال یہ ہے کہ بیٹا باپ سے ہے اور باپ بیٹے سے ہے۔ یعنی بیٹا ہونا باپ پر موقوف ہے اور باپ ہونا بیٹے پر موقوف ہے، کوئی بیٹا بغیر باپ کے نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی شخص بغیر بیٹے کے باپ بن سکتا ہے۔ تو جس طرح اس مثال میں باپ سے بیٹے کا ہونا اور بیٹے سے باپ کا ہونا صحیح ہے اسی طرح تناخ میں جنم سے کرم اور کرم سے جنم کا ہونا بھی صحیح ہے اور اس میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔

حضرت مولانا:

فاضل مخاطب مجھے معاف فرمائیں، میرا اعتراض غلط فہمی پر مبنی نہیں ہے بلکہ مجھ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی جا رہی ہے جناب پھر غور فرمائیں۔ میرا اعتراض سماج کے اس مسئلہ اصول پر مبنی ہے کہ کسی روح کو کوئی قالب بغیر عمل کے نہیں مل سکتا، پس جب ویدک دھرم کا یہ اصول ہے تو آپ یہ کہہ کر اعتراض سے نجات نہیں حاصل کر سکتے کہ ”پچھلے کرموں کا بدلہ اگلا جنم ہے“۔ میرا اعتراض تو یہ ہے کہ آپ کے اس اصول پر کبھی ایک مرتبہ بھلی کسی روح کو کوئی قالب مل ہی نہیں سکتا بلکہ روح کو قالب ملنا قطعی محال ہو جاتا ہے، اور آپ کا یہ اگلے پچھلے کا سوال تو جب ہی پیدا ہو سکتا ہے جبکہ روح کے لئے پہلے قالب کا ملنا تسلیم کر لیا جائے۔ یہی مغالطہ

آپ نے ہینسل کی مثال میں بھی دیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ ”جس طرح ہر شخص اپنی پہلی ہینسل سے درخواست لکھ کر یہ دوسری ہینسل حاصل کر سکتا ہے اسی طرح روح پہلے قالب کے ذریعہ عمل کر کے دوسرا قالب حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن مہربانم یہ آپ کا صریح مغالطہ ہے، کیونکہ اس مثال میں آپ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ لوگوں کے پاس درخواست لکھنے کے لئے پہلے سے ہینسل موجود ہے جس سے درخواست لکھ کر وہ میری ہینسل حاصل کر سکیں گے، بخلاف روح کے کہ اُس غریب کو کرم کرنے سے پہلے کوئی جنم نہیں مل سکتا۔ پھر وہ پہلا کرم کرنے کے لئے جنم کہاں سے لائے گی۔ لہذا اس کی صحیح مثال جب بن سکے گی جب کہ فرض کر لیا جائے کہ کسی شخص کے پاس درخواست لکھنے کے لئے پہلے سے کوئی ہینسل موجود نہیں ہے اور پھر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہینسل صرف ان کو دی جائے گی جو ہینسل ہی سے درخواست لکھ کر پیش کریں، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کو ہینسل ملنا قطعاً محال ہوگا۔ ایسے ہی روح اپنی ذات کے اعتبار سے مادہ سے الگ تھی، پھر پرمیشور نے چاہا کہ اس کو مادہ کا قالب دے کر دنیا آباد کرے مگر اصول یہ مقرر کیا کہ قالب اُسی روح کو ملے گا جو اس کے مناسب پہلے کوئی کرم کر لے اور بیچاری تہاروح بغیر مادی قالب کے کوئی کرم بھی کر نہیں سکتی، پس نتیجہ صاف ظاہر ہے پرمیشور کے اس قانون کی رو سے کوئی روح کوئی قالب نہیں حاصل کر سکے گی۔ عام حاضرین کی سہولت فہم کے لئے اس کی ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجئے کسی حکومت کا محکمہ تعلیم یہ قانون مقرر کرے کہ ہمارے کالجوں اور اسکولوں میں صرف وہی لڑکے داخل ہو کر تعلیم حاصل کر سکیں گے جو ہمارے کسی اسکول یا کالج کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہوں۔ چنانچہ لڑکا کسی کالج یا اسکول میں داخل ہونے کے لئے جاتا ہے تو اُس سے یہی کہا جاتا ہے کہ پہلے ہمارے کسی اسکول یا کالج کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لو اس کے بعد تم کو داخل کیا جائے گا اور سرٹیفکیٹ اُسی کو دیا جاتا ہے جو باقاعدہ داخل ہو کر کسی امتحان میں کامیابی حاصل کر لے۔ تو اس امتحانہ قانون کی رو سے کسی لڑکے کا داخلہ بغیر سرٹیفکیٹ کے نہ ہو سکے گا اور کسی کو سرٹیفکیٹ بغیر داخلہ کے نہیں دیا جاسکے گا۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ اس حکومت کے کسی اسکول یا کالج میں قیامت تک کوئی لڑکا داخل نہ ہو سکے گا۔ اور سارے محکمہ میں گویا تعطیل رہے گی۔ بس ٹھیک اسی طرح سمجھا جائے کہ سماج کے اصول پر روح ازلی انادی اور مادہ بھی ازلی انادی اور یہ دونوں چیزیں اپنی ذات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ۔

اب پر میثور روحوں کو قالب دے کر دنیا کو چلانا چاہتا ہے مگر قانون یہ مقرر کرتا ہے کہ کسی روح کو بغیر عمل کے قالب نہیں دیا جائے گا۔ اور مجر دروہ بغیر قالب کے کوئی عمل کر بھی نہیں سکتی۔ تو نتیجہ یہی ہوگا ان کالجوں اور اسکولوں کی طرح خدائی کارخانہ بھی ہمیشہ دیران رہے گا۔ اور اس اصول (تناخ) کی بدولت کوئی روح کبھی کوئی قالب نہ حاصل کر سکے گی۔

1. 2. 3. 4. 5. 6. 7. 8. 9. 10. 11. 12. 13. 14. 15. 16. 17. 18. 19. 20. 21. 22. 23. 24. 25. 26. 27. 28. 29. 30. 31. 32. 33. 34. 35. 36. 37. 38. 39. 40. 41. 42. 43. 44. 45. 46. 47. 48. 49. 50. 51. 52. 53. 54. 55. 56. 57. 58. 59. 60. 61. 62. 63. 64. 65. 66. 67. 68. 69. 70. 71. 72. 73. 74. 75. 76. 77. 78. 79. 80. 81. 82. 83. 84. 85. 86. 87. 88. 89. 90. 91. 92. 93. 94. 95. 96. 97. 98. 99. 100. 101. 102. 103. 104. 105. 106. 107. 108. 109. 110. 111. 112. 113. 114. 115. 116. 117. 118. 119. 120. 121. 122. 123. 124. 125. 126. 127. 128. 129. 130. 131. 132. 133. 134. 135. 136. 137. 138. 139. 140. 141. 142. 143. 144. 145. 146. 147. 148. 149. 150. 151. 152. 153. 154. 155. 156. 157. 158. 159. 160. 161. 162. 163. 164. 165. 166. 167. 168. 169. 170. 171. 172. 173. 174. 175. 176. 177. 178. 179. 180. 181. 182. 183. 184. 185. 186. 187. 188. 189. 190. 191. 192. 193. 194. 195. 196. 197. 198. 199. 200. 201. 202. 203. 204. 205. 206. 207. 208. 209. 210. 211. 212. 213. 214. 215. 216. 217. 218. 219. 220. 221. 222. 223. 224. 225. 226. 227. 228. 229. 230. 231. 232. 233. 234. 235. 236. 237. 238. 239. 240. 241. 242. 243. 244. 245. 246. 247. 248. 249. 250. 251. 252. 253. 254. 255. 256. 257. 258. 259. 260. 261. 262. 263. 264. 265. 266. 267. 268. 269. 270. 271. 272. 273. 274. 275. 276. 277. 278. 279. 280. 281. 282. 283. 284. 285. 286. 287. 288. 289. 290. 291. 292. 293. 294. 295. 296. 297. 298. 299. 300. 301. 302. 303. 304. 305. 306. 307. 308. 309. 310. 311. 312. 313. 314. 315. 316. 317. 318. 319. 320. 321. 322. 323. 324. 325. 326. 327. 328. 329. 330. 331. 332. 333. 334. 335. 336. 337. 338. 339. 340. 341. 342. 343. 344. 345. 346. 347. 348. 349. 350. 351. 352. 353. 354. 355. 356. 357. 358. 359. 360. 361. 362. 363. 364. 365. 366. 367. 368. 369. 370. 371. 372. 373. 374. 375. 376. 377. 378. 379. 380. 381. 382. 383. 384. 385. 386. 387. 388. 389. 390. 391. 392. 393. 394. 395. 396. 397. 398. 399. 400. 401. 402. 403. 404. 405. 406. 407. 408. 409. 410. 411. 412. 413. 414. 415. 416. 417. 418. 419. 420. 421. 422. 423. 424. 425. 426. 427. 428. 429. 430. 431. 432. 433. 434. 435. 436. 437. 438. 439. 440. 441. 442. 443. 444. 445. 446. 447. 448. 449. 450. 451. 452. 453. 454. 455. 456. 457. 458. 459. 460. 461. 462. 463. 464. 465. 466. 467. 468. 469. 470. 471. 472. 473. 474. 475. 476. 477. 478. 479. 480. 481. 482. 483. 484. 485. 486. 487. 488. 489. 490. 491. 492. 493. 494. 495. 496. 497. 498. 499. 500. 501. 502. 503. 504. 505. 506. 507. 508. 509. 510. 511. 512. 513. 514. 515. 516. 517. 518. 519. 520. 521. 522. 523. 524. 525. 526. 527. 528. 529. 530. 531. 532. 533. 534. 535. 536. 537. 538. 539. 540. 541. 542. 543. 544. 545. 546. 547. 548. 549. 550. 551. 552. 553. 554. 555. 556. 557. 558. 559. 560. 561. 562. 563. 564. 565. 566. 567. 568. 569. 570. 571. 572. 573. 574. 575. 576. 577. 578. 579. 580. 581. 582. 583. 584. 585. 586. 587. 588. 589. 590. 591. 592. 593. 594. 595. 596. 597. 598. 599. 600. 601. 602. 603. 604. 605. 606. 607. 608. 609. 610. 611. 612. 613. 614. 615. 616. 617. 618. 619. 620. 621. 622. 623. 624. 625. 626. 627. 628. 629. 630. 631. 632. 633. 634. 635. 636. 637. 638. 639. 640. 641. 642. 643. 644. 645. 646. 647. 648. 649. 650. 651. 652. 653. 654. 655. 656. 657. 658. 659. 660. 661. 662. 663. 664. 665. 666. 667. 668. 669. 670. 671. 672. 673. 674. 675. 676. 677. 678. 679. 680. 681. 682. 683. 684. 685. 686. 687. 688. 689. 690. 691. 692. 693. 694. 695. 696. 697. 698. 699. 700. 701. 702. 703. 704. 705. 706. 707. 708. 709. 710. 711. 712. 713. 714. 715. 716. 717. 718. 719. 720. 721. 722. 723. 724. 725. 726. 727. 728. 729. 730. 731. 732. 733. 734. 735. 736. 737. 738. 739. 740. 741. 742. 743. 744. 745. 746. 747. 748. 749. 750. 751. 752. 753. 754. 755. 756. 757. 758. 759. 760. 761. 762. 763. 764. 765. 766. 767. 768. 769. 770. 771. 772. 773. 774. 775. 776. 777. 778. 779. 780. 781. 782. 783. 784. 785. 786. 787. 788. 789. 790. 791. 792. 793. 794. 795. 796. 797. 798. 799. 800. 801. 802. 803. 804. 805. 806. 807. 808. 809. 810. 811. 812. 813. 814. 815. 816. 817. 818. 819. 820. 821. 822. 823. 824. 825. 826. 827. 828. 829. 830. 831. 832. 833. 834. 835. 836. 837. 838. 839. 840. 84

Journal of Management Studies, 19(6), 701-718.

[illegible][illegible][illegible]

1. *Staphylococcus aureus* (1000)

[illegible]

1997-1998, 1998-1999, 1999-2000, 2000-2001, 2001-2002, 2002-2003, 2003-2004, 2004-2005, 2005-2006, 2006-2007, 2007-2008, 2008-2009, 2009-2010, 2010-2011, 2011-2012, 2012-2013, 2013-2014, 2014-2015, 2015-2016, 2016-2017, 2017-2018, 2018-2019, 2019-2020, 2020-2021, 2021-2022, 2022-2023, 2023-2024, 2024-2025, 2025-2026, 2026-2027, 2027-2028, 2028-2029, 2029-2030, 2030-2031, 2031-2032, 2032-2033, 2033-2034, 2034-2035, 2035-2036, 2036-2037, 2037-2038, 2038-2039, 2039-2040, 2040-2041, 2041-2042, 2042-2043, 2043-2044, 2044-2045, 2045-2046, 2046-2047, 2047-2048, 2048-2049, 2049-2050, 2050-2051, 2051-2052, 2052-2053, 2053-2054, 2054-2055, 2055-2056, 2056-2057, 2057-2058, 2058-2059, 2059-2060, 2060-2061, 2061-2062, 2062-2063, 2063-2064, 2064-2065, 2065-2066, 2066-2067, 2067-2068, 2068-2069, 2069-2070, 2070-2071, 2071-2072, 2072-2073, 2073-2074, 2074-2075, 2075-2076, 2076-2077, 2077-2078, 2078-2079, 2079-2080, 2080-2081, 2081-2082, 2082-2083, 2083-2084, 2084-2085, 2085-2086, 2086-2087, 2087-2088, 2088-2089, 2089-2090, 2090-2091, 2091-2092, 2092-2093, 2093-2094, 2094-2095, 2095-2096, 2096-2097, 2097-2098, 2098-2099, 2099-2100, 2100-2101, 2101-2102, 2102-2103, 2103-2104, 2104-2105, 2105-2106, 2106-2107, 2107-2108, 2108-2109, 2109-2110, 2110-2111, 2111-2112, 2112-2113, 2113-2114, 2114-2115, 2115-2116, 2116-2117, 2117-2118, 2118-2119, 2119-2120, 2120-2121, 2121-2122, 2122-2123, 2123-2124, 2124-2125, 2125-2126, 2126-2127, 2127-2128, 2128-2129, 2129-2130, 2130-2131, 2131-2132, 2132-2133, 2133-2134, 2134-2135, 2135-2136, 2136-2137, 2137-2138, 2138-2139, 2139-2140, 2140-2141, 2141-2142, 2142-2143, 2143-2144, 2144-2145, 2145-2146, 2146-2147, 2147-2148, 2148-2149, 2149-2150, 2150-2151, 2151-2152, 2152-2153, 2153-2154, 2154-2155, 2155-2156, 2156-2157, 2157-2158, 2158-2159, 2159-2160, 2160-2161, 2161-2162, 2162-2163, 2163-2164, 2164-2165, 2165-2166, 2166-2167, 2167-2168, 2168-2169, 2169-2170, 2170-2171, 2171-2172, 2172-2173, 2173-2174, 2174-2175, 2175-2176, 2176-2177, 2177-2178, 2178-2179, 2179-2180, 2180-2181, 2181-2182, 2182-2183, 2183-2184, 2184-2185, 2185-2186, 2186-2187, 2187-2188, 2188-2189, 2189-2190, 2190-2191, 2191-2192, 2192-2193, 2193-2194, 2194-2195, 2195-2196, 2196-2197, 2197-2198, 2198-2199, 2199-2200, 2200-2201, 2201-2202, 2202-2203, 2203-2204, 2204-2205, 2205-2206, 2206-2207, 2207-2208, 2208-2209, 2209-2210, 2210-2211, 2211-2212, 2212-2213, 2213-2214, 2214-2215, 2215-2216, 2216-2217, 2217-2218, 2218-2219, 2219-2220, 2220-2221, 2221-2222, 2222-2223, 2223-2224, 2224-2225, 2225-2226, 2226-2227, 2227-2228, 2228-2229, 2229-2230, 2230-2231, 2231-2232, 2232-2233, 2233-2234, 2234-2235, 2235-2236, 2236-2237, 2237-2238, 2238-2239, 2239-2240, 2240-2241, 2241-2242, 2242-2243, 2243-2244, 2244-2245, 2245-2246, 2246-2247, 2247-2248, 2248-2249, 2249-2250, 2250-2251, 2251-2252, 2252-2253, 2253-2254, 2254-2255, 2255-2256, 2256-2257, 2257-2258, 2258-2259, 2259-2260, 2260-2261, 2261-2262, 2262-2263, 2263-2264, 2264-2265, 2265-2266, 2266-2267, 2267-2268, 2268-2269, 2269-2270, 2270-2271, 2271-2272, 2272-2273, 2273-2274, 2274-2275, 2275-2276, 2276-2277, 2277-2278, 2278-2279, 2279-2280, 2280-2281, 2281-2282, 2282-2283, 2283-2284, 2284-2285, 2285-2286, 2286-2287, 2287-2288, 2288-2289, 2289-2290, 2290-2291, 2291-2292, 2292-2293, 2293-2294, 2294-2295, 2295-2296, 2296-2297, 2297-2298, 2298-2299, 2299-2300, 2300-2301, 2301-2302, 2302-2303, 2303-2304, 2304-2305, 2305-2306, 2306-2307, 2307-2308, 2308-2309, 2309-2310, 2310-2311, 2311-2312, 2312-2313, 2313-2314, 2314-2315, 2315-2316, 2316-2317, 2317-2318, 2318-2319, 2319-2320, 2320-2321, 2321-2322, 2322-2323, 2323-2324, 2324-2325, 2325-2326, 2326-2327, 2327-2328, 2328-2329, 2329-2330, 2330-2331, 2331-2332, 2332-2333, 2333-2334, 2334-2335, 2335-2336, 2336-2337, 2337-2338, 2338-2339, 2339-2340, 2340-2341, 2341-2342, 2342-2343, 2343-2344, 2344-2345, 2345-2346, 2346-2347, 2347-2348, 2348-2349, 2349-2350, 2350-2351, 2351-2352, 2352-2353, 2353-2354, 2354-2355, 2355-2356, 2356-2357, 2357-2358, 2358-2359, 2359-2360, 2360-2361, 2361-2362, 2362-2363, 2363-2364, 2364-2365, 2365-2366, 2366-2367, 2367-2368, 2368-2369, 23

1. The first part of the document is a list of names and dates, which appears to be a record of some kind. The names are written in a cursive script, and the dates are in a more formal, printed style. The list is organized into two columns, with names on the left and dates on the right. The names are: John Smith, James Brown, William Jones, and Thomas White. The dates are: 1810, 1811, 1812, and 1813. The list is followed by a signature, which appears to be "John Smith".

10-2-2006

[illegible]

تیسرا باب

الفرقان۔ اخلاص واستقامت کی یادگار

۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں بریلی سے ماہنامہ الفرقان کے اجراء کا ذکر آنے بعد اسے اس کے احوال کا کوئی تذکرہ نہیں، مناظروں کے قصے چلتے رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ مناظروں کا سلسلہ الفرقان کے اجراء سے پہلے شروع ہو گیا تھا، الفرقان ان کے بیچ میں طلوع ہوا۔ اس لئے یہی موزوں ٹھہرا کہ مناظروں کا بیان مکمل کر دیا جائے۔ اس سے فارغ ہو کر الفرقان کے احوال ذکر میں آویں۔ سو مناظروں کا بیان مکمل ہو گیا۔ اب الفرقان اور اس کی سرگذشت۔

مناظرہ لاہور (۱۳۵۲ھ) کے پس منظر میں الفرقان کا جس طرح یکا یک جاری ہونا سامنے آیا تھا واقعہ میں وہ اس طرح یکا یک ذہن میں آئی ہوئی تجویز تھی، یہ دو سال پہلے کا ایک منصوبہ تھا جس کو حالات نے ایک ہنگامی اقدام کی شکل دیدی۔ حضرت صاحب سوانح ۱۹۳۲ء میں تقریباً چھ ماہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنؤ کی فرمائش پر مولانا کے ادارہ دار المصلحین میں مولانا کی معاونت کے لئے رہے تھے، وہیں آپ کے ذہن میں ایک ماہنامہ جاری کرنے کی تجویز آئی تھی، شاید اس میں حضرت مولانا لکھنؤ کے یہاں سے نکلنے والے ماہنامہ ”انجم“ کا بھی کوئی اثر ہو۔ بہر حال یہ دو سال پہلے کا منصوبہ تھا جیسا کہ آگے اپنے موقع پر لکھنؤ کے اس قیام کے تذکرہ میں اس منصوبہ کا ذکر آتا ہے۔ اسی لئے اس کے بیان مقاصد میں اس کا دائرہ کار روڈ بریلویت تک محدود نہیں ملتا ہے بلکہ دینی خدمت کے وسیع تر دائرہ کی بات سامنے آتی ہے۔ اور عمل پہلے ہی دن سے ہوا بھی یہی۔ اس کے جو مقاصد اس کی پہلی ہی اشاعت میں بیان کئے گئے تھے وہ اس طرح تھے:

☆ ”الفرقان کا اصل مقصد صرف دین الہی کی اشاعت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے اور اسی مقصد کو لے کر وہ عالم وجود میں آیا ہے۔ اور اس مبادک مقصد کی تکمیل کے

لئے جو لائحہ عمل اس وقت اس کے سامنے ہے وہ اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔
اسی سے ہمارے ناظرین کو الفرقان کی حکمت عملی بھی معلوم ہو جائے گی:

☆ الفرقان ان شاء اللہ اقوام عالم کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ محاسن پیش کرے گا جن کی نظیر سے دنیا کے مذاہب اور بائیان مذاہب کی تاریخ عاجز اور یقیناً عاجز ہے۔

☆ الفرقان حتی الامکان معارف قرآنیہ کی نشر و اشاعت کا خاص اہتمام کرے گا، کیونکہ قرآن اسلام کا ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، اور وہی خدا کا وہ آخری پیغام ہے جو قیامت تک کے لئے انسانوں کی ہدایت کا کفیل بن کر آیا ہے۔

☆ الفرقان نبیوں اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتباع سنت کی روح پھونکے گا کیونکہ اس کا نہایت راسخ عقیدہ ہے کہ ہماری صلاح و فلاح اسی سے وابستہ ہے اور ہمارے اسلاف کا عروج جس نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اسی اتباع اور اقتداء کا مریہون منت تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل بھی صرف جناب رسالت (ﷺ) کے نقش قدم کی پیروی ہی سے خوشگوار ہو سکتا ہے۔ حضرت امام مالک کا کیا بصیرت افروز ارشاد ہے "لَنْ يُصْلَحَ آخِرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلَّحَ بِهِ أَوَّلُهَا" اس امت کے آخری دور کی اصلاح بھی صرف اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے اس کے دورِ اوّلین کی اصلاح ہوئی۔

☆ الفرقان اُن بدعات و مشرکانه رسوم کے خلاف زبردست جہاد کرے گا جنہوں نے فرزندِ ان توحید کے دین و دنیا کو برباد کر دیا ہے۔ اور جن کے زہریلے اثرات سے مسلمانوں کا ایمان تک محفوظ نہیں ہے۔

☆ الفرقان کا مقصد بلاوجہ کسی جماعت یا کسی شخص سے الجھنا اور اس کو نیچا دکھانا یا اس پر غلبہ غصہ اتارنا اور ان کی پکڑیاں اچھالنا ہرگز نہیں، وہ صرف اعلائے کلمۃ الحق کے لئے میدان میں آیا ہے، البتہ اگر کوئی خدا کا باغی اس کے مقصد میں حائل ہوگا تو وہ اس کا بھی مقابلہ کرے گا لیکن اس میں بھی اس کی روش قرآن حکیم کے تعلیم کردہ اصول و جادِ لہم بالنی ہی احسن سے محتاج و ضروری ہوگی۔

پس پہلی ہی اشاعت میں جہاں تردید بریلویت والے مضامین ہیں وہیں ہم "قرآن اور زمانہ حال کے مسلمان" جیسا ادارتی مضمون بھی پاتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خیالِ ان مقاصد میں اسلام کی

خدمت کا جو وسیع تر تصور ملتا تھا وہ محض برائے گفتن نہ تھا، ایک سنجیدہ اور ہامعنی بات تھی۔ اور ایسے مضامین کم و بیش ہر شمارے میں نکلتے رہے۔ علیٰ ہذا آریہ سماج کی شدھی تحریک بھی ان دنوں میں زور دکھا رہی تھی جس کا حوالہ آپ کی ایک گزشتہ تحریر میں بریلوی فتنہ انگیزی کے ساتھ گزرا ہے کہ اس کے مقابلہ کے لئے بھی آپ نے طالب علمی کے آخری زمانہ میں تیاری کی تھی، پس اس کے حوالہ سے بھی مضامین اور مناظروں کی رودادیں الفرقان میں نکلتی رہیں۔ لیکن یہ بالکل قدرتی چیز تھی کہ جو چیز الفرقان کے اجراء کے فوری فیصلہ کی تقریب بنی اس کا اثر کچھ دن تو کچھ نمایاں رہے۔ چنانچہ دو تین سال تک اس میں بریلوی مذہب اور اس کی پھیلائی ہوئی مشرکانہ بدعات و خرافات نیز علماء دیوبند کے خلاف ان کے شدید گمراہ کن پروپیگنڈے کے سلسلہ کی مناظرانہ سرگرمیوں ہی کا رنگ غالب رہا۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں چونکہ ایک غیر معمولی گرج چمک والے انداز کی، یا حضرت مرحوم کے اپنے الفاظ میں ایک ”طوفانی“ انداز کی سرگرمی تھی اس لئے ایک جوش و خروش والے استقبال کی روح بھی اس نے لوگوں میں پھونک دی تھی۔ اس استقبال کا ایک نمونہ دیکھتے چلے۔ یہ جناب رہبر اعظمی مرحوم کی خیر مقدمی نظم ہے۔ جو ۱۳۵۵ھ کے سالنامہ میں شائع ہوئی۔ اس کے چند شعر!

الفرقان کا خیر مقدم

از جناب رہبر اعظمی مبارک پوری

| | |
|--|--|
| شبستانِ ملامت میں وہ چمکی برقی نورانی | برستا ہے ساء فیض سے ایک نورِ ایمانی |
| بڑھایا دستِ قدرت نے وہ جامِ نورِ عرفانی | ہوئی بخورِ صہبائے حقیقت، چشمِ انسانی |
| نہ ہو کیوں صفحہ عالم پہ الفرقانِ لامانی | زباں ہے اسکی سبحانی مضامین اسکے حسانی |
| تری ہر ہر گجاں میں ہے پنہاں جذبہ صادق | ترے ہر قطرہ خونِ جگر میں جوشِ ایمانی |
| اُٹ کر رکھ دیا واللہ تو نے تختہ باطل | نفسا میں اڑ گیا ہے دامنِ تدبیرِ شیطانی |
| وہ شمشیرِ ہدایت ہے کہ جسکے خوفِ ودہشت سے | کلیجہ شرک و بدعت کا وہ دیکھو ہو گیا پانی |
| پلائے جا پلائے جا وہی بھر بادۂ نوشیں | ہو جس کی جرحہ کیشی باعثِ تنویرِ ایمانی |

مگر جیسے ایک طرف خیر مقدم کے لئے جوش و خروش تھا دوسری طرف ایسے ہی غیظ و غضب بھی۔ چنانچہ اشاعت کے دوسرے ہی سال کے چوتھے شمارہ میں ہم قتل کی اس دھمکی کی خبر بھی پڑھتے ہیں کہ ”اگر تو

باز نہ آیا تو بہت جلدی تجھے مزہ چکھا دیا جائے گا، بہت سے سنی تیرے خون کے پیاسے ہیں۔“ قتل کی یہ دھمکی بظاہر اس مناظرہ کا نتیجہ تھی جو دوسرے ہی سال عین بریلوی حضرات کے جامعہ رضویہ میں ہوا۔ اور وہاں ”واجب القتل“ کے نعرے بلند ہوئے تھے۔ اس دھمکی کے جواب میں ایک دو صفحے الفرقان میں لکھے گئے تھے ان کی چند سطریں بھی یہاں نقل کر دی جائیں تو آپ کی زندگی کے اس مرحلے کے احوال میں کا ایک اہم جزو فی الجملہ سامنے آجائے گا۔ جواب میں اسے گناہم بزدلانہ دھمکیوں میں کی تیسری دھمکی بتاتے ہوئے (کہ وہ اس نے پہلے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں رنگون کے مناظرانہ سفر میں مل چکی تھیں) اپنا یہ عقیدہ ظاہر کرنے کے بعد کہ موت و حیات کا مالک صرف اللہ ہے نیز یہ بھی کہ ”موت جو راہ حق میں آئے در حقیقت وہ موت نہیں بلکہ ایک دائمی اور لازوال زندگی کا پیش خیمہ ہے۔“ آخر میں یہ دعا درج کی ہے کہ

”اے موت و حیات کے مالک، اے شہیدوں کو دائمی زندگی عطا کرنے والے مجھے بھی اپنی راہ میں موت دے کر اپنی رحمت کے آغوش میں لے لے۔ ساتھ ہی میری یہ بھی دعا ہے کہ خداوند اگر میری موت تیرے کسی بندے ہی کے ہاتھ سے لکھی ہے تو میرا قاتل اس کو بنا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان نہ ہو، میں نہیں چاہتا کہ کوئی بد قسمت مسلمان میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور میری وجہ سے جہنم میں جائے۔“

یہ تو اس خاص وقت کی تحریر ہے۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ راقم کی عمر پانچ چھ سال ہوگی۔ بعد میں جب مناظرہ کا شغل برسوں پیچھے رہ گیا تھا ایک دفعہ کسی مناسبت سے اس مناظرانہ شغل، بدرجہ شوق، کا ذکر آیا تو سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اس وقت الحمد للہ یہ کیفیت تھی کہ اس راہ حق میں کام آجانے کی تمنا رہتی تھی۔ اور یقیناً یہی چیز ہو سکتی تھی جو اس راہ میں آپ کو ہر جگہ بے دھڑک لیجایا کرتی تھی، وہ لاہور کا بریلوی مرکز مسجد وزیر خاں ہو یا بریلی کا جامعہ رضویہ! شاعر نے سچ ہی کہا ہے:

عشرت قتلِ سمرِ اہلِ تمنا مت پوچھ

بعیدِ نظارہ ہے ششیر کا عریاں ہونا

یہ شوقِ شہادت! کیوں نہ اسے دفاعِ سنت کے صلہ میں ایک سنتِ نبوی تک رسائی کہا جائے؟ حدیث مبارک ہے کہ ”میں ہر چھوٹی جہادی مہم میں بھی جایا کرتا اور آرزو کرتا کہ قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں۔“ اگر ان مسلمانوں کے جذبات کا خیال دامن گیر نہ ہوتا جن کو مجھ سے پیچھے رہ جانا بہت بھاری ہوگا۔ ”اللہم صل وسلم علی النبی الاکرم“

مشکلات، استقامت اور.....

الفرقان کی عمر الحمد للہ اسی (۸۰) سال ہو رہی ہے۔ اب تو وہ بغیر کسی خاص پریشانی کے نکل رہا ہے۔ لیکن صاحب الفرقان قدس اللہ سرہ نے اس کو جاری رکھنے کے لئے بالکل شروع ہی سے جو پاپز بیلے وہ بھی آپ کی سیرت کا وہ پہلو ہے جسے ذکر کئے بغیر نہیں گزرا جاسکتا۔ مناظرانہ سرگرمیوں کے تناظر میں ان سخت حالات کو یاد کرتے ہوئے حسرت موہانی یاد آنے لگتے ہیں:

”ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

تجدیدِ نعت (۱۹۹ء) میں اس مشقت و عزیمت کا ذکر بایں طور آتا ہے:

”آج جبکہ الفرقان کے اجراء کو ساٹھ سال سے اوپر گزر چکے ہیں۔ یہ بندہ عاجز پیچھے کی

طرف پلٹ کر دیکھتا ہے تو دل اللہ کے شکر اور اس کی حمد و ثناء سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کہ ایک کمزور اور

تنہا انسان کے فیصلے اور ارادہ کو اس نے کیسی قوت بخشی۔ الفرقان جاری کرنے کا یہ فیصلہ بالکل

ہی بے سرو سامانی کے عالم میں محض توکل علی اللہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ آغاز سے مسلسل دقتوں اور

پریشانیوں کا سایہ رہا، مگر ہمت اپنے رب کریم کی اعانت کے آسرے پر بندھی رہی اور اس میں

فلکست کے آثار پیدا ہوئے تو مالک کی مدد و اعانت کا ہاتھ کسی نہ کسی شکل میں ضرور سامنے

آگیا۔ اور اذ عوسی اَسَجِبْ لِحُکْمِ (تم مجھے پکارو میں سنوں گا۔ قرآن، سورہ مومن،

آیت ۶۰) کی نوید کے مطابق اپنے بندے کی پکار سنی گئی جو اس نے الفرقان کی کشتی دریائے عمل

میں اُتارتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں بلند کی تھی۔

”اے ساری کائنات کے پروردگار! تیرا ایک عاجز و سیاہ کار بندہ تیرے ہی جلالت والے

نام اور عظمت والے کلام سے شروع کرتا ہے، تو اس کے ارادوں میں برکت عطا فرما اور اسکے دل

کو صدقِ نیت اور اخلاص کی توفیق عطا فرما۔ خداوند! میں پیادہ پا ہوں اور وادی خاردار، میں نہتا

ہوں راستے میں ہزار خونخوار، میری کشتی شکستہ ہے اور سامنے حوادث کا طوفان۔ مگر تیری نصرت

ساتھ دے تو بیڑا پار ہے اور اسی کے بھروسے پر تیرے اس کمزور بندے نے ہمت باندھی ہے۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا

دل افگندیم بِسْمِ اللّٰهِ مَسْجُوْنِہَا وَ مُؤْمِنِہَا

الفرقان کے اجراء کا اعلان کیا گیا تو اس کا استقبال بہت ہمت افزا تھا۔ جیسا کہ اس کے پہلے ہی

شمارہ (محرم ۱۳۵۳ھ) میں فرماتے ہیں کہ

”مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ مجھ جیسے عاجز بندے کے ایک اعلان پر الفرقان کے اس قدر چاہنے والے پیدا ہو جائیں گے۔ خدا کے فضل و کرم سے صرف ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ میں اتنی درخواستیں آئیں کہ اگر چند روز یہی رفتار باقی رہی تو امید ہے کہ ان شاء اللہ عنقریب الفرقان ایک کامیاب رسالہ ہو جائے گا اور اپنے تمام مصارف خود برداشت کرے گا۔“

مگر دوسرے ہی شمارے میں پہلے شمارے کی مذکورہ بالا حوصلہ افزائی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھنے کی نوبت آگئی کہ ”افسوس کہ محرم ہی سے اس میں انحطاط شروع ہو گیا اور صفر میں تو گویا صفر ہی رہا۔“ نتیجہً علمائے کرام اور برادرانِ قاسمی سے اپیل کرنا پڑی کہ الفرقان کے مقصد کو دیکھتے ہوئے اس کی حیات و بقا کے سلسلہ میں اپنا فرض محسوس کریں۔ اس وقت کی اپنی تہی دہی کا عالم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”تہی دہی کی وہ حالت جس کے ماتحت یہ سب لکھا گیا یہ تھی کہ ربیع الاول کا شمارہ چھپوانے کے لئے اس عاجز کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ خدا غریقِ رحمت کرے میری اہلیہ مرحومہ (والدہ مولوی عتیق الرحمن و حافظ حفیظ الرحمن) کو۔ لے کہ میں نے اُن سے کہا کہ کیا تمہارے پاس کچھ روپے ہوں گے جو مجھے قرض دید؟ مرحومہ کے پاس پچھتر روپے نکلے جو انھوں نے بخوشی مجھے دیدے۔ اور اُس زمانے میں بس اتنی ہی رقم ایک شمارہ تیار کرنے کو کافی تھی۔ چنانچہ میں رسالہ کی کتابت لے کر فوراً دہلی روانہ ہو گیا جہاں اس زمانے میں الفرقان کی طباعت ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کہ بریلی میں اس وقت کوئی اچھا پریس نہ تھا۔“

”ربیع الاول کا یعنی تیسرا شمارہ تو نکل گیا۔ مگر اب اس کے آگے کے لئے کیا ہو؟ ہر ماہ ایک شمارہ نکال کر آئندہ والے کے لئے یہی سوال سامنے آتا تھا اور تقریباً ہر مہینے تعاون کی اپیل دھراتے دھراتے کیا رہویں نہر یعنی ذیقعدہ کے شمارہ میں یہ لکھ دینے پر مجبور ہونا پڑا کہ

پہلو بٹکا فید و بہ بنید دلم را تا چند گویم کہ چنان ست و چنیں نیست۔
(سینہ چیر و اور دل کا حال بذات خود دیکھو، میں کہاں تک بتاؤں کہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔)
آگے فرماتے ہیں:

”----- مجھے کافی توقع تھی کہ درد انگیز داستان سے الفرقان کا ہر ناظر تھوڑی دیر کے لئے ضرور بچیں ہو جائے گا۔ لیکن افسوس کہ رسالہ کی اشاعت کو آج پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے مگر اب تک چند مخصوص احباب کے سوا (جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں) کسی طرف سے کوئی

(۱) ان کا انتقال ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں بریلی ہی کے زمانہ قیام میں ہوا۔ عمر کل چوالیس سال پائی۔ نہایت صابر و شاکر تھیں اور میرے لئے ہر لحاظ سے ذریعہ راحت۔

آواز نہیں آئی۔ اور دوا حسرتا کہ میری وہ درد بھری پکار خدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔ لایس الی اللہ المشتکیٰ وهو المستعان۔

اس کے بعد اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

”میں نے بہت چاہا کہ ہمت شکست نہ کھائے۔۔۔ مگر یہ دنیا عالم اسباب ہے، اور اسباب میسر نہیں تو ایسے میں آئندہ سال مجھ میں رسالہ جاری رکھنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ گویا الفرقان بند کر دینے کا اعلان تھا۔ مگر رب کریم کی رحمت و نصرت نے مجھے تہانہ چھوڑا اور وہ بات پوری ہو کر رہی اور آج تک ہو رہی ہے جو میری پریشانی اور بے بسی کا مذکورہ بالا حال پڑھ کر ایک بزرگ نے (جن کا نام ظاہر کرنے کی مجھے اجازت نہ تھی) تحریر فرمائی کہ

”فکر نہ کرو، ہمت نہ ہارو، کار ساز حقیقی کی اعانت تمہارے ساتھ ہے اور اس وقت اس کی مشیت یہی ہے کہ الفرقان ابھی دنیا میں زندہ رہے۔“

(الفرقان ذی الحجۃ ۱۳۵۳ھ)

ایک تجربہ کارانہ مشورہ

دہلی کے جس پریس میں الفرقان چھپتا تھا، اس کے مالک، خاں صاحب عبداللطیف خاں، تحفہ بہت نعمت کے مطابق، پہلے سے اچھے شناسا تھے۔ اُن کے ایک مشورہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

”پہلے شمارے کی کاپیاں لے کر گیا اور خاں صاحب کے حوالے کرنے لگا تو انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ فرمایا کہ مولانا میری ایک حیثیت یہ ہے کہ میں پریس چلا رہا ہوں اس لحاظ سے مجھے چاہئے کہ میں آپ کا کام فوڑا ہاتھ میں لے لوں اور آپ کا رسالہ چھاپ کر چھپائی آپ سے وصول کر لوں، لیکن مجھے آپ سے مخلصانہ تعلق بھی ہے اس لئے میں اپنے تجربہ کی بنا پر آپ کو مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس ایک دو سال میں کئی ایک دینی مذہبی رسالے لے کر جاری ہوئے، میرے ہی پریس میں چھپتے تھے۔ کسی کے دو تین نمبر نکل سکے کسی کے چار پانچ، کسی کے اس سے ایک دو زیادہ اور پھر بند ہو گئے۔ کیونکہ وہ لوگ اس سے زیادہ خسارہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس سرمائے کا اتنا انتظام ہے کہ دو تین سال تک رسالہ خسارے کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے تب تو آپ اس کو شروع کریں اور اگر اتنا انتظام نہیں تو اس کا خیال چھوڑ دیں۔ اس شمارہ کی کتابت پر جو کچھ آپ خرچ کر چکے ہیں اس کا نقصان برداشت کر لیں۔ میں نے خاں صاحب کے اہل مخلصانہ مشورہ کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس طرف سے اطمینان ہے۔ اور واقعہ یہ تھا کہ میرے پاس صرف اتنا انتظام تھا کہ بس دو ماہ کے شمارے چھپ سکتے تھے۔“

عبداللطیف خاں صاحب نے جو بات فرمائی اس کی تجربہ کارانہ سچائی اور مذکورہ بیان حال سے ظاہر ہے، اور صرف دو شماروں بھر کے پیسے پاس ہونے پر رسالہ جاری کرنے کا اقدام تو بن غیر معمولی لگن، ہمت اور صدق نیت کے ساتھ اللہ پر بھروسے ہی کا نتیجہ ہو سکتا تھا، خاص کر جب کہ ایک مخلص تجربہ کار اسبابی نقطہ نظر سے صاف صاف آگاہی پہلے ہی دن دے رہا ہو کہ یہ کھیل خطرناک اور صرف نقصان کا سودا ہے، لیکن لگن، ہمت اور صدق نیت کے بھروسے پر اللہ سے مدد کی امید غالب آئی۔ اور طبیعت ”کھیل“ سے منہ موڑنے کی روادار نہ ہوئی۔ اور راز اس کا یہ تھا کہ وہی جملہ تھا جو ایک اللہ والے نے طبیعت پر شکست کے آثار دیکھ کر لکھ بھیجا تھا کہ ”ہمت نہ ہارو! اللہ کی مشیت یہ ہے کہ الفرقان ابھی زندہ رہے۔“

اللہ والوں کی بات بھی کیا بات ہے، کہ پتھر کی لکیر بن گئی۔ اس وقت (دم تحریر) اسی (۸۰) برس کے قریب اس بات کو ہو رہے ہیں اور الفرقان نرم و گرم وقت گزارتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن پاک کی تیرہویں سورہ، الرعد، میں حق و باطل کی مثال میں کارآمد و بیکار اشیاء کے حوالے سے فرمایا ہے: ... فَاَمَّا الزُّبْدُ فَيَنْزِلُ هَبًّا جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْاَمْثَالَ (پس) (سیلاب کے اوپر کا) جھاگ (جو محض میل کچیل ہوتا ہے) وہ غائب ہو جاتا ہے اور وہ چیز (یعنی پانی) جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اللہ اس طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔ (تاکہ تم سمجھو!) الرعد ۱۳ اور الفرقان کا اپنے اُس ابتدائی حال زار کو سہتے ہوئے لُٹم لُٹم چلتے رہنا، بظاہر یہی بتاتا ہے کہ وہ ایک فنی نافع تھی، اس لئے آزمائش اگرچہ بندے کی ہوتی رہی، جیسا کہ اہل حق کے ساتھ ہوتا آیا ہے، مگر ہمت کو توفیق ملتی رہی کہ سانس نہ توڑے۔ علاوہ ازیں اس کی نافعیت کی یہ بھی ایک علامت کہ اس نے مسلمانوں کو مشرکانہ رسوم و عقائد سے نکالنے، آخرت سوز مال کے تاجروں سے آگاہ کرنے اور توحید و سنت کے علمبردار بزرگوں سے وابستہ کرنے کا جو بے باکانہ اور عالمانہ بیڑا اپنے روزِ اول سے اٹھایا اس نے وقت کے اکابر و اعیان اہل حق کے دلوں میں اُس کی اور اس کے بانی کی وہ وقعت و الدی کہ ان سب نے ایک مشترکہ اپیل الفرقان کی اعانت کے لئے جاری فرمائی۔ نام ان بزرگوں کے تھے:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (صدر جمعیۃ العلماء ہند) حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ حضرت مولانا حافظ محمد عبداللطیف صاحب (ناظم مظاہر علوم سہارنپور) خطیب ملت حضرت مولانا سید عطاء

اللہ شاہ صاحب بخاری (امیر شریعت پنجاب) رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (صدر مجلس احرار) حضرت مولانا احمد علی صاحب (امیر انجمن خدام الدین لاہور) حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب حضرت مولانا محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب (مناظر اسلام و مدرس مظاہر علوم سہارنپور) حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی (صدر مدرس مفتاح العلوم مؤ) اپیل کافی طویل ہے۔ اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”مولانا محمد منظور صاحب الفرقان کے ذریعہ جو کام کر رہے ہیں وہ ان کا ذاتی نہیں بلکہ خالص دینی کام ہے۔ اور تائید اہل سنت اور تردید اہل بدعت کے سلسلے میں جو خدمات وہ انجام دے رہے ہیں درحقیقت پوری جماعت کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ اندریں حالات چاہئے تو یہ تھا کہ جماعت پوری گرم جوشی کے ساتھ الفرقان کی آواز کو پائیدار اور وسیع کرنے کی کوشش کرتی۔۔۔ لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ جماعت کے تغافل کی وجہ سے الفرقان کی اشاعت نہایت محدود ہے جس کی وجہ سے اس کی مالی حالت نازک ہے بلکہ اس کی بقا ہی خطرہ میں ہے۔“

لہذا مسلمانان اہل سنت سے پُر زور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ الفرقان کو ایک دینی مبلغ اور مذہبی داعی سمجھتے ہوئے اس کے دائرہ اشاعت کو وسیع کرنے کی انتہائی جدوجہد کریں اور کوشش کریں کہ الفرقان کی آواز ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں پہنچ جائے۔ مدارس اسلامیہ کے مہتمم صاحبان اس کو مدرسہ کے نام جاری کرائیں اور طلبہ سے اس کا مطالعہ کرائیں۔ اور اس کی آواز کو وسیع کرنے کی ممکن سعی سے دریغ نہ فرمائیں۔“

(الفرقان بابت رمضان و شوال ۱۳۵۳ھ)

تین مہینے کا ایک وقفہ، اور نئی زندگی!

الغرض حالات کیسے بھی رہے الفرقان کی اشاعت کا سلسلہ الحمد للہ جاری رہا۔ البتہ ملک کی تقسیم (۱۹۴۷ء) کے نتیجے میں مشرقی پنجاب سے مسلم آبادی کا تخلیہ ہوا تو یہ الفرقان کے لئے مالیاتی اعتبار سے ایسا کمر توڑ جھٹکا تھا کہ اب ہمت اسے جاری رکھنے سے جواب دے جائے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ الفرقان کے خریداروں کی ایک بھاری تعداد اسی مشرقی پنجاب میں تھی، جو یکایک ”لاپتہ“ قرار پائی اور ان کے نام بھیجے گئے رسالے عرصہ کے بعد ایک ایک کر کے واپس آنے لگے۔ ہر چند کہ آپ کے لئے یہ فیصلہ ”ایک اولاد کو زندہ دفن کرنے“ کے برابر تھا مگر ناچار دل پہ پتھر رکھ کر الفرقان کی بندش کا فیصلہ آپ کو کرنا پڑا، وہ فیصلہ جو آپ

کے الفاظ اور احساس میں ”ایک اولاد کو دفن کرنے“ کا فیصلہ تھا۔ مگر وہ بات جو بالکل شروع دور کی پریشانی پر ایک اللہ والے کی مبارک زبان سے نکلی تھی کہ ”ہمت نہ ہارو، مشیت حق کا فیصلہ ہے کہ الفرقان ابھی جاری رہے۔“ شاید اسی کی برکت برابر شامل حال چلی آرہی تھی کہ شعبان ۱۳۷۲ھ / جون ۱۹۵۳ء میں آئندہ سے الفرقان کی بندش کا اعلان نکلا تو اہل تعلق و محبت میں اسے زندہ رکھنے کے لئے جذبات کی ایک لہر اس سرے سے اُس سرے تک دوڑ گئی، اور پھر حضرت مولانا علی میاں کی طرف سے خریداران الفرقان کے نام ایک پروردگار بیل اس سلسلہ میں نکلی جس نے اس لہر کو اور تیز کیا، اور الحمد للہ تین مہینے کے اندر اتنی تعداد نئے خریداروں کی مہیا ہو گئی جس کے بعد اس بندش کے جاری رکھنے کا جواز باقی نہ رہا، اور ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ / اکتوبر ۱۹۵۳ء سے الفرقان کا آفتاب گہن سے نکل آیا۔ لیکن اتنی تبدیلی بہر حال ہوئی کہ حضرت صاحب الفرقان کی طبیعت نے اب الفرقان کی ذمہ داری سے سبکدوشی ہی چاہی۔ البتہ اسے بخوشی قبول فرمایا کہ راقم (عتیق الرحمن) اب اس کا اشاعت کا ذمہ دار ہو جائے اور ان کو ”ایک اولاد کے دفن کرنے“ کے صدمہ سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

تو الفرقان کی بندش کا یہ اعلان اس کی ایسی نئی زندگی کا ذریعہ بنا کہ فقط تین ماہ کی بندش کے بعد پھر جو سلسلہ شروع ہوا تو حالات کی نرمی گرمی کے باوجود اس کے بند کر دینے کا سوال آج تک الحمد للہ نہیں پیدا ہوا اور یہ عارضی بندش غالب کے شعر کا مصداق ٹھہری کہ ۔

موت ایک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لیکر

الفرقان سے آپ کی دلی وابستگی

بزرگوں کی دعائیں اور قلبی توجہات اپنی جگہ، لیکن الفرقان کی زندگی قائم رکھنے میں الفرقان کی خدمت حق اور خود صاحب الفرقان کے دل کی لگن کا بھی دخل کچھ کم سمجھنا مشکل ہے۔ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۳ء سے آپ کے لئے اس کی فکر سے آزادی کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن دل کی اُس سے وابستگی کے حال میں جو ذرا بھی فرق آیا ہو۔ اسی ۱۳۷۲ھ یا اگلے سال کی بات ہے۔ ٹھیک وقت اچھی طرح یاد نہیں، کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک استاد جن کے اسباق میں مشکوٰۃ شریف بھی تھی درمیان سال میں انتقال فرما گئے،۔ فوری انتظام کے لئے کس کی نظر گئی (بظاہر حضرت مولانا علی میاں کی) کہ راقم (عتیق) کے ذریعہ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی

جائے، جو چند ہی سال پہلے دیوبند سے فارغ ہو کر آیا تھا۔ حضرت والد صاحب سے بات کی گئی انھوں نے پسند فرمایا۔ مجھے بھی کوئی جھجک نہ ہوئی اس لئے کہ مشکوٰۃ ان کتابوں میں تھی جنھیں بہت اچھی طرح سمجھ کر پڑھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ اللہ غریقِ رحمت کرے استاذِ مرحوم حضرت مولانا شریف احمد صاحب کشمیری کو جن کے یہاں میرا مشکوٰۃ کا گھنٹہ تھا۔ جتنے قابل تھے اتنے ہی بے تکلف، ہنس مکھ اور مہربان، جس نے جرأت پیدا کر دی تھی کہ بات سمجھنے کے لئے لمبی لمبی بحث بھی حضرت مرحوم سے سبق میں کر لیں۔ بہر حال میرا عارضی اور اعزازی تقرر رندہ میں اس خدمت کے لئے ہو گیا۔ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ جو مزاج پایا ہے نیز صحت کی ہمیشہ کی کمزوری، اس کی بنا پر الفرقان کی ادارت اور مشکوٰۃ جیسی کتاب کی تدریس دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں چل پائیں گے۔ سال تو بہر حال پورا کرنا تھا۔ بعد میں میں نے والد ماجد سے عرض کیا کہ دو دماغی کام اپنے حق کے مطابق ساتھ ساتھ نہیں بچھ سکیں گے۔ پس اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ کونسا کام جاری رکھنا اور کونسا چھوڑ دینا ہے؟

تو حدیث جس سے ان کا عمر بھر کا لگاؤ تھا، اور پھر رندہ جیسے ایک بڑے ادارہ میں مجھ کو آموز کو مشکوٰۃ شریف پڑھانے کا موقع روزِ اول ہی سے میسر آ رہا تھا۔ اس سب کے باوجود وہ خود کو اس پر راضی نہ کر سکے کہ الفرقان پھر بند ہو جائے۔ ان کا فیصلہ الفرقان ہی کے حق میں رہا اور میں پھر صرف الفرقان ہی کا ہو گیا۔ اس فیصلہ کا باعث یقیناً الفرقان کی وہی نافعیت ان کے ذہن میں تھی جس کی خاطر انھوں نے بیس برس تک تمام پریشانیوں کے باوجود اسے کسی نہ کسی طرح اللہ کی مہربانی سے جاری رکھا تھا۔

”ہوا ہے گو تند و تیز لیکن.....“

راٹم کو ۵۶ء اور پھر ۱۹۵۹ء میں الفرقان ہی کی ضرورت سے، کہ وہاں کے خریداروں کے چندے کی رقم ہندوستان منتقل کی جاسکے، لاہور (پاکستان) جانا ہوا۔ لاہور کے نامور صاحبِ قلم مولانا غلام رسول مہر کا نام ان کی سیرت سید احمد شہید وغیرہ کی وجہ سے ذہن میں تھا۔ لاہور پہنچ کر ملنے کا اشتیاق ہوا۔ وقت لے کر حاضر ہوا۔ وقت لینے میں الفرقان کا ذکر آنا ہی تھا۔ الفرقان اور حضرت صاحب الفرقان کے حالات آپ نے پوچھے۔ اور اس ذیل کی گفتگو میں ایک شعر جوان کی زبان پر آیا وہ تھا۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغِ اپنا جلا رہا ہے

وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

خیال ہے کہ مہر صاحب مناظرہ لاہور کے وقت سے ضرور صاحب الفرقان سے واقف رہے ہوں

گئے، کہ اس مناظرہ کے فیصلے کے لئے علامہ اقبال نے حکم بنا قبول کر لیا تھا اور مہر صاحب، بقول ڈاکٹر جاوید اقبال، علامہ کے ”دیرینہ رفیق اور مخلص ہم نشین“ تھے۔ اور پھر مسلک اہل حدیث، اس لئے ایک نامور حامی و داعی توحید کے لئے ان کے دل میں ایک مقام ہونا قدرتی بات تھی۔ نیز اکابر دیوبند سے ان کا جو تاثر اسی ملاقات میں سامنے آیا (جسے راقم حاصل ملاقات سمجھتا ہے) وہ مزید۔ موصوف نے اثناء گفتگو میں فرمایا تھا کہ میری دلی خواہش ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کی سوانح لکھ سکوں، عظیم ہستی تھی۔ ”عظیم ہستی“ کے الفاظ بعینہ انہی کے تھے، اتنے عرصہ کے بعد یہ کہنا تو مشکل ہے، لیکن الفاظ جو کچھ بھی رہے ہوں بے شک تھے اسی مفہوم کے۔ خدا غریبی رحمت کرے، اسلام کی بہت خدمت مہر صاحب بڑے فاضلانہ انداز میں کر گئے۔ دیگر علمی و ادبی خدمات الگ ہیں۔

ہندوستان میں نئے حالات کی نمود اور الفرقان!

الفرقان کا وہی خاص مالی مشکلات والا ابتدائی دور چل رہا تھا کہ ملت کے دین کے لئے خاص خطرات کے آثار ملک کے سیاسی افق پر نمایاں ہوئے۔ تحریک آزادی کے نتیجہ میں، جو کہ کانگریس کے زیر قیادت چل رہی تھی، برطانوی گورنمنٹ نے ہندوستان کو آزادی کی اوّلین قسط کے طور پر ایکٹ ۱۹۳۵ء دیا۔ اور اس کے ماتحت ۱۹۳۶ء میں الیکشن ہو کر جب صوبائی حکومتیں بنیں تو وہ زیادہ تر کانگریسی تھیں، اس لئے کہ اس الیکشن میں کانگریس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ تو: (جیسا کہ آپ ”مولانا مودودی اور میری رفاقت“ میں فرماتے ہیں)

”ہم جیسوں کے لئے دو حقیقتیں بالکل کھل کر سامنے آ گئیں۔ ایک یہ کہ انگریزی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے، اس کے نتیجے میں جو آزادی حاصل ہوگی اور جمہوری قومی حکومت قائم ہوگی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق نہ ہوگی بلکہ خاص کر اقلیتی صوبوں میں ان کی تہذیب اور ان کے ملی شخص کے لئے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔“

اور پھر ۱۹۳۶ء کے الیکشن کے بعد جو کانگریسی حکومتیں بنیں خود ان کے بھی اطوار اس اندیشہ کو واضح طور پر تقویت دینے والے تھے۔ پس یہ بالکل حقیقت پسندانہ اندیشہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی حکومت میں غالب ہندو اکثریت کے ماتحت ملت کے دین کی سلامتی آسان نہیں ہوگی۔ اور اسے اسی قسم کی مشکلات درپیش ہو سکتی

پس ملک کی صورتِ حال میں حضرت مجددؑ اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ کرنا ایک بہترین رہنمائی کے درجہ کی چیز پیش آمدہ حالات میں ممکنہ طور پر ہو سکتی تھی۔ اللہ نے اس موقع پر اپنے اس بندے کو ”بروقت خبردار“ کر کے دل میں ڈالا کہ مالی مشکلات کا خیال پیچھے ڈالے اور الفرقان کے ایک خاص نمبر کا حوصلہ کرے۔ اور یہ تھا ”مجددِ دلفِ ثانی نمبر“! خود آپ نے بعد کی ایک تحریر میں اس نمبر کی اشاعت کے خیال کو، آنے والے حالات کی ضرورت کے لحاظ سے، ایک لطیفہ غیبی سے تعبیر فرمایا ہے۔^۱

پس تمام مشکلات اور بے سروسامانی کے باوجود الفرقان کی اشاعت کے چوتھے سال (۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) میں تقریباً تین سو صفحات پر نہایت شان بان سے یہ نمبر نکلا۔
”تحدیثِ نعمت“ میں اس کی بابت ارشاد فرمایا ہے:

”اسی دور کے خاص قابلِ شکر کاموں میں الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر ہے، جو اسی بے سرو سامانی کے دور کی یادگار ہے جس کا بیان اوپر ہوا۔ مگر اللہ نے اسی حال میں یہ کام اِس شان سے کرایا کہ حضرت مجتہد کے بارے میں یہ آج تک حوالہ کی کتاب کے طور پر استعمال ہو رہا ہے اور اس موضوع پر کوئی مصنف اس سے بے نیازی برتنا جائز نہیں رکھتا۔ حضرت مجتہد کا جو احسان ہندوستانی مسلمانوں پر توحید و سنت کے باب میں ہے، یعنی یہ کہ دسویں صدی ہجری کے

[illegible]

ہندوستان میں مشرکانہ اور مبتدعانہ خیالات کا جو اندھیز مسلمانوں پر چھا گیا تھا وہ آپ ہی کے دم سے دور ہوا۔ الفرقان کے اس خاص نمبر نے آپ کے اس تجدیدی کام کو اجاگر کرنے اور اس سے ملنے والی روشنی کو از سر نو پھیلانے کا کام تو کیا ہی۔ اس کے علاوہ حضرت مجدد کا جو کارنامہ اس نمبر کے ذریعہ دنیا کے سامنے ایک مرتب اور مدلل شکل میں آیا وہ اکبر کے الحادی فتنے ”دین الہی“ کے توڑ میں آپ کی وہ جراتمند انداز حکیمانہ جدوجہد ہے جس نے اکبر کے بعد جہانگیر ہی کے زمانہ سے حکومت کا زرخ بدل دیا اور بالآخر اورنگ زیب عالمگیر جیسا حکمران اکبر کے تحت پر بیٹھا۔
آئیے اس نمبر کی ایک جھلک اس کی فہرست مضامین میں دیکھ لیں۔

فہرست مضامین

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان بریلی

بابت ماہ شعبان المعظم ورمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

| جلد ۵ | فہرست حصہ نثر | نمبر ۸، ۹، ۱۰ |
|---|---|---------------|
| مضامین | مضامین نگار | نمبر صفحہ |
| نذر | مدیر | ۲ |
| نگاہ اولیں | مدیر | ۶-۱۵ |
| حضرت امام ربانی اور تجدید دین | جناب مولانا محفوظ الرحمن نامی مجددی | ۱۷-۲۳ |
| حضرت مجدد الف ثانی کی زندگی میں ہمارے لئے سبق | حضرت مولانا احمد علی لاہوری | ۲۵-۲۸ |
| تجدید دین اور حضرت شیخ احمد سرہندی فاروقی | حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہانپوری | ۳۰-۵۰ |
| معرکہ حق و باطل | حضرت مولانا سید محبت الحق محشر حسینی بلیاوی | ۵۳-۵۶ |
| الخطبہ الشوقی فی حقرة المجدد | حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی نقشبندی مجددی | ۵۷-۹۶ |
| مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ | حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند | ۹۷-۱۰۳ |
| الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ | حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی مدظلہ | ۱۰۴-۱۵۶ |
| ہندوستان کا پہلا مجدد اعظم (رحمۃ اللہ علیہ) | جناب مولانا ابو عبدالرحمن چشتی مچھلی شہری | ۱۶۱-۱۸۲ |
| گیارہویں صدی کا مجدد جلیل | جناب مولوی سید محبوب الحسن رضوی دیوبندی | ۱۸۳-۱۹۲ |

| | | |
|---------|---|---|
| ۲۰۰-۱۹۳ | جناب مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی | تجدید ملت اور تاریخی شہادت |
| ۲۰۵-۲۰۱ | جناب مولانا سید محبت الحق محشر حسینی بلیادی | مسئلہ ذبح بقر اور حضرت مجدد الف ثانی کی دور میں نظر |
| ۲۰۷-۲۰۶ | جناب مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر "صدق" | حضرت مجدد الف ثانی یورپ کی نظر میں |
| ۲۱۱-۲۱۰ | جناب پیرزادہ سید محمد سلیمان نقشبندی مجددی | حضرت مجدد الف ثانی اور مولوی احمد رضا خان بریلوی |
| ۲۱۵-۲۱۴ | جناب مولوی منہاج الحق قاسمی سنہلی | حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ حضرت مجدد الف ثانی |
| ۲۱۷-۲۱۷ | جناب مولانا نسیم احمد فریدی فاروقی امرودی | تذکرہ خلفائے مجدد الف ثانی |
| ۲۳۶-۲۳۵ | جناب مولوی فاروق احمد ایم اے کلکتہ | مختصر حالات حضرت مجدد الف ثانی |
| ۲۸۰-۲۳۹ | مدیر | حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد "تجدید" |
| ۲۸۳ | جناب مولانا محمد حسن بدر سنہلی | تواریخ مجدد الف ثانی نمبر |

فہرست حصہ نغم

| نمبر | شعراء کرام | عنوان نغم |
|---------|---|--|
| ۱۶ | علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم | بر مرزا حضرت مجدد الف ثانی |
| ۲۳ | جناب مولانا ابوالبلیان محمد داد پوری | مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) |
| ۵۲-۵۱ | جناب مولانا مفتی سید مہدی حسن آزاد | نقشبند عشق |
| ۹۶ | جناب مولانا سید عبدالرشید پٹوی شہزاد پوری | گلابک رشید در مدح امام ربانی مجدد الف ثانی |
| ۱۰۴ | جناب مولانا شاہ عبداللہ محمد مجنون (کلکتہ) | صدائے مجنون بر آستان شیخ سرہندی |
| ۱۶۰-۱۵۶ | جناب مولانا سید محبت الحق محشر حسینی بلیادی | حضرت مجدد الف ثانی بیسویں صدی میں |
| ۲۰۹ | جناب مولانا قاری عبدالعزیز شوقی اسعدی | آقائے سرہند |
| ۲۱۳ | جناب عصمت آراء بیگم صاحبہ عصمت کلکتہ | سرکار ہند |
| ۲۱۶ | جناب مولانا شہاب الدین شہاب علوی امرودی | خوابگاہ حضرت مجدد الف ثانی |
| ۲۳۸-۲۳۷ | جناب مولوی سید انیس الدین احمد رضوی | درس حیات |
| ۲۸۱ | جناب مولانا نسیم احمد فریدی فاروقی امرودی | آفتاب سرہندی |
| ۲۸۴ | جناب سید عبدالرب صوفی | تاریخ مناجاتیہ |

یہ تھا الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر جو اس کے پانچویں سال (۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) میں شائع ہوا۔ اور اس کی اصلاحی شہرت میں ایک بلند پایہ علمی اور تحقیقی یادگار کے اضافے کا ذریعہ بنا۔

خاکسار تحریک نمبر

اس سے فرصت ہوئی تو نظر آیا کہ ملت کے اندر کا، کافی دنوں سے چلا آتا ایک فتنہ، انہی دنوں ملک میں رونما ہونے والے نئے سیاسی حالات کے زیر اثر، بڑی تیزی سے اپنا دائرہ اثر پھیلانے میں کامیاب ہونے لگا ہے۔ الفرقان، جو حالات کے ہر موڑ اور ملت کے ہر معاملے کی نگہداری اپنا فرض بنائے ہوئے تھا اس کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس فتنے کو نوٹس لئے بغیر چھوڑ دے۔ پس سال آئندہ (۱۹۳۹ء) میں اس کے لئے ایک خاص نمبر کی باری آئی۔ یہ فتنہ علامہ مشرقی کی ”خاکسار تحریک“۔ یہ پُر فتنہ تحریک اسلامی شان و شوکت کی بحالی کے نام پر اٹھی تھی اس لئے ملک میں سیاسی تبدیلی والے حالات میں بآسانی پُرکشش بن گئی۔

”تحدیثِ نعمت“ میں اس فتنے اور اس نمبر کے حوالہ سے ارشاد ہوا ہے:

”مشرق کے مقاصد غالباً سیاسی نوعیت کے تھے مگر لبادہ انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی

خیالات کی اصلاح کا اوڑھ لیا تھا۔ اور اس لبادہ میں اسلام کو مغربی مادہ پرستی کے طرز پر ایک بالکل

مادہ پرستانہ نظریہ زندگی کے رنگ میں رنگنے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ اس نظریہ کی اشاعت اور مقبولیت

کے لئے موصوف نے خاکسار تحریک کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا نظم اور ڈھانچا ایک

فوجی تنظیم کے انداز پر تھا۔ اس میں قواعد پر پکا مسلحہ برداری وغیرہ سب کچھ تھا۔ مسلمانوں کے نو

جوان اور پر جوش طبقے کے لئے اس انداز کی تنظیم میں قدرتی طور پر ایک خاص کشش تھی۔ اور

اسلام کی مادہ پرستانہ تعبیر میں اس الحاد زدہ طبقہ کے لئے کشش تھی جو مسلمان تو کہلاتا چاہتا تھا مگر

اُن اعتقادی اور عملی پابندیوں سے آزاد رہ کر جو کہ اسلام کا جزو لاینفک تھیں۔ نیز ایسی ہر تحریک کی

طرح اس تحریک کو بھی اسلام دشمن قوتوں کی خفیہ ہمدردیاں حاصل ہونا ایک یقینی سی بات تھی۔ نتیجہ

اس کا حلقہ اثر تیزی سے وسیع ہونے لگا اور کہتے ہی مسلمان اصل اسلام کو ”مولوی کا غلط

مذہب“ قرار دیکر (جو کہ مشرقی کی اصطلاح تھی) اپنی ارتداد کی گود میں جانے لگے۔ اس فتنہ انگیز

تحریک کے مقابلے میں بھی الفرقان کو ایک بھر پور اور یگانہ طریقے سے میدانِ عمل میں آنے کی

توفیق ملی اور تحریری جہاد کے علاوہ کچھ عملی جدوجہد کی سعادت بھی اس بندہ عاجز کے حصے میں اس

سلسلہ میں آئی۔ الفرقان کی چھٹی جلد ۱۳۵۸ء میں تین ماہ کے شماروں پر مشتمل ایک خاص

نمبر اسی تحریک کے بارے میں نکالا گیا جو پورا کا پورا اس عاجز کے مقالے پر مشتمل تھا۔“

اس موقع پر اس مقالے کی تمہید بھی آپ نے پوری کی پوری نقل فرمائی ہے، جس کا مقصد قارئین پر واضح کرنا تھا کہ کیوں اس تحریک کو اتنی غیر معمولی اہمیت الفرقان نے دی ہے؟ تمہید خاصی طویل ہے۔ یہاں اس کا بقدر ضرورت حصہ نقل کیا جاتا ہے:

”خاکسار تحریک کا مسئلہ اس وقت مسلمانان ہند کے اہم ترین مسائل میں سے ہو گیا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اگر چندے یہی رفتار رہی تو پھر اس کی مذہبی اور سیاسی مضرتوں اور ملت پر مرتب ہونے والے اس کے مہلک اثرات اور بدنتائج کا انداد و دفاع اگر محال نہیں تو قریب بہ محال ضرور ہو جائے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت کو سمجھنے والے اور اس کے خطرناک عواقب کا ادراک کرنے والے ہندوستان بھر میں شاید گنتی کے چند ہیں۔۔۔۔۔

”اس سلسلے میں بڑی اور سب سے پہلی ضرورت ہے ایسے لٹریچر کی تیاری اور اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جس میں نہایت صحیح اور سنجیدہ اور منہج طور پر اس تحریک کی حقیقت، اس کے مقصد و منہاج اور اس کے اثرات و نتائج کو بیان کیا جائے تاکہ جو مسلمان اس بارہ میں ابھی گمراہ نہیں کئے جاسکے ہیں یا جو صرف سرسری طور پر اس عام نقطہ نظر سے اس کے مخالف ہیں کہ یہ بھی منجملہ دوسری گمراہ اور غلط مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے ایک جماعت ہے۔ وہ اس کی حقیقت اور خصوصی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ نیز اللہ کے جو سادہ دل اور نیک بندے ”اسلامی فوجی تنظیم“ کے فریب میں آکر۔۔۔ اور خالی از حقیقت پر دو پیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہو گئے ہیں وہ بھی ٹھنڈے دل کے ساتھ اس کو دیکھ کر اپنی رائے اور اپنے رویہ پر نظر ثانی کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لٹریچر کی تیاری اور اشاعت ایک دو شخصوں کا کام نہیں ہے ضرورت ہے کہ جس سے بھی اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کرے۔ اس سلسلے میں میرا جو مقالہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے امید ہے کہ یہ انشاء اللہ اس مقصد کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ اور عام ناظرین کے علاوہ جو حضرات اس تحریک کے متعلق ضروری لٹریچر کی تیاری میں کوئی حصہ لینا چاہیں گے ان کو بھی اس سے اس تحریک کی حقیقت سمجھنے میں اچھی طرح مدد مل سکے گی۔۔۔۔۔“

نمبر کی تائید

اس خاص نمبر کی افادیت کے سلسلے میں جو ایک مثال تحدیثِ نعت میں بیان کی گئی ہے وہی ایک اس کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھا دینے کے لئے کافی ہے۔ فرمایا ہے کہ ”مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفت روزہ ”سچ“ میں خاکسار تحریک کی تحسین و تائید کا رجحان چل رہا تھا۔ الفرقان کے اس نمبر سے مولانا کے خیالات

میں تبدیلی آئی۔ نمبر کو پڑھتے ہی مولانا مرحوم نے جو خط اس عاجز کو لکھا اس میں چند پتے بھی تھے کہ ان پر یہ نمبر بھیج دیا جائے اور اس کا ڈاک خرچ بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ **فَلِّلَہُ الْحَمْد**

شاہ ولی اللہ نمبر

حضرت مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) کے بعد اسلامی ہند کی دوسری زندہ جاوید اور مایہ ناز شخصیت بارہویں صدی ہجری کے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ہے۔ اور ملت کے لئے کئی پہلوؤں سے ایک سدا بہار رہنما نمونہ۔ حضرت مجدد الف ثانی نمبر کے ذریعہ حضرت مجدد اور آپ کے کارناموں کی یاد تازہ کی گئی تو اس نے بعد کی یہ دوسری شخصیت بھی یاد دلائی، کہ اس کے تذکار میں بھی دین کے تحفظ کے لئے اپنے رنگ کی کچھ زیادہ ہی روشنی ہے۔ پس نیت ٹھیری کہ ایک نمبر آپ کے شایان شاں بھی۔

اللہ اللہ۔ کیا حوصلہ اللہ نے اپنے اس بندے کو دیا تھا! پیسہ پاس نہیں اور دین و ملت کی ضرورت ایسے کام کی داعی ہے جسے کرنے کی اہلیت اللہ نے اسے بخشی ہے تو پھر مالی بار کے خوف کو خاطر میں نہیں لانا، اور اللہ کے بھروسہ پہ قدم اٹھا دینا ہے، جیسا کہ بریلوی یلغار کی مزاحمت کے سلسلہ میں جسم و جان کی بازی کی طلبگاری ہوئی تو برسوں اس بازی میں باک نہیں رہا۔ اللہ اپنے بندے کو غنایات سے نوازے اور ہم اخلاف کو توفیق عملی شکر کی دے۔

یہ نمبر ۱۳۵۸ھ کے خاکسار تحریک نمبر کے اگلے ہی سال (۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں) شائع ہوا اور اسے مجدد الف ثانی نمبر سے بھی بڑھ کر مقبولیت ملی، جو حضرت شاہ ولی اللہ کی بعض یگانہ خصوصیات کا قدرتی نتیجہ تھی۔ چنانچہ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی فوراً ہی شائع کرنا پڑا۔ یہ تقریباً چار سو صفحات کا ضخیم نمبر تھا۔ اپنے موضوع پر وہ آج بھی تاریخی دستاویز اور الفرقان کی علمی اور تحقیقی صلاحیت کی ایک مزید یادگار! اس کی بابت ”تحدیثِ نعمت“ میں ارشاد ہوا ہے:

”حضرت مجدد الف ثانی نمبر کی طرح الفرقان کا ایک اور خصوصی نمبر جس کو یہ بندہ الفرقان

کے ذریعہ اپنے نصیب میں آنے والے حسنات میں سے ایسا ہی ایک دوسرا حسنہ سمجھتا ہے۔ اور

اس کے لئے اللہ کا مصمم قلب سے شکر گزار ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نمبر تھا جو ۱۳۵۹ھ میں شائع

ہوا، جس کا مقصد تذکار شاہ ولی اللہ کی تجدید تھی۔ اس نمبر کو مجدد الف ثانی نمبر کی طرح بلکہ اس سے

بڑھ کر ہی علمی وقعت حاصل ہوئی۔ فوراً ہی دوسرا ایڈیشن تیار کرنا پڑا۔ بعد ازاں اس کا

کتابی ایڈیشن بھی نکلا۔۔۔۔۔

آئے اس نمبر کی بھی ایک جھلک اس کی فہرست مضامین میں دیکھیں:

فہرست مضامین

شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان بریلی

بابت ماہ رمضان و شوال و ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ

فہرست حصہ نثر

| نمبر صفحات | مضامین نگار حضرات | مضامین |
|------------|--|--|
| ۱۰-۱ | مدیر | نگار و ادبیں |
| ۱۲ | حضرت مولانا سید حسین احمد مدظلہم العالی | ”ارشادِ گرامی“ |
| ۱۳ | مولانا عبد الماجد ریا بادی، ایڈیٹر ”صدق“ لکھنؤ | ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا اور شاہ ولی اللہ |
| ۱۶ | مولانا محمد حسن بدر فشی فاضل و فاضل دیوبند | ہدیہ نایاب مادہ ہائے تاریخ و تاریخ نمیش بہاولی اللہ نمبر |
| ۳۰-۱۷ | مولانا مسعود عالم صاحب ندوی | امام ولی اللہ دہلوی سے پہلے اسلامی ہند کی دینی حالت |
| | | اور تدریجی ارتقاء |
| ۹۸-۴۱ | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، | منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں |
| | مدیر ”ترجمان القرآن“ لاہور | حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام |
| ۲۲۹-۹۹ | مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ | آغوشِ موج کا ایک دُرِ تابندہ، یا اسلامی ہند کے طوفانی |
| | صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد | عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ |
| ۲۳۲-۲۳۰ | مولانا مسعود عالم صاحب ندوی | تعارف عکس تحریر حضرت شاہ ولی اللہ |
| ۳۳۰-۲۳۳ | حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مدظلہ | امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف |
| ۳۲۵-۳۲۲ | حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ | ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب |
| | | شاہ صاحب کی نظر میں |
| ۳۳۶-۳۲۹ | مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر ”برہان“ دہلی | انقلابی یا مجید و |

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی بحیثیت مصنف

۳۳۶-۳۳۷ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، استاذ تفسیر
ندوة العلماء لکھنؤ

شاہ صاحب کا ایک علمی ماخذ

۳۵۱-۳۳۷ مولانا محمد اویس ندوی نگرانی رفیق دارالمصنفین

شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی بعض علمی خصوصیات

۳۵۸-۳۵۴ مولانا سید ابوالنظر صاحب رضوی امرودی

امام شاہ ولی اللہ اور حقیقت

۳۷۱-۳۶۰ مولانا محمد یوسف فاضل بخاری، استاذ جامعہ اسلامیہ

حضرت شاہ ولی اللہ اور تقلید

۳۷۸-۳۷۲ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ اور ان کے کام کا مختصر تعارف

۳۸۴-۳۸۰ مولانا محمد حسن بدرسنہ علی فاضل دیوبند

تاریخ جانفزا

۱۳۵۹

فہرست حصہ نظم

عنوان نظم

شعراے کرام

صفحہ

پیام ولی اللہی

۱۵-۱۴ مولانا سید انیس الدین احمد رضوی امرودی

مزار شاہ ولی اللہ پر پہنچ کر

۲۳۰ مولانا نسیم احمد فریدی امرودی رفیق ادارہ

الفرقان بریلی

مجدد وقت

۳۲۱ حضرت مآثر القادری (حیدر آباد دکن)

شاہ ولی اللہ (قدس سرہ العزیز)

۳۲۷-۳۲۲ حضرت روشن صدیقی جوالا پوری

خطاب بروج فتح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۳۵۳-۳۵۲ حضرت میر تقی کاظمی امرودی

عقیدت کے پھول

۳۵۹ حضرت شوٹی اسعدی انبالوی

در مناقب مجدد عصر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۳۷۹ حضرت آثر زبیری لکھنوی

۴۰۷-۴۰۵ جناب سید محمد عبدالرب صوفی

امت مسلمہ سے روح ولی اللہی کا خطاب

۴۰۸ مولانا محمد حسن صاحب بدرسنہ علی

تاریخ منظوم

نمبروں کے اس سلسلے کا مقصد

شاہ ولی اللہ نمبر کے نگاہ اولیں میں اس نمبر اور حضرت مجدد نمبر (دونوں) کی اشاعت سے اپنا اصل مقصد مدعا بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

”۔۔۔۔۔ نمبروں کے اس سلسلہ سے ہماری غرض صرف یہ ہے کہ اس طرح ہم اپنے اُن مجددین اور مصلحین اُمت کے کارناموں کو روشن اور ان کی ہدایتوں کو زندہ کر کے مسلمانانِ حال کے سامنے پیش کر سکیں جنہوں نے بگڑے ہوئے ہندوستان ہی میں اقامتِ دین، احیاءِ ملت اور اشاعتِ کتاب و سنت کے سلسلہ میں وہ خدمات انجام دیں جن کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمان آج تک اس ملک میں باقی ہیں، اور بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی اس کام کے لئے جو کچھ اور جیسا کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے بحیثیتِ مجموعی دوسری جگہ نہیں ہو رہا۔ درحقیقت یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب طفیل اور صدقہ ہے ہمارے اُن ہی مقدس بزرگوں کا، جن کے ناموں کو تو ہم نے بس ناموں کی حد تک ضرور یاد رکھا ہے اور خوب یاد رکھا ہے، لیکن اُن کے کاموں اور پیغاموں کو ایسا بھلا دیا ہے کہ بچارے عوام درکنار خواص تک نادانف ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے شروع کیا ہے، کیونکہ بقول حضرت امام ربانی ”ہزارہ دوم کے آغاز ہی سے یہاں دین کی ”غربت“ اور ”جاہلیت“ کے غلبہ کا خاص دور شروع ہوا ہے اور ہندوستان میں تجدیدی نوعیت کا کام وہیں سے شروع ہوتا ہے (اس سے پہلے یہاں دین کی خدمت کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر ہمارے ناظرین مولانا محمد نور الحق صاحب پروفیسر اور سنیل کالج لاہور کے اس سلسلہ مضامین میں ملاحظہ فرما رہے ہیں، جس کا کافی حصہ پچھلے دو سال میں قسط وار الفرقان میں شائع ہو چکا ہے اور باقی انشاء اللہ آئندہ شائع ہوگا، نیز اس عہد کی اجمالی تاریخ اسی نمبر میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے مقالہ میں آگئی ہے)

”بہر حال اس ملک میں تجدیدی نوعیت کا کام چونکہ ہمارے خیال میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی ہی سے شروع ہوا ہے اس لئے ہم نے اپنے نمبروں کا سلسلہ بھی وہیں سے شروع کیا ہے، ”مجدد الف ثانی نمبر“ ہمارے اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔ ہم کو بے حد مسرت ہے کہ علمی

حلقوں میں ہماری توقعات سے زیادہ قبول ہوا، بہت زیادہ پڑھا گیا، اور ہندوستان کے علمی حلقہ پر اس نے اپنا ایک خاص اثر ڈالا۔ اسی سلسلہ کی یہ دوسری کڑی ”شاہ ولی اللہ نمبر“ ہے، جو اس وقت آپ کے زیر نظر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق سوچا گیا تھا اور اعلانوں میں جو وعدے کیے گئے تھے الحمد للہ ان کے لحاظ سے اس میں کوئی خاص کمی نہیں ہے۔“

چوتھا باب

(مولانا مودودی سے جماعتِ اسلامی تک)

”غالباً ۱۹۳۲ء شروع ہو چکا تھا، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنؤی نے ایک ادارہ ”دارالمبلغین“ کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ دارالعلوم (دیوبند) جیسے بڑے دینی مدارس کے باصلاحیت فارغ التحصیل فضلاء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی دعوت و تبلیغ اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں سے اس کی حفاظت و مدافعت اور اس کے لئے تحریر و تقریر کی اور مناظرہ و مباحثہ کی تربیت دی جائے۔ مولانا مرحوم نے اس ادارہ کی خدمت کے لئے اس عاجز کو بھی طلب فرمایا اور اسی سلسلہ میں اس دور میں چند مہینے میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔“ (مولانا مودودی کے ساتھ رفاقت کی سرگزشت)۔

اقتباس ابھی نامکمل ہے، لیکن مناسب ہے کہ درمیان ہی میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب سے تعلق کی وہ نوعیت بیان میں آجائے جو آپ کی طرف سے لکھنؤ کی اس دعوت کا باعث بظاہر ہوئی۔ پس، صاحب سوانح تو حضرت لکھنؤیؒ سے اپنے زمانہ طالب علمی سے واقف تھے۔ اور دورِ طالب علمی ختم کرتے ہی میدانِ مناظرہ میں جو شہرت پائی تو دیگر اکابر کی طرح حضرت لکھنؤی بھی آپ سے ناواقف نہ رہے۔ پھر اسی زمانہ میں حضرت صاحب سوانح کا تقریر امر وہہ کے اسی مدرسے میں ہو گیا جس میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نے کافی عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی تھی، اور اہل امر وہہ کو اس وقت سے حضرت لکھنؤی سے ایسا تعلق ہو گیا تھا کہ سلسلہ خدمت ختم ہونے کے بعد بھی آپ کی آمد و رفت امر وہہ رہتی تھی۔ اس لئے اب آپ کی امر وہہ آمد و رفت کی بدولت طرفین سے اس واقفیت کے ایسے انس و قربت میں بدلنے کی راہ بھی پیدا ہو گئی کہ ابھی کچھ پہلے آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت لکھنؤی کو ضلع میرٹھ میں ایک مناظرہ کے لئے جانا تھا جس

ترجمان القرآن کے ہر شمارہ کا منتظر رہنے لگا، جب وہ آتا تو مولوی عبدالمومن مرحوم مجھے پہنچاتے اور میں بڑے شوق و اہتمام سے اس کا مطالعہ کرتا۔“

”لکھنؤ کے اپنے قیام کے زمانہ ہی میں میں نے الفرقان جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور محرم ۱۳۵۳ (مارچ ۱۹۳۲ء) سے بریلی سے اس کا اجرا ہوا۔ اور اب ترجمان القرآن اس کے جادہ میں آنے لگا، وہ مجھے اتنا عزیز تھا اور میں اس کا ایسا عاشق تھا کہ اس سے پہلے پورے ایک سال کے شمارے جو میں نے لکھنؤ میں دیکھے تھے اور اب میرے پاس نہیں تھے وہ بھی میں نے دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد سے قیما متگولائے اور اس کا پورا فائل اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا۔۔۔“

اوپر مناظرہ سلانوالی کے سلسلہ میں گزرا ہے کہ ۷، ۸ سال کے تجربہ کے بعد مناظروں کے مروجہ طریق کار کو غلط محسوس کر کے، اس لائن کے ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، یہ بات ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء کی ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں مستقبل کے ایک نئے سیاسی نقشے کے آثار رونما ہونے لگے تھے۔ برطانوی حکومت نے ”انڈیا ایکٹ ۳۵ء“ پاس کیا، جس میں اہل ہند کو کچھ سیاسی اختیارات دئے گئے، اور ۳۶ء میں اس کے مطابق الیکشن ہوئے جس کے نتیجے میں ہندوستانیوں کی اپنی صوبائی حکومتیں اس ایکٹ میں دئے گئے اختیارات کے ماتحت بنیں۔ (اور جیسا کہ گزرا، اسی نئی صورت حال سے تاثر کے تحت الفرقان کی خاص اشاعت ”مجدد الف ثانی نمبر“ کا فیصلہ آپ نے کیا تھا) اس موقع پر ترجمان القرآن نے بھی ایک سلسلہ مضامین اس نئی صورت حال کے حوالہ سے مستقبل کے ہندوستان پر شروع کیا۔ ترجمان القرآن کے ان مضامین نے اس نئی سوچ اور فکر کو اور غذا دی۔ ملک کے سیاسی اُفق پر ابھرنے والی مستقبل کی جس نئی صورت حال کا نقشہ ان مضامین میں کھینچا گیا تھا، اس صورت حال کے پیش نظر ترجمان نے ایک خاص راہ عمل کی طرف دعوت بھی دی تھی۔ اس دعوت میں آپ کو اُس تحریک خلافت کی بازگشت سنا دی جس کی آغاز شباب میں جگائی ہوئی آپ کی آرزوئیں تشنہ رہ گئی تھیں۔ اور ”بازگشت“ کا یہ تاثر آپ کو ”جماعت اسلامی“ نام کی اس جماعت کی تشکیل میں بھرپور شرکت تک لے گیا جس کا قیام ۱۹۳۱ء میں مولانا مودودی کے زیر سرکردگی عمل میں آیا۔

”رفاقت کی سرگزشت“ میں آپ نے تحریک خلافت کے دور عروج کی اپنی ان یادوں کا حوالہ دیا ہے جو مختصر اس طرح ہے:

میں بھی یہ مضامین نقل ہوتے رہے اور راقم الحروف خود بھی ان کی تائید میں لکھتا رہا۔
 آپ کی تعلیمی و تدریسی مشغولیت کا سلسلہ تو تین چار سال ہی میں ختم ہو گیا تھا، پھر مناظرانہ سرگرمیوں سے بھی طبیعت ہٹی، تو اس کا مطلب تھا عملی خلا۔ ایسے میں ترجمان القرآن کے مذکورہ بالا سلسلہ مضامین کا وہ مرحلہ آیا جس میں:

”مولانا مودودی نے مسلمانوں کے سامنے احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کو نصب العین بنا کر خالص دینی بنیاد پر اس طرح کی ایک جماعت کی تنظیم اور اصلاحی دعوتی کام کی اسکیم پیش کی جس طرح کسی دور میں مولانا آزاد مرحوم نے ”الہلال“ کے ذریعہ ”حزب اللہ“ کے نام سے ایک جماعت کی تنظیم شروع کی تھی۔ یاد آتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں حوالہ کے ساتھ ”الہلال“ کے اقتباسات بھی نقل کئے تھے۔ اس عاجز کو ان کی اس مثبت اسکیم سے بھی اس وقت پورا اتفاق تھا۔“

گویا عملی خلا کے نہایت بہتر شکل میں پُر ہونے کا سامان ہوتا نظر آیا۔ یہاں سے مولانا مودودی کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ اس مقصد سے شروع ہوا کہ مجوزہ اسکیم کو عملی شکل دی جائے۔ اس خط و کتابت کے نتیجہ میں ملاقات طے ہوئی۔ یہ ملاقات (غالباً ۱۹۳۸ء میں) اس وقت دہلی میں ہوئی، جبکہ مودودی صاحب اپنی اسکیم کے نفاذ کے لئے حیدرآباد کو ناموزوں جان کر مشرقی پنجاب کے ایک مقام پر منتقل ہونے کی دعوت پا چکے تھے اور وہاں منتقل ہونے کی تیاریوں میں تھے۔ بعد میں یہی مقام ان کے ذریعہ ”دارالاسلام“ کے نام سے موسوم ہوا۔ اور جماعت کے قیام کے بعد اس کا مرکز بنا۔ دہلی کی ملاقات سے جماعت کی تشکیل تک غیب و فراز اور تردد و تبادل کے جو مراحل طے ہوئے (جو مجملہ آگے آرہے ہیں) وہ ایک ایسے جذبہ بے تاب کی داستان ہیں جو راہ کے کانٹوں کو خاطر میں لانے کو تیار نہ ہو۔ یہ مراحل پہلی ہی ملاقات سے شروع ہوئے، جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

مولانا مودودی سے ملاقات

”میں یہ بات سن چکا تھا کہ مولانا مودودی کے ایمان آفریز مضامین اسے ان کے طرز زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے ان کی زندگی اس سے بہت مختلف ہے۔ جن صاحب نے یہ بات مجھے بتائی تھی وہ مولانا کے ملنے والوں میں سے تھے اور ترجمان

القرآن کے مضامین سے متاثر اور ان کے قدردان۔ انھوں نے بتلایا تھا کہ مودودی صاحب ”مخلوق اللہ“ (کلین شیوڈ) ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ سن کر مجھے حیرت و استعجاب کے ساتھ بڑا رنج و افسوس اور بڑی ہی مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن دہلی کی اس ملاقات سے چند ہی روز پہلے حیدرآباد ہی سے ایک قابل اعتماد ذریعہ سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب انکی زندگی کے طرز میں ہم جیسوں کے لئے خوشگوار تبدیلی شروع ہو گئی ہے۔ (ایک محترم بزرگ نے لکھا تھا کہ اب مودودی صاحب کے چہرے پر ایمان کی کھیتی اگنا شروع ہو گئی ہے) مجھے اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی۔ بہر حال میں مولانا سے ملنے کیلئے دہلی پہنچا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پہلی دفعہ مولانا کو دیکھ کر طبیعت کو ایک دھچکا سا لگا، کیونکہ اب بھی مولانا کی ہیئت اس سے بہت مختلف تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ وہ اس وقت مخلوق اللہ (Clean shaved) تو نہیں تھے لیکن اس لحاظ سے ان میں بس برائے نام تبدیلی آئی تھی۔ مگر چونکہ مولانا کے مضامین سے بہت متاثر تھا اور ان کے ساتھ ایک خاص قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا اس لئے دل کو سمجھایا کہ عملی زندگی کی اصلاح کا ابھی آغاز ہوا ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ یہ حالت نہیں رہے گی۔ اور ان کی زندگی اور تحریر میں جو مطابقت ہونی چاہئے وہ ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ آئندہ کام کے بارے میں اس ملاقات میں کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

”دارالاسلام“ کا سفر اور دوسری ملاقات

”اس کے کئی مہینے بعد وہ وقت آیا جب مولانا حیدرآباد سے نکل ہو کر پٹنہاں کوٹ کے قریب دارالاسلام نامی اس بستی میں آ گئے جس کو وہاں کے ایک مخلص صاحب خیر چودھری نیاز علی صاحب نے اسی نیت سے بنایا اور وقف کیا تھا کہ اللہ کے کچھ بندے یہاں قیام کر کے دین کی کوئی ٹھوس خدمت انجام دیں۔ چند مہینے کے بعد مولانا نے اپنی تحریک اور اپنے کام کا ایک خاکہ ترجمان میں شائع کیا اور اپنے ہم خیال دوستوں کو دعوت دی کہ وہ فلاں تاریخ کو دارالاسلام میں جمع ہوں اور ایک جماعت یا ادارہ کی باقاعدہ تشکیل ہو جائے۔ مقررہ تاریخ پر یہ عاجز بھی دارالاسلام پہنچا۔ توقع تھی کہ مودودی صاحب میں اصلاح و تبدیلی کا جو عمل شروع ہوا تھا اب تک اس نے کافی منزلیں طے کر لی ہوں گی۔ لیکن وہاں پہنچ کر ایک دو دن مولانا کے ساتھ رہنا ہوا تو بڑے رنج کے ساتھ مایوسی ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ ابھی انھوں نے اپنے کو بدلنے کا ارادہ ہی

نہیں کیا ہے۔ دارالاسلام کے بانی چودھری نیاز علی خاں صاحب اس عاجز کے بارے میں کچھ غائبانہ واقفیت پہلے سے رکھتے تھے، اس موقع پر ان سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بھی مولانا کے بارے میں فکر مندی کے ساتھ اسی احساس و تاثر کا ذکر کیا جو میرا تھا۔ (چودھری صاحب خود پورے متشرع اور خوش اوقات تھے۔)

”اگلے دن جب وقت آیا کہ سب (آنے والے) ایک جگہ بیٹھ کر جماعت یا ادارہ کی تشکیل کریں تو میں نے ذرا دیر پہلے تہائی میں مولانا سے کہا کہ میں آیا تو اسی ارادہ سے تھا کہ اس کام میں آپ کا رفیق بنوں گا لیکن یہاں آکر مجھے کچھ تذبذب پیدا ہو گیا ہے، اور میں نے مناسب سمجھا کہ میں پہلے ہی آپ کو بتا دوں کہ اس وقت جو ادارہ یا جماعت بنے گی میں اس میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔ لیکن آپ کے مقصد اور آپ کی دعوت سے مجھے پورا اتفاق اور ہمدردی ہے۔ اور ضابطہ کی شرکت کے بغیر تعاون کروں گا۔“

مولانا نے کوشش کی کہ یہ تذبذب دور کر دیں اور فیصلہ بدلوادیں۔ چنانچہ کہا کہ ”میں آپ کے اس تردد اور تذبذب کی وجہ سمجھتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں کس دنیا کا آدمی تھا اور کہاں سے چل کر آیا ہوں آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک دم بدل جاؤں، آپ جو کچھ چاہتے ہیں ان شاء اللہ رفتہ رفتہ ہو جائے گا۔“

لیکن تردد اتنا پیدا ہو گیا تھا کہ فیصلہ بدلا نہیں جاسکا۔ البتہ مولانا کی خاطر تشکیلی مجلس میں شرکت کی تا کہ دوسرے لوگوں کو کچھ پتہ نہ چلے۔ اور جب سب لوگ (جو آٹھ دس تھے) شرکت یا عدم شرکت کا اہتمام کیا۔ فیصلہ بنا چکے، تب سب سے آخر میں آپ نے فی الحال شرکت سے یہ کہتے ہوئے معذرت کی کہ میں ابھی اور غور کروں گا۔

اس مجلس میں بنائے گئے ادارہ کا نام ”ادارہ دارالاسلام“ تھا اور چار حضرات اس کے رکن بنے تھے۔ لیکن یہ ادارہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ لکھا ہے کہ ”کچھ عرصہ بعد ادارہ دارالاسلام کا ذکر ترجمان تین آنا پند پنج ہو گیا۔ اور معلوم ہوا کہ مولانا اس کام کے آگے بڑھنے سے مایوس ہو گئے۔“

بیابان جذبہ کی ایک نئی کوشش

سفر شوق کے اس تلخ مرحلے کے اثرات ابھی زائل نہ ہو پائے تھے کہ اسی سلسلہ کی ایک نئی کوشش کا امکان ایک دوسری سمت میں نظر آیا تو دل کی بے تابی نے نہ چاہا کہ ذرا بھی دیر اس میں ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ”سیرت سید احمد شہید“ پہلی دفعہ چھپی تھی، مولانا نے اس کا ایک نسخہ آپ کو بھی بھیجا۔ یہ خلافت تحریک سے پیدا آرزوئے انقلاب کو کچھ اور بھی بڑھ کر بھڑکانے، دواستہ کر دینے والی تھی۔ آپ نے مولانا کو خط لکھا۔ اور اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے پوچھا کہ ”براہ کرم صفائی سے بتائیے کہ آپ نے بس یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا جو لکھی گئی یا وہ کام بھی کرنے کا ارادہ ہے جس کا یہ کتاب تقاضہ کرتی ہے؟ اگر یہ دوسری بات ہے تو میں آپ سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں۔“ مولانا کا جواب حسب خواہش ملنے پر آپ نے فوراً ہی رائے بریلی کا سفر کیا۔ اور کتاب پڑھ کر جو تقاضہ اُبھرا تھا اس پر گفتگو کی، اس گفتگو میں مولانا مودودی کا اور ان کے مضامین کا خاص طور سے ذکر رہا جو انھوں نے ”آنے والے انقلاب“ کے عنوان سے لکھے تھے۔ پتہ چلا کہ مولانا علی میاں بھی ان مضامین سے ایسے ہی متاثر تھے اور اس لحاظ سے دونوں حضرات کے خیالات اور جذبات میں پوری ہم آہنگی نکلی۔

اس ملاقات میں آپ نے ”ادارۃ دارالاسلام“ کی تاسیس کے سلسلے میں اپنے پٹھانکوٹ کے سفراء مولانا مودودی صاحب سے متعلق اپنے اندازہ اور احساسات کا بھی ذکر کیا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان سے تو مایوسی ہوئی ہے لیکن ہم سے خاص حالات کے مطابق جو کچھ ہو سکے دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے کرنا چاہئے اور بنام خدا اس کا آغاز کریں۔ لیکن اس جذبہ اور احساس ضرورت کے باوجود دونوں بزرگوں میں سے کوئی بھی کام کی قیادت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ اپنے متعلق آپ نے فرمایا کہ میں اپنے کو جانچ تول کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ ایسے ہی مولانا علی میاں صاحب نے بھی اپنی کچھ معذوری بتائی اور پھر یہ طے ہوا کہ دوستوں پر نظر ڈال کر ایسی شخصیت تلاش کرنا چاہئے جو اپنے کو پوری طرح اس کام کے لئے وقف کر دے، اس کی حیثیت امیر کی ہو اور اس میں وہ چیزیں کم از کم بقدر ضرورت موجود ہوں جو ایک ایسے کام کے امیر میں ہونی چاہئیں۔ یہ بیل کہاں آسانی سے منڈھے چرنے والی تھی، بس ایک بے قرار جذبہ تھا جو تسکین کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا چنانچہ کئی سفر بھی اس

(۱) یہاں یہ ذکر کرنا موزوں ہو گا کہ حضرت مولانا علی میاں اور حضرت صاحب سوانح کافی پہلے سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ مولانا نے اس ملاقات کا ذکر ”کاروانِ زندگی“ میں کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ”سیرت سید احمد شہید ہوئی شائع ہوئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ مولانا منظور صاحب نعمانی کو ہدیہ بھیجا جن سے میرا تعارف اس وقت ہوا تھا جب وہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے ادارۃ دارالمبلغین میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ ابتدا کی تعارف اور ملاقاتوں کے بعد متعدد مشترک باتوں کی وجہ سے بہت جلد دونوں میں مناسبت اور ربط پیدا ہو گیا۔ (جلد اول ص ۳۴-۳۳)

سلسلہ میں دونوں بزرگوں نے کئے مگر نتیجہ خیز نہ ہو سکے۔

اس غیر معمولی بے چینی کے سلسلہ میں خود تحریر فرمایا ہے کہ

”اس زمانے (۱۳۸ء/۱۳۹ء) میں باشعور مسلمانوں کے جذبات میں عام طور سے ایک مظلوم برپا تھا اور ایسے کام کے لئے زمین خاصی تیار تھی، اس لئے اس وقت طبیعت اس کے لئے سخت بے چین تھی کہ ایسا کوئی کام شروع ہو۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے دل کی زمین میں اس کا ختم خلافت تحریک کے زمانہ ہی میں پڑ چکا تھا۔ پھر ۱۳۹ء میں جب دوسری جنگ شروع ہو گئی تو اس وقت یہ بچپنی اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ جنگ دنیا کے اورو قوموں کے نقصوں میں غالباً بڑی بڑی تبدیلیوں کا ذریعہ بنے گی۔“ (پس ایسے انقلابی وقت میں اپنے لئے امکانات کی تلاش اور ان کو بروئے کار لانے کی کوشش میں ہر ممکن سعی کی جانی چاہئے)

مودودی صاحب سے پھر ایک رابطہ

مولانا مودودی کا ”ادارہ دار الاسلام“ جس کا ذکر اوپر آیا وہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکا بلکہ خود مودودی صاحب کا قیام بھی ”دار الاسلام“ کہلانے والی بستی میں نہ رہ پایا، وہ چند ہی مہینوں کے اندر وہاں سے لاہور منتقل ہو گئے۔ اور ترجمان القرآن اب وہیں سے نکلنے لگا۔ اسی دوران میں ۱۳۹ء والی جنگ شروع ہوئی تو موصوف نے ہندوستانی تحریکات اور مسلمانوں کے نصب العین کے متعلق ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ ان مضامین کی آخری قسطوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا اب پھر کوئی جماعت اس کام کے لئے بنانا چاہتے ہیں جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں۔ اتفاق سے انہی دنوں میں آپ کالاہور کا ایک سفر ہوا وہاں کچھ دوست مودودی صاحب سے ایسا ہی تعلق رکھنے والے تھے اور ان کے مضامین اور ان کی دعوت سے متاثر۔ ان سے ملاقات ہوئی اور قدرتی طور پر مودودی صاحب اور ان کی تازہ دعوت سے متعلق گفتگو بھی آتی تھی۔ ان حضرات کے کہنے کے مطابق مولانا کی زندگی میں اب کافی تبدیلی بھی آ گئی تھی۔ انھیں یہ بات بھی کسی درجہ میں معلوم تھی کہ مولانا مودودی سے ذاتی دوستانہ تعلق رکھنے اور ان کی دعوت اور ان کے اس وقت کے موقف سے اصولی طور پر متفق ہونے کے باوجود آپ موصوف میں کوئی کمی محسوس کرنے کی وجہ سے ’’ادارہ دار الاسلام‘‘ کی تشکیل کے وقت اس کی رکنیت قبول نہیں کر سکے تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں اب اس معاملہ پر نئے سرے سے فیصلہ کی ضرورت تھی، یہ خود بھی خواہشمند تھے کہ کوئی جماعت بنے اور کام شروع ہو۔ ادھر خود کسی کام کے

لئے بے چینی کا وہ عالم تھا جو ابھی اوپر گزرا۔ دریا کی طغیانی قیامت مچائے تھی اور ساحل نایاب۔ فرماتے ہیں:

”اس لئے میں پھر کچھ آمادہ ہو گیا۔ پھر بھی میں نے مزید اطمینان کے لئے مولانا مودودی سے کچھ صاف صاف باتیں کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں (واضح رہے کہ مودودی صاحب حضرت صاحبِ سوانح سے دو سال عمر میں بڑے تھے، ع) تو میں آپ سے آپ ہی کے متعلق تنہائی میں کچھ باتیں کروں گا۔ وہ بخوشی اس کے لئے تیار ہو گئے۔“

اس کے بعد آپ نے مولانا سے وہ باتیں کیں جن کے بارے میں بظاہر آپ نے سوچا کہ ان کا جواب اگر مثبت شکل میں ملتا ہے تو پھر بنام، خدا موصوف کو امیر کارواں کی حیثیت سے قبول کر ہی لیا جائے اور قبل اس کے کہ وقت نکل جائے کچھ کام شروع ہو۔ مولانا سے کی گئیں یہ باتیں سوال و جواب کی شکل میں بالتفصیل ”رفاقت کی سرگزشت“ میں آچکی ہیں۔ مولانا کا جواب مثبت رہا اور وہیں طے ہو گیا کہ اب کوئی تاریخ مقرر کر کے جماعت کی تشکیل کے لئے ہم خیال لوگوں کو دعوت دیدی جائے۔ فرماتے ہیں:

”یاد آتا ہے کہ غالباً اس وقت میرے مشورہ ہی سے تاریخ مقرر ہوئی، اور دعوت دی گئی۔“

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

یہ مجوزہ جماعت اگست ۱۳۶۰ھ (شعبان ۱۳۶۰ھ) میں ”جماعتِ اسلامی“ کے نام سے وجود میں آئی۔ اس کا دستور منظور ہوا، اور امارت کے لئے مولانا مودودی کا نام خود آپ ہی نے پیش کیا۔ مولانا مودودی کے اس سلسلہ کے مضامین یوں تو کافی پہلے سے الفرقان میں نقل ہو رہے تھے، جماعت کی تائیس کے بعد تو وہ گویا ”جماعت کا آرگن ہو گیا۔“ مزید ارشاد ہوا ہے کہ ”اس دور میں اس کی دعوت و کالت ہی اس عاجز کی زندگی کا موضوع تھا۔ اور لا یؤمن احدکم حتیٰ یحب لاخیه ما یحب لنفسه“ کے مطابق جی چاہتا تھا کہ اللہ و رسول پر ایمان رکھنے والے سارے بندوں کا یہی حال ہو جائے۔

مرکزِ جماعت کا قیام اور ہجرت

چھ ماہ بعد جماعت کی مجلسِ شوریٰ کا جلسہ لاہور میں ہوا۔ شوریٰ کے اس جلسے میں بعض ارکان کی تجویز پر یہ بھی طے ہوا کہ جماعت کا مرکز لاہور نہ رہے بلکہ کسی جگہ ایک ایسی نوآبادی قائم کی جائے جس کو ہم اپنے نظریات کے مطابق تا امکان ایک مثالی دینی بستی بنائیں۔ اور جماعت کے جوارکان منتقل ہو سکتے ہوں وہ

وہیں منتقل ہو جائیں۔ بعض مصالح کے پیش نظر سیالکوٹ کا علاقہ اس کے لئے زیادہ مناسب سمجھا گیا، مگر اس میں وقت لگ سکتا تھا اس لئے عارضی طور پر چودھری نیاز علی خاں صاحب سے ”دارالاسلام“ والی بستی کے لئے بات کرنا طے ہوا۔ اور یہ جگہ مل گئی۔ اولاً مودودی صاحب نیز چند اور حضرات وہاں منتقل ہوئے۔ اور دو تین ہفتے کے بعد حضرت صاحب سوانح بھی بریلی سے ”ہجرت“ کر کے وہیں پہنچ گئے (راقم سطور کو بھی آپ نے اس ہجرت میں ساتھ رکھا تھا۔ باقی اہل خانہ کو اس وقت تک کے لئے سنبھل پہنچا دیا تھا جب تک دارالاسلام میں ہم سب کے قیام کا معقول بندوبست نہ نظر آئے) فرماتے ہیں: ”مجھے یاد ہے کہ میں اپنے اس سفر کو ایک طرح کا سفر ”ہجرت“ سمجھتا تھا۔“

ہمہ شوق آمدہ بودم۔۔۔

چھ ماہ پیشتر شوری کے اجلاس کے موقع پر یہ دیکھ کر آپ کو بڑا دکھ لگا تھا کہ لاہور کی گفتگو کے بعد مولانا مودودی میں جس تبدیلی کی توقع کی گئی تھی وہ بالکل پوری نہیں ہوئی ہے، تاہم اب ذرا صبر سے کام لینا تھا، خود کچھ کہنے کے بجائے مولانا امین احسن صاحب سے کہلویا اور بس۔۔۔ اب چند ماہ بعد دارالاسلام پہنچ کر پایا کہ مولانا مودودی میں بظاہر مطلوبہ تبدیلی آگئی تھی۔ تو اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اس کے بعد جلد ہی وہ ہوا کہ ”ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حراماں رقتم“ کا مضمون بننے لگا۔ کیا ہوا؟ تفصیل ”رفاقت کی سرگزشت“ میں آکر بالعموم معلوم ہے ورنہ دیکھی جاسکتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مولانا کی خانگی زندگی سے متعلق ایک ایسی بات سامنے آئی جو آپ کے نزدیک ایک شرعی منکر تھی اور مولانا سے بات کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ اپنے اس نظر سے نہیں دیکھتے، جبکہ مولانا امیر جماعت تھے، اب صورت بڑے شش و پنج کی بن گئی۔ مولانا سے ایسا قلبی تعلق ہو گیا تھا کہ ایک تو اس کی وجہ سے یہ صورت حال سخت ابتلاء بن رہی تھی، دوسرے دنیا بھر کو جماعت کی طرف بلایا تھا، اور پھر ہجرت کی نیت سے مرکز جماعت میں پہنچے تھے! تو ”جائے رقت نہ پائے ماندن“ کا مضمون۔ وہاں کے بعض معتمدین سے مشورہ چاہتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی کچھ خوش نہیں ہیں۔ آخر کار حل یہ نظر آیا کہ فی الحال واپس ہو جائیں اور پھر غور کر کے فیصلہ کریں، چنانچہ کوئی ایک ڈیڑھ ماہ کے قیام کے بعد سنبھل کو واپسی عمل میں آگئی۔ اس ضمن میں قابل ذکر ہے کہ برسات کا یعنی ملیر یا کا موسم تھا راقم کو ایسے سخت ملیر یا نے آدیا تھا کہ زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی تھی، تو حضرت والد ماجد کی جان کو ایک نہیں دو پریشانوں نے گھیرا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے ملیر یا سے نجات ہوئی اور واپسی کے لئے رخصت سفر بندھا، اور پھر اچھی طرح۔

غور کر کے اس فیصلہ پر پہنچنا پڑا کہ جب مودودی صاحب سے ذاتی تعلق بھی خراب نہیں کرنا چاہتے، کہ مسئلہ شوریٰ میں لائیں، تو پھر واحد شکل خاموشی کے ساتھ جماعت سے رکنیت کا رشتہ توڑنے ہی کی رہ جاتی ہے۔ کتنا شاق اور کتنا مشکل یہ فیصلہ ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ ہونا چاہئے۔ یہ وہ سارے خواب دفن کر دینے کا فیصلہ تھا جو جماعت بناتے وقت دیکھے تھے، وہ خواب جن کی خاطر جماعت بنانے میں اپنے اصولی شرائط پر ایک وقتی سمجھوتہ تک کر لیا تھا۔ بہر حال ہونی ہو کر رہی۔ اور اپنے خواب اپنے ہاتھوں ہی سے دفن کر دینا پڑے۔

صدمہ اور سخت بیماری

شعبان ۱۹۶۱ھ کی آخری تاریخ میں سنبھل واپسی ہوئی تھی۔ راقم تو ملیریا کی گرفت سے نکل کر صحتیاب ہونے لگا تھا لیکن حضرت والد صاحب دو چار ہی دن بعد ایسے بیمار پڑے کہ اب ان کی جان خطرہ میں نظر آنے لگی۔ لکھا ہے کہ

”اس واقعہ سے مجھے اتنا رنج اور صدمہ ہوا کہ شاید ہی عمر میں اس سے پہلے اتنا بڑا کوئی

صدمہ ہوا ہو۔۔۔ اور عالم اسباب میں غالباً اسی صدمہ کا اثر تھا کہ دو ہی چار دن بعد میں بیمار پڑ گیا اور دو دن تو ایسے گزرے کہ تیمار داروں کو زیست کی امید بھی کم تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر زندگی عطا فرمادی۔“

آپ نے تو پسند نہیں کیا تھا کہ یہ مسئلہ شوریٰ کے سامنے رکھا جائے لیکن مولانا نے اس کی ضرورت سمجھی اور شوریٰ کا یہ جلسہ رمضان بعد دہلی میں ہوا۔ سرگزشت میں آپ نے لکھا ہے کہ ”مولانا کے ضروری قرار دینے کی وجہ سے سخت کمزوری ہی کی حالت میں شرکت کرنا پڑی، بصورت دیگر وہ جلسہ سنبھل میں رکھنے کو تیار تھے۔“ سرگزشت میں اس جلسہ کی کاروائی کا خاصی تفصیل سے ذکر ہے۔ مگر ہمارے لئے قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ کو چونکہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے جماعت سے تعلق کے سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کا موقع ابھی نہیں مل سکا تھا اس لئے جلسہ کی کاروائی میں شرکت، یہ کہنے بھر کے علاوہ کہ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں، بس ایک مشاہد کے طور پر رہی۔ بعد میں صحت کچھ بحال ہونے پر ذاتی غور و فکر اور بعض اہل رائے سے مشاورت کے نتیجے میں جماعت سے ضابطے کا تعلق ختم کرنے کے فیصلہ کی اطلاع آپ نے ”دلی رنج و قلق کے ساتھ“ مودودی صاحب کو دیدی۔

اِس ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر!

اس اطلاعی خط کی جو رسید مولانا کی طرف سے آئی وہ آپ کے بیان کے مطابق اب تک کی خط و کتابت اور گفتگو کے برعکس ایسے جد رنگ کی تھی کہ بجائے خود بڑے قلق کا باعث بنی، اور اس کی وجہ بقول آپ کے غالباً یہ تھی کہ ”مولانا کو یہ وہم ہو گیا کہ اب جب کہ میں نے جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے تو جیسا کہ ایسے موقعوں پر دنیا میں عام طور پر ہوتا ہے شاید میرا رویہ بھی بدل جائے گا اور جن باتوں کے اظہار سے میں اب تک بچتا رہا ہوں اب میں ان کے برملا اظہار و اعلان پر آمادہ ہو جاؤں گا۔“ اور یہ بات رنجیدہ ہونی ہی چاہئے تھی، کیونکہ ابھی اوپر گزرا کہ جماعت سے قطع تعلق کا تصور اس لئے شاق تھا کہ خود مولانا سے ذاتی تعلق گہری محبت کے درجہ کا ہو گیا تھا۔

عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْۙ

بات تو حیرت اور تکلیف ہی کی ہے۔ لیکن جیسا کہ قرآن نے مذکورہ بالا آیت میں کہا ہے کہ ”ہوسکتا ہے ایک چیز تمہیں ناگوار ہو مگر واقعہ میں وہ تمہارے حق میں بھلائی کی ہوا“ یہ ناگوار اور رنجیدہ شی اس فائدہ کا باعث ہوئی کہ مولانا کے قلم نے جو سحر ۳۲ء سے کر رکھا تھا ۳۲ء میں انہی کے قلم نے خود ہی اس کے توڑ کا سامان بھی کر دیا۔ اور اس دلی لگاؤ سے یکسوئی ہو گئی جو آئندہ اختیار کردہ کاموں میں مغل ہو سکتی تھی۔ عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو پر اس میں تمہارے لئے بھلائی ہو) (البقرہ ۱۱۶)

تاہم جماعت سے ہمدردی برقرار!

لیکن یہ ”توڑ“ مولانا کی ذات سے لگاؤ اور ”طبعی محبت“ کی حد تک ہوا! جماعت کے ساتھ قدر دانی کے رشتے میں بھی بال آجائے، یہ اثر مولانا کے رنگ کی یہ تبدیلی بھی نہ دکھاسکی۔ اس میں اور بہت دن لگے۔ جماعت سے اپنی علیحدگی کا جو اظہار الفرقان کے ذریعہ آپ نے ضروری جانا وہ ان الفاظ میں تھا:

”احباب کرام کو معلوم ہے کہ اب سے قریباً پونے دو سال پہلے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے زیر قیادت جو ایک جماعت بنی تھی یہ عاجز ”مدیر الفرقان“ بھی اس میں شریک تھا اور اس جماعت و دعوت کے تعارف اور مقاصد کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں الفرقان میں بھی کافی لکھا تھا۔ پھر یہ عاجز جماعت کے موجودہ مرکز و مستقر (بستی دارالاسلام) ہی میں چلا گیا تھا اور خیالات و عزائم اس سلسلہ میں اس سے کچھ آگے بھی تھے، بعض خاص احباب کو جن کا کچھ علم بھی

ہے۔ لیکن کسی دوسرے سے شکوہ نہیں اپنی ہی حراماں نصیبی کا گلہ مند ہوں کہ اس مرحلہ ہی میں بعض ایسے خلاف توقع امور سامنے آئے کہ جس اطمینان اور جن امیدوں اور جن اندازوں کی بنا پر میں نے اس نظام سے وابستگی اختیار کی تھی اور اپنے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا ان میں میرے لئے فرق آگیا۔ اور مجھے اپنے معاملہ پر نظر ثانی کرنا ناگزیر معلوم ہوا۔ پھر جتنا غور و فکر میرے لئے ممکن تھا میں نے اپنی دانست میں اس سے پورا کام لینے کے بعد اس نظام جماعت سے اپنے کو علیحدہ کر لینا ضروری سمجھا اور بالآخر دلی رنج و قلق کے ساتھ اپنے کو الگ ہی کر لیا۔

دو مثالیں

لیکن جیسا کہ آگے تحریر فرمایا ہے، یہ صرف ضابطہ کی علیحدگی تھی ورنہ جماعت کے اصول و مقاصد سے اتفاق اور وابستگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور اس راہ میں جماعت سے بقدر امکان ہر تعاون کا پورا ارادہ رکھتے تھے، چنانچہ اس کی مثال کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے کہ

۱۔ ”اسی دور کی بات ہے کہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی میرے پاس بریلی تشریف لائے اور مجھے بتایا کہ میں نے مدرسۃ الاسلام سے اپنا تعلق ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور مستقبل کے بارے میں میں تم سے مشورہ کرنے ہی آیا ہوں۔ میرے سامنے اس وقت دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ قرآن مجید سے متعلق حضرت استاذ مولانا فراہی مرحوم کے افادات کو اردو میں مرتب کرنے کا ایک سلسلہ شروع کر دوں۔ اور دوسری صورت ان کے سامنے یہ تھی کہ وہ جماعت کے مرکز دار الاسلام جا کر قیام کریں اور اپنے کو ہمہ تن جماعتی کاموں میں لگا دیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ اگر آپ اپنے بارہ میں یہ اندازہ رکھتے ہوں کہ مودودی صاحب پر آپ اثر انداز ہو کر کام کو آگے بڑھا سکیں گے اور اس میں کوئی جان ڈال سکیں گے تو پھر میری رائے یہی ہے کہ آپ مرکز چلے جائیں۔ اس کے مقابلے میں کسی کام کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا نے اس وقت یہی طے کیا کہ میں دار الاسلام جاؤں گا۔ اور یہ بات (کہ مولانا اصلاحی میرے ہی مشورہ پر دار الاسلام جا کر مقیم ہوئے) جماعت کے حلقہ میں غالباً بہت سے حضرات کو معلوم ہے۔“ (الفرقان شعبان رمضان ۱۳۷۷ھ)

۲۔ اس روئے کی ایک دوسری مثال بھی آپ نے اس ذیل میں اس وقت کی درج فرمائی ہے، جبکہ جماعت سے متعلق رائے میں فرق آچکا تھا اور آپ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ جماعت کی دعوت اور اس کے

کام سے جہاں لوگوں کو نفع ہو رہا ہے وہیں بعض ذہنوں پر کچھ مضر اثرات بھی پڑے ہیں۔ لیکن نفع کے پلہ کو چونکہ آپ بھاری سمجھتے تھے اس لئے ہمدردی کا رویہ بہر حال برقرار تھا۔ چنانچہ اسی دور میں (۱۹۴۹ء میں) جب آپ کو حجاز مقدس جانا نصیب ہوا اور پاکستانی جماعت کے اہم رکن مولانا مسعود عالم ندوی کے بارے میں بھی علم ہوا کہ وہ بھی ایک لمبے سفر سے واپسی میں وہاں پہنچ رہے ہیں تو پاکستان میں جماعت کے کام سے واقفیت کی خاطر اور کچھ ہمدردانہ مشوروں کی خاطر طے کیا کہ اُن سے ضرور ملنا ہے۔ اور پھر جو کچھ جماعت اور اس کے مقاصد کی ہمدردی میں کہا جاسکتا تھا وہ سب ان سے جس اپنائیت اور دلسوز انداز میں کہا، وہ اس طرح مولانا ندوی کے دل کے تار چھیڑ گیا کہ کوئی تحفظ روانہ رکھ سکے۔ جماعت نے براہ راست سیاست کے میدان کا جو رخ کر لیا تھا اس کے بارے میں آپ نے اختلاف رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ:

”اس دنیا میں کسی انقلاب کے دو ہی ذریعے ہو سکتے ہیں۔ ایک ظاہری اسباب و وسائل اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت۔ اسباب و وسائل کے لحاظ سے ہم آپ خالی ہاتھ ہیں۔ اس لئے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت ہی سے ہو سکتا ہے اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ ”نصرت خداوندی ایسی ارزاں نہیں ہے کہ یوں ہی آجائے۔ نصرت جس کا نام ہے وہ ایک طرح کا معجزہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بہت گراں قدر ہے۔ اس کی مستحق وہی امت یا جماعت ہو سکتی ہے جس کا اللہ سے خاص قسم کا تعلق ہو۔ چونکہ آپ حضرات اور جماعت کے کام سے دل کو ایک خاص تعلق ہے اس لئے میری یہ نہایت مخلصانہ گزارش اور خواہش ہے کہ آپ حضرات سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور اگر میری گزارش صحیح معلوم ہو تو اس پہلو کی طرف اتنی توجہ دیں جس کا یہ مستحق ہے۔ میرا علم و اندازہ یہ ہے کہ اس چیز کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور بس ذہنی اور فکری اصلاح اور زندگی کے کچھ ظاہری پہلوؤں کی اصلاح ہی کو سامنے رکھ لیا گیا ہے۔“ (ایضاً)

جماعت سے علیحدگی کی حالت میں ایسی صاف اور نازک بات کسی بھی درجہ کے خلوص پر اعتماد کے ساتھ کہی گئی ہو، پھر بھی اندیشہ ناگزیر تھا کہ کہیں یہ بات مولانا کو ناگوار نہ ہوئی ہو۔ لیکن ہوا اس کے برخلاف۔ فرماتے ہیں کہ ”موصوف میری اس گفتگو پر آبدیدہ سے ہو گئے اور بڑے گہرے تاثر کے ساتھ کہا کہ ”واقعہ یہ ہے کہ اس کمی کو ہم خود اتنا محسوس کرتے ہیں کہ میں اور غازی صاحب تنہائیوں میں اس موضوع پر باتیں کر کے باز ہار دیتے ہیں۔“ اور شدت تاثر میں پھر یہاں تک کہہ گئے کہ ”ہماری سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ جماعت میں سب سے زیادہ مؤثر اور مقبول اور محبوب شخصیت مولانا مودودی کی ہے اور ان ہی کی ذات جماعت میں معیار اور نمونہ بن گئی ہے اور ان کو اس طرف بالکل توجہ نہیں ہے۔“

اپنوں کے مقابلہ میں جماعت کا دفاع

اور ایک تیسری مثال جس کا ذکر مذکورہ بالا سلسلہ میں نہیں ہے۔ البتہ راقم کے ذہن میں ہے اور مولانا مودودی کے ساتھ رفاقت کی سرگشت“ میں اس کا ذکر آتا ہے ان دونوں مثالوں سے بھی کہیں آگے کی ہے۔ اور وہ یہ کہ ۱۹۵۱ء میں مؤقر علماء دیوبند کی طرف سے جماعت اسلامی کے خلاف کچھ سخت الزامی تحریریں شائع ہوئیں۔ آپ کے نزدیک یہ الزامات و اعتراضات درست نہیں تھے تو الفرقان ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ اگست ۱۹۵۱ء میں ایک مفصل مضمون اہل علم کو جماعت کے ساتھ انصاف کے کام لینے کی طرف متوجہ کرنے کے لئے لکھا۔

جماعت کے بارے میں ذہن کی تبدیلی

جماعت کے بارے میں ہمدردی کا یہ رویہ تقریباً پندرہ سال (۱۳۲ء تا ۵۷ء) چلتا رہا، حالانکہ رائے میں تھوڑا تھوڑا فرق بھی آتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی پاکستان میں جو ایک بڑا خلفشار ہوا اور اس کے کچھ ہی بعد آپ کا ایک سفر ادھر کا ہوا، تب اس خلفشار کے جو اسباب مولانا امین احسن صاحب جیسے حضرات سے، جو مولانا مودودی سے اختلاف رائے والوں میں تھے، آپ کے علم میں آئے، اس وقت سے آپ کا ذہن کلیہً بدل گیا۔ اور مارچ اپریل ۱۹۵۸ء کے الفرقان میں اس کے اظہار کے لئے ایک مفصل مضمون ”مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ میرا تعلق اور میری رائے کے مختلف دور“ کے عنوان سے تحریر فرما کر اپنے احساس کے مطابق اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر بعد میں از سر نو لکھا گیا یہ مضمون اب کتابی شکل میں ”مولانا مودودی کے ساتھ اور میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف“ کے نام سے دستیاب ہے۔

”مجبوری“ کا فیصلہ یا فضل حق کی دست گیری؟

الغرض یہ آپ کی زندگی کا ایک باب تھا جو عملاً تو ۱۹۶۲ء (۱۳۲ء) میں بند ہو گیا تھا، مگر وہ مجبوراً تھا۔ پھر ”مجبوراً“ چھوڑی ہوئی اپنی اس محبوب جماعت کے جو احوال ۷۸ھ/۵۷ء میں سامنے کھلے تو پندرہ سال پہلے کے مجبورانہ فیصلہ پر دل سراپا شکر تھا کہ بڑا ہی فضل یہ اللہ کا تھا جس نے ایک ”مجبوری“ کی شکل میں ظہور کیا تھا۔ اور پھر ایک عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ کچھ مقبولانِ بارگاہ کی دعائیں تھیں جو اس فضل الہی کے ظہور کا

وسیلہ بنیں۔ ورنہ وہ مسئلہ جو ”لائخل“ بن گیا واقعہ میں کوئی ایسا مسئلہ تھا ہی نہیں۔ اولاً تو مودودی صاحب سب سے پہلی شورئی کے موقع پر مولانا امین احسن صاحب کے جواب میں اپنا نقطہ نظر یہ بتا چکے تھے کہ ”میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ باہر کی تبدیلی اندر کی تبدیلی کے ساتھ اور اس کے تقاضہ سے ہونی چاہئے۔“ اس نقطہ نظر کو قبول کر لئے جانے بعد ان کے کسی ”تسائل“ پر کسی سخت گرفت کی گنجائش کہاں رہتی تھی؟ ثانیاً، یہ مسئلہ تنہا ان سے متعلق نہیں تھا، بلکہ زیادہ متعلق اہل خانہ سے تھا۔ اس لئے اور بھی ڈھیل کا حقدار۔ اور تیسری بات یہ کہ معاملہ کو اپنے اور مودودی صاحب کے مابین کے ذاتی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھا گیا، جبکہ واقعہ میں وہ اصلاً جماعتی مسئلہ تھا، اور اس لئے شورئی میں رکھے جانے کا تھا۔ پھر وہاں جو بھی فیصلہ ہو جاتا اس سے مسئلہ ختم ہو جاتا تھا۔ مگر اس کا مطلب ہوتا جماعت سے رشتہ نہ ٹوٹا۔ پس اسے اوپر سے اترنے والے ایک فیصلہ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ معاملہ کے ان تین پہلوؤں میں سے کوئی پہلو بھی آپ کے جیسے منطقی دماغ کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا؟ — بڑا ایمان افروز قصہ فہل الہی کی اس دستگیری کا ہے جو حضرت صاحب سوانح نے ”تحدیثِ نعمت“ کے ایک باب میں تحریر فرمادیا ہے:

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دعا

”تحدیثِ نعمت“ (حصہ دوم) میں ایک باب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے ایک نو مسلم میواتی رفیق حضرت حاجی عبدالرحمن صاحبؒ پر ہے۔ اس تذکرے میں ان کی خصوصیات میں سے مستجاب الدعوات ہونے کے بیان میں آتا ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحب کی وفات (رجب ۱۳۶۳ھ/ جولائی ۱۹۴۴ء) کے اگلے ہی دن میوات کے ایک تبلیغی اجتماع میں جانا ہوا۔ نظام الدین کے دوسرے اکابر کے ساتھ میانجی عبدالرحمن بھی شریک سفر تھے، واپسی میں میانجی نے اصرار کر کے مجھے اپنی بیل گاڑی میں، جوان کے کسی معتقد کی تھی بٹھالیا، اور پھر راستے کی اس تنہائی میں فرمایا کہ میں نے تنہائی میں ایک بات پوچھنے کے لئے آپ کو ساتھ بٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

”کوئی دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دوپہر کا وقت تھا، میں کھانے

وغیرہ سے فارغ ہو کے اپنی عادت کے مطابق حجرے کے کاؤ بند کر کے سونے کے ارادے سے

لیٹ گیا تھا کہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) نے دروازہ پر آ کر دستک دی اور آہستہ سے

فرمایا کہ ”حاجی عبدالرحمن اگر تم جاگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو، مجھے تم سے ایک ضروری بات

کرتی ہے۔“ میں اگرچہ جگ رہا تھا ابھی سویا نہیں تھا، لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا اور کچھ بولا بھی نہیں، تاکہ وہ واپس جا کر اس وقت آرام کر لیں، بات تو پھر بھی ہو جائے گی۔ میں نے سوچا اگر میں دروازہ کھول دوں گا تو یہ دیر تک باتیں کریں گے اور پھر ان کے آرام کا وقت نہیں رہے گا، تو میں نے ان کے آرام کے خیال سے نہ دروازہ کھولا نہ کوئی جواب دیا۔

حضرت جی نے تھوڑا انتظار فرما کے پھر وہی کہا کہ ”حاجی عبدالرحمن اگر تم جگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے“ میں نے اس کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا اور کوئی جواب نہیں دیا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنے حجرہ میں آرام کر لیں۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی فرمایا۔

میں نے مجبور ہو کر دروازہ کھول دیا اور ان سے کہا کہ میں جگ تو رہا تھا لیکن میں اس لئے نہیں بولتا تھا کہ آپ اس وقت باتیں شروع کریں گے تو آرام نہیں کر سکیں گے، بات تو آرام کرنے کے اور ظہر کے بعد بھی ہو سکتی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تقاضہ تھا کہ تمہیں اٹھا کے ابھی بات کروں۔ اس کے بعد حضرت جی نے تمہارا (راقم السطور محمد منظور نعمانی) کا نام لے کر فرمایا کہ ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا ہاں ان کو تو جانتا ہوں۔ فرمایا وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں، اسی وقت ان کے لئے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو وہاں سے نکال لے۔ پھر حضرت مجھے ساتھ لیکر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، پھر مجھ سے فرمایا کہ ان کے لئے اللہ سے دعا کرو اور اللہ سے مانگو، خود بھی دعا فرمائی۔“ یہ پورا واقعہ بیان کر کے حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تمہارا قصہ کیا تھا اور تم کہاں گئے تھے، میں نے حضرت جی سے پوچھا بھی نہیں۔ اگر تم بتا سکو اور بتانا مناسب سمجھو تو بتاؤ کہ تم کہاں گئے تھے جس کی حضرت جی کو اتنی فکر تھی؟

حاجی عبدالرحمن صاحب کی یہ بات نقل کر کے فرماتے ہیں:

”میں نے ان کی بتلائی ہوئی مدت اور موسم کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں ”جماعت اسلامی“ کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے اس کے اُس وقت کے مرکز اور مستقر (دارالاسلام جمال پور ضلع گورداسپور) میں جا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ چند رفقاء جماعت کے ساتھ مقیم ہو گیا تھا۔“ (تحدیثِ نعمت ص ۲۷۷)

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
 پد بیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں
 جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو، موج نفس ان کی
 الہی کیا چھپا ہوتا ہے، اہل دل کے سینوں میں

اور حضرت مولانا الیاس صاحب کے اسی صف کے بزرگوں میں ہونے کی اس سے بہت بڑی
 شہادت تو مرحوم صاحبزادہ گرامی مرتبت حضرت مولانا یوسف صاحب کے انقلاب حال کی ہے۔ حضرت
 مولانا الیاس صاحب کے قریب رہنے والے لوگوں پر یہ بات عیاں تھی کہ صاحبزادہ محترم کو حضرت کے دعویٰ
 کام سے کچھ مناسبت نہ تھی۔ وہ لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا الیاس صاحب کی
 علالت جب آخری مراحل طے کرنے لگی اور دعوت سے جڑے ہوئے خواص کو فکر ہوئی کہ آپ کے بعد کون
 اس کام کو سنبھالے گا؟ تو لوگ کسی کو بھی حضرت مولانا کی نیابت کے لائق نہیں پارہے تھے۔ وہ شخصیت ہی
 ایسی بلند پایہ تھی، الغرض، دعوت سے جڑے ہوئے خواص کے لئے یہ مسئلہ (جیسا کہ حضرت مولانا علی میاں
 صاحب تحریر فرماتے ہیں):

”پریشان گمن بنا ہوا تھا کہ مولانا کی وفات کے بعد (جو کچھ زیادہ دور نہیں معلوم ہوتی)
 اُن کی نیابت کون کرے گا اور خیر و برکت کا یہ سلسلہ کس طرح جاری رہے گا۔۔۔ ان لوگوں نے
 اپنی اس تشویش کا اظہار حضرت شیخ الحدیث (مولانا زکریا صاحب) سے کیا (جو وہیں تشریف
 رکھتے تھے)۔ شیخ نے سب کے جواب میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خاص بندوں کے ساتھ
 جو اس کے لئے مرتبے ہیں یہ ہے کہ وہ ان کی چیز کو ضائع نہیں فرماتا۔ یہ بات ایسی نہیں کہ ہم آپ
 کوئی انتظام کریں اور وہ ہو جائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے لوگوں میں سے کسی ایک
 میں غیر معمولی تبدیلی ہوتی ہے اور وہ اس کے کام کو سنبھال لیتا ہے۔ (صوفیہ کے یہاں اسی کو
 انتقال نسبت کہتے ہیں) اسی کا انتظار کیجئے اور اللہ سے دعا بھی کیجئے۔“

آگے حضرت علی میاں فرماتے ہیں کہ ”مولانا نے انتقال سے دو دن پہلے مولانا یوسف صاحب کو (چند
 دوسرے حضرات کے ساتھ) اجازت و خلافت عطا فرمائی تھی۔ وفات پر انھیں کی جانشینی عمل میں آئی۔ بہت
 سے حضرات جن کو دستار بندی اور جانشینی کی اس قدیمی روایت سے مناسبت نہ تھی۔۔۔ انھیں یہ بات کھٹکی۔
 لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اُن کے اندر (مولانا یوسف صاحب کے اندر) ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا

ہوئی اور ان میں ان صلاحیتوں اور کمال کا ظہور ہونے لگا جو اس عظیم اور نازک سلسلے کو اس کے مزاج اور اس کے داعی اول اور بانی کے انداز اور منشاء کے مطابق چلا سکے۔۔۔“ (کاروان زندگی۔ جلد اول۔ باب ۱۲)

یہ پورا اقتباس بتا رہا ہے کہ جانشینی کے لئے مولانا یوسف صاحب کسی کی نظر میں نہیں تھے، اور وجہ وہی تھی کہ ان کی اس کام سے کچھ مناسبت دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت مولانا الیاس صاحب چلتے وقت (یا کہنے خلافت عطا فرماتے وقت) جیسے اپنی روح ان میں پھونک گئے، اور اُس نے ان کی جا پہ بیٹھتے ہی اپنا کام حیرت انگیز طور پر دکھانا شروع کر دیا۔ اور پھر تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ داعی اول سے بھی شاید کچھ آگے ہی جا رہے ہیں۔ لہٰذا کہاں سے کہاں حضرت کی دعوت کا سلسلہ ان کے ہاتھوں پہنچا، یہ کوئی راز نہ رہا۔ اور حضرت شیخ الحدیث کی بات اس طرح صحیح ثابت ہوئی جیسے کہ وہ آگے کا نوشتہ تقدیر دیکھ کر فرما رہے ہوں۔ سُبْحَانَ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ تو مولانا یوسف صاحب کا قصہ تو حضرت مولانا الیاس صاحب کے اُن اہل دل میں سے ہونے کی اور کہیں بڑے درجہ کی شہادت ہے جن کے بارے حضرت اقبال فرما گئے ہیں:

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو، موجِ نفسِ ان کی
اور نصیحت کر گئے کہ

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو

(۱) بالکل صحیح وقت تو یاد نہیں، ۱۹۶۰ء کے آس پاس کی بات ہے۔ راقم سطور الفرقان کے کچھ کام سے لاہور گیا ہوا تھا، پتہ چلا کہ حسن اتفاق سے حضرت مولاناؒ بھی پاس ہی پاکستان کے تبلیغی مرکز رائے ونڈ میں تشریف فرما ہیں۔ ایک رات وہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں کا ایک مشاہدہ یہاں قابل ذکر ہے۔ فجر کے بعد معمول کی تقریر فرمانے بیٹھے تو چہرہ بڑی طبیعت خرابی کی غمازی کر رہا۔ چنانچہ بات بھی ان الفاظ سے شروع ہوئی کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے رات نیند نہیں آئی۔ مگر ضروری بات کہنی ہے۔ اور یہ بات دو ڈھائی گھنٹے چلی۔ وہاں سے اٹھ کر ناشتہ کے لئے آرام گاہ پر آئے۔ ناشتہ پر باہر سے آئے ہوئے متعدد معزز حضرات تھے۔ راقم کو بھی اپنے والد ماجد کی نسبت سے اس ناشتہ میں شرکت کی عزت ملی۔ قریب بیٹھ کر اندازہ ہوا کہ چہرہ بالکل زرد ہے اور نہایت ضعف کے آثار، پر دسترخوان پر بیٹھے ہی آپ نے وہاں بھی خطاب شروع کر دیا۔ خدام نے چائے کی پیالی پیش کی، ہاتھ میں لے لی، وہ ویسے ہی ہاتھ میں رہی کہ خطاب اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ یہ اندازہ کر کے کہ اب وہ ٹھنڈی ہو گئی ہوگی خدام نے دوسری گرم پیالی بڑھائی۔ بہت زمانے کی بات ہو گئی اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ بھی آپ نے منہ سے لگائی کہ نہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں دوسرے بھی کیا ناشتہ کر رہے ہوں گے؟ طبیعت کے بارے میں پتہ چلا کہ سخت قسم کی خونی بواسیر ہے۔ جسم کا سارا خون اس نے نچوڑ لیا ہے۔ یہ حال حضرت مولانا یوسف صاحب کے اس دعوت کے ساتھ شغف کا ہو گیا تھا۔ کہ اپنی کچھ خبری نہ رہی تھی۔ ہم تن دعوت تھے۔

اشارے شروع ہی سے چل رہے تھے

واقعہ میں تو کوئی نہیں جانتا کہ اللہ کے یہاں کیا مقام کسی کا ہے۔ مگر حاجی عبدالرحمنؒ کے بیان کردہ واقعہ سے جس طرح قابل یقین حد تک اظہار ہوتا ہے کہ رحمت حق کو حضرت صاحب سوانح کی حفاظت منظور تھی، اسی طرح شروع ہی سے جو باتیں مودودی صاحب کی طرف بڑھنے کی راہ میں پیش آتی رہیں انھیں بھی کھلے اشارے ہی دست حق کے کہا جاسکتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں توقع سے مختلف دیکھ کر دل کو دھکا لگنا اور پھر خود کو کچھ سمجھا سمجھا کر دل کو راضی رکھنے کی ضرورت پڑنا۔ ادارہ دار الاسلام کے تاسیسی اجتماع میں شرکت کے لئے بستی دار الاسلام پہنچنا اور دو دن وہاں رہ کر مودودی صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کے بعد ادارہ میں عدم شرکت کے فیصلہ پر مجبور ہونا۔ پھر سال ڈیڑھ سال بعد لاہور کے سفر میں بھی موصوف کو معیار مطلوب سے بہت کافی کم محسوس کرنا اور ضرورت سمجھنا کہ تعین کے ساتھ اور کھول کھول کر کی کے نقطوں پہ انگلی رکھی جائے۔ پس اللہ کی دی ہوئی دینی حس کا یہ ہر ہر مرحلہ پر اپنا کام دکھانا، اسے حفاظتی اشاروں کے سوا اور کیا کہا جائے؟ لیکن تقدیر کے بھی کچھ راز ہوتے ہیں۔ معاملہ صرف لطیف اشاروں تک محدود رکھ کر آگے بڑھ جانے دینا شاید ایک تربیتی عمل تھا۔ اور اس سے ایک رہنما مثال ہم بعد والوں کے لئے یہ قائم کرنا تھی کہ جب سر پہ بڑے، بلکہ اُن کا ایک پورا خاندان، موجود ہو اور اس کے ساتھ اعتماد و احترام کا تعلق بھی ہو، تو محض اپنے فہم و فکر کی رہنمائی میں کوئی جدا دینی راہ عمل اختیار کرنا ایک بُر خطر طرزِ عمل ہے۔ اپنے بڑوں کے وسیع خاندان کے ساتھ جس احترام کا تعلق آپ کا روزِ اول سے رہا تھا، اور ان بزرگوں کی طرف سے بھی شفقت و اعتماد کا جو ایک قابلِ فخر معاملہ آپ کے ساتھ تھا اس کے شواہد کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ (ان میں سے بعض اوپر آ بھی چکے ہیں اور الفرقان کے صفحات میں تو پھیلے پڑے ہیں۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں ان ایک خاصا حصہ جمع ہو چکا ہے اور آگے اس سوانح کا جز بھی وہ ان شاء اللہ بنے گا۔) اس صورتِ حال میں آپ کے ساتھ ایک تربیتی معاملہ اس موقع پر پیش آنا کچھ بعید از قیاس نہیں رہتا۔ تربیت غالباً مکمل ہو چکی تھی کہ ایک حضرِ وقت کے دل کو آپ کی طرف متوجہ فرمایا گیا اور پھر دل بول اٹھا کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

مولانا مودودی: فکری تجزیہ

مودودی صاحب کے بارے میں رہ رہ کر جو یہ تاثر تازہ ہوتا رہا کہ ایک دینی انقلاب کے زبردست

داعی ہوتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی میں وہ ایسا رویہ روا رکھتے ہیں جسے اللہ و رسول کی پسند کے مقابلے میں عملاً اپنی ذاتی پسند کی ترجیح کا رویہ کہا جاسکتا ہے، حضرت صاحب سوانح، اس کو مولانا سے شدت تاثر کے ماتحت بس ایک کمزوری پر محمول کرتے اور امید کرتے رہے کہ کچھ کہنے سننے سے اور کچھ قافلہ انقلاب کی قیادت کا منصب باقاعدہ پانے سے یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر پھر ایک حد پہ جا کر مایوس ہو جانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اب مولانا کی زندگی کے بعض ایسے گوشے سامنے آچکے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح گف ہوتی ہے کہ آں محترم کا تصویر دین گوالفاظ کے اعتبار سے بالکل یگانہ نہ رہا ہو معنی اور مفہوم کے لحاظ سے قطعاً ایک ایسا ہی یگانہ تصور تھا جیسا کہ موعود امام مہدی کے بارے میں معبود عقیدہ سے لفظی ہم آہنگی کے ساتھ اپنے یکسر جداگانہ تصور کا اظہار آپ نے اس صریح پیرایہ میں کیا تھا کہ

”مسلمانوں میں جو لوگ امام مہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی ان متجددین سے جو اس کے قائل نہیں ہیں اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے۔ چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے ”بقیۃ السلف“ ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے۔ جس کافر پر نظر مار دیں گے بہوش ہو جائے گا۔“ (وغیرہ وغیرہ)۔ ”مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔۔۔“ (منصب تجدید کی حقیقت)

”مولویانہ اور صوفیانہ وضع قطع“ ان چیزوں میں سے ہے جو دینی ذہن رکھنے والے جملہ مسلم طبقوں میں صالحین کی وضع قطع کی حیثیت سے جانی جاتی رہی ہے۔ اور کیسے نہ ہو، کہ وہ دو اسلامی قدروں، حیاء اور سادگی، کے اہتمام کا مظہر ہے؟ مگر مولانا کا ذہن صالحین وقت کے امام ”الامام المہدی“ کو اس وضع صالحین کے بجائے کسی جدید ترین وضع میں دیکھنا چاہتا ہے! اور اسی کا ”پیش خیمہ“ اسے کہا جانا چاہئے کہ جب اس ذہن نے خود ایک قافلہ ”کار تجدید“ کے لئے ترتیب دیا تو ”صالحین“ کی ایک نئی وضع ہی کا چلن اس میں جاری کیا۔ سو اسے بجز ایک بالکل جداگانہ تصویر دین کے اور کس کھاتے میں ڈالا جائے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس جداگانہ تصویر دین کا بھرپور اظہار تو آں محترم کی شروع ہی کی تصنیف ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں“ سے ہو جاتا تھا، مگر آپ کی یگانہ قدرت تحریر نے اس اظہار کے ”بھرپور“ ہونے کے باوجود اسے بڑی مدت تک گرفت میں آنے سے روک رکھا، اور بہت دیر میں جا کر یہ کام اللہ نے مخدوم

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ پر آسان کیا۔ اس پر آپ کی کتاب ”عصر حاضر میں دین کی تفہیم“ سمجھ رکھنے والوں کے لئے حجت ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک بہت سہل الفہم اور عمل سے تعلق رکھنے والی چیز مولانا کے قریب ترین لوگوں میں سے محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب کا ایک انکشاف ہے، جو چند سال قبل ان کے زیر ادارت ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے مولانا مودودی نمبر میں ان کے مضمون سے سامنے آیا۔ موصوف نے اس مضمون میں مولانا کے ساتھ ایک عمرے کے سفر کے ذکر میں اپنے ایک ایسے تجربے کا ذکر کیا ہے جس سے خود ان کے بقول انھیں بھی ”سخت دھچکا لگا“ تھا۔ لکھا ہے کہ:

”ہم لوگ تو حرم پاک میں گھنٹوں بیٹھے عبادت کرتے۔ مگر مولانا کو میں نے دیکھا کہ وہ

فرض اور سنت پڑھنے کے بعد کچھ دیر اذکارِ مسنونہ پڑھتے، پھر ریاضِ الجہنہ جاتے، صفہ میں نفل ادا

کرتے اور اس کے بعد سیدھے ہوٹل میں جا کر دعوتی اور دوسری دینی سرگرمیوں میں مصروف

ہو جاتے۔“

اس پریشان کن تجربے کا ذکر موصوف نے مولانا کے ”غیر معمولی اعتدال و توازن“ کی مثال میں کیا ہے۔ اور اس حد تک کے ”اعتدال و توازن“ کی سند (کہ جو باوجود غایت عقیدت و تعلق کے ان کی سمجھ سے بھی باہر ہو رہا تھا) انھیں، بقول خود، حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک ملفوظ میں بالآخر مل گئی، جس سے ان کے اس زوالے تجربے کی پیدا کردہ یہ ”خلش“ کہ ”حرمین الشریفین میں آکر یہ اس طریقے سے اظہار کیوں نہیں کرتے جس طرح عام لوگ کرتے ہیں؟“ دور ہوئی۔

تفنگی رہ جائے گی اگر حضرت جنید بغدادیؒ کا وہ ”سندی“ ملفوظ یہاں نہ بیان کر دیا جائے۔ سو وہ یہ روایت تھی کہ ”ایک شخص نے حضرت جنیدؒ کے یہاں کوئی کرامت نہ دیکھی تو غیر مطمئن واپس جا رہا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم نے کوئی بات یہاں خلافِ شریعت تو نہیں دیکھی۔ اس نے کہا نہیں۔ تب فرمایا کہ ”بس ہم وہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو شریعت میں مطلوب ہے، نہ کم نہ زیادہ۔“ (ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۰۳ء)

پروفیسر خورشید صاحب نے جس صفائی سے یہ واقعہ اور اس پر اپنے دل کی خلش کا ذکر کیا وہ قابلِ داد ہے اور ہمیں ماننا چاہئے کہ ان کے دل نے اس خلش سے یقیناً حضرت جنیدؒ والی اس روایت میں راحت پائی لی ہوگی، لیکن حقیقت میں اس باعثِ خلش معاملہ کی سامنے کی اور سیدھی توجیہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ایک

چیز جو ”روحانیت“ کہلاتی ہے مولانا کے تصور دین میں اس کا خانہ ”اقامتِ دین“ کی جدوجہد سے دب کر رہ گیا تھا۔ وہ واجبی ادائے فرائض سے زیادہ وقت روحانیت کو جلا دینے کی مد میں دینے کے قائل نہیں رہ سکے تھے۔ اس لئے لاہور میں ہوں یا مدینہ النبی (ﷺ) میں، خود بقول خورشید صاحب ”بنیادی عبادت و نفل ادا کر کے جہادِ زندگانی میں مصروف ہو جاتے تھے۔“ اور یہی وہ چیز ہے جس کو ذہن میں رکھ لیا جائے تو ذرا بھی اجنبی کی یہ بات نہیں رہتی کہ مولانا کو شرعی داڑھی کے لئے اور صالحین کی وضع وغیرہ اختیار کرنے کے لئے، جس کا کافی الاصل تعلق اتباعِ سننِ نبویہ (ﷺ) سے ہے، سمجھانا پڑے! جو کہ حضرت صاحبِ سوانح کو کرنا پڑا تھا۔ سنتوں کا اہتمام بھی، بغیر اس تفریق کے کہ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ، سننِ حدیث میں سے ہے یا سننِ عادیہ میں سے، اسی روحانیت والے خانے کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اہتمام میں بندہ کی روح اپنے رب سے قربت کا احساس کرتی ہے۔ کہ رسول (ﷺ) کے بہ ہر جہت اتباع ہی میں تو اس کے قرب کا راز ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوبَکُمْ! (یعنی کہو کہ تمہیں اگر اللہ کی محبت منظور ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت فرمائے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا)

روحانیت کے سلسلہ میں مولانا کا ذہن بالکل صاف طور پر سمجھنے کے لئے امام مہدی سے متعلق گفتگو میں ”چلے کھینچے ہوئے درویش“ کی طنز آلود تعبیر کا یاد کر لیا جانا بجائے خود کافی سے زائد ہے۔ چلے کسی کسی کے ذوق کی چیز ہو یا نہ ہو، مگر اپنے مقصد (جلائے روحانی) کے اعتبار سے یہ ریاضت فی الجملہ قابلِ احترام بلاشبہ ہے۔ لیکن یہاں موردِ طنز!

اس ضمن میں حضرت مولانا علی میاں کی ایک تحریر کا حوالہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ مولانا شروع کے اکابر جماعت میں سے تھے۔ آپ کی خود نوشت کے مطابق ”تقریباً تین سال تک لکھنؤ کی جماعت کے ذمہ دار“ رہنے کے بعد آپ نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے وجہ میں تین باتیں ”کاروانِ زندگی“ میں تحریر فرمائی گئی ہیں (جلد ۲۳۳ تا ۲۳۵)۔ اور ان کے بعد ارشاد ہوا ہے:

”ان وجوہ سے طبیعت کچھ افسردہ رہنے لگی اور یہ محسوس ہوا کہ کام صرف مولانا کی تحریروں کو پڑھنے، سنانے اور اس کی داد دینے میں منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔“

دوسری طرف اپنا خود حال یہ تھا کہ غائبانہ مولانا کی تحریروں پر پڑھ کر جتنا تاثر ہوتا تھا، ملاقات اور زیادہ دیر ساتھ رہنے میں (بغیر کسی محسوس وجہ یا شرعی بنیاد کے) اس انجذاب اور وابستگی میں کمی محسوس ہوتی تھی، شاید یہ خاندانی اثر تھا کہ طبیعت کسی نمایاں باطنی اور روحانی کشش

کے بغیر کسی شخصیت کی زیادہ گرویدہ نہیں ہوتی۔“

الغرض، مولانا مودودی دین کے لئے اپنی نیت میں بشری اندازے کی حد تک اگرچہ یقیناً مخلص تھے۔ ان کی قلمی جدوجہد نے بلاشبہ نو تعلیم یافتہ طبقے کے سیکڑوں ہزاروں افراد کو اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات اور بے یقینی سے نکال لیا۔ اور ان میں سے جو مولانا کے دئے ہوئے خیالات و جذبات پر دنیا سے چلا گیا اس نے بیشک اسلام پر ہی موت پائی۔ مگر اس کے ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کے دئے ہوئے تصور دین نے اللہ کی معبودیت پر اس کی حاکمیت کو غالب کیا۔ جب کہ واقع میں اس کی حاکمیت اس کی معبودیت کی فرع تھی۔ انسان میں عبدیت کی صفات اللہ کے ساتھ معبودیت والے رشتے کی قوت سے جلا پاتی ہیں۔ اور اس رشتہ کی مغلوب ہونے کی صورت میں اس کی حاکمیت کو غالب کرنے کی جدوجہد بھی ان حدود و قیود کی پابند اور ان صفات کی آمینہ دار نہیں رہ سکتی جو اس جدوجہد کی صحیح راہ کا نشان اور لازمہ ہیں۔ بلکہ (خدا نہ کردہ) ایک درجہ میں ”جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی“ جیسی کچھ صورتِ حال (معاذ اللہ) پیدا ہو کر رہتی ہے۔ چنانچہ حاکمیت اللہ کی جدوجہد کے لئے جو ایک خاص طریق کار

(۱) مشکل ہے کہ قارئین کو محسوس نہ ہو کہ پہلی تین باتیں کیا تھیں۔ بات حضرت مولانا جیسی شخصیت کی ہے اور پھر معاملہ ایک موجودہ جماعت کا۔ سو وہ تینوں باتیں بھی ذیل میں پڑھی جاسکتی ہیں:

”ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں بڑا غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے، اور وہ ان کے علاوہ کسی اور مفکر، مصنف اور داعی کے متعلق کوئی بلند خیال قائم کرنے اس پر اعتماد کرنے اور اس کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے روز بروز محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا (اور بعض اوقات زبانوں پر بھی یہ بات آ جاتی تھی) کہ ان سے بہتر کسی نے اسلام کو سمجھا اور پیش نہیں کیا، اور کلی دین کے داعی بس وہی ہیں۔ یہ افراد زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور ملازمین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کا دین کا جو کچھ مطالعہ تھا وہ مولانا ہی کی تحریروں کے ذریعہ تھا وہ نہ صرف علماء سلف بلکہ معاصر علماء کبار کی دینی خدمتوں اور دینی تحقیقات سے بھی ناواقف تھے اور اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید اور اس کے علمبرداروں کے علمی و عملی کارناموں سے بالکل نا بلند تھے، اسلئے کسی حد تک معذور بھی تھے۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا اور علماء اور دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بے باک ہو رہی تھیں۔

تیسری بات یہ کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں کوئی ترقی، اصلاحِ نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔“

شروع میں، از روئے دین واضح حدود و قیود کے ساتھ، لازم گردانا گیا تھا، دیکھتے دیکھتے نیا منہ بن گیا۔ اور یہ ”قافلہ اقامتِ دین“ اُن حدود کو بھی ایک ایک کر کے پھلانگنا جائز جانتا چلا گیا، جن کے اصلاً ناجائز ہونے کا اسے اقرار ہی نہیں، ابتدائے ”عشق“ میں اصرار رہا تھا۔ پاکستان کی صدارت کے لئے جنرل محمد ایوب خان کے مقابلے میں مس فاطمہ جناح کی پر جوش حمایت، جو خود مولانا مرحوم کی سرکردگی میں ہوئی وہ اس کی ایک ناگفتہ بہ مثال ہے۔ اور بعد میں اس طرز عمل میں جتنی بھی ترقی نہ ہوتی چلی جاتی کم تھی، کہ۔

نحسِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اللہ کی معبودیت جب اصل دین بنتی ہے تو کفار سے کئے ہوئے عہد و قرار بھی احترام کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ اور یہ نہ ہو تو اللہ سے کئے عہد بھی وقتی مصلحتوں کی منطق اور عملی حکمت کے فلسفوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یاد کیجئے، غزوہ بدر کی جیسی نازک گھڑی ہے۔ دشمن پوری تیاری سے آیا ہے اور ادھر نہ افراد مقابلے بھر کے ہیں نہ سر و سامان۔ ایسے میں دو مسلمان کہیں سے وارد ہوتے ہیں جو درمیان میں کفار کے ہاتھ پڑ گئے تھے اور اس شرط پر چھوٹے تھے کہ اس جنگ میں وہ مسلم صف کا حصہ نہیں بنیں گے۔ ان کے خیال میں یہ ایک وقتی مصلحت والا وعدہ تھا، مگر رسول اللہ (ﷺ) کو اس کا علم ہوتا ہے تو آپ اس شدید ضرورت کے وقت بھی جنگ میں ان دونوں کی شرکت کے روادار نہیں ہوتے، کہ اللہ کا دین ہر عہد و قرار کا پاس سکھاتا ہے۔ کیسا بڑا سانحہ ہے کہ خلوص سے، بیشک خلوص سے، اٹھا ہوا کوئی قدم ایسا بے راہ ہو جائے کہ خود اپنے لازم جانے حدود و قیود سے بھی کتر ا کے بڑھنے کی راہیں نکالنے لگے! اَللّٰهُ الْمَشْتٰکِ!

یہاں ایک بات اور بھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حاکمیت کو اس کی معبودیت پر غالب کر دینے کی بات تو تھی ہی، مزید برآں جماعت کا نصب العین، زمینی حقائق سے بالکل بے نیازانہ، اسلامی حکومت و وجود میں لانا ٹھیرایا گیا۔ ملک آزاد ہونے کی طرف جارہا تھا، اور آزادی کے بعد کا نظام حکومت جمہوری ہونا تھا، جس کی رو سے آبادی کی ہندوا کثريت صدیوں کے بعد ملک کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں آتی دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں

(۱) جماعت نے پہلا، الیکشن ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں ہڑا تھا۔ اس موقع پر ”سیاست اور خواتین“ کے بارے میں جس موقف کا اظہار جماعت نے شدت و دہ کے ساتھ کیا تھا، ترجمان القرآن میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اسے یاد کیا جائے تو پھر مس فاطمہ جناح کے لئے جدوجہد کا حال پڑھ کر ”انچھی پنم بہ بیداریت یارب یا خواب“ کے سوا اور کیا کہا جاسکے گا؟

یہاں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کی سوچ کو ایک رومانوی سوچ کے سوا کیا اور کوئی نام دیا جاسکتا ہے؟ انجام اسکے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اگر جماعت کو باقی رکھنا ہے تو نصب العین کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے زمینی حقائق سے سمجھوتے کی راہ اختیار کی جائے۔ اور ہندوستان تو ہندوستان، تقسیم سے پاکستان وجود میں آجانے پر یہ کھلا کہ آج ایک خالص مسلم علاقہ میں بھی آپ کو اس نصب العین کے تقاضے ”فراموش“ ہی کر کے زندگی کرنا ہوگی۔۔۔ چنانچہ پاکستان میں جماعت اپنے انداز سے اور ہندوستان کی جماعت اپنے حالات کے لحاظ سے نصب العین تقاضوں کے خلاف سمجھوتوں کی راہ چلنے پر مجبور ہوئی۔ اور ”خلافت علیٰ منہاج النبوت“ کا نصب العین بس پرانے لٹریچر کی زینت رہ گیا۔ اس سلسلہ میں حضرت صاحب سوانح کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ مسو میں خلافت تحریک کی کامیابی کے مناظر نے جو ایک بیتاب آرزو آپ کی زندگی کا حصہ بنادی تھی اس کے زیر اثر وہ مولانا مودودی کی دعوت کی طرف بے ساختہ کھنچ گئے، مگر مولانا مودودی کے بارے میں تو کسی ایسی جذباتیت کی اطلاع نہیں ہے۔ وہ تو سراسر حقائق ہی کی زبان میں بات کرتے تھے! ہندوستان میں اسلامی حکومت کا خواب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی جماعت نے بھی دیکھا تھا مگر زمانہ کے حقائق سے ٹکراؤ ہوا تو قال اللہ قال الرسولؐ اڑھنا بچھونا ہونے کے باوجود صفائی سے تنازل اختیار کر کے، نہ کہ تاویلیں کر کے، ملک میں اس مشترک حکومت کا تصور قبول کر لیا جس سے چارہ نہ تھا۔ اور جسے اب عملاً قبول کرنے پر تو سب مجبور ہو رہے ہیں۔

(۱) یہاں مولانا کا وہ ارشاد یاد آتا ہے جو تحریک پاکستان کے موقع پر اسکے ذریعہ اسلامی حکومت کی توقع کرنے والوں کی بابت آپ نے فرمایا تھا کہ یہ نیبو کا پودا لگا کر اس سے آم کھانے کی توقع کا مصداق ہے۔

پانچواں باب

(خانقاہ رائے پور سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ تک)

قصہ کوتاہ، جماعتِ اسلامی کی تشکیل سے جو ایک نئے میدانِ کار کی بساط، پیہم تک و دو کے بعد اور بڑے اونچے خوابوں کے ساتھ بچھائی گئی تھی، سال ہی بھر کے اندر اللہ کو منظور ہوا کہ اسے خیر باد کہہ دیا جائے۔ مگر معاملہ کی یہ صورت جس طور پر بنی (کہ گویا فضلِ الہی کی دیکھیری تھی اگرچہ ایک بے حد رنجیدہ صورت کی راہ سے) تب ہونا ہی چاہئے تھا کہ متروکہ میدانِ کار سے بہتر میدان کی طرف رہنمائی میسر آئے، اور وہ میسر آئی، کہ

جہاں میں اہل ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

اور وہ تھی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے وابستگی۔

مگر اس کے راستہ کی پہلی منزل بننا مقدر تھا خانقاہِ رائے پور کو، اور ”پھر وہاں کی ”دولت“ سے سرفرازی کے نتیجہ میں وہ راہ کھلنا تھی جو دہلی کے ”آستانہ“ پر پہنچائے۔

”میری زندگی کے تجربات“ میں تحریر فرمایا ہے:

”حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے ذاتی عقیدت اور ”تبلیغی تحریک“ کے نام سے

مشہور ان کی دینی دعوت سے بھی اجمالی اور سطحی واقفیت اگرچہ بہت پہلے سے حاصل تھی، لیکن اب

سے قریباً دو برس پہلے جب کہ میں مولانا مودودی جیسے اپنے نہایت محبوب دوست سے رفیقہ

رفاقت منقطع کرنے کے بعد سخت درجہ کے طبعی قلق میں مبتلا اور مایوسی و افسردگی کے نہایت گہرے

گڑھے میں گویا گر ا ہوا تھا، اسی زمانہ میں توفیقِ الہی نے، بغیر میرے ارادہ و خیال کے کچھ ایسے

اسباب پیدا فرمائے کہ حضرت مولانا مرحوم کی جن خصوصیات اور ان کی دینی دعوت کے جن پہلوؤں میں میرے لئے خصوصی کشش ہو سکتی تھی اور میں ان سے واقف نہ تھا، ان کی ابتدائی واقفیت کے لئے ایک راہ پیدا ہو گئی۔ اور اس ابتدائی واقفیت ہی نے ”دامن دل کھینچ کے“ کہا کہ ”جا اینجاست۔“

یہ ”غیر ارادی اسباب“ جن سے حضرت مولانا الیاس صاحب اور ان کی دعوت کو کچھ صحیح طور پر سمجھنے اور پھر اس سے وابستہ ہو جانے کی راہ کھلی ان کی تفصیل ہمیں خود حضرت صاحب سوانح ہی کی تحریر سے دستیاب ہے۔ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ (مؤلفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) کا مقدمہ آپ کے قلم سے ہے۔ اس میں حضرتؒ سے اپنے تعلق کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے:

”اس عاجز کی زندگی میں ایک مختصر ساعرہ ایسا بھی گزرا ہے جب دل میں تصوف اور اہل تصوف کے بارہ میں کچھ اسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے جو ہمارے اس زمانہ کے بہت سے پڑھ لکھوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ فضل رہا کہ اس سلسلہ کے جن اکابر اور صاحب ارشاد مشائخ سے میں واقف تھا (اپنے خیال میں ان کو ایک علمی اور اجتہادی غلطی میں مبتلا سمجھنے کے باوجود) دل سے ان کا ادب کرتا تھا اور ان کو اپنے جیسوں سے ہزاروں درجہ بہتر اللہ کا مخلص اور مقبول بندہ جانتا تھا۔ اپنے اسی حال اور اسی دور میں ۱۹۳۲ء میں، میں سخت بیمار پڑا (یہ سخت بیماری اسی ”سخت درجہ کے طبعی قلق“ اور مایوسی و افسردگی“ کا نتیجہ تھی جس کا ذکر ابھی اوپر مودودی صاحب کی رفاقت کے حوالے سے گزرا۔ ع) پھر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور صحت ہو گئی، لیکن اس بیماری کا پیدا کیا ہوا غیر معمولی ضعف بہت دنوں تک باقی رہا، میرے معالجین نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دنوں کے لئے کسی ایسی جگہ قیام کروں جہاں آب و ہوا بھی صحت بخش ہو اور مجھے زیادہ سے زیادہ آرام و سکون مل سکتا ہو۔۔۔۔۔ میں دو تین سال پہلے (۱۹۳۹ء میں) رائے پور کی خانقاہ ایک دفعہ دیکھ چکا تھا۔ مجھے یہ جگہ آب و ہوا اور سکون کے لحاظ سے بہت پسند آئی تھی۔ اور اگرچہ خانقاہی مشاغل سے اپنی طبیعت کو اس وقت بھی کوئی خاص مناسبت نہیں تھی، لیکن صاحب خانقاہ (قدس سرہ) کی عنایت و شفقت اور مزاجی اور فکری مناسبت نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔۔۔۔۔ معالجین کے مشورہ کے مطابق جب میں نے کہیں جانے کے بارے میں سوچا تو رائے پور کی خانقاہ ہی کا فیصلہ کیا اور چلا گیا، وہاں پہونچ کر مخصوص خانقاہی مشاغل دیکھ دیکھ کے دل میں اعتراضات اور سوالات ابھرنے شروع ہوئے، پہلے دن اُن کو دبا کر خاموش رہنے کی کوشش کی لیکن اُس میں کامیاب نہ ہو سکا اور موقع پا کر حضرت ممدوح کی خدمت میں عرض کر دیا،

یقین تھا کہ حضرت میرے سوالات اور اشکالات کا جواب دے کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش ضرور فرمائیں گے (مجھے یہ بات اس وقت بھی معلوم تھی کہ حضرت صرف صاحب خانقاہ درویش و عارف ہی نہیں ہیں بلکہ عالم فاضل بھی ہیں اور ایک مدت تک درس تدریس کا مشغلہ بھی رہا ہے) لیکن حضرت نے ایک لفظ بھی اس سلسلہ میں نہیں فرمایا بلکہ اس کے برعکس اعتراف و انکسار اور پسپائی اور خود شکنی کا ایسا رویہ اختیار فرمایا کہ اگر اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو میں اس جاہلانہ زعم میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ حضرت بھی میرے اشکالات کا جواب نہ دے سکے۔ میں نے دو نشستوں میں دو دفعہ حضرت کے سامنے اپنے اشکالات عرض کئے اور حضرت نے دونوں دفعہ یہی رویہ اختیار فرمایا اور جواب اور دفاع میں ایک لفظ بھی نہیں فرمایا، میرے لئے حضرت کا یہ رویہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ میں اس کی وجہ سوچنے پر مجبور ہو گیا، جب میں نے اس بارے میں غور کیا اور خود اپنے باطن کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میری اس گفتگو کا محرک مخلصانہ طلب نہیں ہے بلکہ میری حیثیت ایک ”مدعی“ اور ”مقرض“ کی ہے، اور حضرت کی یہ بلند مقامی ہے کہ بجائے یہ فرمانے کے کہ ”مقرضوں اور مدعیوں کو جواب دینا ہمارا طریقہ نہیں ہے“ خود شکنی اور پسپائی کا یہ طریقہ اختیار فرما رہے ہیں۔ اس کے بعد حق کے ایک طالب اور جو یا کی حیثیت سے میں نے خود بھی اشکالات پر غور کرنا شروع کیا اور حضرت سے پھر ایک صحبت میں عرض کیا، اس دفعہ حضرت نے وہ رویہ نہیں اختیار فرمایا بلکہ تصوف کے مقصد اور مشاغل اور وسائل اذکار و اشغال وغیرہ کا تجزیہ فرما کر ایسی محققانہ تقریر فرمائی جس سے اپنے اشکالات و سوالات کی غلطی کی بنیاد خود مجھ پر منکشف ہو گئی اور معلوم ہوا کہ سارے اشکالات ہی نا فہمی اور کم عقلی سے پیدا ہو رہے تھے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو حضرت کی حکمت اور فن اصلاح کا کمال سمجھے اور جس کا جی چاہے باطنی تصرف سے اس کی توجیہ کرے، بہر حال وہی دن میری زندگی کے موڑ کا دن تھا۔ جزاک اللہ چشم باز کر دی۔“ (سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، ایڈیشن ۲۰۱۲)

تصوف پر گفتگو کا یہ قصہ تحدیثِ نعمت میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اور اس کتاب کے حصہ دوم میں بھی دیکھا جاسکتا۔ اس قصہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

”حضرت کی یہ تقریر سن کر میرا وہ ذہنی خلجان دور ہو گیا اور جو کچھ حضرت نے فرمایا اس کو ذہن نے پوری طرح قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ یہ احساس اور داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے بھی اس سے خالی اور محروم نہ رہنا چاہئے۔ لیکن میرے حالات ایسے تھے کہ میں اس کی تحصیل کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے میں نے حضرت کی خدمت میں بے تکلف اور صفائی سے عرض

کیا کہ حضرت اگر یہ ذکر و شغل اس لئے کرایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خشیت و محبت وغیرہ کیفیات حاصل ہوں تو میں بھی اس کا محتاج اور طالب ہوں لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں زیادہ اور مستقل وقت نہیں دے سکتا کیوں کہ دین کے جن دوسرے کاموں سے تعلق ہے میں ان کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

حضرت نے فرمایا:

”مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے جن کو اللہ نے دین کے کاموں کی اچھی استعداد دی ہے وہ اب ادھر توجہ نہیں کرتے۔ اگر وہ تھوڑی سی توجہ ادھر کریں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب نے، باوا صاحب نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحب، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت سید صاحب نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں کیں اور ان کے جو نتیجے نکلے اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستے سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی پیچارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہوتے ہیں۔“

مزید فرمایا: خدا معلوم تصوف کو لوگ کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“

بیعت کی درخواست اور ”فتح باب“

فطری بات تھی کہ اس کے بعد بیعت کا خیال دل میں آئے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ

”پھر کئی دوسری محبت میں میں نے حضرت سے بیعت اور تلقین کی درخواست کی۔“ لیکن حضرت نے بعض دوسرے بزرگوں (حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب) کی طرف رجوع کا مشورہ دیا کہ ”آپ جیسے اہل علم کے لئے میں ان ہی حضرات کو بہتر سمجھتا ہوں۔“ لیکن پھر باادب اصرار کے نتیجہ میں قبول فرما کر کچھ ذکر کی تلقین فرمائی اور بیعت کو آئندہ پر محمول فرمایا کہ ”بیعت کی بات پھر کبھی دیکھی جائے گی۔“ اور اس کی نوبت بھی پھر دو سال کے بعد آگئی۔ حضرت والا نے خود اپنے بارے میں یعنی یہی صورت بیان فرمائی تھی کہ ”جب میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا

اور بیعت کی درخواست کی تو حضرت نے اس وقت بیعت نہیں فرمایا ذکر کی تلقین فرمادی اور ارشاد فرمایا ”دیر آید درست آید“ آئندہ کسی وقت پر بیعت بھی ہو جائے گی۔ اور پھر دو سال کے بعد حضرت نے بیعت فرمالیا۔“

رنج والہ کی راہ سے فتح باب کا یہ پہلا قدم تھا۔ جسے کہیں کہ گئے تھے ”آگ“ لینے مگر قسمت نے پیہری ”پائی۔ آگے خود اس بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ
 ”حضرت کی خدمت میں حاضری اور پھر بیعت کی توفیق اس بندے پر اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت تھی جن کا شکر ادا کرنے سے یہ بندہ ہمیشہ عاجز و قاصر رہے گا۔“
 ”عظیم نعمت“

یہ ”عظیم نعمت“ صرف حاضری اور بیعت نہ تھی، یہ حقیقت میں تصوف کی بھولی ہوئی اس راہ کی طرف بازگشت تھی جس سے آپ ”بعض خاص اسباب و حالات“ کے زیر اثر دور ہو گئے تھے، جبکہ حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ، جن کے آپ شیدائے تھے وہ اسی راہ تصوف کے سالک اور داعی تھے، اور آپ اپنے صوفی والد ماجد ہی کی عبادت و ریاضت کا خاص ثمرہ، اور حضرت سید انور شاہ صاحبؒ کے دست گرفتہ۔ یقیناً اسی دولتِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے یہ رائے پور کی حاضری مقدر ہوئی تھی جس کے لئے سکون کی ضرورت اور پھر ایک پرسکون جگہ کی تلاش بہانہ بنائی گئی۔ سچ فرمایا گیا: اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (سورہ یوسف ۱۰۰) سیدنا یوسف علیہ السلام کو تختِ مصر پر پہنچانا تھا تو اسبابی سلسلہ میں اوّل کئویں کے راستے مصر تک پہنچایا گیا، پھر جیل خانہ دکھایا، تب جا کے رسائی کی صورتِ تختِ مصر تک بنی۔

حضرت مولانا الیاسؒ کی طرف رہنمائی کی نعمت

اور دوسرا قدم (فتح باب کا) تھا حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی دینی دعوت سے وابستگی، جس کی راہ اسی پہلے قدم سے کھلی۔ اور اس کا قصہ اسی ”تحدیثِ نعمت“ کے اگلے صفحات (تذکرہ حضرت مولانا محمد الیاس) میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس سلسلہ میں چند ہی صفحات پہلے ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ اس عاجز نے جب مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے بیعت کی درخواست کی تو حضرت ممدوح نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ یا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ذکریا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن جب میں نے اس کے بعد بھی اپنی گزارش اور درخواست

پر نیاز مندانہ اصرار کیا تو قبول فرمایا۔ اس کے دو چار دن بعد جب میں حضرت سے رخصت ہونے لگا تو بڑی شفقت کے ساتھ حضرت نے مجھے تاکید فرمائی کہ حضرت دہلوی کے یہاں زیادہ جایا کرو۔ (حضرت رائے پوری قدس سرہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو "حضرت دہلوی" ہی کے لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔) میں نے عرض کیا کہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ہوں اور میرے دل میں الحمد للہ ان کی عظمت ہے لیکن مجھے حضرت مولانا کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہ ہو سکی۔ میری زبان سے یہ سن کر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ کا خاص تعلق بیک وقت بہت سے بندوں سے بھی ہوتا ہے لیکن خاص الخاص تعلق بس کسی کسی کے ساتھ ہوتا ہے، فی الحقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس بندے کے ساتھ اس کا کیسا تعلق ہے لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اس وقت حضرت دہلوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص تعلق ہے۔ حضرت کی زبان سے یہ کلمات سن کر میں نے ارادہ کر لیا کہ حضرت مولانا الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری کا اب ان شاء اللہ زیادہ اہتمام کروں گا۔" بجا فرمایا حضرت اقبال نے۔

دم عارف نسیم صمد ہے اسی سے ریثہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میر شہابی سے کلیسی دو دم ہے

رائے پور سے رخصت ہوتے ہیں۔ راہ میں سہارنپور آتا ہے۔ وہاں حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کی زیارت و ملاقات کے لئے ٹھہرتا ہے۔ حضرت کے یہاں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی علالت اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کا علم ہوتا ہے۔ پس وہیں سے دہلی جانے کا قصد فرماتے ہیں۔

”آمد آں یارے کہ مامی خواستیم“

دہلی کے سفر کے سلسلے میں ارشاد ہوا ہے:

”اب یاد نہیں رہا کہ اسی دن یا اگلے دن روانہ ہو گیا۔ رات کو عشاء کی نماز کے کافی دیر بعد حضرت نظام الدین پہنچنا ہوا، مسجد میں دو یک صاحبان نظر پڑے جو ابھی سوئے نہیں تھے۔ غالباً ان میں سے کوئی صاحب میرے پہچاننے والے بھی تھے، میں نے ان حضرات سے عرض کر دیا کہ حضرت مولانا اگر جاگ بھی رہے ہوں تو میری حاضری کی اطلاع اس وقت نہ دی جائے، میں ان شاء اللہ صبح حضرت سے ملوں گا (میرا مقصد تھا کہ میری وجہ سے حضرت کے آرام اور نیند میں خلل نہ پڑے۔) ان حضرات سے اتنی بات عرض کر کے میں عشاء کی نماز پڑھنے لگا، جب فارغ

ہوا تو ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ حضرت مولانا جاگ رہے ہیں اور ان کو تھکاری اطلاع ہو گئی ہے اور فرمایا ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر ابھی میرے پاس آجائیں۔“

آپ حضرت کے حجرہ میں حاضر ہوتے ہیں، اور بستر ہی پر حضرت سے مصافحہ کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانے کے بجائے بستر سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ کے دونوں ہاتھ جو مصافحہ کے لئے بڑھائے گئے تھے اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائی پر سے مضبوطی سے پکڑ کر لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

”میں نے اصرار سے عرض کیا کہ حضرت کی طبیعت ناساز ہے، حضرت بستر ہی پر آرام فرمائیں، لیٹ جائیں! فرمایا کچھ بیمار نہیں ہوں۔ تم ہی لوگوں کا پیار ڈالا ہوا ہوں، آ کے دین کا کام کرو انشاء اللہ میں اچھا ہو جاؤں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں حضرت لیٹ جائیں، آرام فرمائیں، حضرت نے فرمایا وعدہ کرو آؤ گے، وقت دو گے جب میں بیٹھوں گا، میں نے عرض کیا کہ میں ابھی حاضر ہوں جیسے حضرت فرمائیں گے انشاء اللہ ویسے ہی کروں گا۔ جب میں نے حضرت کے فرمانے کے مطابق وقت دینے کا وعدہ کر لیا تو حضرت تکیہ کا سہارا لیکر نیچے فرش پر بیٹھے اور ایک صاحب دروازہ صاحب حال کی طرح گفتگو فرماتے رہے۔ کافی دیر کے بعد، غالباً میرے باصرار عرض کرنے پر گفتگو کا سلسلہ ختم فرمایا اور مجھ سے فرمایا اچھا اب آرام کرو ان شاء اللہ صبح بات کروں گا۔

”صبح کو فجر کی نماز کے بلکہ اشراق کے بھی بعد پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت میں نے ایک ہفتہ کا ارادہ کر لیا ہے۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھا اور دعائیں دیں۔ اسی کے ساتھ فرمایا کہ اس وقت تو آپ چلے جائیے انشاء اللہ میں اس بیماری سے جلد ہی اچھا ہو جاؤں گا جب میرا کوئی سفر ہوگا تو اطلاع دلواؤں گا اس وقت آپ آجائیں۔ میں صرف ایک دو دن حضرت کی خدمت میں نظام الدین رہ کر اس وقت کے اپنے مستقر بریلی واپس آ گیا۔ ایک دو دن کے اس مختصر قیام میں مختلف صحبتوں میں حضرت کی جو باتیں سنیں ان سے اندازہ ہوا کہ اللہ نے اپنے دین کا اور اپنے رسول پاک کی امت کا وہ درد و فکر حضرت مولانا کو دیدیا ہے جس کا غالباً ہزارواں حصہ بھی ہمیں نصیب نہیں۔“

نظام الدین حاضری کے موقع کی یہ تفصیل (جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے حضرت مولانا الیاس صاحب کو مدت سے اور بڑی طلب تھی کہ حضرت صاحب سوانح آپ کی دعوت کو پھیلانے کا ذریعہ بنیں) چند ہی مہینے پیشتر کے اُس واقعہ دعا کی غمازی کر رہی ہے جس کا بیان اوپر حضرت حاجی

عبدالرحمن صاحبؒ کی روایت سے گزرا کہ حضرت صاحبؒ سوانح بریلی چھوڑ کر مستقل قیام کے ارادہ سے جماعت اسلامی کے مرکز دارالاسلام پٹھانکوٹ جو پینچے (جہاں تک یاد آتا ہے جون کا آخر ہوا جولائی کا شروع) تو بالکل آغاز ہی تھا کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے دل پر کوئی بجلی کوندی اور جولائی اگست کی جیسی گرمی کی دوپہر میں آرام چھوڑ کر آپ حاجی صاحب کے حجرہ پر پہنچے کہ اپنے ساتھ انھیں ملائیں اور اللہ کی بارگاہ میں دست سوال دراز کریں کہ مولانا نعمانی جس ”غلط“ جگہ چلے گئے ہیں وہاں سے ان کی واپسی کی تدبیر فرما۔ یہ دعا اگرچہ ایک منفی پیرائے میں سامنے آ رہی ہے، لیکن مقصد کے لحاظ سے محض منفی رہ نہیں سکتی تھی۔ غلط جگہ سے نکالنے کے بعد کسی صحیح جگہ کی رہنمائی کی طلب بھی اس کا لازمی جز ہوتا تھا۔ اور جو یہ دعا مانگ رہا تھا اس کی نظر میں وہ ”صحیح“ جگہ جو ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اس دن سے انتظار تھا کہ ”آنے والا“ اب کب اپنی ”صحیح“ جگہ کو آتا ہے۔ اور جب وہ آپہنچا، تو یہ اُس کا پہنچنا تھا کہ کب سے چشم آرزو جس کے لئے دراز تھی۔

انتظار حقیقت اور بھی پہلے سے تھا!

اس ”صحیح“ جگہ سے وابستگی کے بعد اس کے تعارف میں جو ایک مفصل مضمون ”نصرت دین اور اصلاح مسلمین کی ایک کوشش“ کے عنوان سے آپ نے الفرقان (بابت جمادین ۱۳۶۳ء) میں تحریر فرمایا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتظار اور بہت پہلے سے تھا۔ اس مضمون کی تمہید میں آتا ہے:

”اب سے کوئی تین برس پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں دو ایک دفعہ حاضری کا اتفاق ہوا تو مدوح نے بڑے درد اور قلق کے ساتھ یہ شکوہ فرمایا کہ ”تم میرا ساتھ نہیں دیتے“۔ اس زمانے میں مولانا کے اس شکوہ کو میں سنتا تھا اور بس ٹال جاتا تھا۔ کیوں کہ مولانا کی تبلیغی جدوجہد کے متعلق میری جو معلومات تھیں اور جو کچھ میں اندازہ کرتا تھا اس کی بنیاد پر اگرچہ اس کو ایک اچھی دینی خدمت اور باعث اجر کوشش یقین کرتا تھا لیکن میری سمجھ میں اسکی کوئی ایسی غیر معمولی اہمیت نہیں آتی تھی جس کی وجہ سے میں اس کو اسی باب کے اپنے دوسرے مسائل پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا اور اپنے اوقات کا کوئی بڑا حصہ اس میں لگا دینے کا فیصلہ کر لیتا۔“

پھر مذکورہ بالا وجہ کی کچھ تفصیل کر کے:

”بہر حال یہی وجہ تھی کہ میں نے مولانا کے شکوہ کو کئی بار سنا اور خاموشی سے ٹال دیا، ہاں

کبھی کسی بڑے اور عام اجتماع کے موقع پر وعظ تقریر کے لئے یاد فرمایا تو چلا بھی گیا اور تبلیغ کی اہمیت و ضرورت پر تقریر بھی کر دی۔ الغرض عرصہ تک مولانا کے کام اور ان کی جدوجہد کے بارے میں میرا خیال یکساں رہا۔ اس مدت میں کئی بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا اور غالباً ہر دفعہ ہی مولانا نے ساتھ نہ دینے اور دور دور رہنے کی شکایت فرمائی اور کام میں حصہ لینے کے لئے کہا، لیکن میں نے نہ کبھی وعدہ کیا اور نہ کبھی ارادہ ہی قائم ہوا۔“

پرو عارنگ لے ہی آئی اور دل گھل گیا

الغرض، حضرت مولانا کی دعا کے مثبت پہلو کی قبولیت ظاہر ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ اب وعدہ ہو رہا تھا کہ میں حاضر ہوں، جیسے حضرت فرمائیں، عذر نہیں۔ اور پھر جیسا حضرت نے فرمایا تھا کہ جب میرا کوئی سفر ہوگا تو اطلاع دلاؤں گا اس وقت آپ آجائیں۔ اس کے مطابق کچھ مدت کے بعد حضرت والا کی طرف سے اطلاع ملی کہ فلاں تاریخ کو میوات میں ایک تبلیغی اجتماع ہے اگر ممکن ہو تو اس موقع پر آجائیں۔ فرماتے ہیں:

”میں بریلی سے روانہ ہو کر نظام الدین حاضر ہو گیا۔ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی لکھنؤ سے پہنچ گئے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خاص عنایت فرمائی کہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ ہی کار میں بٹھایا۔ حضرت پورا راستہ ارشادات فرماتے رہے۔ اس سفر میں اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا کو اس سے پہلے جو کچھ سمجھا تھا حضرت کا مقام اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔ رفیق محترم مولانا ندوی نے بھی اپنا یہی احساس اور تاثر بتایا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس سفر میں حضرت کے حال کے مطالعہ اور ارشادات سننے کا جو موقع ملا اس نے ذہن اور طرز فکر پر بہت گہرا اثر ڈالا اور پہلی دفعہ گویا آنکھوں سے دیکھا کہ ”دل والوں“ اور ”دماغ والوں“ میں کیا خاص فرق ہوتا ہے۔

اس کے چند مہینے بعد حضرت مولانا نے ایک بڑی ”جماعت“ کے ساتھ لکھنؤ کا تبلیغی سفر فرمایا۔ راقم سطور کو اس کی بھی اطلاع دی گئی تھی۔ مقررہ پروگرام کے حساب سے یہ عاجز بھی لکھنؤ پہنچ گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پوری جماعت کا قیام تھا۔ جب میں لکھنؤ پہنچا اور حضرت مولانا سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے عرض کر دیا کہ اس پورے سفر میں انشاء اللہ ساتھ رہوں گا تو ارشاد فرمایا کہ

تم بس میرے ساتھ رہو اور یہ شرط ہے کہ سات دن تک مجھ سے کوئی سوال نہ کرو، بس میری سنتے رہو اور جو کام ہو رہا ہے اسے دیکھتے رہو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ چار دن گزرنے کے

ایک حرکت و بیداری پیدا کریں اور غافلوں کو متوجہ کر کے وہاں کے مقامی اہل دین سے وابستہ کرنے کی اور اس جگہ کے دین کی فکر رکھنے والوں (علماء و صلحاء) کو پیارے عوام کی اصلاح پر لگا دینے کی کوشش کریں۔ ہر جگہ پر اصلی کام تو وہیں کے کارکن کر سکیں گے اور عوام کو زیادہ فائدہ اپنی ہی جگہ کے اہل دین سے استفادہ کرنے میں ہوگا۔ البتہ اس کا طریقہ ہمارے ان آدمیوں سے سیکھا جائے جو ایک عرصہ سے افادہ و استفادہ اور تعلیم و تعلم کے اس طریقے پر عامل ہیں اور اس پر بڑی حد تک قابو پا چکے ہیں۔“

حضرت مولاناؒ کے اس ارشاد کا مفہوم واضح تر کرنے کے لئے اسی مضمون کی یہ تلخیصی سطریں پڑھی جاسکتی ہیں:

تحریک اور اس کے طریقہ کار کی ہمہ گیری

”امید ہے کہ ناظرین کرام نے یہاں تک کی گزارشات سے اس تحریک کے مقاصد، اس کی ہمہ گیری اور اس کی دور رس کو سمجھ لیا ہوگا، اور اندازہ فرمایا ہوگا کہ:

یہ تحریک دین کی ”عمومی تعلیم و تربیت“ کے اُس نبوی طریق کو زندہ کرنے اور رواج دینے کی براہ راست کوشش ہے جس نے قرن اول کے سارے مسلمانوں کو علم و عمل اور سعی و جہد کا کامل نمونہ بنا دیا تھا اور اب بھی اُس کا عام رواج ہو جائے تو یقیناً موجودہ ”مسلمان قوم“ قرآن والی ”امت مسلمہ“ اور ”خیر امت“ بن سکتی ہے۔

نیز یہ تحریک مسلمانوں میں دین کی خدمت و نصرت کا جذبہ عام کرنے اور ان کو نصرت کے اُس صحیح راستہ پر لگانے کی فی زمانہ بہترین صورت ہے جس راستہ سے خود رسول (ﷺ) نے اور آپ کے صحابہ نے دین کی نصرت کی تھی۔

علیٰ ہذا مسلمانوں کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے قریب کرنے، ملی جلی زندگی گزارنے، اسلامی مساوات و مساوات کا عادی بنادینے اور اُخوة اسلامیہ کو پھر سے زندہ کرنے کی بھی یہ حکیمانہ اسکیم ہے۔

اسی طرح ایمان و یقین کی تجدید و تکمیل، تزکیہ اخلاق اور تعمیر سیرت کو مسلمانوں میں عام کرنے، نیز ذکر و فکر اخلاص و احسان، مراقبہ آخرت، اور اللہ کی خشیت جو مسلمانوں کے عمومی اوصاف ہونے چاہئے تھے مگر ہماری بد قسمتی سے اب چند خانقاہ نشین بزرگوں کی خصوصیت بن

کہہ گئے ہیں (اور اب تو وہاں بھی عام طور سے بس اللہ کا نام ہی ہے۔ اَلَا مَن شَاءَ اللہ) تو ان خصائص و احوال کو پھر سے مسلمانوں میں بطریق عموم پھیلانے کی بھی یہ بہترین عملی تدبیر ہے۔ اس سب کے ساتھ یہ تحریک، مقصد رسالت کی نیابتِ حفاظت، تبلیغ و دعوت کے فریضہ کی ادائیگی، اور ”امر بالمعروف و نہی المنکر“ کے اجراء کی بھی براہ راست کوشش ہے۔

پس کہنا چاہئے کہ اس دعوتی تحریک کے بارے میں یہ فہم و ادراک تھا جس میں آپ نے اپنی اندرونی عملی تڑپ کا جواب پایا اور سینہ اس کی قبولیت کے لئے ایسا کھلا کہ پھر کبھی تڑد پاس نہ آیا۔ اس کے بعد پورے سولہ سترہ سال (یعنی کوئی ۱۹۶۱ء تک) ایسے گزرے کہ اپنے مستقل تصنیفی معمولات اور خانگی ذمہ داریوں کے بعد زندگی کا اہم ترین شغل اسی دعوت کی مصروفیات رہیں۔ اور اسی کے ماتحت ۱۹۴۶ء میں بریلی چھوڑنے کا فیصلہ کیا (کہ وہاں مناظرانہ دور کی زندگی گزرنے کی وجہ سے اس دعوتی کام کا میدان آپ کے لئے تنگ تھا) متبادل جگہیں دوسا منے آ رہی تھیں۔ لکھنؤ، دہلی، قراہ بالا آخر لکھنؤ کے نام نکلا۔ اور اسی شہر کو مستقر بنانے کا فیصلہ کیا۔ لکھنؤ کے لئے داعی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو یہاں پہلے سے اس دعوتی کام میں لگے ہوئے تھے، اور ان کی رفاقت میں یہاں یہ کام زیادہ بہتر طور سے انجام دئے جانے کی توقع تھی۔ ان دو مؤثر شخصیتوں کے اجتماع سے دلی کے بعد لکھنؤ ایک دوسرے درجہ کا مرکز بن گیا اور پھر اس دیار اودھ میں اس کام کو جو فروغ ہونا چاہئے تھا محمد اللہ وہ ہوا۔ پہلے اس کے اجتماعات ندوے کی مسجد میں ہوتے تھے۔ اس کا اپنا کوئی مرکز نہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد اللہ نے ایک صاحب خیر کی توفیق سے اس کا اپنا مرکز بھی امین آباد کے قرب میں کچھری روڈ پر بنوا دیا۔ اور تب سے یہ مرکز ہی دونوں بزرگ شخصیتوں کا مستقر ایک عرصہ تک ٹھہرا۔

اب الفرقان بھی اس دعوت کا نقیب

اپنی ذات ہی کو آپ نے اُس طویل عرصہ تک جو اللہ کو منظور تھا، اس کام کے لئے وقف نہ رکھا بلکہ اب الفرقان بھی اسی کا ہو کر رہ گیا۔ تخریصِ نعمت میں خود تحریر فرمایا ہے:

”حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک کا کام صرف دل و زبان اور عملی نقل و حرکت سے تعلق رکھتا تھا۔ قلم اور تحریر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر میری ذات کے ساتھ الفرقان ایسا جزا ہوا تھا کہ کسی علمی، دینی اصلاحی خدمت کی میں توفیق پاؤں اور الفرقان اس

سے الگ الگ رہے اس کا تصور ہی کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اب الفرقان کی بھی اصل دعوت یہی ہوگئی۔ اور میرا احساس ہے کہ اپنی ذات اور الفرقان دونوں سے جس قدر کام اس راہ میں لینا اس عاجز کے لئے ممکن ہوا وہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات میں سے غیر معمولی درجہ کا بڑا انعام و احسان ہے۔“

الفرقان میں اس سلسلہ کے مضامین و مقالات کے علاوہ اللہ نے آپ سے ایک خاص کام حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے کچھ ملفوظات مرتب کرنے اور ان کو کتابی شکل دینے کا لیا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس سے کتنا فائدہ اس دعوتی کام کو اس پہلو سے پہنچا کہ کام میں لگے لوگوں کو اصل داعی کے خیالات کی یاد دہانی ایک دستاویزی شکل میں ہوتی رہے۔ حضرت کے دوسو (۲۰۰) سے اوپر ملفوظات اس کتاب میں آئے ہیں۔ الفرقان کا آغاز مناظروں کے دور کی ترجمانی سے ہوا۔ بعد میں اس کی جگہ مودودی صاحب کے فکر کی ترجمانی نے لے لی۔ مگر ان دونوں کا عرصہ بمشکل دو دو سال رہا، جبکہ تبلیغی دعوت کی پیہم خدمت کا عرصہ سولہ سترہ سال ہوتا ہے۔ یوں قلم سے بھی اس دعوت کی بھرپور ترجمانی الفرقان کے ذریعہ ہوتی رہی۔ اور اس میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کا بھی برابر حصہ رہا۔ کہ دونوں شخصیتیں باہم اس طرح جڑ گئی تھیں کہ ”من تو شدم تو من شدی“۔

اس دعوتی سلسلہ کی آپ کی مصروفیات کا کچھ حصہ اسفار کے باب میں آ گیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں کہ یہ تفصیل اس کتاب کے پیمانے میں سامنے نہیں آ سکتی۔ البتہ اس ضمن کی ایک ایسی چیز اس وقت یاد آ رہی ہے جو مختصر ہے اور اس کے تذکرے میں ایک خاص قسم کی افادیت۔

حضرت جگر مراد آبادی کی شخصیت تعارف سے بے نیاز ہے وہ غزل کے شاعر اور کیسی غزل۔

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے

تو پھر یہ کیسے کئے زندگی کہاں گزرے

انہی جگر صاحب کے گھر آپ گوئدہ (یوپی) کے ایک تبلیغی سفر میں کچھ ساتھیوں کے ساتھ پہونچتے ہیں۔ وہ رئیس السنز لین اور آپ شعر و شاعری کے ساتھ مناسبت سے کوسوں دور، مگر یہ دعوتی ملاقات جگر صاحب کے پار ہوگئی، اور ایسی گرویدگی ان کو آپ کے ساتھ ہوئی کہ لکھنؤ آنا ہوتا رہتا، جب بھی دفتر الفرقان (واقع گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ) کے آس پاس سے گزر ہوتا دفتر تشریف لے آتے اور چائے نوش فرماتے اور

الفرقان کے لئے کوئی موزوں غزل وہیں لکھ کر عنایت فرماتے۔ مزید برآں حج کا خیال ہوا تو اس کے لئے ضرورت سمجھی کہ آپ کے پاس کچھ وقت گزاریں اور پھر نازم سفر ہوں۔ چنانچہ ایک عشرہ مع اہلیہ محترمہ کے آپ نے ہمارے یہاں بلوچ پورہ جیسی غیر شاعرانہ جگہ میں قیام فرمایا۔ اور صرف محلّہ ہی غیر شاعرانہ ڈھنگ کا نہ تھا۔ قیام گاہ میں بھی ان کی طبع لطیف کے لئے خاصی آزمائش کا پہلو تھا۔ ہمارے گھر میں تین فیملیاں ہونے کی وجہ سے ایسی گنجائش نہ تھی کہ جگر صاحب بھی اہلیہ محترمہ کے ساتھ قیام کر سکیں، پس اُن کا قیام گھر کے سامنے اکھاڑے والی مسجد کے اوپر اس کمرے میں ہو سکا جو والد ماجد کی نشست اور تصنیف و تالیف کے کام کا کمرہ تھا، یہ نہایت مؤذّب ہو کے رہنے کی جگہ تو تھی ہی، اور ایسا اتفاق جگر صاحب کو کیوں کبھی ہوا ہوگا؟ مزید یہ تھا، اور یہ ان کے لئے بہت تھا، کہ وہاں مؤذّن صاحب کچھ زیادہ ہی بھاری اور بلند آواز کے تھے۔ اللہ بال بال مغفرت کرے، موصوف نے ان میں سے کسی چیز کو اپنے روحانی مقصد کی تکمیل میں حائل نہ ہونے دیا، اور پورا وقت گزار کر ہی واپس ہوئے۔

جگر صاحب کے حج کے بعد جوش ملیح آبادی نے انھیں ”حاجی جگر نے“ کہنا شروع کیا تھا۔ جگر صاحب نے کیا اچھا جواب دیا تھا:

تو جہاں پہلے تھا موجود وہیں ہے اب بھی
دیکھ یہ رندان خوش انجام کہاں تک پہنچے

چھٹا باب

(مادرِ علمی دیوبند کی خدمت کا دور۔ اور ایک منفرد کردار)

۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں آپ نے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی تھی، مگر وہ کہ جنہیں سبق یاد رہے انہیں فراغت حقیقت میں عمر بھر نہیں ملا کرتی، چنانچہ ہم دیکھ آئے ہیں کہ دارالعلوم سے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہی آپ نے تیاری شروع کر دی تھی کہ باہر جو اس درس گاہِ حق کے مسلک، اس کی بنیادی تعلیم و دعوت اور اس کے اکابر کے خلاف ایک طوفان اہلِ ہوئی و ہوس نے اُٹھا رکھا ہے اسے چیلنج کرنا ہے۔ پس ادھر فراغت پائی اور ادھر اس طوفانِ ضلالت سے جہاد کی بساط بھی درس و تدریس کے شغل کے ساتھ ساتھ بچا دی۔ اور وہ نامِ خدا کے فضل و کرم سے اس میدان میں پایا کہ بزرگوں کی نہ صرف دعاؤں سے سرفرازی ملی بلکہ وہ اعتبار بھی ان کی نظروں میں نوعمری کے باوجود میسر آیا کہ پوری جماعت کے وکیلِ مطلق کا درجہ پالیا۔ جیسا کہ سب تفصیل سے سامنے آچکا۔

سولہ سترہ برس کا یہ عرصہ گزرتا ہوا ۱۹۴۳ء تک پہنچتا ہے، جہاں کچھ اور انعاماتِ الہیہ کا فیضانِ ظہور فرما ہے (وہ کہ جس نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے دامنِ صفا سے وابستہ کیا، اور پھر یہاں سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی طرف رہنمائی، جس نے مولانا کی دینی دعوت میں شرکت کا راستہ ہموار کر کے اس راہ پہ آپ کو لگا دیا جس کی تلاش میں ایک عرصہ سے آپ کی نیچوں روح بھٹک رہی تھی) وہاں ٹھیک اسی ”فتح باب“ کے زمانے میں، اپنی نوعیت کی ایک تیسری نعت، ہندوستان کے عظیم علمی و دینی مرکز اور آپ کی مادرِ علمی ”دارالعلوم دیوبند“ کی خدمت کے موقع کی دستیابی تھی۔

۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں اوپر کی مذکورہ دونوں عظیم نعمتوں سے سرفرازی ہوئی تھی، جن میں آپ کے ارادہ کوئی الجملہ دخل تھا، آئندہ سال ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں بالکل بے سان و گمان اطلاع ملتی ہے کہ دارالعلوم

رُوْلًا رَحِيْمًا. اَللّٰهُمَّ اَلْهِنْسِيْ رُشْدِيْ وَفِنِيْ شَرَّ لَفْسِيْ۔ آپ سے بھی اسی دعا کا خواستگار ہوں۔

خادم محمد منظور نعمانی

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

شورئی میں آپ کا مقام اور طرز عمل

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ یہ جواب نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”راقم الحروف مجلس شورئی کا رکن ہونے کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے بارے میں یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ شورئی میں ان کا طرز عمل مکتوب میں پیش کردہ دونوں باتوں، یعنی توفیق سداد و صواب اور حقوق دارالعلوم کی ادائیگی کا مکمل آئینہ دار تھا۔ اور حقیقت حال تو آخرت ہی میں سامنے آئے گی تاہم قرآن و آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں بارگاہِ خداوندی میں شرف قبول سے نوازی گئیں۔ معذوری کے چند آخری سالوں کو متفق کر کے وہ پابندی کے ساتھ شورئی و عالمہ کی تمام مجلسوں میں شریک ہوتے رہے، اور ہر طرح کی ذہنی و عملی توانائی سے دارالعلوم کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے رہے۔ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے داخلی اور بیرونی مسائل سے متعلق جب بھی کوئی کمیٹی تشکیل کی گئی تو اس میں بہت اہمیت کے ساتھ ان کا نام شامل کیا جاتا رہا، رکنیت شورئی کے بالکل ابتدائی سالوں میں وہ دارالعلوم کی دستور ساز کمیٹی کے رکن بنائے گئے، نیز یہ کہ ملازمین دارالعلوم کی ترقیات یا گریڈ پر نظر ثانی سے متعلق کوئی کمیٹی ہو یا کسی بھی طرح کی اصلاحات سے متعلق کوئی کمیٹی مقرر کی گئی وہ برابر اس کے رکن نامزد کئے جاتے رہے۔“

راقم الحروف بھی ۱۹۶۲ء سے دارالعلوم کی شورئی کا رکن ہے، اور اگرچہ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سے عابسانہ تعارف تو بہت پہلے سے تھا لیکن ملاقات کا شرف مجلس شورئی ہی میں حاصل ہوا، پھر وہیں موصوف کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا، اور اس زمانہ سے لیکر آج تک کے ارکان شورئی میں راقم مولانا نعمانی صاحب مرحوم کے طرز عمل سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔

موصوف کا مجلس شورئی میں طرز عمل یہ تھا۔

(الف) وہ دارالعلوم کے معاملات میں رائے قائم کرنے سے پہلے مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال کرتے اور غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کر لیتے اس کو صاف طور پر پیش کرتے، کسی کی رعایت کی بنیاد پر چشم پوشی یا مدہنت ان کی عادت نہیں تھی۔

(ب) مجلس شورئ کے ارکان دو حصوں میں تقسیم تھے ایک حزب اقتدار، اور ایک حزب مخالف، اور عام طور پر ممبران کی رائے میں اپنی جماعت کے رجحانات کی رعایت پائی جاتی تھی، لیکن مولانا نعمانی مرحوم کا ان دونوں جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ خصوصی تعلق نہیں تھا، ان کی رائے ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد کے تابع رہتی تھی۔

(ج) انھیں اپنی رائے پیش کرنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ مجلس کے آداب اور اراکین مجلس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی رائے پیش کرتے تھے، بڑے محتاط الفاظ استعمال فرماتے تھے، لب و لہجہ سے تواضع و انکسار ہیکتا تھا، بسا اوقات تاثر کی شدت میں آواز بھڑا جاتی تھی، کبھی آنکھیں بھی نم ہو جاتی تھیں، اور اگر وہ کسی کے بارے میں یہ سمجھ لیتے تھے کہ وہ کسی وجہ سے ان کی بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کر پائیں گے تو وہ ان سے تنہائی میں ملتے، اپنی رائے پیش کرتے، دوسرے کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور عام طور پر یہ ہوتا کہ دوسرے کو اپنی رائے پر مطمئن کر لیتے یا دوسرے کی رائے قبول کر کے خود مطمئن ہو جاتے۔ اسی لئے دارالعلوم کے معاملات میں ان کے اخلاص و دیانت، غیر جانبداری اور اصابت رائے کو دیکھتے ہوئے راقم الحروف کا بیشتر ان سے اتفاق رہتا تھا۔

(د) موصوف میں ایک جوی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی رائے کو کبھی اپنی ذات کا مسئلہ نہیں بناتے تھے، اگر اپنی رائے میں کمزوری واضح ہو جاتی تو اس کو برملا واپس لے لیتے تھے اور اگر کمزوری بھی واضح نہ ہوتی تو مجلس کے ضابطہ کے مطابق کثرت رائے کا احترام کرتے۔ میں نے کبھی انھیں اپنی بات کی بیخ کنی نہیں دیکھا۔

(ه) اصابت رائے میں ان کا خصوصی مقام تھا اور مجلس ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مجلس میں اختلاف رائے ہوا تو مسئلہ مولانا نعمانی صاحب کے سپرد کر دیا گیا، اور انھوں نے جو رائے پیش کی اسی کو فریقین نے قبول کر لیا۔

حضرت مولانا نعمانی صاحب کی رائے پر محول کئے جانے والے یہ مسائل بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے، جیسے ممبران شورئ کی خالی جگہوں پر انتخاب کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ ہر اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ انہی ممبران کے ذریعہ پروردگار عالم دارالعلوم جیسی عظیم الشان روایات کی حامل درس گاہ کا نظم چلا رہا ہے اور دارالعلوم کے حال اور مستقبل کا انحصار انہی حضرات کی رائے پر ہوتا ہے۔

”ہر طرح کی چینی و عملی توانائی سے دارالعلوم کی خدمت“ کی جو شہادت حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب نے پیش فرمائی ہے اس پر اتنا اضافہ اور کیا جانا حق ہے کہ اس ہمہ جہت خدمت کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ فائدہ بھی اٹھانے کی، بلکہ اس کے شائبہ کے بھی، روادار آپ کی طبیعت کبھی نہ ہوئی۔ اور خدمت کی اس ہمہ جہتی کے ساتھ اس داغ بے غرضی ہی میں شورئی کے اندر آپ کی اُس یکتائیت کا راز تھا جس کا ذکر حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب نے اپنی اس شہادت میں آگے کیا ہے کہ

”بارہا ایسا ہوا کہ مجلس میں اختلاف رائے ہوا تو مسئلہ مولانا نعمانی صاحب کے سپرد کر دیا گیا اور انھوں نے جو رائے پیش کی اسی کو فریقین نے قبول کر لیا حضرت مولانا کی رائے پر متول کئے جانے والے یہ مسائل بڑی اہمیت کے ہوتے تھے، جیسے مہران شورئی کی خالی جگہوں پر انتخاب کا مسئلہ۔ یہ مسئلہ ہر اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔۔۔۔۔“

خود آپ نے بھی اسے اللہ کا ایک بڑا احسان اپنے حق میں سمجھتے ہوئے اس کا ذکر ”تحدیثِ نعت“ میں بایں الفاظ فرمایا ہے:

”مجھے مسرت ہے کہ شورئی کے ساتھیوں میں میری رایوں سے وقفاً وقفاً اختلاف کرنے والے تو جتنے بھی رہے ہوں مگر، الحمد للہ، میرے بارے میں سب کا گمان میرے علم و اندازہ کی حد تک یہی رہا کہ میری رایوں اور تجویزوں کی بنیاد دارالعلوم کا مفاد دیکھنے اور سوچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ اور ان سب کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی رہا کہ گویا مجھے ان سب کا اعتماد حاصل

دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس سے جو عالم ناک قضیہ پیدا ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اپنے ایک بیان کے ضمن میں آپ نے دارالعلوم کے تعلق سے متعدد وضاحتیں اپنے بارے میں فرمائی تھیں، ان میں سے ایک کا یہاں درج کیا جانا مناسب ہے۔ فرمایا: ”یہاں اپنے اس معمول کا ذکر کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ جب تک میری صحت اچھی تھی، میں مجلس شورئی کے اجلاس میں شرکت کے لیے سفر عموماً پرانے زمانے کے قمرؤ کلاس میں کرتا تھا، اگر کبھی اس درجہ میں سفر ناقابل برداشت ہوا تو اس سے اوپر کے درجہ میں منتقل ہو جاتا تھا۔ اس سفر کے مصارف دارالعلوم ادا کرتا تھا۔ دیوبند پہنچے تک کے مصارف کا تو مجھے علم ہوتا تھا لیکن واپسی کے مصارف اعزاء ہی سے لینے پڑتے تھے، جس میں کمی زیادتی کا امکان رہتا تھا اور حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی طرح آنہ پائی کا حساب میرے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے میں نے یہ معمول مقرر کر لیا تھا کہ کبھی کبھی خاص اسی مد میں دارالعلوم کو کچھ رقم بھیج دیتا تھا، تاکہ اگر دارالعلوم کی کچھ رقم میرے ذمہ رہ گئی ہو تو وہ ادا ہو جائے، پھر اب سے تقریباً ۵۵-۶۰ سال پہلے ایک حادثہ کے نتیجہ میں میری حالت ایسی ہو گئی کہ چلنے بھرنے سے معذور ہو گیا، اور میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب میں سفر کے قابل نہ ہو سکوں گا، دارالعلوم کی شورئی کے اجلاس کے لیے بھی سفر نہ کر سکوں گا، تو اس وقت میں نے آخری دفعہ پانچ سو روپے کی رقم اسی مد میں بھیجی اور اس کے بعد ضمیر اس بارہ میں بالکل مطمئن ہو گیا کہ انشاء اللہ اب قیامت میں مجھے دارالعلوم کے ایک پیسہ کا بھی حساب دینا نہیں پڑے گا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک“

ہے۔ اور یہ بلاشبہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ خاص کر اس زمانہ میں جبکہ باہمی اعتماد ایک کمیاب مہی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔“

بے ساختہ خیال آتا ہے کہ یہ دارالعلوم کے اسی طالب العلم کی کہانی ہے جسے طالب علمی کے دونوں سال میں ڈھنگ کا کمرہ بھی رہنے کو نہ میسر آیا تھا، اور دفترِ اہتمام میں بار بار کی حاضری اور درخواست کے باوجود اس وقت کے ”مطبع قاسمی“ کے ایک خستہ سے کمرہ ہی میں دونوں سال گزارنے پڑے تھے۔

دارالعلوم کا ایک سفر اور آخر عمر کی معذوری

عمر کے آخری بیس سال میں معذوری کے دور کی داغ بیل ۴۷ء میں دارالعلوم کی خدمت ہی کے سلسلہ کے ایک سفر میں پڑی تھی۔ لکھنؤ سے دیوبند کا سفر عام طور پر براہِ سہارنپور ہوتا تھا۔ سہارنپور سے بس ہر وقت دستیاب ہے۔ اس لئے ٹرین کے مقابلہ میں اکثر اسی کو ترجیح ملتی تھی۔ ۴۷ء کے اس سفر میں بھی بس سے دیوبند اتار کر دارالعلوم کا راستہ رکشہ سے طے ہو رہا تھا، اور ہمیشہ کی طرح بے رفیق سفر تھا، جیسا کہ معمول تھا، اور دماغ کسی سوچ میں غرق، جو بظاہر دارالعلوم ہی سے متعلق ہوگی، کہ رکشہ ڈرائیور کی بے احتیاطی سے رکشہ الٹ گیا۔ بالکل بے خبری میں نیچے گرے اور کولھے کی ہڈی کا جوڑ (Hip Joint) کھل گیا۔ کولھے کی ہڈی کی ایسی چوٹ جس قدر تکلیف دہ ہو سکتی تھی اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ حادثہ کی بذریعہ تار اطلاع پر راقم سطور مع برادرِ مہمانِ نعمانی سلمہ، دیوبند پہنچا۔ دیوبند میں ضروری علاج کی سہولت دستیاب نہیں تھی اس لئے آپ مظفر نگر کے ایک نرسنگ ہوم کے زیرِ علاج تھے۔ ہم لوگوں کے پہونچنے پر ایک سفر اس نرسنگ ہوم کا ہوا اور وہاں کی اجازت سے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا گیا۔ دیوبند سے سہارنپور تک جیپ میں چار پائی پر لٹا کر اور سہارنپور سے ٹرین کی فرسٹ کلاس برتھ پر لٹائے ہوئے ۲۸ مئی کی صبح کو لکھنؤ پہنچا ہوا۔ اور اسٹیشن سے سیدھے اسپتال، کہ برادرِ مہمانِ نعمانی نے پہلے سے اسپتال میں سہولت کے انتظامات کر رکھے تھے۔ اسپتال میں کافی وقت گزرا۔ تاہم اللہ کا احسان کہ بالآخر تکلیفوں کا خاتمہ ہوا۔ اور رفتہ رفتہ معمول کے مطابق نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ لیکن معالجہ میں شاید اندرونی طور پر کوئی کسر رہ گئی جس کے اثرات دو سال بعد (۶۷ء میں) ایسی شکل میں ظاہر ہوئے کہ چند دن موت و حیات کی کشمکش کی صورت رونما رہی (تفصیل آگے باب (۸) میں آئے گی) اور پھر یہاں سے ٹانگ کی اُس مستقل معذوری کا آغاز ہو گیا جس کے آخری دس سال صاحبِ فراش ہی رہ کر گزرے، حتیٰ کہ ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء میں اس دنیوی زندگی کا ورق تمام ہوا۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَاخْشِرْ لَہٗ عِبَادَکَ الصّٰلِحِیْنَ۔

صد سالہ اجلاس (۱۹۸۰ء) اور آپ کا ابتلاء

معدوری کا قصہ، جیسا کہ گزرا، ۱۷۷۷ء کے آخر سے شروع ہوا۔ مگر جب تک بھی بن پڑا دارالعلوم کی شورئی اور عالمہ کے جلسوں میں شرکت بہر حال ہوتی رہی، کہ شورئی میں داخل ہونے کے بعد سے دارالعلوم کے معاملات و مسائل آپ کی زندگی میں آپ کے ذاتی معاملات و مسائل کا درجہ اختیار کرتے چلے گئے تھے۔ اسی دوران میں صد سالہ اجلاس طے ہوا اور اس کے لئے مارچ ۸۰ء کی تاریخیں، تو فردری مارچ ۱۹۸۰ء کے الفرقان میں اس اجلاس کے بخیر و خوبی انعقاد کی دعا کے لئے آپ نے دو صفحہ کا ایک نوٹ تحریر فرمایا۔ اور آخر میں قارئین سے اپیل کی کرتے ہوئے لکھا:

”دارالعلوم دیوبند، جماعت دیوبند اور اس کے اکابر سے لویۃ اللہ تعلق و محبت رکھنے والے تمام حضرات سے اس عاجز کی استدعا ہے کہ ان دنوں میں خاص اہتمام سے پورے الحاح و تضرع کے ساتھ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس اجلاس کو دارالعلوم کے لئے اور پوری امت مسلمہ اور خاص کر ملت اسلامیہ ہند کے حق میں صلاح و فلاح اور خیر و سعادت کا وسیلہ بنائے اور ایسی تمام باتوں سے حفاظت فرمائے جو اس کی ناراضگی کا باعث بننے والی ہوں۔“

دعا کے لئے خاص اہتمام کی اس اپیل کے پس منظر میں اس سے پہلے کے ایسے اجلاس دارالعلوم ۱۹۱۰ء کی یاد تھی۔ اس سابق اجلاس کا خیال اس موقع پر آپ کو آیا، تو احساس ہوا اور خطرہ گزرا کہ اُس اجلاس کا جو دینی رنگ اور دینی شان اُس وقت کے اکابر جماعت کے تقویٰ و تقدس کے طفیل دیکھی گئی تھی اُس کی امید تو اب تعمیرِ زمانہ کی بدولت ہرگز نہیں کی جاسکتی ہے۔ تاہم خدا نہ کرے کہ ہم بالکل نام ڈبونے والے ثابت ہوں۔

بد قسمتی کہئے، کہ آپ نے جس خطرہ کے احساس سے دعا کی اپیل کی تھی اس کے آثار اجلاس کے انعقاد سے پہلے ہی اس حد تک رونما ہو گئے کہ اجلاس میں شرکت کے لئے سفر کا ارادہ ترک کرنے اور ریلوے کارزرویشن کینسل کرانے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور اس پر قدرتی طور سے بہت سے خطوط آپ کی عدم شرکت کے بارے میں آئے تو الفرقان (مئی) میں پھر دو صفحہ کا ایک نوٹ ان خطوط کے جواب میں تحریر فرمایا۔ جو اس طرح تھا کہ

”الفرقان کے فردری مارچ کے مشترکہ شمارے میں جو اجلاس سے قریباً ایک ہفتہ پہلے شائع ہوا تھا، اسی عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اپنے دینی انحطاط، دارالعلوم کے موجودہ حالات اور زمانہ کی رفتار سے کچھ خطرات محسوس کرتے ہوئے لکھا گیا تھا۔ لیکن جو وقوع میں آیا۔“

اس نے بتلایا کہ ہم اس سطح سے بہت نیچے گر چکے ہیں جس کا خطرہ تھا۔

”اس عاجز کا دین و دنیا کا سارا سرمایہ بس وہ تھوڑا سا (بہت تھوڑا سا) علم ہی ہے جو از اول

تا آخر دارالعلوم ہی کا صدقہ ہے۔ اس مادر علمی کا باقاعدہ طالب علم بن کر تو اب سے قریباً

۵۵ سال پہلے صرف آخری دو درجوں کی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اس سے پہلے بھی جو کچھ کہیں

پڑھا دارالعلوم کے بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض یافتہ اساتذہ ہی سے پڑھا، اس طرح جو کچھ پایا اس کا

سرچشمہ دارالعلوم ہی ہے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم سے ایک اختصاصی

تعلق یہ بھی رہا کہ مختلف میدانوں میں اس کی نمائندگی اور وکالت و ترجمانی کا شرف بھی اللہ تعالیٰ

نے عطا فرمایا۔ اور اس بارے میں اپنے اکابر مرخومین کا پورا اعتماد حاصل رہا۔ ولا فخر! ایک ضابطہ کا

اور کسی درجہ میں ذمہ داری کا تعلق یہ بھی رہا کہ یہ عاجز قریباً چالیس سال سے اس کی مجلس شوریٰ کا

رکن رہا ہے۔

”ان سب تعلقات کا تقاضہ اور حق تھا کہ میں اجلاس میں نہ صرف شریک ہوتا بلکہ اس میں

میرا نمایاں حصہ ہوتا۔ اجلاس کے بہت پہلے سے میں مختلف ممالک کے دوستوں کے خطوط

کے جواب میں لکھتا رہا تھا کہ ان شاء اللہ دارالعلوم کے اجلاس میں ملاقات ہوگی۔ پھر جب

تاریخ قریب آنے لگی تو رزرویشن بھی کرالیا، لیکن صرف تین دن پہلے (جس دن مجھے دیوبند کے

لئے روانہ ہونا تھا) اطلاع ملی کہ اجلاس کے منتظمین اور ذمہ دار حضرات نے اجلاس کے پروگرام

کے سلسلہ میں (کسی مجبوری سے یا اپنے نزدیک صحیح و مناسب سمجھ کر) بعض ایسے فیصلے کر لئے ہیں

جن سے بہر حال مجھے شدید اختلاف ہے اور دارالعلوم جیسے مقدس روایات رکھنے والے علوم نبوی

اور ہدایت و ارشاد کے کسی مرکز کے لئے میرے نزدیک ایسی کسی بات کا کوئی جواز نہیں ہے۔

”یہ اطلاع ملنے کے بعد میں غور و فکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب وہاں پہنچ کر میرے

بڑے اظہار و اختلاف سے صرف انتشار ہی پیدا ہوگا، پروگرام میں کسی تبدیلی کا اب کوئی امکان

نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اپنے بارے میں اجلاس میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور

سفر کا ارادہ منسوخ کر دیا۔“

اجلاس اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوا۔ اور اسی شکل میں ہوا جس کی اطلاع پا کر آپ نے سفر

منسوخ کر دیا تھا۔ اور صد افسوس کہ اس کے ساتھ وہ کچھ بھی ہوا جس کے نتیجہ میں ایک خانہ جنگی کی بنیاد پڑی،

دارالعلوم کی صد سالہ روشن تاریخ کو گہن لگا اور جماعت سر بازار رسوا ہوئی۔ اور نتیجہ میں وہ آزمائش بحیثیت

(۱) یہاں قارئین کو یہ جاننے کا تقاضہ بالکل بدیہی ہے کہ وہ کیا فیصلے تھے؟ مگر جب آپ نے اظہار مناسب نہیں سمجھا تو اعراض

ہی اولیٰ۔

رکنِ شوریٰ آپ کے حصہ میں آئی جس پر آپ کا دل حسرت سے پکارنے لگا کہ ”یَا لَیْسَی مِثْ قَبْلَ هَذَا وَ كُنْتُ نَسِیًا مُنْسِیًا“ (اے کاش میں اس سے پہلے مرکزِ نیا مَنَسِیَا ہو چکا ہوتا)۔ دارالعلوم کے مفاد و مصالح کے لحاظ سے تو شوریٰ میں آپ اکثر آزمائش میں رہتے ہی تھے، جیسا کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ کے بیان میں گزرا لیکن اس موقع پر آزمائش مفاد و مصالح کے نہیں، خود دارالعلوم کے اور اس کی مقدس روایات کے تحفظ کے حوالہ سے تھی۔ اور کیسی سخت کہ دل ”یَا لَیْسَی مِثْ قَبْلَ هَذَا...“ کی پکار پر مجبور۔ مہینوں بلکہ کئی برسوں پر پھیلی آزمائش، کہ تفصیل میں جانے کے لئے کتاب کی ضخامت چاہئے۔ مگر اصولاً زندگی کا ایک باب عزیمت ہونے کے باوجود یہ آزمائش ایک پہلو سے آپ کے احساسات کے لئے اتنی المناک تھی کہ جی چاہتا تھا اسے بھول جائیں اور کوئی یاد نہ دلائے۔ اور تاریخ کا ایسا حصہ چونکہ یہ بن چکی ہے کہ صرف ”اجلاسِ صد سالہ“ کا حوالہ کہانی یاد دلا دینے کے لئے کافی ہے، اس لئے ہمیں بھی ضرورت نہیں کہ اپنی طرف سے تفصیل میں جائیں۔

فرض ادا کیا، مگر دلی دُکھ کے ساتھ

اس کہانی کا سب سے زیادہ سخت آزمائش پہلو آپ کے لئے یہ تھا کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب جیسی محترم اور ہمیشہ کی مرنجائش مرنجِ شخصیت سے اس درجہ کا اختلاف کرنا پڑا جس کا (خود آپ کے الفاظ میں) کبھی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پس اگرچہ اس کا تو آخر دم تک آپ کو فیما بینہ و بین اللہ اطمینان رہا کہ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی آپ کو کرنا پڑا عند اللہ اپنی ذمہ داری کے ماتحت وہی کرنا لازم تھا۔ مگر اس کا برابر رنج رہا کہ حضرت قاری صاحبؒ کے کم اندیش مشیروں نے آپ سے معرکہ آرائی کی صورت بنا دی۔ اور بس اپنے دل اور ضمیر کی صفائی کی بنا پر اس امید سے تسلی رہی کہ اگر اللہ نے خاتمہ ایمان پر کیا تو اس کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ ہم دونوں کو اُس زمرے میں شامل کرے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَلَزَعْنَا مَا فِي صُلُوبِهِمْ مِنْ غَلِيٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ. [الحجر ۱۵]

اور ہم دور کریں گے اُن کے دلوں میں سے کدورت کہ سب بھائی بھائی کی طرح ہیں

تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے۔

اپنے اس تکلیف دہ احساس کے ماتحت آپ نے حضرت قاری صاحب کی وفات پر جو کچھ الفرقان میں تحریر فرمایا اس کا حق ہے کہ سوانح میں محفوظ کر دیا جائے۔ ذیل میں من و عن درج ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب الی رحمۃ اللہ

اس عاجز راقم سطور کو قاری صاحب کے حادثہ وفات پر بالخصوص اس احساس سے شدید رنج و صدمہ ہے کہ یہ ایسے وقت ہوا جبکہ دارالعلوم سے متعلق اُن معاملات کی وجہ سے جن کا ذکر الفرقان میں آتا رہا ہے، ہمارے ذات البین (باہمی تعلقات) میں وہ خوشگواہی نہیں رہی تھی جو ابتدائے تعلق و تعارف (قریباً ۶۰ سال) سے اب تک چلی آ رہی تھی.... دل میں شدت سے حسرت اُبھرتی ہے کہ کاش ہم ان واقعات سے پہلے ہی دنیا سے اٹھالیے گئے ہوتے۔ یَا لَیْتَنِي مِثُّ قَبْلَ هَذَا وَ كُنْتُ نَسِيبًا مِّنْ سِیَّآ۔

لیکن ہماری موت و حیات کی طرح ہماری زندگی کے افعال و اعمال اور واقعات و احوال بھی ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔ جو ماضی کے لیے مقدر تھا وہ ہو چکا۔ مستقبل کے لیے جو مقدر ہے وہ ہو کے رہے گا۔ ”مَا قَدَرَ اللَّهُ فَسَوْفَ يَكُونُ“ خاص کر دارالعلوم کے ان معاملات میں اپنی طبیعت و مزاج کے خلاف اس عاجز کے ابتلا کی توجیہ اس کے سوا کی نہیں جاسکتی کہ یونہی مقدر تھا، ورنہ میں تو ان واقعات سے بہت پہلے قریباً ۲۰ سال پہلے ایک دفعہ مجلس شوریٰ کی رکنیت سے استعفا دے چکا تھا، اس وقت میرے اساتذہ بھی حیات تھے انھوں نے بھی حکم فرمایا کہ میں استعفیٰ پر اصرار نہ کروں اور رکنیت کا تعلق قائم رکھوں۔ مجھے مان لینا پڑا۔ پھر اس کے بعد بھی کئی بار استعفیٰ کا ارادہ کیا اور اگر اپنی رائے اور دل کے داعیہ پر عمل کر لیتا تو دارالعلوم کے موجودہ نزاعی قضیہ کے سلسلہ میں میرا ذکر بھی نہ آتا مگر میرا ابتلا مقدر ہو چکا تھا، اس لیے ہو کے رہا۔ لَا رَاۤءَ لِمَا قَضَاہُ۔

الفرقان میں کبھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ اب سے قریباً ۱۲-۱۳ سال پہلے دارالعلوم کے بعض حالات و معاملات کی وجہ سے میرے دل میں اس کا شدید داعیہ پیدا ہوا کہ مجلس شوریٰ کی رکنیت سے خاموشی سے استعفا دے کر اپنے کو اس کی ذمہ داریوں اور مسئولیت سے الگ کر لیا جائے۔ لیکن اس دور میں کوئی اہم فیصلہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مقدّمہ کے مشورہ کے بغیر نہیں کرتا تھا، سہارنپور اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورت حال عرض کی۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مولوی صاحب جو کچھ تم نے بتلایا مجھے اُس

سے زیادہ معلوم ہے۔ لیکن میری رائے استغفے کی نہیں ہے۔ میرے نزدیک تمہارا مجلس شوریٰ میں رہنا دارالعلوم کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ البتہ جس بات کو تم صحیح نہ سمجھو صفائی سے اس کے بارہ میں اپنی رائے ظاہر کر دو، نہ مانی جائے تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں! میں نے حضرت شیخ کے فرمانے کے مطابق استغفے کا ارادہ اُس وقت ترک کر دیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد پھر کسی معاملہ پر استغفے کا تقاضا دل میں پیدا ہوا پھر میں نے حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کیا، حضرت نے اب کے بھی وہی فرمایا۔

آخری دفعہ اجلاس صد سالہ کے بعض خاص واقعات اور محرمات کی بنا پر بہت ہی شدت سے استغفے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا، اس وقت حضرت شیخ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا، میں نے مفصل عریضہ لکھا، شیخ کا جواب آیا کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ اور حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ اہم معاملات میں سات دن متواتر استخارہ کے لئے فرمایا کرتے تھے۔ اب میرا مشورہ ہے کہ آپ سات دن متواتر استخارہ مسنونہ کریں اور اپنے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیں۔ اس کے بعد جو بھی رجحان ہو اس پر عمل کر لیا جائے۔ اکابر نے لکھا ہے کہ استخارہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی رائے اور اپنے اندرونی داعیہ کو بالکل فنا کر کے استخارہ کیا جائے۔ لیکن میرے دل میں اس وقت استغفے کا ایسا شدید تقاضا اور داعیہ تھا کہ میں اس کے فنا کرنے پر قادر نہیں تھا، اس لئے وہ سات روزہ استخارہ نہیں کیا جا سکا اور میں اُس وقت کا منتظر رہا جب اپنی رائے کو فنا کر کے استخارہ کر سکوں۔ اسی حال میں دن گزر رہے تھے کہ ہماری اور پوری جماعت کی بد قسمتی سے دارالعلوم سے متعلق نامبارک واقعات کا وہ افسوسناک سلسلہ شروع ہو گیا جس کے بارہ میں حسب ضرورت الفرقان میں لکھا جاتا رہا ہے۔ اور مجلس شوریٰ کے رکن ہونے کی حیثیت سے میں نے جو اپنی ذمہ داری سمجھی اسی کو ادا کرنے کی کوشش کی۔ ہم میں سے کوئی بھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ راقم سطور اتنا ہی عرض کر سکتا ہے کہ ضمیر اس پر مطمئن ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اپنے نزدیک دارالعلوم کا حق اور اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ اس کے باوجود مَا أَطْرَيْتُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَا مَارَةَ ۚ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ط إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ بات بہت طویل ہو گئی، مقصد صرف یہ عرض کرنا تھا کہ ایک دفعہ استغفادیدینے اور اس کے بعد بھی بار بار استغفے کے ارادے اور شدید تقاضے کے باوجود اس اختلاف کے شروع ہو جانے تک استغفادے کر

الگ ہو جانے کی نوبت نہ آنا اور میرا اس میں مبتلا ہونا اس لیے ہوا کہ یہی مقدر ہو چکا تھا۔

صحابہ کرام خاص کر عشرہ مبشرہ میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے مابین جو اختلاف ہوا جو صرف کہنے سننے یا لکھنے لکھانے تک محدود نہیں رہا بلکہ نوبت قتل و قاتل کی آئی، یہاں تک کہ مؤخر الذکر دونوں حضرات اسی میں شہید ہوئے، اس کے بارے میں بھی آخری بات یہی کہی جاسکتی ہے کہ اللہ علیم و حکیم کی طرف سے یہ مقدر ہو چکا تھا اور اس میں بھی یقیناً حکمتیں تھیں، خواہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔

غرض ان سب باتوں کے پیش نظر ہونے کے باوجود اور وہ حدیث پاک بھی حافظہ میں ہونے کے باوجود جس میں حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کا عالم بالا کا وہ مکالمہ ذکر فرمایا گیا ہے جو ایسے مواقع پر موجب تسکین ہو سکتا ہے، جب قاری صاحب کے حادثہ وفات کی خبر سنی تو خاص کر اس احساس کی وجہ سے شدید رنج و قلق ہوا کہ اس کا امکان ختم ہو گیا کہ ہم اس زندگی ہی میں اپنے قلوب اور معاملات کو صاف کر سکیں۔
مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ۔

کئی مہینے پہلے ارادہ کیا تھا کہ قاری صاحب کی خدمت میں ایک مفصل خط لکھوں اور دارالعلوم کے ان معاملات کے سلسلہ میں خلاصہ مشورہ عرض کروں اور ذات الامین کی صفائی کی ایک کوشش کروں۔ اس کے لیے مناسب وقت اور فضا کا اور صحت کے لحاظ سے اُن کی حالت بہتر ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن اللہ کی مشیت جس مناسب وقت کا انتظار تھا وہ بھی نہیں آیا اور خرابی صحت اور ضعف و نقاہت کے بارے میں بھی ایسی اطلاعات ملتی رہیں جن کی وجہ سے وہ خط لکھنا میں نے مناسب نہیں سمجھا اور مناسب و بہتر وقت کا انتظار کرتا رہا۔ اسی حالت میں ایک دن اخبار میں پڑھا کہ تشویشناک علالت کی حالت میں دہلی کے فلاں ہسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں تو اپنی غرض سے بھی ان کی صحت کے لئے دعائیں کیں تاکہ جو کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں عرض کر سکوں۔ کچھ دن کے بعد معلوم ہوا کہ حالت کچھ بہتر ہو گئی ہے اور دہلی سے مکان دیوبند تشریف لے آئے ہیں لیکن ضعف و نقاہت انتہائی درجہ کا ہے تو میں نے طے کیا کہ جو کچھ میں دارالعلوم کے معاملات سے متعلق کہنا چاہتا ہوں وہ تو بہت طویل اور غور طلب ہوگا، اس حالت میں وہ لکھنا مناسب نہیں، البتہ آخرت کے لیے اپنا معاملہ صاف کرنے کے واسطے مختصر عریضہ بلا انتظار اسی وقت لکھ دینا چاہئے۔ چنانچہ ۸/۴ اپریل کو مندرجہ ذیل عریضہ لکھا:

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

معظمیٰ و محترمی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو، عرصہ سے جناب کی خدمت میں عریضہ کے ذریعے کچھ عرض کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن مناسب وقت اور فضا کا انتظار کرتا رہا مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ ایسا وقت اب تک نہ آسکا۔ پچھلے دنوں جناب کی شدید علالت اور علاج کے لئے دہلی کے کسی اسپتال میں داخلہ کی خبر اخبار میں پڑھی تھی تو ارادہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے تو اب کسی وقت کا انتظار کئے بغیر ہی عریضہ لکھوں گا۔ کل ایک صاحب ملے جو حال ہی میں دیوبند گئے تھے انھوں نے جناب کے ضعف و قناعت کا حال بتایا تو اب وہ سب کچھ لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا جو لکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم کے سلسلہ میں بد قسمتی سے جو اختلاف ہمارے درمیان پیدا ہوا جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مجلس شوریٰ کے ایک رکن کی حیثیت سے میرا بھی اس میں حصہ رہا۔ اس سلسلہ میں میں نے جو کچھ لکھا یا عملاً کیا اگرچہ یہ سمجھ کر لکھا یا کیا کہ یہ دارالعلوم اور جماعت کا مجھ پر حق ہے، اور اگر میں نے اس میں کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کرنا پڑے گی۔ تاہم میں بشر ہوں، خطا اور نفس و شیطان کے شر سے محفوظ نہیں ہوں (وَمَا أَتَزَيُّ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ) بالکل ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں جناب کے حق میں مجھ سے تعدی (زیادتی) ہوئی ہو۔ اس کے لئے عاجزانہ طور پر معافی کا طالب و سائل ہوں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ" کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاف اور آخرت کے مواخذہ سے بری فرما کر اس عاجز پر احسان فرمائیں گے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی

(الفرقان اگست ۱۹۸۳ء)

اس مکتوب کی اشاعت پر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی (کراچی پاکستان) کا گرامی نامہ موصول

ہوا تھا اس کے جواب میں جو کچھ حضرت والا نے تحریر فرمایا وہ بھی یہاں قابل ملاحظہ ہے:

بسمہ تعالیٰ

صفر المظفر ۱۴۰۴ھ، مطابق ۱۹۸۴ء

صدیقی الحکرم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۲۲ محرم موصول ہو کر موجب منت و مسرت ہوا، عریضہ کا جواب یا اطلاع رسید نہ ملنے کی وجہ سے خیال ہو گیا تھا کہ شاید وہ ڈاک سے ضائع ہو گیا۔ آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ اب گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ہوا تھا کہ ان دنوں آپ سفر حج میں تھے۔ اب واپسی میرا عریضہ ملاحظہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس حج اور اس سفر کے عمرات اور ان کے سلسلہ کے تمام مناسک و افعال اور دعوات صالحہ کو اپنی شان عالی کے مطابق قبول فرمائے اور آپ کے لیے اور آپ کے اہل تعلق کے لئے مغفرت کا وسیلہ بنائے اور اس کے انوار و برکات آپ کی روح میں اس طرح پیوست فرمادے کہ قبر میں بھی ساتھ جائیں۔

دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں حضرت قاری صاحب کے حیات میں اور ان کے حادثہ وفات کے بعد الفرقان میں جو کچھ لکھا گیا اس کے بارے میں گرامی نامہ سے جناب کی رائے اور تاثر معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا، اور دل کی فکر و تشویش میں کمی ہوئی اور اسی کی وجہ سے دل میں کچھ عرض کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ ورنہ ہائی بلند پریشر کا مریض ہونے کی وجہ سے اب خطوط بہت ہی مختصر لکھتا یا لکھاتا ہوں۔ یہ عریضہ بھی ایک عزیز سے لکھا رہا ہوں۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ جو مقدر تھا وہ ہو چکا، لیکن خاص کر ان کی وفات کے بعد سے دل بہت متاثر ہے اور جب خیال آ جاتا ہے تو رنج اور افسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ درجات بلند فرمائے اور اس سلسلہ میں جو غلطیاں ہم سے یا ان سے ہوئیں اپنی شان کرم سے معاف کر دے۔ اِنَّهُ عَفُوٌّ کَرِیْمٌ۔

مولانا بل انسان علی نفسہ بصیرۃ مجھے اپنے ظاہری و باطنی عیوب و معاصی کا علم ہے جو ایسے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ رحم و کرم کا معاملہ نہ فرمائے تو خیریت نہیں ہے۔ اور قاری صاحب مرحوم مغفور کے تو صرف ان ہی اقدامات کو میں غلط سمجھتا ہوں جو دارالعلوم کے بارے میں عمر کے

آخری دور میں ان کی طرف سے ہوئے، بالخصوص دارالعلوم کے دستور اساسی اور اسکی مجلس شوریٰ کو کالعدم قرار دینے کا اقدام، جو دارالعلوم کے حق میں یقیناً انتہائی درجہ کی خطرناک بات تھی اور ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت اور ان کے عمر بھر کے طرز عمل کے خلاف تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی فطری انتہائی درجہ کی نرم مزاجی اور کبر سنی کی پیدا ہوئی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اس غلط اور ناممکن بات کے لئے ان کو تیار کر لیا، وہ خود تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتے تھے، یہی چیز اس اختلاف اور خلفشار کی بنیاد بنی اور ہم سب اس آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ فی ما بیننا و بین اللہ دل اس پر مطمئن ہے کہ دارالعلوم کو برے انجام سے بچانے کے لئے ہم ارکان شوریٰ نے جو رویہ اختیار کیا وہ صحیح بلکہ ہمارا فرض تھا۔ تاہم بشر ہیں۔ رائے اور فکر کی غلطی سے ہم میں سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔

بہر حال میں تو ان کے صرف اس عمل اور اس سلسلہ کے اقدامات کو غلط سمجھتا ہوں جو رائے اور فکر کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ان کی جن حسنات اور جن کمالات سے واقف ہوں ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں ان کو حفظ قرآن کی دولت عطا فرمائی۔ وہ زندگی بھر ان کا وظیفہ رہا، پھر وہ علم دین کی نعمت عظمیٰ اسے بھی نوازے گئے۔ ہم نے آپ نے ان کو دیکھا وہ شرافت نفس اور خلق حسن کا مجسمہ تھے، ان کے مواعظ حسنہ سے ہزاروں بندگان خدا کو ہدایت ملی ہوگی، نماز روزے کی اور ذکر و تلاوت پھر دوسرے اعمال خیر کی توفیق ہوئی ہوگی، اس سب کے علاوہ خود اپنی تقریباً ۸۰ سال کی مختلف النوع عبادات اور دینی خدمات اور حسنات کا بھی ذخیرہ اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں اور آخرت میں فیصلہ کسی ایک عمل پر نہیں بندہ کے مجموعہ اعمال پر ہوگا۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ اور فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاغِبَةٍ۔

ظاہر ہے کہ انکی ان بیشمار حسنات و خدمات کے مقابلہ میں دارالعلوم کے سلسلہ کی اس غلطی کی کیا حیثیت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا منشور رحمت ہے۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ اس سب کو سامنے رکھ کر قریب بہ یقین امید ہے کہ وہ انشاء اللہ اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ اور فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاغِبَةٍ والے زمرے میں ہوں گے۔

اور اس کے برعکس یہ عاجز اپنے کو رذائل اور معاصی کا مجسمہ ہی دیکھتا اور سمجھتا ہے ہاں اللہ تعالیٰ کا فیصل و کرم ہے کہ اپنی اس حالت کا احساس اور فکر نصیب ہے۔ اور اسی کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق بھی ملتی رہتی ہے۔ اور دعائے ماثور اَللّٰهُمَّ اِنَّ مَغْفِرَتَكَ اَوْسَعُ

مِنْ ذُنُوبِي وَرَحْمَتِكَ أَرْجِي عِنْدِي مِنْ عَمَلِي كُوَ خَاصٌ طُورَ سَ حَسْبِ حَالٍ
 پاتا ہوں اس لئے غرقِ معاصی ہونے کے باوجود ارحم الراحمین کی رحمت کا امیدوار
 ہوں اور جیسا کہ جناب نے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے اس کی بھی امید رکھتا ہوں اور دعا
 کرتا ہوں کہ رب کریم ہم کو ان بندوں میں شامل فرمادے جنکے بارے ارشاد ہوا ہے
 وَ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
 بقلم محمد حسان نعمانی

ساتواں باب

آزادی کے بعد کے ملٹی مسائل و تقاضے

اور آپ کا فکری و عملی کردار

۱۹۴۶ء میں بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پٹانکوٹ میں دارالاسلام نامی بستی کیلئے زمین وقف کرنے والے چودھری نیاز علی صاحب جو تقسیم ہند کے فیصلہ پر پاکستان منتقل ہو چکے تھے، انھوں نے اسی زمانہ میں حضرت صاحب سوانح اور آپ کے رفیق و ہم سفر حضرت مولانا علی میاں صاحب سے مراسلت کے ذریعہ بڑے اصرار سے کوشش فرمائی تھی کہ یہ دونوں بزرگ بھی ہندوستان سے پاکستان بننے والے سرزمین کی طرف ہجرت کر لیں۔ مگر ان بزرگوں نے سوچ سمجھ کر یہی فیصلہ کیا کہ ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جانا ہے کہ ان کی اکثریت نے جن لوگوں کو اپنا لیڈر و پیشوا مانا تھا وہ انھیں حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر پاکستان سدھار گئے ہیں۔ ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت۔۔۔“ میں چودھری صاحب مرحوم کے ذکر پر حاشیہ میں جہاں چودھری صاحب کا کچھ تعارف دیا گیا وہیں اس واقعہ کا ذکر بھی آگیا ہے۔ فرمایا ہے کہ:

”ملک کی تقسیم طے ہونے کے بعد جب پورے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے تخیل کا

فیصلہ ہو گیا تو چودھری صاحب بھی پاکستان منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی انھوں نے جوہر آباد میں دارالاسلام ہی کے طرز پر ایک بستی بنوائی۔ راقم سطور محمد منظور نعمانی اور رفیق محترم مولانا علی میاں کو برابر خطوط لکھتے رہے کہ آپ دونوں کی یہاں ضرورت ہے اور یہاں کام کا میدان ہے۔ میں نے آپ لوگوں کے لئے یہاں پورے انتظامات کر لئے ہیں (یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان سے

مسلمان برابر پاکستان منتقل ہو رہے تھے۔) آخر میں چودھری صاحب نے دقتی خط دے کر ایک آدمی کو بھیجا اور تفصیل سے لکھا کہ آپ کے لئے یہ یہ انتظامات کر لئے گئے ہیں، آپ دونوں مع اہل و عیال چلے آئیں۔ اس آخری خط کے جواب میں اس عاجز نے چودھری صاحب کے اخلاص اور حسن ظن و عنایت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ ’ہم دونوں نے متوکل علی اللہ طے کر لیا ہے کہ جب تک ہندوستان میں کچھ بھی مسلمان ہیں ہم ان کی خدمت کے لئے یہیں رہیں گے۔‘ (— میری رفاقت — اڈیشن ۲۰۰۸ء ص ۲۸)

چودھری صاحب کو دئے گئے اس جواب سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی ہر وہ خدمت ان بزرگوں نے اپنے نغمہ فرض جانی تھی جو ان کے بس میں ہو۔ اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد یہاں مسلمانوں پر مسائل کا گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ اولاً تو جان و مال پر بنی اور پھر ان کی زندگی کا کوئی گوشہ نہ رہا جو آزادی کے لائے اس طوفان سے کم و بیش متاثر نہ ہو رہا ہو اور اہل فکر و ہمت کی توجہ کا طلبگار نہ ہو۔ جان و مال پر جو قیامت ٹوٹی اس کے بارے میں تو وہی مسلم رہنمائی الواقع کچھ کر سکتے تھے جو اپنے سیاسی رشتوں کی راہ سے حکومت وقت پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں تھے۔ مولانا آزاد تھے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب تھے، حضرت مولانا مدنی تھے، مولانا حفظ الرحمن صاحب تھے۔ اور انھوں نے کوئی کسر اس معاملہ میں نہ رکھی۔ حضرت صاحب سوانح اس پوزیشن میں نہیں تھے۔ مگر آپ کو ایک چیز اپنے والد ماجد سے ملی تھی، خطرات سے رو در رو ہونا۔ جس کا پیہم مظاہرہ آپ کی مناظرانہ زندگی میں ہوتا رہا تھا، آپ کے اس موروثی وصف نے ایک راہ بہر حال اس معاملہ میں بھی کچھ کر گزرنے کی بجھائی۔

مسلمانوں کو خوف و ہراس سے نکالنے کا ایک غیر معمولی اقدام!

جان و مال پر ٹوٹی قیامت سے جو ایک عمومی خوف و ہراس کی کیفیت مسلمانوں پر طاری ہو گئی تھی اس کی بابت آپ نے ٹھانی کہ کچھ نہیں تو اسے اپنے ذاتی نمونہ ہی سے چیلنج کر کے اپنی حد تک مسلمانوں کی ڈھارس بندھانے کا کام کریں۔ حالات کا اندھا طوفان اور یہ عزم! لیکن حضرت دادا صاحب سے ملا بے خونی کا کردار نچلا بیٹھنے کو تیار نہیں۔ اس نوعیت کا ایک واقعہ جو الفرقان میں شائع بھی ہو گیا تھا (اور پھر اسی قسم کے چند دوسرے واقعات و تجربات کے ساتھ ”انسانیت زندہ ہے“ نامی ایک کتابچہ میں شامل ہو کر دستیاب ہے)

(۱) غالباً یہ وہ وقت ہے جب حضرت مولانا علی میاں تیلپی سلسلہ میں سفر حجاز میں گئے ہوئے تھے اور آپ ہندوستان میں تھا۔ اس لئے جواب تھا آپ ہی کو دینا تھا۔

سوانح حیات کا جز بننے کا حق رکھتا ہے۔ واقعہ کا عنوان ہے: ”۳۸-۱۹۳۷ کے خونی دور کا ایک سفر“۔ اس عنوان کے ذیل میں آتا ہے:

”ملک کو آزادی ملنے اور ہندوستان و پاکستان میں آزاد قومی حکومتیں قائم ہو جانے کے ساتھ ہی دونوں طرف فسادات کی وبا پھوٹ پڑی تھی، وہاں بے قصور ہندو اور سکھ، اور یہاں بے گناہ مسلمان اس بیدردی سے مارے کاٹے اور لوٹے جاتے تھے جس کی یاد اتنی مدّت گذر جانے کے بعد آج بھی روح انسانیت کو لرزہ بر اندام کر دیتی ہے، معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں میں سے روح آدمیت بالکل نکل گئی ہے اور ان کے قابلوں میں بھیر ٹیوں، چیتوں، سانپوں اور بچھوؤں کی ردھیں آگئی ہیں، عورتوں اور بچوں اور معصوم بچوں تک کو بے دریغ ذبح کیا جاتا تھا، چلتی ٹرینوں میں سے آدمیوں کو ڈھیلیوں اور پتھروں کی طرح باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں کچھ مدت تو ایسی گزری کہ شمالی ہند کے بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ریل کا سفر بالکل ہی بند رہا اس کے بعد حکومت کی طرف سے یہ انتظام کیا گیا کہ ہر ٹرین میں ایک دو ڈبے مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیے جاتے، ان میں صرف مسلمان سوار ہوتے اور ان کی حفاظت کے لیے مسلح پولیس کا ایک دستہ ساتھ ہوتا۔

اسی زمانہ کی بات ہے میں نے لکھنؤ سے سہارنپور اور دیوبند جانے کا ارادہ کیا اس وقت کے دستور کے مطابق لکھنؤ اسٹیشن پر مجھے اسی مخصوص ڈبہ میں سواڑ ہونا پڑا، اخبارات اور دوسرے ذرائع سے مجھے یہ بات معلوم تو تھی کہ مسلمان مسافروں کے لیے اس طرح کا خاص انتظام ہے اور ان کو ایک مخصوص ڈبے میں پولیس کی حفاظت میں بیٹھنا پڑتا ہے لیکن اس کے تجربہ کا یہ پہلا موقع تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔ ڈبہ میں مسلمان مسافر اس کی گنجائش سے بہت زیادہ تھے اس لیے وہ کچھ کھینچ بھرا ہوا تھا، میں خاموش بیٹھا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جس آزادی کی جدوجہد میں ہمارا بھی حصہ تھا اور جس کی مد میں ہمارے بزرگوں نے بے حساب قربانیاں دی تھیں، اس کے حاصل ہونے کے بعد آج ہم اس حال میں ہیں کہ سہارنپور تک کا سفر بھی اس بند بٹھڑے میں اور مسلح پولیس کی حفاظت میں کرنے پر مجبور ہیں۔ قدرتی طور پر مجھے اس احساس بڑی تکلیف تھی۔ اور ڈبے کے دوسرے مسلمان جس قسم کی سادہ لوحی کی باتیں ان حالات ہی کے متعلق اس وقت آپس میں کر رہے تھے انہیں سن سن کر میری اس تکلیف میں اور اضافہ ہو رہا تھا، ان کی ان باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ نہ تو ان بے چاروں کو ان حالات کے ذہنی اور ظاہری

اسباب ہی کا کچھ پتہ ہے نہ ان سے نیچے اور نجات پانے کی تدابیر اور جدوجہد کی طرف ان کی کوئی توجہ ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ سے اپنا رابطہ صحیح کرنے اور اس کی مدد حاصل کرنے کی کوئی فکر ہے۔ کچھ دیر کے بعد ہر دوئی اسٹیشن آیا، میں عصر کی نماز پڑھنے کے لیے نیچے پلیٹ فارم پر اترنے لگا، یہ سارے مسلمان بھائی مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں نیچے نہ اتروں، انہیں خطرہ تھا کہ شاید میں نیچے قدم رکھتے ہی مار ڈالا جاؤں گا، میں نے انہیں ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں کسی طرح انہیں نہیں سمجھا سکا، وہ اس پر مصر رہے کہ میں باہر قدم نہ رکھوں بلکہ ان میں سے بعض کرم فرماتو غصہ گرمی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے ان کے اس خوف اور اصرار کو دیکھ کر گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر ہی نماز پڑھنا ضروری سمجھا، اور بالآخر میں اتر گیا، پانی کا ٹل دور تھا۔ میں وہاں جا کر پانی لایا اطمینان سے وضو کیا اور پلیٹ فارم پر مصلیٰ بچھا کر نماز شروع کر دی، جیسے ہی نماز سے فارغ ہوا گاڑی چھوٹنے لگی اور میں اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اب میں نے اُن مسافروں سے کہا کہ میں ڈبے کے اندر بھی نماز پڑھ سکتا تھا لیکن صرف آپ لوگوں کا یہ خوف دُور کرنے کے لیے میں نے نیچے اتر کر نماز پڑھنا ضروری سمجھا، آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے پلیٹ فارم پر نماز پڑھی اور دور جا کر ٹل سے پانی لایا اور میرا بال بھی بیکا نہیں ہوا، آپ کو اگر اس ملک میں رہنا ہے تو دلوں سے یہ خوف نکال کر رہئے ورنہ کسی ایسی دنیا میں چلے جائیے جہاں موت آپ کے پاس نہ آ سکے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ اللہ کے بندو! دنیا میں قوموں پر سخت سے سخت وقت آتے ہیں لیکن اگر ان میں حوصلہ ہو اور وہ ان کے مقابلہ میں سوچ سمجھ کر صحیح رویہ اختیار کریں تو حالات بدل جاتے ہیں۔ آپ لوگ حالات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، ان بیوقوفوں اور غلطیوں کو سمجھئے جو پچھلے دنوں میں آپ نے کیں اور آپ کے ناقابت اندیش لیڈروں نے آپ سے کرائیں اور آئندہ کے لیے صحیح طرز عمل اختیار کیجئے، اور اس سب کے ساتھ بلکہ سب سے پہلے سچے مسلمان بن کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح کیجئے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔

بہر حال یہ باتیں اس وقت میں جس طرح کہہ سکتا تھا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے کہلوائیں میں نے ان لوگوں سے کہیں، لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ میری ان باتوں سے انہوں نے کتنا اثر لیا۔

اس کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اب ٹرین جب اگلے اسٹیشن پر رکے گی تو میں مغرب کی نماز بھی نیچے اتر کے پڑھوں گا اور حفاظتی پولیس والے ڈبے کو چھوڑ کر کسی دوسرے عام ڈبے میں بیٹھنے کی کوشش کروں گا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ پولیس کی رائفلوں کی حفاظت میں اس طرح ڈبے میں بند

ہو کر سفر کرنا نہایت ذلت کی بات ہے، اور اگر خدا نخواستہ یہ رواج قائم رہ گیا تو مسلمان اس ملک میں ہمیشہ کے لئے مرعوب اور دہشت زدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ بہر حال اپنے اس احساس اور خیال کے مطابق میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا۔ اب ٹرین شاہجہانپور کے اسٹیشن پر رکی۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا میں اپنے منصوبہ کے مطابق نیچے اترا اور پلیٹ فارم پر مصلیٰ بچھا کر نماز شروع کر دی، مجھے اندازہ تھا کہ پولیس کے سپاہی اپنی ذمہ داری محسوس کر کے کسی دوسرے ڈبہ میں مجھے سوار نہیں ہونے دیں گے اس لیے میں نے طے کر لیا کہ ٹرین کے چھوٹنے تک نماز پڑھتا رہوں گا اور جب ٹرین چل دے گی، تب دوڑ کر کسی دوسرے ڈبہ میں بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، ٹرین جب تک چھوٹ نہیں گئی میں نے نماز ختم نہیں کی اور جب وہ چل دی تو میں تیزی سے دوڑ کر ایک دوسرے ڈبہ میں بیٹھ گیا۔ پیارے محافظ سپاہی چیخنے چلا تے رہے، لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی۔ ایک مسلمان، بلکہ مولوی صورت داڑھی والے مسلمان کو اس طرح عام ڈبہ میں گھستا دیکھ کر اس وقت ڈبہ کے سب مسافروں کو حیرت ہوئی، سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ بعض بھلے آدمی اور شریف ہندو مجھے اس نظر سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بھولا بھٹکا مسلمان یہاں کیسے آگیا، معلوم نہیں اب اس کے ساتھ کوئی کیا کرے گا، میں نے ان کی نگاہوں کو سمجھ کے فوراً کہا اطمینان رکھیے میں بھول اور غلطی سے نہیں آیا ہوں، میں مسلمانوں والے ڈبہ میں تھا بلکہ میرا اسباب اب بھی وہیں ہے، لیکن میرے دل نے کہا کہ یہ بہت غلط ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ساری ٹرین میں انسان نہیں درندے ہیں، میرے دل نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور میں اس بات کو غلط ثابت کرنے ہی کے لیے آیا ہوں، میں سب کو اپنا جیسا آدمی اور شریف انسان سمجھتا ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ میرا عقیدہ اور ایمان ہے کہ میرے پیدا کرنے والے نے جس وقت تک کے لیے میرا دنیا میں زندہ رہنا طے کر دیا ہے اس وقت تک کوئی میری زندگی ختم نہیں کر سکتا اور جس گھڑی کے لیے میری موت لکھ دی گئی ہے اس گھڑی مجھے کوئی موت سے بچا نہیں سکتا۔ اس لیے میں خوب سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر آیا ہوں۔ میں نے یہ بات ڈبہ میں داخل ہونے کے بعد کھڑے کھڑے کہی تھی، بیٹھنے کے لیے کوئی خالی جگہ میری نگاہ میں تھی بھی نہیں، لیکن میری اس بات کا سب پر اتنا غیر معمولی اثر پڑا کہ قریب قریب ہر شخص مجھے اپنے پاس بٹھانے کے لیے جگہ نکالنے لگا، ان میں سے میں نے ایک بوڑھے میاں کو ترجیح دی اور ان ہی کے برابر بیٹھ گیا، اس کے بعد ان میں سے ہر شخص اس وقت کی فسادی فضا اور

انسانیت کشی کے خلاف اپنے اپنے انداز میں نفرت کا اظہار کرنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد بریلی کا اسٹیشن آیا، شاہجہانپور کے اسٹیشن پر محافظ پولیس کے سپاہیوں نے دیکھ لیا تھا کہ میں کس ڈبہ میں سوار ہوں۔ بریلی اسٹیشن پر جیسے ہی ٹرین رکی ان میں کے ایک صاحب گھبرائے ہوئے اور ساتھ ہی غصہ میں بھرے ہوئے آئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ہمیں پریشان کر دیا، ہماری ڈیوٹی ہے اور ہم آپ کے ذمہ دار ہیں، میں نے ان سے کہا کہ دیکھ لیجئے کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور اطمینان رکھیے کہ انشاء اللہ خیریت سے رہوں گا، اس کے باوجود انہوں نے چاہا کہ میں اس ڈبہ میں چل کر بیٹھوں لیکن اس ڈبہ کے سارے ہندو سکھ مسافروں نے کہا کہ یہ ہرگز نہیں جائیں گے، بلکہ ان سپاہی صاحب کے ساتھ جا کر ایک صاحب میرا اسباب بھی وہاں سے اٹھا لائے۔ اس تجربہ کے بعد میرا جی چاہتا تھا کہ ہر اسٹیشن پر ڈبہ بدلوں اور اسی طرح نئے ڈبہ میں سوار ہوں لیکن اس ڈبہ کے مسافروں نے اصرار کیا کہ میں سہارنپور تک انہیں کے ساتھ رہوں۔ ان کے خلوص و محبت کا احترام کرتے ہوئے نیز یہ خیال کر کے کہ اب مسافروں کے سونے کا وقت آ گیا ہے، میں نے بھی یہی فیصلہ کر لیا اور رات کے تین بجے کے قریب سہارنپور ہی جا کر اس ڈبہ سے اتر ا۔

پنجاب میل سے رات کے تین بجے کے قریب سہارنپور اسٹیشن پر اتر کے میں صبح تک وہیں ڈیننگ روم میں رہا۔ جس ٹرین سے مجھے دیوبند جانا تھا وہ صبح کو پنجاب سے آ کر دہلی جاتی تھی، اپنے وقت پر وہ آگئی، اس زمانہ میں جو ٹرینیں پنجاب کی طرف سے آتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر پاکستان کے مغربی صوبوں فرنیئر، سندھ اور مغربی پنجاب سے نکلے ہوئے ہندو اور سکھ ہوتے تھے اور بہت سے ان میں ایسے بھی ہوتے تھے جن کے عزیز اُن کے سامنے دُج کیے گئے تھے، بلکہ خاصی تعداد زخموں کی بھی ہوتی تھی۔ اس لیے ان کے دل مسلمانوں کے خلاف غصہ اور نفرت سے بھرے ہوئے ہوتے تھے، اس وجہ سے ان ٹرینوں میں اس کی زیادہ پابندی تھی کہ مسلمان خاص اسی ڈبہ میں سفر کریں جو ان کے لیے مخصوص ہوتا تھا اور جس کے ساتھ مسلح پولیس کا محافظ دستہ ہوتا تھا، میں اس صورت حال سے واقف تھا اس کے باوجود سوچ سمجھ کر میں نے یہی طے کیا کہ یہاں بھی کسی عام ڈبہ میں بیٹھنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے یاد ہے کہ فیصلہ کے لیے اپنے کو بہت کچھ سمجھانا پڑا تھا۔ اور قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نے اپنے کو یاد دلائی تھیں۔

بہر حال میں نے طے کیا کہ جب ٹرین چل پڑے گی تو میں دوڑ کر کسی عام ڈبے میں سوار ہو جاؤں گا۔

چنانچہ ایسا ہی کیا، وینٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے ٹرین کے چھوٹے کانٹار کرتا رہا۔ جیسے ہی آخری سیٹی دے کر ٹرین روانہ ہوئی میں دوڑ کر ایک ڈبہ میں گھس گیا، اس ڈبہ میں سخت رش تھا اس لیے مجھے کھڑا ہو جانا پڑا، میں نے محسوس کیا کہ کچھ مسافروں نے تو مجھے صرف حیرت کی نگاہ سے دیکھ اور کچھ نے سخت غصہ بھری نگاہوں سے۔ اس ڈبہ میں زیادہ تر پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ ہی تھے بلکہ ہندو زیادہ تھے سکھ صرف چار پانچ ہی ہوں گے دو ہی چار منٹ گزرے ہوں گے کہ اوپر کی سیٹ پر لیٹے ہوئے ایک شخص نے مجھے دیکھ کر چلانا شروع کیا کہ یہ مسلمان یہاں اس طرح پھرتے ہیں اور پاکستان میں ہمارے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ مجھے اس کے الفاظ اچھی طرح یاد نہیں، مطلب یہی تھا۔ زبان آدمی پنجابی اور آدمی اردو سی تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ایک بے چارہ زخمی ہندو تھا اس کے زخم پر کئی جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اس کے اس فریادی نعرہ نے اکثر مسافروں کو میرے خلاف مشتعل کر دیا اور فضا ایسی بن گئی کہ میں محسوس کرنے لگا کہ شاید میرے لیے وقت موعود آ گیا، ڈبہ کی فضا جیسے ہی میرے خلاف مشتعل ہوئی اور بعض مسافروں نے میری طرف بڑھنا چاہا، ادھیڑ عمر کے دو سکھ مسافروں نے جو مجھ سے قریب ہی ایک سیٹ کے کنارہ بیٹھے ہوئے تھے، میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے بیچ میں بٹھالیا اور اپنی کربانوں پر ہاتھ رکھ کے بڑی زور کے ساتھ میری طرف بڑھنے والوں کو ڈانٹا اور کہا خبردار اگر کسی نے ان پر ہاتھ اٹھایا تو ہم اس کی جان لے لیں گے اور اپنی جان دے دیں گے، تم میں ہمت ہو تو جا کر ان سے بدلہ لو جنہوں نے تمہیں ستایا ہے، انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ تھا، ورنہ اس وقت کی عام ہوا یہ تھی اور یہی سنا اور سمجھا جاتا تھا کہ مسلم دشمنی میں اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی مار کاٹ میں سکھوں کا درجہ ہندوؤں سے بڑھا ہوا ہے۔ بہر حال جب ان دو سکھ بھائیوں نے گرج کر یہ بات کہی اور مجھے اپنے بیچ میں بٹھالیا جو دو تین آدمی کسی بُری نیت سے میری طرف بڑھنا چاہتے تھے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور تھوری دیر کے لیے ڈبہ میں سکوت کی سی فضا ہو گئی، اس وقت میں نے اوپر کی سیٹ پر لیٹے ہوئے اس زخمی مسافر کو مخاطب کر کے کہا میرے بھائی! تم ستائے ہوئے ہو تمہیں بے قصور زخمی کیا گیا ہے، تمہارا غصہ برحق ہے لیکن یہ سوچو کہ وہاں کے ظلم کا بدلہ یہاں کے مسلمانوں سے لیا جائے اور یہاں کے ظلم کا بدلہ وہاں کے بے قصور ہندوؤں اور سکھوں سے لیا جائے اور یہ شیطانی چکر اسی طرح چلتا رہے تو ہم سب کا اور دونوں ملکوں کا انجام کیا ہوگا، اسی پاگل پن نے دونوں طرف کے لاکھوں گھر اجاڑ دیے۔ اب تو

ہمیں عقل آجانی چاہئے۔ اس کے بعد میں نے عام مسافروں کی طرف مخاطب ہو کر کہا میں کسی بھول چوک سے اس ڈبہ میں نہیں آیا بلکہ جان بوجھ کے آیا ہوں اور اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ میرے پیدا کرنے والے نے میری موت کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے اس سے پہلے کوئی مجھے مار نہیں سکتا، اور اس کے آجانے پر کوئی مجھے موت سے بچا نہیں سکتا، یہ میرا ایمان ہے، اور آپ لوگ بھی شاید ایسا ہی سمجھتے ہوں گے پھر ان دونوں سکھ بھائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا نہ میں انہیں جانتا ہوں، نہ یہ مجھے جانتے ہوں گے، چونکہ میرا وقت ابھی نہیں آیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو میری حمایت اور حفاظت کے لیے کھڑا کر دیا۔ ڈبہ میں بادامی رنگ کے کھدر کا کرتا پہنے اور کھدر کی گاندھی کیپ اوڑھے ہوئے ایک بابو جی بھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے، میری اس گفتگو کے بعد انہوں نے بھی انتقام کے شیطانی چکر اور فسادات کے خلاف اچھے انداز میں کچھ باتیں کیں، یہ غالباً کوئی لیڈر قسم کے آدمی تھے، معلوم ہوتا تھا ان کو تقریر کرنے کی عادت ہے، لیکن ان صاحب نے اس اپڈیش کی ہمت اس وقت کی جبکہ ڈبہ کی فضا میں سکون پیدا ہو گیا۔ یہ ٹرین سہارنپور اور دیوبند کے درمیان کسی اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی آدھ گھنٹہ میں دیوبند کا اسٹیشن آ گیا اور میں اتر گیا۔“

دیوبند سے دہلی

دو تین دن دیوبند رہنے کے بعد میرا پروگرام دہلی جانے کا تھا، مجھے اب یاد نہیں کہ دہلی تک کا یہ سفر میں نے مسلمانوں والے خاص ڈبہ میں کیا تھا یا کسی عام ڈبہ میں۔ بہر حال اپنے پروگرام کے مطابق دیوبند سے میں دہلی گیا۔ اس وقت تک دہلی میں مسلمان اپنے خاص علاقوں اور محلوں کے سوا دوسرے محلوں اور بازاروں میں آزادی سے نہیں چل پھر سکتے تھے، مجھے اسٹیشن سے گلی قاسم جان جمعیۃ علماء کے دفتر میں جانا تھا، میں نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ میں اسٹیشن سے سیدھے راستہ چاندنی چوک اور بلی ماران ہوتا ہوا گلی قاسم جان تک پیدل ہی جاؤں گا، میرا خیال تھا کہ اب حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کو ان بازاروں میں چلنا پھرنا چاہئے، میں سمجھتا تھا کہ یہ بات اسی طرح کھلے گی کہ کچھ لوگ اللہ پر بھروسہ کر کے اور ہمت کر کے چلنا پھرنا شروع کر دیں، میں نے اسٹیشن سے باہر آ کر اپنے اس خیال کے مطابق سامان گلی قاسم جان تک لے چلنے کے لیے ایک مزدور سے بات کی، اور سامان اس کے سر پر رکھ کر چلنے لگا۔ گھوڑا تانگہ والے چند مسلمان اپنے تانگوں کے ساتھ اسٹیشن کے اڈے پر موجود تھے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ

کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا گلی قاسم جان، انہوں نے کہا تا نگہ میں سوار ہو جائیے ہم پہونچا دیں گے، میں نے کہا میں پیدل ہی جانا چاہتا ہوں، وہ سمجھے کہ میں حالات سے ناواقف ہوں اور اسی نادانگی کی وجہ سے پیدل جانے کا ارادہ کر رہا ہوں، اس لیے ازراہ ہمدردی انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ راستہ اس قابل نہیں ہے کہ کوئی مسلمان ادھر سے پیدل جائے، میں نے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے کہا کہ مجھے یہ بات معلوم ہے۔ مگر مجھے پیدل ہی جانا ہے، انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ ان بچاروں نے سمجھا کہ یا تو میرے پاس کرایہ کے پیسے نہیں یا پھر خرچ کرنا نہیں چاہتا، اس لیے ان میں سے ایک نے کہا تم پیسوں کا خیال نہ کرو جودل میں آئے دے دیجو لیکن خدا کے لیے تا نگہ میں بیٹھ جاؤ، میں نے کہا میرے بھائی پیسوں کی بات نہیں ہے، اللہ نے خوب پیسے دیئے ہیں اور خرچ بھی کرتا ہوں، لیکن مجھے اس وقت پیدل ہی جانا ہے، اور چاندنی چوک سے ہی نکل کر جانا ہے، ان میں سے ایک بوڑھا تا نگہ بان جس کو میرے ساتھ واقعتاً بڑی ہمدردی تھی بگڑ بولا ارے ملا جی! ہم جانتے ہیں تم لوگ بڑے خسیس ہوتے ہو تم سے پیسہ نہیں خرچ کیا جاتا تم ایک پیسہ مت دیجو! آؤ میرے تا نگہ میں بیٹھ جاؤ میں تمہیں پہونچا دوں گا۔ جب اس کے بعد بھی میں نے اس بے چارہ کی بات نہیں مانی اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے کر آگے بڑھنے لگا تو وہ خفا ہو کر بولا، اچھا جب تیری موت ہی نے دھکا دیا ہے تو ہم کیا کریں۔ میں نے اس بے چارہ کی ہمدردی کا پھر شکریہ ادا کیا اور مزدور کے سر پر سامان رکھ کر پیدل چل دیا۔ چند فرلانگ کا یہ راستہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی جس کیفیت کے ساتھ طے کیا شاید ہی عمر میں کبھی وہ کیفیت نصیب ہوئی ہو، کپنی باغ کی اندرونی سڑک سے نکل کر چاندنی چوک سے گزرا، میں نے محسوس کیا کہ لوگوں نے میرے اس طرح گزرنے کو تعجب سے تو دیکھا لیکن نہ کوئی ناگوار بات میرے کانوں نے سنی اور نہ کسی کی نگاہ بری دیکھی۔۔۔۔۔ بہر حال میں بلی ماران سے گزرتا ہوا گلی قاسم جان جمعیت علماء کے دفتر پہونچ گیا دہلی میں مجھے دو تین دن قیام کرنا تھا، جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو سفر کے لیے وہ گاڑی تجویز کی جو صبح سویرے دہلی سے چلتی تھی، اب پھر میں نے یہ طے کیا کہ اسٹیشن تک پیدل ہی جاؤں گا، فجر کی نماز پڑھ کے سامان کے واسطے مزدور تلاش کرنے کے لیے میں باہر نکلا، گلی قاسم جان اور بلی ماران میں اس وقت کوئی مزدور نہیں مل سکا اس لیے چاندنی چوک جانا پڑا۔ وہاں پہونچ کر سرحدی پٹھانوں کا لباس شلوار اور قمیص پہنے اور سر پر پٹھانوں والی پگڑی باندھے دونو جوان نظر پڑے جنہیں اس وقت چاندنی چوک میں دیکھ کر حیرت بھی ہوئی کہ یہ پٹھان اس زمانہ میں دہلی میں کیوں اور چاندنی چوک میں کیسے کھڑے ہیں، جہاں

کوئی مسلمان قدم نہیں رکھتا، لیکن ان سے بات کرنے کے بعد جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ بے چارے ضلع پشاور کے کسی گاؤں کے رہنے والے مصیبت زدہ ہندو ہیں، جو آٹھ دس دن پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں، اور بڑے پریشان حال ہیں کیونکہ میں ان کو جو راشن ملتا ہے اس سے وہ ایک وقت بھی پیٹ نہیں بھر سکتے، میں نے ان سے کہا کہ مجھے اسٹیشن جانا ہے گلی قاسم جان میں میرا تھوڑا سامان ہے اس کے لیے مجھے مزدور کی ضرورت ہے، انہوں نے کہا چلئے ہم پہونچا دیں، میں نے ان سے مزدوری ٹھہرائی چاہی انہوں نے کہا آپ جو چاہیں دیدیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ میں نے کہا میرا سامان تھوڑا سا ہے مجھے بس ایک آدمی کی ضرورت ہے، آپ دونوں میں سے کوئی میرے ساتھ چلے، انہوں نے کہا کہ ناجی ہم دونوں ساتھ ہی رہتے ہیں، اس لیے ساتھ ہی چلیں گے۔ میں نے کہا تمہاری مرضی! میں انہیں لے کر جمعیت کے دفتر آیا اور یہاں سے سامان لے کر اسٹیشن چل دیا۔ راستہ میں ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے ان کے حالات پوچھے، ان میں سے جو نو جوان میرا سامان سر پر اٹھائے ہوئے تھا اس نے مجھے بتایا ہم دونوں ایک گاؤں کے ہیں، میں تو ایک غریب گھر کا ہوں لیکن میرا یہ ساتھی بڑے مالدار کا بیٹا ہے۔ مگر اب ہم دونوں یہاں ایک ہی حال میں ہیں، یہ کوئی محنت نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں ساتھ ہی رہتے ہیں، میں کچھ محنت مزدوری کر لیتا ہوں اس سے ہم دونوں کچھ اپنا گزارہ کر لیتے ہیں، اس نے کہا مجھے اپنی تکلیف کا کچھ خیال نہیں ہے۔ اس کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی، اس گفتگو میں اس نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے گاؤں کے مسلمانوں نے ہمارا بڑا ساتھ دیا، جب پولیس والے ہمیں اپنے گھروں سے نکالنے آئے تو انہوں نے ہمیں نکلنے نہیں دیا اور پولیس کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے، پھر جب ایک رات کو فوجی موٹریں لیکر فوج کے سپاہی آئے تو وہ مجبور ہو گئے اور ہم نے بھی ان سے کہا کہ اب ہمیں جانے دو، جب ہم چلے ہیں تو گاؤں کے سارے مسلمانوں کو ہم نے روتا چھوڑا ہے، اس نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکے کے باپ راستہ میں پنجاب کے کسی مقام پر قتل کر دیے گئے۔ اب اس نے مجھے اور میں نے اسے بھائی بنالیا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میرا دل بہت رویا اور آنکھوں نے آنسو بہائے مجھے بہت افسوس ہوا کہ اس وقت میرے پاس ان کی خدمت کرنے کے لیے کوئی بڑی رقم نہیں تھی، بہر حال جو کچھ میرے پاس کرایہ سے زیادہ تھا وہ ان دونوں کو پیش کر دیا۔“

کچھ دوسرے سنگین مسائل کا ایک نیا دور

تقسیم ہند کے بعد کا یہ خونی دور جب گزر گیا اور ملک کی زندگی معمول پر آگئی تو مسلمانوں نے دیکھا کہ کچھ دوسرے مسائل کا سامنا ہے۔

اولین مسئلہ۔ ارتداد!

ان مسائل میں اولین مسئلہ ارتداد کا (اسلام چھوڑ کر ہندو بن جانے کا) تھا۔ بعض علاقوں کے دور دراز دیہاتوں میں بے بہت سے ایسے مسلمان جو اپنے دین سے بالکل بے خبر بس نام ہی کو مسلمان تھے آزادی کے خونی دور کے دنوں میں اسلام دشمن ہندو تنظیموں کے دباؤ میں اسلام کا نام بھی جان بچانے کی خاطر چھوڑ بیٹھے تھے، ان کو واپس لانا ایک بڑا اہم فریضہ تھا۔ اس میدان میں کھلے طور پر کام تو مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے فی الجملہ تعاون ہی سے ہو سکتا اور اسے حاصل کرنے کی پوزیشن میں جمعیتہ العلماء ہند جیسی مسلم تنظیمیں ہی تھیں جنہوں نے تقسیم ہند کے نظریہ کے خلاف کھلی لڑائی لڑی تھی۔ تاہم تبلیغی تحریک کے ماتحت نکلنے والی جماعتوں کے لئے بھی اس محاذ پر کام کرنے کی گنجائش تھی، کہ ان کا تو کام ہی مسلمانوں میں دین کو زندہ و تازہ کرنا تھا، بلکہ ان کی تو ابتدا ہی میوات کے ارتداد زدہ مسلمانوں میں کام سے ہوئی تھی، پس بغیر اس مسئلہ کو عنوان بنائے، وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں بھی اپنا حصہ ڈال سکتی تھیں اور اس نے ڈالا۔ تبلیغی جماعت اپنے کام کی تشہیر بالکل نہیں پسند کرتی۔ ورنہ اگر مرکز نظام الدین دہلی سے اس دور کے کام کی کچھ تفصیل حاصل کر کے یہاں دی جاسکتی تو پتہ چلتا کہ اس سلسلہ میں اس جماعت کے کام کا حصہ کتنا بڑا رہا۔ حال (۲۰۱۲ء) ہی میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا سفرنامہ ”سفر در سفر“ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو کچھ بات یہ ہے کہ راقم السطور بھی زندگی میں پہلی مرتبہ تبلیغی جماعت کے کام کے اس درجہ کی افادیت کا قائل ہوا جس کا کوئی مثیل و عدیل بلاشبہ پوری اسلامی دنیا میں نہیں ملے گا۔ مولانا کے اس سفرنامہ کا بڑا حصہ کمیونسٹ راج سے آزاد ہونے والی وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے سفر کی سرگزشت پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے کمیونسٹ راج نے ان مسلم ریاستوں میں اسلام کا نام و نشان تک اپنی دانست میں مٹا دیا تھا۔ مگر مولانا نے ان تمام ریاستوں کے اس ہمہ گیر دورہ میں بڑی حیرت و مسرت کے ساتھ دیکھا کہ، ہر جگہ تبلیغی جماعت کا کار

احیاء اسلام اپنے آثار و نشانات قائم کر چکا ہے۔ اللہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ اور ان کے اخلاف و اعوان کی قبروں کو نور سے بھرے۔ اور ان کے چھوڑے کام کا اپنے ان اصولوں پر رہنا آپسان کرے جس کی انھیں بڑی فکر رہی تھی۔

دوسرا مسئلہ: بچوں کی اسکولی تعلیم

دوسرا سنگین اور دور رس مسئلہ مسلم بچوں کی اسکولی تعلیم کا تھا۔ ملک کے لئے سیکولر آئین کی منظوری کے باوجود صوبائی حکومتیں بالخصوص شمالی ہند کی صوبائی حکومتیں سرکاری اسکولوں میں ایسا نصاب جاری کر رہی تھیں جس میں ہندوویت بھری ہوئی تھی۔ اور تعلیم لازمی اور جبری تھی۔ یہ میدان تبلیغی تحریک کے نظام کار سے دور کا تھا۔ اس تحریک کے نظام عمل میں محدود رہتے ہوئے اس محاذ سے متعلق مسلمانوں کی خدمت کا فریضہ ادا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پس جیسے ہی یہ مسئلہ علم میں آیا حضرت صاحب سوانح کو کوئی تکلف اس میں نہ ہوا کہ اس کو بھی اس کی اہمیت کے مطابق اپنے میدان عمل میں جگہ دین۔ تحدیثِ نعمت میں اس کے حوالہ سے آتا ہے:

”۱۹۳۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لئے جو

مسائل پیدا ہوئے ان میں ایک نہایت سنگین مسئلہ یہ بھی تھا کہ ایک طرف تو تعلیم لازمی کی جارہی

تھی جس کے مطابق ہر بچے کو سرکاری اسکول یا سرکار سے منظور شدہ اسکول میں داخل ہو کر پڑھنا

لازمی تھا، دوسری طرف اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی تھی اور پھر جو کچھ پڑھایا جا رہا تھا اس میں ہندو دیو

مالا خوب خوب شامل کی گئی تھی جس کی بنیاد سر اسر شرک اور توہم پرستی پر تھی۔ اس صورت حال نے

ان تمام مسلمانوں کو بچپن کر دیا تھا جو اس کے نتائج کا اندازہ کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت

کرے قاضی عدیل احمد عباسی ایڈوکیٹ (متوفی ۱۹۸۰ء) کو کہ انھوں نے اس خطرناک صورت

حال سے بچنے کے لئے ایک عملی اسکیم تیار کر کے اپنے ضلع بستی (یوپی) میں اس کے مطابق کام

شروع کر دیا۔ اسکیم یہ تھی کہ جہاں بھی مسلم آبادی ہے وہاں ابتدائی تعلیم کے اپنے کتب قائم کئے

جائیں، جن میں خصوصیت سے قرآن مجید ناظرہ اور اردو زبان میں دینیات کی تعلیم ہو اور ضروری

حد تک پرائمری درجات کے دیگر مضامین، حساب اور تاریخ وغیرہ کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا

جائے۔ اور ان مکاتب کے مصارف کی ذمہ داری بستی کے مسلمان اپنے اوپر بالکل اس طرح

لے لیں جس طرح اپنے بچوں کی شادی بیاہ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب

نے ایک بہت سہل العمل متعین طریق کار کی تجویز بھی رکھی اور اپنے علاقے میں اس کا کامیاب

تجربہ بھی کیا۔ جس سے ان کے مکاتب ایک طرح سے خود کفیل ہوئے۔ وہ تجویز یہ تھی (جس میں

خاص طور سے دیہات کے مسلمانوں کو سامنے رکھا گیا تھا) کہ ہر گھر میں ایک برتن رکھ دیا جائے اور جس وقت بھی روٹی پکانے کے لئے آٹا نکالا جائے ایک چٹکی آٹا اس مکتب کے برتن میں ڈال دیا جائے۔ اور اسی طرح کھلیان کے زمانے میں کھلیان سے تھوڑا سا غلہ مکتب کے لئے نکال دینے کی تجویز رکھی۔ اور اسکو کھلیانی کا نام دیا۔ مرحوم قاضی صاحب نے یہ کام لگ بھگ ۱۵۷ء میں شروع کیا تھا، ۵۳ء یا ۵۴ء میں انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے شہر بستی میں ایک جلسہ کیا۔ اس میں شرکت کے لئے مجھے بھی مدعو کیا۔ میں ان کی اس مکتبی تحریک کے بارے میں کچھ سن چکا تھا۔ لیکن پوری بات سامنے نہیں آئی تھی۔ بستی کے اس جلسہ میں جس میں ان کی دعوت پر شریک ہوا تھا قاضی صاحب نے اس کام کی اہمیت و ضرورت اور اس کے طریقہ کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اور جو مکتب قائم ہو چکے تھے ان کا کچھ حال بیان کیا۔ میرے سامنے اب پوری بات آئی۔ جس سے میں متاثر ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ ملک کے موجودہ حالات میں یہ ہماری نئی نسل کے دین کی حفاظت کا انتظام ہے۔ اور اللہ کی طرف سے قاضی صاحب کو خاص طور پر اس کی توفیق دی گئی ہے۔ وہ ایک مرد مخلص تھے۔ ان کی زندگی میں قوم و ملت کی خدمت کو ابتدائے عمر ہی سے نہایت اہم جگہ حاصل رہی۔ اپنے ضلع کے وہ کانگریسی لیڈروں میں تھے۔ کافی دنوں تک یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ اور اس طرح ان معاملات سے واقفیت کے ان کو زیادہ مواقع حاصل تھے جن کا تعلق سرکاری محکموں اور سرکاری اسکیموں سے تھا۔ غالباً اسی چیز نے ان کو مکتب کی اس طرح کی تحریک کی طرف متوجہ کیا۔

بہر حال جلسہ کے بعد اگلے دن جب اطمینان سے گفتگو کا موقع ملا تو میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اس کام کے دائرہ کو وسیع کریں۔ اور فی الحال اگر پورے ملک کو نہیں تو اپنی ریاست اتر پردیش کو اپنا میدان کار بنالیں۔ مگر قاضی صاحب باوجود میرے اصرار کے اس وقت آمادہ نہ ہو سکے۔ اور ان کا کہنا یہ تھا کہ راستہ معلوم ہو گیا ہے اور تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ ہر ضلع کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح کام کریں۔ میں بس اپنے ضلع ہی کو سنبھال سکتا ہوں۔

لکھنؤ واپس آ کر میں نے رفیق محترم مولانا علی میاں سے یہ سب ذکر کیا، تو ہم دونوں نے یہ سوچ کر کہ بظاہر قاضی صاحب کے سامنے مسئلہ یہ ہو گا کہ وہ کام کا دائرہ پھیلا کر اپنا ذریعہ معاش و کالت برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ اس لئے ہم لوگوں نے ان کیلئے ایک انتظام کی فکر کی اور وہ ہو گیا۔ مگر قاضی صاحب اسے قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکے۔ پھر بھی میرا اور علی میاں کا ان سے اصرار جاری رہا کہ وہ یوپی کی سطح تک کام کو پھیلانے پر بہر حال غور کریں۔ اور بالآخر ایک وقت آیا کہ انھوں نے کام کے اس پھیلاؤ کیلئے ہمت کر لی۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ اس سلسلہ

مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچنا اور موجودہ حالات و مسائل میں ان کی ایسی صحیح رہنمائی کرنا جس کی ان کو فی الواقع ضرورت ہے۔ اور مسلسل وہ پیام ان کو دیتا جو موجودہ حالات و مسائل سے نپٹنے کا اہل انھیں بنا سکے۔ ہمارے بہت سے اخبارات نکل رہے ہیں مگر کسی کی یہ واحد اور خاص ہم نہیں ہے کہ مسلمانوں میں ان مسائل اور ان سے نپٹنے کے صحیح طریقہ کار کا شعور اور اس پر پابند رہنے کا حوصلہ اور لگن پیدا کی جائے۔ یہ کمی اور اس کو پورا کرنے کی ضرورت اس گزشتہ عرصہ میں برابر رہ کر محسوس کی جاتی رہی حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ خیال بھی ہوا کہ الفرقان ہی کو ہفتہ وار کی شکل دیدی جائے۔ مگر اس کے حق میں نہ اپنی طبیعت ہی مطمئن ہو سکی نہ دوسرے اہل الرائے نے اس حق میں رائے دی۔ ادھر کے چند مہینوں میں جو خصوصیت سے وہ واقعات اور ان کے نتیجے میں جو حالات رونما ہوئے جن پر دو تین مہینے سے الفرقان میں لکھا جا رہا ہے تو طبیعت اس ضرورت کے لئے انتہائی حد تک بے چین ہوئی۔ کچھ دردمند اور ہوشمند دوستوں سے ذکر کیا جنھوں نے اس ضرورت اور مقصد سے پورا اتفاق کرتے ہوئے اس کام کو گرجوشی کے ساتھ انجام دینے کا بیڑ اٹھالیا۔

چنانچہ ایک ایسے بلند پایہ فتنہ روزہ کا ہر پہلو سے مکمل اور اطمینان بخش خاکہ بنانے کے بعد جو قبول عام کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو اور کم سے کم مسلمانوں کے اکثر طبقات میں وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے سرمایہ کی تحصیل کا کام اور دیگر انتظامات شروع کر دئے گئے ہیں۔ اور امید ہے کہ جلد ہی اس اخبار کے اجرا کا اعلان کیا جاسکے گا۔“

ہفت روزہ ندائے ملت

یہ اخبار مارچ ۱۹۶۲ء میں ”ندائے ملت“ کے نام سے ایک ٹرسٹ (ندائے ملت ٹرسٹ) کے ماتحت جاری ہوا۔ جس کے روح رواں حضرت صاحب سوانح اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے نوجوان مددگار راقم کے دوست ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی مرحوم تھے۔ ادارت راقم سطور کے ذمہ آئی جس کی معاونت ڈاکٹر محمد آصف قدوائی (مرحوم) اور برادرِ مہم حفیظ نعمانی (حفظہ اللہ) کرتے رہے۔ اس اخبار کے ابتدائی چھ (۶) سالہ دور (۶۲ء تا ۶۸ء) نے ہندوستان کی مسلم صحافت کی تاریخ میں جو امتیازی نقش، مولانا آزاد کے الہلال کے بعد، چھوڑا وہ اہل نظر کے یہاں ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس کے پہلے ہی شمارے نے ایک صور سا پھونکا اور پھر ۶۵ء میں جب ملت کی مسلم یونیورسٹی جیسی متاع پر بُرا وقت آیا تو اس کے مسلم

یونیورسٹی نمبر نے ایک ناقابل فراموش تاریخ بنائی۔ اور ادارتی ارکان میں سے حفیظ نعمانی نے دفتر کے دو ساتھیوں (عبدالحلیم صاحب اور عبدالحکیم وارثی) کے ساتھ دس ماہ کی جیل اس پاداش میں بھگتی۔!

مسلمانوں میں سنجیدہ اخبارات چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ خرید کر رسالہ اخبار کم ہی پڑھتے ہیں۔ اس لئے مالیات کا مسئلہ لے بیٹھتا ہے۔ خاص کر جب کہ اخبار سنجیدگی ہی نہیں اسلامی شریعت کے احکام کی پابندی بھی اپنے اوپر عائد کئے ہو۔ پس ایسا اخبار جاری رکھنے کے لئے سرمایہ کے حصول کی مہم بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کام جو آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا، مگر اس اخبار کی خاطر خود کو اس پر بھی راضی کیا اور مرحوم ڈاکٹر محمد اشتیاق صاحب اس مہم میں بڑے جذبہ سے آپ کے معاون رہے۔

اخبار کی فکری بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان احساس کمتری کا شکار ہیں انھیں سب سے پہلے اخلاقی جرأت اور حوصلہ کی خوراک چاہئے اور ثنائی سیاسی شعور کی۔ جرأت اور حوصلہ کی روح پھونک دینے اور احساس کمتری سے نکال دینے میں جو کامیابی ندائے ملت کو ہوئی اسے بلا کسی مبالغہ کے ایک تاریخ ساز درجہ کی چیز کہا جاسکتا ہے۔ البتہ سیاسی شعور کا جہان تک تعلق ہے افسوس کہ اس کا پیدا کرنا آسان ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے لئے سوچ و فکر کا جو غیر جذباتی ماحول چاہئے تھا آزادی سے پہلے کی شدید ہندو مسلم کشمکش کے طبعی اثرات اور آزادی کے بعد کے ناخوشگوار عالم انگیز حالات کے کچوکوں نے عام مسلمانوں کو اس ماحول کی سطح تک بلند ہونے کا موقع اس وقت تک نہیں دیا تھا۔ بلکہ بد قسمتی سے اخبار کے تیسرے ہی سال (جنوری ۱۹۶۴ء میں) ملک کی تین ریاستوں، بہار، اڑیسہ، بنگال کہ آپس میں ملی چار سو میل کی پٹی (Belt) میں اس درجہ کے بھیانک مسلم کش فسادات ہوئے کہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ اور اس سخت مخالف ماحول میں جس شعور اور غیر جذباتیت کی ضرورت تھی اس کے لئے جدوجہد کی کامیابی مشکل تر ہو گئی۔

جنوری ۱۹۶۴ء کے نئے ہوشرُ با فسادات!

یہ فسادات (بلکہ کہئے مسلم کشی) اپنی نوعیت کی بالکل یگانہ ٹھی تھی۔ اسی لئے کہا گیا کہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے تھے۔ اس لئے اس کا تھوڑا سا بیان ضروری ہے، صرف حوالہ دے کر گزر جانا مناسب نہ ہوگا۔ اپنی سرگزشت ”کاروانِ زندگی“ میں حضرت مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

”اس کی سنگینی اور اس میں حصہ لینے والوں کی سفاکی اور سنگدلی کا اندازہ کرنے کے لئے

مسٹر جے پرکاش نارائن کے اس بیان کا ایک اقتباس کافی ہوگا جو ان کے اس خط سے نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور سیاسی جماعتوں کے نام لکھا تھا، وہ لکھتے ہیں:

جہاں تک مظالم کا تعلق ہے میرے خیال میں کوئی حد باقی نہیں رہی، ہر نفرت انگیز اور شرمناک حرکت کی گئی۔ عام طور پر جو کچھ ہوا وہی عبرت ناک تھا، لیکن بعض معاملوں میں تو بے رحمی اور گراؤٹ کا اندازہ کرنا محال ہے۔ ایسی ایسی ہیبت ناک باتیں کی گئی ہیں جن کے بارے میں دہلی یا ملک کو قطعی علم نہیں ہے کہ کس پیمانہ پر کیا ہوا۔۔۔۔۔“

یہ مسٹر جے پرکاش نارائن اس وقت کے بہت مؤثر و معروف اور ایک سینئر سیاسی لیڈر تھے۔ اور انھوں نے جائے وقوعہ کا دورہ کیا تھا۔ ائمہ کافساد جس نے ندائے ملت کا اجراء کرایا، اس سے کہیں کم درجے کی بات تھی۔ پس اس ہیبت ناک المیہ کا جو اثر اور تقاضہ آپ (حضرت صاحب سوانح) کی طبیعت پہ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہے۔ پہلے تو اپنے رفیق و ہمد حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ مل کر انہی جے پرکاش نارائن سے دہلی میں ملے، تاکہ دیکھا جائے کہ وہ اس سنگین معاملہ میں عملاً بھی کچھ کرنے کو سوچتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسے معاملات میں غیر مسلم شخصیتیں ہی کچھ مؤثر ہو سکتی ہیں۔ انہی کا کچھ دباؤ حکومت پر پڑ سکتا ہے۔ انہی کی آواز پر غیر مسلم عوام میں کچھ احساس بیدار ہو سکتا ہے۔ اور پھر معاملات کچھ رو بہ اصلاح ہو سکتے ہیں۔ جے پرکاش صاحب کی رائے ہوئی کہ اچارہ نہ دوبا بھاوے جی سے ملنا، جو گاندھی جی کے جانشین سمجھے جاتے تھے، زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے آپ لوگ ان سے بھی ملیں اور اتفاق سے میں بھی ان کی طرف جانے والا ہوں آپ کی مدد کروں گا۔ چنانچہ ان سے ملنے کے لئے ناگپور کا سفر کیا گیا۔ لیکن افسوس کہ نتیجہ توقع کے خلاف بچد مایوس لگن رہا۔ اس کے بعد حضرت صاحب سوانح نے خود جا کر فساد زدہ علاقے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور مولانا علی میاں صاحب کے دست راست مولانا معین اللہ ندوی (مرحوم) کو ساتھ لے کر اس خطرناک علاقہ کا سفر کیا۔ مولانا کا روانہ زندگی (حصہ اول) میں لکھتے ہیں:

”اپریل کے اواخر یا مئی کے اوائل میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے مولوی معین اللہ صاحب ندوی کی معیت میں جشیہ پور اور راور ڈکیلا کا سفر کیا، انھوں نے واپس آ کر کچھ ایسا تاثر ظاہر کیا کہ ان مقامات میں خود جائے بغیر واقعہ کی سنگینی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے مجھے بھی آمادہ کیا کہ میں بھی وہاں کا ایک سفر کروں کہ ع

شنیدہ کہ بود مانند دیدہ

ساتھ ساتھ ایک انقلابی تخیل تھا۔ دل دماغ نے جب اس سے اتفاق کیا تو اپنی افتا و طبع کے مطابق اسے اوڑھ ہی لیا۔ ڈاکٹر سید محمود جنگ آزادی میں قربانیاں دینے والی پرانی نسل سے تھے۔ اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندو لیڈروں کے شانہ بشانہ رہے تھے۔ اس لئے آزادی کے بعد کی مسلم آزار فضا سے بچد ملول اور متفکر رہنے والے مسلم لیڈروں میں تھے۔ ۶۱ء میں جو بڑے فسادات ہوئے تھے جن کے نتیجہ میں ”ہم لوگوں کو“ ندائے ملت“ نکالنے کا تقاضہ ہوا تھا ڈاکٹر صاحب نے انہی فسادات کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمن صاحب وغیرہ کی معاونت سے ایک بڑا کنونشن ملک کی سیکولر طاقتوں کو فسادات کی سیاست کے خلاف جمع کرنے کے لئے منعقد کیا تھا۔ ۶۳ء کے فساد نے ان کو مسلمانوں کے ایک اتحاد کا خیال دیا جو اس بنیاد پر عمل میں آئے کہ فسادات کے اس شرناک سلسلہ میں صرف مسلمانوں کی تباہی و بربادی ہی قابل توجہ نہیں ہے بلکہ اس میں ملک کی اکثریت کی جو اخلاقی و روحانی بے حسی الم نشرح ہے اس کو بھی قابل توجہ سمجھ کر وہ طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ ہندو عوام تک پہنچا جاسکے اور ان کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاسکے۔“

مولانا علی میاں ”اپنی سرگزشت میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ”ڈاکٹر سید محمود صاحب اس صورت حال سے سب سے زیادہ فکر مند اور مغموم تھے۔ اس سلسلہ میں مجھ سے اور مولانا محمد منظور صاحب سے لکھنؤ میں اور مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا ابواللیث صاحب ندوی اور مولوی محمد مسلم صاحب مدیر دعوت سے (جنہوں نے اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا) دہلی میں ان کا مستقل رابطہ تھا۔ ان مشوروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد سے جلد ایک مسلم مشاورتی اجتماع بلایا جائے جس میں راہ عمل معین کی جائے اور کام شروع کر دیا جائے۔ بعض مصالح کی بنا پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ یہ اجتماع بجائے دہلی کے لکھنؤ میں رکھا جائے۔ میں نے اور مولانا محمد منظور صاحب نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ۸/۹ اگست ۱۹۶۴ء کی تاریخیں اس کے لئے مقرر کی گئیں اور مسلم جماعتوں کے قائدین اور ملت کے ممتاز دانشوروں اور دردمندوں کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔“

مسلم مجلس مشاورت

مسلمانوں کے حوالہ سے جیسے سنگین ترین حالات میں لکھنؤ کے اس اجتماع کے دعوت دی گئی تھی مشکل ہی سے کوئی ہو سکتا تھا کہ شرکت میں تاثر کرے۔ بھرپور نمائندگی ہوئی۔ اور ”مسلم مجلس مشاورت“ کے نام سے

ایک ملک گیر مسلم اتحاد کی بنا پڑی۔ اس اتحاد کا جو مقصد تھا، کہ ملک کی اکثریت کی اخلاقی حس جگائی جائے، اس کے لئے ملک کے اطراف میں مجلس کے وفد کے دورے شروع ہوئے۔ اس عظیم اتحاد پر جس سے، سوائے ایک کے، کوئی نمائندہ حلقہ باہر نہیں رہ گیا تھا مسلمانوں میں ایک غیر معمولی جذبہ اور خود اعتمادی کی کیفیت ہر جگہ نمایاں تھی، بڑے کامیاب جلسے ہوئے۔ غیر مسلموں کی شرکت بھی ان جلسوں میں کہیں کم کہیں زیادہ بہر حال ہوئی۔ بعض جگہ جلسوں کے صدر بھی ہندو حضرات ہوئے، لیکن یہ بڑا نازک مشن تھا، ایک طرف مسلمانوں میں خود اعتمادی اور اتحاد پیدا کرنا تھا تو دوسری طرف یہ پیغام ان کے دلوں میں اُتارنا تھا کہ ملک جس اخلاقی بے حسی کا شکار ہوا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں انسانیت کو رسوا کرنے والی حرکتیں کمزوروں کے ساتھ شب و روز ہو رہی ہیں، مسلمانوں کے لئے ”خیر اُمت“ کی حیثیت سے اس کی فکر بھی لازم ہے۔ اور اس کے لئے وہ طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ ہندو عوام تک پہنچا جاسکے اور ان کی اخلاقی حس کو جگانا ممکن ہو۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ مجلس کے ان دوروں میں مجلس کے اصل مقصد اکثریت میں اخلاقی حس جگانے، پر محض مسلمانوں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر لانے کا جذبہ غالب ہوتا چلا گیا۔ اور پھر ۱۹۷۱ء کا جنرل الیکشن سامنے آنے لگا تو اصل مقصد پہ اور ہی بُرا وقت آ پڑا۔ بلکہ خود اتحاد کو بھی تفرقہ کا گھن لگ گیا۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں فرمایا ہے کہ

”ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خیال واقعی ایک بلند پایہ خیال تھا۔ مگر افسوس کہ یہ فکر و خیال اچھی طرح تجربہ میں نہ آسکا۔ اس کے لئے جس ذہنی صفائی اور جس اسپرٹ کی ضرورت تھی وہ شاید ڈاکٹر صاحب کے سوا ہم میں سے اکثر میں موجود نہ تھی۔ اور اس لئے ہم نے داعی کی اصل بات میں زیادہ دلچسپی کے بغیر محض ”مسلم اتحاد“ سے دلچسپی رکھتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ دو تین سال بعد جو جنرل الیکشن کا زمانہ آ گیا تو ہم سے کتنوں ہی نے اس اتحاد کو اپنے سیاسی خیالات و رجحانات کی سواری بنانے میں بھی تکلف نہ کیا۔ اور نتیجہ میں یہ اتحاد بس ایک نام نہاد اتحاد بن کر رہ گیا۔“

اور افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ ”نام نہاد“ ہی سہی اتحاد رہا تو تھا، لیکن جب پرانے لوگ جو مجلس کے بانیان تھے بالعموم اللہ کو پارے ہو گئے تو لوگوں نے اس نام نہاد ”اتحاد“ کو بھی باقی نہ رہنے دیا۔ اب مدت سے ایک کی جگہ دو مجلس مشاورتیں چل رہی ہیں۔ اور ان میں سے کسی کو ذرا احساس نہیں کہ ”مشاورت“ کے نام پر یہ تفرقہ کا عمل کیسے روا ہے!

مجلس مشاورت کے اس تجربے کا منفی اثر

مسلم مجلس مشاورت کا یہ تجربہ جس کی ابتداء نے تحریک خلافت کے دور کی کچھ یاد تازہ کر دی تھی اپنے الم انگیز انجام سے آپ پر یہ تاثر چھوڑ گیا کہ ”امت میں فی الحال اجتماعی کاموں کی صلاحیت دور دور تک نہیں ہے۔ اور ایسی کوششوں سے دنیا تو کیا سنورتی، اُلے آخرت خطرہ میں پڑتی ہے۔ لوگ تھوڑی دور چلنے کے بعد اجتماعی انداز کی سوچ کی جگہ اپنی اپنی الگ سوچ کی طرف چلنے لگتے ہیں۔ جس سے بدگمانیاں ہوتی ہیں، باہمی چپقلش ہوتی ہے اور بدگوئیاں، جو آدمی کی آخرت کے لئے تباہ کن ہیں۔ اس لئے بس اپنی استطاعت بھر کے انفرادی کام پر ہی قناعت کرنے میں خیر ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے کہ ایسی مخلصانہ اور بے غرضانہ کوششیں اپنے دائرہ اثر کو پھیلاتی ہوئی امت میں ایک عمومی شعور اور بے لاگ خدمت کا مزاج پیدا کر دیں۔“ راقم سطور کا اپنا خیال ہے کہ آپ کے اس تاثر میں آپ کی حساسیت کو بھی دخل تھا۔ غلط قسم کی باتیں بالکل ہی برداشت نہ ہوتی تھیں، اور اجتماعی کاموں میں ایسی باتوں سے مفر نہیں۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہی ماننا پڑے گی، اور روز بروز الم نشرح ہو رہی ہے، کہ امت سے بحیثیت مجموعی اجتماعیت کا وہ شعور ہی جیسے سلب ہو گیا ہے جس سے قرآنی ہدایت ”وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ“ (اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہے۔ الشوری: ۳۸) پر عمل پیدا ہوتا ہے۔ اتحاد بنایا جاتا ہے جو ”وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ“ کا پابند کرتا ہے مگر یہ پابندی نہیں نبھائی جاتی، چنانچہ ایک نئے تفرقہ کا منظر بنتا ہے۔

القصہ، ۶۸ء میں آپ نے اس باہم چپقلش کے ماحول سے نکلنے کے لئے مجلس کی رکنیت سے علیحدگی اختیار فرمائی، خود ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی بدول ہو کر صدارت سے مستعفی ہوئے۔ اور افسوس کہ مجلس مشاورت کے اس اختلاف سے ندائے ملت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، کیونکہ اس کے تقریباً تمام ہی مٹری مشاورت سے بھی وابستہ تھے۔ آپ نے اس سے بھی بے تعلقی اختیار فرمائی۔ اور یہاں ندائے ملت کا دورِ اوّل تمام ہوا، کہ راقم سطور، ڈاکٹر آصف قدوائی اور حفیظ نعمانی وغیرہ ارکانِ ادارت، سب ہی نے علیحدگی کی راہ اپنائی۔ یہ ۶۸ء کی بات ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک

آزادی کے بعد سے جو نئے مسائل مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے ان میں ایک، ان کے شادی

بیاہ اور طلاق و وراثت سے متعلق قانون ”مسلم پرسنل لا“ میں ترمیم و تنسیخ کے لئے اٹھنے والی آوازیں بھی تھیں۔ یہ آوازیں تیز ہوتی گئیں حتیٰ کہ معاملہ سنگین نظر آنے لگا۔ خود آزاد خیال نام نہاد مسلمان ان آوازوں میں اپنی آواز ملانے لگے۔ ۲۷ء کے شروع میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا جلسہ تھا اس میں، ”تحدیدِ نعت“ کے بیان کے مطابق، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی (امیر شریعت بہار و اڑیسہ) مرحوم نے ساتھی ممبران کو توجہ دلائی کہ اس سلسلہ میں کچھ ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے خاص طور سے دہلی میں لائسنسی ٹیوٹ کی طرف سے منعقدہ ایک سیمینار کی کارروائی کا حوالہ دیا۔ شوریٰ نے مسئلہ کی تفصیل معلوم کر کے اسے قابلِ توجہ جانا اور ضروری اقدام کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں دسمبر ۲۷ء میں ایک آل انڈیا ملی کنونشن بمبئی میں منعقد ہوا اور اس کے لئے دعوت اتنی مؤثر ہوئی کہ مسلمانوں کے تمام مسالک و مکاتب فکر کی بھرپور نمائندگی پائی جارہی تھی۔ اس کنونشن میں حضرت مولانا قاری طیب صاحب ”مہتمم دارالعلوم کی صدارت میں“ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ“ کا قیام عمل میں آیا۔

مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے بعد یوں تو ہر رکن ہی اس تحریک کا بھی رکن تھا، پر حضرت صاحب سوانح اُن ارکان میں تھے جنہوں نے اس میں خصوصی دلچسپی لی۔ چنانچہ کنونشن بمبئی میں بلانے کا فیصلہ ہوا تو انتظامی معاملات کو جلد طے کرنے کے لئے دارالعلوم کا ایک محدود سا جو وفد بمبئی گیا اس کے ارکان میں سے ایک آپ بھی تھے۔ تھی تو یہ بھی ایک اجتماعی نوعیت کی تحریک، مگر شورائے دارالعلوم کی طرف سے ہونے کی بنا پر جس کے آپ ارکان میں سے (بلکہ سینئر ترین رکن) تھے، یہ ذرا ایک مختلف نوعیت کا معاملہ تھا۔ یہ ملت کی ایک ایسی دینی ضرورت کی پکار پر دارالعلوم کا اقدام تھا کہ اس کے لئے دارالعلوم سے بہتر کوئی دوسرا ادارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور آپ اس کی شوریٰ کے رکن رکین۔ الحمد للہ کہ دارالعلوم کی یہ تحریک اس قدر کامیاب رہی کہ ملک میں مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی نمائندہ عظیم کا مرتبہ آج تک اس مسلم پرسنل لا بورڈ ہی کو حاصل ہے۔ اور آج دم تحریر تک جبکہ اس بورڈ کی عمر چالیس برس ہونے جا رہی ہے کسی خاص خلفشار کی صورت اس میں، الحمد للہ، رونما نہیں ہوئی ہے، جبکہ وہ پوری نسل تقریباً گزر چکی ہے جس کے ہاتھوں اس کی داغ بیل پڑی تھی۔

آٹھواں باب

(معذوری کا ۲۰ سالہ دور اور اس کے سبق آموز احوال)

گذشتہ باب (۶) میں گزر چکا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں دیوبند کے ایک سفر کے دوران ایک حادثہ میں کوٹھے کی ہڈی کا جوڑ (Hip Joint) کھل گیا، اور پھر علاج معالجہ سے وہ بظاہر اگرچہ درست ہو گیا، لیکن معالجہ میں شاید اندرونی طور پر کوئی کسر رہ گئی جس کے اثرات دو سال بعد (۱۹۷۴ء میں) ایسی شکل میں ظاہر ہوئے کہ چند دن موت و حیات کی کشمکش کی صورت رونما رہی (تفصیل آگے آتی ہے۔) اور پھر یہاں سے ٹانگ کی اُس مستقل معذوری کا آغاز ہو گیا جس کے آخری دس سال صاحبِ فراش ہی رہ کر گزرے، حتیٰ کہ ۱۹۹۱ء میں اس دنیوی زندگی کا ورق تمام ہوا۔ اللہم اغفرلہ واحشرہ فی عبادک الصالحین۔

۱۹۷۶ء کی اس تکلیف کا ظاہری سبب

۱۹۷۶ء میں جو چیز اس دورِ معذوری کے آغاز کا باعث بظاہر اسبابِ بنی و صرف اسی لحاظ سے قابلِ ذکر نہیں کہ یہ ملک کے ایک بڑے اہم تاریخی موقع پر اپنی ملت کے سلسلہ میں اپنے اسی احساسِ ذمہ داری کا ایک تقاضہ پورا کرنے میں پیش آئی تھی جس احساسِ ذمہ داری نے آپ کو تبلیغی دعوت و محنت کے سلسلہ میں اپنے کامل شرحِ صدر کے باوجود اخبارِ ندائے ملت کے اجراء اور مسلم مجلسِ مشاورت کو وجود میں لانے کی جدوجہد پر مجبور کیا تھا۔ بلکہ اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں بے ریا و بے غرض خدمت کا وہ ایک نمونہ سامنے آتا ہے جو فرزندِ انِ ملت کے لئے ایک خاموش نصیحت اپنے اندر لئے ہوئے ہے، کہ ملت کی خدمت اس طرح کرو کہ وہ ہو سکے تو بس تم جانو اور تمہارا اللہ۔ یہ پورا واقعہ آپ ہی کے قلم کا لکھا ہوا، یا لکھوایا ہوا الفرقانِ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں بایں الفاظ شائع ہوا تھا۔

”عرفت ربی بفسخ العزائم رمضان مبارک (مطابق ستمبر ۱۹۷۶ء) کے شمارہ کی

ٹانگ کے پورے بالائی حصہ پر درم آ گیا ہے، اور میرے لئے زمین پر قدم رکھنا بھی مشکل ہے۔ بخار بھی ہو گیا تھا لیکن ٹانگ کی شدید تکلیف کی وجہ سے مجھے اس کا بالکل احساس نہیں تھا۔

مرض کا حملہ اچانک بالکل اس طرح ہوا جیسے فاج اور لقوہ وغیرہ مفا جاتی امراض کا حملہ ہوا کرتا ہے۔ علاج شروع ہوا، دوا کے استعمال کے لئے روزہ بھی قضا کر دینا پڑا لیکن ٹانگ کی تکلیف تیز رفتاری سے بڑھتی رہی اور اسی طرح بخار بھی۔ رات اسی بے چینی اور تکلیف میں گزری دوسرے دن اس کیفیت میں یہ اضافہ ہوا کہ ہچکیاں آنا شروع ہو گئیں اور مسلسل فاقوں کے باوجود مستقل ایک ہی حالت میں رہنے سے پیٹ میں نفخ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اگلے دن تک بھی اس کیفیت میں کوئی فرق نہیں ہوا بلکہ ٹانگ کی تکلیف اور نفخ میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تیسرے دن سے بخار یکساں رہنے کے بجائے تیزی سے گھٹنے بڑھنے لگا۔ دن میں دو تین بار شدید لرزہ کے ساتھ بخار بڑھتا تھا اور سارے جسم پر کچلی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ صورت حال میرے تیمارداروں کے لئے قدرتی طور پر پریشان کن تھی۔

ایک ڈاکٹر جو بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں ان کو میری بیماری کی اطلاع دی گئی، وہ آئے اور میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ مجھے بلڈ یوریا کا شبہ ہے اس لئے خون اور پیشاب کا ٹسٹ فوراً کرایا جائے۔ تیمارداروں نے اس کا انتظام کیا اور اگلے ہی دن ٹسٹ کی رپورٹوں سے ڈاکٹر صاحب کے شبہ کی تصدیق ہو گئی، معلوم ہوا کہ بلڈ یوریا ہے، اور آنا فانا خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے۔ میں اس مرض سے اور اس کی سنگینی سے واقف نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے تیماردار اور معالج خاصے فکر مند ہیں۔ اس نئے اور غیر متوقع مرض کے انکشاف کے بعد میرے تیمارداروں نے ایک دوسرے کرم فرما ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا اور ان کے مشورہ سے اس مرض کے خصوصی ماہر ایک ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا۔

”میرا اپنا حال یہ تھا کہ مجھے علالت کے پہلے ہی مرحلہ سے اصل احساس ٹانگ کی تکلیف کا تھا، جو رفتہ رفتہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے، بخار کے اضطراب اور نفخ کی اذیت اور مسلسل بے خوابی نے ان تین چار دنوں میں مجھے اس درجہ نڈھال اور بے حال کر دیا تھا کہ میرے لئے آنکھیں کھولنا اور گھر والوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اور بعد میں تیمارداروں نے بتلایا کسی کسی وقت بالکل ہذیانی کیفیت ہو جاتی تھی۔ اسی حالت میں بلڈ یوریا کے ماہر معالج ان ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جلدی ہیفاقہ ہونے لگا۔ اس درمیان میں ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق بار بار خون اور پیشاب ٹسٹ کرایا جاتا رہا اور ہر مرتبہ کی رپورٹ سے مرض میں تخفیف ہی ظاہر ہوتی رہی حتیٰ کے

بلڈ پور یا بالکل نارمل ہو گیا۔۔۔۔۔۔ البتہ ٹانگ کی تکلیف ابھی تک جوں کی توں برقرار تھی اور بخار بھی برابر رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ ٹانگ کے علاج کے لئے اسپتال میں داخلے کا فیصلہ کیا گیا اور ایسولنس کے ذریعہ مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا، وہاں پہلے ٹانگ کا اکسرے ہوا، جس کی بنا پر ڈاکٹروں نے بتلایا کہ کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہے بلکہ جو ہڈی ایکسیڈینٹ سے مجروح ہوئی تھی اس پر اور اس کے ماحول پر درم آ گیا ہے اور اس کا علاج بس آرام اور ورزش ہے۔ چنانچہ ورزش شروع ہو گئی اور بخار وغیرہ کے لئے دوائیں دی جاتی رہیں اور انجکشن لگتے رہے الغرض اس طرح علاج چلتا رہا۔ دس بارہ دن اسپتال میں رہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ علاج گھر پر بھی اسی طرح جاری رہ سکتا ہے، اس لئے ڈاکٹروں کی اجازت سے گھر آنے کا فیصلہ کر لیا گیا، چنانچہ ۲۸ ویں روزے کو اسپتال سے گھر واپسی ہوئی اور وہی علاج گھر پر ہوتا رہا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے سامنے بندے کی عاجزی اور بے بسی کہ رمضان مبارک کے صرف دو روزے نصیب ہو سکے اور سارا مہینہ اس طرح گذرا کہ صرف فرض نمازیں کسی طرح لیٹے لیٹے اشاروں سے ادا ہو جاتی تھیں۔ اور ان کے بارہ میں بھی اس قدر بے اطمینانی تھی کہ میں ان سب کو صحت کے بعد واجب الاعادہ سمجھتا تھا۔ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ۔“

تو وہ ”اہم ملی خدمت“؟

یہ تمام قصہ ملی خدمات کے تقاضوں کے سلسلہ میں احساسِ ذمہ داری کی ایک مثال کے طور پر ذکر میں لایا گیا ہے۔ لیکن قارئین اگر اس میں کسی خدمت کا ذکر نام کو بھی نہ پارہے ہوں۔ اور یقیناً نہ پارہے ہوں گے۔ تو یہی وہ وجہ ہے کہ اس تذکرہ میں فرزندانِ ملت کے لئے ایک خاموش عملی نصیحت اس امر کی دیکھی جا رہی ہے، کہ ہو سکے تو ملت کی خدمت اس طرح کرو کہ بس تم جانو اور تمہارا اللہ۔ ورنہ حضرت مولانا علی میاں صاحب سے گفتگو اور پھر مزید گفتگو کے لئے رائے بریلی کا سفر، یہ سب اسی ملی خدمت کے سلسلہ میں تھا۔ اور بڑی ہی اہم خدمت کا یہ معاملہ تھا، لیکن کسی کو اس کی ہوا بھی دینا پسند نہ فرمائی گئی کہ وہ خدمت تھی کیا۔ مگر اب جبکہ خدمت گزار اس دنیا میں نہیں ہے تو نصیحت کے پہلو سے اس مضر خدمت کی تشریح ایک کارِ خیر ہے۔ پس وہ خدمت یہ تھی:

آنجمانی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے دور کی ایمر جنسی کا زمانہ تھا، جس میں جبری نس بندی (Forced Sterilisation) کی مہم جیسی المناک زیادتیاں ہوئی تھیں اور ہو رہی تھیں۔ حضرت مولانا علی میاں نے کچھ لوگوں کے توجہ دلانے پر مسز گاندھی کو ان معاملات پر توجہ دلانے کے لئے اپنی اس حیثیت

سے خط لکھا کہ محترمہ رائے بریلی ہی سے (جو مولانا کا آبائی شہر ہے) پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوئی تھیں۔ اور مولانا وہاں کی ایک معروف ہستی۔ اس خط پر تو وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ ایک دن یکا یک وزیراعظم کی طرف سے قصر صدر جمہوریہ (راشٹر پتی بھون) میں لنچ میں شرکت کی دعوت پہنچی۔ مولانا نے خیال فرمایا کہ یہ شاید انہی خطوط کا غیر معمولی اکرام کے انداز میں جواب ہے۔ اس لئے عام معمول کے مطابق حضرت صاحب سوانخ سے مشورہ کیا۔ اور جانے کی رائے قرار پانے پر دہلی کا سفر فرمایا۔ یہ دہلی کے اسی سفر سے واپسی تھی جس کا حوالہ الفرقان کی مذکورہ بالا تحریر میں دیا گیا ہے کہ واپسی پر ”مولانا کو بعض اہم معاملات کے بارے میں اس عاجز سے گفتگو فرمائی تھی“۔ اور اس کے بعد دوسرے دن جو رائے بریلی کا سفر ہوا، جس سے واپس آ کر ٹانگ میں تکلیف ہوئی اُس سفر کا قصہ یہ تھا کہ مسز گاندھی کے معتمد خاص محمد یونس خاں صاحب کے بارے میں مولانا کے یہاں اطلاع آئی ہوئی تھی کہ وہ ملنے کے لئے رائے بریلی آنا چاہتے ہیں اور قدرتی طور پر سمجھا گیا کہ وہ اسی سلسلے میں آ رہے ہوں گے۔ مولانا ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ حضرت صاحب سوانخ بھی اس موقع پر شریک گفتگو ہوں، اس لئے کہ بظاہر اس کا موضوع وہی ہوگا جس کے لئے مسز گاندھی کو خطوط لکھے گئے تھے۔ پس دوسرے دن (دوسرے روزے کو) رائے بریلی کا سفر ہوا اور پھر طویل گفتگو یونس خاں صاحب سے رہی۔

سویہ ہے ۶۷ء کا وہ ”ایک تاریخی“ واقعہ جس کے سلسلے میں راحت و آرام فراموش کر کے وہ تکلیف آپ نے مول لی جس نے رفتہ رفتہ بالکل صاحب فراش ہی آخر دم تک کے لئے کر دیا۔ مگر اس تکلیف اور اسکے سبب کے اس طویل بیان میں جو الفرقان کے حوالے سے اوپر نقل ہوا اصل معاملے پر ایسا اخفا کا پردہ ڈالا گیا ہے کہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ یہی اس واقعہ کا سبق ہے۔ اور کیا شبہ کہ گرہ باندھ لینے والا سبق ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ہم پسماندگان حضرت نعمانیؒ کے لئے آپ کی سب سے قیمتی میراث (اور فخر کی اجازت ہو تو بڑی قابل فخر میراث) آپ کا یہی وتیرہ اخفاء و عجز اور نفی ذات ہے۔^۱

(۱) راقم تو ان دنوں لکھنؤ میں نہ تھا اب ودانہ اسے لندن لیجا چکا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس واقعہ سے جڑا ہوا ایک واقعہ اس سے کچھ قبل کا اور بھی ہے۔ اندرا حکومت کے ایک وزیر سید محمد صاحب اس سلسلہ میں لکھنؤ آ کر خود حضرت صاحب سوانخ سے بھی ملے تھے۔ اور موصوف نے نسبندی کے حق میں بڑی طویل گفتگو اس پہلو سے کی کہ ملک کی آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا سد باب اگر نہ کیا جائے تو کیا حال ملک کا ہو جائے گا؟ لیکن حضرت صاحب سوانخ کا وہی مزاج اخفاء، جس کی بنا پر اس کا کوئی تذکرہ الفرقان میں نہیں آیا۔

دارالعلوم کا صد سالہ اجلاس اور آپ کا ابتلاء

پھر اسی معذوری کے دوران میں آپ کی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ (۱۸۰ء) کا وہ قصہ پیش آیا جس کے ایک عظیم ابتلاء کا بیان اوپر باب (۶) میں گزرا ہے، اور وہ ابتلاء معذوری کے ابتلاء و آزمائش کو جس درجہ پر پہنچا دینے والا تھا اسے وہی جان سکتا تھا جس پر مہینوں، برسوں کا یہ روح فرسا قصہ گزرا۔ اللہ پورے اجر سے نوازے۔

ایک اور بساطِ کارزار، ایرانی انقلاب اور خمینی امامت!

جس نے بڑھاپے میں جوانی کا حوصلہ مانگا

دارالعلوم کے قضیہ نے آپ کو جسمانی و روحانی اور ذہنی و قلبی طور پر جس قدر بھی نہ تھکا دیا، بے حال نہ کر دیا ہوتا تھا کہ بڑا طویل اور بڑا کریناک قضیہ تھا اور پھر معذوری بیماری کا عالم۔ مگر اس قضیہ سے سر اٹھانے کی فرصت ملی تو دیکھا کہ ایک نئے معرکے کی بساط بکھی ہوئی انتظار میں ہے۔ یہ تھی انقلاب ایران (۱۹۷۹ء) کے نتیجہ میں قائم انقلاب جناب آیہ اللہ خمینی کی ”امامت“ جسے بے پناہ پروپیگنڈے کے ذریعے جمیع عالم اسلام کے لئے واجب الاطاعت بنایا جا رہا تھا۔ اور یہ پروپیگنڈہ جس کے لئے ایرانی دولت کے خزانے کھول دئے گئے تھے، اس کے اثرات اس حد تک اہل سنت کی آبادیوں میں رونما ہونا شروع ہو گئے تھے کہ ”اسلام پسند“ کہلائے جانے والے وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان جو دین کے ایک خاص تصور کے پیرو ہونے کی وجہ سے ”اسلامی انقلاب“ اور ”اسلامی حکومت“ کے نعرہ میں ہوشربا کشش اپنے لئے پاتے تھے وہ اہل سنت میں اس ”امامت“ کے پر جوش داعی بن گئے تھے۔ حالانکہ یہ خالص شیعہ عقیدہ و تصور والی امامت تھی۔ اور سُنیت کے لئے زہر قاتل، جسے شیعہ سنی اتحاد و یگانگت کے غلاف میں لپیٹ کر محض ایک سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

حضرت صاحبِ سوانح کی زندگی کا آغاز ہی حق و باطل کو الگ الگ کر کے دکھانے کی پُر عزم جدوجہد سے ہوا تھا۔ اور اس جدوجہد ہی کے سلسلہ میں بریلی سے جاری کئے جانے والے ماہنامہ کے نام ”الفرقان“ کی یہی معنویت تھی۔ پس قدرتی طور پر آپ کے لئے یہ صورت حال ناقابلِ برداشت ہونا تھی کہ

کے مقابلہ میں صف آرا ہو جانا اور تازیانوں اور زنداں کی تکلیف برداشت کرنا۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقیؒ (م ۱۰۳۳ھ) کا شہنشاہ اکبر کے عقیدہ ہزارہ دوم، دعوائے امامت و اجتہاد اور وحدتِ ادیان کی مخالفت کرنا، پھر جہانگیر کے عہد تک اس کو اس وقت تک جاری رکھنا جب تک مغلیہ حکومت کا رخ بدل نہیں گیا، اس کی دو مثالیں ہیں، ورنہ تاریخ اسلام اپنے اندر ”کلمۃ حق عند سلطانِ جائر“ اور ”لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق“ کی پیرویوں تا بناک مثالیں رکھتی ہے، یہ سلطانِ جائز کبھی شخصی بادشاہ ہوتا ہے کبھی رائے عامہ، کبھی شہرت عام، کبھی دل فریب کا میاں یاں اور بلند و بانگ دعاوی۔ اور تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ آخر الذکر صورتیں زیادہ آزمائش کی چیزیں ہیں۔

حقیقت میں اسلام کی حقیقی تعلیم اور صحیح عقیدہ وہ دریا ہے جو کبھی اپنا رخ نہیں بدلتا اور کبھی پایاب نہیں ہو سکتا، سیاسی طاقتیں، قبیح انقلابات، حکومتوں کا قیام و زوال اور دعوتیں اور تحریکیں موجیں ہیں جو آتی اور گزر جاتی ہیں، دریا اگر صحیح رخ پر بہہ رہا ہے اور آب جاری ہے تو کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر عقیدہ میں فساد آگیا تو گویا دریا نے اپنا رخ بدل دیا اور اس میں آبِ صافی کے بجائے گندہ اور ناصاف پانی بہنے لگا، اس لئے فسادِ عقیدہ اور زلغ و ضلال کے ساتھ کوئی دعوت و تحریک کسی ملک کا عروج و اقبال، کسی معاشرہ کی جزئی اصلاح یا کسی فساد و خرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا وعدہ قبول نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں اس ملت کی بقا اور دین کی حفاظت کا راز مضمر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اپنے دور کے علماء، خادمین دین اور محافظین شریعت و سنت کو اس دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی یہ فاضلانہ اور محققانہ کتاب ’ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت‘ ہے۔

اہلِ حرم کے کانوں میں اذان

معدوری اور کمزوری کے اس حال میں یہ کتاب لکھ دینے ہی پر اکتفا نہ فرمایا گیا، بلکہ اس کے لئے شیعیت کے بھرپور مطالعہ کے نتیجہ میں یہ محسوس کرنے پر کہ اس فتنہ ”امامت“ کا سب سے زیادہ خوفناک عملی پہلو اس کا یہ نشانہ ہے کہ حرمین شریفین پر اس کا اقتدار قائم ہو۔ اور پھر ساتھ میں یہ دیکھنے پر کہ حرمین شریفین کے ذمہ دار اور علماء اس فتنہ کے سلسلہ میں بالکل ساکت و صامت ہیں، ارادہ باندھ لیا کہ اسی معدوری کے عالم میں، جس میں دیوبند کا سفر بھی آسان نہ رہا تھا (شورنی کے بعض جلے بھی اسی وجہ سے لکھنؤ میں

ہوئے) حرمین شریفین کا سفر کریں اور وہاں کے ذمہ داروں کو قوجہ دلائیں۔ آپ رابطہ عالم اسلامی کے رکن اسامی تھے۔ مگر ۱۹۷۶ء سے ٹانگ کی معذوری کے سبب اس کے جلسوں میں شرکت نہیں کر پارہے تھے۔ ۸۵ء کے اجلاس کا دعوت نامہ آیا تو طے کر لیا کہ کسی بھی طرح سفر کریں گے۔ مگر تنہا سفر کے قابل تو اب رہے نہ تھے۔ چنانچہ دو رفقاء سفر (برادر م غلیل الرحمن سجاد اور برادر عمر آدمولوی محمد زکریا صاحب) کے خرچ کا خود انتظام کر کے اس ارادے کی تکمیل فرمائی۔ اور وہاں جس سے جو کچھ کہا جاسکتا تھا کہا۔ مگر افسوس کہ واپسی کسی نتیجہ کی امید لے کر نہ ہو سکی۔ بلکہ اُلٹے ”رموزِ مملکتِ خویش“ کے ماتحت آپ کی کتاب وہاں اس وقت تک ممنوع (بین) رہی جب تک کہ دو سال بعد (۱۹۷۸ء میں) حج کے موقع پر خمینیانِ ایران کے ہاتھوں وہ خوزیز ہنگامہ نہ ہوا، جس میں کئی سو جانیں گئیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر حکمرانوں کی آنکھ کھلی۔ (حجاز مقدس کے اس سفر کا تفصیلی بیان اسفار کے باب میں آئے گا۔)

جناب خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں استفتاء

مطالعہ شیعیت کے نتیجہ میں خمینی صاحب کی عالمی امامت کی تحریک نے جیسے ایک آگ تن بدن میں لگادی تھی اور بوڑھے جسم میں جوانی کا عزم و حوصلہ لوٹ آیا تھا۔ کتاب کے بعد اسی سلسلہ کی ایک اور محنت کا عزم باندھ لیا۔ اور یہ گویا کتاب ہی کا کلمہ تھا۔ کتاب کے مضامین کا آخری عنوان تھا:

”حضرات علمائے کرام کی خدمت میں“

اس کے تحت لکھا گیا تھا کہ:

”اس کتاب میں آپ نے اثنا عشریہ کی مستند ترین کتابوں اور ان کے مسلم علماء و مجتہدین کی واضح تصریحات کی روشنی میں ملاحظہ فرمایا کہ ان کے اساسی عقیدہ امامت کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہ اس کا درجہ نبوت سے برتر اور ائمہ کا مقام و مرتبہ انبیاء و مرسلین سے بالاتر ہے۔ اور وہ خداوندی صفات و اختیارات کے بھی حامل ہیں، اور یہ کہ حضرات خلفاء ثلاثہ اور ان کے رفقاء، تمام اکابر صحابہ منافق، اللہ و رسول کے غدار، جہنمی اور لعنتی ہیں۔ اور ائمہ المؤمنین عائشہؓ اور حفصہؓ منافقہ تھیں۔ انہوں نے زہر دے کر حضور (ﷺ) کو ختم کیا۔ اور قرآن مجید محرف ہے۔ ان کے علاوہ بھی اثنا عشریہ کے جو معتقدات آپ کے سامنے آئے امید ہے کہ اس کے بعد آپ اس مذہب اور اس کے پیروؤں کے اسلام سے تعلق کے بارے میں کتاب و سنت کی روشنی میں قطعیت کے ساتھ فیصلے فرما سکیں گے۔ آپ امت کے امین ہیں اور زلیخ و ضلال سے امت کی۔“

حفاظت آپ کا فریضہ ہے۔ وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقُّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ۔“

علماء امت کی خدمت میں اس گزارش کی اشاعت کے بعد آپ نے یہ بھی اپنا فرض جانا کہ ایسے اہم معاملے میں صرف اتنے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ ایک استفتاء بھی مرتب کر دیں۔ تاکہ علماء کرام کو غور و فکر میں آسانی بھی ہو۔ اور بات ٹل نہ جائے۔ چنانچہ ایک مفصل استفتاء ۱۹۸۶ء میں تیار فرما دیا گیا۔ اور پھر اس کے جوابات آئے ان کی پہلی قسط الفرقان کے ایک خاص نمبر کی شکل میں دسمبر ۱۹۸۷ء میں اور دوسری قسط ۱۹۸۸ء کی خاص اشاعت کی شکل میں شائع فرمائی گئی۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی ادارہ علماء مشکل سے چھوٹا ہوگا جہاں سے جواب کے لئے رابطہ نہ کیا گیا ہو۔ اسی کے نتیجے میں اتنی بڑی تعداد میں جوابات موصول ہوئے کہ دو قسطوں میں اشاعت کی ضرورت پڑی۔ اور یہ اتنے وسیع پیمانہ پر رابطہ اپنی معذوری اور بیماری کے ساتھ اس حال میں فرمایا گیا کہ بس ایک معمولی سا کاتب خطوط میسر تھا، کوئی سکرٹریٹ یا پروفیشنل اسٹینوگراف کی چیز وہاں نہ تھی کہ بے تعب و مشقت یہ کام انجام پا جاتا۔ مگر اللہ نے یہ کام بھی آپ کی خواہش کے مطابق آپ سے لے ہی لیا۔ قسط دوم (۸۸ء) کے مقدمے میں اظہارِ شکر کے طور پر فرماتے ہیں:

”یہاں یہ عاجز اپنے رب کریم کے شکر کے ساتھ اس کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہے کہ جب میں نے شیعہ اثنا عشریہ اور خمینی کے بارے میں استفتاء مرتب کر کے حضرات علماء کرام کا فتویٰ حاصل کرنے اور اس کے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میرا خیال بلکہ غالب گمان تھا کہ ماضی قریب میں بعض لوگوں کے کفر کے غلط فتوؤں کی وجہ سے تکفیر کا فتویٰ بہت بدنام ہو گیا ہے اس لئے مختلف حلقوں کی طرف سے مجھ پر ملامت کے تیروں کی بوچھاڑ ہوگی اور ممکن ہے کہ بہت سے حضرات جو اصل مسئلہ میں پورا اتفاق رکھتے ہیں وہ بھی اس کو مناسب نہ سمجھیں۔ لیکن یہ عاجز اس صورت حال میں جس کا ذکر استفتاء کی تمہید اور مقدمہ میں بھی کیا جا چکا ہے۔ فیما بینی وبينَ اللّٰہِ اس کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا اس لئے ارشادِ باری ”يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ“ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے کو ملامت کے تیروں کا نشانہ بننے کے لئے تیار کیا اور اسی فیصلہ کے نتیجے میں الفرقان کا وہ خاص نمبر گزشتہ دسمبر میں شائع ہوا، جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

یہ عاجز اس کو اپنے کریم پروردگار کا خاص کرم ہی سمجھتا ہے کہ آج تک ایک خط بھی ایسا نہیں آیا جس میں اس فتوے تکفیر اور اس کی اشاعت کے اقدام کو غلط یا نامناسب ہی قرار دیا گیا ہو

_____ اس کے برعکس لا تعداد خطوط ایسے موصول ہوتے رہے جن میں لکھا گیا کہ یہ اس وقت کا اہم دینی فریضہ تھا جس کے ادا کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی۔“

شیعیت اور خمیصیت کے بارے میں اپنے اس کام کو جو آپ کی عملی زندگی کا آخری کام ثابت ہوا، اپنے علم اور فہم دین کی روشنی میں آپ ان کاموں میں سے ایک، بلکہ شاید سب سے برتر، سمجھتے تھے جن پر اپنے اللہ سے امید لگائے جتھے کہ ذریعہ مغفرت کے طور پر قبول فرمائے جائیں گے۔ اور دنیا میں جو عزت و مقبولیت آپ کے اس کام کو حاصل ہوئی، وہ ان شاء اللہ ایک امید افزا علامت آخرت کی ضرور لئے ہے۔

نواں باب

(تصنیفات و تالیفات)

[آپ کی تصنیفات کے تین دور ہیں، ایک ۳۶ء تک۔ دوسرا ۳۷ء سے ۴۳ء تک اور بعد ازاں تیسرا۔]

دورِ اوّل کی تصانیف

سیفِ یمانی

۱۔ سب سے پہلے جس تصنیف کے لئے آپ نے قلم اٹھایا اس کا ذکر آپ کے دورِ طالبِ علمی میں آچکا ہے، یہ ”بوارق الغیب“ تھی جس کا موضوع غیر اللہ کے لئے علمِ غیب کے عقیدہ کی تردید تھا۔ مگر یہ بڑا دورِ طلبِ کام تھا، پھر کچھ اور عوارض بھی اس کے مؤخر ہونے کا باعث بنے، اور اس سے پہلے یہ ایک مختصر تصنیف ”رِشادِ الاخیار“ وجود میں آگئی۔ جس کا دوسرا نام ”سیفِ یمانی“ تھا۔ اس کا تعلق بھی اُسی ”دفاعِ دینِ حق“ والے سلسلہ سے تھا جس سے آپ کی عملی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی اکابرِ دیوبند کے بارے میں بریلی سے کئے جانے والے افتراء پر دازانہ اعتراضات کا جواب۔ یہ آپ کی امر وہہ کی مدرسے کے زمانہ (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) کی تصنیف ہے۔ بالکل پہلی اور اوّل عمر کی تصنیف ہونے کے باوجود اسے جو مرتبہ اکابر کی نگاہ میں ملا اس کے لئے چند تقریظوں کے چند چند جملے کافی ہوں گے:

۱۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بعد الحمد والصلوة احقر اشرف علی غفرلہ عنہ رنے رسالہ ”سیفِ یمانی“ بالاستیعاب دیکھا جو بعض اہلِ اہوا کے اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا ہے، تحقیقی جواب بھی

ہے اور الزامی بھی۔ بلا مبالغہ اس کو جادلہم بالآئی ہی احسن کا مصداق پایا۔“
 (حضرت تھانویؒ نے کتاب کی رسید دیتے ہوئے جو گرامی نامہ مصنف کے نام لکھا اس میں اپنی ذات سے متعلق اعتراضات کے جواب پر یہاں تک تحریر فرمادیا تھا کہ میں خود بھی چاہتا تو اتنا بہتر جواب شاید نہ لکھ سکتا۔ آگے حضرت تھانویؒ سے متعلق آنے والے مضمون میں حضرت کا یہ ارشاد آ رہا ہے۔ مرتب)

۲۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

”رسالہ سیف یمانی“ پہنچا تقریباً نصف کا مطالعہ کر چکا ہوں جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء، مدت سے میری تمنائی کہ اس موضوع پر ایک جامع رسالہ لکھا جائے تو بہت فائدہ ہوگا کئی مرتبہ خود لکھنے کا خیال ہوا۔ مگر یہ اجر آپ کے حصہ میں تھا۔ ماشاء اللہ نہایت سلیس، عام فہم اور چست عبارت میں اقوال و ارشادات اکابر کا حل کر دیا گیا ہے۔۔۔“

۳۔ حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ

”رسالہ سیف یمانی کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔ لاشک یہ رسالہ اسم با مسمیٰ مبتدعین مفترعین کی گردنوں کے لئے ایک بے پناہ تلوار ہے۔ لاریب اس کے مصنف نے یہ عمدہ رسالہ لکھ کر مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچایا اور اللہ کی مخلوق کو راہ ہدایت دکھلائی۔ بخدا مولوی صاحب موصوف اس میدان کے شہسوار ہیں۔۔۔“ (عربی سے ترجمہ)

۴۔ حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمن اعظمیؒ

”۔۔۔۔۔ مصنف نے اکثر مسائل اختلافیہ میں ایسی سیر حاصل بحث کی ہے۔۔۔۔۔ اور وہ داد تحقیق دی ہے کہ اگر اردو والے طبقہ اور طلباء مدارس عربیہ اس کتاب کو زیر مطالعہ رکھیں تو مبتدعین کے بڑے سے بڑے مناظر کا ناظر بن کر سکتے ہیں۔“

۵۔ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ

(مناظر و متکلم اسلام، سابق ناظم تعلیمات مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور)

آپ کے پورے صفحہ کی تقریظ کا خاتمان الفاظ پر ہوا ہے:

”۔۔۔۔۔ میں اخیر میں اس حقیقت کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ علامہ محترم کو میں ایک سال قبل مولوی محمد منظور صاحب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل میں اپنی ذہنیت بدلنے پر مجبور ہوا اور مولانا مولوی محمد منظور صاحب کہنے لگا۔ لیکن اس تصنیف لطیف کے غیر فانی

نفوس نے میرے قلب کو علامہ محترم مولانا محمد منظور — عم فیضہم کہنے پر مجبور کر دیا۔“ اور واقعہ یہ ہے کہ ذرا بھی مبالغہ کی تقریظ میں نہیں ہے۔ ۱۵۰ صفحے کی یہ کتاب گویا علم کی پوٹ ہے اور ذہانت و برصغری کا مرقع۔ اس کی عظمت دیکھتے ہوئے یقین آنا مشکل ہے کہ یہ کسی نوعمر عالم کی تصنیف ہے۔ اور چونکہ اس لئے پیشک تائید ”روح القدس“ سے مؤید، کہ دین حق اور مقبولانِ بارگاہِ حق کے دفاع میں تھی۔ راقم کے ہاتھ میں یہ کتاب اس سے پہلے نہیں آئی تھی، اور اب دیکھی تو سر بارگاہِ حق میں شکر سے جھک گیا، کہ کس کی اولاد میں ہونے کا شرف بخشا گیا ہے۔ لک الحمد یا ربی۔

بوارق الغیب

اسی سلسلہ کی دوسری تصنیف ”بوارق الغیب“ (مسئلہ علم غیب کا قرآنی اور نبوی فیصلہ) ہے۔ دیوبند اور بریلی کے مابین اختلافی مسائل میں ایک خاص مسئلہ ”مسئلہ علم غیب“ کے نام سے معروف ہے۔ اور خالص علمی مسئلہ ہے۔ آپ جن دنوں (۲۵-۱۳۴۴ھ/۲۶-۱۹۲۵ء) دیوبند میں زیرِ تعلیم تھے یہ وہ وقت تھا کہ دو سال پہلے جاز میں سعودی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور اس کے مذہبی دائرے کے بعض اقدامات پر بہت سے حلقوں میں جو ناراضگی ہوئی تو ہندوستان اس میں سب سے آگے رہا اور نتیجہ میں زبردست قسم کی مذہبی جنگ یہاں رونما ہوئی، اور قدیم اختلافی مسائل، قبروں کے قبے، عرس، فاتحہ، میلاد وغیرہ نئے سرے سے تازہ ہوا اُٹھے، انہی مسائل میں ایک یہ ”مسئلہ علم غیب“ بھی تھا، کہ بریلوی مکتب فکر آنحضرت (ﷺ) کے لئے اسی طرح کے کامل علم غیب کا مدعی تھا جو حق تعالیٰ سبحانہ کی صفت ہے۔ جبکہ دیوبند کے عقیدہ میں یہ منافی توحیدِ شرک تھا۔ سو، سعودی حکومت کے خلاف والے غصہ کی زد میں یہاں وہابی کہلائے جانے والے اہل دیوبند بھی آ گئے۔ اور اس خالص علمی مسئلہ پر بھی پر بحث و مباحثہ علمی حلقوں سے نکل کر اخبارات و جرائد کی سطح تک آپہنچا۔ اس شور و شر سے اسی طالب علمی کے زمانے میں آپ کے دل میں تقاضہ ہوا کہ ایک مختصر رسالہ اس مسئلہ پر تحقیقی انداز کا لکھیں (اوپر گزر چکا ہے، بریلوی فتنہ انگیزی کے خلاف تیاری آپ نے اسی زمانے میں شروع کر دی تھی۔)

جماعتِ دیوبند کے مشہور مناظر عالم، حضرت مولانا سید محمد رفیع حسن صاحب ان دنوں دارالعلوم علی میں ہوتے تھے۔ بظاہر اپنے اسی رجحان کے ماتحت آپ کو حضرت مولانا رفیع حسن صاحب سے کچھ خصوصی مناسبت اور قربت رہی ہوگی، کہ اپنے ارادہ کا ذکر آپ نے حضرت موصوف سے کیا۔ اس پر حضرت مولانا (۱) سیفِ یمانی (ص ۵) پاکستانی ایڈیشن شائع کردہ مکتبہ دارالعلوم فیض محمدی، خالد آباد لاہور۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن نسیم ہند سے قبل ۱۳۳۸ھ میں نکلا تھا۔ اب یہ پاکستان ہی میں دستیاب ہے۔

نے صاحب سوانح کے بیان کے مطابق فرمایا کہ:

”ہمارے حضرات نے اس مسئلہ پر اب تک جو رسائل لکھے ہیں ان سب میں قدر ضرورت پر اکتفا کیا گیا ہے اور مخالفین نے غلط بحث کرنے کے لئے بڑے بڑے رسالے لکھ ڈالے ہیں۔ لہذا اگر اس موضوع پر کچھ لکھنا ہے تو ہمت کرو اور ایک مبسوط رسالہ لکھ دو جس میں اپنے دلائل بھی کافی ثانی ہوں اور مخالفین کے دلائل کا جواب بھی بالاستیعاب ہو۔“

کام بڑا تھا اور طالب علمی کا آخری سال۔ اس وقت تو یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا تھا، تکمیل بعد میں ہو سکی۔ اور اس تکمیل میں جو ایک سخت امتحان سے گزرنا پڑا وہ بھی من لینے کا ہے۔ یہ کام بحمد اللہ مکمل ہوا تھا کہ ایک مناظرہ کے سلسلہ میں آپ کو پنجاب کے شہر گجرات جانا پڑا اور واپسی میں گھر آ کر دیکھتے ہیں تو کتاب کا مسودہ غائب ہے۔ اس پر جو گزر جانی چاہئے تھی وہ کہاں بیان میں آ سکتی ہے۔ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع کی اور یہ کہ اب از سر نو یہ کام کرنا بس کا نہیں ہے۔ مگر حضرت مولانا کو بغیر دیکھے ہی اس کام کی قدر و قیمت کا کچھ ایسا اندازہ تھا کہ آپ نے اصرار سے فرمایا اور ہمت دلائی کہ اللہ کا نام لو اور پھر سے بیٹھ جاؤ۔ خود آپ کو بھی اپنی اس گم شدہ متاع کی اہمیت کا جس قدر احساس نہ رہا ہو کم ہے۔ الغرض پھر سے کمر باندھی اور تنکا تنکا پھر سے جمع کر کے گم شدہ کو بازیاب کر ہی لیا۔ یہ دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں قرآن پاک کی چالیس آیتوں اور ان کی تفسیر میں احادیث نبوی اور اقوال صحابہ و تابعین و معتد مفسرین سے اپنے موقف کو مدلل کیا گیا ہے۔ یہ حصہ تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں کوئی ڈیڑھ سو احادیث مبارکہ سے اپنے موقف کی تائید اور مخالف موقف کی تردید پر استدلال ہے۔ یہ حصہ تقریباً ۲۰۰ صفحات کی ضخامت کا ہے۔

یہ اُس دور کی وہ دو کتابیں ہیں جو اب بھی دستیاب ہیں ورنہ مختصر ضخامت کے اور بھی متعدد رسالے اس زمانہ میں لکھے گئے۔ مثلاً (۱) قبر پرستی کے خلاف ”مؤمن کی پہچان از روئے قرآن“، (۲) ”سہ ضروریہ“ (ایسے ہی چھ مسئلوں سے متعلق)۔ (۳) حاضر و ناظر، (۴) ”تیجہ“ (۵) ”ہدایات قادریہ یا ہماری گیارہویں شریف“۔

دوسرا اور تیسرا دور

یہ تصنیفات ۳۶ء تک کے دور کی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا دوسرا دور ۳۷ء سے ۴۳ء تک کا ہے جس میں تصنیفات کے خانہ میں خاکسار تحریک پر ایک بسیط مقالہ ہے ”خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی

روٹی میں۔“ اور اسلام بحیثیت نظامِ کامل پر آٹھ خطبے، ”خطباتِ مہمئی“۔ ان میں سے کوئی اب دستیاب نہیں ہے۔ تصانیف کا اصل دور ۱۳۴۲ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس میں اللہ عم نوالہ نے بڑی برکت دی۔ آپ کی سب مشہور کتابیں اسلام کیا ہے؟، دین و شریعت، معارف الحدیث، قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ کلمہ کلید کی حقیقت۔ نماز کی حقیقت۔ برکاتِ رمضان۔ آپ حج کیسے کریں؟ آسان حج۔ تصوف کیا ہے؟ شیخ محمد بن عبدالوہاب کیخلاف پروپیگنڈہ۔ مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت۔ قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ ایرانی انقلاب۔—— تجدیدِ نعمت۔ درسِ قرآن۔ اسی آخری دور کی ہیں، یعنی بڑا مبارک دور رہا۔

آپ کی تصانیف کی اہم خصوصیت

عربی کا ایک مقولہ ہے ”مَا قُلَّ وَ مَا ذُلُّ“ (یعنی نہایت مختصر اور جامع) یہی آپ کی تحریر کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ساتھ ہی زبانِ نہایت آسان و سلیس اور سادگی و ہر کاری کا ایک نمونہ۔ مشکل سے مشکل اور گہری سے گہری بات کو ایسے عام فہم و سہل و مختصر الفاظ میں ادا فرمادیتے ہیں کہ ادنیٰ دقت سمجھنے میں نہیں رہتی۔ قرآن پاک میں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے آتا ہے ”وَ اَلْنَا لَهُ اَلْحَدِيدَ“ (اور ہم نے اس کے واسطے نرم کر دیا لوہے کو۔ سورہء سبا ۱۰/۳۴) اللہ نے کچھ یہی چیز آپ کو زبان کے معاملے میں عطا فرمادی تھی۔ تقریر ہو یا تحریر بالکل سادہ اور سہل پُر موثر زبان میں ہوتی، موضوع چاہے عام دعوتی و اصلاحی ہو یا علمی، زبان آپ کی سہل اور سادہ ہی رہی۔ جس سے عامی اپنے فہم و استعداد کے مطابق استفادہ کرتا اور عالم اپنے ذرجہ فہم کے مطابق۔ معارف الحدیث آپ کی اس خصوصیت کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ عام آدمی بھی اسے اپنے مطلب کی چیز پاتا ہے اور اہل علم مشکل سمجھی جانے والی حدیثوں کے مسائل کا حل بھی اس سادہ سی کتاب میں پا جاتے ہیں۔

آپ کی زبان کی مذکورہ بالا خصوصیت کی تعبیر آپ کی کتابوں کے انگریزی مترجم ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم اپنے الفاظ میں اس طرح کرتے تھے کہ مجھے مولانا کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں ذرا دقت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ آپ کا اسٹائل بالکل جدید انگریزی اسٹائل ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور سادہ زبان۔ مجھے الفاظ کی ترتیب میں کہیں کوئی خاص تبدیلی کرنے اور گھٹانے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بس اردو کی انگریزی کر دینا ہوتی ہے۔ اور وہی ناقل ہیں کہ ان کے یہاں کبھی کبھی تشریف لانے والے یوپی حکومت کے سکریٹری وزارتِ مالیات جناب۔۔۔ (جو دینی ذہن رکھنے والے جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے) فرماتے

کہ ”میاں، گرتے پچامے میں ایک انگلش مین ہے۔“

انگریزی مترجم (ڈاکٹر آصف صاحب) ہی نہیں ایک عربی مترجم نے بھی بعینہ انہی کی بات میں اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ آپ کی یاد میں نکالے گئے خصوصی نمبر ۱۹۹۸ء) میں ایک مضمون دارالعلوم دیوبند کے عربی ترجمان ماہنامہ ”داعی“ کے مدیر مولانا نور عالم خلیل امینی کا ہے اس میں وہ اپنا اس وقت کا تجربہ بتاتے ہیں جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوتے تھے کہ وہاں کے عربی ماہنامہ ”البعث الاسلامی“ کے مدیر مولانا سید محمد الحسنی مرحوم نے حضرت صاحب سوانح کی کتاب ”دین و شریعت“ کا ایک مضمون عربی ترجمہ کے لئے دیا۔ انھیں فوری ضرورت تھی وہ چاہتے تھے رات ہی میں ترجمہ کر ڈالوں، اور میں سخت نزلے اور اس کے اثر سے بخار میں مبتلا تھا۔ اس لئے میں نے ان سے ایک دور و زکا وعدہ کیا۔ ”لیکن“ کہتے ہیں:

”رات کو بستر پر لیٹے لیٹے خیال آیا کہ ذرا اس مضمون پر یوں ہی ایک نظر تو ڈال لیں۔ اس سے قبل مولانا کی کسی تحریر کا ترجمہ کرنے کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ بلکہ ان کی کسی کتاب کو بھی غور سے پڑھنا یا نہیں۔ زبان کی خوبی و خرابی پر غور کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ لیکن اللہ جانتا ہے کہ مولانا کہ یہ تحریر مجھے اتنی ہلکی معلوم ہوئی کہ لیٹے لیٹے ہی اُسے اسی وقت عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ میں جملے کو ذرا سا اشارہ کرتا وہ عربی کا قالب اوڑھ لیتا۔ بڑی آسانی سے ایک اردو تحریر عربی کا لباس جیل پہن لیتی۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی متوسط سائز کے چھ صفحات اردو سے عربی میں ہو گئے۔ مجھے زندگی میں بلا مبالغہ ہزاروں صفحات اردو سے عربی میں کرنے پڑے ہیں لیکن اس مضمون کی تعریف سے طبیعت میں جو فرحت و انبساط اور خوش گوار لذت محسوس ہوئی وہ اب تک کسی مضمون کی تعریف کے حوالے سے یاد نہیں۔“

خاص خاص تصنیفات کا کچھ تعارف

اسلام کیا ہے؟

اس کتاب کے تعارف میں، حضرت مولانا علی میاں کے قلم سے نکلے ہوئے ”دین و شریعت“ کے مقدمہ کا اقتباس پڑھئے:

”جب یہ حقیقت مسلم ہے کہ اسلام آخری دین ہے، وہ حدود و ثغور اور ممالک و اقالم ہی نہیں، زمان و مکان، نسل و زبان اور عقول و اذہان کے حدود سے بھی آزاد، ایک دائمی، زندہ جاوید

رہے تھے خود بھی اس کی نافعیت اور مقبولیت کے لئے اہتمام سے دعا کرتے تھے اور اپنے بزرگوں سے بھی اس کے لئے خاص طور سے درخواست کی تھی۔ پس یہ ہے بظاہر اس کتاب کے غیر معمولی درجہ پر عام فہم ہونے کا راز۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندے کے اس مخلصانہ جذبے اور اہتمام کو یہ تاثیر بخشی کہ ۱۹۵۰ء میں پہلی دفعہ چھپنے کے بعد آج (۲۰۱۲ء) تک اس کی طباعت کا سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے۔ دسیوں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر ملکوں ملکوں شائع ہو رہی ہے۔ فَللّٰہِ الْحَمْد

دین و شریعت

اس کتاب کا مقدمہ جیسا کہ ابھی گزرا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ مقدمہ اس کتاب کا بہترین تعارف ہے۔ اس میں کتاب کی پوری خصوصیات نہجۂ دی گئی ہیں۔ یہاں اسی کو حتی الامکان اختصار کے ساتھ مولانا ہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا پیرا گراف تو وہی ہے جو ابھی ”اسلام کیا ہے؟“ کے تعارف میں گزرا کہ

”جب یہ حقیقت مسلم ہے کہ اسلام آخری دین ہے، وہ حدود و ثغور اور ممالک و اقالم ہی نہیں، زمان و مکان، نسل و زبان اور عقول و اذہان کے حدود سے بھی آزاد، ایک دائمی، زندہ جاوید اور عالمگیر پیغام، دعوتِ فناء اور زندگی کا دستور العمل ہے، تو— ہر زمانہ، ہر ماحول، ہر ذہنی سطح اور زبان و اسلوب میں اس کو اس طرح پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے ماننے والوں اور پیروؤں کے ایمان و اطمینان میں اضافہ ہو، ذہن طبعیتوں کی ذہنی تشفی ہو۔۔۔۔۔۔“

(اس لئے) اس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ جس نے ایک طرف دین کا علم، اس کے ماہر اساتذہ اور علماء راہنہین سے حاصل کیا ہو، کتاب و سنت سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو، تعلیم کے ساتھ علماء راہنہین کی صحبت بھی پائی ہو، پھر اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کے مختلف حلقوں میں رہا ہو، اُن کے حالات و خیالات سے واقف ہو، اُس نے زندگی کسی خیالی دنیا، علمی حصار یا ”دینی جزیرہ“ میں نہ گزاری ہو، ————— پھر وہ (وہی یا اکتسابی طریقہ پر) دقیق مسائل کو سہل اور عام طریقہ پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور لکھنے پر قادر ہو۔ اس سب کے علاوہ اس کے اندر اخلاص، سوز و دروں اور دعوت کا طاقتور جذبہ بھی پایا جاتا ہو کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

مجھے اس حقیقت کے اعلان میں مسرت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان نے اس اہم اور نازک کام کا بیڑہ اٹھایا، اور پہلے کم تعلیم یافتہ اور سادہ ذہن

رکھنے والے لوگوں کے لئے ”اسلام کیا ہے؟“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔
 اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا کو توفیق دی کہ وہ اس سے بلند معیار کی کتاب پیش کریں، جس
 میں ان کے بقول ”اسلامی اصول و تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ دلوں سے عہد حاضر
 کے شکوک و شبہات اور اہل زلیغ و ضلال کے مغالطات و تحریفات کی بھی صفائی ہو اور اس کے
 ذریعہ علم و واقفیت کے ساتھ دین و شریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین
 و اعتماد اور سلف صالحین کے اختیار کیے ہوئے مسلک اہل سنت کے بارے میں اطمینان بھی حاصل
 ہوتا جائے“

”(اس) کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم ہونے کے ساتھ اس میں دین کی صحیح
 فہم، مطالعہ اور صحبت (?) کا نچوڑ آگیا ہے، اسی کے ساتھ اس میں توازن و حقیقت پسندی بھی
 ہے، اور وہ مولانا کی عمومی تحریروں کے مطابق حشو و زوائد سے پاک ہے۔ مولانا نے تفہیم کے لئے
 بعض ذاتی واقعات اور دقیق حقائق سمجھانے کے لئے بعض مکالمے بھی نقل کئے ہیں۔ جدید ذہن
 اور لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ایسے مضامین بھی آگئے ہیں جو عقائد کی ”عرفی“ کتابوں میں
 نہیں ملیں گے۔ مثلاً وحدت ادیان کے فتنہ کار، منکرین حدیث کی گمراہی کا بیان، اہل السنۃ
 والجماعہ کے بنیادی امتیاز کا اظہار، نئے زمانے کے نئے بتوں کا تذکرہ، نفس پرستی پر ضرب، اعجاز
 قرآن پر مختصر لیکن مفید بحث، ارکانِ اربعہ کی اصل روح اور مقصد کی توضیح۔ بعض قدیم
 و دو قلع کلامی مسائل کی بڑی خوبی سے تلخیص و تسہیل کی ہے۔ مثلاً رویت باری، جبر و قدر کا مسئلہ
 ، آخرت کی ضرورت، اور یہ کہ جزا و سزا اس دنیا میں کیوں نہیں دی جاتی؟ سلف صالحین کے اتباع
 کی کیا اہمیت ہے؟ خلافت راشدہ کی عظمت و انفرادیت، سیاست و حکومت کے بارے میں
 متوازن و معتدل نقطہ نظر اور جامع گفتگو۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں (بہت سی اصلاحی و دعوتی کتابوں کے برخلاف)
 اخلاق کی اہمیت، معاملات و معاشرت، دین کی خدمت و نصرت، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت حق،
 امر بالمعروف نہی عن المنکر پر پورا زور دیا گیا ہے، اور ان پر مستقل ابواب و مضامین ہیں۔ آخر میں
 احسان و تصوف کی بحث ہے۔ اس سلسلہ میں تصوف کے اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور
 طالبین کے لئے لائحہ عمل مرتب طریقہ پر پیش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب نے دین کی
 تفہیم اور اسلام کی ضروری تعلیم کے ساتھ، ایک مختصر لیکن جامع رہنمائے زندگی کی حیثیت اختیار

کر لی ہے، جس کو ایک مشغول و متوسط درجہ کا آدمی اپنی زندگی کا دستور حاصل بنا سکتا ہے، اس کے ساتھ بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لئے کسی طالب حق غیر مسلم کے ہاتھ میں اس کا انگریزی ترجمہ بے تکلف دیا جاسکتا ہے۔“ ۱

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

متوسط سائز کے ۲۶۶ صفحات کی یہ کتاب آپ کے ایک خاص نقطہ نظر سے مطالعہ قرآن کا نتیجہ ہے۔ اس نقطہ نظر کے بیان کے لئے دیا چہ کی یہ طریق:

”۔۔۔ اس ناچیز نے قرآن مجید کو موضوع بنا کر کبھی کوئی خاص طالب علمانہ محنت نہیں کی، اس لئے علوم قرآن میں مجھے کسی قسم کا اور کسی درجہ کا بھی امتیاز و تخصص حاصل نہیں، بلکہ پرانے عربی مدرسوں کے تعلیم یافتوں کی طرح بس ترجمہ اور سادہ مطلب سمجھ لیتا ہوں۔ اور یہ بھی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس سے بڑا انعام اُس رب کریم کا اس عاجز بندے پر یہ ہے کہ تلاوت کے وقت کبھی کبھی دل کو تذکر کی دولت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور اس کی یہ برکت ہے کہ قرآن مجید کا کلام الہی ہوتا میرے لئے ایک بالکل محسوس حقیقت ہے۔ گویا جس طرح کسی میٹھی یا نمکین چیز کے کھاتے وقت اپنی زبان و تالو کے احساس کی بنا پر مجھے اس کی شیرینی یا نمکینی کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے، الحمد للہ بالکل اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت کے وقت کبھی میرے قلب کا جو تاثر اور احساس ہوتا ہے مجھے اس سے قرآن پاک کے کلام الہی ہونے کا قطعی یقین حاصل ہوتا ہے۔ ان دونوں یقینوں میں میرے لئے کوئی فرق نہیں ہے۔ **الحمد لله على ذلك حمداً كثيراً**۔

”قرآن مجید سے دل کے اس تاثر کا اگرچہ کوئی وقت اور موسم مقرر نہیں ہے لیکن خاص کر رمضان مبارک میں یہ دولت الحمد للہ زیادہ نصیب ہوتی ہے۔ اور جب بھی اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے، قدرتی طور پر اس وقت قرآن مجید اور اس کی دعوت و تعلیم کی عظمت کا احساس و یقین اور بڑھ جاتا ہے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے رمضان المبارک ہی میں ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، یاد نہیں کون سا مقام تھا، بہر حال اس دن طبیعت بہت متاثر ہوئی اور دل میں یہ داعیہ بھی اس وقت بڑی حدت سے پیدا ہوا کہ قرآن مجید کی اس دعوت و تعلیم کو قرآن ہی کے دعوتی

انداز میں اللہ کے ان بندوں تک بھی پہنچانے کی کوشش اپنی بساط کے مطابق کی جائے جو
 بچارے اس سے نا آشنا ہیں۔ اس کی ایک عملی شکل اس وقت ذہن میں یہ آئی کہ متوسط
 ضخامت کی ایک کتاب لکھی جائے جس میں قرآنی دعوت و تعلیم کو عنوانات کے تحت اس طرح
 مرتب کر کے پیش کیا جائے کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سب کے لئے اس کا سمجھنا آسان
 ہو۔ اور اس میں اپنی طرف سے کسی دلیل اور بحث کا اضافہ بالکل نہ کیا جائے، بلکہ صرف قرآن کی
 بات قرآن ہی کے سادہ دعوتی اور تذکیری طرز پر اپنی زبان میں کہی جائے، البتہ سمجھنے کے لئے
 جہاں کچھ تشریح اور وضاحت کی ضرورت ہو وہاں صرف بقدر ضرورت ہی وضاحت اور تشریح
 کر دی جائے۔۔۔۔۔۔“

یہ ہے ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟“ اڈا یہ الفرقان میں ”قرآنی دعوت“ کے عنوان سے قسط وار
 شائع ہوتی رہی۔ پھر کتابی شکل کے لئے اس کا نام ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟“ پسند کیا گیا۔ انگریزی
 ایڈیشن میں نام Qura'n and you قرار پایا۔

درس قرآن

یہ آپ کے افادات میں سب سے آخر کی چیز ہے، مگر نام کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ کوئی اور کتاب اگر
 ذکر میں آئی ہے تو بعد میں آئے۔

لکھنؤ کے مرکز تبلیغ میں حضرت مولانا علی میاں نے درس قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا تھا۔ تفسیر قرآن
 آپ کا تدریسی مضمون رہا تھا اور مرکز بننے سے پہلے ”ادارہ تعلیمات اسلام“ نامی ایک اپنے ہی لوگوں کے
 قائم کردہ ادارے میں آپ کے درس کا سلسلہ تھا۔ یہ سلسلہ آپ کے مشرق وسطیٰ کے ایک طویل سفر کی بنا پر
 منقطع ہوا اور واپسی ہوئی تو ایک طرف ادارہ کے حالات بدل چکے تھے دوسری طرف تبلیغی سلسلہ کا اپنا مرکز بن
 کر تیار ہو گیا تھا جس کے بعد آپ اور حضرت صاحب سوانح دونوں بزرگوں کا قیام مرکز ہی میں ہو گیا۔ پس
 آپ نے اپنے ہفتہ وار درس کا سلسلہ یہاں شروع فرمادیا۔ ”کاروان زندگی“ (جلد اول ص ۲۷۵) میں تحریر
 فرماتے ہیں: ”یہ سلسلہ بھی برسوں چلتا رہا اور ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ میرے طویل بیرونی سفروں اور
 دارالعلوم (ندوۃ العلماء) میں قیام منتقل ہو جانے کے بعد اس کی ذمہ داری رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی کی
 طرف منتقل ہو گئی۔“

حضرت مولانا کا ندوۃ العلماء میں قیام غالباً ۶۲/۶۱ء میں شروع ہوا تھا، جب آپ پر ناظم ندوۃ

العلماء کے عہدے کی ذمہ داری آگئی۔ اس طرح حضرت والد ماجد کا درس کوئی بیس برس سے اوپر چل کر ۱۹۸۵ء میں تمام ہوا۔ مگر افسوس کہ اس کے قلمبند کئے جانے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ کافی عرصہ کے بعد آپ کو خیال ہوا کہ اس مبارک سلسلے کا جتنا حصہ بھی ممکن ہو الفرقان میں آجایا کرے۔ پس اس کی بدولت درس کی ۵۷ قسطیں، یعنی ایک تھوڑا سا حصہ الفرقان میں محفوظ ہو گیا۔ اور یہ شاید الفرقان کی فائلوں ہی میں رہ جاتا اگر آپ کے دل میں اس کو یکجا کر کے کتابی شکل دیدینے کا خیال نہ آتا۔ یہ خیال مگر آپ کو زندگی کے اس آخری دور میں آیا جب ۷۶ء سے شروع ہونے والی معذوری کی بدولت اس طرح کے کام دوسروں پر منحصر ہو گئے تھے۔ آپ نے دفتر الفرقان سے درس کی قسطیں نکلوائیں اور ایک نظر ڈال کر کتابت کے لئے دیدیں۔ مگر کتابی شکل کے لئے کچھ اور کام بھی آپ ان قسطوں میں ضروری خیال فرماتے تھے۔ کچھ دن بعد (۹۴ء کے آخری مہینوں میں) راقم کا ہندوستان جانا ہوا تو آپ نے ان قسطوں کی کتابت دکھائی اور فرمایا کہ ان میں کتابی شکل دئے جانے کے لئے جو کام باقی ہے وہ کر سکو تو کر دو۔ اس کے علاوہ آپ کے ایک اُس سلسلہ مضامین کی کتابت بھی تھی جو ”کس کو پایا، کیا پایا؟“ کے عنوان سے الفرقان میں نکلا تھا اور ”تجدیہٴ نعمت“ نامی کتاب میں ”حصہ دوم“ کے طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا حصہ اول تیار ہونا باقی تھا جس میں آپ کے مختصر حالاتِ زندگی آجائیں۔

درسِ قرآن کے کام میں بعض وجوہ سے تاخیر ناگزیر ہوئی، اور تجدیہٴ نعمت کا کام مقدم ہو کر زندگی کے بالکل آخری دنوں میں طبع شدہ کتاب کی شکل پا گیا اور آپ نے اُسے اسی دنیا میں ایک نظر دیکھ بھی لیا۔ اس کا افسوس تو قدرتی طور پر رہا کہ درسِ قرآن کا کام آپ کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا مگر اس میں ایک بڑی خیر بھی نکل آئی۔ درس کی جو کتابت آپ نے میرے سپرد فرمائی تھی وہ اس کی صرف گیارہ قسطوں پر مشتمل تھی۔ بعد میں از سر نو تلاش کئے جانے پر ۴۶ قسطیں اور نکل آئیں، اس طرح اب ۵۷ قسطیں ہو گئیں اور ان سب پر ضروری کام کا مرحلہ طے ہو کر ۲۰۰۴ء میں اس کی بھی طباعت اور اشاعت ہو گئی۔ فالحمْد للّٰہ۔ درس کی ان قسطوں میں تسلسل کی صورت اگرچہ بہت کم ہے لیکن قرآن پاک کی تو ہر آیت بجائے خود ایک مکمل ہدایت نامہ ہے اور پھر حضرت صاحبِ سوانح کی سادہ و عام فہم زبان، جامع و مختصر طرزِ بیان اور آپ کا وہ جذبہ اصلاح اور سوزِ دروں جو آپ کی ہر تحریر و تقریر کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہوا ملتا ہے، نیز دنیوی حالات پر مبصرانہ نگاہ اور درس میں موقع کی مناسبت سے ان حالات کی بابت قرآنی رہنمائی پر روشنی، یہ وہ چیزیں ہیں جو قاری کو تسلسل اور عدم تسلسل کے سوال سے بے نیاز کر دے سکتی ہیں۔ چنانچہ اس غیر مسلسل درس کے نئے نئے

ایڈیشنوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ۶۲۸ صفحات اس کی ضخامت ہے۔

اچھا ہے کہ اس درس کا کوئی ایک صفحہ ہی قارئین کے سامنے آجائے۔ تو لیجئے سورہ نحل کے ایک درس کی آخری آیت پر گفتگو، ممکن حد تک اختصار کے ساتھ ::

”سورت کی بالکل آخری آیت ہے ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ

مُحْسِنُونَ“ یہ گویا سورہ کا مقطع اور نہایت اہم خداوندی منشور ہے۔ اس میں بہت بڑی بشارت

اور بڑا اطمینان بخش وعدہ ہے، اس میں رسول اللہ کو اور قیامت تک پیدا ہونے والے حق پرستوں

کو خوش خبری سنائی گئی ہے اور گویا ضمانت دی گئی ہے کہ جس جماعت اور گروہ کی زندگی تقویٰ

پر بیہیزگاری اور نیکو کاری کی ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور اپنے غیبی لشکروں کے ساتھ ان کا

رفیق اور مددگار ہوگا۔ اِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ!

آج مسلمان عرب و عجم میں، مشرق و مغرب میں ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں اگرچہ کہا جاتا ہے

کہ اس وقت دنیا کے مختلف بڑے اعظموں میں ان کی ۳۰-۳۵ خود مختار حکومتیں ہیں لیکن جن

لوگوں کو دنیا کے حالات کی کچھ خبر ہے وہ سب جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں ان مسلمان حکومتوں کا

کچھ بھی وزن نہیں ہے۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ ان میں سے ایک ایک کے حالات تفصیل

سے مطالعہ کر لے۔ اور ہم ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ اور اپنے حالات پر نظر ڈال لیں۔

ملک کی آزادی سے پہلے یہاں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو دیکھنے والے خود ہم لوگ

موجود ہیں اور آزادی کے بعد جن حالات سے گزر رہے ہیں وہ آپ سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ ہم

نے بہت آسان نسخہ یہ سیکھ رکھا ہے کہ پہلے انگریزوں کے دور میں اپنی ساری مصیبتوں اور

بربادیوں کی ذمہ داری ہم انگریزوں پر ڈال دیتے تھے اور آزادی کے بعد سے جو کچھ ہو رہا ہے

اس کی ذمہ داری ہندوؤں پر یا کانگریسی حکومت پر ڈال دیتے ہیں۔ گویا خود ہم بالکل بے قصور ہیں

اور ہمارے ان حالات میں ہماری بد عملیوں اور غفلتوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم نے اس کا حل

اور علاج بس یہ سمجھا ہے کہ سیاسی پلیٹ فارموں سے اپنی مظلومیت کا بس شور مچائے جاوے، حکومت

کے خلاف احتجاج کرتے رہو، چیخ و دہاؤ اور اخبارات و رسائل میں مضامین پر مضامین لکھتے

جاؤ! واقعہ یہ ہے کہ یہ طریقہ بس اپنے کو اور بیچارے اپنے عوام کو فریب دینے کا ہے۔

حقیقت میں ہماری ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی جڑ بنیاد خود ہمارے اندر ہے۔ قرآن

مجید میں قوموں اور خاص کر پیغمبروں کی اُمتوں کی عزت و ذلت اور خوش حالی کا جو قانون جا بجا بیان فرمایا گیا ہے وہ صرف اگلے پیغمبروں اور حضور کے زمانے ہی کے لئے نہیں تھا وہ ازلی وابدی قانون ہے، قرآن پاک میں جا بجا یہ حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ قوموں اور اُمتوں پر بُرے حالات ان کے اندر کے بگاڑ کی وجہ سے آتے ہیں ارشاد فرمایا گیا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ، دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ، بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے بارے میں جن کے حالات خراب ہوئے اور جن پر تباہیاں آئیں، جا بجا فرمایا گیا ہے: ”وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ“۔

اگر قرآن پاک کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ ہمارے یہ حالات (بنیادی طور پر) خود ہمارے ایمانی نقص اور اعمال و اخلاق کی خرابی کا نتیجہ ہیں، اور ہمیں ان حالات سے اُس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ ہم اپنے اندر حقیقی ایمان و یقین پیدا کرنے اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کی فکر نہ کریں۔ یہ حالات خود بخود پیدا نہیں ہو گئے ہیں، نہ کسی دوسری قوم یا پارٹی یا حکومت نے ان کو پیدا کیا ہے، یہ اللہ کا عذاب ہے ”ازماست کہ برماست“۔ اس کے علاج کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ پہلے اپنے حال اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایمان و تقویٰ، پرہیزگاری اور نیکوکاری امت میں عام کرنے کی امکانی حد تک جدوجہد کی جائے۔

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری والی زندگی کے بعد آپ سے آپ بلا کچھ کئے حالات خود بخود بدل جائیں گے اور ہمارے مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے، بلکہ اس تبدیلی کے بعد ہم خدا کی امداد و نصرت کے مستحق ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مسائل حل کرنے کے لئے صحیح تدبیریں اختیار کرنے کی اور صحیح طریقہ پر جدوجہد کرنے کی توفیق ہمیں ملے گی اور پھر ہماری جدوجہد کے صحیح اور خاطر خواہ نتائج پیدا ہوں گے۔ یہی سُنْتُ اللّٰہ ہے۔ اور یہی انبیاء اللہ کا اور حضور (ﷺ) کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ بلکہ میں تو قرآن ہی کی روشنی میں اور اپنی تاریخ کی روشنی میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر ہم مسلمانوں میں تقویٰ اور نیکوکاری کی زندگی وسیع پیمانے پر پیدا ہو جائے تو دنیا بھر کے ملکوں میں اور خاص کر ہمارے اِس ملک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی ایسی ہوائیں چلیں گی کہ قوموں کی تو میں اور علاقوں کے علاقے رسول اللہ (ﷺ) کا لایا ہوا طریقہ زندگی قبول کرنے لگیں گے۔ لیکن کیسی بد قسمتی ہے کہ ہم سب

کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اپنی اصلاح کی کوشش کرنے کو تیار نہیں۔ حالانکہ ہمارے لئے راستہ صرف یہی ہے:

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ!

معارفِ الحدیث

آٹھ جلدوں میں آپ کی یہ تالیف جس کی اشاعت کا سلسلہ ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا تھا حقیقت میں اب تعارف سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ لیکن حضرت مولفؒ نے اس کی پہلی جلد میں جو محرک اپنے اس کام کا بتایا ہے اور جو طریق کار اور معیار اس میں آپ نے پیش نظر رکھا اس کا بیان اُن لوگوں کے لئے مفید ہوگا جنہوں نے اب تک اس سے استفادہ نہیں کیا ہے۔

حفاظتِ قرآن و سنت کے غیبی انتظامات کی جو صورتیں ہر زمانے میں اس کی ضرورت کے مطابق بحمد اللہ سامنے آتی رہی ہیں، بطور تمہید ان کے حوالے بعد آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہمارے اس دور اور ہمارے ہی ملک میں اپنے بعض بندوں سے اردو زبان میں قرآن مجید کی ایسی خدمتیں کرائیں جن کی اس دور میں خاص ضرورت تھی اور الحمد للہ کہ ان بندگانِ خدا کی محنتوں سے اس وقت کی ضرورت پوری ہو گئی، اسی طرح اب سے قریباً بارہ برس پہلے (۱۳۶۱ھ میں) اس عاجز بندے کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس زمانے کے خاص حالات اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر اردو میں حدیثِ نبویؐ کی بھی ایک خدمت کی جائے، اور اس کے لئے موجودہ کتب حدیث (صحاح یا مشکوٰۃ وغیرہ) میں سے کسی کی اردو شرح لکھنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ احادیثِ نبویہ کا ایک متوسط درجہ کا جدید مجموعہ خاص اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر خود ترتیب دیا جائے۔ اور اپنے زمانے کے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کی دینی، علمی اور ذہنی و فکری حالت اور عصر حاضر کے خاص علمی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر عام فہم اردو زبان میں حدیثوں کی تشریح کی جائے“

ان سطروں کی روشنی میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیثِ نبویؐ کی خدمت کا ایک مجتہدانہ منصوبہ تھا۔ اپنے زمانے کے خاص حالات اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر احادیثِ نبویہ کا ایک مجموعہ اپنے طور پر ترتیب دینا، اسے ایک مجتہدانہ منصوبے کے سوا کوئی اور کیا نام دیا جائے۔ اور کتاب کی تکمیل پر الحمد للہ ثابت ہوا کہ یہ گراں قدر منصوبہ فی الواقع ایک اہل ہستی کا منصوبہ تھا۔ کتاب کی دوسری جلد کے بسیط مقدمہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اسی حقیقت کو، حدیث کی قدیم و جدید خدمتوں کا حوالہ دیتے ہوئے، بایں الفاظ

ادار فرمایا ہے کہ

”حدیث کی قدیم وجدید ان سب خدمتوں کے بعد بھی ضرورت تھی کہ اس عہد انقلاب اور اس کی ضرورتوں اور ذہنی خصوصیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے حدیث کا ایک متوسط مجموعہ مرتب کیا جائے اور حدیث کے انتخاب و ترتیب اور تشریح میں اس مقصد کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے کہ ذہن کو اذعان اور قلب کو اطمینان حاصل ہو اور زندگی کے بگاڑ کی اصلاح ہو۔ نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ احادیث کے سلسلہ میں اس دور میں جو سوالات ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ بعض سلیم طبیعتیں بھی مزید تشفی کی طالب ہوتی ہیں ان کو بھی حل کیا جائے، یہ کام دہی کر سکتا تھا جو ایک طرف رسوخ فی الدین اور رسوخ فی العلم کی دولت سے بہرہ یاب ہو، دینی حقائق پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہو اور اس کو ہر دینی حقیقت پر علمی و ذہنی طور پر بھی شرح صدر ہو، اس سب کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور اختلاط و اجتماع اور مطالعہ کے ذریعہ اس عصر کی افتاد و طبیعت اور دماغی ساخت سے بھی واقف ہو، نئے فنون اور تحریکات سے بے خبر نہ ہو اور اپنے حاضر علم، وسیع مطالعہ اور وسیع تجربہ اور خدا داد قوت فہم و استدلال سے احادیث کی ترجمانی اور نئے ذہن کی تشفی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق تھی کہ اس نے اس اہم اور نازک کام کے لئے رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی کو منتخب فرمایا۔“

تصوف کیا ہے؟

تصوف سے متعلق آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ تھا آپ کی تصنیف نہیں، آپ کے اپنے چار مضامین کے علاوہ، ایک مضمون حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا اور تین حضرت مولانا اولیس صاحب ندویؒ (سابق صدر شعبہ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ اس کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے کے لئے دیباچہ کتاب کی چند سطروں کے علاوہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ دیباچہ میں آپ کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کی تعلیمات اور سیرت کی روشنی میں اسلام کے تین شعبے نظر آتے ہیں: (۱) ایمان اور عقائد کا شعبہ، جو دین کا سب سے اہم اور بنیادی شعبہ ہے (۲) اعمال ضابطہ، دین کا وہ تمام تر عملی حصہ جو جسمانی اعضاء سے تعلق رکھتا ہے (۳) ”روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیہ اخلاق“ کا شعبہ، جس کے ذیل میں محبت و خشیت، یقین و توکل، زہد و احسان اور اخلاص جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات آتی ہیں، جن کا نہایت اعلیٰ اور مثالی نمونہ آپؐ نے امت کے لئے چھوڑا ہے۔ تصوف، اسی آخری شعبہ میں تحصیل کمال کی جدوجہد کا نام ہے۔ یہ دیباچہ کی ابتدائی سطروں کا خلاصہ ہے۔ آگے ارشاد ہوا ہے:

”رسول اللہ (ﷺ) کی مقدس ذات تو ان تینوں شعبوں کی یکساں طور پر جامع تھی۔ کسی درجہ میں اکابر صحابہ کو بھی یہ جامعیت حاصل تھی۔ لیکن بعد کے قرون میں زیادہ تر ایسا ہوتا رہا کہ آنحضرت (ﷺ) کے اکثر نائبین و وارثین اگرچہ ذاتی طور پر کم و بیش ان تینوں شعبوں کے حامل اور جامع ہوتے تھے لیکن اپنی اپنی صلاحیت و استعداد اور ذوق یا ماحول کے مطابق انہوں نے کسی ایک شعبہ کی خدمت سے اپنا خاص تعلق رکھا۔ اور بیشک بعد کے ان قرون میں دین کا پھیلاؤ جس درجہ بڑھ گیا تھا اور جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ اس صورت اور اس تقسیم عمل نے خواص امت میں ائمہ عقائد، فقہاء اور صوفیاء کے الگ الگ طبقے پیدا کئے۔ پس جس طرح ائمہ عقائد اور فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ دین کے پہلے دو شعبوں کی خدمت و حفاظت اور تنقیح و تفصیل کی اسی طرح حضرات صوفیاء نے دین کے تیسرے شعبہ کی خدمت و حفاظت اور اس باب میں آنحضرت (ﷺ) کی نمائندگی اور نیابت کی۔“

اس کے بعد اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ روحانی و قلبی کیفیات و صفات اور تزکیہ اخلاق کا حصول تو کجا، ان کا صحیح ادراک بھی اس دولت کے کسی وارث اور حامل سے قریب ہو کر اس کے آثار و علامات کے مشاہدہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ (اور یہی کیا؟ پہلے دو شعبوں میں بھی آدمی کسی زندہ ہستی کی شاگردی اور رہنمائی سے کہاں مستغنی ہو سکتا ہے؟) مگر ہمارے زمانے میں یہ بدیہی حقیقت بہت سے لوگوں پر جو غفی ہو گئی ہے، اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے کہ

”ہمارے اس زمانے میں جو بہت سی نئی چیزیں اور نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسائل نشر و اشاعت کی وسعت اور کتابوں کی کثرت نے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا کر دیے ہیں جو دین کو صرف کتابوں اور رسالوں کے صفحات سے حاصل کرتے ہیں (اور یہ چیزیں نفسہ کچھ بری نہیں ہے، بلکہ اس لحاظ سے اچھی ہی ہے کہ اس طرح دینی افادے اور استفادے کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔) لیکن چونکہ ان کو دین کے کسی ایسے بالاتر نمونے کے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوتا جو خصوصیت سے دین کے اس شعبہ کا بھی حامل ہو اور جس کو دیکھ کر یہ اپنے علم و عمل کو ناقص و نارسیدہ اور اپنی دینی معرفت کو ناقص سمجھ سکیں، اس لئے بسا اوقات یہ حضرات اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور لٹریچر کی راہ سے جو ہم نے جان لیا ہے بس یہی کل دین ہے۔ اور چونکہ آج کل کا عام پسند دینی لٹریچر بھی زیادہ تر ایسے ہی اہل علم و اصحاب قلم کا تیار کیا ہوا ہے جو خود اس مرض میں مبتلا ہیں اس لئے وہ اپنے ناظرین کو اس بیماری سے نکالنے کے بجائے ان کے مرض کو اور زیادہ راسخ اور سنگین کر دیتا ہے۔۔۔۔۔“

یہ ہے اس کتاب کا بنیادی اجمالی فکر جس کی تفصیل اس میں شامل مضامین کے ذریعے اصحاب مضامین کے اپنے اپنے انداز سے سامنے آتی ہے۔ اور ایک ایک مصنف کے تین تین اور چار چار مضامین کی شمولیت ظاہر کرتی ہے کہ جس ضرورت اور محرک کے ماتحت یہ کتاب تصوف کے موضوع پر مرتب کی گئی ہے اس ضرورت کی حد تک موضوع کا کوئی ضروری پہلو اس کے احاطے سے شاید باہر نہیں رہ گیا ہے۔ نیز جس طبقے کے پیش نظر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اُس کی طرف سے کتاب کا ابتدائی مضمون الفرقان میں شائع ہونے پر جو سوالات اور اشکالات آئے ان سب کے بیان اور جواب پر مبنی ایک مضمون بھی اس میں شامل ہوا ہے۔

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

یہ قادیانیوں کے خارج از اسلام ہونے نہ ہونے کے سوال پر الفرقان میں شائع شدہ چند مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ ضخامت (صرف ۱۲۵ صفحات) کے اعتبار سے اس کتاب کو بجائے ”کتاب“ کتابچہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا، تاہم یہ ایک ایسی خصوصیت کی حامل ہے کہ آپ کی اہم تصنیفات میں جگہ دے جانے کا حق رکھتی ہے۔ اس کا موضوع، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ سوال ہے کہ قادیانیوں کو اسلام سے خارج قرار دینا کیوں کر برحق ہے؟ اس طور پر اس میں اسلام اور کفر کے حدود سے بحث کی گئی ہے، کہ خود کو مسلمان بتانے والا کب تک مسلمان رہتا ہے اور کب وہ اپنے اس دعوے کے باوجود فی الحقیقت کفر کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے؟

ایک ”کتابچہ“ ہونے کے باوجود اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ اپنے مصنف کی ایسی ایک خصوصیت کا مظہر ہے جس میں وہ اپنا ثانی بظاہر نہیں رکھتے تھے۔ (کہئے کہ یہ ان کی Specialty تھی) یہ خصوصیت تھی اسلام اور کفر کے حدود کو دو اور دو چار کی طرح واضح کر کے عقلی طور پر بھی قابل قبول بنا دینا۔ ۱۹۷۴ء میں جب پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم فرقہ قرار دئے جانے کے لئے علماء پاکستان کی طرف سے وہ زبردست تحریک شروع ہوئی جس کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے بالآخر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیدیا۔ اس موقع پر ہندوستان میں غیر مسلم پڑیس کی طرف سے اور خود بہت سے ”روشن خیال“ مسلمانوں کی طرف سے اس کی ایسی سخت مذمت ہوئی، کہ جیسے قادیانیوں پر ایک بھاری ظلم کیا گیا ہو۔ اس وقت مسئلہ کی وضاحت کرنے کے لئے یہ مضامین یکے بعد دیگرے لکھے گئے۔ اس سے چودہ پندرہ برس پیشتر اسلام اور کفر کے اس مسئلہ کی وضاحت کی ضرورت اُس وقت بھی پیش آئی تھی جب پاکستان میں پرویزی مسلک کے بانی مسٹر غلام احمد پرویز کی تکفیر کا فتویٰ جاری ہوا تھا۔ اُس موقع پر بھی آپ کو اس سے متعلق بحث میں حصہ لینا پڑا تھا۔ آپ کی وفات پر لکھے گئے اپنے مضمون میں مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی نے اس قضیے سے متعلق آپ

کے حصہ کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ تحریر کیا تھا وہ یہاں پڑھنے کے لائق ہے:

”۶۰ء کے لگ بھگ پاکستان و ہندوستان کے علماء نے مل کر غلام احمد پرویز صاحب کی کتابوں کا جائزہ لیا اور ایک متفقہ فتویٰ مرتب کیا جس میں کہا گیا تھا کہ پرویز صاحب اپنے بعض گمراہانہ عقائد و افکار کی وجہ سے دائرۃ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ فتویٰ پرویز صاحب کی کتابوں کی چھان بین کے بعد مرتب کیا گیا تھا اور اس پر تمام مسلم مکاتب فکر کے علماء کے دستخط تھے۔

”اس موقع پر پرویز صاحب کے حلقے نے یہ کہہ کر آسمان سر پہ اٹھالیا کہ علماء کرام کا تو مشغلہ ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کافر بناتے رہیں، اسلامی عقائد و اصول سے ناواقف بہت سے دوسرے حضرات بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس فتوے کو اعتراضات کا نشانہ بنانے لگے۔ اس موقع پر پروپیگنڈے کی تردید میں بھی متعدد مضامین و مقالات منظر عام پر آئے لیکن اس موضوع پر سب سے زیادہ مدلل، زور دار اور دل میں اتر جانے والی تحریر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تھی جو الفرقان میں شائع ہوئی تھی اور اسے پاک و ہند کے بہت سے علمی مجلات نے نقل کیا۔ مولانا کے مستحکم اندازِ تحریر کا قائل تو میں پہلے بھی تھا، لیکن اس تحریر سے اندازہ ہوا کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے قاری کو اپنے ساتھ بہا لیجانے کی کس غیر معمولی صلاحیت سے مالا مال فرمایا ہے۔ اور حقیقت یہ کہ ان کے اس مضمون نے ”تکفیر“ کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی دھند صاف کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔“ (الفرقان، اشاعت خاص بیاد حضرت بانی الفرقان۔ ۱۹۹۸ء)

سو، یہ کتابچہ صرف ایک قادیانیوں ہی کے مسئلے کو صاف نہیں کرتا، بلکہ اصولی طور سے دل میں اتر جانے کے انداز میں بتاتا ہے کہ اسلام اور کفر کے حدود ہیں کیا؟ آدمی کب اسلام کی حدود سے نکل کر کفر کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ خود کو مسلمان ہی کہتا ہو؟ پس ”بہ قانت کہتر وہ بہ قیمت بہتر“!

شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ

منجد کی مشہور (اور بدنام) شخصیت (۱۱۱۵-۱۰۲۶ھ/۱۷۰۳ء-۱۷۹۲ء) جن کے نسبت سے ”وہابی“ کی گالی وجود میں آئی، ایک طرف پورے دیارِ عرب کو مشرکانہ بدعات سے پاک کر دینے کا کارنامہ ان کے نامہ اعمال میں رہا، دوسری طرف ایسے زبردست مخالفانہ پروپیگنڈہ کا نشانہ عرصہ دراز تک یہ شخصیت رہی کہ اسلامی دنیا کے حاملان و داعیانِ توحید و سنت بھی مخالفانہ نگاہ ہی سے ایک عرصہ تک دیکھتے رہے۔ انہی میں ہندوستان کے اکابر دیوبند بھی تھے۔ آخر کار یہ غبار چھٹا اور اکابر دیوبند میں سے جن بزرگوں نے شیخ پر مخالفانہ

اظهار رائے کیا تھا حقیقت معلوم ہونے پر اپنے اقوال سے رجوع فرمایا۔ مگر یہ ایسے انداز سے نہیں ہوا جس سے سابق اقوال کا اثر اچھی طرح زائل ہو جاتا۔ چنانچہ ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک دیوبندی طالب علم کو جامعہ کے ماحول میں ضرورت محسوس ہوئی کہ جن اکابر دیوبند (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) کی مخالفانہ رائیں کبھی شائع ہوئی تھیں ان کے اور ان کی نوعیت کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ طالب علم مذکور نے اس ضرورت کے لئے حضرت صاحب سوانح کی خدمت میں لکھا، اور وقت کے اکابر دیوبند میں سے یہ انتخاب بظاہر اس لئے تھا کہ حضرت والا کی رابطہ عالم اسلامی کی رکنیت کی بنا پر عالم عربی کے نمائندہ علماء و اعیان آپ سے واقف ہو چکے تھے۔ چھوٹے کتابی سائز پر تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا یہ رسالہ طالب علم مذکور کی اسی تحقیق طلبی کا جواب ہے۔ اور عربی مقولہ کے مطابق ”علیٰ الخبیر سقطت“ (تم صحیح آدمی کے پاس پہنچے) کھلوالینے والا جواب۔ اور ہونا بھی چاہئے تھا، کہ موضوع دعوت توحید و درویشک و بدعات کا تھا۔ اور اس موضوع پر آپ جماعت دیوبند کے فریڈ اور مصدق نمائندہ۔

اللہ اس نیک طالب علم کو بڑی ہی بہتر جزاء دے، مسئلہ پر ایک ایسی مبسوط تحقیقی گفتگو اس کے سوال کے نتیجہ میں مرتب ہو گئی ہے کہ دور قریب کا کوئی گوشہ شاید نہ چھوٹا ہے نہ تشنہ رہا۔ مخالف پروپیگنڈہ کی نوعیت، اس میں شریک عناصر، شیخ کی دعوت پر اس کے اثرات، شیخ کی واقعی دعوت، اس دعوت میں اور اکابر دیوبند کے توحیدی موقف میں مشترک اور غیر مشترک عناصر۔ اکابر اہل حدیث کا اس دعوت توحید کے سلسلہ میں موقف دروید۔ پھر شیخ کی سرپرستی میں اٹھنے والے سعودی خاندان کے حجاز پر غالب آنے اور اپنے مسلک کے مطابق وہاں مزارات کے قبے گرانے پر بریلی کے قوری مشائخ کی جیج و پکار، نیز حضرت شاہ اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان اور شیخ ابن عبد الوہاب کی ”کتاب التوحید“ کا رشتہ جوڑنے میں ان کی دستکاریاں۔ یہ سبھی کچھ اس کتاب میں آگیا ہے۔ یعنی ایک دور کا پورا علمی و تاریخی منظر نامہ سامنے آ جاتا اور سیراب کر جاتا ہے۔

فیصلہ کن مناظرہ

یہ آپ کے اس تاریخی ”مناظرہ لاہور“ کی یادگار ہے جس کے نتیجہ میں بریلی سے ماہنامہ الفرقان کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا۔ جیسا کہ دوسرے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ اس دور کی کتاب ہے جس کا باب آپ نے ۱۳۶ھ میں بند کر دیا تھا۔ مگر ”۔۔۔ کبھل نہیں چھوڑ رہا“ کے مطابق جب ایک عرصہ کے بعد اس فتنہ نے پھر بہت سر اٹھایا اور لوگ آپ سے پے پے متقاضی ہوئے کہ اس سلسلہ کی کتابیں پھر مہیا فرمائی

جائیں تو مجبوراً آپ نے خاص ضرورت کی دو کتابوں پر نظر ثانی کر کے کتب خانہ الفرقان کے حوالہ کر دیں جن میں سے ایک یہ تھی۔

وہ طے شدہ مناظرہ تو، جیسا کہ گزرا، بریلوی عمائد و اکابر نے برپا ہونے ہی نہ دیا۔ لیکن اس کے جو طے شدہ موضوعات تھے ان پر حضرت صاحب سوانح نے اپنے تحریری بیانات مولانا حامد رضا خاں (ابن احمد رضا خاں صاحب) کو بھیجنے کا سلسلہ شروع فرما کر موصوف سے چاہا کہ مجمع عام میں آئے سانسے ہو کر زبانی نہیں تو تحریری طور پر غائبانہ ہی گفتگو فرمائیے، اور پھر یہ سلسلہ مکمل ہو جانے پر پوری کاروائی طے کئے گئے جج صاحبان (علامہ اقبال وغیرہ) کو فیصلہ کے لئے بھیج دی جائے، کہ مسلمان قوم دیوبندی بریلوی جھگڑے سے کسی طرح باہر آئے۔ لیکن جب اس کا جواب بھی خاموشی سے ملا تو آپ نے مناظرہ کے طے شدہ موضوعات پر، جو مولانا احمد رضا خاں صاحب کے تکفیری فتوے ”حسام الحرمین“ سے تعلق رکھتے تھے، اپنے مکمل بیانات ”معرکہ القلم“ کے عنوان ”بے الفرقان میں قسط وراشائع کر کے اپنی حد تک حجت تمام کی۔ اور ان بیانات کا مجموعہ اس (فیصلہ کن مناظرہ) کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ان بیانات کا تعلق اکابر دیوبند (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا غلیل احمد سہارنپوری اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) پر مولانا احمد رضا خاں صاحب کے افسوسناک تکفیری الزامات سے ہے جن کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمان ایک ناحق کی مستقل عقائدی جنگ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اپنے موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھنے والی اور تاریخی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ عام کتابی سائز پر ۱۶۰ صفحات ضخامت کی۔

مسئلہ حیات النبیؐ کی حقیقت

مشکل سے ۲۴ صفحے کی تصنیف ہے۔ مگر علمی اہمیت کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی اہمیت بھی رکھنے کی بنا پر اس کی مستحق ٹھہری ہے کہ اہم تصنیفات کے ذیل میں درج کی جائے۔ حیات النبیؐ (علیہ السلام) کا مسئلہ جو، گزشتہ صدی کی غالباً پانچویں دہائی میں، پاکستان کے علماء دیوبند کا ایک اندرونی نزاعی مسئلہ، حضرت نانوتویؒ کی تحقیق کے حوالہ سے بن کر اٹھا، اس کے بارے میں حضرت صاحب سوانح کے پاس پاکستان سے خطوط آنے شروع ہوئے کہ ایک قول فیصل کی ضرورت ہے۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ اور اسی دوران میں حضرت مولانا علی میاں کا سفر پاکستان ہوا۔ تو آپ نے بھی واپسی پر بڑی ضرورت بتائی کہ اس مسئلہ پر جلدی کچھ لکھیں، تب آپ نے بنام خدا یہ جماعتی فرض ادا کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور ممکن حد تک اپنی اس کوشش کو

زیادہ موثر بنانے کیلئے دیوبند کا سفر اپنی اس تحریر کو لے کر کیا، وہاں اپنے استاذ حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کی خدمت میں اسے پیش کر کے، جو دیوبند میں حضرت نانوتویؒ کی تحریروں کے خاص الخاص شارح تھے، اس کی تصویب حاصل کی۔ نیز وہاں سے سہارنپور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں سے بھی توثیق پائی۔ اس سب تفصیل کے ساتھ آپ نے اولاً اسے الفرقان میں شائع کیا اور بعد میں لوگوں کے تقاضے پر یہ کتبخانہ الفرقان سے پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوا۔

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

اس کتاب کا بہت کافی تذکرہ تصنیفات کا باب شروع ہونے سے پہلے گزرا ہے۔ لیکن وہ کتاب کے تعارف کے ضمن میں نہیں اس کے محرک اور پس منظر کے ضمن میں تھا۔ تعارف کا مرحلہ باقی رہا تھا۔ ۳۰۰ صفحات ضخامت کی یہ کتاب ہے۔ اور، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں ایرانی انقلاب کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس کے مطابق یہ محض پروپیگنڈہ ہے کہ یہ انقلاب حکومت ایک خالص ”اسلامی انقلاب“ ہے جس سے رسول اللہ (ﷺ) کے لائے ہوئے انقلاب کی تجدید ہوگی، جبکہ حقیقت میں وہ ”ولایت فقیہ“ کے عنوان سے اس مفروضہ انقلاب کا پیش خیمہ ہے جو شیعہ عقیدے کی رو سے ”امام غائب“ کے ظہور پر رونما ہوگا۔ اور اس میں جو کچھ شیعہ عقائد کے مطابق پیش آتا ہے وہ، جیسا کہ معلوم ہے، اصلاً سنّی اسلام کی جڑیں کھود کر پھینک دینا ہے۔ دوسرے حصے میں بانی انقلاب امام خمینی کی تصنیفات کی روشنی میں ان کا تعارف ہے جو بتاتا ہے کہ وہ مکمل طور پر شیعیت کی علمبردار شخصیت ہیں اور یہ سوچنے کی بھی گنجائش ان کے بارے میں نہیں ملتی کہ وہ شیعہ عقائد و تصورات سے بلند ہو سکتے ہیں اور لا سنیہ ولا شیعہ کی سچ مچ کوئی حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ تیسرا حصہ شیعیت کی حقیقت پر ہے، اور یہ اس معنی کی کتاب کا اہم ترین حصہ ہے کہ شیعیت کی واقعی حقیقت اتنے واضح اور دو ٹوک پیمانے پر اس سے پہلے عامۃ المسلمین کی رسائی میں نہیں آئی تھی۔ اس سلسلے کی یہ پہلی کتاب ہے جس نے شیعیت کو ایک ضد اسلام حقیقت کے طور پر سمجھنا ہر کہہ و مہ کے لئے ایسا آسان کر دیا کہ کتنے ہی وہ سلیم الطبع افراد جو اس انقلاب کے سلسلہ میں ایرانی پروپیگنڈہ کا شکار ہو کر اس کے پر جوش حامی بنے ہوئے تھے اس کتاب کے مطالعہ کی بنا پر تائب ہوئے۔ ایرانی انقلاب کا مسئلہ تو اب پرانا ہو گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت آپ سے آپ بھی کھلتی چلی گئی۔ لیکن شیعیت اس سے مختلف چیز ہے، اسے جو کوئی مختصر اور دو اور دو چار کے انداز میں سمجھنا چاہے اس کے لئے یہ کتاب ہمیشہ تازہ ہے۔ کتاب کی تاثیر کے لئے درج ذیل ایک مثال بہت کافی ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا تاثر

کتاب شائع ہو جانے کے بعد تو اس کی تاثر و مقبولیت جس خداداد انداز سے سامنے آئی وہ تو بعد کی بات ہے، کتاب ابھی تیار نہیں ہوئی تھی، صرف ابتدائی حصہ الفرقان میں قسط وار نکلا تھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مدیر برہان۔ دہلی (جو ایک طرف تو حضرت صاحب سوانح ہی کی طرح حضرت علامہ انور شاہ صاحب کے شاگردوں میں تھے دوسری طرف اس صف کے علمائے دیوبند میں غالباً واحد ہستی تھے کہ ”ایک روشن خیال“ عالم شمار ہوتے) آپ الفرقان کی ان قسطوں سے پہلے اپنے ماہنامہ برہان کے اداروں میں خمینی صاحب کے ”اسلامی انقلاب“ کا زوردار خیر مقدم کر چکے تھے۔ لیکن الفرقان میں نکلنے والی کتاب کی ان قسطوں کو پڑھا تو برہان ہی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں تحریر فرمایا کہ:

”۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے برادر محترم مولانا محمد منظور نعمانی کو کہ انھوں

نے نہایت محنت اور جاں فشانی سے ان کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جو خود علامہ خمینی کے قلم کی رہنمائی منت ہیں۔ اور اس دقیق و عمیق و وسیع مطالعہ کے نتائج صاف اور شستہ زبان میں نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ماہنامہ الفرقان کی گزشتہ چند اشاعتوں میں شائع کر دئے ہیں۔

”میں نے مولانا کے یہ مقالات بڑی دلچسپی سے از اول تا آخر پڑھے اور اب میں اعلان کرتا ہوں کہ ایرانی انقلاب یا موجودہ ایرانی حکومت کے متعلق میں نے اب تک برہان میں جو کچھ لکھا میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ مولانا کے یہ مضامین اس درجہ اہم اور بصیرت افروز ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان ان سے اختلاف کی جرأت کر سکتا ہے۔۔۔۔۔“

اس سے بھی بڑی تاثر!

کتاب کی تصنیف کا محرک اہل سنت کا وہ طبقہ ہوا تھا، جو کہ ایرانی انقلاب کو واقعی اسلامی انقلاب اور خلافت راشدہ کی تجدید اور خمینی صاحب کو خلیفۃ المسلمین مان کر اس کا زبردست پروپیگنڈہ کر نیوالا بن گیا تھا، بالخصوص جماعت اسلامی کا حلقہ اثر، الحمد للہ خود وہ بھی اس کتاب کی تاثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اپنی واقفیت کے متعدد اور نمایاں حضرات کے بارہ میں علم ہے کہ اس کتاب نے انھیں جماعت کے عام رجحان سے بالکل کاٹ دیا۔ اور معلوم نہیں کتنے ہوں گے جن کا ہمیں علم نہیں۔

ایک نصابی کتاب

الفیۃ الحدیث

مذکورہ بالا کتابوں سے مختلف نوعیت کی آپ کی ایک کتاب ” الفیۃ الحدیث “ نامی ہے جو مدارس عربیہ میں علم حدیث کی پہلی کتاب کے طور پر پڑھائی جانے کیلئے مرتب کی گئی۔ اس تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں حدیث شریف کی جو پہلی کتاب طالب علم کے ہاتھ میں آتی تھی وہ ” مشکوٰۃ المصابیح “ تھی، جب کہ عرصہ دراز تک یہی حدیث کی آخری کتاب بھی رہی، اگرچہ اب صورت حال مختلف ہے، اب حدیث کی آخری کتابیں صحاح ستہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) ہیں۔

الغرض، مشکوٰۃ شریف، اول تو بخاری مسلم ہی جیسی تقطیع پر، ۶۰۰ صفحے کی ضخیم اور جامع کتاب ہونے کی بنا پر پہلی کتاب کی حیثیت سے موزوں نہیں کہی جاسکتی تھی، پھر درس کی جیسی تقریروں کا رواج ہے وہ اس کو مزید مشکل اور بوجھل بنا دینے والا۔ ہو سکتا ہے کہ گزشتہ زمانوں میں طلبہ کا شوق و یکسوئی اور اچھی استعدادیں انھیں اس بوجھ کا تحمل بنا دیتی ہوں، لیکن اب تو نہ وہ شوق اور نہ وہ استعدادیں۔ اس لئے اکابر علماء کو عرصہ سے اس ضرورت کا احساس ہوتا تھا کہ مشکوٰۃ سے پہلے ایک یاد دہلکی کتابیں پڑھائی جائیں۔

۱۹۷۰ء کے قریب کسی وقت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں اس ضرورت کا تذکرہ ہوا اور سب ہی نے اس کو تسلیم کیا۔ لیکن مشکوٰۃ المصابیح سے پہلے حدیث کی کوئی ایسی کتاب شامل نصاب کی جائے جو اس اہم مسئلہ کو حل کرے؟ اس سوال کے جواب میں کوئی موجودہ کتاب سامنے نہیں آ پاتی تھی۔ سو اہل شوریٰ نے مشورہ سے یہ طے کیا کہ ایسی کتاب تو جو مذکورہ ضرورتوں کو پورا کرے تیار ہی کرانی پڑے گی۔ اور اس مشکل و مبارک کام کے لئے شوریٰ نے بالاتفاق حضرت صاحب سوانح کا نام طے کیا، کہ اپنی شہرہ آفاق حدیثی خدمت ” معارف الحدیث “ کی کئی جلدیں تصنیف فرما چکے تھے، جو اس بات کا مظہر تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حدیث پاک سے خصوصی مناسبت اور اس کا خصوصی ذوق و استحضار عطا فرمایا ہے۔ اور آپ نے بھی، جو اس ضرورت کا مختلف وجوہ سے زیادہ ہی احساس رکھنے والوں میں تھے، بے تکلف اس خدمت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ اسی ذمہ داری کے ماتحت تیار کی گئی کتاب یہ ” الفیۃ الحدیث “ ہے۔ یعنی درس نظامی کی پہلی حدیثی کتاب، جو دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ میں بصد تشکر قبول کی گئی۔ اس میں آپ نے ایک ہزار احادیث پر مشتمل

وہ تمام ابواب جمع کر دئے ہیں جو ابتدائی منزل پر پڑھائے جانے کے لئے مناسب ہیں۔ اور جن خصوصیات کی جامع آپ کی معارف الحدیث ہے ان میں سے جس قدر کی گنجائش اس مختصر کتاب میں ہو سکتی تھی ان سب کی حامل قدرتی طور سے یہ بھی ہے۔

آپ کی کُل وہ تصنیفات و تالیفات، ایک نظر میں

جو اس وقت دستیاب ہیں

۲۰۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

۲۱۔ ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

۲۲۔ خمینی اور اثنا عشریہ کے بارہ میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ

۲۳۔ بوارق الغیب یا مسئلہ علم غیب کا قرآنی فیصلہ

۲۴۔ مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت

اور اب میرا موقف

۲۵۔ تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات

۲۶۔ مسئلہ حیات النبیؐ کی حقیقت

۲۷۔ نماز اور خطبہ کی زبان

۲۸۔ عقیدہ علم وغیب

۲۹۔ قرب الہی کے دور راستے

۳۰۔ قرآن وحدیث کی سودعائیں

۳۱۔ قرآن اور صاحب قرآن کا تعارف

۳۲۔ انسانیت زندہ ہے (اردو، ہندی)

۳۳۔ میری طالب علمی

۳۴۔ آپ کون ہیں، کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟

۳۵۔ الفیۃ الحدیث (عربی)

۳۶۔ تحدیثِ نعت

۱۔ اسلام کیا ہے؟ (اردو، ہندی، انگریزی)

۲۔ دین و شریعت (اردو، انگریزی)

۳۔ قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ (اردو، انگریزی)

۴۔ درس قرآن

۵۔ معارف الحدیث (۸ جلدیں۔ اردو انگریزی)

۶۔ تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی

۷۔ ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ (اردو، ہندی)

۸۔ تصوف کیا ہے؟

۹۔ آپ حج کیسے کریں؟ (اردو، ہندی)

۱۰۔ آسان حج (اردو، ہندی)

۱۱۔ کلمہ طیبہ کی حقیقت

۱۲۔ نماز کی حقیقت

۱۳۔ برکاتِ رمضان (اردو، ہندی)

۱۴۔ منتخب تقریریں

۱۵۔ قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

۱۶۔ کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت

۱۷۔ قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

۱۸۔ شیخ محمد ابن عبدالوہاب کی خلاف پروپیگنڈہ اور

علماء حق پر اس کے اثرات

۱۹۔ فیصلہ گن مناظرہ

دسواں باب

بیرون ہند کے اسفار و افادات

[اندرون ملک تو آپ کے اسفار کی وہ کثرت رہی کہ گنتی اور شمار امکان سے باہر۔ اللہ نے آپ کو مزاج دیا کہ اپنے اساتذہ سے حاصل کئے علم سے اپنے ابنائے ملت کو مقدور بھر فائدہ پہنچائیں۔ سو فراغت کے بعد ہی سے یہ سلسلہ تقریر اور تحریر شروع ہو گیا۔ اور جب تک چلنے پھرنے سے معذوری والی کیفیت نہ ہو گئی فیضِ رسانی کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔ آغاز، دین حق کے دفاع میں مناظروں سے ہوا تھا، طبیعت کا رخ بدلاتو یہ سلسلہ خالص دعوتی و اصلاحی جدوجہد میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم سے پہلے پورا بڑا صغیر آپ کی جولاں گاہ تھا۔ تقسیم کے بعد یہ جولاں گاہ ہندوستان کے باقی بچ جانے والے حصہ ہی تک بالعموم محدود ہو گئی۔ لیکن یہ باقی بچ رہنے والا ہندوستان بھی کوئی چھوٹی موٹی جگہ نہ تھی۔ الگ ہو جانے والے حصے سے بدرجہا بڑا۔ اس سرے سے اس سرے تک ہزاروں میل کے فاصلے۔ غرض ”ملک خدا تک نیست“ کا معاملہ تھا۔ ہاں یہ ملک ٹکٹ ہوا تو تبلیغی جماعت کی جدوجہد کیلئے، ہوا، کہ وہ اس کے حدود میں رہنے پر قانع نہ رہ سکی، بلکہ سارے عالم اس کا میدانِ عمل بنا۔ اور ”ہل من مزید“ کی پیہم صدا اس کی زبانِ حال سے سنی جاتی ہے، اور آپ کے بیرونی اسفار میں اس تبلیغی سلسلے سے وابستگی کا بھی حصہ ہے۔ اللہ انھیں قبول فرما کر اپنے بندہ کو فائز الزمام کرے۔]

پہلا بیرونی سفر ۱۹۵۲ء

(پاکستان کا پہلا اور طویل سفر)

بیرون ہند آپ کا پہلا سفر ۱۹۵۲ء میں مغربی پاکستان کا ہوا۔ یہ علاقہ آپ کے لئے قریب قریب ایسا ہی تھا جیسا آج کا باقی ہندوستان۔ تقسیم سے پہلے ادھر آپ کے بکثرت سفر ہوئے تھے۔ الفرقان کی

خریداروں کی بھی خاصی تعداد ادھر تھی۔ مگر تقسیم نے وہ دیوار راتوں رات کھڑی کر دی کہ اب ادھر سے ادھر جانا ہفت خواں طے کرنے کے مترادف تھا۔

جیسا کہ اس سفر کی روداد الفرقان میں دیتے ہوئے آپ نے لکھا کہ ”پہلے اپنے وطن کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے شہریت کی سند اور سفر کا اجازت نامہ (نو آ بنگلشن) حاصل کرنا، پھر دوسرے ملک کے ہائی کمشنر کے دفتر سے پرمٹ بنوانے کے لئے ہفتوں اور کبھی کبھی مہینوں دوڑ دھوپ کرنا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے خیال ہی سے ہم جیسوں کی طبیعت ہار کے بیٹھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ باوجود اپنی دلی خواہش اور دوستوں کے تقاضوں کے پاکستان بننے کے بعد سے اب تک سفر کی ہمت نہ کی جاسکی۔“ لیکن بعض ضروری کاموں کے تقاضے سے آپ نے اس ہفت خواں کو کسی طرح طے کرنا طے ہی کر لیا گیا۔ اور پھر جب ارادہ کر لیا تو جیسا کہ تحریر فرمایا ہے ”اللہ کے فضل و کرم نے سارے قانونی مراحل بھی آسانی سے اور کم سے کم وقت میں طے کرادیئے، اور فروردی کو یہ عاجز بمبئی سے بحری جہاز سے روانہ ہو کر ۱۱ فروری کو کراچی جا پہنچا۔ اور پھر ۲۶ فروری تک پورے ۱۹ دن کراچی ہی میں قیام رہا۔ اس کے بعد یکم مارچ سے ۱۸ مارچ تک سندھ، پنجاب اور سرحد کے بعض اور مقامات پر بھی ایک ایک دو دو دن کے لئے جانا ہوا، اور ۱۹ مارچ کو پھر کراچی واپس آ کے ۲۵ مارچ کی شب میں وہاں سے روانہ ہو کر اسی رات میں دہلی آ گیا۔“

یہ سفر ڈیڑھ مہینے کا ہوا، جس میں سے مجموعی طور پر ۲۵ دن کراچی میں قیام رہا، اس لئے روداد سفر میں جو واقعات اور احساسات و تاثرات آئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر کراچی ہی سے ہے۔ اور یہ ”تبلیغی کام“ سے شروع ہوتے ہیں، کہ ضرورت جس کے تقاضے سے سفر ناگزیر ہی جانا اگرچہ کچھ اور رہی۔ مگر اس بہانے سے پاکستان پہنچنا ہو گیا تو پھر اس موقع سے تبلیغی کام کا حال دیکھنا تھا، اور سفر کا کافی وقت اسی کی نذر ہوا۔

کراچی میں تبلیغی کام

”اپنا تبلیغی کام (یعنی مسلمانوں میں ایمانی رُوح اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کی جدوجہد)

جیسی ہونی چاہئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے پاکستان بننے کے بعد جیسے مواقع یہاں دیئے ہیں اس کے لحاظ سے تو یہ کام یہاں بہت کم ہے، لیکن ایک چیز ہے جو مستقبل کے بارے میں امید بندھاتی ہے اور گو نہ اطمینان دلاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے چند مخلص بندے اس راہ میں ایسی محنتیں اور قربانیاں کر رہے ہیں جس سے ہم جیسوں کو عبرت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی کری می سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی محنت کو ضرور بار آور فرمائیں گے۔ ان میں سے اکثر

ملازمت پیشہ ہیں، بعض خاصی بڑی تنخواہ پانے والے بھی ہیں، غالباً تاجر بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور ان کی محنتوں کو بار آور کرے۔ ان میں سے بعض کا حال تو یہ ہے کہ کراچی میں رہتے ہوئے ہفتوں گھر جانے کا ان کو موقع نہیں ملتا، مکی مسجد (جو یہاں کے تبلیغی کام کا مرکز ہے اور جو پاکستان کے کام کے لئے گویا نظام الدین کی جگہ والی مسجد ہے، بلکہ خستہ حالی اور بے سرو سامانی میں اُس سے بھی کچھ آگے ہے) اسی کا متعلقہ محن گویا ان دوستوں کا صفہ ہے۔ رات کو وہیں جمع ہو کر مشورے اور دینی تقاضوں کے متعلق سوچ بچار کرتے ہیں پھر وہیں پڑ کے سو جاتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد پھر کچھ تشکیلیں اور تجویزیں کرتے ہیں، پھر وہیں سے اپنے اپنے دفاتروں یا دوکانوں پر چلے جاتے ہیں، اور دفاتروں سے فارغ ہو کر سیدھے وہیں آ جاتے ہیں۔ دونوں وقت کا کھانا اُن کے گھروں سے مکی مسجد ہی پہنچتا ہے۔ اور باہر سے آئے ہوئے تبلیغی سلسلہ کے مہمان روزانہ ان کے مہمان اور شریک طعام ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت بڑی قابل رشک ہے ان کی زندگی۔

”بعض دوستوں کے متعلق معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ان کو گھر کی صورت دیکھے مہینہ سے اوپر ہو جاتا ہے، اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ اگر دین کی راہ میں تکلیفیں اٹھانے کے اس ذائقہ کو انھوں نے نہ چکھا ہوتا تو شاید غریبوں سے بات کرنا اور نماز کے لئے مسجد میں آنا بھی وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔۔۔۔۔ بہر حال ان دوستوں کا یہ حال دیکھ کر بڑی عبرت اور بڑی خوشی ہوئی، اور الحمد للہ اس حقیقت پر اور یقین بڑھا کہ زندگی میں دین کے آنے اور قوم میں ایمانی روح کے پیدا ہونے کا راستہ یہی ہے کہ افراد میں ایمان و احتساب کی صفت پیدا کرنے کے لئے جد و جہد کی جائے۔۔۔۔۔ جن دوستوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے انھوں نے اونچی اونچی تنخواہ پانے کے باوجود دین کی سربسزی کے لئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فکر میں غربت والی اور جد و جہد و مشقت والی یہ بوترا بی زندگی جب ہی اختیار کی ہے جب اللہ کے کچھ بندوں نے اُن میں ایمان و احتساب کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اور ان کی طبیعتوں کا رخ اللہ کی رضا کی طرف اور جنت کی نعمتوں اور لذتوں کی طرف پھیرنے کے لئے جد و جہد کی۔ بس کاراين است غير ايس همه چيچ“

اختفال علماء اسلام

”فروزی کے تیسرے ہفتہ میں علماء اسلام کی یہ کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ عاجز بھی اس کی بعض نشستوں میں ایک مشاہد کی حیثیت سے شریک ہوا۔ چند علماء کرام دوسرے

ممالک سے بھی تشریف لائے تھے۔ برہا برس کے تجربہ کے بعد اس قسم کی کانفرنسوں کے متعلق جو مایوسی بہت پہلے سے دل میں بیٹھ چکی ہے افسوس ہے کہ اس کانفرنس کی کارروائی دیکھ کر اس میں کچھ اور اضافہ ہی ہوا اور یہ یقین اور بڑھ گیا کہ اس امت کے لئے یہ رسمی اور رواجی طریقے بالکل درست نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ عاجز تو عمر بھر کے تجربے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ اگر اللہ کے صرف دو مخلص بندے جن میں اخلاص کے علاوہ صلاحیت اور باہم اعتماد اور ایک خاص حد تک فکری اتحاد و ہودین کی خدمت و نصرت اور اس امت کی صلاح و فلاح کے لئے جدوجہد کو اپنی زندگی کا مسئلہ بنا کر کسی شکستہ مسجد کے گوشہ یا جنگل کے کسی درخت کے ہی نیچے کچھ وقت کے لئے سر جوڑ کے بیٹھ جائیں اور باہم مشورہ سے جو کچھ طے کریں اس پر اپنی زندگی کا سرمایہ لگانے کا فیصلہ کر لیں تو ان دو بندوں کا یہ جوئے کے بیٹھنا اس امت کے اور اس کے دین کے حق میں انشاء اللہ اس قسم کی کئی عالمی کانفرنسوں سے کہیں زیادہ خیر کا باعث ہوگا۔۔۔۔۔۔ بس اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے۔

کراچی کے عام حالات

”پاکستان بننے سے پہلے بھی اس عاجز نے کراچی دیکھا تھا، اس وقت کا کراچی پرانے کراچی سے بہت بدلا ہوا ہے، اور بہت ترقی کر چکا ہے۔ آبادی ۶۔۷ گنا بڑھ گئی ہے، اس کے علاوہ بھی ہر چیز میں ترقی ہے۔ تجارت میں ترقی ہے، تعلیم میں ترقی ہے، صنعت میں ترقی ہے، دولت میں ترقی ہے، قیام میں ترقی ہے، شہر کی رونق اور چہل پہل میں بہت ترقی ہے۔ اور غالباً سب سے زیادہ ترقی کانفرنسوں، جلسوں اور مشاعروں میں ہے۔ لوگوں نے بتلایا کہ شاید ہی کوئی اچھا یا بُرا دن ہوتا ہو کہ اس دن شہر میں کوئی کانفرنس کوئی بڑا جلسہ یا کوئی مشاعرہ نہ ہو۔۔۔۔۔۔ کاش ایمانوں میں اور دین سے تعلق میں اور آخرت کی فکر میں بھی اسی تناسب سے ترقی ہوئی ہوتی۔

افسوس دیکھنے والا زندگی کے اس پہلو میں کوئی ترقی نہیں محسوس کرتا۔۔۔۔۔۔ ہاں امیدیں ہیں اور اس راہ میں جاننا بازی کرنے والے خوش نصیبوں کے لئے میدان وسیع ہے۔

عوام کی حالت کو بہتر بنانے اور ملک و مملکت کو ترقی دینے اور مستحکم کرنے کے لئے جو ٹھوس تعمیری کام اور جو محنتیں ہونی چاہئیں، واقفین کا بیان ہے کہ ان میں بھی بہت کمی ہو رہی ہے اور مختلف کارکن طبقوں سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔

مہاجرین کی حالت

”لکھو کھا غریب مہاجرین کو خصوصاً مکان نہ ہونے کی بڑی تکلیف ہے۔ اس بارہ میں کام کا غیر معمولی پن اور حکومت کی بعض مجبوریوں بلاشبہ قابل لحاظ ہیں، لیکن سب پہلوؤں پر نظر رکھ کر بھی سینہ میں دل اور دل میں درد کا کوئی ذرہ رکھنے والا انسان حکومت اور خاص کر اس کے شعبہ آباد کاری کے متعلق بُرے خیالات کو اپنے دل میں آنے سے نہیں روک سکتا، پھر یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو صرف حکومت کی ذمہ داری سمجھ کر پاکستان کے عام شہری اپنے کو اس کی فکر سے سبکدوش سمجھ لیں اور اطمینان سے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ بقدر استطاعت و طاقت اس کی ذمہ داری سب پر ہے۔ جس شہر کو مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت کا دارالحکومت ہونے کا فخر و امتیاز حاصل ہو اس کا اس حال میں ہونا کہ کچھ لوگوں کے پاس تو عالی شان محلات اور اُن کے ساتھ وسیع تفریحی باغیچے ہوں اور اُن کے لاکھوں بھائی اس حال میں ہوں کہ اُن کے پاس بارش اور دھوپ سے بچا سکنے والی جھونپڑیاں بھی نہ ہوں، یہ نقشہ ہرگز اللہ کو پسند نہیں ہے اور اس میں بڑے خطرات ہیں۔ بہر حال پاکستانی حکومت اور وہاں کے عام شہریوں کا فرض ہے کہ پورے صدق دلانہ تعاون کے ساتھ وہ اپنے بے گھر بھائیوں کے واسطے سکونت کا انتظام کرنے کے لئے اپنے امکانی وسائل سے جدوجہد کریں۔ جب آپ اس کے لئے قدم اٹھائیں گے اللہ تعالیٰ آپ کی پوری مدد فرمائے گا اور اس سلسلہ کی ہر مشکل آپ کے لئے آسان کرے گا۔“

پاکستان میں دینی مدارس

”اتفاق کی بات ہے کہ سندھ، مغربی پنجاب اور سرحد میں ہمیشہ سے مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود دینی مدارس بہت کم تھے اور جو تھے وہ معمولی حالت میں تھے۔ اب ہمارے علماء کرام مدارس کے قیام کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں، جو مدارس اب تک قائم ہو چکے ہیں اور جن کا اس عاجز کو علم ہے ان میں سے تین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

- ۱۔ دارالعلوم الاسلامیہ - اشرف آباد، ٹنڈوالہار، ضلع حیدرآباد (سندھ) ۲۔ خیر المدارس، ملتان
- ۳۔ جامعہ اشرفیہ، لاہور

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مشہور جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امر تری جامعہ اشرفیہ لاہور کے غالباً بانی اور سرپرست ہیں اور صدر مدرس اس وقت حضرت مولانا ادریس کاندھلوی (صاحب التعلیق الصبیح) ہیں اور ملتان کا خیر المدارس گویا جالندھر کا خیر المدارس

ہے اور حضرت حکیم الامت ہی کے ایک دوسرے خلیفہ اور مشہور ممتاز عالم دین حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری گویا اس کے بانی اور سب کچھ ہیں۔ ان دونوں مدرسوں کو یہ عاجز نہیں دیکھ سکا، اس لئے ان کے بارے میں میرا علم بس اتنا ہی ہے۔ ہاں اول الذکر (دارالعلوم الاسلامیہ) کو دیکھنے کے لئے مستقل سفر کیا اور قریباً ڈیڑھ دو دن وہاں رہا، اور الحمد للہ بڑی خوشی ہوئی۔ یہ دارالعلوم گویا وہ مجوزہ دارالعلوم ہے جو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے قسم کا ایک مرکزی دارالعلوم قائم فرمانا چاہتے تھے۔ ضلع حیدرآباد (سندھ) میں ٹنڈوالہار ایک قصبہ ہے۔ اس کی خوش نصیبی ہے کہ اس دارالعلوم کے لئے قرعہ فال اس کے نام پڑا۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی (جو غالباً حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے بھی ہیں اور جن کا قرآنی درس روزانہ کراچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتا ہے) وہ اس دارالعلوم کے مہتمم اور گویا روح رواں ہیں، جہاں تک اُن سے ہو سکا ہے اہل علم و کمال کو جوڑنے کی انھوں نے بڑی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سلسلہ میں کامیاب بھی کیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری (سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور) اس دارالعلوم کے صدر مدرس ہیں۔ حضرت مولانا موصوف اس دور کی اُن ممتاز بابرکت ہستیوں میں سے ہیں جن کی مثالیں بہت ہی کمیاب ہیں اور جن کی محبت اور زیارت اور خدمت میں حاضری سے بڑی خیر کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ طالین صادقین کو توفیق بخشیں۔ حضرت ممدوح سے قریب ہو کر قلب میں اُن کی بڑی محبت پیدا ہوتی ہے۔

میرے بڑے شفیق اور محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب بخاری بھی یہاں حدیث و تفسیر کے استاذ ہیں، موصوف حضرت مولانا سید انور شاہ قدس سرہ کے اُن ممتاز ترین دو تین تلامذہ میں سے ایک ہیں جنھیں حضرت کے علم سے وافر حصہ ملا ہے، اور جن کے درس میں بیٹھ کے حضرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑا قابل رشک ہے اُن کا علم اور ان کا مطالعہ اور اُن کا حفظ۔

صف اول ہی کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی بھی ہیں۔ عرصہ تک مدرسہ فقہ دہلی میں حدیث کے استاذ رہے ہیں۔ نسائی شریف کے اپنے حاشیہ اور ترمذی شریف کے ابتدائی حصہ کی شرح سے علمی حلقوں میں متعارف ہیں۔ تدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی یہاں آپ کے سپرد ہے۔ پاکستان تشریف لانے سے پہلے دو تین سال آپ کا قیام بھوپال رہا۔ اس ناچیز کا تعلق اُسی زمانہ میں بڑھا، بڑی ہی شفقت اور محبت فرماتے ہیں۔

میرے دوست مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جے پوری (صاحب لغات القرآن) بھی

اس دارالعلوم کے مدرسین میں ہیں۔

مولانا احتشام الحق صاحب کی کامیابیوں اور دارالعلوم کی خوش نصیبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تجوید و قرأت کے لئے اس کو استاذ القرآن جناب مولانا عبدالمالک صاحب اللہ آبادی مل گئے، جو اس وقت اس فن کے مسلم ائمہ میں سے ہیں۔ طلبہ میں بھی خیر کے آثار زیادہ نظر آئے، خدا کرے کہ یہ چیز باقی رہے۔ طلبہ کی خواہش اور ان بزرگوں کی فرمائش پر اس عاجز نے طلبہ کے سامنے ان کی زندگی اور مقصد زندگی کے بارہ میں کچھ عرض بھی کیا۔

اس وقت درس و تدریس اور طلبہ کا قیام جن عمارتوں میں ہے وہ عارضی کام چلاؤ بنائی گئی ہیں۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے اور عزائم بڑے بلند ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا احتشام الحق صاحب کو بڑا حوصلہ دیا ہے، تخمینوں اور اسکیموں میں لاکھوں سے کم کا شاید اُن کے یہاں کوئی حساب نہیں ہے۔ اور لاکھوں کا مہیا کر لینا شاید اللہ نے اُن کے لئے آسان بھی کر دیا ہے۔ بہر حال اس معاملہ میں ان کی نگاہ بہت اونچی اور عزائم بہت بلند ہیں۔ اُن کے خیال میں دارالعلوم کا جو نقشہ ہے اور طلبہ کی زندگی کا بھی جو معیار اُن کے پیش نظر ہے وہ قریب قریب آج کل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں والا معیار ہے۔ اللہ خیر کرے بے تکلف عرض ہے کہ اس بارہ میں اس عاجز کو انشراح نہیں ہو سکا۔ اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ اس قسم کی ترقیاں ہمارے مدرسوں کے لئے کچھ راست نہیں آتیں، لیکن اس مالک میں سب قدرت ہے۔ یُنْخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَمِيتِ وَيُنْخْرِجُ الْمَمِيتَ مِنَ الْحَيِّ۔

طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کے متعلق مولانا محمد یوسف صاحب نے جن فیصلوں اور ارادوں کا اظہار فرمایا اور اُن سے بھی بڑی خوشی ہوئی۔ ان حضرات نے جو کچھ سوچا ہے اگر وہ عمل میں آگیا تو دینی تعلیم کے بارے میں انشاء اللہ نہایت ضروری اور نہایت مفید اصلاحی قدم ہوگا۔ اس موضوع پر سوچنے والوں کو اکثر افراط یا تفریط میں مبتلا دیکھا گیا ہے لیکن ان حضرات نے جو سوچا ہے اس میں ضرورتوں کے پورے لحاظ کے ساتھ اعتدال بھی ہے اور وہ تجویزیں قابل عمل بھی ہیں۔ بہر حال دارالعلوم جا کرجی بڑا خوش اور مطمئن ہوا۔ حق تعالیٰ شانہ اس شجرہ طیبہ کو ہر قسم کے شر و فتن سے محفوظ رکھیں۔“

دو ہفتے پنجاب اور سرحد میں

”ثَنُّوْ اللّٰہَ یَا رَکَّابِہِ سَفَرِ الدَّارِ الْعِلْمِ اور حضرات دارالعلوم کی زیارت ہی کی نیت سے کیا تھا۔ اس کے بعد پنجاب اور سرحد میں جہاں جانا ہوا اپنے تبلیغی کام کے سلسلہ میں جانا ہوا

اور پورے سفر میں رفقاء کی جماعت ساتھ رہی۔ اس دورہ کی مختصر روئید ابھی ہدیہ ناظرین ہے:
 ٹنڈوالہ یار سے روانہ ہو کر ۳ مارچ کی صبح بھاول پور پہنچے۔ بھاول پور میں ہمارے
 تبلیغی کام کو بہت اچھا کام سمجھنے والے تو بہت ہیں لیکن اس راہ میں محنت کرنے والے رفقاء کم ہیں،
 البتہ یہ دیکھ کر دل بہت خوش اور مطمئن ہوا کہ یہاں کے بعض اہل علم بھی اپنے علمی اور تدریسی
 مشاغل کے باوجود کام سے خاص شغف رکھتے ہیں اور رہنمائی کر رہے ہیں۔

۵ مارچ کی صبح کو بھاولپور سے لاہور کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ملتان پڑتا ہے،
 لیکن میں وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا اس لئے وہاں کے اپنے بزرگوں اور دوستوں سے معذرت کرتے
 ہوئے بذریعہ خط میں نے استدعا کی تھی کہ اسٹیشن پر زحمت فرما کر مجھے زیارت کا موقع دیں، اسی
 واسطے بھاولپور سے اس ٹرین کو اختیار کیا جو ملتان پر تبدیل کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا خیر
 محمد صاحب، مولانا عبدالشکور صاحب کسبل پوری، مولانا عبدالخالق صاحب، مولانا عبداللہ
 صاحب اور شہر کے بہت سے مخلص احباب اسٹیشن پر تشریف لے آئے تھے۔ ایک گھنٹے سے کچھ
 زیادہ ان حضرات کی خدمت میں حاضری نصیب رہی۔ بعض بزرگوں کے حکم کی تعمیل میں مختصر سا
 خطاب بھی کیا۔

ملتان سے روانہ ہو کر مغرب وعشاء کے درمیان لاہور پہنچے، پہلے سے چونکہ اطلاع تھی
 اس لئے اکثر تبلیغی احباب اسٹیشن پر تشریف لے آئے تھے۔ آسٹریلیین مسجد (جولاہور میں تبلیغی
 جماعتوں کا ایک مستقر ہے) اسٹیشن سے بالکل قریب ہے، وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز پڑھی، نماز
 کے بعد دوستوں نے کچھ باتیں کیں۔ جو اس موقع پر کہنی مناسب معلوم ہوئیں، پھر مشورہ سے کام
 کا پروگرام بنا۔ رات کو وہیں مسجد کے عقب میں ”ادارہ اصلاح و تبلیغ“ میں میرا اور جماعت کا قیام
 رہا۔ اگلے دن جمعرات کا تھا۔ دن کے اوقات میں اپنے بزرگوں اور پرانے دوستوں سے ملاقاتوں
 کا سلسلہ جاری رہا، لاہور میں تبلیغی جماعت کا مرکز باغبان پورہ میں بلال پارک کی مسجد ہے، ہفتہ
 وار اجتماع وہیں جمعرات کو ہوتا ہے۔ بعد مغرب وہاں پہنچ کر اجتماع میں شرکت کی۔ بعض
 دوستوں نے بتلایا کہ آج یہاں بہت سے حضرات ایسے بھی آئے ہیں جو ہمارے کام سے
 ناواقف ہیں یا غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اس لئے تقریر میں دعوت کی وضاحت اور تفہیم کی کوشش کی
 — لیکن قلوب تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، اس نے جن کے متعلق چاہا ان کو انشراح
 واطمینان نصیب فرمایا، سکھر (سندھ) میں جو اجتماع وسط اپریل میں ہونے والا ہے اس کے لئے
 ابھی سے علاقوں میں پھر پھر کے کام کرنے کی دعوت بھی دی گئی۔ (بلکہ اس دورہ کے قریبا ہر

اجتماع اور ہر خطاب میں دعوت یہی دی جاتی رہی

جمعہ اور شنبہ کو بھی قیام لاہور ہی میں رہا، جمعہ کو بعد نماز جمعہ نیلہ گنبد والی جامع مسجد میں اور ہفتہ کو بعد نماز مغرب آسٹریلین مسجد میں اجتماعات ہوئے۔ کام کرنے والے دوستوں کے ساتھ مشاورتی گفتگو کا سلسلہ بھی دونوں دن جاری رہا۔ اتوار کو لاہور سے روانگی ہوئی۔ شام کو گجرانوالہ پہونچے اور اگلا دن وہیں گذرا۔ اس تھوڑے سے وقت میں دو تین اجتماع ہوئے، یہاں مولانا عبدالواحد صاحب بڑے جوش اور اذعان کے ساتھ تبلیغی کام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی تعداد الحمد للہ کافی ہے۔ پیر اور منگل کی درمیانی شب میں گجرانوالہ سے روانہ ہو کر صبح کو پشاور پہونچنا ہوا، یہاں دو دن قیام رہا، اور دونوں دن اجتماع ہوا۔ کوہاٹ کے تبلیغی احباب کافی تعداد میں الحمد للہ پشاور آ گئے تھے۔ تیسرے دن (جمعرات کو) پشاور سے راولپنڈی پہونچے، اور یہاں قیام ۱۲ گھنٹہ سے بھی کچھ کم رہا، عصر سے قریباً عشاء تک اجتماع رہا، اور رات ہی میں وہاں سے سرگودھے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ضلع سرگودھا کی تحصیل جھادریاں سے ۷-۸ میل کے فاصلہ پر ڈھڈیان ایک گاؤں ہے۔ یہ مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ کا اصل وطن ہے، اور حضرت ممدوح چند مینے سے وہیں تشریف فرما ہیں۔ سرگودھا اور پھر وہاں سے ڈھڈیاں تک کا یہ سفر حضرت کی خدمت میں حاضری کی نیت سے کیا، لیکن وقت میں زیادہ گنجائش نہ تھی اس لئے قریباً ایک شب و روز ہی قیام رہ سکا۔ اور ۱۵ مارچ شنبہ کی صبح کو وہاں سے روانہ ہو کر عصر سے کچھ پہلے لائل پور پہونچنا ہوا، اور بعد مغرب جامع مسجد میں عام اجتماع ہوا، اور رفقہ سے مشاورتی گفتگو، اگلے روز بعد نماز فجر ہوئی۔ پھر اسی دن یعنی ۱۶ مارچ دوپہر کو وہاں سے روانہ ہو کر شام کو ہم لاہور پہونچ گئے۔ ۱۷ مارچ کو بھی لاہور ہی قیام رہا۔ دن کچھ ملاقاتوں میں گذرا، اور رات کو بعد نماز مغرب نیلہ گنبد والی مسجد میں اجتماع ہوا، یہ گویا اس دورہ کا آخری اجتماع تھا۔“

اس دورہ کے اجتماعات اور خطابات کی خاص دعوت

”ہر جگہ کے اجتماع اور خطاب میں الفاظ و عنوان کے کچھ فرق کے ساتھ ایک ہی دعوت اس پورے دورے میں دی اور وہ یہ کہ ہماری موجودہ زندگی وہ اصل ایمانی اور اسلامی زندگی نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے تھے اور ہمارے اندر اللہ کی ذات اور صفات پر اور آخرت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے نقشوں پر وہ یقین نہیں

رہا ہے جو زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت والی اور آخرت کی فکر والی زندگی بنایا کرتا ہے، اور جب تک ہم خود اپنی اس حالت کی بُرائی کو محسوس کر کے اس کو بدلنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے خدا نخواستہ ہماری یہی حالت رہے گی بلکہ اور زیادہ بگڑتی چلی جائے گی، اور اس کی اصلاح اور درستی کی تدبیر یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی کے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ وہ ہر مہینہ میں ۳-۴ دن اور ہر سال میں ایک چلہ یا ایک مہینہ اپنے دوسرے کاموں سے بالکل یکسو اور فارغ ہو کر اپنے اندر حقیقی ایمان و یقین پیدا کرنے اور اللہ سے اور دین سے اپنا تعلق بڑھانے کی فکر اور کوشش میں اور اللہ کے دوسرے بندوں کو اس کی دعوت دینے میں ایک خاص اور پروگرام کے مطابق صرف کیا کرے گا۔۔۔۔۔ بہر حال ہر جگہ لوگوں کو اسی کی دعوت دی گئی ہے اور اپنی بساط کی حد تک اس فیصلہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔۔۔ الحمد للہ ہر جگہ اللہ کے کچھ بندوں نے بات کو سمجھا اور قبول کیا، کچھ اسی وقت تیار ہو گئے اور کچھ نے آئندہ کے لئے ارادے کئے۔“

تبلیغی رفقاء کو چند خاص اہم مشورے

قریباً ہر جگہ کے تبلیغی رفقاء کی خدمت مندرجہ ذیل چند باتیں خاص طور سے عرض کیں۔

۱۔ اس عالم اسباب میں اس کام کے صحیح طور پر چلنے کا زیادہ دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ خود اس کام کو صحیح طور پر سمجھیں اور صحیح طور پر کریں۔ اس کام کے دو خاص بازو ہیں۔ ایک لوگوں کو دین کی سرسبزی کے لئے اور خود اپنے ایمان میں طاقت پیدا کرنے کے لئے سفر اور جدوجہد پر آمادہ کرنا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کے جو بندے ہماری دعوت پر آمادہ ہو جائیں اُن کے لئے پوری دلسوزی اور فکر مندی کے ساتھ اس کا انتظام کرنا کہ ان کا وقت اس کام کے صحیح اصولوں کے مطابق اس طرح صرف ہو جس سے ان کی ایمانی کیفیات میں اور آخرت کی فکر میں ترقی ہو اور صحیح اصولوں پر دین کی جدوجہد کا رواج ہو۔ کام کے ان دونوں بازوؤں میں سے اگر کوئی ایک بھی کمزور ہو گا تو کام نہیں چل سکے گا۔ اگر ہم لوگوں کو جدوجہد اور قربانی پر آمادہ کرنے میں کمزور پڑیں گے یعنی اوقات لینے کی کوشش میں کمی کریں گے تو یہ کام بالکل نہیں چلے گا، کیونکہ یہ کام ہی جماعتوں کی نقل و حرکت کا ہے۔۔۔۔۔ اور اگر ہم اوقات دینے والوں کے اوقات کے صحیح استعمال کی فکر نہیں کریں گے تو جانے والے کوئی نفع محسوس نہیں کریں گے۔ اور ایک دودفعہ کے تجربہ کے بعد وہ مایوس اور بددل ہو کر بیٹھ جائیں گے۔۔۔۔۔

یہ بات صرف نظری نہیں ہے بلکہ کام کرنے والوں کو دونوں قسم کی جماعتوں کا بار بار تجربہ ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم جتنی فکر اور کوشش لوگوں کو سفر اور جدوجہد پر

جدوجہد کی نعمت میں اُن کو بھی شریک کرنے کے لئے ہمارے واسطے ضروری ہے کہ ہم اُن کے ساتھ تدریجی حکمت عملی اختیار کریں اور ان کو دعوت اس طرح دیں کہ وہ اس کام کو اپنی طاقت سے باہر اور اپنے لئے ناقابل عمل نہ سمجھیں، جس کی صورت یہ ہے کہ اس کام میں شرکت کی ہلکی صورتیں بھی اُن کے سامنے رکھی جائیں، جب وہ آپ سے اور آپ کے کام سے کچھ مانوس ہو جائیں گے تو انشاء اللہ آگے قدم بڑھانا بھی اُن کے لئے آسان ہو جائے گا۔۔۔۔۔ بہر حال ایسا نہ ہو کہ ہماری سخت گیری اور انتہا پسندی کی وجہ سے امت کے کچھ طبقے اس کام سے ہمیشہ بے تعلق ہی رہیں، جس کے متعلق اللہ نے ہمیں یقین نصیب فرمایا ہے کہ یہ کام قلوب میں ایمان پیدا کرنے والا اور اللہ سے اور دین سے تعلق بڑھانے والا ہے۔ اگر خدا نخواستہ ہم نے ایسا کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ ہماری یہ بڑی بے رحمی اور بے دردی ہوگی۔ الغرض ہمیں اس کی پوری فکر ہونی چاہئے کہ حضور کی امت کے تمام طبقے کسی نہ کسی درجہ میں اس کام سے جڑ جائیں، خواہ کسی کا جڑنا اتنا ہی ہو کہ وہ ہمارے مقامی اجتماعات میں آنے لگے۔ اس راستہ کا ذرہ بھی نہ ہونے کے مقابلہ میں بہت ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے اس کام کے سلسلہ میں جو چیزیں منصوص نہیں بلکہ ہم نے غور و فکر اور تجربہ کے بعد بطور ضروری تدبیر کے ان کو اختیار کیا ہے اُن کے ساتھ ہمارا معاملہ وہ نہ ہو جو منصوصات کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسا کرنا غلو اور حدود سے تجاوز ہوگا اور بدعات ہمیشہ اسی غلطی سے وجود میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس غلطی سے ہماری حفاظت فرمائے۔

۵۔ چھٹی اور آخری بات یہ ہے کہ کثرت ذکر و دعا اس کام کا نور اور اس کی جان ہیں، ہمارے خاص کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ ذکر و دعا کا خاص اہتمام رکھیں، خصوصاً رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھنے کی اور اس کے بعد سے فجر تک ذکر میں مشغول رہنے کی اور خوب دل سے رونے اور اللہ سے مانگنے کی عادت ڈالیں اور تنہائی میں مراقبوں سے اس یقین کو بڑھائیں کہ دین اور دنیا دونوں لائٹوں کی ہر چیز کو وجود میں لانا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اُس کے سوا کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے اور ہماری کوشش صرف اس کے حکم کے تعمیل میں ہے۔ جس قدر یہ یقین بڑھے گا اسی قدر دعا میں جان اور قوت آئے گی۔ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَ لَا مُعْطٰی لِمَا مَنَعْتَ وَ لَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔

لاہور کی ملاقاتیں

۱۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین (لاہور) بڑی شفقت فرمانے

والے میرے بزرگوں میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ سے دین کی بڑی خدمت لی ہے، اور ہزاروں بندگان خدا کو دین کی نعمت آپ کے ذریعہ ملی ہے۔ وعظ وارشاد کے وسیع سلسلہ کے علاوہ درس قرآن آپ کا خاص ذریعہ فیض اور گویا آپ کی دعوت ہے۔ بھاو پور سے روانہ ہو کر جب ۵ مارچ کو لاہور پہونچا تو اگلے ہی روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، پاکستان بننے سے پہلے سال میں کئی کئی دفعہ حضرت ممدوح سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ ملک کی تقسیم کا اثر نفسیات پر بھی عجیب و غریب پڑا ہے۔ پاکستان کے جن بزرگوں اور دوستوں سے اب کے ملنا ہوا، اندازہ ہوا کہ ان ملاقاتوں کے وقت طرفین کے احساسات اور نفسیات پہلے زمانوں کی ملاقاتوں سے بہت مختلف قسم کے تھے۔

۲۔ اسی روز فیض باغ پہونچ کر محبت قدیم مولانا مطیع الحق صاحب دیوبندی سے ملاقات کی۔ مولانا علمی اور روحانی نسبت کے علاوہ وطن کی نسبت سے بھی دیوبندی ہیں۔ بڑی عجیب اور قابل تقلید موصوف کی زندگی ہے۔ ایک عرصہ سے لاہور کے کسی اسکول سے ملازمت کا تعلق ہے، اس تعلق کی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کرنے کے ساتھ قرآن مجید کا درس بھی دیتے ہیں، اس کے علاوہ بچوں کی تعلیم کا ایک خاص بڑا مرکز بھی قائم کر رکھا ہے جس کے ساتھ اولاد کا سا گہرا قلبی تعلق ہے، اسکول کے مقررہ چند گھنٹوں کے علاوہ پوری زندگی محض لوجہ اللہ اس تعلیمی مرکز کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ موصوف کی محنت و مشغولیت اور اُن کے اس تعلیمی مرکز کی کامیاب حالت کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ اگر چاہیں تو ملازمت وغیرہ اپنے معاشی مشغلوں کی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرنے کے ساتھ بھی کتنے بڑے دینی اور قومی کام کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان ہو یا ہندوستان یا دنیا کا کوئی اور ملک ہر جگہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ایسے بندگان خدا کا وجود ہے جو اس طرح اپنی زندگی اور اس کی قوتوں کو اللہ کے لئے وقف کر دیں۔

۳۔ لاہور میں جن بزرگوں کی ملاقات اور زیارت اس سفر میں میسر ہوئی اُن میں ایک خاص قابل ذکر بزرگ (کنڈیاں والے) حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب ہیں، مغربی پنجاب ضلع میاں والی میں کنڈیاں ایک مشہور بستی ہے۔ حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس آخری دور میں نقشبندی مجددی سلسلہ سلوک کے گویا ایک امام تھے وہیں اُن کی خانقاہ ہے۔ یہ حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب اُن کے خلیفہ راشد اور اُن کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں۔

دیوبند کی طالب علمی کے آخری سال دورہ حدیث میں ہم دونوں شریک وہم سبق تھے، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اُن کو تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا دیا اور ارقم سطور مختلف کوچوں اور میدانوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔

ماومجنوں ہم سبق بودیم درد دیوان عشق اوبصحرارفت وما درکوچہا رسوا شدیم

قریباً بیس سال تک تو میں مولانا کے احوال سے بالکل بے خبر رہا، اس کے بعد (اب سے کوئی ۵-۶ سال پہلے) کسی ذریعہ سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے ہمارے ساتھی اور ہم درس سابق مولوی عبداللہ صاحب لدھیانوی حضرت مولانا احمد خاں صاحب سے فیضیاب اور ان کی مقدس امانت کے وارث اور امین ہو کر اُن کے فیصلہ اور حکم سے اُن کے خلیفہ اور جانشین ہو چکے ہیں اور ان کے مشائخ کرام کا فیض اللہ کے بندوں کو اب ان کے ذریعہ پہنچ رہا ہے۔ جب سے یہ معلوم ہوا تھا مدوح کی زیارت اور ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا، لیکن تقسیم کے بعد جیسا کہ معلوم ہے ہمارے اور ان بزرگوں کے درمیان گویا لوہے کی دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں۔ حسن اتفاق کہ جس روز میں کراچی سے لاہور پہنچا مولانا موصوف بھی غالباً اُسی دن تشریف فرما ہوئے۔ اگلے روز یعنی جمعہ کے دن (۷ مارچ) مجھے ایک دوست نے بتلایا بلکہ ازراہ کرم خود ہی موصوف کی قیام گاہ تک مجھے پہنچا بھی دیا۔ اور اس طرح ملاقات نصیب ہوئی۔ بڑے خوش نصیب ہیں اللہ کے وہ بندے جنہیں اللہ ہر طرف سے کاٹ کے اپنی ہی طرف متوجہ کر لے اور صرف اپنا بنالے۔

۴۔ حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی جو دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے اور اب جامعہ اشرفیہ لاہور کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ جب یہ نیاز مند حاضر خدمت ہوا، تو فرمایا کہ یہ چلتی پھرتی ملاقات کافی نہیں، کم از کم ایک رات میرے ہی پاس قیام کرو، میں نے وعدہ کر لیا اور قیام لاہور کی آخری شب میں حضرت مولانا ہی کے ساتھ کھانا کھایا اور رات کو بھی وہیں قیام کیا۔ پاکستان کی دینی حالت اور اس کے امکانات اور اس سلسلہ کی مسماعی پر تفصیل سے گفتگو ہوتی رہی۔ اس سلسلہ میں ایک خوش کن بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حکومت نے اہم دینی کتابوں کی حفاظت اور طباعت و نشر و اشاعت کی کچھ خدمت انجام دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے ایک مستقل ادارہ قائم ہو گیا ہے اور بجٹ میں رقم بھی منظور ہو گئی ہے جو پیش نظر کام کے آغاز و افتتاح کے لئے کافی ہے۔ اس کام میں مشورہ دینے کے لئے علماء کی جو مجلس مقرر کی گئی ہے اس میں مولانا مدوح بھی ہیں۔

۵۔ لاہور میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولانا مودودی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، لیکن ایک اتفاقی مجبوری سے یہ ملاقات زیادہ مفصل نہیں ہو سکی۔۔۔ واقعہ یہ ہوا کہ میرا ارادہ لاہور سے براہ راست دہلی واپس ہونے کا تھا، اس لئے یہ سوچا تھا کہ پشاور اور پنجاب کے دوسرے مقامات سے فارغ ہو کر جب میں لاہور آؤں گا تو واپسی کا پرٹ حاصل کرنے کے سلسلہ میں مجھے دو چار دن لاہور ضرور ٹھہرنا پڑے گا، ان ہی دنوں میں سے کسی ایک دن میں ان حضرات سے تفصیلی ملاقات کروں گا، لیکن جب میں دوسرے مقامات سے فارغ ہو کر لاہور پہونچا تو مجھے کراچی سے آیا ہوا ایک خط ملا جس کی وجہ سے مجھے جلد سے جلد کراچی روانہ ہونا ضروری ہو گیا، پھر کسی کے ساتھ تفصیلی اور اطمینانی ملاقات کرنے کی میرے لئے گنجائش نہیں رہی، اس لئے صرف مختصر ملاقات پر اکتفا کرنا گزیر ہو گیا۔۔۔ اس مختصر ملاقات میں ان حضرات سے جو کچھ عرض کرنا میں نے ضروری یا مناسب سمجھا وہ میں نے عرض کیا، اور جو ان حضرات نے فرمانا مناسب جانا انھوں نے فرمایا۔۔۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز کے اور ان حضرات کے مسلک اور طرز فکر میں خاصا فرق اور بُعد ہے۔ بایں ہمہ یہ یہ عاجز یہی خیال رکھتا ہے کہ دین کی غربت کے اس دور میں ہمیں جہاں کہیں خیر کا اور دین کی خدمت کا کوئی پہلو نظر آئے ہم اس کی قدر کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ نیک گمانی اور خیر خواہی کی بنیاد پر معاملہ رکھیں۔ صرف اسی طرح ایک طرف کا خیر دوسری طرف تک متعدی ہو سکتا ہے اور غلطیوں کے بچانے میں ہر ایک دوسرے کا مددگار بن سکتا ہے۔

لاہور سے کراچی کی راہ میں ایک بڑے حادثہ کی اطلاع

۱۸ مارچ کی صبح کو لاہور سے کراچی کو روانگی ہوئی۔ رفیق مکرم بابو عبد الوہاب صاحب بی، اے (جو اس پورے سفر میں رفیق رہے) وہ بھی میرے ساتھ تھے۔ ٹرین لاہور سے روانہ ہوئی۔ بھائی عبد الوہاب صاحب کے ہاتھ میں اس وقت لاہور کا ”نوائے وقت“ تھا، اچانک اُن کی زبان پر جاری ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ میں نے کہا خیریت تو ہے؟ بھائی عبد الوہاب صاحب نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس میں اپنے حاجی عبد الجبار صاحب کے انتقال کی خبر ہے۔ میں بھی ستائے میں رہ گیا۔ یوں تو موصوف سے تعلق و تعارف ۸۔۹ سال سے تھا، لیکن ساتھ رہنے کا اتنا موقع کبھی نہ ملا تھا جتنا کہ اب کے ملا۔ کراچی میں آپ ہی کے یہاں میرا قیام رہا۔ اصل میں ساتھ رہنے سے ہی آدمی کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور جو ہر کھلتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن کی زندگی کو چند پہلوؤں سے بڑا ہی قابل رشک

پایا۔ غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اپنے بشری اندازہ میں حق تعالیٰ نے اُن کو بڑے انعامات و کمالات سے نوازا تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابراہیم الصالحین من عبادہ.....

”اگلے روز صبح کو ٹرین سے کراچی پہونچایا، حاجی صاحب موصوف مرحوم کے خلف الرشید بھائی حاجی محمد ابراہیم صاحب لینے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ دین اور دین کے سلسلہ کی ہر چیز کا اصلی نتیجہ اور اجر تو انشاء اللہ آخرت کی زندگی میں جنت میں پہونچ کر ملے گا لیکن اللہ کے دین دار بندوں کو دنیا میں بھی اس کی جن برکتوں کا تجربہ ہوتا ہے سچی بات یہ ہے کہ اہل دنیا کو کسی طرح اسی کا علم ہو جائے تو اپنی محرومی اور بے نصیبی پر وہ بے چارے اپنا سر پیٹ لیں بلکہ خود کشی کر لیں۔ موت کا حادثہ اور وہ بھی گھر کے سب سے بڑے ذمہ دار کی اور بہت وسیع کاروبار چلانے والے کی اچانک موت کا حادثہ یہ ایسی چیز ہے کہ ایسے مواقع پر اچھے اچھے سنجیدہ اور متوازن لوگ فکر و غم کے غلبہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں، لیکن جن کو دین اور ایمان و یقین کو دولت نصیب ہوتی ہے وہ ایسے موقعوں پر قرآنی ہدایت کے مطابق اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کے ذریعہ اس یقین کو اپنے اندر تازہ کر کے کہ جانے والا اپنے مالک و مولیٰ اور اپنے رحیم و کریم رب کے حکم سے ٹھیک اپنے مقرر وقت پر اس کی بارگاہ میں چلا گیا ہے اور ہم سب بھی ایک دن وہیں پہونچنے والے ہیں اور وہی ہمارا اصلی اور دائمی وطن ہے اپنے کو ہلکا و مطمئن کر لیتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اُن کی اس خاص حالت اور وقتی حاجت و ضرورت کے مطابق اپنی خاص رحمت اور سکینت اُن کے قلوب پر نازل فرماتا ہے۔

”۱۹ مارچ کی صبح کو یہ عاجز کراچی پہونچا تھا، ہندوستان واپسی کا پرمٹ ملنے کے انتظار میں پورا ایک ہفتہ پھر رہنا پڑا۔ اس قیام میں یہ دیکھ کر الحمد للہ جی بڑا خوش ہوا کہ حاجی صاحب مرحوم کے گھر والوں کی ان دنوں خاص فکر یہ تھی کہ اللہ کے تعلق اور آخرت کی فکر بڑھانے کا یہ خاص موقع اور وقت ہے اور ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ رحمت و کرم کا خاص معاملہ فرمائے اور پسماندگان کو اپنا تعلق اور اپنے دین سے وابستگی نصیب فرماتے ہوئے اپنی خاص رحمتوں اور نعمتوں سے نوازے۔

واپسی اور اہل پاکستان کو الوداعی پیغام و انتباہ!

”۱۱ فروری کو یہ عاجز کراچی پہونچا تھا، اور پورے ڈیڑھ مہینے میں یہ سفر ختم کر کے ۲۶ مارچ کی صبح کو دہلی واپس ہو گیا۔ اس پورے سفر میں پاکستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کی جو زندگی دیکھی اور احباب سے جو کچھ سنا اُس کا تقاضا ہے کہ سفر کے اس تذکرہ کو اس

آخری بات پر ختم کروں۔

اللہ نے انسانیت کو ترقی دینے اور کمال تک پہنچانے کے لئے، اور آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں اس کو جنت کا مستحق بنانے کے لئے نبوت و رسالت کا جو سلسلہ انسانیت کے بالکل ابتدائی دور سے شروع فرمایا تھا اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ختم فرمایا۔ آپ کی نبوت تمام دنیا کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اپنی عمر طبعی پوری کر کے اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں لیکن دنیا میں نشر ہدایت اور دینی و روحانی تعلیم و تربیت کا جو کام بحیثیت نبی وقت کے آپ کو کرنا تھا وہ ہر دور اور ہر زمانہ میں آپ کی امت کو کرنا ہے، اور یہ اس امت کا طغراء امتیاز ہے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ... الخ بہر حال اب یہ ساری امت اپنے منصب و مقام کو پہچانے تو یہ اپنے نبی کی نائب ہے، اور قیامت تک کے لئے کار نبوت اس کے سپرد ہے۔ پس آپ کا جو امتی جس حال میں جہاں ہے اُسے سمجھنا چاہئے کہ وہ اس جگہ کے لئے اسلام کا نمائندہ اور ذمہ دار ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والے مقصد کے لئے اُسے جینا اور مرنا ہے۔

لیکن وہ ممالک جو اپنے کل باشندوں یا اُن کی غالب اکثریت کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک کہلائے جاتے ہیں اور جن کا سیاسی نظم و نسق بھی تمام تر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے اُن کی ذمہ داری نیابت نبوت کے اس کام کے بارے میں یقیناً بہت بڑی اور بہت وسیع ہے۔ اور اُن میں سے بھی خاص طور پر پاکستان جو اسلام ہی کے نام پر بنا ہے، اس وقت اس کے سب مسلمان باشندوں کی خواہ وہ عالم ہوں یا غیر عالم، امیر ہوں یا غریب، حاکم ہوں یا عام شہری، تاجر ہوں یا مزدور، بہر حال سب کی اپنی اپنی حیثیت اور حالت کے مطابق یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود سچے مسلمان بنیں، اور ملک کو اسلام کی دعوت اور خدمت کا مرکز بنائیں۔ اگر انھوں نے اپنے اس فرض کو اور اسلام کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حق کو ادا نہ کیا، اور ”اپنی حکومت“ سے صرف وہی مادی منافع اور دنیوی ترقیاں حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنائے رکھا جو دنیا کی ساری خدا فراموش قومیں اپنی حکومت اور اپنے اقتدار سے حاصل کرتی ہیں تو آخرت میں اس کا جو انجام ہو گا وہ تو مرنے کے بعد سامنے آئے گا، لیکن قرآن مجید نے ایسے مجرموں کو دنیا ہی میں ظاہر ہونے والے جن بُرے انجاموں سے جا بجا ڈرایا ہے اُن کے ظہور سے بھی بے خوف نہیں رہنا چاہئے۔

اس وقت تمام دنیا کے مسلمان اور خصوصاً اسلامی ممالک کہے جانے والے ملکوں کے مسلمان دور رہے پر ہیں۔ یا تو وہ دین کے بھولے ہوئے سبق کو یاد کریں اور ایک تازہ

ایمان کے ذریعہ اللہ و رسول سے اپنا رشتہ پھر سے اور نئے سرے سے جوڑ کر اور اپنے لئے نبوت کی نیابت والی اور دعوت والی زندگی اختیار کر کے پیغمبروں کے طریقہ پر دنیا کی رہنمائی کریں اور اس کو تباہ ہونے سے بچائیں۔۔۔۔۔ یا اگر خدا نخواستہ ایمان کے اس راستے سے مطمئن نہیں ہیں اور اس بارہ میں ان کا ذہن بدقسمتی سے صاف نہیں ہے اور اس لئے اس زمانہ کی خدا فراموش اور مادہ پرست عروج یافتہ قوموں کی نقالی اور پیروی ہی میں وہ اپنی ترقی منحصر سمجھتے ہیں، تو پھر یہ راستہ تو چالو ہے ہی، آپ بھی اگر اس پر چلنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو چلیں، اور اس کا جو انجام ہونے والا ہے اس کے منتظر ہیں!۔۔۔۔۔ فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَفَؤُضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ، إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝

راقم مرتب عرض کرتا ہے کہ ۱۹۵۲ء کے اس ”الوداعی پیغام و انتباہ“ کو دیکھئے اور اس وقت (یعنی ۲۰۱۲ء) کے پاکستان کا ”حالی بد حالی“ دیکھئے۔ یہاں (لندن میں) راقم کے لئے روزنامہ جنگ اس ناگفتہ حال کا آئینہ ہے۔ حضرت صاحب سوانح نے لوگوں کو کبھی اس گمان کا موقع نہیں دیا کہ وہ کوئی صاحب کشف و کرامات ہیں، لیکن اس انتباہ میں جو کچھ فرمایا، وہ ایک وارثِ علوم نبوت کی حیثیت سے شک و شبہ سے بالاتر آپ کا یقین تھا جو اہل پاکستان کی ہمدردی میں ایسی چٹنگی کے ساتھ زبان پہ آ کر رہا کہ جیسے کوئی مستقبل میں جھانک کر کہہ رہا ہو۔ اور یہ کسی اللہ کے بندے کا پہلا انتباہ نہیں تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کہیں پڑھا ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ (غالبا) پہلی مرتبہ جب پاکستان تشریف لے گئے، تو وہاں ایک مسجد کے اندر ہونے والے پروگرام میں ایک صاحب (غالبا سیرت کمیٹی پٹی، ضلع لاہور کے قرشی صاحب) نے ”ہر نمازی غازی اور ہر غازی نمازی“ کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے پس منظر میں بظاہر اس وقت کا تازہ تازہ مسئلہ کشمیر تھا، اور تبلیغی کام کے متعلق اس عوامی تخیل کے ماتحت کہ یہ بس کلمہ نماز کی تبلیغ ہے، اس موقع پر شاید یہ چاہا گیا کہ حضرت مولانا کو غزوہ و جہاد کی طرف بھی توجہ دلائی جائے۔ اس پر حضرت والا نے خطاب کے شروع ہی میں اس نعرے ہی کی جانب رخ کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا تھا، وہ اسی قسم کا نہایت سخت انتباہ تھا۔ اور اس وقت کے ماحول کو دیکھتے ہوئے ایک غیر معمولی اور خدا داد جزا مندانہ صراحت بھر انتباہ۔ چند الفاظ کچھ یاد آ رہے ہیں کہ اللہ کو راضی کئے بغیر نہ ہی تمہارے جہادی نعرے اور نہ ہی تمہاری فوج، تمہارے ٹینک تو ہیں وغیرہ تمہارے کچھ کام آنے والی ہیں۔ پہلے اپنے آپ کو مسلمان بناؤ!۔۔۔۔۔ مگر انفس کہ ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ کا معاملہ ہے۔ ۱۹۵۲ء ہی میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے قتل سے جو بگاڑ کی بنا پڑی تو ہر روز اضافہ ہی کی طرف کوچلی۔ اور اس وقت تو وہ حال ہے کہ بس اللہ ہی بات بنائے۔

(۲)

پاکستان کا دوسرا سفر (۱۹۵۷ء)

اس سفر کا علم لالکپور (پاکستان) سے آئے آپ کے ایک گرامی نامہ سے ہوتا ہے، جو ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ وفات کی اطلاع ملنے پر راقم کے نام ارسال فرمایا گیا اور الفرقان کے دسمبر ۱۹۵۷ء کے شمارہ میں وہ شائع کیا گیا۔ اسکے علاوہ کوئی ریکارڈ اس بارہ میں نہیں ملتا کہ کس مقصد سے یہ سفر ہوا اور کتنے دن کا ہوا۔ اسی سفر کے حوالہ سے الفرقان کے شمارہ مارچ اپریل ۱۹۵۸ء میں آپ کا مضمون ”مولانا موردی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ذیل میں اس سفر کی یادگار مذکورہ بالا گرامی نامہ درج کیا جا رہا ہے۔

نامہ غم

عزیز من سلکم اللہ تعالیٰ و عافاکم سلام مسنون

..... بعد مغرب جامع مسجد میں اجتماع تھا، میری تقریر کے بعد عشاء کی نماز ہوئی، نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ کسی نے آکر جامع مسجد کے خطیب ہمارے دوست مولانا زین العابدین کوریڈو کے حوالہ سے حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات کی خبر پہنچائی۔ ابھی اجتماع کی کچھ کارروائی باقی تھی، سنتوں اور نفلوں سے فارغ ہو کر ہم سب لوگ پھر جڑ کے بیٹھے تو مولانا زین العابدین صاحب نے ایک خاص تمہید کے ساتھ تقریر شروع کی، یہ تمہید اجتماع کے موضوع سے بالکل بے تعلق تھی، اس لئے میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس تمہید کے بعد انھوں نے مجمع کو حضرت کی وفات کی خبر سنائی، اب تک مجھے بھی خبر نہ تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اگرچہ تمہید میں انھوں نے خصوصیت سے صبر کی تلقین فرمائی تھی، لیکن مجمع کے اکثر لوگوں پر بے اختیار گریہ طاری ہو گیا، بہت سے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، ایک صاحب بیہوش ہو گئے اور دیر تک بیہوش رہے، اور ان کی حالت ایسی ہوئی کہ ان کی زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی، کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ حضرت سے محبت اور تعلق رکھنے والوں کی یہاں اتنی بڑی تعداد ہوگی۔

مولانا زین العابدین صاحب نے خبر وفات سنا کر اور مجمع کو صبر کی تلقین کر کے فرمایا کہ اس وقت حضرت کے ساتھ محبت و تعلق کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ فوراً ہی قرآن مجید پڑھ پڑھ کر ہم حضرت

کے لئے ایصالِ ثواب کریں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت اور رافع درجات کی دعا کریں، چنانچہ سارا مجمع مشغول ہو گیا، اور کچھ دیر کے بعد دعا کر کے مجمع منتشر ہوا۔

حضرت کی وفات سب مسلمانوں کے لئے خاص کر ہماری جماعت کے لئے اور دارالعلوم کے لئے بہت ہی بڑا سانحہ ہے۔ جماعت کے لئے اور دارالعلوم کے لئے ایک ایسی شخصیت کا وجود ناگزیر ضرورت ہے جو اپنی علمی اور روحانی برتری کی وجہ سے اتنی وزنی اور مؤثر ہو کہ مختلف الرائے اور مختلف المذاق عناصر اس کی بات ماننا اپنے لئے ضروری سمجھیں۔ اب تک اللہ کا یہ فضل رہا کہ جماعت کو اور دارالعلوم کو تسلسل کے ساتھ ایسی شخصیتیں نصیب ہوتی رہیں، سب سے آخری شخصیت حضرت ہی کی تھی، حضرت کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آ رہی، اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے ہماری اس ضرورت کو پورا کرے۔ اِنَّهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر

حضرت کے متعلق میرے پاس کچھ خاصی معلومات ہیں، اب تک ان کے لکھنے کا ایسا داعیہ نہیں پیدا ہوا تھا جو لکھوا ہی لیتا، انشاء اللہ اب لکھوں گا اور امید ہے کہ الفرقان کی آئندہ اشاعت کی تیاری کے وقت تک پورا کر کے تم کو دے سکوں گا، مجھے امید ہے کہ دوسرے حلقوں کے لوگ جو حضرت کو نہیں جانتے ہیں انشاء اللہ وہ اُس سے کچھ جان سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ جو کچھ ذہن میں ہے وہ لکھ سکوں۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(۳)

جنوب مشرقی افریقہ کا سفر (۱۹۶۸ء)

۱۹۶۸ء میں آپ کا ایک سفر جنوب مشرقی افریقہ کے برطانوی و فرانسیسی مقبوضات ماریشس، اور ری یونین کا وہاں کے مخلصین و مشتاقین کی دعوت پر ہوا۔ الفرقان دسمبر ۱۹۶۸ء میں اس سفر کا بیان کرتے ہوئے آپ نے لکھا کہ

”اس سال اکتوبر نومبر میں اپنی زندگی کا سب سے طویل سفر کیا۔۔۔ جزیرہ ماریشس اس سفر کی پہلی منزل تھی۔ یہاں کے مخلص احباب جو اب تک الفرقان اور اسلام کیا ہے و ”معارف الحدیث“ وغیرہ کتابوں کی وجہ سے صرف غائبانہ واقفیت رکھتے تھے، عرصہ سے ان کا صراحتاً کہ میں ماریشس کا سفر کروں۔ اس دفعہ جولائی کے مہینے میں انھوں نے مجھ سے رابطہ کئے بغیر میرے لئے ایک تاریخ مقرر کر کے ہوائی جہاز کا واپسی ٹکٹ اور حکومت ماریشس کا اجازت نامہ بھیج دیا۔۔۔ لیکن میں یہ سفر شروع اکتوبر میں کر سکا۔ ۲ اکتوبر کو ماریشس پہنچا اور ۱۲ تک وہاں قیام رہا۔“

ماریشس جو برطانوی مقبوضات میں سے تھا انہی دنوں اس کو آزادی و خود مختاری ملی تھی۔ جزیرے کی اُس وقت کی سات لاکھ آبادی میں مسلمانوں کا تناسب سو لاکھ بتایا گیا۔ لکھا ہے کہ

”یہ سب ہندوستانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن میں تجارت پیشہ عموماً گجراتی ہیں، دوسرے بہت سے ممالک اور مقامات کی طرح یہاں کے بھی گجراتی مسلمان دین و دنیا دونوں کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔۔۔ اس چھوٹے سے ملک میں کئی شہر ہیں، سب سے بڑا شہر پورٹ لوئس ہے۔ وہی ملک کا دارالحکومت ہے، میرا قیام پورٹ لوئس میں تھا لیکن قیام کے ان دس دنوں میں جزیرے کے قریباً سب ہی شہروں میں، بلکہ شہروں کے علاوہ اکثر بڑی بستیوں میں بھی جانا ہوا۔۔۔ آبادیاں عام طور سے بہت صاف ستھری ہیں۔ خستہ حالی اور پسماندگی اور گندگی کے مناظر کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔“

یہاں بلانے والے دوستوں نے پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ جزیرے کا کوئی شہر بلکہ کوئی بڑی بستی بھی ایسی نہ رہی جہاں جانا نہ ہوا ہو۔ قریباً روزانہ ۲-۳ جگہ جانا اور ہر جگہ مسلمانوں سے خطاب کرنا ہوتا۔ کہیں کہیں غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوتے اور سنتے۔ مسلمانوں میں الحمد للہ دین کا وقار عام ہے۔ اور عجیب و غریب بات یہ ہے کہ افریقہ کے اس دور دراز جزیرے کے

دیہاتوں میں رہنے والے مسلمان بھی اردو سمجھتے اور بول لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر کاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا بھی بندوبست ہے۔

”قیام کے آخری دن جبکہ میں ری یونین روانہ ہونے والا تھا حکومت ماریش کے حکمہ نشریات نے ایک تقریر ریکارڈ کی جو اگلے دن ماریش ریڈیو سے نشر کی گئی۔ اس تقریر میں پورے ملک سے خطاب کیا گیا تھا، اس کا عنوان تھا ————— ”ایک مسلمان مسافر کا پیغام اہل ماریش کے نام!“

ری یونین

ماریش کے بعد آپ کے سفر کی دوسری منزل ری یونین تھی۔ یہ جزیرہ اس وقت تک براہ راست فرانس کے زیر حکومت تھا۔ مسلمانوں کی تعداد صرف ۱۵۰۰ بتائی گئی جن کے متعلق آپ نے لکھا کہ ”اقتصادی اور معاشی حالت کے اعتبار سے بہت اچھے حال میں ہیں۔ جزیرہ کی تجارت بہت کچھ انہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ مسلمان تاجر عموماً گجراتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ کشمکش سے بالکل نا آشنا ہیں، اسی وجہ سے اتنی تھوڑی سی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمان بہت اچھے حال میں ہیں۔ یہ جزیرہ ماریش سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ بہت خوبصورت اور صاف ستھری آبادی ہے۔۔۔۔۔“

”یہاں کے تاجروں میں جو بوڑھے ہیں، میں جہاں تک محسوس کر سکا وہ بڑے دیندار ہیں اور جو ان کے بعد کا طبقہ ہے اس کو بھی الحمد للہ دین سے لگاؤ ہے، لیکن بالکل نئی نسل کا دینی مستقبل بعض خاص اسباب کی وجہ سے سخت خطرے میں ہے۔ یہاں کے ایک مخلص دوست حاجی داؤد صاحب ہیں انھوں نے ہی اس عاجز کو ری یونین کی دعوت دی تھی۔ ہمارے حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے مکہ معظمہ میں بیعت ہوئے تھے جبکہ حضرت حج کے لئے گئے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے بچوں کو ہندوستان میں رکھ کر دینی تعلیم دلوائی ہے۔ سب سے بڑے مولانا احمد سعید صاحب اب سے کئی سال پہلے یہاں سے فارغ ہو کر جا چکے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے بیعت کا تعلق ہے، اردو اور عربی کے علاوہ فرانسیسی میں بھی بہت روانی سے تقریر کرتے ہیں۔ علم و صلاح کی جامعیت کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں پر ان کا بہت اچھا اثر ہے۔ ان کے باتوفیق والد نے گویا ان کو دین کے لئے وقف کر دیا ہے۔

”اس عاجز نے ری یونین کے مسلمان تاجروں کے سامنے جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کے

جنوبی افریقہ کا سفر (۱۹۷۲ء)

(جنوبی افریقہ کا یہ سفر اپریل ۱۹۷۲ء میں شروع ہوا اور جون ۷۲ء میں مجازہ مقدس پر اختتام کو پہنچا۔ اس سفر کی روداد اولاً مجازہ مقدس سے ایک مکتوب کی شکل میں موصول ہوئی تھی، جو بطور خاص ادارہ الفرقان کے خصوصی معاون حضرت مولانا نسیم احمد فریدی کے نام اس تقریب سے لکھا گیا کہ مکہ معظمہ پہنچنے پر حضرت صاحب سوانح نے آپ کو خواب میں دیکھا، اور آپ کے (مولانا کے) حق میں اس کو نہایت مبارک سمجھنے سے اس کی اطلاع اور مبارک باد دینے کا تقاضہ، مولانا کے ساتھ نہایت خصوصی اور قدیم تعلق کی بنا پر، دل میں پیدا ہوا حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ تعلق کا خصوصی درجہ بتانے کے لئے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ کی وفات (۱۹۸۸ء) پر الفرقان نے ایک خصوصی نمبر آپ کی یاد میں شائع کیا۔ یہ مکتوب جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ جولائی ۱۹۷۲ء کے الفرقان میں شائع ہوا۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں وہ مکتوب:)

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

۸ جون ۱۹۷۲ء یوم پنجشنبہ

از مکہ مکرمہ

برادر مکرم و محترم جناب مولانا نسیم احمد فریدی صاحب احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا
سلام و رحمت!

میں اس وقت اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق سے بلد اللہ الامین مکہ مکرمہ میں ہوں۔ آج یہاں حاضری کا تیسرا دن ہے۔ گزشتہ رات آپ کو خواب میں دیکھا کہ آپ عمرہ کر کے سر منڈائے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور آپ کی شکل و صورت وہ ہے جو اب سے ۲۵-۳۰ سال پہلے تھی، جب آپ جوان تھے، مجھے اس خواب سے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کے لئے بھی یقیناً بہت مبارک ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کی تحقیق کی روشنی میں میں نے سمجھا ہے کہ یہ آپ کا مثالی وجود تھا جس کو اللہ تعالیٰ کے اس دربار عالی میں حاضری اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ فہنیئاً لکم و طوبی لکم۔ اس خواب ہی سے دل میں یہ تقاضا پیدا ہوا کہ اپنے اس سفر کے بارے میں آپ کو خط لکھوں اور اس طرح کی قدر تفصیلی ملاقات خط ہی کے ذریعہ کروں۔

میرے اس طویل سفر پر روانہ ہو جانے کے بعد مولوی عتیق الرحمن کے خط سے آپ کو اس کا علم ہوا ہوگا۔ یہ سفر بالکل اچانک اس طرح ہوا جس طرح بہت سے واقعات قضاء و قدر کے فیصلے سے بعض اوقات

اچانک ہو جاتے ہیں۔ میں ۲۹ مارچ کو سورت میں تھا، عشاء کے بعد ایک تبلیغی اجتماع میں تقریر کر رہا تھا، جب فارغ ہوا تو سورت ہی کے ایک صاحب نے بتایا کہ ابھی ابھی جو ہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ) سے میرے جاننے والے ایک صاحب نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ:

”ہم لوگ بمبئی میں حاجی یعقوب صاحب سے بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہاں سے ٹیلی فون کا رابطہ قائم نہیں ہو سکا، سورت سے مل گیا ہے۔ اس لئے یہ کام آپ کے سپرد کرتے ہیں کہ آپ حاجی یعقوب صاحب کو بمبئی میں ٹیلی فون پر اسی وقت ہمارا یہ پیغام پہونچا دیں کہ ہم لوگوں نے مولانا محمد منظور نعمانی کا ویزا بڑی کوششوں کے بعد اپنی حکومت سے حاصل کر لیا ہے، اب حاجی یعقوب صاحب مولانا نعمانی کو ہمارا یہ پیغام بھی لکھنو پہونچا دیں اور اس کی کوشش کریں کہ وہ پہلے ہوائی جہاز سے جو ہانسبرگ کے لئے روانہ ہو جائیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم براہ راست مولانا کو لکھنو تاروے رہے ہیں۔“

جن صاحب نے ٹیلی فون کی یہ بات مجھ سے آ کر بتائی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے اُن کو جواب دے دیا ہے کہ ”اتفاق سے مولانا نعمانی آج ہمارے شہر سورت ہی میں آئے ہوئے ہیں، میں اُن کو بھی یہ پیغام پہونچا دوں گا ورنہ بمبئی حاجی یعقوب صاحب کو ٹیلی فون بھی کر دوں گا۔“

میں اپنے پروگرام کے مطابق ۳۰ مارچ کو علی الصبح سورت سے روانہ ہو کر دس بجے کے قریب بمبئی پہونچا، یہاں آ کر معلوم ہوا کہ حاجی یعقوب صاحب کو جنوبی افریقہ سے رات ہی تار ملا ہے کہ ”منظور نعمانی کا ویزا حاصل کر لیا گیا ہے، ان کو فوراً روانہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کیجئے“ میں نے بمبئی کے اپنے احباب سے عرض کر دیا کہ بظاہر اس وقت میرے لئے اس سفر کا کوئی امکان نہیں ہے، علاوہ دوسری مجبوریوں کے میرے پاسپورٹ میں جنوبی افریقہ کا اندراج نہیں ہے، یہ کام جلد ہی ہو بھی نہیں سکے گا، اور میرا پاسپورٹ بھی اتفاق سے اس وقت دہلی میں ہے، میں نے اسی مقصد سے بھیجا تھا، بمبئی کے دوستوں نے کہا کہ ہم پاسپورٹ دہلی سے منگوا لیں گے اور یہاں اندراج کی کوشش کریں گے، ہمیں امید ہے کہ ہم یہ کام جلد ہی کر لیں گے۔

میں ۳۱ مارچ کو بمبئی سے روانہ ہو کر یکم اپریل کو لکھنو آ گیا، مطمئن تھا کہ اگر یہ سفر ہوا بھی تو ہفتے دو ہفتے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ لیکن دوسرے یا تیسرے ہی دن بمبئی سے ٹیلی فون آیا کہ پاسپورٹ دہلی سے ہم نے منگوا لیا اور اس میں جنوبی افریقہ کا اندراج بھی کر لیا گیا، آپ فوراً بمبئی پہونچ جائیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی

(۱) اس غلط و اہتمام کی خاص وجہ یہ تھی کہ شروع اپریل میں وہاں تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا وہ لوگ چاہتے تھے کہ میں کسی طرح اس اجتماع میں شریک ہو جاؤں۔

اور اپنے کچھ ضروری کاموں کے پیش نظر فیصلہ کرنا سخت مشکل ہو گیا، میں نے بمبئی کے دوستوں سے کہا کہ میں ذرا سوچ سمجھ کر ایک دو دن میں رائے قائم کر سکوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں دو ہی دن پہلے تین ہفتے کے ایک طویل سفر کے بعد واپس آیا تھا، بعض بہت ضروری اور اہم مسائل میرے سامنے تھے، جن کی وجہ سے کسی طویل سفر کے لئے تیار ہو جانا میرے لئے بہت مشکل تھا، لیکن ویزا اور پاسپورٹ کے مشکل ترین قانونی مرحلے جس رفتار سے طے ہوئے تھے میں نے اس سے یہ سمجھا کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ نیز یہ بھی لالچ دل میں پیدا ہوا کہ واپسی میں انشاء اللہ حرمین شریفین کی حاضری اور عمرہ و زیارت کی سعادت بھی نصیب ہو جائے گی۔ ان فرض یہ سوچ کر میں نے اپنے اعزاز اور کاموں کو نظر انداز کر کے اپنے کو سفر کے لئے آمادہ کر لیا، بمبئی کے دوستوں کو اطلاع دے دی، انھوں نے فوراً ہی ہوائی جہاز میں ریزرویشن کر لیا اور میں ۵ اپریل کی شب میں سوانو بجے لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۷ اپریل کی صبح ۶ بجے وہاں پہنچ گیا۔

بمبئی میں صرف ۳-۴ گھنٹے قیام رہا، گیارہ بجے سے پہلے ہی ہوائی اڈے کو روانگی ہو گئی، ساڑھے بارہ بجے ایرانڈیا کے اس طیارہ کی پرواز کا وقت تھا جس سے سفر کرنا تھا، وہ ٹھیک اپنے وقت پر روانہ ہو گیا، اور قریباً پانچ گھنٹے میں تین ہزار میل کے قریب مسافت طے کر کے مشرقی افریقہ کے مشہور شہر نیروبی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ وہاں ابھی ظہر کا آخری وقت تھا، پہلے سے اس کا اندازہ بھی تھا وہیں اتر کے ظہر کی نماز ادا کی، مجھے جو ہاں سرگ جانا تھا، اور وہاں کے لئے نیروبی سے اگلے دن ۸ اپریل کو طیارہ ملنے والا تھا اس لئے ۷ کو قیام نیروبی ہی میں رہا۔ عشاء کے بعد ایک مسجد میں تقریر بھی ہوئی۔ یہ ”پنگھانی مسجد“ کے نام سے معروف ہے۔ اس کے قرب و جوار میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اردو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے امام خاص دیوبند کے رہنے والے مولوی اظہار صاحب ہیں جو دیوبند کے فاضل بھی ہیں۔

یہ نیروبی مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کا دار الحکومت ہے۔ اب سے چند برس پہلے تک کینیا، بلکہ مشرقی افریقہ کے اکثر دوسرے ممالک بھی، برطانیہ کے زیر اقتدار تھے۔ نیروبی کو انگریزوں نے بالکل لندن کے نقشہ پر بنایا تھا۔ بہت ہی خوبصورت شہر ہے، بڑی اچھی اور معتدل آب و ہوا ہے، اور بڑی زرخیز زمین ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جس طرح بہت سے دوسرے مقبوضات سے انگریزوں نے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کیا اسی طرح کینیا اور اس کے پڑوسی ملکوں کو بھی انھوں نے آزادی دیدی۔ اب وہاں کے عوام کی اپنی حکومت ہے، یہ سیاہ فام نسل ہے۔ اللہ کی شان ہے! سفید فاموں کی ساری اونچی کرسیوں پر اب

سیاہ فام بیٹھے ہیں، لیکن حکومت کی صلاحیت اور اہلیت آنے کے لئے بظاہر ابھی کافی وقت چاہئے۔ ہم اپنی نادقتی سے اب تک یہ سمجھتے تھے کہ جن ملکوں میں گرمی بہت زیادہ پڑتی ہے وہاں کے لوگوں کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ لیکن کینیا اور پھر جنوبی افریقہ میں یہ دیکھ کر کہ وہاں کے اصل باشندے بالکل سیاہ فام اور کالے رنگ کے ہیں، اس غلط خیال کی تصحیح ہو گئی۔ یہ ممالک بالکل گرم نہیں ہیں، لیکن ان میں رہنے والے جو یہاں کے اصل باشندے ہیں، بالکل سیاہ فام ہیں، معلوم ہوا کہ رنگ کا تعلق گرم و سرد علاقہ سے نہیں بلکہ نسل سے ہے۔

رات کو نیروبی قیام کرنے کے بعد اگلے دن ۸ اپریل قریباً بجے صبح بی، او، اے، سی کے طیارہ سے جو ہانسبرگ کے لئے روانگی ہوئی، یہ بہت بڑے قسم کا طیارہ تھا، اس سے پہلے اتنا بڑا طیارہ کبھی نہیں دیکھا تھا، اس میں ۴۰۰ کے قریب مسافروں کی نشستیں تھیں۔ یہ لندن سے آیا تھا اور جو ہانسبرگ (جنوبی افریقہ) جا رہا تھا، اس میں بچوں کے کھیل کود کی جگہ بھی تھی اور اس کے سامان بھی تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ دنیا کے تصععات اور تعیشات کی یہ ترقیاں کہاں تک جائیں گی؟! — حیرت ہے کہ جن لوگوں کی عقلی معاش کی پرواز اتنی بلند اور تیز رفتار ہے ان کی عقلی معاد کیسی مردہ ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد کے مسئلہ کی مطلق فکر نہیں؟! حق ہے مَنْ يُضِلِلِ اللّٰهَ فَلَا هَادِيَ لَهُ، قریباً چار گھنٹے میں اس برق رفتار طیارہ نے جو ہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر اتار دیا، احباب و مخلصین آئے ہوئے تھے۔ سفر کے قانونی مراحل سے فارغ ہو کر شہر جو ہانسبرگ سے گزرتے ہوئے لوڈی پورٹ پہنچے، جہاں اس دن قیام طے تھا۔ یہ بستی شہر جو ہانسبرگ سے قریباً بارہ میل پر ہے، گویا اس کے ملحقہات میں سے ہے۔ ہمارے خاص میزبان موسیٰ بھائی بڈھانیا کا رہائشی مکان وہیں ہے رات کو عشاء کے بعد لوڈی پورٹ کی مسجد میں تقریر ہوئی۔ جنوبی افریقہ پہنچ کر یہ پہلی تقریر تھی۔ شہر جو ہانسبرگ سے آکر بھی لوگ بہت کافی تعداد میں شریک ہوئے۔

میرے اس سفر کے اصل محرک اور داعی ڈربن کے مولانا عبدالحق عمر جی تھے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے عصری تقاضوں کا فہم بھی دیا ہے، اور اُن کی فکر بھی، اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے گہرا تعلق بھی۔ ڈربن جنوبی افریقہ کے صوبہ عیال کا سب سے بڑا اور پورے ملک کا دوسرے نمبر کا شہر اور جو ہانسبرگ سے قریباً چار پانچ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ مولانا موصوف کو ٹیلیفون سے میرے پہنچنے کی اطلاع دلے دی گئی، وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ اسی دن (بعد عشاء) جو ہانسبرگ تشریف لے آئے۔ موصوف سے خط و کتابت کا سلسلہ تو مدتوں سے تھا لیکن ملاقات اسی دن ہوئی۔ انھوں نے بتلایا

کہ کل اتوار ہے اور اس دن کاروبار، تعلیم گاہیں اور دفاتر سب بند رہتے ہیں، لوگوں کو عام فرصت ہوتی ہے اس لئے کل بعد ظہر کے لئے ڈربن کی جامع مسجد میں تقریر کا اعلان کیا گیا ہے، اس لئے علی الصبح ہوائی جہاز سے ڈربن چلنے کا پروگرام ہے۔ چنانچہ ۹ راپریل کی صبح ڈربن روانہ ہو گئے، اور تقریباً ایک گھنٹہ میں وہاں پہنچ گئے۔ بعد ظہر ڈربن کی جامع مسجد میں پہلی تقریر ہوئی۔ اس مسجد کے امام مولانا ابوبکر صاحب ہیں۔ اصلی باشندے دمن کے ہیں۔ تعلیم فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسہ نظامیہ کی ہے، طرز فکر اور طرز عمل اپنے اساتذہ حضرات علماء فرنگی محل والا ہے، ان سے مل کر جی بہت خوش ہوا، بہت متواضع اور متوازن صاحب علم ہیں۔

اس جامع مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر ایک اور بڑی مسجد ہے، یہ غالباً جامع مسجد کے بعد ڈربن کی سب سے بڑی اور آباد مسجد ہے۔ ڈربن میں میرا قیام اسی دوسری مسجد کے قریب جناب حاجی محمد احمد عمر صاحب کے مکان پر تھا، اس لئے اکثر اوقات نماز اسی مسجد میں ہوتی تھی۔ ڈربن کے زمانہ قیام میں کئی بار اس مسجد میں تقریر بھی ہوئی۔ اس مسجد کے امام اور خطیب دارالعلوم دیوبند کے میرے ایک رفیق درس جناب مولانا عبدالرحمن انصاری صاحب ہیں، بہت فہیم اور متوازن ہیں، اصل وطن رائپور ضلع بہار پنور ہے، لیکن طویل مدت سے جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں، غالباً وہاں کی شہریت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ متعدد تعلیمی اداروں اور اسکولوں کے شعبہ دینیات کے ذمہ دار اور نگران ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اچھا اثر و رسوخ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے طالب علمانہ رفاقت کے بعد جس کو قریباً آدھی صدی ہو گئی، بس ایک دو دفعہ چند منٹ کی ملاقات کبھی ہوئی تھی۔ ہاں ۱۹۶۸ء کے سفر حج میں کچھ اطمینان سے دو چار ملاقاتیں مسجد حرام میں ہوئی تھیں۔ اُس کے بعد اب اس سفر میں اطمینان سے قریب رہنا ہوا، مولانا نے بہت محبت اور تعلق کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ ایسے حضرات جہاں بھی ہوں ان پر خاص اس علاقہ کی دین کی فکر و خدمت اور رسول اللہ ﷺ کی نیابت کی خاص ذمہ داری ہے۔ اور اگر اس کی ادائیگی کی توفیق ملے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے درجات ہیں (اللہ تعالیٰ اپنے اُن سب بندوں کو جن کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے علم کا وارث و امین بنایا ہے، توفیق دے کہ وہ اس وراثت کا حق ادا کریں اور اپنے منصب عالی کو سمجھیں)

مولانا عبدالحق عمر جی اور دوسرے مخلصین کی خواہش تھی کہ میں جنوبی افریقہ میں تین مہینے قیام کروں، میرے لئے ویزا بھی تین مہینے کا حاصل کر لیا گیا تھا، اُس ملک میں قریباً ۴۰-۵۰ شہر اور بستیاں ایسی ضرور ہیں جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ وہ حضرات چاہتے تھے کہ میں اُن میں سے ہر جگہ پہنچوں، ایک دو دن قیام کروں، وہاں کے مسلمان مجھ سے ملیں اور میری باتیں سنیں،۔ مجموعی اجتماعات کے علاوہ خصوصی

مجالس بھی ہوں۔ لیکن میں جن حالات میں لکھنؤ سے گیا تھا، میرے لئے تین مہینے قیام کا کوئی امکان نہیں تھا، تاہم میں نے چھ ہفتے قیام کا فیصلہ کیا اور ان دوستوں سے کہا کہ آپ میرے راحت و آرام کا لحاظ کئے بغیر ایسا پروگرام بنا لیجئے کہ میں تمام ایسے مقامات پر پہنچ سکوں جہاں آپ ضروری سمجھیں اور حسب ضرورت و موقع ایک دو دن قیام کر سکوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جنوبی افریقہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے تین ہی میں مسلمان ہیں، سب سے زیادہ صوبہ نیپال میں ہیں، جس کا مرکزی شہر ڈربن ہے۔ اس سے کچھ کم صوبہ ٹرانسوال میں ہیں، جس کا مرکزی شہر جوہانسبرگ ہے، اور اُس سے کم کیپ میں ہیں، جس کا مرکزی شہر کیپ ٹاؤن ہے۔ جو پورے ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ یہ سمندر کے کنارے ہے۔ بڑے خوش منظر پہاڑ ہیں۔ آب و ہوا اور موسم کے لحاظ سے گویا یورپ کا ایک خطہ ہے۔

مسلم آبادی کے تناسب کے لحاظ سے میرے چھ ہفتے کے وقت کو اس طرح تقسیم کیا گیا کہ سب سے زیادہ وقت یعنی تین ہفتے سے بھی کچھ زیادہ صوبہ نیپال کے لئے رکھے گئے، کیپ کے لئے صرف پانچ دن رکھے گئے اور باقی ۱۵-۱۶ دن ٹرانسوال کے لئے رکھے گئے۔ یہاں سرکیس دور دراز پہاڑی علاقوں میں بھی دوہری اور ایسی شیشہ کی طرح ہموار ہیں کہ ہمارے یہاں دارالحکومت دہلی میں بھی نہیں ہیں۔ موٹریں بھی عام طور سے نہایت اعلیٰ قسم کی استعمال ہوتی ہیں۔ اس لئے سیکڑوں میل کا سفر بھی ذرا محسوس نہیں ہوتا۔

جنوبی افریقہ میں پورا بیڑہ مہینہ گویا مسلسل سفر میں گذرا۔ بعض دنوں میں تو تین تین چار چار سو میل کا سفر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل رہا کہ اس پوری مدت میں صحت ایک دن بھی خراب نہیں ہوئی۔ اکثر دنوں میں تو دو اور بعض دنوں میں تین تین اور چار چار تقریریں بھی کیں۔ صحت کی اس بحالی میں عالم اسباب میں کبھی درجہ دخل اس بات کو رہا کہ وہاں کے دسترخوانوں کی یہ نوعیت دیکھ کر کہ ان پر نوع بہ نوع کی قیمتی اور مرغی کھانے ہوتے ہیں، میں نے اپنے پر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ دسترخوان کی چیزوں میں جو سب سے ہلکی اور سرلیج لہضم ہوگی بس وہی کھاؤں گا اور اتنا اور اس حساب سے کھاؤں گا کہ ۲۴ گھنٹوں میں ایک پاؤ سے زیادہ غذا اندر نہ جائے۔ دن میں دو تین دفعہ روزانہ یہ آزمائش ہوتی تھی کہ دوسروں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنا پڑتا تھا، انواع و اقسام کے بہت اعلیٰ اور مرغی قسم کے کھانے سامنے ہوتے تھے، لیکن میں اپنے لئے صرف دو ایک چیزیں ہلکی قسم کی منتخب کر لیتا تھا اور دوسری چیزوں سے حتی الوسع پرہیز کرتا تھا۔ اس امتحان میں بڑے عزم سے کام لیتا پڑتا تھا۔ لیکن الحمد للہ کامیاب رہا، اور بظاہر اسباب اس کا نتیجہ تھا کہ اتنی طویل مدت

میں ایک دن کے لئے بھی طبیعت خراب نہیں ہوئی اور کسی علاج معالجہ کی ضرورت پیش نہیں آئی، حالانکہ برسوں سے گھر پر بھی طبیعت کی خرابی کا کچھ نہ کچھ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

یہ دسترخوان اور کھانے کی بات تو جملہ معترضہ کے طور پر آگئی۔ میں جنوبی افریقہ کے تین صوبوں کے دورہ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس دورہ میں سارے سفر موٹر سے ہوئے۔ صرف ڈربن سے پورٹ الزبتھ یا وہاں سے کیپ ٹاؤن، وہاں سے جوہانسبرگ اور پھر وہاں سے ڈربن تک کے سفر ہوائی جہاز سے ہوئے۔ ٹرین سے سفر کی نوبت بالکل نہیں آئی، حالانکہ ملک میں بہت اعلیٰ اور آرام دہ قسم کی ٹرینیں چلتی ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس سے سفر کرنے کا رواج بہت ہی کم ہے۔ لوگ عام طور سے لہجہ سفر ہوائی جہازوں سے کرتے ہیں یا پھر اپنی کاروں سے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے پاس اپنی کاریں نہ ہوں۔ یہ لوگ بسوں سے سفر کرتے ہیں جو ریل سے بہت سستا بھی پڑتا ہے اور وقت بھی کم لگتا ہے۔

سفر کا پروگرام عموماً یہ رہتا تھا کہ نماز فجر کے بعد مختصر اصلاحی بیان، اس کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر سفر شروع ہو جاتا، اگر سفر طویل، تین چار سو میل کا ہو تا تو راستہ میں کسی مقام پر ظہر سے پہلے پہونچ کر قیام کرنا طے کر لیا جاتا، اور پہلے سے وہاں اطلاع دے دی جاتی۔ ظہر کی نماز میں وہاں لوگ جمع ہو جاتے اور ان سے کچھ دینی اصلاحی باتیں ہو جاتیں پھر کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کر کے آگے چلے جاتے۔ اصل اجتماع اور بیان رات کو بعد عشاء ہوتا۔ ہر مقام پر سو دو سو میل تک کے لوگ اپنی کاروں سے ضرور پہونچ جاتے، معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا عام رواج ہے۔ گویا جس طرح ہمارے یہاں کے لوگ کسی دینی اجتماع یا تقریب کے لئے ۲-۴ میل کی مسافت سے پیدل یا رکشوں سے آ جاتے ہیں اسی طرح یہاں سو، دو سو میل تک کے لوگ اپنی کاروں سے آ کر شرکت کرتے ہیں، اور اجتماع کے ختم پر اپنے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے مقامات پر بھی جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہ ہوتی اجتماع میں حاضری اکثر بہت کافی ہو جاتی ہے۔ عام طور سے تقریر اردو ہی میں ہوتی، جس کو اکثر حاضرین سمجھتے۔ میں اس کی پوری کوشش کرتا کہ اپنے

امکان کی حد تک آسان سے آسان زبان استعمال کروں، اور ایک ایک بات کو اگر ضرورت سمجھوں تو دو، دو، تین تین بار دہراؤں۔ صرف صوبہ کیپ کی تقریروں میں انگریزی ترجمہ کی ضرورت ہوئی، کیونکہ وہاں مسلمانوں میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ہیں جو اردو سمجھ سکیں۔ میرے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل مولانا محمد یونس ٹیل تھے، بڑے اچھے ذی استعداد عالم ہیں۔ انگریزی میں میری تقریر کا ترجمہ بہت اچھا کرتے۔ میں جو آیت پڑھتا وہ آیت پڑھتے، اور جس حدیث کا متن پڑھتا وہ لفظ بلفظ اسی کو پڑھتے۔

صوبہ کیپ میں جتنی تقریریں ہوئیں سب کا ترجمہ مولانا موصوف ہی نے انگریزی میں کیا۔

ہر تقریر کے موقع پر محسوس ہوتا تھا کہ لوگ بات توجہ سے سنتے اور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دینی ذوق و طلب کی یہ کیفیت کچھ ہی دنوں سے اس ملک کے مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہے، اور اس میں تبلیغی جماعت کے کام کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ اس کام کا سلسلہ اس ملک میں ۷-۸ سال سے چل رہا ہے، جو لوگ کام میں زیادہ لگے ہوئے ہیں ان کو بڑا ہی مخلص پایا۔ معلوم ہوا کہ پہلے کئی سال تک لوگوں نے بالکل توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ لوگ مخلص بنے، اجر آخرت کی امید پر اسی طرح اخلاص اور استقامت سے محنت کرتے رہے، پھر جیسا کہ سنت اللہ ہے حق تعالیٰ نے قلوب کو متوجہ کیا، اب لوگوں کے دلوں میں اس کام کی بڑی عظمت ہے۔ اس کام کے ذریعہ بعض لوگوں کی اتنی دینی ترقی ہوئی ہے کہ ان کا حال جان کر بڑا ہی رشک آیا اس سے دل میں کام کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی۔

جنوبی افریقہ مختلف پہلوؤں سے عجیب و غریب ویرالا ملک ہے، یہاں ایسے مناظر اور نعمتوں کی ایسی فراوانی ہے کہ جنت کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں کے سیاسی حالات بھی بہت ہی عجیب و غریب ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے یہاں کے مسلمانوں کے حالات بھی ایسے ہیں کہ ان پر تفصیل سے کچھ لکھا جائے۔ دین کے سلسلہ میں جو کوششیں اور جو کام اور جس طرح ہو رہے ہیں وہ بھی قابل تذکرہ ہیں لیکن اس خط میں ان میں سے کسی چیز کی گنجائش نہیں۔ اس وقت تو میں اپنے اس سفر کی منزلوں کا سرسری تذکرہ کر کے حرمین شریفین کی حاضری کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جنوبی افریقہ کے اس دورہ میں میری آخری منزل ڈربن تھی۔ آخری تقریر ۲۲ مئی کو ڈربن کی اس جامع مسجد میں ہوئی جس میں ۹ اپریل کو سب سے پہلی تقریر ہوئی تھی۔ یہ ڈربن میں گویا میری الوداعی تقریر تھی۔

جنوبی افریقہ سے ماریشس

-- ۲۳ مئی کو میں ڈربن سے ماریشس کے لئے روانہ ہوا۔ ماریشس مشرقی افریقہ میں چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اب سے ۵ سال پہلے ۱۹۶۸ء میں بھی یہاں جانا ہوا تھا۔ اس وقت یہ برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔ لیکن اس کی آزادی کا فیصلہ ہو چکا تھا، اور اقتدار منتقل ہونے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اب یہ آزاد ملک ہے۔ اس ملک کی کل آبادی ۸ لاکھ کے قریب ہے۔ گویا ہمارے آپ کے ضلع مراد آبادی کے قریب ایک تہائی۔ اس کا طول و عرض اتنا ہے کہ ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلے جانے کے بعد بھی سفر کی مسافت پوری نہیں ہوتی اور نماز میں قصر کی ضرورت پیش نہیں آتی، زمین بہت زرخیز ہے۔ اس دفعہ

یہاں صرف چار دن قیام رہ سکا، وقت میں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل مولانا اسماعیل صاحب اور ان کے مخلص رفیق حاجی غلام محمد صاحب اس عاجز سے بڑا گہرا اعلیٰ تعلق رکھتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ۳-۴ دن کی گنجائش کسی طرح نکالی تھی۔ قیام ان دونوں کے یہاں منقسم رہا۔ حاجی غلام محمد صاحب اردو بالکل نہیں جانتے۔ گجراتی بھی غالباً بہت کم جانتے ہیں۔ صرف انگریزی اور فرانسیسی جانتے ہیں۔ لیکن ان کی بوڑھی والدہ صاحبہ کچھ اردو بول بھی لیتی ہیں اور پڑھ بھی لیتی ہیں۔

ماریش سے ری یونین

۲۶ مئی کو بعد نماز جمعہ ماریش سے ری یونین کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ بھی مشرقی افریقہ کا ایک جزیرہ ہے۔ ماریش کی طرح یہ بھی چھوٹا سا ملک ہے۔ لیکن یہ فرانس کے زیر اقتدار ہے۔ ۱۹۶۸ء کے سفر میں یہاں بھی آنا ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ گویا یورپ کا ایک بہترین خطہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ بھی بتائی گئی کہ اس کی زمین میں سانپ بچھو جیسے زہریلے جانور بالکل نہیں ہیں، نہایت سرسبز و حسین ملک ہے۔ پورا ملک ایک گلزار معلوم ہوتا ہے۔ مرکزی شہر سینٹ ڈینس ہے۔ زیادہ تر قیام یہیں رہا۔ اس کے علاوہ دو تین شہروں میں بھی جانا ہوا۔ سفر موٹر سے اس طرح ہوا کہ ساتھ والوں نے بتلایا کہ پورے ملک کا دورہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ہر شخص خوش حال ہے۔ معمولی مزدور کی آمدنی ہندوستانی سکے کے حساب سے ۵۰ روپے یومیہ ہے۔

اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہ کم از کم دو تین ہزار ہوتی ہے۔ ایک دوست نے بتایا کہ میرا لڑکا بینک میں کلرک ہے، ہندوستانی سکے کے حساب سے اس کی تنخواہ پانچ ہزار سے اوپر ہے۔ پورے ملک میں تجارت قریباً سو فی صدی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے مسلمان عموماً بہت خوش حال ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہے اور ملک کے دوسرے طبقوں کا پورا اعتماد ان کو حاصل ہے۔ میں یہاں کے صرف چند حضرات ہی سے واقف ہوں۔ اللہ نے دولت دنیا کے ساتھ آخرت کی فکر اور دین کی نعمت بھی بظاہر، بھرپور عطا فرمائی ہے۔ بلاشبہ ایسے حضرات بڑے خوش نصیب ہیں جن کو ”حسنہ دنیا“ اور ”حسنہ آخرت“ دونوں حاصل ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو شکر کی اور ان نعمتوں کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کے دولت مندوں میں آخرت کی فکر بہت کم ہی دیکھی جاتی ہے۔

ری یونین سے کینیا

ری یونین میں میرا قیام ۶ دن رہا۔ ۲ جون کو وہاں سے نیروبی (کینیا) کے لئے روانہ ہوا۔ ایک دن

نیردلی اور دودن ”مباسہ“ میں رہا، یہ مباسہ کینیا کا دوسرے نمبر کا شہر ہے۔ اور بے حد حسین اور صاف ستھرا شہر ہے۔ اب سے چند سال پہلے تک اس کے علاقے کے علاقے انگریزوں کے لئے گویا مخصوص تھے۔ لیکن اب وہ سب انگریزوں سے خالی ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بنگلوں میں دوسرے لوگ ہیں۔ کَم تَرَ کُنُوزًا مِنْ جَنَّاتٍ وَ نَعِیمٍ وَ زُرُوعٍ وَ مَقَامٍ کَرِیمٍ وَ نَعْمَۃً کَانُوا فِیْهَا لَا یُکْهِیْنَ ۝ کَذٰلِکَ وَاَوْزَنَّا هَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ .

مباسہ کی ایک قابل ذکر شخصیت

مباسہ میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والوں کی الحمد للہ ایک اچھی تعداد ہے۔ بڑے مخلص اور صالح بندے ہیں۔ مباسہ ہی کینیا اور مشرقی افریقہ کے کئی دوسرے ملکوں کے لئے بحری اسٹیشن ہے۔ اس لئے یہاں تبلیغی جماعتوں کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہے۔ یہاں کی ایک شخصیت حاجی ابراہیم صاحب قابل ذکر ہیں۔ تبلیغی کام کے سلسلہ سے ہندوستان آتے رہتے ہیں، بار بار ملاقات ہوئی ہے۔ کافی عرصہ سے تعارف ہے۔ لیکن اُن کی خصوصیات بالکل معلوم نہیں تھیں۔ اب معلوم ہوا کہ دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے بہت ممتاز ہیں۔ کاروبار بھی بہت بڑا اور بین الاقوامی قسم کا ہے۔ لوگوں نے ذکر کیا کہ ایک زمانہ میں اُن کا یہ حال تھا کہ اُن کے کپڑے پیرس میں دھلتے تھے۔ اللہ کی شان ہے کہ تبلیغی کام سے تعلق کے بعد اُن کی ایسی کاپیالٹ ہوئی کہ جازی قسم کا لمبا کرتا اور اس کے اوپر عبا اور سر پر عمامہ مستقل لباس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صورت بھی مشائخ کی عطا فرمائی ہے۔ دین میں اتنی پختگی اور استقامت ہے کہ گھر میں، دفتر میں کسی قسم کی تصویر کا گذر نہیں۔ چونکہ کاروبار بہت بڑا ہے اس لئے حکومت کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ کم سے کم دفتر میں ملک کے صدر کی تصویر آویزاں کی جائے، جیسا کہ ملک میں عام دستور ہے۔ انھوں نے معذرت کی کہ میرا مذہب مجھ کو اس کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ صاف لکھ دیا کہ اگر اس کے بغیر میں ملک میں نہیں رہ سکتا تو میں اس بارے میں سوچوں گا۔ آخر حکومت نے اپنا اصرار واپس لے لیا، اور صرف اس پر قناعت کر لی کہ دفتر میں ملک کے جھنڈے کا کاغذی نقشہ آویزاں رہے جس میں کوئی تصویر نہیں ہے۔ حاجی صاحب کے ساتھ اُن کے دفتر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے دیکھا کہ ملک کے جھنڈے کا نقشہ ہی آویزاں ہے۔ معلوم ہوا کہ حاجی صاحب اپنا کوئی مکان کسی کو کرایہ پر دیتے ہیں تو اس سے شرط کر لیتے ہیں کہ وہ مکان میں تصویر نہیں لگائے گا، کتا نہیں رکھے گا۔

حاجی صاحب موصوف کی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ مناسب موقعوں پر ارباب حکومت اور

طفیل اس کے جلسوں کے سلسلہ میں بھی کئی بار حجاز مقدس کی حاضری نصیب ہوئی، لیکن اس دفعہ مسجد حرام میں خاص کر طواف میں اللہ تعالیٰ کا کچھ خاص فضل و کرم محسوس ہوتا تھا۔ اللہ کی توفیق سے بہت سے اُن حضرات کی طرف سے بھی جن سے قرابت، احسان یا محبت کے تعلقات ہیں اور ان کے حقوق ہیں، طواف کرنا نصیب ہوا۔ آپ کی خوشی کے لئے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی طرف سے بھی طواف کیا۔

مولانا سعید احمد خاں صاحب کو تو آپ خوب جانتے ہوں گے اور اچھی طرح یاد ہوں گے۔ حجاز پاک میں وہ تبلیغی کام کے ذمہ دار ہیں، ہمیشہ سے میرے قلب میں اُن کی بڑی عظمت ہے۔ ان کا قیام مدینہ طیبہ میں رہتا ہے۔ معلوم یہ ہوا تھا کہ وہ عنقریب مدینہ طیبہ سے کسی سفر پر روانہ ہونے والے ہیں، اس لئے مجھے فکر تھی کہ مولانا کے سفر سے پہلے مدینہ طیبہ پہنچ جاؤں، لیکن اللہ کی شان! کہ وہ خود مکہ معظمہ تشریف لے آئے۔ اُن کی زیارت و ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ بھائی فضل عظیم مراد آبادی جو اب خدا کے فضل سے مکی ہو گئے ہیں، ان کی ملاقات بھی بڑی خوشی کا باعث ہوئی۔ ان دوستوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص فضل ہے۔ ان سے تعلق و محبت انشاء اللہ آخرت میں کام آئے گا۔ مولانا غلام رسول مالیکانوی سے بھی آپ واقف ہوں گے۔ میرے اندازے میں بہت متوازن اور فہیم ہیں۔ مکہ معظمہ میں اپنے کسی بھی کام کے لئے جب کسی کوزحمت دینا ناگزیر ہو تو میں بے تکلف ان ہی کو تکلیف دیتا ہوں۔ بہت مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک سعادت اور خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب لاہوری سے ان کا خاص رابطہ ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے مولانا تک پہنچنے کا گویا وہی دروازہ ہیں۔ آپ حضرت مولانا ممدوح سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ شاید دارالعلوم دیوبند میں ساتھ بھی رہا ہو۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کے صاحبزادے ہیں۔ عمر مجھ سے خاصی کم ہے، لیکن خاص درویشانہ زندگی نے اتنا متاثر کیا ہے کہ مجھ سے بہت زیادہ ضعیف اور بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ اختلاج کی بھی کافی عرصہ سے شکایت ہے۔ لوگوں سے بہت ہی کم ملنا چاہتے ہیں۔ میرے ساتھ اور مجھ سے زیادہ مولانا علی میاں کے ساتھ عنایت و محبت کا خصوصی تعلق ہے۔ مکہ معظمہ کے اس قیام میں ۲-۳ بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ بلاشبہ مولانا اُن بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کا حال حدیث نبوی میں یہ بیان فرمایا گیا ہے: ”یَذْكُرُكُمْ اللَّهُ رَوْيْتَهُ وَيَذْكُرُكُمْ الْآخِرَةُ عَمَلُهُ وَيَنْفَعُكُمْ مِنْطَقُهُ“۔ (یعنی انھیں دیکھ کر تمہیں اللہ یاد آئے، اور اُن کا طرزِ عمل اور ان کی زندگی آخرت کو یاد دلائے اور ان کی باتوں سے تمہیں نفع ہو اور دل زندہ ہو)

خلوت پسندی مولانا کا حال ہے اور اس وقت وہ اس بارے میں بالکل معذور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی تہدیلی فرمائے کہ لوگوں کے لئے اُن سے ملنا اور اُن کی صحبت سے استفادہ آسان ہو جائے۔ مولانا یقیناً ان بندگان خدا میں سے ہیں جن کی صحبت اکسیر ہے۔

مدینہ منورہ کی حاضری

مکہ معظمہ میں ۶ دن گزارنے کے بعد مدینہ طیبہ حاضری کا ارادہ کیا، میں نے افریقہ ہی سے اپنے نہایت عزیز دوست صوفی محمد اقبال صاحب (مقیم مدینہ طیبہ) کو لکھ دیا تھا کہ انشاء اللہ مکہ معظمہ اور پھر وہاں سے مدینہ طیبہ حاضری ہوگی اور آپ کا مہمان رہوں گا۔ لیکن ہمارے میزبان قاری محمد سلیمان صاحب نے مع اپنی اہلیہ مکرمہ کے (جن کو اللہ تعالیٰ نے قاری صاحب کے جذبہ مہمان نوازی کا بھی پورا شریک بنایا ہے) میرے ساتھ مدینہ طیبہ چلنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اُن کی میزبانی کا سلسلہ وہاں بھی اسی طرح جاری رہے اور پوری ایک موٹر کار مدینہ طیبہ جانے کے لئے کر لی۔ ۱۱ رجون کی شام کو مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہو گئے، اور رات کو عربی ٹائم کے حساب سے ۴ بجے کے بعد (یعنی ہمارے حساب سے ۱۱ بجے کے بعد) مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔

قاری صاحب پر اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک بہت عالی شان اور نہایت آرام دہ مکان اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ گویا اُن کی نگرانی اور انتظام میں ہے۔ جس میں وہ خود قیام فرماتے ہیں اور اُن کے مہمان بھی اُس میں مقیم ہوتے ہیں۔ اسی مکان پر جا کر اتر گئے۔ یہ مسجد نبوی سے بہت قریب ہے، صرف تین چار منٹ کا راستہ ہے۔ عشاء کی نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کیا، اور اذان فجر سے پہلے مسجد شریف میں حاضر ہو گئے۔ ”روضۃ الجنۃ“ میں دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرنے کے بعد سرور کائنات آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں سلام عرض کرنے کے لئے مواجہہ میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ اور جن حضرات اکابر و احباب یا عزیزوں کی طرف سے سلام پہنچانا تھا ان کا سلام پہنچایا۔ قرآن پاک کی یہ آیت بار بار زبان پر آئی۔

إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ، كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا ۴ بِيَهْوَئِهِ ۴ ثُمَّ تَابَ مِنْ ۴ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّهُ غَفُورٌ

رَحِيمٌ ۵

مدینہ طیبہ میں ۶ دن قیام رہا، الحمد للہ وقت بہت ہی اچھا گذرا۔ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم

سے تعلق رکھنے والوں کا وہاں ایک پورا حلقہ ہے، گویا اپنا ایک خاندان بسا ہوا ہے۔ صوفی محمد اقبال صاحب اور ڈاکٹر اسماعیل صاحب سے پورا عزیزانہ تعلق ہے، بظاہر ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ اتفاق سے ان دونوں مولانا عبدالرحیم صاحب بھی مدینہ طیبہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کو حضرت شیخ سے استفادہ کی بڑی توفیق ملی ہے۔ حضرت کی بھی ان پر خاص نظر عنایت رہی ہے، ان کو دیکھ کر بڑا ہی رشک آتا تھا۔ اور اپنے پر بڑا ہی افسوس اور محرومی کا بڑا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ کے اچھے بندوں کی محبت نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ شکر نصیب فرمائے۔

احب الصالحین ولست منهم لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

مسجد نبوی کا خطبہ جمعہ اور تاثر

جیسا کہ عرض کیا مدینہ طیبہ میں ۶ دن قیام رہا۔ ایک دن شہداء اُحد کے مزارات پر اور جنت البقیع میں بھی حاضری اور ”مسنون طریقہ پر“ عرض سلام اور دعا و ایصالِ ثواب کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۶ جون کو جمعہ تھا۔ اسی کی شام کو مکہ معظمہ روانگی کا پروگرام تھا۔ نماز جمعہ مسجد شریف میں روضۃ الجنۃ میں ادا کی، امام صاحب کا خطبہ بڑا موثر اور خاصا طویل تھا۔ جب مسلمانوں کے دل زندہ تھے تو اس سے بہت مختصر خطبوں سے دلوں کی دنیا، پھر اس کے نتیجہ میں باہر کی دنیا بدل جاتی تھی۔ اب بس زبان بول دیتی ہے اور کان سن لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر امت کے دلوں کو زندہ فرمائے۔ اِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْۢ ۙ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدَّ قَسْوَةً، وَاِنْ مِنْ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ، وَاِنْ مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ، وَاِنْ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (سورہ بقرہ: آیت ۷۴)

سوچنے کی بات ہے کہ آج ہماری حالت کیا اس سے کچھ زیادہ مختلف ہے؟!

عصر کی نماز بھی مسجد شریف میں ادا کی، غروب آفتاب سے قریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے بارگاہِ عالیٰ مواجہ شریف میں آخری حاضری ہوئی، الوداعی سلام عرض کیا اور غروب سے قریباً ۱۵ منٹ پہلے مکہ معظمہ کے لئے روانگی ہوئی۔ اس دفعہ بھی قاری صاحب نے صرف ہم تین آدمیوں کے لئے پوری گاڑی کر لی تھی۔ ”ایبار علی“ پہونچ کر مغرب کی نماز ادا کی، اسی کے قریب میں وہ جگہ ہے جہاں رسول اللہ (ﷺ) نے

حجۃ الوداع کا احرام باندھا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی وہیں سے عمرہ کا احرام باندھا، اور لیلیک لیلیک پکارتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ ایسے وقت پہنچا ہوا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، فجر کی اذان میں بس ڈھائی گھنٹے باقی تھے، تھوڑی دیر سولے پھر نماز فجر کے لئے اٹھ گئے، نماز ادا کی، اشراق کے بعد عمرہ کا طواف اور سعی کر کے حلق کرایا... الحمد للہ اس سفر میں یہ دوسرا عمرہ مدینہ طیبہ سے نصیب ہو گیا۔

اللہم لک الحمد لا احصى ثناء علیک انت کما انیت علی نفسک

اس پورے سفر میں اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایات نصیب رہیں۔ یہاں تک کہ اپنے حال اور اعمال پر نظر کر کے بار بار یہ ڈر پیدا ہو کہ کہیں یہ استدراج کا معاملہ نہ ہو۔ لیکن سفر کا خاتمہ جس طرح حرمین شریفین کی حاضری پر فرمایا گیا اُس سے امید ہوتی ہے کہ یہ سب رب کریم کا فضل و کرم اور انعام و احسان ہی ہوگا، جس کے لئے استحقاق بالکل شرط نہیں ہے۔

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

ایک اہم بات ذکر سے رہ گئی۔ انشاء اللہ اُس کا تذکرہ آپ کے لئے بہت خوش کن ہوگا۔ اس دفعہ حرمین شریفین میں جدہ میں بھی دینی لحاظ سے فضا بہت بہتر محسوس ہوئی.... معلوم ہوا کہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے دو سخت حکم جاری ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ اذان ہونے پر لوگ فوراً مسجدوں کو چل دیں۔ اگر جماعت کے وقت کوئی شخص (معذوروں کے علاوہ) گھریا دوکان پر کہیں دیکھا گیا تو وہ قابل سزا ہوگا، اور یہ سزا بہت سخت بھی ہو سکتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ عورتیں پردہ کے حکم کی پابندی کریں، اگر کسی عورت کو دیکھا گیا کہ وہ بے پردہ ہو کر اپنی آرائش و زیبائش کی نمائش کرتی ہے تو اگر وہ سعودی ہے تو اس کو اور گھر والوں کو سزا دی جائے گی، اور غیر ملکی ہے تو ملک چھوڑنے کا حکم دیدیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ ان دونوں حکمنوں نے غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور بڑی اصلاح ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے سب طبقوں کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے اور ان کو ادا کرنے کی توفیق دے، خدا کرے آپ کا مزاج بغافیت ہو۔ اس خط کے جواب میں بس دعا کا طالب وسائل ہوں، نہایت محتاج بھی۔

محمد منظور نعمانی والسلام

اس سفر کے کچھ مشاہدات و تاثرات

[اوپر کے مکتوب میں سفر کی مصروفیت اور مشاغل خاصی تفصیل سے آگئے، لیکن نئے ملکوں اور نئی سر زمینوں میں جو کچھ نئے چیزیں دیکھنے میں آتی، نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور جو تاثرات ان

سے پیدا ہوتے ہیں، ایک سفرنامہ میں قارئین اُن کے بھی متوقع ہوتے ہیں۔ یہ کسی بھی سفرنامہ کا ضروری حصہ ہیں۔ جنوبی افریقہ کی روداد سفر کا یہ بقیہ حصہ ذیل میں (کچھ اختصار کے ساتھ) ملاحظہ فرمائیے، جو الفرقان کی مابعدی اشاعت (جمادی الاخریٰ در جب ۱۳۹۲ھ) میں طبع ہوا۔ اور ہاں یہ خیال رکھئے کہ چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ مرتب [

”افریقہ ایک بہت ہی طویل و عریض براعظم ہے۔ گویا ایک مستقل دنیا ہے۔ اس میں بہت سے ملک اور بہت سی حکومتیں ہیں۔ ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلم حکومتوں کی سب سے زیادہ تعداد براعظم افریقہ ہی میں ہے۔ واقفین نے بتلایا کہ افریقہ کے مختلف ملکوں اور خطوں میں تقریباً دو سو سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں ۱۴-۱۵ زبانیں تعلیمی و تصنیفی یا سرکاری زبانیں ہیں، باقی صرف علاقائی بولیاں ہیں۔“

جنوبی افریقہ اور اس کی خصوصیات

افریقی ممالک میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ، خوش حال اور طاقتور ملک ”جنوبی افریقہ“ ہے، اور مختلف حیثیتوں سے عجیب و غریب ملک ہے۔ لوگوں نے بتلایا کہ اس کا رقبہ اتنا وسیع ہے جتنا پہلے مشرقی بنگال پاکستان کا تھا، اور آبادی صرف دو کروڑ کے قریب ہے، پھر زمین نہایت زرخیز ہے، پھل نہایت اعلیٰ قسم کے اور بڑی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، اور دوسرے ملکوں کو بھی جاتے ہیں، کاشت کی چیزوں میں سب سے زیادہ پیداوار گنے کی ہے۔ جس کی سال میں دو فصلیں ہو جاتی ہیں، یعنی چھ مہینے میں گنا بالکل تیار ہو کر مل میں چلا جاتا ہے۔ اس ملک میں اس کی پیداوار کسی وقت اور موسم کی پابند نہیں ہے۔ اندرون ملک کے دورہ میں خود دیکھا کہ ایک جگہ کھیت میں گنا بویا جا رہا ہے، دوسری جگہ دیکھا کہ قد آدم اکیچھ کھڑی لہلہا رہی ہے۔ تیسری جگہ جگہ دیکھا کہ گنا کٹ کر ملوں میں جانے کے لئے ٹرکوں میں بھر جا رہا ہے۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ شکر بنانے والے کارخانے یہاں سال کے بارہ مہینے چلتے رہتے ہیں اور ان کو گنا ملتا رہتا ہے۔

موسم کا حال یہ ہے کہ تکلیف دہ گرمی کبھی نہیں ہوتی، وہاں گرم موسم کا مطلب صرف یہ ہے کہ سردی کی تکلیف نہیں، ہاں سردی سخت پڑتی اور وہ ٹھیک اُن مہینوں میں جن میں ہمارے یہاں سخت گرمی ہوتی ہے، یعنی جون اور جولائی میں، میں مئی کے مہینے میں ٹرانسوال میں تھا، وہاں ایسی سردی تھی جیسی ہمارے یہاں آخر دسمبر اور جنوری میں ہوتی ہے۔ گھروں اور مسجدوں کو ہیٹر کے ذریعہ گرم کرنا پڑتا تھا۔ وسط مئی میں بعض مقامات پر

ایسی برف باری ہوئی کہ زمین بالکل سفید پوش ہوتی تھی اور موٹر بہت احتیاط سے چلانی پڑتی تھی۔

اس ملک میں ہموار میدانی زمین بہت کم نظر آئی۔ زیادہ تر پہاڑوں کے نشیب و فراز ہیں۔ پہاڑیاں بھی عجیب قسم کی ہیں۔ نیچے پتھر ہے جیسا کہ پہاڑوں میں ہوتا ہے، لیکن اوپر مٹی کی سطح ہے جو نہایت زرخیز ہے، پہاڑوں پر گنوں کے سرسبز و شاداب کھیتوں کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سبز مخمل کا فرش ہے جس میں کہیں شگن نہیں۔ کھیتی کا سارا کام بجلی کی طاقتور مشینوں سے ہوتا ہے۔ گنے کے کھیتوں کو پانی بجلی کے ذریعہ فواروں سے اس طرح دیا جاتا ہے کہ دور سے معلوم ہوتا ہے کہ کھیت پر تیز بارش ہو رہی ہے۔

زمین کی زرخیزی اور پیداوار کی کثرت کے علاوہ ملک کے بعض حصوں میں سونے اور ہیرے اور لوہے کی کانیں بھی ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ دنیا کا ساٹھ فی صدی سونا اس ملک کی کانوں سے نکلتا ہے، ان سب چیزوں کی وجہ سے دولت کی بڑی فراوانی ہے۔ غربی اور مفلسی کا کم از کم شہروں میں، کہیں نام و نشان نہیں نظر آتا۔ دولت کی فراوانی کا کچھ اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ ملک کے مرکزی اور سب سے بڑے شہر جو ہانسبرگ کی آبادی بتلایا گیا کہ ۱۲ لاکھ کے قریب ہے، اور موٹر کاروں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے، گویا ہر ۳-۴ آدمیوں کے پاس ایک موٹر کار ہے۔ اور موٹر کار بھی نہایت اعلیٰ قسم کی بیش قیمت۔ ملک کے دور دراز خالص پہاڑی علاقوں اور جنگلوں میں بھی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے، اور سڑکیں ایسی ہموار اور بہتر حالت میں کہ گویا مشین میں ڈھال کر ابھی بچھائی گئی ہیں، اس لئے موٹروں پر سیکڑوں میل کا سفر بھی بالکل محسوس نہیں ہوتا، اس کے علاوہ بھی عام صفائی ستھرائی بڑی قابل تحسین ہے۔

ملک کے صوبے اور مسلم آبادی

ملک ۴ صوبوں میں منقسم ہے۔ ایک ٹرانسوال، جس کا مرکزی شہر جوہانسبرگ ہے، جو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ دوسرا ٹینال، جس کا مرکزی شہر ڈربن ہے، جو ملک کا دوسرے نمبر کا شہر ہے۔ تیسرا کیپ، جس کا مرکزی شہر کیپ ٹاؤن ہے، جو پورے ملک کا دار الحکومت بھی ہے۔ پارلیمنٹ کا اجلاس وہیں ہوتا ہے۔ آب و ہوا اور مناظر کے لحاظ سے یہ دنیا کے بہترین اور خوبصورت ترین شہروں میں سمجھا جاتا ہے۔ چوتھا صوبہ اورنج فری اسٹیٹ ہے۔ اس میں مسلمان بہت کم ہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لئے اس صوبہ میں میرا جانا نہیں ہوا۔

مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد صوبہ ٹینال کے شہروں میں ہے اور اس کے بعد ٹرانسوال کے شہروں میں۔ اس لئے میرا زیادہ وقت قریباً چالیس دن ان ہی دونوں صوبوں کے دورہ میں گزرا۔ کیپ

ٹاؤن میں صرف تین دن قیام رہا، اور اس صوبہ کے ایک دوسرے شہر پورٹ الزبتھ میں صرف ایک دن۔ اس شہر میں ایک عجائب خانہ ہے۔ بعض مقامی حضرات بہت اصرار کر کے مجھے بھی لے گئے، وہاں سب سے عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک بہت بڑا تالاب ہے اس میں بڑی بڑی مچھلیاں ہیں، قد اور وزن کے لحاظ سے ہمارے ملک کی بھینس کے برابر، ان میں اس طرح کی سمجھ ہے جس طرح بندر میں ہوتی ہے۔ انھیں خاص تربیت دی گئی ہے۔ بہت سے کام وہ کر کے دکھاتی ہیں جو انسان ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں عجیب صلاحیتیں رکھی ہیں۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ، وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْبَشَرِ ۝

صوبہ ٹرانسوال اور عیال کے شہروں میں جو مسلمان ہیں وہ عموماً گجراتی نسل کے ہیں۔ ان میں کے اکثر گھروں میں اب تک گجراتی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مذہبی تعلق سے اردو سے بھی رابطہ ہے۔ اردو پڑھنے لکھنے والے تو بہت کم ہیں، لیکن چھوٹے بچوں اور کم عمر نو جوانوں کے علاوہ آسان اردو سب سمجھتے ہیں۔ عیال اور ٹرانسوال کے شہروں میں تقریریں صرف اردو ہی میں ہوتی تھیں۔ میں کوشش کرتا تھا کہ زبان ممکن حد تک آسان ہو، لوگوں نے بتایا کہ میری تقریر عام طور پر سمجھی جاتی تھی۔ ہاں کیپ ٹاؤن میں اردو سمجھنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں اس لئے وہاں تقریر کا ترجمہ انگریزی میں کیا جاتا تھا۔ کیپ ٹاؤن کے دورہ میں میرے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ایک نو جوان فاضل مولانا محمد یونس ٹیل تھے۔ عالم بھی ذی استعداد ہیں اور انگریزی زبان پر بھی اچھی قدرت ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا بہت ہی اچھی ترجمانی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں قرآن مجید کی آیت یا کسی حدیث کا متن پڑھتا تو اس کو اسی طرح پڑھتے۔

کیپ ٹاؤن کے سلیمان جعفر

کیپ ٹاؤن، ڈربن اور جوہانسبرگ دونوں شہروں سے بہت فاصلہ پر ہے۔ لگ بھگ ہزار میل کی مسافت ہوگی۔ اس لئے وہاں جانا بھی ہوائی جہاز سے ہوا اور آنا بھی، وہاں کے ایک دوست سلیمان جعفر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہاں میری اردو تقریر سمجھنے والے نہیں ہیں، وہاں کا طویل سفر سلیمان جعفر صاحب ہی کی وجہ سے منظور کیا تھا۔ یہ کیپ ٹاؤن کے ایک تاجر ہیں جو اردو سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ان کا قصہ یہ ہے کہ اب سے غالباً دو دو سو سال پہلے انھیں میری کتاب ”اسلام کیا ہے؟“ کا انگریزی ترجمہ ”What Islam is?“ کہیں سے مل گیا۔ اس کے مطالعہ سے ان پر بے حد اثر پڑا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب تک میری جو زندگی گذری بالکل غیر اسلامی گذری۔ اور اگر اس حال میں کسی وقت دنیا سے چل دینا ہو تو میرا انجام اور ٹھکانا بہت بُرا ہوگا۔ اس خیال نے ان کے دل

ودماغ کو بے حد متاثر کیا، پہلے تو انھوں نے طے کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے مدینہ منورہ جا پڑوں، اور بقیہ زندگی جس طرح بھی گزرے وہیں گزار کے وہاں کی پاک زمین کا پیوند ہو جاؤں، اس کے لئے انھوں نے سعودی حکومت سے مراسلت بھی کی، لیکن وہاں سے مستقل قیام کے لئے آنے کی اجازت نہیں ملی تو پھر انھوں نے اپنی اصلاح اور گزشتہ زندگی کی تقصیرات کی تلافی کے لئے ہندوستان کا رخ کیا، کچھ دن دوسرے مقامات پر بھی رہے۔ آخر میں لکھنؤ آ گئے، یہاں زیادہ دنوں اُن کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجہ حفظ کے غریب طلبہ کے ساتھ ایک ایسے کمرہ میں رہا جس میں پنکھا بھی نہیں تھا، اور موسم انتہائی گرم۔ مدرسہ کے ”لنگر خانہ“ سے جو عام کھانا طلبہ کو ملتا تھا وہی یہ بھی بقیمت لے کے کھاتے تھے۔ کئی مہینے لکھنؤ میں اس طرح قیام کے بعد گزشتہ رمضان (۱۳۹۱ھ) سے پہلے وہ حج کے ارادہ سے حجاز مقدس چلے گئے، اور ۴-۵ مہینے قیام کے بعد اپنے وطن کیپ ٹاؤن پہنچ گئے۔ میرے وہاں پہنچنے سے کچھ ہی دن پہلے یہ حجاز مقدس سے واپس آئے تھے۔ کیپ ٹاؤن میں میرا قیام ان ہی کے مکان پر رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ان کا یہ مکان اس قدر عالیشان اور آراستہ تھا کہ ہمارے ملک کے گورنر کی رہائش گاہیں بھی شاید اس سے زیادہ آراستہ اور شاندار نہ ہوں گی۔ ان کی دوکان پر بھی جانا ہوا، یہ کھانے پینے کی چیزوں کی دوکان ہے۔ ایک طرح کا بہت بلند معیار ہوٹل ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا جو ماہانہ کرایہ وہ ادا کرتے ہیں، ہمارے ہندوستانی سکہ کے حساب سے وہ پانچ ہزار روپے کے قریب ہوتا ہے۔ اس زندگی اور اس حیثیت کے آدمی نے لکھنؤ میں کئی مہینے اس طرح گزارے جس طرح ہمارے مدارس میں بہت ہی غریب اور مسکین طالب علم گذارتے ہیں۔ اُن کے صبر و ثبات اور مجاہدہ سے طبیعت پہلے بھی متاثر تھی مگر اُن کے رہائشی مکان اور وہاں اُن کی زندگی کو دیکھ کر بہت ہی اثر ہوا اور بڑی عبرت حاصل ہوئی۔ اتنی تفصیل سے ان کا تذکرہ یہاں اسی لئے کر دیا ہے کہ اللہ کے بندے عبرت اور سبق حاصل کریں۔

مسلمانوں کی زندگی کا ایک قابل فکر تضاد

ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی زیادہ تعداد صوبہ نیپال اور ٹوانسوال میں ہے، اور میرا زیادہ تر وقت ان ہی صوبوں میں گذرا۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ان کی زندگی میں عجیب قسم کا تضاد ہے۔ ان میں خاصی بڑی تعداد صوم و صلوة بلکہ جماعت کی پابند ہے، جس کی وجہ سے مسجدیں خوب آباد ہیں، معلوم ہوا کہ ان کے بہت سے گھرانوں کی عورتیں بھی نماز کی پابند ہیں۔ بلکہ روزانہ صبح قرآن مجید کی تلاوت بھی ان کا معمول ہے۔ ایسے لوگ بڑی تعداد میں ہیں جو شرعی ڈاڑھی رکھتے ہیں، جو اس زمانہ میں

بلاشبہ گہری مذہبیت کی علامت ہے۔ خیر کی راہوں میں بڑی کشادہ دستی اور فیاضی سے خرچ بھی کرتے ہیں، اور ثواب آخرت کی امید پر خرچ کرتے ہیں، جو یقیناً دینداری کی نشانی ہے۔ اپنے بچوں اور بچیوں کو دنیوی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم بھی دلاتے ہیں اور اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور اب تو اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنے بچوں کو حافظ یا عالم بنانے کے لئے ہندوستان یا پاکستان کے مدرسوں میں بھیجتے ہیں، جو ان جیسوں کے لئے دین کی راہ میں یقیناً بڑی قربانی ہے۔ مگر ان سب چیزوں کے ساتھ خانگی معاشرت معلوم ہوا کہ بڑی حد تک مغربی ہے۔ بہت ہی خاص بلکہ... خاص الخاص گھرانوں میں کچھ پردہ ہے۔ ورنہ اکثر گھرانوں کی بیویاں اور بہو بیٹیاں دوکان پر بیٹھ کر کاروبار کرتی ہیں، انہیں دیکھ کر ہم جیسے آدمی کو اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جس میں دینداری کا کچھ بھی اثر ہے، بعض دوستوں نے بڑے دکھ کے ساتھ بتایا کہ اس طرز زندگی کے بہت ہی افسوسناک بلکہ شرمناک نتائج پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ بعض مخلص دیندار بھائی اس کے لئے بہت فکرمند ہیں۔ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ بعض حضرات جن کو تبلیغی کام سے زیادہ مناسبت اور دلچسپی ہو گئی ہے ان کے گھروں میں شرعی پردہ بھی آگیا ہے اور ان کے گھروں کی خواتین جو پہلے آزادانہ طور پر باہر نکلتی یا دوکانوں پر بیٹھتی تھیں اب برقعہ پہننے لگی ہیں، جو وہاں کی دنیا میں ایک عجیب سی بات ہے۔ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں یہ بہت بڑا اقتصادی مسئلہ ہے، دوکانوں پر جو کام گھر کی خواتین کرتی ہیں اگر وہ نہ کریں تو ان کی جگہ اچھی قابلیت کے نوکر رکھنے پڑیں گے اور ایک نوکر کی تنخواہ ہندوستانی مسکے کے حساب سے قریباً دو ہزار ماہوار ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس کا کاروبار پر بہت بوجھ بھی پڑے گا اور پھر نوکروں پر بھروسہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ان دوستوں کی دین داری کی دل میں بڑی قدر و عظمت پیدا ہوئی جنہوں نے اپنے گھروں کی خواتین کے لئے شرعی فیصلہ کر کے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے اس کا صلہ اس دنیا میں بھی ان کو عطا فرمائے۔

مغربی معاشرت اور بے پردگی کے علاوہ ایک دوسری چیز جو جنوبی افریقہ کے مسلمان بھائیوں میں نظر آئی وہ ان کی انتہائی سرفانہ زندگی ہے۔ جن لوگوں میں دینداری اور آخرت کی فکر بالکل نہیں ہے ان کی فضول خرچیوں کا تو حال یہ ہے کہ معلوم ہوا ایک صاحب نے اپنی پٹی ہوئی بلی کی سالگرہ منائی اور اس تقریب پر ہندوستانی مسکے کے حساب سے قریباً بیس ہزار روپے صرف کئے۔ لیکن جن بھائیوں میں خدا کے فضل سے دینی احساس اور آخرت کی فکر ہے ان میں بھی دیکھا کہ کھانے پینے اور لباس میں بڑا اسراف ہے، اور خالفا

سب سے زیادہ اسراف مکانات کی شان و شوکت اور آرائش میں ہے۔ مساجد کی تعمیر میں بھی بے حد اسراف سے کام لیا جاتا ہے۔ صوبہ بنیال میں ایک شہر لیڈی اسمتھ ہے وہاں ایک بڑی ہی شاندار اور انتہائی حسین و جمیل مسجد بنائی گئی ہے، یقیناً وہ لاکھوں پونڈ کے صرفہ سے تیار ہوئی ہوگی۔ بلاشبہ تعمیری صنعت کا شاہ کار ہے۔ معلوم ہوا دور دور سے لوگ اس کو دیکھنے آتے ہیں۔ کاش اس لاگت سے ایسے مقامات پر جہاں مسجدوں کی ضرورت ہے چالیس پچاس مسجدیں بنادی گئی ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بھائیوں کو ان باتوں پر غور کرنے کی توفیق دے۔

جب مساجد کا ذکر آگیا ہے تو ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ وہاں یہ بہت اچھا رواج ہے کہ ہر مسجد میں وضو خانہ کے قریب دس بیس یا اس سے زیادہ عباس ٹنگی رہتی ہیں، جو لوگ کوٹ پتلون پہنے نماز پڑھنے کے لئے مسجد آتے ہیں وہ اوپر سے وہ عباسیں پہن کر نماز پڑھتے ہیں۔ نمازیوں کے لئے وضو کا انتظام بھی بہت اعلیٰ اور آرام دہ ہے۔ بہر حال مساجد سے بڑی دلچسپی ہے۔ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے بہت سے لوگ کئی کئی میل سے اپنی موٹروں پر آتے ہیں۔

میں نے اوپر ذکر کیا کہ وہاں بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم دلانے کا بڑا اہتمام ہے۔ اس لئے وہاں دو نظام جاری ہیں۔ کچھ اچھے معیاری اسکول بعض مسلم انجمنوں یا اداروں کے اہتمام میں چل رہے ہیں ان میں تعلیم کا وہی نصاب و نظام جاری ہے جو عام سرکاری اسکولوں میں ہے، اس لحاظ سے یہ مدرسے بھی سرکاری نظام تعلیم کا جزو ہیں۔ لیکن ان میں ہر درجہ کے لئے قریباً ایک گھنٹہ قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے، جس کی حکومت نے اجازت دے رکھی ہے۔ یہ دینیات کی تعلیم بھی اسی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے جو وہاں کی سرکاری تعلیمی زبان ہے۔ یعنی انگریزی اور افریکان لہیہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس تعلیم میں میری کتاب ”اسلام کیا ہے؟“ اور ”دین و شریعت“ کے انگریزی ترجموں سے مدد لی جاتی ہے اور اسکے کچھ مخصوص حصے مختلف درجات میں پڑھائے جاتے ہیں۔ دینیات کی اس تعلیم پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ مسلمان برداشت کرتے ہیں اس کے علاوہ اسکول کا سارا خرچ گورنمنٹ کے ذمہ ہوتا ہے۔

(۱) ”افریکان“ دراصل ڈچوں کی زبان ہے، جو انگریزی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہے۔ یہ دونوں زبانیں (انگریزی اور افریکان) ملک کی سرکاری زبانیں ہیں اور ان کی تعلیم لازمی ہے۔

(۲) بعد میں ایک صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ آئندہ تعلیمی سال سے یہ دونوں کتابیں اوپر کے دو درجوں میں جزو نصاب بنادی گئی ہیں۔

وہاں اسکولوں یا کالجوں کی تعلیم پر کسی کو ایک پائی بھی خرچ کرنی نہیں پڑتی۔ بلکہ کتابیں وغیرہ بھی حکومت فراہم کرتی ہے۔

دینیات کی تعلیم کا دوسرا نظام وہاں یہ ہے کہ جو بچے سرکاری اسکولوں میں عام ملکی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد دو گھنٹے کے لئے دینی مدرسہ میں جاتے ہیں۔ اور قریباً ہر جگہ ایسے جزوقتی مدرسے قائم ہیں۔ اور یہ مدرسے زیادہ تر ان اسکولوں کے قریب ہی قائم کئے گئے ہیں۔ گویا سرکاری عمومی تعلیم کے بالکل متوازی مسلمان بچوں کے لئے دینی تعلیم کا یہ مستقل نظام خود مسلمانوں نے قائم کر رکھا ہے۔ ان مدرسوں میں دینیات کی تعلیم عام طور سے اردو کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی ”تعلیم الاسلام“ اور اسی طرح کی بعض اردو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ میں نے خود دیکھا کہ بعض اوقات بچوں کو ان کتابوں کی کسی عبارت کا مطلب ان کے استاد گجراتی یا ملکی زبان افریکان میں سمجھاتے ہیں۔ اس نظام تعلیم پر لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔

ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ صوبہ بنیال میں ایک چھوٹا سا شہر ہے، غالباً ”رحمہند“ نام ہے، وہاں جانا ہوا۔ وہاں دینیات کا مدرسہ مسجد کے قریب ہے۔ ہم نے عصر سے پہلے وہاں کے دوستوں کی خواہش پر مدرسہ اور اس کی تعلیم کو دیکھا۔ اس کے بعد جب عصر کی نماز کا وقت قریب آیا تو ہم لوگ نماز پڑھنے کے لئے مسجد آگئے۔ میں نے دیکھا کہ ان بچوں نے آکر وضو نہیں کیا، جماعت شروع ہوئی تو سب جماعت میں شریک ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مدرسہ کے اساتذہ سے اس بارے میں پوچھا، انھوں نے بتایا کہ یہ بچے اور بچیاں چونکہ مدرسہ میں قرآن شریف بھی پڑھتے ہیں اس لئے یہ پابندی ہے کہ وضو کے ساتھ پڑھیں، جس کا وضو نہیں رہتا وہ جا کر وضو کر لیتا ہے۔ الغرض یہ سب مدرسہ میں با وضو پڑھتے ہیں، اس لئے یہ مسجد آکر وضو نہیں کرتے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ کئی ایک دوسرے شہروں میں بھی دیکھا کہ مسجد کے قریب ہی وہ دینی مدرسہ ہے جس میں بچے اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید اور دینیات پڑھنے کے لئے آتے ہیں اور خاص طور پر عصر کی نماز میں سب کے سب شریک ہوتے ہیں۔ یہاں بچیوں کا لباس بہت با پردہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مدرسہ کی طرف سے اس لباس کی پابندی ہے۔ کاش! یہی اہتمام اس وقت بھی رہے جب یہ بچیاں بچپن کی حدود سے آگے بڑھ جائیں۔

دو قابل ذکر دینی مدرسے

دینی تعلیم کے سلسلہ میں دو مدرسے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جو ہانسمرگ شہر کے امام

ہے۔ نام شاید ”نور الاسلام“ ہے۔ اس کا واقعہ بڑا عجیب اور سبق آموز معلوم ہوا۔ اس وقت جو صاحب اس مدرسہ کے ذمہ دار اور کفیل اور گویا روح رواں ہیں اُن کا نام حاجی حسن موسیٰ مایت ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ میرے والد صاحب حاجی موسیٰ مایت سخت بیمار ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک رات کو ڈاکٹروں نے بالکل مایوسی ظاہر کر دی، اور کہہ دیا کہ اب کسی علاج اور تدبیر کا وقت نہیں رہا۔ میرے والد صاحب نے اسی وقت دعا کی۔ اور اللہ تعالیٰ سے نذر مانی کہ اگر مجھے صحت ہوگئی تو میں اپنی فلاں بلڈنگ اللہ کے لئے وقف کر دوں گا اور مدرسہ قائم کر دوں گا۔ اللہ کی شان! اسی وقت سے اُن کی حالت سنبھلنے لگی، اور صبح تک معلوم ہوا کہ گویا بالکل اچھے ہیں۔ معالج ڈاکٹر سے چونکہ خاص تعلق تھا اس لئے اس نے صبح کو خود ٹیلیفون کر کے دریافت کیا، اس کو بتلایا گیا کہ ان کی حالت تو بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر نے خود آکر دیکھا اور حیرت سے پوچھا کہ آپ نے رات میرے جانے کے بعد کیا دوا استعمال کی؟ انھوں نے بتلایا کہ میں نے کوئی دوا استعمال نہیں کی، بس اللہ سے یہ عرض کیا اور اس نے فضل فرمایا۔ جس مدرسہ کا میں نے ذکر کیا وہ اسی عمارت میں قائم ہے۔ یہ بہت وسیع و عریض بلڈنگ ہے۔ اوپر کے تمام کمروں میں مدرسہ کے درجات ہیں، اور نیچے کی عمارت سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے مدرسہ کے مصارف پورے ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ مدرسہ کے مصارف ہمارے سکے کے حساب سے پندرہ بیس ہزار ماہوار سے کم نہ ہوں گے۔ اس مدرسہ میں کئی سو بچے اور بچیاں قرآن مجید اور اردو کے ذریعہ دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ملکی و دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسکول جاتے ہیں۔ حاجی حسن مایت صاحب کی خواہش پر میں نے اس مدرسہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا اور ان کے والد صاحب کا واقعہ سن کر ایک رات ان کے مکان پر قیام بھی کیا، بڑے سادہ اور نیک آدمی معلوم ہوئے۔

دوسرا قابل ذکر مدرسہ ”المعبد الاسلامی“ ہے۔ یہ جنوبی افریقہ کا غالباً سب سے بڑا دینی ادارہ ہے۔ ہمارے ایک دوست اور دارالعلوم دیوبند کے رفیق مولانا محمد موسیٰ میاں افریقی مرحوم تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں گھر کے بڑے دولت مند اور نوجوان ہونے کے باوجود بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔ اب سے قریباً دس سال پہلے افریقہ ہی میں ان کا وصال ہو چکا ہے۔ الفرقان میں ان پر جو تعزیتی نوٹ لکھا گیا تھا اس میں ان کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ بھی آ گیا تھا۔ اُن کے والد ماجد حاجی موسیٰ میاں تھے۔ یہ اصل متوطن سملک ڈابھیل (ضلع سورت) کے تھے۔ اب سے لگ بھگ ایک صدی پہلے یہ جنوبی افریقہ پہنچے۔ کوئی بڑا سرمایہ بھی ساتھ نہیں تھا۔ کسی طرح کچھ کام شروع کیا۔ اللہ نے بہت برکت

دی۔ اور ان کا سرمایہ اس زمانہ میں لاکھوں تک پہنچ گیا۔ پھر جب وہ وقت آیا کہ ان کے صاحبزادے (جو سب ان ہی کی طرح نیک اور باخدا ہیں) کاروبار سنبھالنے کے لائق ہو گئے تو انھوں نے ایک دن ان سے کہا کہ ”میں جب اس ملک میں آیا تھا تو بالکل خالی ہاتھ تھا، اب اللہ نے اتنا دے دیا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا ہے وہ سب اسی کی راہ میں خرچ کر دوں اور جس طرح خالی ہاتھ آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ اپنے مالک کے حضور میں پہنچ جاؤں، اور میں نے اس کی یہ صورت سوچی ہے کہ اس وقت جو کچھ کاروبار ہے یہ سب تم لوگ مجھ سے قیمت خرید لو، اور وہ قیمت اسی کاروبار سے قسطوں میں ادا کرتے رہو، اس طرح تمہارا یہ کاروبار بھی اسی طرح چلتا رہے گا اور قیمت بھی ادا ہوتی رہے گی۔ اور وہ پوری رقم اللہ کے لئے کسی کام میں لگا دی جائے گی۔ نیک اور صالح بیٹوں نے خوشی سے اس تجویز کو منظور کر لیا، کاروبار میں جو کچھ سرمایہ لگا ہوا تھا اس کا اندازہ اس وقت چالیس ہزار پونڈ کا کیا گیا، اور صاحبزادوں نے چالیس ہزار پونڈ کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی اور کاروبار سنبھال لیا، ان کے والد ماجد حاجی میاں موسیٰ مرحوم نے اس پوری رقم سے ایک دینی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ”المعهد الاسلامی“ یہی دینی مدرسہ اور ادارہ ہے، اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد اور قابل دید ہے۔ جب تک ہمارے رفیق اور دوست مولانا محمد موسیٰ میاں حیات رہے وہ اس کے مدیر رہے۔ اب مولانا مرحوم کے خلف الصدق مولانا ابراہیم میاں اس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ رات دن اسی میں قیام رہتا ہے۔ قدیم تعلق کی بنا پر یہ عاجز وہاں بھی گیا، ایک رات قیام بھی کیا، ادارے کے تمام شعبوں کو دیکھا، دل بہت خوش ہوا۔ سارا خاندان جس کو وہاں ”میاں فیملی“ کہا جاتا ہے، وہیں آباد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین اور دنیا کی نعمتوں کو جس طرح اس پورے خاندان میں جمع کر دیا ہے اس کی مثالیں پورے عالم اسلام میں شاذ و نادر ہی ہوں گی۔

ہمارے دوست مولانا محمد موسیٰ میاں اور ان کے والد ماجد حاجی موسیٰ میاں ”المعهد الاسلامی“ کے قریب ہی مدفون ہیں۔ یہ عاجز قبروں پر بھی گیا اور مسنون طریقہ پر سلام و دعا کی توفیق نصیب ہوئی۔

تبلیغی جماعت کا کام

دینی کاموں اور کوششوں کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کے کام کا ذکر ابھی تک نہیں آیا۔ خدا کے فضل سے اس کام کو وہاں قبول عام حاصل ہے۔ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ہیں اور صرف اللہ اور اجر آخرت کے لئے یہ محنت اور کوشش کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی لگانا چاہتے ہیں۔ اللہ کے بعض بندوں کو دیکھا کہ اس کام ہی کے ذریعہ انھیں بڑی دینی ترقی نصیب ہوئی، اُن کا حال دیکھ کر بڑا ہی رشک آیا

یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت جنوبی افریقہ کے شہروں میں جو خاص قسم کی دینداری کی فضا ہے اور مساجد زیادہ تر آباد ہیں اس میں تبلیغی جماعت کی محنت کا خاص حصہ ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اب سے ۴-۵ سال پہلے یہ بات نہیں تھی۔ میں ۱۸ اپریل کو جوہانسبرگ پہونچا تھا۔ اس سے ایک ہی ہفتہ پہلے پورے ملک کا تبلیغی اجتماع ہوا تھا۔ دوستوں نے اس کی پوری کوشش کی تھی کہ میں ایسے وقت پہونچوں کہ اجتماع میں میری شرکت ہو سکے۔ لیکن کچھ قانونی مجبوریوں کی وجہ سے میرے لئے یہ ممکن نہ تھا، میں اجتماع کے ایک ہفتہ بعد پہونچا، مگر اجتماع سے جو جماعتیں ملک میں کام کرنے کے لئے روانہ ہوئی تھیں وہ شہروں شہروں پھر رہی تھیں۔ ایک جماعت ہندوستان سے بھی گئی ہوئی تھی اور ان ہی دنوں میں ایک جماعت انگلستان سے بھی آئی ہوئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جس شہر میں میرا جانا ہوتا تھا اس شہر میں جماعت ایک دو دن پہلے پہونچ جاتی۔ اس لئے یہ اندازہ کرنے کا پورا موقع ملا کہ الحمد للہ پورے ملک میں جماعت کے کام کو مقبولیت حاصل ہے۔

گزشتہ ماہ جولائی کے وسط میں انگلستان میں جو عالمی تبلیغی اجتماع ہوا ہے اس کے لئے دعوت اور تشکیل کا کام میرے زمانہ قیام میں برابر ہوتا رہا۔ ۲۳ مئی کو جب میں ماریشس سے ڈربن کے لئے روانہ ہوا تو یہ معلوم ہوا تھا کہ قریباً ۷۰ حضرات اب تک انگلستان کے اجتماع میں جانے اور کچھ وقت لگانے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ بعد میں آنے والے خطوط سے معلوم ہوا کہ الحمد للہ ایک مستقل جہاز کے ذریعہ سو سے زیادہ افراد کا قافلہ جنوبی افریقہ سے گیا۔ یہ حضرات اپنے ملک سے روانہ ہو کر پہلے حجاز مقدس پہونچے اور حرمین شریفین میں عمرہ و زیارت کی سعادت حاصل کر کے اور وہاں دعائیں کر کے انگلستان گئے۔

جنوبی افریقہ کے لئے انگریزی زبان چونکہ مادری زبان کی طرح ہے اور اللہ نے اپنے فضل خاص سے ان کو وسعت اور استطاعت بھی بخشی ہے اس لئے اس کی بڑی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ یورپین ممالک میں دین کا کام لے۔

جوہانسبرگ کی آخری تقریر

جوہانسبرگ میں میری آخری تقریر ۲۰ مئی کو ہوئی تھی، اس میں مجمع بہت زیادہ تھا، اور معلوم ہوا کہ منتخب تھا۔ میں اگلے دن وہاں سے روانہ ہونے والا تھا۔ اس تقریر میں میں نے خصوصیت کے ساتھ اس پر زور دیا تھا کہ اللہ نے آپ کو بڑی وسعت اور فراغت دی ہے اور بڑے انعامات سے نوازا ہے، اس کا شکریہ ہے کہ آپ یہ طے کریں کہ آپ کی اولاد میں جس بچے میں زیادہ صلاحیت اور ذہانت ہوگی، ہم اُس کو اللہ کے

لئے اور دین کے لئے وقف کر دیں گے اور اس کو ایسی تعلیم دلائیں گے اور اس کے لئے تیار کریں گے کہ وہ خاص کر مغربی ممالک میں دین کی خدمت اور دعوت کا کام کر سکے۔ آپ اپنے کاروبار میں اس کا پورا حصہ رکھئے اور اس کے دوسرے بھائی اس کی طرف سے بھی کاروبار کریں۔ مولانا محمد موسیٰ مرحوم جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ وہ دین کے لئے وقف تھے۔ کاروبار دوسرے بھائی دیکھتے تھے اور ان کا اس میں پورا حصہ تھا، اور اب معلوم ہوا کہ ان کے صاحبزادے مولانا ابراہیم میاں کے ساتھ بھی اُن کے اہل خاندان کا یہی معاملہ ہے، وہ کاروبار اور کاروباری ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش صرف دینی کاموں کی فکر کے لئے وقف ہیں، اور کاروبار میں ان کا برابر کا حصہ ہے۔

ڈربن کے بعض مخلص دوستوں کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے بعض شرکاء کو دین کے لئے بالکل فارغ اور وقف کر دیا ہے اور کاروبار میں ان کا پورا حصہ رکھا ہے۔ بڑے ہی مبارک اور خوش نصیب ہیں اللہ کے ایسے بندے۔ ڈربن کے مولانا عبدالحق عمر جی کو اللہ نے جو خاص صلاحیتیں دی ہیں ان کی بنا پر میں نے اُن سے خاص طور پر اصرار کیا کہ وہ اپنے کو کاروبار کی فکروں اور مشغولیتوں سے بالکل فارغ کر لیں اور کاروبار کا سارا بوجھ ان کی طرف سے بھی اُن کے بھائی بھتیجے اٹھالیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو آسان اور مقدر فرمادے۔ تبلیغی جماعت کے سلسلہ کا ایک واقعہ کا ذکر کرنے کا اور جی چاہتا ہے۔ ایک دن حاجی موسیٰ بڈھانیا کے ساتھ (جو میرے خاص داعیوں اور میزبانوں میں سے تھے) جو ہانسبرگ سے اُن کی رہائش گاہ لوڈی پورٹ جا رہے تھے۔ راستہ کی ایک مسجد میں ظہر کی جماعت تیار تھی، موٹر سے وہیں اتر کے نماز میں شریک ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا نام محمد عادل بتایا گیا۔ یہ اپنی مولویانہ ڈاڑھی، نیچے کرتے، اور مغلیٰ پاجامے اور خاص قسم کی ٹوپی سے بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے کہ مظاہر علوم سہارنپور کے کوئی نیک طالب علم ہیں۔ لیکن بتایا گیا کہ یہ ہیرا تراشی کے خاص کاریگر ہیں، یہاں کے ایک کارخانہ میں بہت اونچی تنخواہ پاتے ہیں، ان کا قصہ یہ ہے کہ یہ سوٹ بوٹ میں رہتے تھے، اردو بالکل نہیں جانتے سمجھتے تھے، کہیں تبلیغی جماعت والوں کے ہاتھ آ گئے، انھوں نے ان سے دین اور آخرت کی باتیں کیں اور اپنے طریقہ کے مطابق زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے ۴ مہینے کی دعوت دی، اُن کی بات اللہ کے اس بندے کے دل نے قبول کر لی اور کارخانہ کے مالک کو ۴ مہینے کی چھٹی کی درخواست دے دی، اس نے ہٹا کے پوچھا، تو انھوں نے پوری بات بتا دی کہ میں دین سیکھنے کے لئے اور اپنی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی بنانے کے لئے جانا چاہتا ہوں، ان کی چھٹی منظور ہو گئی، اور یہ ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان کے تبلیغی

مرکز نظام الدین آگئے۔ ۴ مہینے بعد یہاں واپس پہونچے تو ان کی صورت اور لباس ہر چیز بدل چکی تھی، اب یہ اپنی جگہ پر کام کرنے کا رخانہ گئے تو ان کے ساتھ کام کرنے والوں نے کہا کہ ہم ان کے ساتھ اس وقت تک کام نہیں کریں گے جب تک کہ یہ کارخانہ کا وہی لباس نہ پہنیں جو ہم سب پہنتے ہیں۔ انھوں نے کارخانہ کے مالک سے کہہ دیا کہ میں لباس نہیں بدلوں گا، آپ چاہیں تو میری ملازمت ختم کریں مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ کارخانہ کا مالک جو یہودی تھا ان سے باتیں کرنے کے بعد اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے دوسرے سب ملازم کارمیکروں سے کہہ دیا کہ آپ لوگوں کا جی چاہے تو رہیں یا نہ رہیں، یہ اسی لباس میں رہیں گے اور کام کریں گے۔ انھوں نے کارخانہ کے مالک سے یہ بھی کہا کہ اب میں ہر مہینے تین دن اور سال بھر میں صرف ایک دفعہ چالیس دن جماعت کے ساتھ جایا کروں گا اور ان دنوں کی تنخواہ وصول نہیں کروں گا، کارخانہ کے یہودی مالک نے یہ بھی بخوشی منظور کر لیا اور معلوم ہوا کہ وہ یہودی ان سے بڑا عقیدتمندانہ تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان میں جماعتوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اب یہ محمد عادل اردو بھی کچھ بولنے اور سمجھنے لگے ہیں، اللہ تعالیٰ ترقی اور استقامت نصیب فرمائے اور دوسروں کو اس مثال کی پیروی کی توفیق دے۔

(۵)

پاکستان کا تیسرا سفر (۱۹۷۸ء)

رابطہ عالم اسلامی نے جولائی ۱۹۷۸ء میں ایک ”ایشیائی اسلامی کانفرنس“ کراچی میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ آپ کو بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ وہ دن تھے کہ دو سال پہلے ٹانگ کی معذوری شروع ہو چکی تھی۔ رابطہ کے جلسوں میں بھی آپ نہیں جا رہے تھے۔ مگر یہ پاکستان کے سفر کی دعوت تھی جہاں آپ بس ایک دفعہ شروع سالوں میں کوئی ۲۰ سال پہلے جا سکے تھے، جبکہ اہل تعلق کا وسیع حلقہ وہاں تھا۔ اگر تقسیم نے ادھر سے ادھر کا سفر مشکل نہ بنا رکھا ہوتا تو ایک آدھ بار اور ادھر کا سفر ضرور ہو چکا ہوتا۔ پس یہ جو رابطہ کی دعوت آئی جس کے ساتھ معلوم ہوا کہ یہ کانفرنس حکومت پاکستان کے تعاون سے ہو رہی ہے اور مدعوین کے سفر وغیرہ کی ذمہ داری پاکستان نے لی ہے اور لکھنؤ سے کراچی تک کا واپسی کا ہوائی ٹکٹ اور ویزا وغیرہ ساری ضروری چیزیں گھر بیٹھے آجائیں گی تو معذوری کے باوجود یہ سوچ کر اب پتہ نہیں زندگی کے دن کتنے اور ہیں، جی چاہا کہ یہ سفر کر ہی لیا جائے۔ اور الحمد للہ یہ سفر ہوا۔ اگست ۱۹۷۸ء کے الفرقان میں اس کا مفصل تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا:

”۔۔۔۔۔ استخارہ کے بعد طے کر لیا کہ اگر سفر کے سارے قانونی مراحل بلا فکر و زحمت کے طے ہو جائیں اور میری موجودہ معذوری کی حالت میں جس طرح کے رفیق سفر کی مجھے ضرورت ہے وہ رفیق سفر بھی مل جائے تو متوکل علی اللہ مجھے یہ سفر کر لینا چاہئے۔

میرے چھوٹے لڑکے مولوی خلیل الرحمن سجاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم ہیں وہ میرے لئے سب سے اچھے رفیق اور خادم ہو سکتے تھے لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کانفرنس کی تاریخ (یکم شعبان ۶ جولائی) تک اپنے امتحان سے فارغ ہو کر کراچی پہنچ سکیں گے، تاہم میں نے ان کو لکھا کہ اگر تمہارے لئے اس کا امکان ہو کہ ۵ جولائی تک تم کراچی پہنچ سکو تو میں بھی سفر کی ہمت کر لوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے امتحان سے فراغت جون ہی میں ہو جائے گی اور میں ۵ جولائی کو ان شاء اللہ کراچی پہنچ جاؤں گا۔

اس کے بعد مجھے لکھنؤ سے کراچی تک کے چند گھنٹے کے لئے ایک ایسے رفیق کی ضرورت تھی جس کو حسب ضرورت کوئی زحمت دے سکوں۔ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں کے بھتیجے مولوی محمد الحسنی بھی کانفرنس میں مدعو تھے انھوں نے طے کیا کہ اگر راقم سطور کانفرنس کی شرکت کے لئے سفر کرے تو وہ ایک رفیق کے طور پر میرے ساتھ ہی سفر کریں گے۔ پس لکھنؤ سے کراچی تک کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے میری ضرورت کے مطابق بہترین رفیق عطا فرمادیا۔ اس کے بعد بنام خدا سفر کا تہیہ کر لیا گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک بڑے فعال اور باصلاحیت کارکن مولوی قمر علی ندوی، جو راقم السطور کے ساتھ عزیزانہ تعلق رکھتے تھے ان دنوں دارالعلوم ہی کے کسی کام سے دہلی میں مقیم تھے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے وہاں کے سارے قانونی مراحل انھوں نے طے کئے اب صرف کام اتارا گیا کہ مقررہ وقت پر لکھنؤ کے ہوائی اڈے پہنچ کر میں دہلی کے لئے ہوائی جہاز میں سوار ہو جاؤں۔ چنانچہ ۵ جولائی ۴ بجے سہ پہر کو ہوائی جہاز سے دہلی کے لئے روانگی ہو گئی۔ مولانا محمد میاں حسنی میرے ساتھ تھے۔ قریباً تین سو میل کی مسافت ۳۵ منٹ میں طے کر کے جہاز دہلی کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ عزیزم مولوی قمر علی ندوی وہاں موجود تھے انھوں نے میرے لئے پہلے دارکری کا بھی انتظام کر لیا تھا۔

کراچی جانے والا ہوائی جہاز قریباً ڈھائی گھنٹے لیٹ آیا، اس لئے رات کے بارہ بجے کے قریب کراچی اترنا ہوا۔ مہمانوں کی سہولت کے لئے ہوائی اڈے پر بہت اچھے انتظامات تھے۔ ضروری قانونی کاروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ رات کے ایک بجے کے قریب انٹرنیشنل ہوٹل پننچ جہاں کانفرنس کے تمام مدعوین کے قیام کا انتظام تھا۔

رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو ادھر جون میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس

اعلیٰ کی شرکت کے لئے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے وہاں سے براہ راست کراچی اسی روز (۵ جولائی) پہنچ چکے تھے۔ خلیل الرحمن سجاد سلمہ بھی مولانا کے ساتھ ہی پہنچ گئے تھے۔ کانفرنس کے منتظمین نے میرا قیام بھی اسی کمرے میں تجویز کیا جس میں مولانا کا قیام تھا۔“

اس کے آگے کانفرنس کی کارروائی کا مختصر بیان ہے اور پھر کچھ تبصرہ۔ یہ تبصرہ اس لئے یہاں قابل نقل ہے کہ مفید ہونے کے علاوہ اس سے صاحب سوانح کی سوچ اور طرز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا ہے کہ ”جہاں تک شان و شوکت اور ایشیا کے مختلف ممالک کی نمائندگی کا تعلق ہے بلاشبہ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ لیکن یہ بات مستقبل بتائے گا کہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو اس عظیم الشان کانفرنس نے کیا دیا۔۔۔ اس طرح کی کانفرنسوں کے بارہ میں نتائج اور حاصلات کے لحاظ سے راقم سطور کا پچاس سال سے زیادہ کا تجربہ بہت ہی مایوس کن ہے۔ خدا کرے یہ تجربہ پہلے تجربوں سے مختلف، خوش کن اور مسرت بخش ہو۔

کانفرنس میں دو چیزیں شدت سے محسوس ہوئیں، اُن کا ذکر نہ کرنا ایک طرح کی خیانت ہوگی۔ ایک انتہائی اسراف، جس کی کم از راقم سطور کو کوئی وجہ جواز نہیں سمجھ سکا۔ جس ہوٹل میں تمام مدعوین کا قیام تھا۔ جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ انہی میں سے بعض واقف حضرات نے بتلایا کہ اس ہوٹل میں ہم میں سے ہر ایک کے قیام و طعام کے مصارف کا اوسط ایک ہزار روپیہ یومیہ کے قریب تھا۔ انہی صاحب نے بتلایا کہ ایک پیالی چائے جو ہم پیتے ہیں یا کسی مہمان کے لئے منگاتے ہیں اس کی قیمت سات روپے ہوتی ہے۔ بعد میں پاکستان ہی کے ایک صاحب نے بتلایا کہ اس ہوٹل کے مالک پاکستانی مسلمان نہیں ہیں، یہ امریکہ کی کسی کمپنی کا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اور بھی زیادہ رنج و افسوس کی بات ہے۔۔۔ آجکل پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ، معاشرہ کی اصلاح اور مسلمانوں میں اسلامی زندگی عام کرنے کا مسئلہ سب مخلص اور دین پسند اہل فکر کے سامنے ہے اور اس کو دوسرے سب مسئلوں سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے، اور بیشک یہ اس کا مستحق ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمارا یہ طرز عمل اور امریکہ وغیرہ کی تقلید میں ہماری یہ مسرفانہ زندگی ہماری ان نیک اور مبارک آرزوؤں سے کچھ مطابقت رکھتی ہے؟ کیا اس بارہ میں رسول اللہ (ﷺ) کی ہدایات، آپ کے اسوۂ حسنہ اور امت کی تاریخ میں ہمارے لئے کوئی رہنمائی نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں بصارت اور بصیرت عطا فرمائے۔

دوسری چیز جو شدت سے محسوس ہوئی وہ بعض مقررین کا وہ جوش خطابت تھا جس سے محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حقیقت پسندی کا کوئی حصہ عطا نہیں فرمایا ہے وہ صرف خیالی

دنیا میں رہتے ہیں اور شاید اپنے کو اور اپنے دور کے مسلمانوں کو وہ قرونِ اولیٰ کے فاتح مجاہدین سمجھتے ہیں اور دنیا کی بساط پر اس وقت مسلمانوں کی جو واقعی حالت ہے اس کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ الغرض ان پر جوشِ مقررین کی ہنگامہ خیز تقریریں سن کر شدت سے یہ احساس ہوا کہ یہ تقریریں عام مسلمانوں کو حقیقت پسندی اور فکر مندی کے ساتھ عملی آدمی بننے کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنتی رہیں گی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ تقریر فرمائی جس میں ان مقررین کو اس طرف توجہ بھی دلائی اور بتلایا کہ اس رویہ سے ہم نے کھویا بہت اور پایا کچھ نہیں۔ لیکن بعد کی تقریروں سے اندازہ ہوا کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ صدا بہ صحرا کے سوا کچھ نہ تھا۔ فالہٰی اللہ المشتکی!

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب وہ خلیفہ منتخب کئے گئے اور انھوں نے پہلا خطبہ دیا جو بہت مختصر تھا تو اس کے آخر میں یہ بھی فرمایا تھا کہ

انتم اليوم الى امام فعال احوج منكم الى
 آج تمہیں زیادہ بولنے والے امام درہنما سے زیادہ
 ضرورتِ فعال و بہت کام کرنے والے امام درہنما کی ہے۔
 امام قوال

ہوٹل سے بنوری ٹاؤن میں

کانفرنس کے اختتام پر یہ مہمانی ختم ہوئی اور ۹ جولائی کو آپ ہوٹل سے حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، نیو ٹاؤن منتقل ہو گئے۔ وہاں حضرت بنوریؒ کے قائم مقام اور خلیفہ مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب (مہتمم جامعہ) آپ کے میزبان ہوئے۔ اس جامعہ کی جامع مسجد کے امام حضرت مولانا علی میاں کے عزیزِ قریب قاری عبدالرشید صاحب ہوتے تھے حضرت مولانا نے ان کے یہاں قیام کا فیصلہ فرمایا۔ قاری صاحب حضرت صاحبِ سوانح سے بھی بہت مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور بقول آپ کے ان کا حق تھا کہ آپ بھی انہی کے یہاں قیام کریں، اور پھر حضرت مولانا علی میاں کا ساتھ۔ اس کے باوجود حضرت مفتی صاحب کے یہاں قیام کا فیصلہ کرنے کی وجہ میں فرمایا ہے کہ ”اگر حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ چند مہینے پہلے اس دنیا سے رخصت نہ ہو گئے ہوتے تو میں انہی کا مہمان ہوتا۔“ اور اب ان کے قائم مقام مفتی صاحب تھے جو حضرت مرحوم کے داماد بھی۔ یہاں آپ کا قیام اسی کمرہ میں رہا جو حضرت بنوری مرحوم کی نشستگاہ تھی۔ اس پر لکھا کہ ”اگر عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مولانا مرحوم کو ان کے کمرہ اور ان کی نشستگاہ میں اس عاجز کے قیام کی اطلاع دی گئی ہوتی تو یقیناً ہے کہ ان کی روح کو بڑی

مسرت ہوتی۔ ان کے صاحبزادے عزیزم مولوی محمد بنوری اور صاحبزادی صاحبہ، مفتی احمد الرحمن صاحب کی اہلیہ مکرمہ اور خود مفتی صاحب نے مہماں نوازی میں جو غیر معمولی اہتمام فرمایا اس سے دل بہت متاثر رہا اور انشاء اللہ رہے گا۔“ مزید فرمایا ہے کہ

”اس قیام کے دوران یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کا کام جس منوال و منہاج پر حضرت بنوریؒ کے سامنے چل رہا تھا اسی منہاج پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چل رہا ہے۔ مزید یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ مولانا کے رفقاء اور تلامذہ ان کی تصنیف ”معارف السنن“ کی تکمیل و اتمام کا بھی عزم رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی پوری مدد فرمائے اور یہ خدمت ان سے لے لے۔ و ما ہو علیہ بعزیز۔“

حسن اتفاق!

ان دنوں آپ کے مرشد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت مولانا عبد العزیز رائے پوری بھی اتفاق سے جامعہ کے مہماں خانہ میں قیام فرماتھے۔ اس کو ”حسن اتفاق“ سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ”ان کی خدمت میں بھی حاضری اور زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور چونکہ پہلے سے اس کا کوئی گمان نہ تھا اس لئے یہ نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔“

احباب و مخلصین کا تانتا

ہوٹل کی مدت قیام میں اہل تعلق کا آزادانہ آکر ملنا ممکن نہ تھا، نیوٹاؤن پہنچ کر سرکاری پابندیاں ختم ہوئیں اور خواہشمندوں کے لئے آزادانہ ملاقات کا دروازہ کھلا۔ اس پر فرماتے ہیں کہ

”ہوٹل میں جب تک قیام رہا وہاں ملاقات کی سخت پابندیوں کی وجہ سے بہت کم احباب آکر مل سکے تھے۔ لیکن اب نیوٹاؤن آکر احباب و مخلصین کا گویا تانتا بندھ گیا۔ کانفرنس کے بعد کراچی میں ۵ دن قیام رہا۔ ان دنوں میں صبح سویرے سے رات گئے تک، ظہر و عصر کے درمیان آرام کا وقت مستثنیٰ کر کے برابر لوگوں کا جھوم رہتا تھا۔ اور یہ صرف وہ تھے جن کی محبت صرف اللہ کے لئے اور دین کے رشتے سے تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ ملاقات کے وقت دنور مسرت سے آنسو جاری ہو گئے، یہ اللہ کے لئے محبت کا تعلق بہت ہی عظیم نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ راقم سطور کو اور ان سب محبین کو اس کی برکات ارزانی فرمائے۔ بہت سے حضرات تھے جو اپنے مکان لے جانے کے خواہشمند تھے، بہت سوں نے تو میرا حال دیکھ کر کہا ہی نہیں اور بہت سوں نے فرمائش کی لیکن میں خود اپنی خواہش اور ان حضرات کے حقوق کے احساس کے باوجود قیام سے معذور تھا۔ ان مخلصوں میں بہت سے وہ تھے جو میری طرح عمر کی آخری منزل میں ہیں (جیسے اشرف منزل جو دھ پور

والے بھائی نجم الاسلام صاحب اور بریلی کے ہمارے پروفیسر خلیق احمد صاحب اور مرزا حکیم عبدالحمید صاحب وغیرہ) بہت نرم امید ہے کہ زندگی میں ان حضرات سے پھر ملاقات ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا ایمان پر خاتمہ اور مغفرت فرما کر اپنے دارِ رحمت جنت میں ملاقات مقدّر فرمائے جس کے بعد مفارقت اور جدائی کا کوئی سوال ہی نہیں۔“

چند اہم مجالس اور ملاقاتیں!

بعد از آن چند اہم مجلسوں اور ملاقاتوں کے عنوان سے تحریر ہے کہ

”اس موقع پر چند اہم ملاقاتوں اور مجلسوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کراچی میں ہمارے سلسلے کے تین بڑے مدارس ہیں۔ ایک نیوٹاؤن کا ’جامعۃ العلوم الاسلامیہ‘ جس میں گویا قیام تھا۔ دوسرا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کردہ ’دارالعلوم کورنگی‘۔ اور تیسرا ’جامعہ فاروقیہ‘ جس کے ذمہ دار اور غالباً بانی بھی مولانا سلیم اللہ خاں صاحب ہیں۔ حضرت مولانا شفیع صاحب تو اب اس دنیا میں نہیں رہے، ان کے صاحبزادگان مولانا محمد رفیع صاحب اور مولانا محمد تقی صاحب ہی ان کے علمی و دینی کمالات کے وارث اور دارالعلوم کے ذمہ دار ہیں۔ مولانا محمد تقی خاص طور پر علم و ذہانت اور تحریری صلاحیتوں میں ہمارے حلقے میں ممتاز اور اس عاجز سے استحقاق سے بہت زیادہ تعلق رکھتے ہیں، مجھے بھی ان سے بہت قلبی تعلق اور مزاجی مناسبت ہے۔ انھوں نے مجھے بہت پہلے لکھا بھی تھا کہ میں وہاں کا سفر کروں اور کچھ دن ’دارالعلوم‘ میں قیام کروں۔ لیکن وقت کی تنگی اور اپنی معذوری کی وجہ سے قیام تو نہ کر سکا، ہاں ان حضرات کی فرمائش پر ایک دن وہاں حاضر ہوا۔ اور طلبہ و اساتذہ اور عوام کی خاصی تعداد کے سامنے کچھ عرض بھی کیا۔ خصوصی مخاطب چونکہ دارالعلوم کے طلبہ تھے اس لئے کچھ اپنی طالب علمی کی داستان اور کچھ اپنے حضراتِ اساتذہ و اکابر کا تذکرہ ہی بنیادی مضمون تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے لگائے ہوئے اس پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر دلی خوشی ہوئی اور اخلاص و للہیت اور قبولیت کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔“

”مولانا سلیم اللہ خاں صاحب کے جامعہ فاروقیہ میں صحیح بخاری کے ختم کے سلسلے میں ایک اجتماع تھا، ہمارے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے آخری درس دے کر ختم کرایا۔ مجھے اس دن کچھ نزلہ زکام کا زور ہو گیا تھا، بارشیں بھی خوب ہو رہی تھیں لیکن ایفاء وعدہ کی غرض سے اجتماع میں حاضر ہوا، ایک صاحب نے مجھے دیکھ کر میری تقریر کا بھی اعلان کر دیا۔ حالانکہ اس وقت میں اس حال میں نہیں تھا۔ مجبوراً چند کلمات (رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں سے اجازت لیکر، جن کی اس وقت تقریر کا اعلان ہو چکا تھا) عرض کر دئے اور حاضرین سے اپنا حال بتلا کے اور معذرت کر کے واپس آ گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا سلیم اللہ خاں صاحب کو انھوں نے مجھے معذور سمجھ کر بطیب خاطر واپسی کی اجازت دی۔“

”نیوٹاؤن کے جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں بھی ۱۳ جولائی کو، جو کراچی کے قیام کا آخری دن تھا اور اسی دن جامعہ کا سالانہ امتحان ختم ہوا تھا، ایک اجتماع میں کچھ عرض کرنے کا موقع ملا۔ وہاں گفتگو علوم نبوی اور ان کے طالبین اور معلمین کے مقام اور اس کے تقاضوں پر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان سب مجاہدین اور اجتماعات اور وہاں کی گفتگوں کو خود میرے اور سب بھائیوں کے لئے باعث خیر و فلاح بنائے۔

”کراچی میں سب سے قدیم تعلق مخلص ترین دوست حاجی عبدالجبار صاحب مرحوم کے گھرانے سے تھا، ان کے خلف الصدق بھائی ابراہیم عبدالجبار میرے لئے ان کے قائم مقام اور تبلیغی کام سے ان کے تعلق کے بھی پورے وارث ہیں، ان کے گھر جانا بھی ضروری تھا۔ انہی کے مشورے کے مطابق اور انہی کے ساتھ ۱۱ جولائی چار شنبہ کو پہلے کراچی کے تبلیغی مرکز ”مکی مسجد“ گئے۔ وہاں ہمارے قاضی عبدالقادر صاحب دامت فیوضہم مقیم تھے جو چند ہفتے پہلے ایک ایکڈنٹ سے سخت مجروح ہو گئے تھے، ان کی زیارت و عیادت کی۔ انھوں نے میرا لاہور کا پروگرام اور اپنے ساتھ ہی ڈاکٹر منیر الحق کے مکان پر قیام بھی طے فرمادیا، جو بھائی افضل صاحب کے داماد ہیں۔ میرا ارادہ بھائی افضل صاحب کے یہاں قیام کا تھا لیکن قاضی صاحب نے بتلایا کہ وہ آجکل لندن اجتماع میں تشریف لے گئے ہیں۔“

ملکی مسجد میں بیان

”ملکی مسجد سے بھائی ابراہیم صاحب اپنے مکان لے آئے۔ اس رات وہیں کھانا کھایا۔ دوسرے دن جمعرات کو ہفتہ وار تبلیغی اجتماع تھا، اس دن پھر ملکی مسجد حاضری ہوئی بہت ہی بڑی تعداد میں اور ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے۔ اللہ نے تبلیغی دعوت ہی سے متعلق کچھ عرض کرنے کی توفیق دی۔ دعوت اور ایمان و یقین کی محنت و جدوجہد کے اصول، اس کے مخصوص مزاج، حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درد و کرب اور اس سلسلے کے ان کے بعض سبق آموز حالات و واقعات اور ارشادات کا خصوصیت سے ذکر آیا۔ تبلیغی کام کی عند اللہ مقبولیت اور انبیاء علیہم السلام کے مزاج اور طریق کار سے اس کی گہری مشابہت و مناسبت کے بارے میں بھی کچھ عرض کیا، اور جو غلطیاں، بے اصولیاں اور دعوتی مزاج سے مناسبت نہ رکھنے والی باتیں کام کرنے والوں سے بسا اوقات ہو جاتی ہیں اور جن سے کام کو بہت نقصان پہنچتا ہے ان کے بارے میں بھی کچھ عرض کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے نفع پہنچائے اور قبول فرمائے۔ (اس اجمال کی تفصیل میں دلچسپی ہو تو وہ سفر پاکستان (۱۹۵۲) میں دستیاب ہے۔ اور بلاشبہ تبلیغی کام کی حکمت اور اس کے اصولوں کا نچوڑ ہے۔ ع)

”تبلیغی کام کی رفتار اور مختلف طبقات خاصکر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے گہرے تعلق کو دیکھ کر اور دینی زندگی کو عالم میں فروغ دینے کی فکر و جدوجہد کا حامل پاکر اور خود ان کی زندگی میں اس

کے غیر معمولی اثرات محسوس کر کے بہت ہی خوشی ہوئی۔ بلاشبہ جو کچھ ہو رہا ہے محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور صرف اس کی توفیق سے ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کام کرنے والوں کو اخلاص و استقامت عطا فرمائے اور اپنے دین کی راہ میں زیادہ سے زیادہ قربانیوں کی توفیق دے، خود ان کو کامل ہدایت سے نوازے اور عالم میں ہدایت کے فروغ کا وسیلہ انھیں بنائے اور ہر طرح کے شر و فتن سے ان کی اور کام کی حفاظت فرمائے۔“

مولانا مفتی محمود صاحب سے ملاقات

اس سفر میں جمیعہ علماء اسلام پاکستان کے رہنما، جماعت دیوبند کے سرخیل اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں پوری حزب مخالف کے متحدہ محاذ ”قومی اتحاد“ کے صدر حضرت مفتی محمود صاحب سے بھی ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ آپ کے خیال کے مطابق یہ مفتی صاحب سے آپ کی اولین ملاقات تھی۔ لیکن مفتی صاحب نے ملاقات میں بتایا کہ وہ آپ سے بارہا مل چکے تھے۔ آگے خود آپ کے الفاظ میں پڑھئے:

”اس وقت پاکستان میں خاص کر ملی معاملات میں ہمارے حلقے کے قائد و ترجمان کی

حیثیت مولانا مفتی محمود صاحب ہی کی ہے، جو جمیعہ العلماء اسلام کے رہنما اور ”قومی اتحاد“ کے

صدر ہیں۔ مجھے ان سے کبھی ملاقات یاد نہیں تھی۔ ان کے بارے میں جو سنایا اخبارات میں پڑھا

تھا اس کی بنا پر دل میں ان کیلئے محبت و احترام کے جذبات تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ وہ مدت

سے ذیابیطس وغیرہ چند سنگین امراض میں مبتلا ہیں۔ ان دنوں وہ کراچی کے ایک بڑے اسپتال

میں زیر علاج تھے۔ ان کی ملاقات و عیادت کے لئے عزیز م مولوی محمد بنوری کے ساتھ ایک شام کو

اسپتال گیا۔ مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی، بھید مسرت و قلبی تعلق کا اظہار ان کے رویہ سے ہو رہا

تھا۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے بارہا مل چکے ہیں۔ لیکن یہ ملاقاتیں یا تو اس وقت ہوئیں

جب وہ طالب علمی کے دور میں تھے یا پھر اس زمانے میں جب وہ صرف ایک نوجوان عالم و مدرس

تھے ”مولانا مفتی محمود“ نہیں تھے۔ اس لئے مجھے ان کی کوئی ملاقات یاد نہیں تھی۔ مفتی صاحب کا فی

دیر تک پاکستان کے عام دینی و سیاسی حالات پر گفتگو فرماتے رہے۔ ان سے بہت سی وہ اہم

باتیں معلوم ہوئیں جو کسی اور سے معلوم نہ ہو سکتی تھیں۔ ان باتوں سے وہاں کے موجودہ حالات کو

صحیح صحیح سمجھنے میں بہت مدد ملی۔“

”موصوف کے اخلاص اور درویشانہ زندگی کے تذکرے تو پہلے بھی سنے تھے ان کی سیاسی فہم

و بصیرت اور اس باب میں ان کے امتیازی مقام کا پورا اندازہ اب اس ملاقات سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ

ان کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے اور ان کی مخلصانہ اور مدبرانہ قیادت سے ملت کو فائدہ

پروفیسر غفور احمد صاحب

”اسی شام قومی اتحاد کے جنرل سکریٹری اور جماعت اسلامی پاکستان کے اہم رکن پروفیسر غفور احمد صاحب نے رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کو اپنے مکان پر استقبالیہ دیا تھا اور اس عاجز کو بھی خصوصیت سے شرکت کی دعوت دی تھی۔ لیکن مفتی صاحب سے ملاقات طویل ہو گئی۔ اس لئے میں استقبالیہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کا خیال رہا کہ پروفیسر صاحب کو میری عدم شرکت محسوس ہوئی ہوگی اور میں خود ان سے ملنا بھی چاہتا تھا، عزیزم مولوی محمد بنوری نے اس کو محسوس کر کے اس کی تلافی کی صورت یہ پیدا کی کہ ایک صبح کو پروفیسر صاحب کو میرے ساتھ ناشتہ کی دعوت دیدی۔ اور انھوں نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کی اور تشریف لے آئے۔ مختلف حضرات سے ان کے خلوص، فہم و فراست اور دوسری خوبیوں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا ملاقات سے اس کی تصدیق ہوئی۔ انھوں نے بتلایا کہ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے اور مولانا علی میاں سے اور مجھ سے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں برابر ملتے رہتے تھے۔ مولانا علی میاں کے درس قرآن میں اور ہمارے تبلیغی اجتماعات میں بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ دیکھ کر خاص طور پر بہت خوشی ہوئی کہ مولانا مفتی محمود صاحب اور ان کے درمیان پورے اعتماد اور خلوص کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فضا کو قائم رکھے، بظاہر پاکستان کی خیر و فلاح اس سے وابستہ ہے۔“

بریلی کے عزیزوں سے ملاقات

بریلی جہاں سے الفرقان کا آغاز ہوا، وہاں جس محلے (شاہ آباد شرقی) میں ہم لوگوں کا قیام تھا وہاں چند گھروں کا ایک احاطہ ”گھیر مولوی عبدالقیوم صاحب“ کے نام سے معروف تھا، اسی میں ہم لوگ ۱۳-۱۴ سال رہے، وہاں کے ان سب لوگوں سے بالکل عزیزانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ یہ آپس میں رشتہ دار گھرانے تھے اور بفضلہ تعالیٰ سب صحیح العقیدہ اور ہم مسلک۔ کم و بیش یہ سب کے سب جدید تعلیم یافتہ اور تحریک پاکستان شروع ہونے پر اس کے حامی تھے۔ پاکستان بنا تو رفتہ رفتہ سب ہی ادھر چلے گئے۔ اور بالعموم مہاجرین کی طرح ان کی اکثریت کراچی ہی میں بسی۔ خود ہم لوگ تقسیم سے ایک آدھ سال پہلے بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکے تھے۔ ایسے میں کراچی جانا ہو تو ان سے ملنا ان کا لازمی حق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ نے ایک دن کچھ وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارا۔ اس بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ

”۔۔۔ اس موقع پر میری بھی خواہش تھی کہ ان سب سے ملاقات ہو جائے اور وہ سب بھی اس کے بڑے خواہشمند تھے۔ ان میں سے ایک عزیز مسٹر عبدالرؤف (جو میرے بریلی کے قیام

کے زمانے میں ایک نوخیز نوجوان تھے اور مجھ سے بہت تعلق رکھتے تھے اور اب ماشاء اللہ متعدد عالمی اخبارات کے نمائندے ہیں) ہوٹل میں آکر ملے تھے اور ان سے یہ ملے ہو گیا تھا کہ کسی دن گھیر کے سب عزیز ایک جگہ جمع ہو جائیں اور میں وہاں پہنچ کر سب سے مل لوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان حضرات نے باہم مشورے سے بھائی جمیل الدین صاحب کے مکان پہ جمع ہونا ملے کر لیا۔ عزیزم عبدالرؤف ہی مقررہ دن اور وقت پر نیوٹاؤن سے مجھے وہاں لے گئے۔ وہاں سب ہی لوگ جمع تھے۔ جوتھوڑا سا وقت ان عزیزوں کے ساتھ گزارا وہ بڑی غیر معمولی مسرت اور خوشی کا وقت تھا۔ اس صحبت میں کچھ دینی باتیں ہوئیں اور دعا پر نشست ختم ہوئی۔ ماسٹر حنیف صاحب کی خواہش پر ان کے گھر بھی گیا۔ بریلی میں انہی کے مکان میں کراہیہ دار کی حیثیت سے میرا قیام تھا۔ سب کو خوش حال دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ شکر کی توفیق دے اور دولت سے پیدا ہونے والے شر سے محفوظ رکھے۔“

کراچی سے فیصل آباد اور لاہور

”لکھنؤ سے میری روانگی سے ایک ہی دو دن پہلے مدینہ منورہ سے آنے والے ایک صاحب کے ذریعہ میرے نہایت مخلص دوست جناب حکیم عبدالرحیم اشرف کا ایک اخلاص نامہ مجھے ملا تھا جس میں تحریر تھا کہ میں یہاں ایک ضروری کام سے آیا ہوا تھا میرا پروگرام یہاں آخر شعبان تک رہنے کا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ آپ عازم پاکستان ہیں لہذا میں کام کو نامہ تمام چھوڑ کر جلد ہی کراچی واپس ہو کر آپ سے ملوں گا۔ فیصل آباد کے قیام کی مدت میرے پہنچنے کے بعد ہی ملے ہوگی۔ (فیصل آباد لاسکو رکا جدید نام)

”اس گرامی نامے سے پہلے میرے ذہن میں کراچی اور لاہور کے علاوہ کہیں کا اور سفر نہیں تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد مختلف شہروں سے مخلص دوستوں کے ٹیلیفون آنے لگے کہ اس سفر میں آپ کو ہمارے یہاں بھی آنا ہے۔ راولپنڈی سے میرے نہایت مخلص اور محترم دوست مولانا غلام اللہ خاں صاحب نے کئی بار خود ٹیلیفون پر گفتگو فرمائی اور راولپنڈی آنے کا وعدہ لیا اور میں نے کسی درجے میں ارادہ بھی کر لیا۔ اسی طرح پشاور سے حضرت مولانا محمد اشرف صاحب دامت برکاتہم کا گرامی نامہ اور پیام لیکر ایک صاحب کراچی آئے تو ارادہ کر لیا کہ اگر راولپنڈی جانا ہوا تو ایک دن کے لئے حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کی زیارت ہی کے لئے خدا نے چاہا تو پشاور بھی ضرور جاؤں گا۔ ویزا میں ان سب مقامات کا اضافہ بھی کر لیا۔ لیکن پھر اپنی حالت اور معذوری نے اس فیصلے پر مجبور کیا کہ سفر کو مختصر کیا جائے اور کراچی سے بس لاہور ہوتے ہوئے دلی

واپسی ہو جائے۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی اسی حساب سے بنوائے گئے۔

”اس پوری کاروائی کے بعد حکیم عبدالرحیم اشرف ۱۲ جولائی کو کراچی پہنچ گئے اور میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں صرف آپ کی وجہ سے سفر مختصر کر کے اور اپنا کام ناقص چھوڑ کر آیا ہوں، فیصل آباد بہر حال چلنا ہوگا۔ میں نے ان کا حق سمجھا کہ ان کی فرمائش کی تعمیل کی جائے چنانچہ پروگرام میں یہ تبدیلی کر لی گئی کہ ان شاء اللہ جمعہ ۱۴ صبح کراچی سے فیصل آباد کا سفر بذریعہ طیارہ ہوگا۔ دو دن وہاں قیام کے بعد بذریعہ کارلا ہو رہا اور وہاں ایک دن قیام کر کے ۱۷ صبح کراچی سے دوبارہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

”جمعہ کو علی الصبح بعد نماز فجر بھائی ابراہیم عبدالجبار صاحب اپنی گاڑی لیکر آ گئے اور یہ عاجز اور خلیل الرحمن سجاد سلمہ، مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب اور عزیز ممولوی محمد بنوری سلمہ کے ساتھ چائے پی کر اور ان حضرات سے رخصت ہو کر بھائی ابراہیم کے ساتھ ہوائی اڈے روانہ ہو گئے۔ جہاز پہلے ملتان آتا اور وہاں سے پرواز کر کے اس نے ہمیں فیصل آباد اتارا۔ یہاں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب، مولانا مفتی سیاح الدین صاحب اور لدھیانہ والے بھائی اسماعیل بھائی ابراہیم صاحب اور دوسرے بہت سے احباب و مخلصین موجود تھے۔ خاص کر بھائی اسماعیل بھائی ابراہیم وغیرہ کو دیکھ کر روح میں تازگی آ گئی، یہ ہمارے حضرت رائے پوری قدس سرہ کے عاشق خادموں میں تھے۔“

فیصل آباد کی دوروزہ مصروفیات

”ہوائی اڈے سے سیدھے حکیم صاحب کے مکان پر پہنچے، دوستوں کی آمد شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جمعہ کی نماز کا وقت آ گیا۔ قریب کی بڑی اور عالی شان مسجد میں، جو اس علاقے کی جامع مسجد ہوگی، نماز ادا کرنے کا پروگرام تھا اور معلوم ہوا کہ میری تقریر کے بارے میں بھی اعلان ہو چکا ہے۔ میرے مسجد تک جانے کے لئے پہلے دار کرسی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسی سے جانا اور آنا ہوا۔ مسجد حاضرین سے بھری ہوئی تھی۔ مولانا مفتی سیاح الدین صاحب تقریر فرما رہے تھے میرے پہنچنے پر انھوں نے اپنی تقریر ختم کر کے میری تقریر کا اعلان کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس وقت دل میں ڈالا وہ عرض کیا۔ اس وقت کی گزارش کا خاص نقطہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمتیں وہ ہیں جو امت کو رسول اللہ (ﷺ) کے ذریعہ ملیں۔ اور ان میں سے عظیم ترین نعمت اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور دعا کرنا ہے۔ پھر دعا کی حقیقت اور اس کی عظمت و اہمیت اور اس کے طریقے اور آداب وغیرہ کے بارے میں جو کچھ عرض کرنے کی اللہ نے توفیق دی عرض کیا

گیا۔ رسول اللہ (ﷺ) کی بعض خاص دعائیں بھی ذکر کی گئیں۔ آخر میں دعا پر بات ختم ہوئی۔ اس کے بعد جمعہ کی نماز ادا کی گئی۔

”نماز سے فارغ ہو کر حکیم صاحب کے مکان پر آئے تو ایک صاحب نے ہمارے ایک بہت ہی مخلص اور اللہ کے لئے محبت کرنے والے بزرگ مولانا محمد شریف صاحب مرحوم کی صاحبزادی کا پیام پہنچایا کہ وہ آپ کے پاس آنا اور کچھ باتیں کرنا چاہتی ہیں، ساتھ ہی یہ بھی بتلایا کہ وہ یہاں آئی ہوئی ہیں اور ان کا خط بھی مجھے دیا۔ خط پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا، میں نے ان کو بلوایا، ان کے ساتھ ان کی دوسری بہن بھی تھیں جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بہنو (یعنی ان کے صاحبزادے کی اہلیہ) ہیں انہی کی عزیز ایک اور خاتون بھی تھیں۔ شاہ صاحب اور مولانا محمد شریف صاحب دونوں بزرگ اس وقت بہت ہی یاد آئے۔ اور ان کے اور ان کے متعلقین کے لئے دعا نصیب ہوئی۔

”مولانا محمد شریف صاحب کی صاحبزادی نے فرمایا کہ اپنی جماعت یعنی سلسلہ دیوبند سے تعلق رکھنے والے جب بھی کوئی بزرگ یہاں آتے تھے تو والد صاحب ان کو اپنے گھر ضرور لاتے تھے، شاید آپ کو یاد ہو کہ اب سے کوئی بیس سال پہلے جس دن میرے مرشد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا، اس دن آپ لاکپور ہی میں تھے اور جس وقت وہ خبر آئی اس وقت آپ جامع مسجد میں تقریر فرما رہے تھے تو والد صاحب آپ کو بھی گھر پر لائے تھے۔ اب وہ نہیں ہیں لیکن آپ کو میرے یہاں آنا ہے۔ میں ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور وعدہ کر لیا کہ ان شاء اللہ کسی وقت ضرور حاضر ہوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن وقت نکال کر ان کے مکان پر پہنچا۔ ان کی بہن شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی بہن بھی موجود تھیں، دونوں بہنوں نے پردے سے باتیں کیں۔ دل بیکار متاثر ہوا۔ ان کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن انھوں نے مجھے ہدیہ کے طور پر عنایت فرمانے کے لئے کئی چیزیں تیار کر رکھی تھیں جو انھوں نے پیش کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت میں بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے اور خاص فضل و رحمت سے نوازے۔“

ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ

”ہمارے داعی اور میزبان حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے دوسرے دن (۱۵ جولائی) اپنے ادارے ”جامعہ تعلیمات اسلامیہ“ میں وہاں کے طلبہ و اساتذہ سے ملاقات اور خطاب کا پروگرام طے فرمادیا۔ صبح ۹ بجے کے قریب ہم وہاں پہنچے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور پرسکون ماحول میں یہ

ادارہ ہے۔ کچھ دیر دفتر میں بیٹھنے کے بعد ہم لوگ اجتماع گاہ پہنچے وہاں حضراتِ اساتذہ و طلبہ اور دوسرے اہل علم اور بعض حضرات اعیانِ شہر کی خاصی تعداد موجود تھی۔ ابتدائیہ سے عالیہ تک کے طلبہ نے مختصر پروگرام پیش کئے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ سب عربی زبان میں تھے۔ ادارے اور اس کے مختلف شعبوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے درد و سوز بھری ہوئی تقریر کی۔ حکیم صاحب نے اپنی تقریر میں بڑے درد و سوز کے ساتھ اپنی مدرسے والی برادری میں اخلاص و للہیت کے فقدان کا ذکر کیا۔ اور مجھ سے فرمایا کہ اس مرض کی کوئی دوا ہوتا؟

”جو حضرات مجھے قریب سے جانتے ہیں انھیں اس بارے میں مایوسی کی حد تک میرے احساسات معلوم ہوں گے۔ لیکن حکیم صاحب نے کچھ ایسے انداز سے مجھ سے فرمائش کی اور غالباً ان کے دل کی گرمی ہی کا اثر تھا جس نے اس وقت میرے دل کو بھی اس بات کے لئے کھول دیا، اور پھر اللہ نے جو کھلویا، عرض کیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک بات کرتا رہا اور وقت کا اندازہ نہیں ہوا۔ گفتگو کا موضوع بنیادی طور پر دین کے کاموں میں اخلاص اور تعلق مع اللہ کی اہمیت، اس کے تقاضوں کو حاصل کرنے کے طریقوں اور اس کی علامتوں کا بیان تھا۔ خاص مخاطب اپنی علمی برادری تھی۔ ساتھ ہی ساتھ عام حاضرین کی مناسبت سے دین کی دعوت و خدمت اور اس کے کرنے والوں کے لئے چند لازمی صفات کا بھی ذکر آگیا۔ اللہ تعالیٰ اس پوری گفتگو کو قبول فرمائے، اور کہنے اور سننے والے سب بھائیوں کو اچھی باتوں پر عمل کی توفیق دے۔“

بھائی ابراہیم اور اسماعیل کے یہاں

”یہاں سے فارغ ہو کر ہمیں بھائی اسماعیل اور ابراہیم کے گھر جانا تھا۔ دوپہر کا کھانا اور آرام وہیں طے کیا جا چکا تھا۔ یہ دونوں، بھائی جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خاص خادموں اور عاشقوں میں تھے۔ ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام سے پہلے خاص کر رمضانِ مبارک یہ رائے پور کی خانقاہ ہی میں گزارتے تھے۔ پہلا وطن لدھیانہ تھا اب فیصل آباد ہے۔ ان کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ انھوں نے علماء اور خواص کی خاصی تعداد کو مدعو کر لیا ہے۔ سب سے مل کر خوشی ہوئی۔ سعودی عرب کے کچھ نوجوان طلبہ بھی تھے جو تبلیغی جماعت کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہیں آرام کیا۔ آرام و راحت کا پورا انتظام تھا۔ بھائی اسماعیل اور ان کے گھر والوں کی خواہش تھی کہ میں وہیں قیام کرتا اور ان کا یہ حق بھی تھا، لیکن چونکہ فیصل آباد کا یہ سفر حکیم صاحب ہی کی دعوت پر اور انہی کی وجہ سے ہوا تھا اس لئے

میں ایسا نہ کر سکا۔ عصر تک بھائی اسماعیل صاحب ہی کے یہاں قیام رہا، نماز عصر وہیں ادا کی۔

قدیم شہر کی جامع مسجد میں اجتماع اور تقریر

”عصر کے بعد قدیم شہر کی جامع مسجد جانا تھا، وہاں اجتماع اور تقریر کا اعلان ہو چکا تھا۔ غالباً اس اجتماع کا اہتمام ہمارے مولانا مفتی سیاح الدین صاحب اور ان کے خاص رفقاء نے کیا تھا۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص اور طلب کی برکت سے وہاں بھی شرح صدر فرمایا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے قریب بات عرض کی۔ پاکستانی مسلمانوں کو اپنی عملی زندگی میں جس تبدیلی کی ضرورت ہے اس کی طرف کسی قدر تفصیل سے توجہ دلائی۔ اور اس کے لئے تبلیغی جماعت کے طرز کار کا ذکر کیا اور ذاتی تجربے کی بنا پر کچھ باتیں عرض کیں۔ اذان مغرب سے مصلیٰ پہلے بات ختم ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ابھی نماز کے بعد حضرات اہل علم کا مخصوص اجتماع رکھا گیا ہے۔ اس لئے کافی تعداد میں حضرات اہل علم جمع ہو گئے ہیں۔ لیکن نماز کے درمیان ہی اچانک میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ ہائی بلڈ پریشر کا میں مریض ہوں۔ کبھی کبھی زیادہ بولنے سے اس میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے، اور پھر میرے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ بالکل بات نہ کروں، اس وقت یہی کیفیت ہو گئی۔ مجبوراً مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کی وساطت سے اُن حضراتِ علماء کرام سے معذرت کر کے اور دل پر سخت بوجھ اور احساسِ ندامت لے کر حکیم صاحب کے مکان پر واپس آ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے میری بیماری اور معذوری کا لحاظ کر کے مجھے اجازت دیدی۔ اللہ کی مشیت! خود میرا جی چاہتا تھا کہ جو باتیں صبح جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں عرض کی تھیں وہی مزید تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان حضرات کی خدمت میں بھی عرض کروں، لیکن ماشاء اللہ کان و ما لم یشأ لم یکن۔ رات میں بھی لوگ ملاقات کے لئے دیر تک آتے رہے، لیکن میں اس وقت ایسی حالت میں تھا کہ صرف مصافحہ ہی کر سکتا تھا۔“

مولینا عبد الجلیل و مولینا عبد الوحید صاحبان کی تشریف آوری

”فیصل آباد کے قریب ہی ضلع سرگودھا ہے جس کی تحصیل جھادریاں کا ایک موضع ”ڈھڈیاں“ ہمارے حضرت رائیپوری قدس سرہ کا وطن تھا۔ اور اب وہی مرقد و مدفن بھی ہے۔ اس کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہ عاجز اپنی معذوری کی وجہ سے کسی طرح وہاں نہیں جاسکتا تھا، اور اس کا بزار خ و قلق تھا۔ حضرت کے بھتیجے مولانا عبد الجلیل صاحب اور بھانجے مولانا عبد الوحید

صاحب جورائے پور میں اکثر حضرت ہی کے ساتھ رہتے تھے ہمارے لئے حضرت قدس سرہ کی خاص یادگار ہیں، ۱۵ جولائی کی شب میں ازراہ عنایت وہ خود ہی تشریف لے آئے۔ مل کر بچہ خوش ہوئی رات کو ساتھ ہی قیام رہا صبح لاہور کے لئے انھوں نے مجھے رخصت کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو حضرت قدس سرہ کا پورا وارث بنائے۔“

ایک اور قابل ذکر شخصیت!

”فیصل آباد میں ایک اور صاحب ملے جن کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ہیں کرٹل مقبول الہی صاحب۔ مجھے کبھی پہلے ان کی ملاقات یا نہیں۔ ان کے مجھ سے عاتبانہ تعارف اور تعلق کا ذریعہ میری کتاب ”آپ حج کیسے کریں“ بنی جو ان کے ایک عزیز نے انھیں سفر حج کے لئے روانگی کے وقت دیدی تھی اور اس مبارک سفر میں برابر ان کے ساتھ رہی۔ انھوں نے بتلایا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ انگلی پکڑ کے مجھے حج کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کرٹل صاحب کو ان کے اخلاص و محبت کی بہترین جزا دینا و آخرت میں عطا فرمائے۔ خلوص و محبت کے علاوہ ان کے اصول پسند فوجی مزاج نے بہت مسرور و متاثر کیا۔ فیصل آباد میں بیٹھے بیٹھے ٹیلی فون کے ذریعہ لاہور سے دہلی اور لکھنؤ کے لئے ہوائی جہاز میں ریزرویشن کرٹل صاحب ہی کی جاکدستی نے آسانی سے کرا دیا۔ جس کے بعد اپنے سفر کے پروگرام کے بارے میں اطمینان ہو گیا۔“

لاہور کے لئے روانگی

”دوسرے دن ۱۶ جولائی کی صبح بھائی اسماعیل ابراہیم کی کار سے لاہور کے سفر کا پروگرام تھا۔ کرٹل صاحب ہی نے باصرار مشورہ دیا کہ صبح روانگی میں تاخیر نہ کی جائے تاکہ گرمی کے وقت سے پہلے آپ لاہور پہنچ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ہم لوگ وہاں کے سب حضرات سے رخصت ہو کر اور سب کے خلوص و محبت کا گہرا تاثر لئے صبح ۶ بجے روانہ ہو گئے۔ راستے میں وہاں کے تبلیغی مرکز بلالی مسجد بھی چند منٹ کیلئے صرف دعا کی غرض سے جانا ہوا۔ لاہور تک کا فاصلہ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا اور ۹ بجے کے قریب ہم لوگ ڈاکٹر منیر الحق صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ انھیں اور ادارہ اصلاح و تبلیغ والے چودھری عبدالعزیز صاحب اور بعض دوسرے احباب کو باہر منتظر پایا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ ڈاکٹر منیر الحق صاحب ہمارے بھائی افضل صاحب کے خویش ہیں۔ آنکھوں کے ماہر معالج کی حیثیت سے ملک اور بیرون ملک میں بھی بہت اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ صورت شکل اور زندگی ایسی مومنانہ جو ہمارے مدرسوں اور خانقاہوں کی دنیا میں بھی اب کم ہی نظر آتی ہے۔ پورے گھرانے پر دین کا رنگ غالب، چھوٹے بچے بھی صورت ”ملا“۔ ایسے

حضرات کا وجود ہم جیسوں کے لئے بڑا سبق آموز ہے۔ ہزاروں دوسری مثالوں کی طرح تبلیغ سے تعلق کی برکتوں میں سے ایک اور مثال سامنے آئی۔“

لاہور میں دوستوں، مخلصوں سے ملاقاتیں

”لاہور میں ہمارے ایک بہت پرانے اور بہت ہی مخلص رفیق اور دوست حاجی عبدالواحد صاحب ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ لاہور کے سفر کا ایک بڑا محرک ان سے ملاقات کا اشتیاق بھی تھا، مجھے ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ وقتی طور پر عدیم البصر ہو چکے ہیں، اس لئے میں نے طے کیا کہ اگر موثران کے گھر تک جاسکتی ہوگی تو میں خود ہی جا کر ان سے ملوں گا، لیکن ان کو میرے پروگرام کا علم ہو گیا تھا اور جیسے ہی میں لاہور پہنچا ان کو اطلاع ہو گئی اور وہ اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ خود ہی تشریف لے آئے۔ ان کی ملاقات اور دید سے بڑی روحانی لذت اور مسرت حاصل ہوئی۔ راقم سطور کے اندازہ اور تجربہ میں اللہ کے بڑے مخلص بندے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آنکھ کا آپریشن کرایا تھا، کچھ روشنی آ گئی ہے۔ الحمد للہ۔ حاجی صاحب نے اگلے دن صبح کا ناشتہ اپنے یہاں کرنے کی ایسے اصرار کے ساتھ فرمائش کی کہ اپنی مجبوری و معذوری کے باوجود مجھے قبول کرنا پڑا۔ کافی دیر بیٹھ کر اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس تشریف لے گئے۔ دن بھر ملنے والے احباب و مخلصین کا تانتا بندھا رہا۔

بلال پارک کا اجتماع اور تقریر

”شام کو بعد مغرب وہاں کے تبلیغی مرکز بلال پارک میں اجتماع رکھ لیا گیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کا آخری بیان ہوا تھا، جس کے بعد ان پر وہ قلمی دورہ پڑا جو ظاہری اسباب میں ان کے وصال کا بہانہ بنا۔ مغرب کی نماز وہیں ادا کی، حاضرین کی تعداد یہاں بھی کافی تھی۔ خصوصاً تبلیغی کام سے عملی تعلق رکھنے والے تو سب ہی جمع ہو گئے تھے۔ نماز مغرب کے بعد دینی دعوت اور تبلیغی محنت ہی کے بارے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کچھ عرض کیا۔ دعوتی کام کی کچھ نواکتوں اور اس تبلیغی جدوجہد اور حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج کی کچھ خصوصیات کی طرف بھی خصوصیت سے توجہ دلائی جن کی رعایت اور حفاظت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سب باتوں کو نفع مند بنائے۔ عشاء کی نماز اپنی معذوری کی وجہ سے اپنی قیام گاہ ڈاکٹر منیر الحق صاحب کے مکان پر آ کر پڑھی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر منیر الحق صاحب کے اس مکان پر اور ان کی ضیافت میں ہمارا یہ قیام ہمارے محترم قاضی عبدالقادر صاحب مدظلہ کی تجویز بلکہ ان کے حکم سے ہوا تھا۔ وہ خود بھی وہیں مقیم تھے، اور ہم گویا ان کے زیر سایہ تھے۔

شب میں بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو صبح تک جاری رہا، بہت تیز بارش تھی لیکن اس

بارش میں ہی حاجی عبدالواحد صاحب مجھے لینے کے لئے آگئے۔ اور اپنے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (مدیر یثاق) کو بھی لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب سے مجھے خود بھی ملنے کا اشتیاق تھا۔ کراچی ہی میں ان کا یہ پیام مجھے ملا تھا کہ میں لاہور آؤں تو ان کے پاس قیام کروں، میں نے اس سے تو معذرت کر دی تھی لیکن ان سے ملاقات کرنا اپنے پران کا اور ان کے مخلصانہ تعلق کا حق سمجھتا تھا۔ بہر حال وہ حاجی عبدالواحد صاحب کے ساتھ تشریف لے آئے اور معلوم ہوا کہ انھوں نے عبدالواحد صاحب کو اس پر راضی کر لیا ہے کہ اس وقت ناشتہ کا پروگرام ان کے مکان کے بجائے ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہو۔ لیکن اتفاق سے اس دن صبح ہی سے ایک ایسی تکلیف عارض ہو گئی جس کی وجہ سے میں باہر نکلنے اور کہیں جانے کے حال میں نہیں رہا۔ اور فجر کے بعد ہی سے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح حاجی عبدالواحد صاحب کو اپنی اس حالت اور ان کے گھر پہ حاضری سے معذوری کی اطلاع دے سکوں۔ بہر کیف جب وہ تشریف لے آئے تو اپنا حال عرض کر کے معذرت چاہی اور انھوں نے بڑی مشکل سے اور یقیناً بادل ناخواستہ ہی میری معذرت قبول فرمائی اور قیام گاہ کی اس ملاقات اور گفتگو ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ آئندہ اس زندگی میں اب کبھی ملاقات ہوگی یا نہیں۔ اللہ ہم سب کے لئے مغفرت کا فیصلہ فرما کر اپنے دارِ رحمت میں یکجائی نصیب فرمائے۔

گورنر صاحب پنجاب کا پیام

پنجاب کے گورنر صاحب کے فرستادہ ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے گورنر صاحب کا یہ پیام پہنچایا کہ ”پشاور سے حضرت مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہ نے مجھے ٹیلی فون کیا ہے کہ آپ اگر پشاور کے سفر کے لئے آمادہ ہو سکیں تو میں آپ کے سفر کا انتظام کروں۔“ میں نے اپنی مجبوری ظاہر کر کے معذرت کی اور حضرت مولانا محمد اشرف صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں خط لکھ دیا، لیکن مولانا کی زیارت و ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس رہے گا۔ اگر زندگی میں مقدر ہے تو ان شاء اللہ کبھی ملاقات ہوگی ورنہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے کرم سے آخرت میں پوری امید ہے۔ راقم سطور کے نزدیک مولانا محمد روح اس دور کے خاصانِ خدا میں سے ہیں۔ واللہ اعلم باحوالِ عبادہ۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات

اس سفر میں اپنے قدیم مکرم و محترم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کا بھی بڑا اشتیاق تھا۔ ٹیلی فون کے ذریعہ فیصل آباد ہی میں ان کا یہ پیام مجھے مل گیا تھا کہ ”میں اتفاق سے لاہور آیا ہوا تھا، یہاں

تمھاری آمد کی خبر ملی، اب میں تمھارے انتظار ہی میں یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔“ میں نے لاہور پہنچ کر مولانا کو اطلاع دلوائی اور کہلوا یا کہ آپ کل تشریف لائیں۔ لیکن اگلے دن شدید بارش کی وجہ سے بہت سے راستے ناقابل عبور ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے مولانا ابجے کے قریب تشریف لائے ۲۰-۲۱ سال کی طویل مدت کے بعد مولانا کو دیکھ کے اور مل کر بہت ہی مسرت ہوئی۔ کئی سال پہلے مولانا بہت سخت مریض ہوئے تھے، بظاہر اسباب اس امید کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ صحتیاب ہو کر قرآن پاک کی تفسیر کا وہ کام جاری رکھ سکیں گے جو ”تدبر قرآن“ کے نام سے وہ کر رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت سے ایسی صحت بخشی کہ اس بیماری کا کوئی اثر ہی نہیں رہا، عمر کے لحاظ سے ان کی صحت بہت بہتر نظر آئی۔ الحمد للہ تدبر قرآن کا کام اسی طرح جاری ہے اور تکمیل کی منزل قریب ہے۔ اس کی چار جلدیں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اہتمام سے شائع ہوئی تھیں اور انہی کی عنایت فرمائی ہوئی میرے پاس ہیں، جزا ہم اللہ تعالیٰ پانچویں جلد مولانا اصلاحی نے غالباً اپنے اہتمام سے طبع کرائی ہے، وہ انھوں نے اب عنایت فرمائی۔ یہ سورہ ”زمر“ پر ختم ہوئی ہے۔ مولانا بتلایا کہ چھٹی جلد پریس میں ہے، ساتویں لکھی جا چکی ہے، اس وقت سورہ ”قلم“ کی تفسیر لکھ رہے ہیں، یہ آخری اور آٹھویں جلد ہوگی۔ اللہ اتمام و تکمیل کی توفیق دے لے راقم سطور کے نزدیک اردو کی جدید تفسیروں میں ”تدبر قرآن“ بہت ممتاز مقام رکھتی ہے۔ کافی دیر مولانا سے گفتگو رہی، گھریلو حالات کا بھی بڑی بے تکلفی سے ذکر فرماتے رہے۔

- (۱) یہ تفسیر مکمل ہو چکی ہے اور مولانا کے بعض غیر معمولی قسم کے تفردات کی بنا پر کافی متنازع بنی ہے اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ ۵۷ء میں جن لوگوں نے جماعت اسلامی سے تعلق ترک کیا وہ بالعموم مولانا اصلاحی صاحب سے وابستہ رہے، ان میں کے ایک نوجوان مصطفیٰ صادق (مرحوم)، جن سے راقم کے سفر پاکستان (۵۹ء) میں اچھی ملاقات رہی تھی (بعد میں انھوں نے لاہور سے روزنامہ ”وفاق“ جاری کیا) چند سال پہلے لندن آئے تب انھوں نے حضرت والد ماجدؒ کے متعلق بتایا تھا کہ آپ نے بھی مولانا کو بعض امور پر نظر ثانی کے لئے توجہ دلانے کیلئے لکھا تھا۔ مگر مولانا کو اپنی رائے پر اصرار رہا۔ واللہ اعلم۔
 - (۲) گھریلو حالات میں ”بے تکلفی“ پر ایک سابق سفر کی ملاقات کی ایک ”بے تکلف بات“ یاد آگئی ہے، جس کا ذکر حضرت صاحب سوانح نے واپسی پر مولانا سے ان کے گھر پر ملاقات کے تذکرہ میں کیا۔ مولانا نے اپنی اہلیہ محترمہ کا قول نقل فرمایا کہ کہا کرتی ہیں ”مولانا نعمانی کی کتابوں سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے تم لوگوں کی کتابوں سے یہ بات نہیں ہوتی۔“
- تم لوگوں سے مراد جماعت اسلامی والے حضرات۔ اور محترمہ خود بھی جماعت سے متعلق گھرانے کی تھیں، اور اسی رشتہ سے مولانا کے عقد میں آئیں، یہ مولانا کی دوسری اہلیہ تھیں جو پاکستانی تھیں۔

رفیق سفر کی روایت

اس ملاقات سے متعلق، رفیق سفر برادر عزیز سجاد نعمانی کی روایت بھی قابل ذکر ہے۔ بتاتے ہیں:

مولانا جب تشریف لائے تو کہا: ”مولانا! آپ کا یہ سفر پاکستان نہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہوا ہے، اور نہ کسی اور مقصد سے۔ آپ دراصل یہاں اپنے ایک پرانے مجرم کو معاف کرنے آئے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ بے حد اصرار کرتے رہے کہ آپ ایک مرتبہ اپنی زبان سے کہہ دیجئے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا!“ (ان کا اشارہ اپنی کسی تیز و تند تحریر کی طرف تھا؛ جو جماعت اسلامی سے متعلق ابلی کے ایک مضمون کی تنقید میں نکلی تھی)۔ اسی سلسلہ گفتگو میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ: ”مولانا! میں سچ کہتا ہوں کہ آپ کے بزرگوں کی فراست ایمانی بھر پور تھی، وہ مودودی صاحب..... کو شروع ہی سے سمجھ گئے، آپ میں اُن سے نسبتاً کچھ کم تھی، آپ کو سمجھنے میں کچھ دیر لگی، میرا حال سب سے خراب تھا، اس لئے بہت زیادہ دیر لگی۔ دوسری بات اس ملاقات کی یہ یاد ہے کہ انہوں نے اپنی اہلیہ کا سلام نقل کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ: ”مجھے بڑی حسرت ہے اور شکایت ہے کہ میری اہلیہ آپ کی کتابیں معارف الحدیث وغیرہ تو بہت اہتمام سے پڑھتی ہیں، مگر میری کتابوں سے ان کو دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔“ ابلی نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے کہا: ”اس میں شکایت کی کون سی بات ہے، ہم جو لکھتے ہیں وہ اُن کے لئے لکھتے ہیں، اور آپ جو لکھتے ہیں وہ ہمارے لئے لکھتے ہیں۔“

اس سفر کی آخری برکت۔

مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد ہم کھانے سے فارغ ہوئے اور تھوڑی دیر آرام کیا ہوائی اڈے جانے کا وقت آچکا تھا، ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ راولپنڈی سے مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خادم خاص، محرم راز اور معتمد خصوصی مولانا عبدالمنان صاحب رائے پوری تشریف لے آئے۔ مولانا (۱) ۱۹۵۱ء پاکستان سے ہندوستان تک فتوؤں کا ایک سلسلہ میں جماعت اسلامی کے خلاف قائم ہوا حضرت صاحب سوانح نے اس میں جماعت کے ساتھ زیادتی محسوس کی اور اعتدال پیدا کرنے کے نقطہ نظر سے ایک مفصل مضمون الفرقان میں لکھا، جس میں جماعت کو بھی کچھ قابل غور باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مولانا اصلاحی صاحب مرحوم نے اس پر ترجمان القرآن میں ۶۲ صفحے کا ایسا تند و تیز مضمون جو ہاتھ تحریر فرمایا جیسے فتوؤں کی بات تو محض آڑ لینے کے لئے کی گئی ہو اور اصل مقصد جماعت کو نشانہ بنانا ہو۔ حضرت والد صاحب نے اس پر تین چار صفحے کا مضمون ”میرے غلطیاں“ کے عنوان سے اس انداز کا لکھا کہ اس سے مولانا مرحوم کا متاثر نہ ہونا مشکل تھا۔ ۸۷ء کی ملاقات میں اس معافی طلبی کا پس منظر یہی قصہ ہونا چاہئے۔ ”میری غلطیاں“ والے مضمون کا ضروری حصہ آگے صفحہ ۳۱۱ پر بطور ضمیمہ درج کیا جا رہا ہے جس سے مولانا اصلاحی صاحب کے مضمون کی نوعیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

نے بتلایا کہ تمہارے راولپنڈی آنے کی اطلاع تھی، کل اچانک معلوم ہوا کہ تم نہیں آرہے ہو اور واپسی کے ارادہ سے لاہور پہنچ گئے ہو تو میں نے رات لاہور کے لئے ٹرین پکڑی اور ابھی پہنچا ہوں۔ ان کی اس عنایت و محبت سے دل بیدار ہوا، عصر کی نماز انہی کی اقتدا میں پڑھی۔ ان کی ملاقات اس سفر کی آخری برکت اور اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت تھی، ہوائی اڈے تک مولانا ساتھ ہی تشریف لائے اور بھی احباب و مخلصین تھے، سب سے رخصت ہوئے اور پاکستان کو الوداع کہا اور انڈین ایر لائنز کے جہاز سے پرواز کر کے بخیر و عافیت دہلی پہنچ گئے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْد۔“

پاکستان کے حالات اور امیدیں

”پاکستان کے موجودہ حالات اور امکانات و توقعات کے بارہ میں گفتگو اگر توفیق ملی تو آئندہ کسی صحبت میں کی جاسکے گی۔ سر دست صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہم جیسے دینی نقطہ نظر رکھنے والوں کے لئے اچھی امیدیں قائم کرنے کی بڑی گنجائش ہے، اللہ تعالیٰ وہاں کے مسلمانوں کے ہر طبقہ کو اس سلسلہ کی اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے اور ادا کرنے کی توفیق دے۔“

استدراک

”کراچی کی مجالس اور ملاقاتوں کے سلسلہ میں ایک اہم مجلس میں شرکت کا ذکر سہوارہ گیا اور اس کا احساس اس وقت ہوا جبکہ اس روداد سفر کی کتابت بھی ہو چکی ہے، اس لئے اب بہت اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

پاکستان کے موجودہ سربراہ حکومت جنرل ضیاء الحق صاحب نے جب ملک کی زمام حکومت ہاتھ میں لی تو ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جو مختلف مذاہب فکر کے چند ممتاز علماء کرام اور چند ماہرین قانون سے مرکب ہے۔ ”اسلامی دستور سازی“ اس کونسل کا مقصد اور خاص کام ہے۔ اس کے صدر ایک ریٹائرڈ جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب ہیں، جو اپنے بشری اندازہ میں ظاہر و باطناً مومن و مسلم اور اس کام اور اس منصب کے لئے غالباً پاکستان کی موزوں ترین شخصیت ہیں۔۔۔ انھوں نے ایشیائی اسلامی کانفرنس کے بعد اس کونسل کا اجلاس بھی کراچی میں رکھا تھا، انہی کی دعوت و فرمائش پر اس کے ایک جلسے میں بھی شرکت ہوئی۔ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خطاب فرمایا جس میں کچھ اصولی مشورے دئے۔ رائج سطور نے بھی چند کلمات کہے۔ اندازہ ہوا کہ کونسل کے صدر اور ارکان میں وہ جذبہ اور لگن موجود ہے جو ایسے مشکل کام کے لئے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی پوری مدد فرمائے اور اس کا عظیم کرم و کرم کو صحیح طور پر انجام دینے کی توفیق دے۔ رَبَّنَا اِنَّا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهِيَ لَنَا مِنْ اَمْرٍ اِدْشَاد۔

میری غلطیاں

از محمد منظور نعمانی

ذیقعدہ (۱۳۷۰ھ) کے الفرقان میں ”جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے“ کے عنوان سے اس عاجز کا جو مضمون شائع ہوا تھا۔ ماہ صفر (۱۳۷۱ھ) کے ”ترجمان القرآن“ میں میرے محترم دوست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے اس کا جواب شائع ہوا ہے۔ اگرچہ میں پہلے ہی سے یہ فیصلہ کیے ہوئے تھا کہ جماعت اسلامی کے حامین یا مخالفین کے طرف سے میری ان گذارشات کے جواب میں اگر کچھ لکھا گیا تو اس کا جواب میں نہیں دوں گا۔ اور اسی مضمون کے آخر میں اس کا ذکر بھی کر دیا تھا، لیکن اگر بالفرض پہلے سے یہ فیصلہ نہ بھی ہوتا تب بھی مولانا امین احسن صاحب کے اس جواب کے بعد یہی فیصلہ کرنا پڑتا۔ میں مولانا کے اس جواب سے اپنی چند غلطیوں پر بھی مطلع ہوا ہوں، اُن میں سب سے بڑی اور بنیادی غلطی میری یہ ہے کہ اپنی نادانی اور سادہ لوحی سے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارے درمیان اگرچہ رائے اور راہ کا کچھ اختلاف ہے لیکن باہم اعتماد اور حسن ظن اور سچی محبت و مودت اور خیر خواہی و خیر اندیشی کا بالکل وہی تعلق باقی اور محفوظ ہے جو کبھی پہلے تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ہمیشہ ہی سے اس بارہ میں غلط فہمی میں تھا یا ادھر ۵-۶ برس میں (جب سے ہم ایسے الگ ہوئے کہ پھر مل نہ سکے) مولانا کو میرے متعلق کچھ ایسی چیزیں پہونچیں جنہوں نے مولانا کے دل میں اتنا فرق ڈالا۔ میں چوں کہ اپنے اندر بال برابر بھی فرق نہیں پاتا تھا اس لئے ان حضرات کے متعلق بھی میرا اندازہ اور گمان یہی تھا۔ اگر یہ مغالطہ نہ ہوتا تو جو کچھ میں نے لکھا تھا کم از کم اپنے لئے تو اس کا لکھنا میں بالکل صحیح سمجھتا۔ کیوں کہ میرے نزدیک یہ باتیں تب ہی مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں جب کہ باہم پورا اعتماد اور حسن ظن موجود ہو۔

مولانا کا جوابی مضمون پڑھ کر مجھے افسوس اور افسوس سے بھی زیادہ اس پر تعجب ہوا کہ مولانا میرے بارے میں ایک نہیں چند در چند سخت قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں، حد یہ ہے کہ وہ (۱) یہ خیال فرما رہے ہیں کہ ”تبلیغی جماعت“ سے چونکہ اس عاجز کا تعلق ہے اور تبلیغی جماعت مولانا کے خیال میں جماعت اسلامی کی

کوئی حریف یا رقیب جماعت ہے۔ اس لئے اس رقیبانہ بدخواہی کے تحت ہی گویا میں نے وہ مضمون لکھا ہے۔ اس کے علاوہ (۲) وہ مجھے گروہی عصبیت کا مریض بھی سمجھ رہے ہیں اور میری اس بیماری کو بھی اس مضمون کے لکھنے میں ذیل اور محرک خیال فرما رہے ہیں۔ - نیز (۳) انھوں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے کہ میں جاسوسانہ ذرائع سے جماعت اسلامی کے متعلق خاص معلومات حاصل کرتا رہا ہوں اور (۴) اس سے پہلے ”دوسرے اندازیاں“ بھی کرتا رہا ہوں۔ اور (۵) خلق خدا کو دھوکہ دینے کے لئے میں نے اس مضمون میں خوب مغالطے بھی دیے ہیں۔ (۶) انتہایہ ہے کہ جماعت اسلامی کے متعلق میں نے یہ مضمون مولانا امین احسن کے نزدیک اس لئے لکھا ہے کہ ”اس کو پڑھنے کے بعد تبلیغی ارکان جماعت اسلامی کے خلاف پوری تیاری کے ساتھ ہر جگہ خطبہ دے سکیں“ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مجھے مولانا کی ان باتوں سے قدرتی طور پر تکلیف بھی ہوئی اور تکلیف سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اور میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ اور بہت سے حضرات کو یہ حیرت ہوئی ہوگی۔ ایک تو میرے بعض ان مخدوم بزرگوں کو جن سے میں خلوتوں اور جلوتوں میں اور تحریری مراسلات تک میں جماعت اسلامی کی طرف سے پوری شدت کے سے لڑتا رہا ہوں اور بعض اوقات نوبت سخت آزر دگی تک پہنچی ہے اور یہ ان بزرگوں کے ساتھ ہوا ہے جن کو میں نے عمر بھر میں کبھی کسی اور مسئلہ پر آزر دہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ ”جماعت اسلامی ہند“ کے ان بزرگوں کو بھی مولانا کے ان خیالات سے تعجب ہوا ہوگا جن سے یہ عاجز برابر ملتا رہتا ہے اور بے تکلفی سے اپنے خیالات ظاہر کرتا رہا ہے۔ بشرطیکہ میرا یہ گمان صحیح ہو کہ ان حضرات نے میری ملاقاتوں کو کبھی منافقانہ اور تجسسانہ نہیں سمجھا ہے (اگرچہ مولانا امین احسن صاحب کے اس تجربہ کے بعد مجھے اپنی اس قسم کی خوش گمانیوں پر اب زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے)

کیا عرض کروں، جماعت اسلامی کے حضرات میں سے اگر کوئی اور میرے ساتھ ایسی بے انصافی کرتا اور میں ان صاحب کی شکایت کرنا مفید یا ضروری سمجھتا تو مولانا امین احسن صاحب ہی سے کرتا، لیکن جب وہ خود ہی میرے متعلق ان بدگمانیوں کا بے تکلف اظہار فرما رہے ہیں تو اب ”کس سے شکوہ کرے کوئی“

۱۔ جو لوگ تبلیغی جماعت اور اس کی نوعیت سے ذرا بھی واقف ہیں وہی جان سکتے ہیں کہ مولانا امین احسن صاحب کا یہ خیال حقیقت سے کتنا دور ہے۔ تبلیغی جماعت میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور مختلف حلقوں کے ساتھ حسن ظن اور ہر ایک کے محاسن کی قدر شناسی اور اکرام و احترام پر جتنا زور دیا جاتا ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ باہر کے حضرات جتنے ہندی کے اس زمانے میں اس کا اندازہ بلکہ غالباً تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا امین احسن صاحب کو اب میں کیسے یقین دلا سکتا ہوں کہ میرے جس مضمون کا جواب انھیں لکھنا پڑا اگر میں تبلیغی جماعت کے اصول اور تقاضے پر پورا عمل کرتا تو یہ مضمون لکھا ہی نہ جاتا۔ جب کبھی سینوں کے راز ظاہر ہوں گے اس وقت مولانا کو معلوم ہوگا کہ یہ مضمون مجھ سے تبلیغی جماعت کے تعلق نے نہیں، بلکہ ”جماعت اسلامی“ اور اس کے ذمہ داروں کے ساتھ تعلق نے لکھوایا تھا۔ ۱۲۔

پھر بعض باتوں کو میری طرف منسوب کرنے میں اور بعض میری گزارشات کا مطلب سمجھنے میں مولانا سے جو حیرت انگیز اور میرے لئے تکلیف دہ غلطیاں ہوئی ہیں وہ سب ان بدگمانیوں ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لئے ان کے بارے میں بڑی حد تک ان کو معذور سمجھتا ہوں۔ آدمی جب کسی کو بدنیت اور بد باطن سمجھ لے تو پھر ذہن اس کے بارے میں بالکل دوسری طرح کام کرنے لگتا ہے۔ البتہ ان میں سے خاص کر دو تین غلطیاں مولانا سے ایسی ہوئی ہیں کہ ان کے بارے میں کم از کم اپنی شدید قلبی تکلیف کا ان سے اظہار کر دینا میرے لئے ضروری ہے۔ (۱) میرے لفظ ”اکرام مسلم“ کے جو عجیب و غریب معنی میری طرف انھوں نے منسوب کئے اور پھر ۴-۵ صفحے میں جس طرح اس کا رد فرمایا ہے اس سے مجھے بہت اذیت ہوئی۔ گویا مولانا کی بدگمانی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب میں اتنا جاہل اور احمق بھی ہو گیا ہوں کہ ”اکرام مسلم“ کے نام سے میں ان کو اس طرز عمل کا مشورہ دے رہا ہوں جس کا مشورہ کوئی اعلیٰ درجہ کا جاہل اور احمق ہی دے سکتا ہے۔ حالانکہ ”اخوان المسلمین“ کے طرز عمل کا میں نے جو حوالہ اس سلسلہ میں دیا تھا مولانا اگر چاہتے تو میرا مطلب سمجھنے میں اس سے بھی کچھ مدد لے سکتے تھے۔

(۲) دیوبند کے ایک رسالہ کے ایک مضمون کا حوالہ دے کر جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کو مولانا نے اتنے غلط معنی پہنائے ہیں کہ مولانا کا مضمون دیکھنے سے پہلے میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ میرا مطلب یہ سمجھے گا۔ اس معاملہ میں میری جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار بزرگ سے بھی مختصر مراسلت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ مولانا امین احسن صاحب کی طرح میرے ساتھ بدگمان نہ تھے اس لئے ان کا جواب اور رد عمل مولانا امین احسن صاحب سے بہت مختلف تھا۔

(۳) مولانا امین احسن صاحب کی تیسری بات جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر پر نظر ثانی کے متعلق میں نے جو مشورہ دیا تھا اور یہ کام دو صاحبوں کے سپرد کرنے کے لئے جو عرض کیا تھا اس کا مطلب مولانا نے یہ سمجھا اور اپنے ناظرین کو سمجھایا کہ دوسرا آدمی میں جماعت کے ان مخالفین کا نمائندہ چاہتا ہوں جنھوں نے حال ہی میں جماعت کے خلاف فتوے صادر فرمائے ہیں اور اس طرح گویا میرا مخلصانہ مشورہ نہیں بلکہ شاطرانہ مطالبہ ایک ایسی کمیٹی کے لئے ہے جس میں ۵۰ فیصدی نمائندگی جماعت اسلامی کے مخالفین کی ہو۔

اللہ اکبر! بدگمانی کی حیرت انگیز کار فرمائی کی یہ عجیب و غریب مثال ہے کہ کوئی اور نہیں مولانا امین احسن میری طرف ایک ایسی تجویز کو منسوب کر رہے ہیں جس کو کوئی انتہائی درجہ کا احمق یا نہایت شریر قسم کا آدمی ہی پیش کر سکتا ہے۔ اللہ کے بندہ! میں نے جماعت کے مخالف کا اس جگہ کہاں ذکر کیا تھا، آخر آپ کا ذہن اس طرف

کس قرینہ سے گیا؟ — کھلی ہوئی بات ہے کہ جماعت کے مخالفین کے نمائندہ کے ساتھ مل کر کبھی یہ کام نہیں ہو سکتا، میرا مطلب تو ان اہل علم سے تھا جو نظام جماعت سے باہر ہونے کے باوجود جماعت اور ذمہ داران جماعت کے ساتھ اعتماد اور حسن ظن کا تعلق رکھتے ہیں اور تعاون کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صرف ان ہی سے لیا جاسکتا ہے، اور میں پاکستان میں ایسے بہت سے حضرات کو جانتا ہوں اور کوئی پوچھے تو نام بتا سکتا ہوں۔

بہر حال یہ تین باتیں تو ایسی تھیں جن سے مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں ان پر سکوت نہیں کر سکا۔ ان کے علاوہ جو اور غلطیاں میرے معاملہ میں پورے ۶۴ صفحے کے اس مضمون میں مولانا سے ہوئی ہیں اگر اللہ کا کوئی بندہ انھیں بھی معلوم کر کے میرے ساتھ انصاف کرنا چاہے تو انشاء اللہ اتنا ہی کافی ہو گا کہ وہ میرا اصل مضمون سامنے رکھ کر مولانا کا جواب پڑھے۔

تاہم میں ان ساری غلطیوں کی بنیاد جیسا کہ میں نے عرض کیا، مولانا کی ان بدگمانیوں ہی کو سمجھتا ہوں جو وہ اپنے اس نیاز مند کے متعلق قائم کئے ہوئے ہیں۔ بدگمانی اچھے خاصے معقول اور ذہین و فہیم آدمیوں سے بھی بڑی سے بڑی اس قسم کی غلطیاں کر ا دیتی ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مولانا کے جواب کو پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں مجھ سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارے درمیان وہ اعتماد و تعلق باقی ہے جو ان باتوں کے مفید ہونے کے لئے ضروری ہے۔ مگر میں عرض کروں گا کہ میری اس غلط فہمی کی ذمہ داری میری نادانی اور سادہ لوحی کے علاوہ کچھ مولانا امین احسن صاحب کی ذات گرامی پر بھی ہے، مولانا نے اپنے جوابی مضمون میں میرے جس خط کا کئی جگہ ذکر کیا ہے (جو میں نے اس مضمون سے کافی مدت پہلے ان کی خدمت میں لکھا تھا) اس میں میں نے اپنی اس غلط فہمی کو پوری طرح ظاہر کر دیا تھا اور اسی بنیاد پر بے تکلف اس کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ میں عنقریب جماعت اسلامی کے متعلق ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں جس میں ان چیزوں کے متعلق اپنے خیالات اور اپنی معروضات آپ حضرات کے سامنے پیش کروں گا جن کو میں جماعت کے سلسلہ میں قابل اصلاح سمجھتا ہوں۔ مگر مولانا نے اس کے جواب میں اشارہ بھی اس پر مطلع نہیں کیا کہ باہمی تعلق اور اعتماد کے بارہ میں میں کسی غلط فہمی میں ہوں، اگر خفی سے خفی اشارہ سے بھی میں یہ سمجھ لیتا یا مولانا ازراہ کرم اس کا ہی کوئی اشارہ کر دیتے کہ یہ وقت اس کام کے لئے ان کے نزدیک مناسب نہ ہو گا تو اس مضمون کا لکھنا میں ہرگز مفید نہ سمجھتا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس وقت جب جماعت اور مولانا مودودی کے بلکہ اس خط کے وصول ہونے پر مولانا نے جو مختصر سا خط رسید کے طور پر مجھے لکھوایا تھا اس سے بھی میں یہی سمجھا تھا کہ ہمارے درمیان اعتماد و محبت کا جو تعلق تھا وہ موجود اور محفوظ ہے۔

آخری پیرا گراف:

مولانا امین احسن صاحب نے اس عاجز کے متعلق جن شدید بدگمانیوں کا اپنے جواب میں اظہار فرمایا ہے، میں نے ان کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی کوششیں مفید ہو سکتی ہیں۔ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ اگر اس زندگی میں نہیں تو آنے والی زندگی میں انشاء اللہ ضرور مولانا کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سراسر ان کی غلط گمانیاں تھیں، بشرطیکہ ہم دونوں کا خاتمہ ایمان پر ہو اور اس گنہگار کو اللہ کی رحمت سے دونوں کے بارہ میں یہی امید ہے۔

(الفرقان: بابت صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲)

حجاز مقدس کا سفر (۱۹۸۵ء)

(ایرانی انقلاب پر آپ کی تصنیف ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ کا جہاں ابتدائی ذکر آیا تھا وہاں اسی انقلاب کے سلسلہ میں حجاز مقدس کے ایک سفر کی مشقت اٹھانے کا بھی حوالہ دیا گیا تھا۔ ۸۵ء کا یہ سفر وہی سفر ہے، اور اسفار کے سلسلہ کا آخری سفر۔ یہ اوپر گزرے سفروں سے مختلف نوعیت کا سفر تھا۔ یعنی یہ ان سفروں کی طرح کا دعویٰ اور اصلاحی سفر نہ تھا، بلکہ ایک دوسری نوعیت کی دینی خدمت اس کا باعث ہوئی، اور اس کا بھی مختصر حوالہ کتاب کے ابتدائی تذکرہ میں آ گیا تھا، تفصیل باقی تھی جو اب اس سفر کے بیان میں آپ پڑھیں گے۔ لیکن یہ سفر، حجاز مقدس کا سفر ہونے کی بنا پر اس خدمت ہی تک محدود نہیں رہا تھا، کہ اس میں بیت اللہ کی حاضری تھی، مدینہ الرسول (ﷺ) اور آپ کی مسجد مبارک کی حاضری تھی۔ پس اس سلسلہ کے اعمال کی بنا پر روحانی ترقی اور ساتھ ہی زبانِ عمل سے تعلیم و تذکیر کا ایک سفر بن گیا تھا۔ اس کی روداد سے اہل توفیق حضوری کے وہ آداب سیکھیں گے جو اہل اللہ ہی کا حصہ ہیں، وہ کیفِ عبدیت اخذ کریں گے جو زیارتِ حرمین کی روح اور جان ہے اور جس کے بغیر یہ زیارت محض ایک رسمی عمل۔ ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق اور حفظِ مراتب کی تعلیم بھی اس میں زبانِ عمل ہی سے ایسی آگئی ہے کہ ایک بیش قیمت درس کہئے۔ خود اس راقم نے، جو ۴۸ برس کی عمر تک زیرِ سایہ رہا، اس روداد سے بہت کچھ سیکھا۔ اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے۔)

کہنے کو تو یہ سفر رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر ہوا تھا، جس کے آپ ۱۹۶۵ء سے بنیادی ارکان میں تھے اور ۷۵ء تک ہر سال اُس کے اجلاس پر جانا ہوتا رہا تھا۔ مگر ۷۶ء سے معذوری کی کیفیت شروع ہو جانے پر آپ اس سلسلہ میں سفر نہیں کر سکے تھے اگرچہ دعوت نامہ معمول کے مطابق ہر سال آتا رہا تھا۔ لیکن امسال دعوت نامہ آیا تو آپ کو اس خاص دینی ضرورت کے ماتحت جس کا ابھی اوپر حوالہ گزرا تھا، ہوا کہ معذوری کے باوجود سفر کے امکان پر غور کریں۔ ۷۶ء سے شروع ہونے والی معذوری ۸۵ء میں اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ سفر کی ہمت کر بھی لی جائے تو ہمیشہ کی بے رفق سفر کی عادی شخصیت کو ایک نہیں دو دو رقیوں کی ضرورت اس سفر کے لئے محسوس ہو رہی تھی۔ پس دو دویزے اور چاہئے تھے اور دو ٹکٹ اور، ظاہر ہے کہ معاملہ آسان نہ تھا۔ مگر جیسا کہ سفر نامہ میں تحریر فرمایا ہے:

”بہر حال ایک طرف داعیہ تھا اور دوسری طرف میری اپنی معذوریاں اور بیماریاں، بار بار

خیال ہوتا تھا کہ میں سفر کے لائق نہیں ہوں اور بار بار دل میں وہ داعیہ شدت پکڑتا تھا (داعیہ کا

بیان آگے آتا ہے) اسی کھمکش اور تذبذب میں وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ اجلاس کی تاریخیں قریب آگئیں۔ پھر یہ بات سامنے آئی کہ میری معذریاں ایسی ہیں کہ میرے ساتھ دور فیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ مولوی خلیل الرحمن سجاد سلمہ کے لئے میں پہلے ہی رابطے والوں کو لکھ چکا تھا کہ ان کے لئے میرے رفیق سفر کی حیثیت سے ویزا بھیج دیا جائے، اب جب دور فیتوں کی بات آئی تو یہ بہت مشکل نظر آتا تھا کہ اتنے کم وقت میں دوسرا ویزا مل جائے۔ میں برابر استخارہ کرتا رہا اور اسی کی دعا کرتا رہا کہ اگر سفر میرے لئے باعث خیر ہو۔ اور کیا شبہ ہے کہ وہاں کا سفر مبارک ہی ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو مقدر اور آسان فرمادے۔ نیت بھی یہی کر لی تھی کہ اگر انتظامات مکمل ہو گئے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفر کا اشارہ سمجھوں گا، ورنہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہوں گا۔ اجلاس سے تین دن قبل مجھے یہ اطلاع ملی کہ دوسرا ویزا ابھی مل جائے گا (جو عزیزم مولوی زکریا سلمہ کے نام سے منگا یا گیا تھا) اطلاع ملتے ہی سجاد سلمہ، دہلی روانہ ہو گئے، دن بھر میں ضروری کاروائیوں کی تکمیل کی، اگلے دن وہ واپس آئے اور اس دن یعنی ۲۸ دسمبر کی شب ہم لوگ لکھنؤ دہلی میل سے روانہ ہو کر صبح بعافیت دہلی اسٹیشن پر اتر گئے۔“

دہلی میں قیام وہاں کے اہل تعلق میں سے کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی پر ہوا جو سستی نظام الدین میں تبلیغی مرکز بنگلہ والی مسجد کے بالکل قریب ہے۔ ان کو اطلاع دیدی گئی تھی، اسٹیشن پر بھی آگئے تھے اور انہی کی گاڑی میں ان کے یہاں پہنچے۔ گاڑی سے اترتے ہی کرامت اللہ صاحب نے خوشخبری سنائی کہ ابھی ابھی چند منٹ پہلے بھائی سعدی صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی تھی میں نے ان کو آپ کے سفر کا اور کل اتوار کی شام کو مکہ مکرمہ پہنچنے کا پروگرام بتایا تو انھوں نے کہا کہ میرا اسلام پہنچائیے اور ساتھ ہی یہ پیام بھی کہ قیام غریب خانہ پر اس کمرہ میں ہوگا جس میں حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ قیام فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی اطمینان بخش خوشخبری تھی۔ اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ

”اس سفر میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی جرحمتیں اور دیکیریاں سامنے آئیں، میرے دہلی

پہنچنے سے بھی پہلے بھائی سعدی صاحب کی یہ پیش کش اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ حضرت شیخ

نور اللہ مرقدہ کا قیام اس کمرہ میں چونکہ ان کی معذوری کے زمانہ میں ہوتا تھا اس لئے اس میں وہ

ساری سہولتیں تھیں جن کی مجھے اپنی معذوری کی وجہ سے ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور

بھائی سعدی اور بھائی کرامت کے لئے دل سے دعا نکلی۔“

اس دن اور اگلی رات کرامت اللہ صاحب کے یہاں قیام کر کے دوسرے دن بعد فجر ہوائی اڈہ کے

لئے روانگی ہو گئی، الحمد للہ یہاں کی قانونی کاروائیاں بھی سہولت سے مکمل ہو گئیں۔ اس مرحلہ پر ارشاد ہوا ہے:

”ہر مرحلہ پر محسوس ہوا کہ اللہ کا خاص لطف و کرم شامل حال ہے۔ جس انتظامی کارکن سے واسطہ پڑتا وہ ہر ممکن تعاون اور مدد کے لئے تیار ہوتا، بالآخر طیارہ پر سوار ہونے کا وقت آیا، لمبی سیڑھیاں چڑھنے میں تھوڑی دقت پیش آئی، طیارہ کا عملہ بہت اچھی طرح پیش آیا سیڑھیوں پر چڑھنے میں بھی اس نے ممکن حد تک مدد دیئے اور سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی، بلاشبہ یہ سب اللہ ہی کی طرف سے تھا۔ فلہ الحمد للہ الشکر۔“

طیارہ ریاض ہو کر جانے والا تھا اور ریاض یا ظہران ہو کر جو جہاز جدہ جاتے ہیں ان کے مسافروں کو ساتھ والے سامان کے ساتھ جہاز سے اترنا ہوتا ہے اور وہاں کچھ چیکنگ کے بعد جہاز کی دوبارہ روانگی کے وقت جہاز میں داخلہ۔ جیسا کہ درمیان میں اسٹاپ کرنے والے جہازوں کا عام قاعدہ ہے، لیکن آپ کے لئے معذوری کی وجہ سے یہ سخت مشکل معاملہ تھا۔ یہاں بھی ارشاد ہے کہ اللہ نے مدد فرمائی اور جہاز کا ایک افسر اس سلسلہ میں سجاد میاں سے گفتگو کے بعد ایسا مہربان ہو گیا کہ اس نے محکمہ کے متعلقہ افسر سے وائرلیس کے ذریعہ رابطہ کر کے کوشش کی کہ مجھے استخفیہ مل جائے، اور بالآخر یہ کام ہو ہی گیا۔

”چنانچہ مولوی زکریا اور مولوی سجاد ہی سب کچھ لیکر اتر گئے اور میں جہاز میں تیار رہا۔ ایک گھنٹہ سے کچھ زیادہ ریاض ٹھہرنے کے بعد طیارہ نے جدہ کے لئے پرواز شروع کی۔۔۔۔۔۔ قریباً سوا گھنٹے کی پرواز کے بعد طیارہ جدہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ جدہ کا یہ نوعمر ہوائی اڈہ جدید ترین انتظامات سے آراستہ ہے بڑی سہولت سے پہیوں والی کرسی پر بیٹھا میں جہاز سے باہر آ گیا۔ رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے استقبالہ کمیٹی کے ایک نمائندے موجود تھے ان کی رہبری میں قانونی کارروائیاں بھی سہولت مکمل ہوئیں اور ہم لوگ باہر نکلے۔ یہاں احباب کی بڑی تعداد منتظر تھی سب سے ملاقات کے بعد جدہ میں اپنے دیرینہ کرمفرما اور مستقل میزبان نورولی برادران کی گاڑی میں سوار ہو کر ان کے مکان روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز ادا کی اور بھائی ریاض احمد کی گاڑی میں سوار ہو کر مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور قریباً صرف ایک گھنٹے میں مکہ مکرمہ میں اپنے میزبان بھائی سعدی کے مکان پہنچ گئے۔

مکہ مکرمہ پہنچنے پر حسب سہولت پہلا کام عمرہ کرنا تھا، مگر آپ کو چونکہ طواف کرسی پر کرنا تھا اور اس کیلئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اسے اس وقت تک کے لئے مؤخر کرنا ناگزیر ہوا جب تک کہ اجازت نامہ حاصل ہو۔ پس آپ کے دونوں رفیقوں نے تو صبح ہوتے ہی عمرہ کر لیا مگر آپ کو اجازت نامے کا انتظار لازم ہوا۔ رات آرام کیا، صبح ہوئی تو اہل تعلق کی آمد شروع ہو گئی۔ پھر رابطہ جس کی دعوت پر سفر ہوا تھا،

اور دو دن پہلے اس کے اجلاس شروع ہو چکے تھے، اس کے اجلاس کا وقت آنے پر آپ نے وہاں کا رخ کیا۔ یہ رابطہ میں آپ کی دس سال کے بعد حاضری تھی۔ عہدہ دارانِ رابطہ اور دیگر ارکان نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

”یہ عاجز دس سال کی غیر حاضری کے بعد رابطہ کے اجلاس میں شریک ہوا تھا، اس دوران رابطہ کے عملے اور ممبران میں متعدد اضافے اور تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ رابطہ کے موجودہ سکریٹری جنرل ڈاکٹر عمر عبداللہ صغیف اور ان کے نائب شیخ محمد ناصر العبدی بھی کچھ ہی پہلے اپنے عہدوں پر فائز ہوئے ہیں، نشست کے اختتام پر دوسرے رفقاء اور ان حضرات سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس طویل غیر حاضری کے بعد اجلاس میں شرکت پر خاص طور سے خوشی کا اظہار کیا۔ (یہیں حضرت مولانا علی میاں صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، وہ پہلے پہنچ چکے تھے اور اس دن شیخ بن بازی کی عدم موجودگی کی وجہ سے اجلاس کی صدارت بھی انہی کی تھی۔)

دوبجے کے قریب اپنی قیامگاہ پر واپسی ہوئی۔ بعد عصر احباب و مخلصین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بلاشبہ ان سب مجاورینِ بیت اللہ سے ملاقات اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ ان میں کچھ وہ بھی تھے جن کی محبتوں اور عنایتوں کی تاریخ بہت قدیم بھی ہے اور بہت طویل بھی۔ مدرسہ صولتیہ کے سربراہ مولانا شمیم احمد کی، قاری محمد سلیمان صاحب، مولانا غلام رسول صاحب، مولانا عبداللطیف کی، صوفی محمد اقبال مہاجر مدنی اسی فہرست میں ہیں۔۔۔ ان کے علاوہ جن عزیزوں سے مل کر خاص طور پر بہت خوشی ہوئی ان میں مولانا حافظ محمد نعمان صاحب کے صاحبزادے مولوی رضوان سلمہ کے چھوٹے بھائی فرقان میاں سلمہ، ڈاکٹر عباد الرحمن نشاط، بھائی غلام محمد حیدر آبادی، عزیزِ مکرم طاز حسن عسکری مدنی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

”میرے لئے پیہ دار کرسی پر طواف کی جو اجازت طلب کی گئی تھی معلوم ہوا کہ وہ کل ملے گی، حرم شریف کی حاضری اور مناسکِ عمرہ کی ادائیگی کے لئے ایک دن اور انتظار کا حکم ملا، خوف بھی رہا کہ کہیں اس تاخیر کی وجہ اپنی اندرونی حالت تو نہیں، اور رحمتِ خداوندی سے امید بھی رہی کہ انشاء اللہ محرومی نہ رہے گی۔

”سہ شنبہ کا دن بھی اسی طرح گزرا، صبح دس بجے سے ایک بجے تک رابطہ کے اجلاس میں مشغولیت رہی، شام کو احباب و مخلصین کا ہجوم رہا۔ آج حرم شریف حاضری کا پروانہ مولوی رضوان اور ان کے بھائی فرقان سلمہما کی کوشش سے مل چکا تھا، روز آئہ شب میں ۹ بجے کے بعد حاضری اور طواف کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ آج شب دس بجے کے قریب میں اپنے دونوں

رفیقوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ (آپ جس کار پر روانہ ہوئے وہ آپ کے میزبان 'بھائی سعدی صاحب' ہی کی عنایت تھی۔ اس پر سوار ہوتے ہوئے آپ کو خیال آیا کہ اُن کی اس عنایت اور اس کے ساتھ دیگر کئی عنایات کا ذکر پہلے آنا چاہئے تھا، پس سلسلہ کلام روک کر اس کی تلافی کے لئے فرماتے ہیں) ”ہاں میں یہ ذکر کرنا بھول گیا تھا کہ بھائی سعدی نے اپنے مکان کے ایک پورے حصے اور اپنے دو خانساموں کے علاوہ اپنی ایک کار بھی ہمارے لئے مخصوص کر دی تھی اور ڈرائیور کی حیثیت سے بھائی مولانا عبداللطیف علی نے اپنے پریس کے ایک کارکن مولوی علیم الدین مظاہری صاحب کو ہمارے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور اس طرح اس بوڑھے فقیر کے پاس مکہ میں عالیشان مکان بھی تھا، عملہ بھی تھا، موٹر بھی تھی، ڈرائیور بھی تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

”توجہ میں اس کار پر سوار ہو کر عمرہ کی نیت سے گھر سے نکلا اور ”لبیک، اللہم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنَّعْمَةَ لَكَ وَالْمَلِكُ، لا شریک لک“ کا ترانہ زبان پر آتا تو یاد آگیا کہ کتنا بر موقع ہے اور کتنا مطابق واقعہ اور حسب حال ہے یہ ترانہ! اپنا کچھ نہیں، کسی کا کچھ نہیں، جو کچھ ہے صرف اسی کا ہے، صرف اسی کا ہے کوئی بھی تو اس کا شریک نہیں۔ ایک مدت کے بعد یہ ترانہ پڑھنے کی اور یہ صدا لگانے کی سعادت مل رہی ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَلِلّٰهِ الشُّكْرُ! باب عبدالعزیز تک موٹر پہنچ سکتی تھی وہیں موٹر سے اترے۔ کرسی ہمارے ساتھ تھی اسی پر مجھے بٹھا دیا گیا مولوی زکریا لیکر آگے بڑھے کچھ دور چل کر نگاہ اوپر اٹھی، خانہ کعبہ اپنی تمام تجلیات کے ساتھ سامنے تھا۔ یا اللہ تیرا کرم، تیرا احسان، میں تو مایوس ہو چکا تھا کہ اب کبھی حاضری نصیب ہوگی۔ اللہم زد بیتک هذا تشریفاً و تکریمًا و سراً و مہابةً و زد من شرفہ و کرمہ من حجۃ او اعتمرہ تشریفاً و تکریمًا و سراً و مہابةً۔

”الحمد للہ کہ عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی طواف شروع کرتے وقت حجر اسود کی تقبیل کی سعادت بھی مل گئی، طواف سے فارغ ہو کر دو گانہ طواف مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرنے کی توفیق ملی۔ اس کے بعد ملتزم پر حاضری ہوئی۔ اگرچہ موسم حج کا نہیں، وقت بھی قریب اب بچے شب کا ہے، اس کے باوجود اللہ کے بندوں اور رحمت کے سانکوں کا جہوم تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمت دی، میں بھی ملتزم سے لگ کر کھڑا ہو گیا، جو کچھ مانگ سکا، جس طرح مانگ سکا اللہ تعالیٰ سے مانگا۔ اس کے بعد فرقان میاں نے زحرم پلایا، دعا کی اور استلام کر کے سعی کے لئے صفا کی طرف روانہ ہوا۔۔۔ قریباً ایک گھنٹے میں سعی سے فراغت ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اپنی معذوری کی وجہ

سے خلق کے بجائے قصر کرایا۔ عمرہ پورا ہوا فالحمد للہ علی ذلک۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اور قبولیت اور اپنے عزیزوں کے لئے جزائے خیر و برکت کی دعائیں کرتے ہوئے جن کی بدولت اس معذور کو بیٹھے بیٹھے عمرہ کی سعادت ملی، ساڑھے بارہ بجے کے قریب قیام گاہ پر واپس ہوئی۔“

رابطہ کا اجلاس بدھ جمعرات (دودن) اور تھا۔ بدھ کے اجلاس میں تشریف لے گئے تو شیخ ابن باز کو موجود پایا، اجلاس کی صدارت بھی حسب معمول وہی کر رہے تھے۔ نشست کے اختتام پر شیخ سے ملاقات ہوئی۔ شیخ کی طرف سے نہایت گرم جوشی سے استقبال کا ذکر کرتے ہوئے موصوف سے اپنے تاثر کے اظہار میں تحریر فرمایا ہے کہ

”شیخ ابن باز اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے عالم اسلام کی منفرد شخصیت ہیں۔ علم، تقویٰ، اخلاق، لہجہ، بصیرت، قوتِ کار اور سادگی و تواضع کی وہ صفات ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جمع فرمادی ہیں جن کی وجہ سے مختلف حلقوں میں بہت عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات سرزمینِ حجاز میں بہت سے فتنوں اور شرور کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، بلاشبہ ان کا وجود بہت مبارک ہے۔“

اس دن (بدھ) کو بھی شام اسی طرح گزری کہ احباب و مخلصین کا ہجوم رہا، آج کچھ احباب (بھائی عبد الباسط اور بھائی رفیق کانپوری وغیرہ) اخیر ظہران سے بھی پہنچے تھے۔ شب میں اسی طرح دس بجے طواف کے لئے حرم شریف جانا ہوا۔ اس دن اللہ تعالیٰ کی کچھ خاص عنایات کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے:

”بہت اطمینان سے کئی طواف نصیب ہوئے، بعض طوافوں میں ایک شوط میں نے پیدل بھی کیا، اپنے جس گھر کو اللہ تعالیٰ نے مبارکاً و ہدیٰ للعالمین فرمایا ہے اس کی ایک برکت تو میں خود یہ دیکھ رہا تھا کہ میری صحت و قوت کے حال میں نمایاں فرق تھا، دن بھر کی ایسی مشغولیت، شام کو ایسی ملاقاتیں اور رات کے یہ معمولات، لیکن اللہ کی قدرت کہ نہ تکان نہ کوئی تکلیف، نہ طبیعت میں کوئی اضمحلال، بلاشبہ یہ اسی بلد امین کی برکتوں اور میرے مالک کے کرم اور احسان کا ثمرہ تھا۔“

جمعرات کو رابطہ کی اختتامی نشست تھی اور شیخ ابن باز کی طرف سے ارکان کے اعزاز میں ظہران کا اہتمام تھا۔ شام کو اسی طرح احباب و مخلصین کا ہجوم رہا۔ البتہ آج شب میں طواف نہ ہو سکا، اس لئے کہ بعد مغرب سجاد میاں نے بلڈ پریشر دیکھا تو بہت بڑھا ہوا تھا۔ رات کو آرام ہی کرنا طے ہوا، یوں بھی جمعہ کی رات

میں حرم کے پروانوں کا اٹھو دام بھی زیادہ رہتا ہے۔ جمعہ کی صبح بحمد اللہ بخیریت ہوئی۔ اس دن آنے والوں میں اپنے کچھ عزیز بچوں کا بھی ذکر ہے:

”جمعہ کی صبح عزیزی شمعون میاں اپنی اہلیہ اور عزیزان نجیب و ذیشان سلمہا کو لیکر مدینہ منورہ سے ملاقات کے لئے آگئے۔ فجر سے پہلے ہی یہ لوگ پہنچ گئے، سب احرام کی حالت میں تھے۔ ان عزیزوں کو یہاں اس حالت میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ برکتوں سے نوازے اور حفاظت فرمائے۔“ (ان میں شمعون میاں راقم کے بھائی حفیظ نعمانی کے بیٹے ہیں۔ نجیب سلمہ مرحوم تایازاد بھائی اصفر امام کے بیٹے اور ذیشان سلمہ مرحومہ تایازاد بہن خالدہ آپا کے بیٹے اور حفیظ میاں کے داماد ہیں۔ گویا یہ سب حضرت صاحب سوانح کے پوتے یا نواسے)

”جمعہ کا دن مع نماز جمعہ بحمد اللہ بعافیت گزرا۔ ملنے والے حسب معمول آتے رہے، کہ دس سال بعد موقع مل رہا تھا۔ اگلے دن شنبہ آیا، اس دن اور بعد کے دو دن (یکشنبہ اور دوشنبہ) مزید مکہ میں قیام رہا اور انہی دنوں میں آپ کو موقع ملا کہ سفر کا جو محرک تھا، جس کے ماتحت کچھ حضرات سے ملنا اور گفتگو کرنی تھی یہ کام انجام پائے۔ اس کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ ”ان تین دنوں میں ملاقات اور گفتگو کا اچھا موقع ملا۔“ بس یہی ایک جملہ اس بارہ میں ہے۔ اس سے زیادہ اس روداد سفر میں کچھ نہیں تحریر فرمایا گیا ہے۔

البتہ اس داعیہ اور محرک کا بہت مفصل بیان شروع میں پایا جاتا ہے۔ جس کا حاصل ہے خمینی صاحب کے نام نہاد ”اسلامی انقلاب“ میں حرمین شریفین کے لئے نہایت سنگین پوشیدہ خطرہ اور اس بارہ میں حرمین کے ذمہ داروں، حتیٰ کہ رابطہ کے ذمہ داروں کی طرف سے بھی کسی فکر کی علامت کا ظاہر نہ ہونا۔

یہ تھا اس سفر کا محرک اور شدید داعیہ، جس نے، ایسی سخت معذوری میں بھی، کہ جودس برس سے رابطہ کی دعوت پر سفر میں بھی اس کے باوجود سدّ راہ رہی کہ اس میں زیارت بیت اللہ جیسی سعادت مفت میسر آتی

(۱) سابق میں جہاں یہ کتاب (ایرانی انقلاب۔۔) تحریر فرمائے جانے کا بیان ہوا ہے وہاں ”اہل حرمین کے کانوں میں اذان“ کے ذیلی عنوان سے اس سفر کا حوالہ آیا ہے اور نتیجہ افسوس کے ساتھ مایوسی بتایا گیا ہے۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ رابطہ کے ذمہ داروں اور دوسرے بڑے علماء سے جب گفتگو کی گئی تو زیادہ سے زیادہ اچھا ردّ عمل فی الجملہ اتفاق اور جذبہ کی تحسین تھا، لیکن یہ توقع بالکل نہیں پائی گئی کہ یہ بات آگے اس باب حکومت تک پہنچائی جائی گی، جبکہ اس سلسلہ میں کچھ کرنا حکومت ہی کا کام تھا۔ اس امید شکنی پر جتنا بھی افسوس نہ ہوا ہو کم ہے مگر آپ نے بظاہر ان حضرات کی رعایت سے یہی مناسب سمجھا کہ نتیجہ کا کچھ ذکر نہ کیا جائے، بس بات ان تک پہنچا دینے کا اشارہ دیدیا جائے۔ اور زیارت حرمین کی جو سعادت عظمیٰ اس بہانہ میسر آگئی، توجہ بس اسی کیلئے اللہ کے شکر پر مبذول رکھی جائے۔

تھی، اس سفر پر آمادہ ہوئے بغیر نہ رہنے دیا۔ اس (محرم) کا بیان اصل روداد سفر کے بالکل شروع میں ہے لیکن یہاں روداد نقل کرتے ہوئے زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ اس بیان کو اس موقع کے لئے مؤخر کر دیا جائے۔ پس اب اس کا مطالعہ فرمائیں، ارشاد ہوا ہے:

”اس سال دعوت نامہ (یعنی رابطہ کا دعوت نامہ) ایسے وقت میں آیا کہ میں ایران کے انقلاب کی واقعی نوعیت اور خمینی صاحب کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس بارہ میں قطعیت اور بصیرت کے ساتھ رائے قائم کرنے کے لئے خمینی صاحب کی چند تصانیف کا پورے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ مذہب شیعہ کی بہت سی اہم کتابوں کا بھی۔

اس مطالعہ سے ایسی متعدد حقیقتیں قطعی دلائل کی روشنی میں اتنی وضاحت کے ساتھ سامنے آئی تھیں کہ کم از کم میرے اپنے علم و ذہن کی گرفت میں وہ حقیقتیں ایسی قطعیت کے ساتھ اس سے پہلے نہیں آئی تھیں۔

ان حقیقتوں میں سے ایک یہ ہے کہ خمینی صاحب نے اپنی کتاب ”الحکومت الاسلامیہ“ میں اپنے بارہویں امام (امام غائب) کی غیبت کبریٰ کے زمانہ میں ”ولایت فقیہ“ کا جو نظریہ پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور اس نظریہ کی بنیاد پر خمینی صاحب کا جو مقام و منصب متعین ہوتا ہے (یعنی کہ وہ امام غائب کے قائم مقام ہیں) اور پھر جو فرائض ان پر عائد اور جو اختیارات ان کو حاصل ہوتے ہیں ان کا لازمی تقاضہ ہے کہ وہ حرمین شریفین پر قبضہ کریں۔ مذہب شیعہ کی مستند روایات میں بیان کیا گیا گیا ہے کہ امام غائب غار سے برآمد ہونے کے بعد پہلے مکہ مکرمہ آئیں گے وہاں بیعت امامت لینے اور منکرین (یعنی سنی مسلمانوں) کو قتل اور نیست و نابود کر دینے کے بعد وہ مدینہ منورہ آئیں گے۔ یہاں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ (معاذ اللہ) روضہ اقدس کی دیواریں ٹوڑوا کے حضرات شیخین کی قبروں سے ان کی لاشوں کو نکوائیں گے پھر ان کو زندہ کر کے ان کے بے شمار ”جرائم اور مظالم“ کی سزا میں ان کو سولی پر چڑھائیں گے۔ اور ہزاروں بار زندہ کر کے اسی طرح سولی پر چڑھاتے رہیں گے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کو بھی زندہ کر کے سزا دیں گے اور تمام صحابہ کو جنھوں نے شیخین کو خلیفہ رسول مان کر ان کا ساتھ دیا، ان کو بھی اسی طرح زندہ کر کے اور ان سے محبت کرنے والے مسلمانوں (یعنی سنیوں) کو بھی زندہ کر کے سب کو سزا دیں گے اور آخر میں سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

(۱) یہ روایت میری کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ میں شیعوں کے خاتم المحدثین علامہ باقر مجلسی کی کتاب ”حق البقیں“ (ص ۶۲-۶۰) کے حوالہ سے نقل کی جا چکی ہے۔

مَعَاذَ اللَّهِ لَمْ مَعَاذَ اللَّهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ۔

ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ان سب کارروائیوں کا کرنا امام غائب صاحب کے لئے جب ہی ممکن ہوگا جبکہ دونوں مقدس شہروں پر حکومت قائم ہو۔ پس اس میں کسی شبہ کی محبتائش نہیں کہ ثمنی صاحب نے ”ولایت فقیہ“ کے نظریہ کی بنیاد پر امام غائب کے قائم مقام اور نائب کی حیثیت سے ”انقلاب“ کے عنوان شریفین ہیں، جو شخص امام غائب کے ظہور سے متعلق مذہب شیعہ کی روایات کو پیش نظر رکھ کر ثمنی صاحب کی کتاب ”الحکومت الاسلامیہ“ کا مطالعہ کرے گا اسے اس میں شبہ نہیں رہے گا کہ حرمین شریفین پر قبضہ اور تسلط ان کے منصوبوں میں سر فہرست ہے اور ایران کے شیعہ عوام خاص کر نو جوانوں میں جو غیر معمولی جوش اور قربانی کا جذبہ ہے وہ اسی امید پر ہے کہ ثمنی صاحب نے امام غائب منتظر کے نائب اور قائم مقام کی حیثیت سے جو یہ جہاد جاری رکھا ہے اس کے نتیجہ میں ہمارے عتبات عالیہ اور حرمین شریفین پر ہمارا قبضہ ہونا یقینی ہے۔

ثمنی صاحب اور ان کے انقلاب یا جہاد سے متعلق دل میں اس یقین کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ عقدہ بھی حل ہو گیا کہ خود ثمنی صاحب اور ایران کے دوسرے قائدین جو صبح و شام ساری دنیا کے اسلام کو آپسی اختلافات بھلا کر متحد ہو جانے کی تلقین کرتے رہتے ہیں، وہ پورے عالم اسلام بلکہ ساری دنیا کی اپیلوں اور کوششوں کے باوجود عراق سے جنگ بندی کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہوتے۔ (یہاں پہونچ کر دل اپنے اس درد کے اظہار کے لئے بے قرار ہے کہ کچھ اچھے پڑھے لکھے لوگ (جو بظاہر شیعہ بھی نہیں ہیں) یہ سب کچھ کھلی آنکھوں دیکھنے کے باوجود ثمنی صاحب اور ان کے رفقاء کو اتحاد اسلامی اور اتحاد بین المسلمین کی دعوت اور دعووں میں صادق سمجھتے اور دوسروں کو بھی باور کرانا چاہتے ہیں، سوچنا چاہئے کہ یہ خدا کا وہ عذاب تو نہیں ہے جس میں عقلیں اور بصیرتیں مسخ اور ماف کر دی جاتی ہیں! إِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبَ الَّتِي فِي الصُّدُورِ)

ثمنی صاحب اور ان کے برپا کئے ہوئے انقلاب کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے جس مطالعہ کا اوپر حوالہ دیا گیا اسی کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ سامنے آئی کہ فقیہ جو مذہب شیعہ کے مشہور و معروف اصولوں میں سے ہے اس کا مطلب، اس کا درجہ اور اس کے حدود کیا ہیں۔ ہمیشہ سے یہ سمجھا تھا کہ شیعہ مذہب میں اپنی کسی ضرورت یا مصلحت کے تقاضے سے جھوٹ بول کر دوسروں کو دھوکہ دینا جائز ہے، گناہ نہ ہوگا۔ اور اس کو صرف دنیوی معاملات ہی تک محدود سمجھا تھا، لیکن اس

مطالعہ سے معلوم ہوا کہ تقیہ صرف جائز ہی نہیں، واجب ہے فرض ہے، وہ عین دین و ایمان ہے! حضرت علی مرتضیٰ سے لے کر گیارہویں امام حسن عسکری تک سبھی ائمہ ساری عمر دین و مذہب کے بارے میں تقیہ کرتے رہے ہیں۔

۱۳؎ امیر المؤمنین علی مرتضیٰ نے خلفائے ثلاثہ کے پورے دورِ خلافت میں تقیہ کیا، وہ عام مسلمانوں کے ساتھ ان خلفاء کے پیچھے ہی اور ان کی اقتداء میں نمازیں پڑھتے رہے حالانکہ وہ (شیعہ حضرات کی روایات اور عقیدہ کی رو سے) جانتے تھے کہ یہ خلفاء مؤمن و مسلم نہیں ہیں بلکہ (معاذ اللہ) منافق ہیں اور ان خلفاء کی پوری ۲۴ سالہ مدت میں کبھی کسی مجمع اور عوام مسلمین کے سامنے اپنی امامت کا بھی دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اپنے طرزِ عمل سے اس کے خلاف ہی مظاہرہ کرتے رہے۔ خود اپنی خلافت کے چھ سالہ دور میں بھی اپنے بعض خطبوں میں ان خلفاء کی خاص کر شیخین کی تعریف فرمائی^۱ (جس کے بارہ میں شیعہ علماء و مصنفین فرماتے ہیں یہ تقیہ تھا) ان کے بعد شیعہ حضرات کے دوسرے امام حضرت حسن نے حضرت معاویہ سے صلح کی اور اس کے بعد ان کے پیچھے اور ان کے مقرر رکھے ہوئے ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے، اور تیسرے امام عالی مقام حضرت حسینؑ نے بھی اس معاملہ میں ان کی مزاحمت و مخالفت نہیں کی، بلکہ ان کا اپنا رویہ بھی یہی رہا، شیعہ حضرات کے نزدیک یہ سب تقیہ تھا، پھر یہ رویہ چوتھے امام حضرت علی بن حسین زین العابدینؑ کا رہا اور ان کے بعد کے تمام ائمہ کا رہا اسی بنا پر اصول کافی کی روایت کے مطابق اثنا عشریہ کے پانچویں امام ابو جعفر (امام باقرؑ) نے فرمایا:

التقية من ديني و دين آبائي ولا إيمان لمن لا تقيه له (اصول کافی ص ۴۸۴ مطبع نولکشور لکھنؤ)

”پھر اس مطالعہ ہی کے سلسلہ میں ”من لا یحضرہ الفقیہ“ میں (جو شیعہ حضرات کی ان چار کتابوں میں سے ایک ہے جن پر گویا مذہبِ شیعہ کی بنیاد قائم ہے) ان کے چھٹے امام جعفر صادق کا یہ ارشاد سامنے آیا کہ

”اگر کوئی شیعہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد سنیوں کی جماعت میں شریک ہو کر تقیہ کے طور

پر ان کے ساتھ بھی نماز پڑھے تو اس کو اس تقیہ والی نماز کا ثواب پچیس درجہ زیادہ ملے گا (من لا

(۱) شیعہ حضرات کے ائمہ معصومین کے وہ ارشادات جن میں تقیہ کو واجب اور فرض اور عین دین و ایمان کہا گیا ہے میرا کتاب ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت کے ص ۲۳۰-۳۱۱ پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۲) یہ خطبہ خود شیعوں کی کتاب ”نجم البلاغہ“ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

بعضرۃ الفقیہ جلد اول ص ۲۷۱ طبع لکھنؤ)

”اور اسی ”من لا یحضرہ الفقیہ“ میں اسی صفحہ پر امام جعفر صادقؑ ہی کا دوسرا ارشاد یہ نظر کے سامنے آیا:

”جو شیعہ غیروں یعنی سنیوں کے ساتھ تقیہ کے طور پر جماعت میں شریک ہو کر صفِ اول میں نماز پڑھے تو اس کا درجہ اس شخص کا سا ہے جس نے رسول اللہ (ﷺ) کے پیچھے صفِ اول میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔“

مذہب شیعہ کی مسلم بنیادی کتابوں میں تقیہ کے بارے میں یہ سب کچھ سامنے آ جانے کے بعد دل میں ایک دوسرا یقین یہ پیدا ہوا کہ ثمنی صاحب ”اور ان کے رفقاء ایران کے دوسرے قائدین ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ وہ اگر کسی وقت کوئی پیش کش یا کوئی یقین دہانی کریں تو اصحاب معاملہ کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ تقیہ ان کے مذہب میں واجب و فرض ہے اور ان کے نزدیک ان کے تمام ائمہ معصومین کا اس پر عمل رہا ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے اگر کوئی معاملہ کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کے نتائج افسوسناک سامنے آئیں، لا قدر اللہ۔“

”ثمنی صاحب کی کتابوں کے مطالعہ نے دل میں ایک تیسرا یقین یہ پیدا کیا کہ وہ ان شیعوں میں سے ہیں جو صفائی کے ساتھ اپنے اس عقیدہ کا اظہار کرتے ہیں کہ (معاذ اللہ) حضرت صدیق اکبرؑ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ذوالنورینؓ اور ان کے رفقاء صفِ اول کے تمام صحابہ نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا، یہ منافق تھے، صرف حکومت و اقتدار کی طرح اور ہوس میں زبان سے کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ ہو گئے تھے، اس مقصد کے لئے وہ ہر ناکردنی کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ضرورت سمجھتے تو (ابو جہل و ابو لہب کی طرح) اسلام کے کھلے دشمن بن کر بھی مقابلہ میں آ سکتے تھے۔۔۔

واقعہ یہ ہے کہ انتہائی بد زبان تبرائی شیعہ صاحبان حضرات خلفائے ثلاثہ کے بارہ میں جو کچھ زبان سے کہتے یا قلم سے لکھتے ہیں ثمنی صاحب نے اپنے خاص انداز میں اپنی کتاب کشف الاسرار میں وہ سب کچھ لکھا ہے (الفرقان میں بھی اس کے اقتباسات شائع ہو چکے ہیں اور ایرانی انقلاب اور ثمنی صاحب سے متعلق میری کتاب میں ثمنی صاحب کی اصل عبارتیں پڑھی جاسکتی ہیں) ان کی ان عبارتوں کے سامنے آ جانے کے بعد کسی آنکھوں والے کو اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ”ثورۃ اسلامیہ، لاشیعیت و لاسنیہ“ کا نعرہ اور اس طرح کی باتیں اور اعلانات و بیانات صرف تقیہ اور فریب ہیں۔“

تو یہ اس مطالعہ کے پیدا کردہ یقین تھے، جن کے ماتحت ایرانی انقلاب کا اصل نشانہ حرمین شریفین

ٹھہرتے تھے۔ اور یہ چیز کسی بھی صحیح العقیدہ کو تشکر کرنے کے لئے کافی تھی چہ جائیکہ کوئی ایسی شخصیت جو اپنے دینی منصب کی بنا پر اپنے کو ذمہ دار سمجھتی ہو کہ اس سے جو کچھ بھی اس خطرہ کے مقابلہ میں ممکن ہو وہ کرے۔ آپ کیلئے رابطہ عالم اسلامی کی اساسی رکنیت کی بنا پر ایک خاص سطح کے سعودی ذمہ داروں تک اس سلسلہ میں اپنی بات پہنچانا ممکن تھا۔ پس طبیعت بخین ہوئی کہ یہ کام کیا جائے۔ اور اللہ نے کرا دیا۔ اس کے آگے ان ذمہ داروں کا کام تھا۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ

مکہ مکرمہ کا قیام پورا ہوا، اب اگلی منزل مدینہ منورہ تھی۔ اس کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

”مکہ مکرمہ کے پورے آٹھ دن کے اس قیام میں مدرسہ صولتیہ حاضری نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ اس کا حق اور اپنا فرض تھا۔ وہ مکہ مکرمہ میں ہمارے بزرگوں کی خاص یادگار ہے، اس میں ہمارے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کا قیام رہا اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نور اللہ مرقدہ تو گویا اس کے بانی ہیں۔ مدرسہ کے موجودہ مہتمم مولانا محمد شمیم صاحب اور بعض اساتذہ کرام برابر تشریف لاتے رہے۔ طے کیا گیا کہ جب مکہ مکرمہ سے روانگی ہوگی تو پہلے کچھ دیر صولتیہ میں قیام رہے، ایسا ہی کیا گیا۔ بھائی مولانا محمد شمیم صاحب کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی، ہم بھائی سعدی اور ان کے مکان سے رخصت ہو کر پہلے صولتیہ آئے یہاں دفتر ہی میں مدرسہ کے حضرات اساتذہ بھی جمع ہو گئے تھے۔ کچھ پرانی یادیں آئیں اور ان سے دل بہت متاثر ہوا، آخر میں بھائی مولانا محمد شمیم صاحب کی فرمائش پر کچھ کلمات عرض کر کے گفتگو دعا پر ختم کی اور وہاں سے رخصت ہو کر ہم لوگ جدہ کے لئے روانہ ہو گئے، مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین اور وہاں کی ہواؤں اور فضاؤں کو الوداع کہا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد!

”مکہ مکرمہ سے رخصت ہو کر ہم لوگ جدہ اپنے مستقل میزبان نور ولی برادران کے یہاں پہنچے، وہیں مولانا علی میاں بھی مقیم تھے، جو ایک دن پہلے مکہ مکرمہ سے تشریف لے آئے تھے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جدہ ہی میں مقیم ہمارے ڈاکٹر اشرف صاحب نے وہاں کے بڑے طبی مرکز میں میرے طبی معائنہ کے لئے کچھ ڈاکٹروں سے وقت لے رکھا ہے۔ اور وہ یہی وقت ہے۔ یہ ڈاکٹر اشرف صاحب امراتوی (سابق برادر اور اب مہاراشٹر) کے ایک نہایت باتوینق خاندان کے فرد ہیں جسے ہم دونوں (رفیق محترم مولانا علی میاں اور اس عاجز) سے محض لوجہ اللہ اور

خالص دینی رشتہ سے تعلق خاطر ہے جو ہم لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں میں سے ہے۔
 ڈاکٹر اشرف صاحب ہماری قیام گاہ ہی پر ہمارے انتظار میں تھے، جیسے ہی ہم پہنچے وہ ہمیں
 طبی مرکز لے گئے (وہ خود بھی بحیثیت ڈاکٹر اسی طبی مرکز سے وابستہ رہ چکے ہیں) ہمارے یہ ڈاکٹر
 اشرف صاحب خود تو مولویانہ شکل و صورت میں تھے ہی، امراض قلب کے ماہر جن ڈاکٹر
 صاحب کو میرا معائنہ کرنا تھا ماشاء اللہ وہ بھی اسی وضع قطع میں تھے، جو بھلہ تعالیٰ ان شعبوں میں
 اب اتنی اجنبی اور نایاب نہیں رہی ہے جتنی کچھ مدت پہلے تک تھی، تاہم اب بھی کیا بضرور ہے
 انھوں نے جدید ترین آلات اور مشینوں کے ذریعہ سے بڑی تفصیل سے میرا معائنہ کیا، اس طبی
 مرکز سے تعلق رکھنے والے کچھ دوسرے ڈاکٹر صاحبان بھی اس معائنہ میں اور ان جانچوں میں
 شریک رہے۔ ان ڈاکٹروں نے میرے دل کی حالت کو قابل اطمینان بتلایا، کچھ دوائیں تجویز
 کیں۔ کیا عجب ہے کہ اس معائنہ سے حکمت الہی کو یہ یاد دہانی بھی اس عاجز کو مقصود ہو کہ تیرے
 دل کی آخری جانچ قبر میں ہوگی، وہاں اگر قلب کو سلیم قرار دیدیا گیا تو پھر کسی قسم کی جسمانی یا
 روحانی تکلیف کبھی لاحق نہ ہوگی، لہذا اس کے علاج اور پرہیز سے کبھی غافل نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس
 کی توفیق عطا فرمائے۔

امراض قلب کے ماہر جن ڈاکٹر صاحب نے میرا معائنہ کیا، ان سے مل کر بلکہ ان کو دیکھ
 کر بڑی خوشی ہوئی، اور اپنے حال پر افسوس ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب طاہر کے نام سے معروف
 ہیں، اپنے ہی سلسلہ کے اہل تعلق میں سے نکلے، حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے سلسلہ سے ان
 کا تعلق ہے، اور محسوس ہوا بلکہ آنکھوں نے دیکھا کہ اس سلسلہ کی خصوصی برکات کے وارث
 ہیں (کثر اللہ اماناً لہم) اسپتال کے کچھ اور ڈاکٹروں اور عملہ کے ارکان سے بھی ان حضرات
 نے ملاقات کرائی، سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور سب کے لئے دعا کی توفیق ملی۔ دو بجے
 دوپہر کے قریب قیام گاہ واپسی ہوئی۔

عصر بعد احباب کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شام کے وقت حضرت مولانا سعید احمد خاں
 صاحب دامت فیوضہم بھی بھائی فضل عظیم کی کے ساتھ تشریف لے آئے، مولانا مدینہ منورہ سے
 عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ آئے تھے، وہیں سے جدہ تشریف لائے، مولانا سے ملاقات اللہ تعالیٰ کے
 انعامات میں سے ہے، ان سے اس عاجز کو محبت ہی نہیں عقیدت بھی ہے، حضرت مولانا
 محمد الیاس نور اللہ مرقدہ کی خصوصیات کا بڑا حصہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو نصیب فرمایا ہے۔ کچھ دیر
 بیٹھ کے اور ہمارے مدینہ منورہ کے سفر کا پروگرام طے کر کے رخصت ہو گئے، یہ بھی طے فرما گئے کہ
 مدینہ منورہ کے ایام قیام میں روزانہ کم از کم رات کے کھانے کا نظم میرے ہی یہاں رہے گا۔

اگلا دن بھی جدہ ہی میں احباب و مخلصین سے ملاقاتوں میں گزرا۔ شام کو ایک دوست نے اپنے مکان پر کچھ مخصوص احباب کو جمع کیا تھا، عصر کی نماز کے بعد وہاں جانا ہوا، کچھ دین کی باتیں کیں، مغرب کے بعد وہیں کھانا بھی کھایا۔

اگلے دن صبح کو مدینہ منورہ کے لئے روانگی کا پروگرام تھا۔ پہلے جدہ سے مکہ مکرمہ بھی بھائی ریاض احمد صاحب لکھنوی ہی نے اپنی گاڑی سے پہنچایا تھا۔ مکہ مکرمہ ہی میں انھوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ جدہ سے مدینہ منورہ بھی وہی اپنی گاڑی سے پہنچائیں گے۔ چنانچہ جمعرات کی صبح ہی وہ گاڑی لیکر قیام گاہ پر آ گئے اور ہمارا چھوٹا سا قافلہ ۸ بجے کے بعد مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

جدہ سے مدینہ منورہ تک اب جو نئی عظیم الشان شاہراہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہے جس سے کار کے ذریعہ جدہ کی حدود سے نکل کر صرف تین گھنٹے میں مدینہ منورہ پہنچا جاسکتا ہے جس کا نام 'الطریق السریع' ہے اور جو نہایت ہموار اور شیشہ کی طرح صاف شفاف ہے، ہماری گاڑی اس سڑک پر رتی رتی رفتار سے جا رہی تھی اور مجھے ۳۶ سال پہلے ۴۹ھ کا جدہ سے مدینہ منورہ کا اپنا پہلا سفر یاد آ رہا تھا جب کہ مکہ مکرمہ یا جدہ سے مدینہ منورہ جانے کے لئے کسی سڑک کا نام و نشان نہ تھا۔ راستہ کا خاصہ حصہ مسلسل پہاڑیوں میں سے گزر کے طے ہوتا تھا۔ زیادہ تر حاجی معمولی قسم کی لاریوں سے مکہ معظمہ سے جدہ ہو کر مدینہ منورہ جاتے تھے۔ سخت گرم موسم (سنبلی) میں حاجیوں کی لاریاں صرف صبح یا شام کے ٹھنڈے وقت میں چلتی تھیں۔ اور اس سے پہلے یہ سفر اونٹوں سے ہوتا تھا۔

اللہ اللہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا رخ کتنا بدل گیا، حقیقت یہ ہے کہ قوموں اور علاقوں کے حالات کی جن تبدیلیوں کو ہم اپنی محدود اور ظاہری عقل و نگاہ سے بہت مشکل اور صدیوں کا عمل سمجھتے ہیں وہ مشیت الہی کے ایک اشارہ پر چشم زدوں میں واقع ہو سکتی ہیں اور ہر طرف ہو رہی ہیں۔ اس دنیا میں اور ساری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اور ہوتا نظر آ رہا ہے اگرچہ حکمت الہی سے اسباب کے پردہ میں ہو رہا ہے لیکن فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے نیکوئی حکم سے ہو رہا ہے اور سب کچھ اسی کا نظر نہ آنے والا دستِ قدرت کر رہا ہے۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب مدینہ منورہ کے آثار نظر آنے لگے ایک بجے کے قریب مدینہ منورہ میں داخل ہوئے پروگرام کے مطابق سیدھے حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب کی قیام گاہ (مسجد عمار بن یاسرؓ) پہنچے، نماز ظہر ادا کی، مولانا کے ساتھ کھانا کھایا۔ عصر کے بعد مولانا

نے چائے پلائی اور ہم لوگ اپنی قیام گاہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ نور دلی برادران ہی نے مدینہ منورہ میں بھی اپنی ایک عمارت کے ایک حصہ میں پہلے ہی سے میرے قیام کا بندوبست کر رکھا تھا، وہاں لوگوں کے لئے آنا بھی آسان تھا۔ اور مسجد شریف بھی وہاں سے نسبتاً قریب تھی۔ اس کے قریب ہی ایک دوسرے مکان میں رفیق محترم مولانا علی میاں کا قیام تھا۔ وہاں پہنچے تو بہت سے احباب منتظر تھے۔

مغرب کی نماز وہیں ادا کی، پھر تیار ہو کر مسجد نبوی کی حاضری کی نیت سے نکلے، باب رحمت تک پہنچے تھے کہ عشاء کی اذان ہو گئی، مجمع کی کثرت اور ہجوم اور اپنی معذوری کی وجہ سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں باب رحمت ہی پر کھڑا ہو گیا، یہ جگہ بھی مسجد شریف کے توسیعی پروگرام کے ماتحت مسجد میں شامل کر لی گئی ہے۔ ہر نماز کی جماعت کے وقت یہاں بھی نمازیوں کی صفیں ہوتی ہیں۔ میں نے یہیں نماز ادا کی، وہیں سے صلوٰۃ و سلام عرض کر کے نماز کے بعد واپس اپنی کرسی پر بیٹھ کر سڑک تک اور وہاں سے موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیام گاہ واپس آ گیا۔ دل و دماغ کا عجب حال تھا۔

رات کا کھانا حسب وعدہ حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب لے کر خود تشریف لے آئے۔ کھانے کے ساتھ صبح کے ناشتہ کے لئے بھی بہت سی نعمتیں مولانا لے آئے تھے۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحب مہاجر کی ٹیم مدنی کو مہاجرین کی ہجرت اور انصار کی نصرت دونوں کا جو حصہ ملا ہوا ہے وہ بھی مجھ جیسوں کے لئے ہمیشہ سے قابلِ صدر رشک ہے، اور اب تو ہر لمحہ اس وصف میں ترقیات کا زامانہ ہے۔ بڑا ذاتقہ اس کھانے میں آیا۔ مولانا کھانا کھلا کر رخصت ہوئے اور میں اپنے رب کریم کے احسانات کا دھیان اور حسبِ توفیق شکر ادا کرتے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ الحمد للہ عافیت کے ساتھ صبح نصیب ہوئی۔ اللّٰهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيُ وَنَمُوتُ وَإِلَيْكَ النُّشُورُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔

نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا، طے کیا تھا کہ صلوٰۃ و سلام کے لئے روضہ اقدس پر حاضری صبح آٹھ بجے کے بعد ہوگی اس وقت ہجوم نسبتاً کم ہوتا ہے۔ چنانچہ قریباً ساڑھے آٹھ بجے کلنا ہوا۔ باب السلام تک تو موٹر ہی نے پہنچا دیا وہاں سے مولوی زکریا سلمی اللہ تعالیٰ کا سہارا لیکر آہستہ آہستہ اپنی بیمار روح اور ناتواں جسم کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ پہلے روضہ الجنۃ میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا کی، اپنے رب کریم کا شکر ادا کیا، گناہوں کی مغفرت و معافی کی بھیک مانگی، اور پھر مولوی زکریا ہی کے سہارے روضہ مبارکہ پر حاضری اور صلوٰۃ و سلام کے قصد سے اس طرف کو چلا، عشاق کا ہجوم اس وقت بھی اچھا خاصا تھا لیکن میرے رب کریم نے مواجہہ شریف پر متعین

شریطوں (سپاہیوں) اور زائرین کے دل میں ڈالا کہ اس بوڑھے معذور کو اطمینان سے صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کا موقع دیدیا جائے۔ الحمد للہ مواجہہ شریف میں باطمینان کھڑے ہونا تو نصیب ہو گیا، لیکن اپنے حال اور نصیحتات کے خیال اور اس بارگاہ عالی کے رعب سے دل و دماغ کی حالت ایسی ہو گئی کہ کھڑا پڑنا سب غائب ہو گیا، بس صلوٰۃ سلام ہی عرض کیا جاسکا۔ پھر آگے بڑھ کے شیخین حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں بھی سلام عرض کیا، بعد ازاں اقدام عالیہ کی طرف آگے دو رکعت نماز پڑھ کے دعا کی، یک گونہ اطمینان دل کو ہوا، شکر و استغفار کے ساتھ مسجد سے باہر نکلا اور قیام گاہ واپس آگیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جمعہ کی نماز کے لئے حاضری نصیب ہوئی۔ دس سال کے بعد مسجد نبوی کے منبر سے خطبہ سنا۔

مدینہ منورہ میں کسی جلسہ وغیرہ میں جانے کا مسئلہ تو تھا ہی نہیں، اس لئے بس اپنے ذوق کے مطابق ہی وقت گزرا۔ معمول اس طرح رہتا کہ صبح اول وقت نماز فجر سے فارغ ہو کر چائے پی لیتے، روزانہ یہ چائے مدینہ منورہ کے ایک بزرگ اور ہمارے پرانے کرم فرما صوفی اسلم صاحب بھیجتے تھے ان کے رفیق حافظ منظور اختر صاحب فجر سے پہلے ہی دو تھرماس، چائے اور دودھ سے لبریز، اور کچھ بسکٹ بکھن وغیرہ لے آتے تھے، نماز سے فارغ ہوتے ہی صوفی اسلم صاحب کی بھیجی ہوئی چائے پیتے، کسی دن اسی کے ساتھ اور کسی دن تھوڑی دیر کے بعد مولوی محمد زکریا اور سجاد ناشتہ کا بھی انتظام کر لیتے، ناشتہ میں وہی چیزیں ہوتیں جو حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب مدظلہ دے گئے ہوتے۔ اس وقت احباب و مخلصین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ خالص لٹری اور دینی تعلق والوں کی باہمی ملاقات اللہ کی عظیم نعمت ہے اور اس سے اجر و ثواب کے ساتھ جو روحانی اور قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے وہ اس دنیا میں جنت کی لذت ہے۔

جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان کی بہت لمبی فہرست ہے، سب کی ملاقات سے دل خوش ہوا، خاص کر مولانا عاشق الہی صاحب بلند شہری جو بڑے صاحب علم اور علمائے ربانین میں سے ہیں۔ مولانا عبدالملک صاحب مراد آبادی، مولانا آفتاب عالم صاحب خلف الرشید حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، صوفی اسلم صاحب، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے چھوٹے صاحبزادے مولوی عطاء الہیمن صاحب، عالم عربی میں مشہور و معروف عالم و مصنف شیخ محمد الجذبہ اور ان کے ساتھ آنے والے دیگر شامی علماء و نو جوان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مدینہ منورہ میں دو مہاجر بزرگ اور تھے جن کی زیارت و ملاقات ضروری تھی، حضرت مولانا قاری عباس بخاری اور حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب چنانچہ ان دونوں حضرات کی زیارت کے لئے میں ایک دن ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا، دونوں حضرات ایک ہی رباط کے دو الگ الگ حصوں میں مقیم ہیں۔ ان دونوں حضرات کی ملاقات اس سفر کی خاص برکات میں سے

ہے۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب کئی سال سے فالج زدہ ہیں، آنکھیں بھی اپنا کام نہیں کرتی ہیں، لیکن ذکر و تلاوت اور نماز سے ان کو ایسا شغف ان کو نصیب ہے جس کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس حالت کے باوجود نماز کے لئے مسجد تشریف لاتے ہیں، اس طرح کہ ان کا خادم انہیں گود میں اٹھا کر پیہوں والی کرسی پر بٹھا دیتا ہے، پھر کرسی سے اٹھا کر مسجد میں لا کر بٹھا دیتا ہے۔ ان کو دیکھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے، جو چند لمحات ان کی خدمت میں گزرے ان شاء اللہ اس کی برکتیں آخرت میں ظاہر ہوں گی، ان دونوں حضرات سے خصوصیت کے ساتھ میں نے ایرانی خطرہ اور اس کے دور رس نتائج کا ذکر کیا اور دعاؤں کے اہتمام کی گزارش کی۔

مدینہ منورہ میں پورے ایک ہفتہ قیام کی سعادت نصیب ہوئی، موسم خلاف توقع نہایت خوشگوار تھا، اگرچہ جنوری کا وسط تھا جو شدید ترین سردی کا موسم ہوتا ہے لیکن ان دنوں وہاں ہلکی سردی تھی، طبیعت بھی الحمد للہ بہت اچھی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہفتہ گزر گیا پروگرام کے مطابق جمعرات کی صبح واپسی تھی، چہار شنبہ کی نمازِ عشاء کے بعد امام صاحب کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کل صبح اشراق کے بعد نماز استسقاء ہوگی چنانچہ بعد فجر مصلیٰ ہم لوگ مسجد شریف حاضر ہو گئے، قد میں شریفین میں جگہ مل گئی پہلے تحیۃ المسجد پڑھی اس کے بعد جب نماز استسقاء ہوئی تو اس میں شرکت کی سعادت و برکت حاصل کی۔ نماز استسقاء کے بعد جب ہجوم چھٹ گیا تو قد میں شریفین ہی کی طرف سے الوداعی صلوٰۃ و سلام عرض کیا، دعا کی اور مسجد شریف سے رخصت ہوئے۔

یہ طے ہو چکا تھا کہ جدہ کے لئے واپسی شمعون میاں سلمہ کی گاڑی سے ہوگی چنانچہ وہ گاڑی لے آئے اور ہم جدہ کے لئے چلے گئے۔ مدینہ سے جدہ جانے والی نئی شاہراہ مسجد قبا کے قریب ہی سے گزرتی ہے طے کیا کہ مسجد قبا میں دو رکعت نماز ادا کر کے آگے چلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی توفیق عطا فرمائی اور اس کے بعد ہم لوگ جدہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

”مدینہ منورہ میں جن جن حضرات نے عنایتیں کیں، میزبانی کی، یا جن کے ذریعہ میزبانی کرائی گئی، اللہ تعالیٰ ان سب ہی کو اپنی شانِ عالی کے مطابق جزا عطا فرمائے۔“

اس محسن کریم کے قربان جانیے

احسان جس کا صورت احسان میں نہ تھا

جمعرات کی دوپہر جدہ، اپنی قیام گاہ بیت نور ولی برادران، الحمد للہ بعافیت پہنچ گئے، اگلی صبح بچے ہوئی اڈہ کے لئے روانہ ہوئے۔ حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب دامت برکاتہم ایک دن پہلے مکہ مکرمہ آ گئے تھے وہ بھی ہمراہ ہوئی اڈہ تشریف لائے اور بھی بہت سے احباب تھے۔ واپسی کا سفر بھرا اللہ بہت ہی سہولت و عافیت سے گزرا۔ شام ۶ بجے کے بعد جہاز بمبئی اتر۔ یہاں بھی جہاز میں جانے اور اس سے باہر آنے کا وہ جدید انتظام تھا جو جدہ اور ریاض میں

زیادہ ترقی یافتہ شکل میں دیکھا، اس لئے سیڑھی سے اترنے کی زحمت سے بچ گیا۔

بہمنی کے ہوائی اڈہ پر بہت سے احباب و مخلصین آگئے تھے، سب کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ دودن بہمنی میں گزرے۔ بہمنی میں میرا یہ آنا دس سال بعد ہوا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہمنی میں مخلصین کی بڑی تعداد ہے، اس عاجز کو ان سے مل کر اور ان کو مجھ سے مل کر جوقلبی اور روحانی مسرت ہوئی اس کا الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے۔ دوستوں کی خواہش تھی کہ قیام کچھ زیادہ ہو، لیکن اس کی گنجائش نہ میرے لئے تھی نہ میرے دونوں رفیقوں کے لئے، اس لئے بس دودن قیام کر کے تیسرے دن دوشنبہ کو دہلی روانہ ہو گئے۔

”صحت کے حال میں انحطاط جدہ سے روانہ ہونے سے ذرا پہلے شروع ہو گیا تھا، بہمنی کے دو روزہ قیام میں یہ انحطاط تیزی سے جاری رہا اور لکھنؤ پہنچتے پہنچتے وہ سب شکایات اور عوارض واپس آگئے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس پورے سفر میں محفوظ رکھا تھا۔ بندہ عافیت ہی کا طالب و سائل ہے، اسی کے ساتھ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مشیت پر راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

۲۱ جنوری بروز دوشنبہ بہمنی سے ایرانڈیا کے جہاز سے دوپہر ایک بجے روانہ ہو کر تین بجے کے قریب ہم لوگ دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گئے۔ ہوائی اڈے سے سیدھے بھائی کرامت صاحب کے یہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر آرام کر کے رات ہی کی ٹرین سے لکھنؤ کیلئے روانگی کا ارادہ تھا۔

”رات ساڑھے نو بجے دہلی لکھنؤ میل سے روانہ ہو کر ۲۲ کی صبح لکھنؤ پہنچ گئے۔ اور اس طرح یہ سفر تمام ہوا جس میں اس عاجز و گنہگار بندے نے اپنے مالک کی قدرت و رحمت کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اللہ تعالیٰ کو تا ہیوں کو معاف فرمائے۔، اس سفر کے ایک ایک قدم کو قبول فرمائے اور جن جن بزرگوں عزیزوں کی کوششیں، عنایات اور دعائیں اس سفر میں ہمارے ساتھ رہیں ان کو اپنی شانِ عالی کے مطابق جزا عطا فرمائے۔“

گیارہواں باب

(ملفوظات، مکتوبات اور خطابات)

[آپ کی افادی زندگی (یا کہئے دین و ملت کی خدمات والی زندگی) کے تقریباً سب ہی پہلو بیان میں آچکے، باقی جو کچھ ہے اس کی تکمیل انشاء اللہ اس باب کے مندرجات سے ہو جائے گی۔ اس باب کے تحت ملفوظات و مکتوبات کی سیر تو قارئین کا فی تفصیل سے کر سکتے ہیں، پر خطابات میں ایک دو ہی پر قناعت ناگزیر ہے، ورنہ وہ بجائے خود ایک کتاب بن جائے گی۔]

ملفوظات

عزیزی مولوی یحییٰ نعمانی کا مضمون جس کا اوپر ذکر آیا اس میں چند بڑے قیمتی علمی نوعیت کے ملفوظ

ملتے ہیں:

۱۔ فرمایا کرتے تھے: ”اللہ تعالیٰ نے علم حدیث میں فتنوں اور فکری انحراف سے محفوظ رکھنے کی خاص تاثیر رکھی ہے۔ ہر زمانے کے مخصوص سیاسی و اجتماعی حالات نے امت مسلمہ کے لئے متعدد فتنے کھڑے کئے۔ بسا اوقات ان فتنوں کے سیلاب میں بہہ جانے سے جو لوگ بچ رہے وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لیکن بحیثیت مجموعی امت کو انحراف سے بچانے والی چیز علم حدیث ہی ثابت ہوا۔“

۲۔ ”علم حدیث کا مطالعہ صرف فقہی، کلامی مسائل کے تناظر میں کرنا خود علم حدیث کے ساتھ بڑی نا انصافی ہے، جس سے ایک طرف سنت رسول کی اصل روشن و دیدہ زیب تصویر سامنے نہیں آتی، دوسری طرف خود امت کے لئے علم حدیث بہت محدود ہو جاتا ہے۔ (آپ کے نزدیک) یہ مسائل سنت نبویہ کے مشتملات کا ایک حصہ ہیں اور یقیناً وہ ان میں بھی رہنما ہے۔ مگر اس کا اصل حصہ وہ محکمات ہیں جن میں امت میں کوئی اختلاف نہیں، اور وہی سنت نبویہ کا اصل پیغام ہیں۔ اور اس میں ساری امت کے لئے رہنمائی اور

معرفتِ خداوندی کے بے شمار خزانے ہیں۔“

۳۔ ایک مرتبہ اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ ”اصولِ تفسیر میں اسلامی مکتبہ میں بڑا خلا ہے۔ چند نقوشِ اولیس قسم کی چیزوں کے علاوہ اس موضوع پر کوئی چیز نہیں ملتی۔“ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں آپ شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر کے مداح تھے۔

۴۔ ایک ملفوظ ایک واقعہ کے ضمن کا ہے اور شخصیت کے اُس پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو ایرانی انقلاب کے حوالہ سے سامنے آیا تھا، یعنی ایمانی حمیت وغیرت۔

دلی کے ایک امام صاحب کی کھڑی کی ہوئی ایک فتنہ انگیز تحریک ”ائمہ مساجد کی ملازمتوں کو سرکاری ملازمتیں بنوانے کے لئے“ کافی دن سے چلی ہوئی ہے۔ گورنمنٹ کے لئے دستورِ ہند کی رو سے یہ بات اگرچہ آسان نہیں، تاہم اسے پورا موقع دیتی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کے اہم ترین اور قدیم ترین مرکز (مساجد) میں اثر انداز ہو جائے۔ اور اس کے بُرے اثرات؟ ----- الاماں! یہ صاحب ایک دن آپ کے پاس تشریف لائے، کہ آپ کی ہمدردی ممکن ہو تو حاصل کریں، اور اپنی ”عظیم ائمہ“ نامی تحریک کا ذکر شروع کیا۔ آپ نے پہلے تو برداشت سے کام لیتے ہوئے اس کے مضمر پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی۔ مگر جب وہ نہیں سمجھے اور مزید بات کرنے کی کوشش کی تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور بلند آواز سے کہا ”بھائی میں یہ سننے کی سکت نہیں رکھتا۔ خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے۔“ انھوں نے پھر بھی کچھ کہنا چاہا، تو فرمایا کہ ”میں کچھ نہیں سن سکتا۔ بس اب آپ چلے جائیں۔“

[تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان حافظِ سیح اللہ صاحب مرحوم دفتر الفرقان لکھنؤ سے وابستہ تھے۔ تبلیغی سفر میں ساتھ جانے کا موقع ملا تو آپ کی باتوں کو نوٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کسی موقع کی بات کو محفوظ کرنے کے قابل سمجھتے تو نوٹ کر لیتے۔ آپ کی وفات پر نکلنے والے خاص نمبر کے لئے موصوف نے اپنے کچھ نوٹس دیئے۔ ذیل میں ان میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ افسوس حافظ صاحب اس سوانح کی ترتیب ہی کے دوران میں انتقال کر گئے۔ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَهُ، بڑی خوبیوں کے تھے اور ہم لوگوں سے دلی محبت رکھنے والے]

۱۔ ایک مرتبہ ٹرین کے سفر میں ایک پنڈت جی کا ساتھ ہو گیا جو کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے، اردو فارسی سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ ایک سوال ہم کئی لوگوں سے کر چکے ہیں مگر کسی نے اطمینان بخش جواب نہیں دیا وہ یہ کہ خدا کو آپ بھی مانتے ہیں ہم بھی مانتے ہیں۔ پھر آپ اپنے کو

مسلمان اور ہم کو کافر کیوں کہتے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ صرف ’کو‘ اور ’کی‘ کا فرق ہے۔ ہم خدا کو بھی مانتے ہیں اور خدا کی بھی مانتے ہیں، اس لئے ہم مسلمان ہیں، آپ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدا ”کی“ نہیں مانتے۔ پنڈت جی نے کہا: مولانا صاحب آپ نے بہت مختصر جواب سے مسئلہ حل کر دیا۔ ورنہ ہم بہت لوگوں سے یہ سوال کر چکے تھے۔ سب نے بڑے تفصیلی جوابات دئے مگر کوئی مطمئن نہیں کر سکا۔

۲۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ”گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حیوانی اور دوسرا شیطانی۔ لوگ حیوانی گناہ کو برا سمجھتے ہیں، حالانکہ شیطانی گناہ زیادہ برا ہوتا ہے۔ چوری، ظلم اور زنا وغیرہ حیوانی گناہ ہیں۔ اور بہتان، غیبت، کبر وغیرہ شیطانی گناہ ہیں۔“

۳۔ مرکز کے قیام کے زمانہ میں نماز جماعت کی امامت مولانا ہی فرماتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ نیت باندھنے کے بعد توڑ دیتے۔ اور دوبارہ نیت باندھتے۔ بعض لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ بغیر استحضار کے نیت باندھ لی تھی۔ نیت باندھنے سے پہلے استحضار (یعنی ذہن کا پوری طرح حاضر ہونا کہ کیا کر رہا ہوں) ضروری ہے۔

آپ کے مسترشدین میں بیلگام (کرناٹک) کے قطب الدین ملا صاحب ہی، راقم کے خیال میں، وہ واحد مسترشد ہیں کہ حلقۃ الفرقان کی کم از کم اکثریت کو تو انہی کی بدولت علم ہوا ہو گا کہ آپ بیعت بھی کر لیتے تھے۔ موصوف بیعت کے بعد سے کافی خط و کتابت کرتے رہے تھے۔ چند سال پہلے اسی خط و کتابت میں سے آپ نے ملفوظات و ارشادات کی نوعیت کے حصے نکال کر اشاعت عام کے لئے ترتیب دئے اور وہ الفرقان میں شائع ہوئے۔ ذیل میں یہاں انہی میں سے کچھ درج کئے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ملا صاحب تبلیغی جدوجہد سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ تبلیغی مخلصین کو بشارت!

”امت کا اجتماعی حال بہت ہی تشویشناک ہے۔ امتوں اور قوموں کے ساتھ اللہ کا معاملہ افراد کے احوال کی بنیاد پر نہیں ہوتا، اجتماعی حال کی بنیاد پر ہوتا ہے، ہاں عام فساد کے وقت میں جو لوگ ایمانی حد تک صلاح کے پابند رہیں ان کے درجات بہت بلند ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے امتیوں کو خوشخبری دی ہے۔

”الحمد للہ دل اس پر بالکل مطمئن ہے کہ تبلیغ کے نام سے جو مخلصین دین کی محنت اپنے لئے اور کسی درجہ میں دوسروں کے لئے بھی کر رہے ہیں انشاء اللہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس فانی

دنیا میں بھی سکون و عافیت عطا فرمائے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ (مکتوب ۳۰ جون ۱۹۸۱ء)

۲۔ دین کی بات، نیت صحیح کر کے

جب کبھی ایسا موقع ہو کہ دین کی بات کہنے کی ضرورت اور تقاضہ ہو تو نیت صحیح کر کے بات کرنی چاہئے۔ یہ بھی ذکر ہے اور متعدی ذکر ہے۔ بلکہ اجتماعات کے علاوہ بھی اگر کبھی موقع ملے تو اس نیت سے دین کی بات کی جائے کہ شاید اللہ کے کسی بندہ کا دل قبول کر لے اور کیا خبر کہ وہی نجات و مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔ (مکتوب ۳ جولائی ۱۹۷۰ء)

۳۔ رمضان المبارک کی نعمت

”رمضان المبارک نصیب ہونا ایسی ہی نعمت ہے جیسا کہ خانہ کعبہ پر حاضری کی توفیق۔ جمیع امور خیر خاص کر نوافل، تلاوت، دعا اور استغفار کا حسب امکان زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔ دوسروں کو بھی اپنی دعاؤں میں شریک کیا جائے۔ یہ بڑا احسان اور صدقہ ہے مجھ پر بھی یہ احسان کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔“ (مکتوب ۳ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ ستمبر ۱۹۷۷ء)

۴۔ رمضان المبارک کی قدر

”رمضان المبارک کا ایک عشرہ گزر چکا دوسرا شروع ہے۔ یہ توبہ و استغفار اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے تعلق کو صحیح کرنے اور بڑھانے کا خاص موسم ہے۔ اس کے ایک ایک لمحہ کی قدر کی جائے۔ اچھایہ ہے کہ ضروری معاشی مشاغل سے جتنا وقت بچ سکے وہ مسجد میں گزرے، تلاوت ہو، ذکر ہو، نوافل ہوں یا اللہ کے در پر پڑ جانے کی نیت سے خاموش پڑا رہنا ہو۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا دامت برکاتہم کا رسالہ ”فضائل رمضان“ اور میرا رسالہ ”برکات رمضان“ کہیں مل جائے تو اسکا مطالعہ ضرور کیجئے۔“ (مکتوب ۱۱ رمضان دسمبر ۱۹۶۷ء)

۵۔ دعوت و تبلیغ اور اعتکاف

”اگر جماعت میں جانے کے مواقع آپ کو ملتے رہتے ہیں تو اچھایہ کہ یہ وقت اعتکاف میں صرف کیا جائے۔ دعوت کے لئے جس تیاری کی ضرورت ہے، اعتکاف اس کا خاص وسیلہ ہے۔ حضرت مولانا الیاس اس کا بیحد اہتمام فرماتے تھے۔ خود بھی نہایت پابندی سے معمول تھا اور چاہتے تھے کہ تبلیغ سے خصوصی تعلق

رکھنے والے اعتکاف ضرور کیا کریں۔ تبلیغ کے ساتھ ذکر و فکر اور خلوت مع اللہ کا اہتمام کم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ خطرہ کی بات ہے تبلیغ کے دو بازو ہیں۔ ایک عوام میں جدوجہد اور محنت۔ اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے خاص الخاص رابطہ۔ ان دونوں میں توازن ضروری ہے۔ دوستوں کو چاہئے کہ وہ اعتکاف اور تبلیغ و دعوت کے تعلق کو سمجھیں یہ لازم و ملزوم ہیں۔ (مکتوب ۲۴-۰۹-۱۹۷۷ء)

۶۔ نفلی اعتکاف کا طریقہ

”ایک دن کے نفلی اعتکاف کی ایک شکل یہ ہے کہ مثلاً جمعرات کو غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں بہ نیت اعتکاف داخل ہوں اور جمعہ کی مغرب تک معکف رہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جمعہ کی شب میں صبح صادق سے پہلے مسجد میں داخل ہوں اور اس دن مغرب تک معکف رہیں اور جمعہ کا روزہ ہو۔“ (مکتوب ۲۶-۱-۱۹۸۰ء)

۷۔ شکستہ دلی بڑی نعمت ہے

بندوں کے حالات میں مدوجزر رہتا رہتا ہے اور اس میں بلاشبہ خیر ہے۔ غفلت و تقصیر کے احساس سے جو شکستہ دلی اور ندامت و انابت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بڑی نعمت ہے (مکتوب ۲-۲-۱۹۷۸ء)۔

۸۔ عمل کو قابل قبول بنانے کا طریقہ

اپنے عمل کو بارگاہ الہی کے لائق نہ سمجھنا اور اس پر رونا اور استغفار کے ذریعہ تلافی کی کوشش کرنا، ناقص عمل کو بھی قابل قبول بنا دیتا ہے (۲۱ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ)

۹۔ خود کو دوسروں سے بہتر نہ جانئے

غفلت پیدا کرنے والی صحبتیں بہت مضر ہیں۔ جتنا پرہیز کیا جاسکے کیا جائے۔ لیکن اپنے کے دوسروں سے بہتر ہونے کے دوسرے سے بھی بچا جائے (مکتوب ۱۱ رمضان دسمبر ۱۹۷۷ء)

۱۰۔ آزمائش بھی نعمت ہے

غم اور فکر و پریشانی تو انبیاء علیہم السلام کو بھی لاحق ہوتی ہے۔ اور اس حیثیت سے اللہ کی نعمت ہے کہ اس کی وجہ سے اپنی عبدیت اور عاجزی کا احساس ہوتا ہے اور توجہ الی اللہ زیادہ نصیب ہوتی ہے۔ حدیث

شریف میں ہے کہ جب حضور کو کوئی خاص پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز میں لگ جاتے تھے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ایسے حال میں زبان مبارک پر یہ دعا زیادہ تر جاری رہتی تھی **يَا حَسْبِي يَا قُيُومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ**۔ ایسے ہی اوقات میں بندہ کی روح اور اس کی زبان پکارتی ہے۔ **اَللّٰهُمَّ لَا مَلْجَا وَلَا مُنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ**۔ (مکتوب الاذی الحجہ ۱۳۹ھ نومبر ۱۹۷۷ء)

۱۱۔ ابتلاء و آزمائش اور اہل ایمان

اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عجیب معاملات ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن سے اوجھل نہ ہو کہ وہ ارحم الراحمین اور رؤف بالعباد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ایمان نصیب فرمایا ہے، اپنا خوف اور اپنی محبت کے کچھ ذرات بھی عطا فرمائے ہیں، کچھ اعمالِ صالحہ کی توفیق بھی ملتی ہے، اپنے کدور کے فقیروں اور منگتاؤں میں بھی شامل فرمایا ہے تو اس کی رحمت سے یقین رکھنا چاہیے کہ ہر بلا اور ہر آزمائش بھی فی الحقیقت رحمت ہی ہے۔ جیسے کہ کڑی دوا اور بڑے بڑے آپریشن صحت کیلئے ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے **اشد الباس بلاء الانبياء**، ثم الامثل فالامثل (سب سے زیادہ آزمائش انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ ان کے بعد درجہ بدرجہ اچھے صالح بندوں پر) ہم آپ بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔ صبح بعد نماز فجر اور شام کو بعد نماز مغرب سورہ توبہ کا آخری جز **حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلَهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ** سات بار اول آخر درود شریف ۳ بار اور رات کو سوتے وقت (اپنے عام معمول کے علاوہ) اول آخر تین بار درود شریف اور گیارہ بار **اَقُوْضُ اِلٰی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ** اور ۳ بار **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ** کے ساتھ **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ** اور **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ** (یعنی دونوں سورتیں) اور مختلف اوقات میں جب خیال آجائے اور جب دل چاہے یا حفیظ یا حافظ یا حسبی یا قیوم برحمتک استغیث (مکتوب ۵-۴-۱۹۸۱ء)

آخر میں ایک ملفوظ، الفرقان بابت ماہ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ سے

آپ کی پہلی الہیہ (راقم کی والدہ ماجدہ) مرض الوفات سے چند ماہ پہلے ایسی بیمار ہوئیں کہ انھیں امید زیت نہ رہی، قدرتی طور پر اپنے بچے چھوڑ جانے کی فکر انھیں ستانے لگی۔ اس صورتِ حال کا حوالہ دے کر حضرت والد صاحب تحریر فرماتے ہیں: میں دیکھتا تھا کہ ایسی حالت میں رجوع الی اللہ اور اعراض عن

الدنیا کی جو کیفیت ہونی چاہئے اور جس طرح ہمہ تن موت کی تیاری میں لگ جانا چاہئے وہ حالت ان کی نہیں ہے، بلکہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ بچوں وغیرہ کے خیال سے موت سے کچھ گھبراتے ہیں، میں نے اس کیفیت کو بار بار محسوس کیا اور دور دور کے اشاروں کنایوں سے ان کو متنبہ کرنا چاہا مگر ان کو تنبیہ نہ ہوا اور بیماری کی اس حالت میں صاف صاف کہنا میں نے مناسب نہ سمجھا لیکن مجھے اس کی بے فکر رہی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی مناسب وقت پر ان شاء اللہ ان کو توجہ دلاؤں گا۔ اللہ کی شان کہ اس بیماری سے ان کو شفا ہوگئی اور میں اپنی بات کو بھول گیا، اب رمضان سے چند روز پہلے میں خود بیمار ہوا تو ایک دن مجھے وہ بات یاد آئی اور میں نے ان سے کہا:

”تمہاری بیماری کے زمانہ میں میں نے یہ کی تمہاری حالت میں محسوس کی تھی۔ آدمی جب بیمار پڑے اور ایسا بیمار کہ موت بظاہر قریب معلوم ہو تو پھر اس کو چاہئے کہ پورے اطمینان کے ساتھ اللہ پاک کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اور تمہارے لئے تو ویسے بھی موت سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، عورتوں کو سب سے زیادہ خیال اپنے بچوں کی ”بربادی“ کا ہوتا ہے سو تمہارے دونوں بچے تمہاری تربیت کی عمر سے نکل چکے ہیں، کتنی ہی اللہ کی بندیاں ہوتی ہیں جو اپنے شیر خوار بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں اللہ پاک ان کی بھی پرورش کا سامان کرتا ہی ہے۔“ میری بات سن کر ان پر بڑا اثر ہوا اور اپنی اُس حالت پر بڑا قلق اور مجھ سے کہا کہ آپ کو یہ بات اس وقت مجھ سے صاف صاف کہہ دینی چاہئے تھی، اگر میں اسی حالت میں مر جاتی تو کیا ہوتا؟“

ملفوظ تو پورا ہو گیا لیکن مفید ہو گا کہ اس بیان کے باقی جملے بھی نقل کر دئے جائیں۔ فرماتے ہیں:

”یہ ساری گفتگو محض اتفاقی طور پر ہوئی، نہ کہنے والے کو وہم و گمان تھا نہ سننے والی کو کہ ابھی ہفتہ عشرہ ہی میں ”وہ وقت“ آنے والا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ دوسری رمضان کو جو اچانک وہ سخت بیمار ہوئیں تو وہ پہلی حالت اب نہ تھی، بلکہ ایک عیادت کرنے والی خاتون سے میری اس گفتگو کا حوالہ دے کر انھوں نے اپنے قلبی اطمینان کا اظہار کیا اور ان کے سامنے میری وہ ساری تقریر دہرائی۔“

(والدہ مرحومہ نے اسی رمضان میں انتقال فرمایا۔ راقم احسان مند ہو گا اگر قارئین کرام والدہ مرحومہ اور حضرت والدہ ماجدہ کے لئے دعائے مغفرت کا احسان فرمائیں)

حکمتِ نصیحت

اد پر حافظ سمیع اللہ صاحب (مرحوم) کے حوالہ سے چند ملفوظ گزرے ہیں۔ انہی کے ضمن میں حافظ صاحب نے نصیحت کا ایک واقعہ بھی درج کیا ہوا تھا، جسے ملفوظ تو نہیں کہا جاسکتا البتہ نصیحت کا جو ایک حکیمانہ

انداز وہ دکھاتا تھا وہ بلاشبہ ایک قیمتی ملفوظ کا درجہ رکھتا ہے:

”ایک مرتبہ میں اپنے تینوں بیٹوں کو لیکر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چھوٹے دونوں کا رجحان دینداری کی طرف تھا بڑے میں اس لحاظ سے کمی تھی۔ میں نے آپ سے پہلے ہی بات کر رکھی تھی کہ ذرا آپ بڑے والے کو نصیحت فرما دیجئے گا۔ مولانا نے بڑے کے بجائے دونوں چھوٹوں کو نصیحت کی۔ حکمت یہ نکلی کہ شیطان ان چھوٹوں کو دینداری کے زعم میں مبتلا نہ کر دے کہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگیں اور کبر میں مبتلا ہو جائیں۔ (نصیحت بہر حال بڑا بھی سن رہا تھا، جو مقصد تھا)

مکتوبات

[شخصیت کو سمجھنے میں مخلوط بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا بھی جاسکتا ہے۔ ضمناً یہاں حضرت صاحب سوانح کی ان تحریری خصوصیات کو بھی سمجھنے اور نوٹ کرنے کا موقع ہے جن کا حوالہ آپ کی تصنیفات کے ذیل میں آیا ہے اور جن سے آپ کو بہ حیثیت مصنف ایک امتیازی مقام اپنے زمانہ میں ملا۔ پھر مختصراً جس مقصد کے لئے لکھا گیا وہ تو ہے ہی، مقصد سے استفادہ کے علاوہ انداز خطاب بھی توجہ طلب چیز ہوتی ہے۔ مخاطب خود ہے بزرگ ہے یا ہمسر نیز معتقد یا مخالف، ہر ایک کے ساتھ گفتگو ایک جدا بیرونی اظہار چاہتی ہے، اس میں ہماری بزرگ نسل کا کیا طور طریقہ تھا، یہ واقفیت بھی ایک علمی سرمایہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اب ان مکاتیب کو آپ مختلف عنوانات کے تحت پڑھئے]

۱۔ علمی افکار و افادات

۱۔ پاکستان اور نفاذ شریعت (مکتوب الیہ نامعلوم، بظاہر کوئی اہم شخصیت)
حضرت معظمی و محترمی دامت فیوضکم و برکاتکم،

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں، گرامی نامہ مورخہ ۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء اب سنے کئی دن پہلے موصول ہو گیا تھا، اس سے پہلے مولانا احمد علی صاحب کے ذریعہ بھی والا نامہ مجھے مل گیا تھا۔ میری بڑی عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے بزرگوں کے عنایت ناموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا، مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے اس والا نامہ میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے اکتوبر میں پاکستان تشریف لیجانے کا ذکر فرمایا گیا تھا اور اس سلسلہ میں دعا کے لئے ارشاد فرمایا گیا تھا۔ اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی فرمائش مجھے بالکل یاد نہیں، اگر بالفرض فرمائش کی گئی ہوتی تب بھی یہ عاجز اس بارہ میں رائے عرض کرنا مناسب نہ سمجھتا۔ اب صفائی کے ساتھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، میں اس بارے میں سخت مایوس ہوں، جس قوم کی نوے (۹۰) فی صدی یا اس سے بھی زیادہ آبادی کی (دینی) حالت وہ ہو جو پاکستان کے موجودہ عام مسلمانوں کی ہے اس میں قانون شریعت کا نفاذ اور اس پر عمل بلاشبہ ایک اچھی اور مبارک آرزو تو ہے لیکن سب سے اللہ یہ نہیں ہے۔ اس

عاجز کے نزدیک صحیح طریقہ کار یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام میں حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، جب بھی قابل لحاظ اکثریت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ چیز پیدا ہو جائے گی تو یہ مبارک آرزو بھی ان شاء اللہ پوری ہو جائے گی۔

حضرت! میں ایسے حال میں ہوں کہ ٹھہر ٹھہر کر بمشکل یہ سطرین لکھا رہا ہوں، اگر میرے لئے آسان ہوتا تو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے اپنی بات عرض کرتا۔ دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس عاجز کو آپ کے حق کے مطابق ہر طرح کی دنیوی و اخروی خیر و فلاح کے لئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔
والسلام بقلم محمد ضیاء الرحمن

۲-۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء (حضرت تھانویؒ کی تالیف ”نشر الطیب“)

(مکتوب الیہ نامعلوم)

مکرمی، سلام مسنون!

میں اس حال میں ہوں کہ آنے والے خطوط پڑھوا کر سنتا ہوں اور جواب بھی دوسروں ہی سے لکھواتا ہوں۔ آپ کا خط مورخہ ۲۸ صفر المظفر ابھی پڑھوا کر سنا اس کے مضمون سے اندازہ ہوا کہ آپ غالباً عالم اور عربی داں ہیں۔

”نشر الطیب“ میں اکیسویں فصل صفحہ ۱۱۵ سے شروع ہوئی ہے۔ اس میں مصنف حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے حضرت مفتی الہی بخش کاندھلویؒ کا پورا رسالہ ”شیم الحبيب“ ترجمہ کے ساتھ نقل فرمادیا ہے جو صفحہ ۱۶۵ پر ختم ہوا ہے۔ آپ نشر الطیب میں اس پورے رسالہ ”شیم الحبيب“ کو پڑھیں اس کے آخر میں ”لمؤلفہ“ کے زیر عنوان جو اشعار ہیں وہ حضرت مفتی الہی بخش صاحب ہی کے ہیں اور رسالہ کا آخری جزء اور گویا اس کا خاتمہ ہیں۔ حضرت مفتی صاحب شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے تلامذہ اور سید احمد شہیدؒ کے مسترشدین میں اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے پیر بھائی اور ان کے ہم مسلک و ہم مشرب ہیں۔

حضرت مفتی الہی بخش صاحبؒ یا حکیم الامت تھانویؒ جیسے سلیم العقیدہ ربانی علماء و مشائخ جب رسول اللہ (ﷺ) سے خطاب کر کے اس طرح کی بات کہیں جیسی ان اشعار میں کہی گئی ہے تو اس کا مطلب وہی ہوگا جو ان کے عقیدہ توحید سے پوری مطابقت رکھتا ہو۔ یہ ایسی کھلی اور بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی سلیم العقل کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ عربی داں اور عالم ہیں اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے میری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں تو آپ کے لئے ان شاء اللہ وہ کافی ہوگا جو لکھایا ہے۔ آپ نے زمانہ طالب علمی میں پڑھا ہوگا کہ اگر ایک ملحد اور دہریہ کہے ”انبت الربیع البقل“ تو اس کا مطلب اس کے عقیدہ کے مطابق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا مؤمن و موحد بندہ یہی جملہ ”انبت الربیع البقل“ بولے تو اس کا مطلب اس کے عقیدہ کے مطابق سمجھا جائیگا۔ آپ کے لئے دین و دنیا کی فلاح کی دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام

۳-۱۸ جولائی ۱۹۹۱ء۔ (حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کا علم)

بنام حکیم ظل الرحمن صاحب۔ دہلی

عزیز مکرم سلمکم اللہ تعالیٰ

سلام و رحمت، آپ کا ملفوف خط کل ملا، بفضلہ تعالیٰ خود ہی پڑھا۔ مولوی سجاد سلمہ نے یاجوج ماجوج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں پہلے سے سن چکا تھا، چونکہ جو کچھ انھوں نے لکھا وہ نئے لوگوں کے لئے نئی سی بات تھی اس لئے اس سے اتفاق نہ کرنا قدرتی بات ہے۔

میں نے نہ اس مسئلہ پر کبھی خود غور کیا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی لیکن اپنے استاذ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے چونکہ خود اس بارے میں سن چکا ہوں اور ان کی چار جلدوں میں مطبوعہ صحیح بخاری کے درس کی تقریر ”فیض الباری“ طبع مصر، میں بھی اس موضوع پر اسی خیال کا اظہار فرمایا گیا ہے جس کا حوالہ بھی مولوی سجاد نے دیا ہے اس لئے مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔ میں حضرت شاہ صاحب کا مقلد نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس دور میں نہ صرف بزرگ صغیر میں بلکہ پورے عالم اسلام میں میری نظر میں قرآن و حدیث کا کوئی عالم اس درجہ کا نہیں ہے اور نہیں تھا۔ اگر کبھی آپ سے ملاقات ہوئی اور آپ نے یاد دلایا تو حضرات الاستاذ کی وسعت علم کے بارے میں زبانی کچھ بتلا سکوں گا۔

آفاقا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دگیری

دعاؤں کا طالب اور دعا گو ہوں۔ والسلام

(۱) غیر عربی داں قارئین یوں سمجھیں کہ پہلی شکل میں اس عربی جملہ کا مفہوم بالکل لفظی ترجمہ والا ہوگا یعنی ”فصل ربیع نے سبزی اٹھائی“ اور دوسری شکل میں ”فصل ربیع میں اللہ کے حکم سے سبزی اُگی“

۴-۲۶ اگست ۱۹۹۰ء (حضرت شاہ اسماعیل شہید کی سوانح)

بنام مولانا نور الحسن راشد صاحب۔ کاندھلہ

برادر عزیز و کرم مولانا نور الحسن راشد صاحب زید مجدہم

سلام و رحمت۔۔۔۔۔ آپ نے اپنے آخری عنایت نامہ میں اطلاع دی تھی کہ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ پر لکھنا شروع کر دیا گیا ہے۔ آپ نے جو ترتیب اس کے لئے تجویز کی ہوگی وہ بہتر ہوگی۔ اس کے باوجود آپ کو اپنا یہ خیال پہونچا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم میں ہے حضرت شہید کی کوئی سوانح حیات سوائے مرزا حیرت مرحوم کی ”حیات طیبہ“ کے نہیں لکھی گئی اور وہ جیسی کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اس کی کوپرا کر دینے پر غور کریں۔ اس میں حضرت شہید اور ان کی تصانیف ”تقویۃ الایمان“ وغیرہ اور ان کے مخالفین، خاص طور پر مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم سے مولانا زید تک کی ”مخالفانہ تحریریں“ اور ان کے جواب میں حضرت شہید کی طرف سے مدافعانہ طور پر جو چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر بھی آجائیگا، کام یقیناً بہت طویل ہے، لیکن امید ہے کہ آپ کے لئے زیادہ مشکل نہ ہوگا اور ایک بہت بڑا قرض جماعت سے اتر جائے گا۔ اور یقین کے ساتھ امید ہے کہ ایک فی سبیل اللہ شہید مظلوم اور حق کی حمایت کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ اپنی شانِ عالی کے مطابق آپ کو عطا فرمائیں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی غالباً لکھ چکا ہوں میری نظر میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس سے اس ضروری کام کے انجام دے سکنے کی امید ہو۔

یقین ہے کہ اگر یہ کام ہو گیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ کتاب بہت مقبول ہوگی۔ اگر زندہ رہا تو ان شاء اللہ اس کی طباعت کے انتظام میں حسبِ توفیق حصہ لے سکوں گا۔

یہ جو کچھ لکھا ہے بس ”إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسٍ يَغْفُوبُ قَضُهَا“ ہے، اسکے سوا کچھ نہیں۔ ہو گا وہی جو اللہ کی مشیت ہوگی، وہی رب کریم اس ضعیف اور عاجز بندہ کو دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔۔۔

والسلام بقلم ضیاء الرحمن محمود

۵-۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء (شیخ محمد ابن عبدالوہاب اور چند دیگر مسائل)

بخدمت جناب عبدالرحمن کوندو۔ سری نگر، کشمیر

مکرمی زید لطفکم، ولیمک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ الفرقان بابت جنوری میں خط و کتابت سے متعلق میری گزارش نظر سے گزری ہوگی (الغنی)

مہدویہ فرقہ، جو اب موجود ہے اس کا غالباً ایک رسالہ ایک دفعہ نظر پڑا تھا۔ اس کے خیالات یقیناً گمراہانہ ہیں۔ اس کے اصل داعی سید محمد جونپوری کی شخصیت اسی زمانہ سے مختلف فیر رہی ہے..... شمالی ہند

لوگوں میں اس طرح کی غلطیاں رہی ہیں جس طرح کی ایک غلطی کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے، جس زمانے میں کام کرنے والوں کی تعداد محدود، چند سو بھی نہیں تھی تو اس طرح کی غلطیوں میں مبتلا بہت کم لوگ نظر آتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کی اصلاح بھی جلد ہو جاتی تھی۔ لیکن اب جب کام کرنے والے صرف ایک ملک ہندوستان میں لاکھوں ہیں تو ایسی غلطیوں میں مبتلا لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس طرح کی غلطیاں ان میں دعوت کے اس کام نے پیدا کی ہیں یا ان کی طبیعت اور مزاج میں اس فساد کا مادہ پہلے سے موجود تھا؟

میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر مطمئن ہوں کہ ہمارے زمانہ کے عام مسلمانوں میں اس طرح کے فساد کا مادہ بہت عام ہے۔ میرے علم میں ہے کہ کام کے مرکز نظام الدین میں ہر علاقہ کے خواص کو چند روز کے لئے بلایا جاتا ہے، ان دنوں میں کام کے اصول اور اس طرح کی غلطیوں کی اصلاح کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جاتی ہے بالخصوص دینی مدارس، علماء و مشائخ اور خانقاہوں کی عظمت دلوں میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مرکز سے اور اجتماعات سے جماعتوں کی روانگی کے وقت جو ہدایات دی جاتی ہیں ان میں بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور دعا میں اہتمام سے یہ جزو شامل رہتا ہے۔ اس کے باوجود، جیسا کہ آپ کا مشاہدہ ہے، کام سے تعلق رکھنے والے عوام میں بہت سوں کے اندر اس طرح کی غلطیاں رہتی ہیں، اور اس عاجز کا خیال ہے کہ جب بھی ایسے عام وسیع پیمانہ پر ایسا کام کیا جائے گا اس میں ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ اس صورت حال میں اس بات کو بہت دخل ہے کہ اس کام کو حضرات علماء بہت کم نصیب ہیں۔ اگر ہر شہر میں ایک دو عالم کام کی ذمہ داری قبول فرمائیں تو اس طرح کی غلطیوں پر انشاء اللہ بہت کچھ قابو پایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ فطری بات ہے کہ کام سے تعلق رکھنے والے عوام اسی عالم دین سے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں جن کو وہ دیکھیں کہ وہ اس راستہ میں جانی اور مالی قربانی دے رہے ہیں اور انھوں نے اپنے کو اس دینی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی (بقلم محمد ضیاء الرحمن قاسمی)

(۱) یہ مکتوب محض ”توازن و اعتدال“ کی مثال کے طور پر درج کیا گیا ہے، تبلیغی جماعت کی وکالت کے لئے نہیں، جو کہ مکتوب کا مقصد تھا۔ یوں بھی یہ ۱۹۸۷ء کی، یعنی آج سے چوتھائی صدی قبل کی بات ہے۔

۲-۱۳ جون ۱۹۸۵ء (ایک اعتراض کا جواب)

بنام عتیق احمد طارق صاحب (مقام محفوظ نہیں)

عزیز مکرم عتیق احمد طارق صاحب، سلام و رحمت

آپ کا پورے پانچ صفحے کا خط ملا۔ آپ کو میرا حال معلوم نہیں اس لئے معذور سمجھتا ہوں۔ آنے والے خطوط اکثر دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں اور جواب لکھانا ضروری ہو تو دوسروں ہی سے جواب لکھواتا ہوں۔

جس مقصد کے لئے آپ نے اتنا طویل خط لکھا اگر سوچتے تو شاید خط لکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، آپ یہ سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے تھے کہ میں نے ”ان صاحب“ کے متعلق جو کچھ لکھا (جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے) وہ اپنے علم کے مطابق لکھا۔ اور آپ نے اس کے خلاف جس کتاب کے حوالوں سے لکھا ہے اس کتاب کے مصنف نے اپنے معلومات کے مطابق لکھا ہے۔ ان صاحب کا جو حقیقی حال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم ہی کے مطابق ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔

اگرچہ بعض ایسے ثقہ لوگوں کے ذریعہ جوان صاحب کے ساتھ آخری زمانہ میں بھی قریبی تعلق رکھتے تھے مجھے اس کے خلاف معلوم ہے جو آپ نے ایک کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے، لیکن مجھے بالکل اصرار نہیں کہ میری معلومات صحیح ہوں بلکہ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے میری معلومات غلط ہوں اور آپ نے جو کچھ ایک کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے وہ صحیح ہو۔۔۔۔۔

.....ماتح ہو

یہ آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔ والسلام

بقلم محمد ضياء الرحمن

۳۔ حمیت حق

۱۔ ۲۲/۱۲/۱۹۷۱ء (کچھ بھی ہو، ”ہم سب مسلمان“ کا نظریہ)

بنام سید اصغر علی صاحب، بمبئی

عنایت فرمائے بندہ جناب سید اصغر علی صاحب، سلام و رحمت

— عجیب مذہب ہے اس سے کسی طرح پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ میں کسی مذہب کو نہیں

مانتا، ہندو دھرم کو بھی نہیں مانتا، لیکن میں پھر بھی ہندو ہوں۔

واقعہ ایسا ہی ہے، سنا تن دھرمی جن کا دین و مذہب مورتی پوجا (بت پرستی) ہے وہ بھی ہندو۔ اور آریہ سماج جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتے ہیں اور اس کو مہا پاپ سمجھتے ہیں، وہ بھی ہندو۔ چاروں ویدوں کو خدا کی الہامی کتاب ماننے والے آریہ سماجی بھی ہندو اور ان ویدوں کو خرافات کا مجموعہ کہنے والے جینی بھی ہندو۔ الغرض ہندو ہونے کے لئے کوئی عقیدہ ضروری نہیں۔

آپ مذہب اسلام کو بھی ہندو دھرم ہی کی طرح سمجھتے ہیں کہ بارہ اماموں کو سب نبیوں سے افضل ماننے والے شیعہ اور خاص طور سے شیعہ بھی مسلمان اور اس عقیدہ کی بنیاد پر ان کو کافر اور دائرۃ اسلام سے خارج سمجھنے والے علماء بھی مسلمان۔ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی محفوظ کتاب مجید ماننے والے ہم لوگ بھی مسلمان اور اس کو مخترف و مبدل ماننے والے شیعہ بھی مسلمان۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ اور دیگر اکابر صحابہ جن کے جنتی ہونے کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے اور رسول اللہ (ﷺ) نے اپنے ارشادات میں ان کے فضائل و مناقب بیان فرمائے ہیں اور ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی، ان کو ایسا ہی سمجھنے والے ہم لوگ بھی مسلمان، اور ان کو کافر و منافق بتلانے والے شیعہ اور ان کے ہم مذہب شیعہ بھی مسلمان۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کو (عاز اللہ) کافرہ اور منافقہ کہنے والے اور لکھنے والے شیعہ بھی مسلمان ہیں، اور قرآن پاک کے الفاظ میں ان کو اہمات المؤمنین اور رسول اللہ کی پاک اور مقدس و واجب الاحترام بیویاں ماننے والے سنی بھی مسلمان۔

(رہا اتحاد اور وحدتِ اسلامی، تو) خمینی کو اتحاد اور وحدتِ اسلامی کا داعی وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو اللہ نے دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والی عقل نہ دی ہو۔ سات آٹھ سال سے مسلسل عراق سے جنگ ہو رہی ہے جس میں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں، یہ سب اپنے آپ کو مسلمان ہی کہنے والے تھے، لیکن جنگ بندی کی ساری کوششیں صرف خمینی کی ضد کی وجہ سے اب تک ناکام ہو رہی ہیں۔ پھر ہر سال حج کے موقع پر خمینی کے بھیجے ہوئے ایرانی حرمین شریفین میں جو شرارت اور فساد برپا کرتے ہیں اور اس سال جو فساد برپا کیا اس سب کا ذمہ دار خمینی آپ کے نزدیک وحدتِ اسلامی کا علمبردار ہے۔! اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اس نے ہم کو دیکھنے والی آنکھیں بھی دی ہیں اور حقائق کو سمجھنے والی عقل بھی۔ والسلام

محمد منظور نعمانی (بقلم محمد ضیاء الرحمن قاسمی)

۲۔ ۲۷ جون ۱۹۸۸ء (آپ کی کتاب ”ایرانی انقلاب۔۔۔“)

بنام ڈاکٹر سید حبیب الحق صاحب ندوی ڈیر بن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ

برادرِ مکرم و محترم ڈاکٹر سید حبیب الحق صاحب، علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے میری کتاب ”ایرانی انقلاب“ کے بارے میں جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس سے فطری طور پر مسرت ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے جس میں انکسار کو ذرہ برابر دخل نہیں کہ میں فطری طور پر مصنف اور صاحبِ قلم نہیں ہوں، ادیب بھی نہیں ہوں، میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی محدود ہے، روزمرہ کی بول چال میں جو الفاظ استعمال کرتا ہوں وہی تحریر میں استعمال کرتا ہوں، جب کسی چیز کا داعیہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کو ضروری سمجھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے کچھ ہو جاتا ہے۔ خاص کر اس کتاب کا معاملہ یہ ہے کہ میں نے ایسی حالت میں لکھی کہ ہائی بلڈ پریشر اور بعض دوسرے امراض میں ابتلا کی وجہ سے لکھنے کے قابل نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا شدید داعیہ دل میں پیدا فرمادیا تھا اور اسی حال میں یہ کتاب لکھی ہے، مقصد صرف یہی تھا کہ سنتوں کی ناواقف دنیا اور خاص کر ہمارے علماء شیعیت کی حقیقت سے واقف ہو جائیں۔ کیونکہ یہ بات آنکھوں کے سامنے آگئی تھی کہ ایرانی انقلاب کے بعد سے شیعیت ایک زندہ دعوت و تحریک بن گئی ہے اور پورا عالم اسلام خاص کر حرمین شریفین ان کا اولین نشانہ ہیں۔ ہاں دعا کا اہتمام بھی نصیب رہا۔ میں تمنا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کتاب کو یہ مقبولیت ہوگی۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اشاعت کے بعد دو سال سے کم عرصہ میں پاکستان میں مختلف اداروں اور مکتبوں کی طرف سے اور اہل خیر حضرات کی طرف سے دولاکھ سے زیادہ اس کے نسخے شائع ہوئے۔ اس سے اپنے بارے میں بفضلہ تعالیٰ کوئی خوش فہمی نہیں ہوئی، میں اپنا حال جانتا ہوں اس لئے اس کو منجانب اللہ سمجھا (وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ)۔

۴۔ فکرِ آخرت و فہمی ذات

۱۔ معظمی و محترمی مولانا اشرف سلیمانی صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے عریضہ کے جواب میں آخری گرامی نامہ غالباً اوائل رمضان المبارک میں مل گیا تھا۔ اس

(۱) مکتوب الیاب اس دنیا میں نہیں ہیں، انقلاب ایران کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بہت پر جوش حامیوں میں رہے تھے۔ اس خط سے ظاہر ہے کہ بعد میں بالکل بدل گئے۔ یہ تبدیلی کس طرح آئی، شاید اس کا اظہار موصوف نے اپنے خط میں کیا ہو لیکن وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کتاب ہی اس تبدیلی کا باعث ہوئی ہو جیسا کہ ان جیسے بہت سے دوسرے حضرات کی کاپی اپٹ اسی کتاب سے ہوئی۔

میں حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا تھا اس سے دل بے حد متاثر ہوا۔ بے تکلف عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ عام عادت کے خلاف اپنی اس کم نصیبی پر دیر تک روتا رہا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ اور ان کے اکثر اجلہ خلفاء سے عقیدت و محبت اور نیاز مندانہ تعلق نصیب رہا اور ان کی عنایتیں اور شفقتیں بھی بھلہ تعالیٰ نصیب رہیں لیکن حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم سے قریبی زمانہ تک بالکل ناواقف رہا۔ اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے امید بھی نہیں کہ حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری اور زیارت نصیب ہو سکے۔ اسی کے ساتھ شدت سے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ ان سے غائبانہ بیعت (بیعت عثمانی) کی درخواست کروں، عزیزم مولوی خلیل الرحمن سجاد سلمہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعلیمی قیام کے دوران حضرت کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر بھی ہوتے رہے انھوں نے یہ بتلایا کہ حضرت کے مزاج پر انخفاء کا غلبہ ہے۔ بہت ہی کم لوگ ان کو جانتے ہیں۔ میں نے ان سے مشورہ کیا کہ میں اس مقصد سے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھنا چاہتا ہوں، انھوں نے بتلایا کہ جدہ کے نور ولی خاندان کے بھائی حاجی محمد نور عبدالقادر نور ولی اور حاجی محمد ولی عبداللہ نور ولی حضرت ممدوح سے عقیدہ مندانہ اور نیاز مندانہ تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ خط بھیجا جاسکتا ہے۔

حسن اتفاق سے میرے ایک بہت ہی مخلص اور صالح دوست حافظ محمد اقبال صاحب ۹ رمضان کو عمرہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے میں نے حضرت ممدوح کی خدمت میں عریضہ لکھ کر جدہ کے اپنے دوستوں کے پاس ان کے ذریعہ بھیج دیا اور ان کو مکلف کیا کہ وہ میرا عریضہ حتیٰ الوسع جلد ہی مدینہ منورہ حضرت مکتوب الیہ دامت برکاتہم کی خدمت میں پہنچادیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ عریضہ جلد ہی حضرت ممدوح کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ میں نے عریضہ میں اپنا حال لکھ کر غائبانہ بیعت کی درخواست کی ہے اور اس کا اظہار کر دیا ہے کہ اس وقت اس کا محرک آپ کا عنایت نامہ ہوا ہے۔

میں اب ضعف کے جس حال میں ہوں کچھ کرنے کے لائق تو نہیں ہوں۔ (پر) امید ہے کہ اس طرح مجھے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے سلسلہ کی برکات سے بھی حصہ مل جائے گا۔ بھلہ تعالیٰ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی ارشادی تعلیمات سے مجھے مناسبت نصیب رہی ہے اور میں نے ان کو اپنے لئے صحیح راہ سمجھا ہے۔

آپ کا ممنون و شکر گزار ہوں کہ آپ کے گرامی نامہ ہی نے یہ داعیہ پیدا کیا اور وہی اس کا محرک ہوا۔
جزاکم اللہ تعالیٰ کما یلیق بشانہ الکریم۔ والسلام
محمد منظور نعمانی

(۲) ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ

(بنام جناب عبدالرشید صاحب لدھیانوی مدینہ پائپ اسٹور۔ راولپنڈی)

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

میرے عزیز و کرم بھائی، احسن اللہ الیکم والینا، وعلیکم السلام ورحمة اللہ
اپنی بات آپ تک پہنچانے کا ذریعہ صرف الفاظ (بشکل تحریر) ہی ہو سکتے ہیں۔ پھر ایسا کوئی آلہ
معلوم نہیں جس سے آپ یہ جان سکیں کہ یہ الفاظ بالکل حقیقت کے مطابق ہیں، ان میں انکسار و تواضع بھی
نہیں ہے۔

آپ نے میرے پہلے خط کو غالباً تواضع پر محمول کیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ جیسے محبین کے حسن ظن کی
برکت سے اس عاجز پر اپنا فضل فرمائے۔

آپ ہی بتائیے کہ جس بندہ کو حق الیقین کے طور پر یہ معلوم ہو کہ وہ اس دولت کی نسبت سے خالی اور
”اُدو کہ گم است“ کا مصداق ہے، اس کے لئے کیسے درست ہے کہ وہ یہ ذمہ داری قبول کرے؟ برسوں سے
میرا معمول ہے کہ حضرت قدس سرہ کے ارشاد کی تعمیل میں صرف بیچارے ان عوام کو جن میں کوئی خاص
استعداد نہیں ہوتی ان کے کہنے پر بس توبہ کرا دیتا ہوں اور ان کے ساتھ الحمد للہ خود بھی توبہ کر لیتا ہوں۔ پھر اگر
ان میں سے کسی میں آگے چلنے کی استعداد محسوس ہوتی ہے تو کہہ دیتا ہوں کہ اب تم حضرت شیخ الحدیث مدظلہ
کی خدمت میں یا اللہ کے جس بندہ سے مناسبت دیکھو چلے جاؤ۔ میں تمہارے لئے خط بھی لکھ دوں گا۔ یہ میں
ازراہ امانت ضروری سمجھتا ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے پیشہ نے اللہ کے ان بندوں کی نگاہوں میں بڑا بنادیا ہے جو بس
میری کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کو حسن ظن بھی نصیب ہے۔ لیکن میں خود دھوکہ میں نہیں ہوں۔
دعا کے لئے کوئی اہلیت شرط نہیں ہے اس لئے اس کا پکا وعدہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ایفا نصیب

فرمائے۔ ایک مشورہ بھی دے سکتا ہوں کہ اگر کسی طرف طبیعت راجع نہ ہو تو تنہائی میں دو رکعت صلوٰۃ توبہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں اُس توبہ اور عہد کی تجدید کر لیجئے جو حضرت قدس سرہ کے ہاتھ پر آپ نے کی تھی اور اپنے احوال صحت و مشاغل دینی کو دیکھ کر حضرت اقدس کی تعلیم و تلقین کی رہنمائی میں معمول وغیرہ مقرر کر لیجئے پھر جو کچھ پیش آئے تو حضرت شیخ سے اور اگر اس ناکارہ ہی سے جی چاہے تو مجھ سے مشورہ فرما لیجئے۔ اگر طبیعت اس پر مطمئن ہو جائے تو پھر کسی نئی بیعت کی مطلق ضرورت نہیں۔ اصل ہادی و مرشد تو اللہ تعالیٰ ہے اور حضرت اقدس اور مشائخ کے سلسلہ کی روحانیت کے فیوض و برکات کا تسلسل باذن اللہ تعالیٰ جاری ہے۔ میں دعا کا محتاج و سائل ہوں اور آپ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

(۳)۔ ۳- اکتوبر ۱۹۸۹ء (ہمام حافظ قاری عبدالحق صاحب، الرس۔ سعودی عربیہ)

برادر مکرم جناب حافظ قاری عبدالحق صاحب، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔ ۱۹ اگست کا لکھا ہوا خلاص نامہ غالباً ستمبر کے پہلے دوسرے عشرہ میں مل گیا تھا، اس سے چند ہی روز پہلے آپ کو ایک خط لکھا جا چکا تھا۔ امید ہے میرا لکھایا ہوا وہ خط بھی آپ کو ملا ہوگا۔ اس کے بعد سے طبیعت ناساز رہی اس لئے آپ کے ۱۹ اگست کے عنایت نامہ کا جواب اب تک نہیں لکھا جاسکا، میں نے ابھی پڑھوا کر سنا ہے، مختصر اچند باتیں لکھا رہا ہوں۔

(۱) آپ میرے بارہ میں بہت مبالغہ کرتے ہیں بالکل اس حال میں نہیں ہوں جو آپ گمان کر رہے ہیں، بے تکلف لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئندہ اس بارے میں احتیاط فرمائیں۔ میں اپنا حال خوب جانتا ہوں اس لئے میرے بارے میں مجھے لکھنا غیر ضروری ہی نہیں نامناسب ہے، مجھے اس سے گرائی ہوتی ہے۔

(۲) آپ نے بیعت کی بات لکھی ہے۔ یاد آتا ہے پہلے بھی میں لکھا چکا ہوں، آپ کو کسی سے بیعت کی ضرورت نہیں، ہمارے مرحوم و مغفور بھائی مولانا حافظ فتح محمد صاحب سے جو بیعت آپ نے کی تھی وہی کافی ہے۔

(۳) معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اہل و عیال دہلی میں ہیں، ان کی وجہ سے آپ جب چاہیں اور مناسب سمجھیں دہلی کا سفر کریں، اگر اس وقت ملاقات کی نیت سے لکھنؤ کا بھی سفر کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ والسلام

۵۔ اصلاح و ارشاد

(۱) ۳۱ ربیع الثانی ۱۳۸ھ (بنام اعجاز الدین صاحب انصاری، بہوپال)

برادر عزیز و مکرم، زیدت حسناکم۔ سلام مسنون

ملفوظ اخلاص نامہ ہفتہ عشرہ پہلے پہنچ گیا تھا۔

(۱) پابندی کے ساتھ ذکر کی توفیق بڑی دولت ہے، اللہ تعالیٰ استقامت اور ترقی نصیب فرمائے اور چلتے پھرتے دھیان و ذکر کی توفیق تو بہت ہی بڑی نعمت ہے۔

(۲) کوشش کیجئے کہ تلاوت اور مناجات کا ناعد نہ ہو، چاہے ایک ہی رکوع اور ایک دو ہی دعائیں ہو جائیں، اہتمام کیجئے، ناعد بڑا خسارہ ہے۔

(۳) آپ نے حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری اور اس کی برکات کا ذکر کیا ہے، بلاشبہ حضرت کی ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے ایسوں کی محبت بہت بڑی سعادت ہے۔ حدیث میں ہے: الضراء مع من احب۔

(۴) حضرت شیخ الحدیث کے ہاں ڈاک کا اہتمام ہے اگرچہ روز آنے والے خطوط کی تعداد پچاس سے بڑھ جاتی، کچھ خطوط رہ بھی جاتے ہوں گے۔

(۵) اللہ تعالیٰ آپ کے لئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے، خود دعاؤں کا بہت محتاج ہوں اور مخلصوں کی دعاؤں سے بہت امید رکھتا ہوں۔ والسلام

محمد منظور نعمانی

(۲) ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء (بنام قطب الدین مٹلا صاحب۔ بیلگام)

برادر عزیز و مکرم، علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۲ مارچ ملا، حالات معلوم ہوئے۔ تسبیحات میں تو بہت کم وقت صرف ہوتا ہے۔ اگر اس کی پابندی بھی نہ ہو سکے تو اپنے ہی ساتھ بے انصافی ہے۔ غالباً میں نے بتایا ہوگا کہ اگر کسی دن مقررہ وقت پر تسبیحات پوری نہ کی جاسکیں تو دوسرے وقت ان کو پورا کر لینا چاہئے۔ اگر دل میں اہمیت ہوگی تو انشاء اللہ توفیق ملتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی شانِ عالی کے مطابق غیور ہیں، بندہ کی بے فکری کبھی کبھی محرومی کا

بب بن جاتی ہے، لیکن ان کی رحمت کی صفت غالب ہے، آئندہ کے لئے اہتمام اور پابندی کا عزم کیجئے
انشاء اللہ توفیق ملتی رہے گی، تسبیحات تو راستہ سے آشنائی پیدا کرنے کا ابتدائی ذریعہ ہیں اگلی منزلوں کی طلب
ہونی چاہئے۔

خوابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ تاہم آپ کا خواب اچھا ہے۔ اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح میں بلند پروازی کی استعداد رکھی ہے۔ آپ اگر اس راستہ پر چلیں گے تو
اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا۔ نہ چلنے کی صورت میں یہ استعداد بھی ضائع ہو جائے گی۔

استحان کے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔ نمازوں اور تسبیحات کے بعد خود دعا کیجئے اور امتحان کے وقت اللہ تعالیٰ
سے یہ دعا کر لیجئے: رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي اَمْرِي۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ

(۳) ۲۸ جون ۱۹۷۷ء (بنام ملا صاحب)

اخلاص نامہ مورخہ ۱۵ جون بروقت مل گیا تھا۔ آپ نے اپنا جو حال لکھا ہے بہت سے اللہ کے
بندوں کا یہ تجربہ ہے کہ حج کے سفر میں ایسا ہو جاتا ہے کہ آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو پونجی لیکر آیا تھا وہ بھی کھودی اور
کچھ بھی نصیب نہیں ہے۔ عارفین کو کہتے سنا ہے کہ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ ہم
سب امراض کا شکار ہیں۔ اگر اس طرح کی واردات کبھی نہ ہو تو اعجاب نفس میں مبتلا ہو کر برباد ہو جائیں۔ حق
یہ ہے کہ کسی کے پاس کچھ نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس کا تجربہ کر کے علاج فرما دیا جاتا ہے۔ سر اسر کرم ہے۔ اللہ
تعالیٰ دعا کی توفیق دے اور عاجزانہ دعا کو آپ کا اور میرا بھی حال بنادے۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ

محمد منظور نعمانی

(۴) ۳ ستمبر ۱۹۷۷ء (بنام ملا صاحب)

ملا صاحب بتاتے ہیں کہ ان کے دور فقیوں نے بیعت کے لیے حاضر ہونا چاہا تو آپ نے تحریر فرمایا:
”اگر قرب و جوار میں اللہ کے کوئی ایسے بندے آپ کے علم میں ہوں جن سے اصلاحی
تعلق کے مفید ہونے کی امید ہو تو میرا مخلصانہ مشورہ آپ کے دونوں رفقاء کو یہ ہے کہ ان

کی طرف رجوع کریں۔ انشاء اللہ نفع زیادہ ہوگا۔ یہ دفع الوقتی اور صرف تواضع کی بناء پر عرض نہیں کر رہا ہوں بلکہ دیانت داری کا تقاضہ یہی ہے کہ یہی مشورہ دوں اور ان کے لئے یہی بہتر ہوگا۔ اس کا بالکل لحاظ نہ کیا جائے کہ آپ کی وساطت سے مجھے لکھا جا چکا ہے۔ اور اگر بالفرض ایسے کوئی صاحب آپ حضرات کی نظر میں قرب و جوار میں نہ ہوں تو پھر ان دونوں صاحبوں کو میری طرف سے بتا دیجئے کہ کسی وقت تازہ وضو کر کے دو رکعت نفل صلوٰۃ توبہ کسی مسجد میں پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کریں۔ اور آئندہ زندگی کو شریعت کے مطابق گزارنے کی نیت کریں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں۔ اگر زندگی میں کچھ غلط باتیں داخل ہو گئیں ہوں جو اپنے خاص حالات کی وجہ سے فوراً نہ چھوٹ سکتی ہوں تو ان کو تدریجاً چھوڑنے کا دل سے فیصلہ کریں۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے نماز کی پابندی کا عہد کریں اور تا امکان نماز باجماعت کی پابندی کریں۔ قرآن مجید کی تلاوت اگرچہ کم مقدار میں ہو روزانہ کا معمول بنائیں۔ صبح و شام (نجر کی نماز سے پہلے سے طلوع آفتاب کے بعد تک صبح کا وقت ہے اور مغرب کے بعد سے عشاء کے بعد تک شام کا وقت سمجھنا چاہئے) دونوں وقتوں میں کم از کم ایک وقت ایک تسبیح کلمہ سوم کی، ایک تسبیح استغفار کی، اور ایک تسبیح درود شریف کی اپنا معمول بنالیں۔ رات کو سوتے وقت تسبیح فاطمہ یعنی سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمد للہ ۳۳ بار، اور اللہ اکبر ۳۳ بار اور استغفار اور درود شریف کم از کم تین دفعہ پڑھ لیا کریں۔ ابتداء اتنا ہی کافی ہے۔“

۲۶-۲۷ مئی ۱۸۴۲ء (بنام خدادی ایوب احمد صاحب۔ جو وہ پور)

برادر مخبر خدادی ایوب احمد زیدت حسنا تکم، سلام و رحمت۔

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

جوابی خط ملا۔ یاد آتا ہے کہ بہت دن پہلے آپ کی طرف سے خط آیا تھا جس میں جو دھپور کے سفر کے لئے لکھا گیا تھا، میں نے جواب بھی لکھا یا تھا، شاید نہ پہنچا ہو۔ بھائی حاجی محمد عمر صاحب مرحوم و مغفور کی علالت اور بیماری کے دنوں میں بار بار جی چاہا اور ارادہ کیا، ضعف اور اپنی بیماری کی وجہ سے سفر نہ کر سکا، اور اب تو دل میں کوئی تقاضا بھی نہیں ہے اور نہ سفر کے لائق ہوں، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ سب مخلص دوستوں کے حق کے مطابق دعا کی توفیق عطا فرمائے اور قبول فرمائے۔

عزیزان خورشید احمد اور رشید احمد سلمہا کی کامیابی کے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔

ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ کے ہمارے مخلص اور عزیز بھائی ماسٹر اقبال احمد

صاحب پر اس عاجز کے نزدیک اللہ کا خاص فضل ہے۔ حضرت حاجی عبدالغفور صاحب نور اللہ مرتدہ سے اُن کو بہت فیض پہنچا، میں اُن کا حال اپنی حالت سے بہتر سمجھتا ہوں۔ دوست احباب اُن کے ساتھ تعلق رکھیں۔ اگر دل میں بیعت کا تقاضا ہو تو اُن سے بیعت کر لی جائے۔ اُن کے ساتھ تعلق حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرتدہ کے ساتھ اور اس عاجز کے ساتھ تعلق ہوگا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ آپ دوستوں کو اس کی اطلاع دیدوں۔ عزیز بھائی محمد حفیظ اور جن عزیزوں نے سلام لکھایا ہے اُن سب کو جواب سلام اور دعا۔ سب سے دعاؤں کا طالب ہوں۔

والسلام

(بقلم محمد خسان نعمانی)

(۵) ۲۳ رمضان ۱۴۱۲ھ (ہنام انیس احمد صاحب۔ پتہ محفوظ نہیں)

میرے عزیز بھائی انیس صاحب، حفظکم اللہ تعالیٰ و عافاکم

سلام و رحمت

آپ کا خط ملا پڑھوا کر سنا، میں زیادہ دن سے بیمار اور صاحب فراش ہوں، خود لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہوں لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے خط کا جواب لکھواؤں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہ کو بڑے سخت شیطانی دوسوے آتے تھے انھوں نے آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت ایسے ایسے دوسوے آتے ہیں کہ جل کر کونکہ ہو جانا ان سے بہتر ہے۔ حضور (ﷺ) سے نے فرمایا کہ یہ حالت اس کی دلیل ہے کہ تمہیں پورا ایمان نصیب ہے۔ اور ایمان کی دولت عزیز ہے۔

یہ عاجز آپ کو یقین دلاتا ہے کہ بفضلہ تعالیٰ آپ پورے صاحب ایمان ہیں، ان خیالات کو دوسوے سمجھنا اور ان سے تکلیف اور پریشانی محسوس کرنا اور پریشان ورنجیدہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ بفضلہ تعالیٰ آپ کا قلب مؤمن ہے۔

نماز یا قرآن پاک کی تلاوت میں لذت اور حلاوت نہ ہونے سے کوئی نقصان نہیں بلکہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر زیادہ اجر و ثواب عطا فرمائے گا کہ لذت و حلاوت نہ ہونے کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نماز پڑھتے ہیں اور اجر و ثواب کے لئے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ اللہ کے بعض

بندوں پر کبھی کبھی ایسے حالات آجایا کرتے ہیں لیکن چند روز میں وہ کافور ہو جاتے ہیں۔ اور ان سے پریشانی اور تکلیف کا احساس ان کی دینی و ایمانی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

ایک مختصر عمل لکھاتا ہوں:

صبح نماز فجر سے پہلے یا فارغ ہونے کے بعد اسی طرح رات کو عشاء کی نماز کے بعد گیارہ (۱۱) دفعہ درود شریف، اس کے بعد ایک سو ایک دفعہ یہ مختصر دعا ”اَللّٰهُمَّ بَثِّ قَلْبِيْ عَلٰی دِيْنِكَ“ پھر گیارہ دفعہ درود شریف پڑھنے کا تین ہفتے کے لئے معمول بنا لیجئے اور ہر نماز کے بعد دعا کیجئے کہ اے اللہ تو شیطانی وسوسوں سے میری حفاظت فرما اور تین بار کلمہ شریف پڑھ لیا کیجئے۔

یہ عاجز بھی آپ کے لئے دعا کرتا ہے امید ہے کہ ان شاء اللہ آپ جلد اس حالت سے نجات پا جائیں گے۔ خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

۶۔ اصلاح رسوم

(۱) ۳ جون ۱۹۸۹ء (بخدمت جناب عبدالرحمن کوندو صاحب، سری نگر کشمیر)

مخلص مکرم جناب عبدالرحمن کوندو صاحب زید لطفکم سلام ورحمت

گرامی نامہ مؤرخہ ۱۷ مئی موصول ہوا۔ آجکل ضعف بہت بڑھا ہوا ہے، گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے بصارت میں بھی کمی آگئی ہے۔ اگر یہ معذوری نہ ہوتی تو آپ کی کتاب ”فتنہ جہیز“ کتب خانہ سے منگوا کر سننا۔

یاد آتا ہے کہ اب سے چند سال پہلے الفرقان میں جہیز کے مسئلہ سے متعلق دو صاحبان علم کے مضامین پاکستان کے کسی موقر رسالہ سے نقل ہو کر شائع ہوئے تھے۔ ان میں یہی ثابت کیا گیا تھا کہ جہیز جو نکاح و شادی کے لوازم میں سے ہو گیا ہے قطعاً غیر شرعی ہے۔ یہ عاجز بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ والسلام
(بقلم محمد ضیاء الرحمن قاسمی)

(۲) ۳ جون ۱۹۸۹ء (بنام عائشہ بی بی بنت حافظ محمد اقبال صاحب۔ گوئدہ)

عزیزہ من بیٹی عائشہ سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم، علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بیٹی تمہارا خط ملا، میں ایسے حال میں ہوں کہ خود تو خط پڑھ بھی نہیں سکتا، اور طویل خط پڑھوا کر سننا بھی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن تمہارا خط پڑھوا کر سننا۔

مجھے یقین ہے کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے صحیح اور سچ لکھا ہے، لیکن جو کچھ ہوا بہت غلط ہوا، شادی بیاہ کے سلسلہ میں جو طریقے عام طور پر ہندوستان میں رائج ہیں وہ تقریباً سب ہی خلاف سنت و شریعت ہیں لیکن قریباً سب ہی ان میں مبتلا ہیں، ان میں اور نئی رسموں کا اضافہ کرنا بہت ہی غلط کام ہے۔ اگر پہلے سے یہ رواج نہیں تھا کہ رشتہ طے ہونے کے بعد انگوٹھی اور جوڑا پہنایا جائے تو تم نے یہ کر کے ایک غلط قسم کی رسم کی بنیاد ڈال دی جو اللہ کے بہت سے بندوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے گی۔ اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے مٹھائی وغیرہ کا آنا اور تمہارا قبول کر لینا بہت غلط کام ہوا ہے۔ رسمیں اسی طرح شروع ہوتی ہیں پھر وہ سب کے لئے لازمی سی ہو جاتی ہیں۔ بہت سے غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کچھ ہو چکا (ہو گیا) اب خاندان والوں کے سامنے تم اقرار کر لو کہ مجھ سے غلطی ہوئی، لیکن نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی۔

ان بری رسموں کی اصلاح کیلئے جہاں تک ہو سکے ان سے بچا جائے، لڑکی والوں سے کہلوادو کہ ہم نکاح اور شادی سنت و شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، آپ لوگ بھی ایسا ہی کریں۔ ایک حدیث شریف میں ہے۔ اعظم النکاح بركة ایسرھا مؤنة۔ (بابرکت نکاح وہ ہے جس میں بارکم ہو) والسلام محمد منظور نعمانی

۷۔ تعزیت و تسلی

(۱) ۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ء (بنام مولانا محفوظ الرحمن صاحب۔ سنجل)

مکرم و محترم مولانا محفوظ الرحمن صاحب، زیدت حسناتکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اپنی بیٹی حمیرا تسنیم سلمہا کے خط سے آپ کی اہلیہ مکرمہ کے انتقال کی اطلاع ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ سنجل ہی میں ہیں۔ اس لئے یہ طریق لکھا رہا ہوں۔

میں دو دفعہ اس مرحلہ سے گزرا ہوں۔ تجربہ ہے کہ دل پر کیا گزرتی ہے اور زندگی کے نظام پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کی مشکلات کو آپ کے لئے آسان فرمائے اور نعم البدل عطا فرمائے۔ عظیم ہے کہ حضور (ﷺ) کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ جو اول مؤمنات تھیں اور حقیقی اور روح معنی میں رفیقہ حیات، ان کی مفارقت کا شدید صدمہ حضور (ﷺ) کو پہونچا، اولاد بھی چھوڑی، آپ کو

یہ سنت بھی نصیب ہوئی جو غیر اختیاری ہے، اللہ تعالیٰ اس صدمہ کا اجرا اپنی شانِ عالی کے مطابق آپ کو آخرت میں عطا فرمائے۔

آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں: اِنَّ لِلّٰهِ مَا اخَذَ وَّلَهُ مَا اعطٰی وَّ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْنَبْصِرْ وَّلْنَحْتَسِبْ“ والسلام علیکم ورحمة اللہ۔

۸۔ فکر ملت

(۱) ۵ نومبر ۱۹۸۸ء (بخدمت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

صدق محترم و معظم احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا۔

سلام و رحمت، کل عزیز کرم مولوی غیاث الدین صاحب آئے تھے، انھوں نے آپ کا عنایت فرمایا ہوا ”المرتضیٰ“ کا نسخہ پہنچایا، مجھے بھی اشتیاق تھا، انشاء اللہ ضرور پڑھوا کر سنوں گا۔

معلوم ہوا تھا کہ ”المرتضیٰ“ کی رسمِ اجراء کی جو تقریب ہو رہی ہے اس میں شرکت کے لئے مولانا رحمانی زید مجدہم اور پروفیسر خلیق نظامی صاحب اور سید حامد صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ ان حضرات کا قیام دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ہوگا۔ افسوس کہ میں بالکل اس حال میں نہیں ہوں کہ اس موقع پر وہاں حاضر ہو سکوں، اگر حاضر ہوتا تو خود ہی ان حضرات سے عرض کرتا، اب آپ سے اور مولانا رحمانی زید مجدہم سے گزارش ہے کہ بابرئ مسجد کے قضیہ نے جو خطرناک شکل اختیار کر لی ہے اس سلسلہ میں اس موقع پر جمع ہونے والے حضرات کی طرف سے کوئی بیان دیدیا جائے۔ اور اگر اس مقصد کے لئے وسیع پیمانہ پر خواص اہل الرائے و اصحاب دانش کا اجتماع بلانے کی رائے ہو جائے تو اس کے بارے میں فیصلہ فرمالیا جائے۔ ۲۶ نومبر کو دہلی میں بابرئ مسجد کے سلسلہ میں جو کانفرنس بلائی جا رہی ہے اندیشہ ہے کہ اس کے بعد مسئلہ اور زیادہ خطرناک ہو جائے۔

مجھے احساس ہے کہ میں علیل ہوں اور اس وقت میری رائے بھی علیل ہے لیکن اس مسئلہ کی خطرناکی کے احساس سے آپ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنے کا شدید داعیہ ہے۔ جس میں اسلام اور ملتِ مسلمہ کی خیر ہو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رہنمائی فرمائے اور مقدر و مینتر فرمادے۔ والسلام

(بقلم محمد ضیاء الرحمن)

(۱) مکتوب الیہ کے متعلق یہ بتانا مناسب ہوگا کہ آپ کے والد مرحوم مولانا نجم الحسن صاحب حضرت صاحبِ سوانح کے شاگرد تھے اور ارقم الحروف کے استاذ۔

خطابات

(۱)

ہماری دعوت اور اس کا طریق کار

[لکھنؤ کے ہفتہ وار تبلیغی اجتماع ۲۹ نومبر ۱۹۵۱ء میں کی گئی تقریر۔ اس دن کے اجتماع میں کافی بڑی تعداد نئے لوگوں کی تھی، اس لئے یہ تقریر خاص طور سے انہی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھی، اور ایسے انداز میں کہ تبلیغی محنت کی حقیقت، اس کا طریقہ کار اور افادیت بآسانی اور پوری طرح ان کے ذہن میں آجاسکے۔ اور اللہ توفیق دے تو اس مبارک محنت میں شرکت کا فیصلہ کر کے اٹھیں۔]

الحمد لله الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لولا ان هدانا الله لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات الله تعالى عليهم وعلى كل من اتبعهم باحسان الى يوم الدين .

حضرات! آج جمعرات ہے، اور آپ میں سے اکثر حضرات کو بلکہ قریباً سب ہی کو معلوم ہوگا کہ ”دارالعلوم ندوۃ العلماء“ کی اس مسجد میں ہر جمعرات کو اسی وقت یہ اجتماع برابر ہوتا ہے، یعنی آج کا یہ اجتماع اُس طرح کا اتفاقی اور وقتی اجتماع نہیں ہے جس طرح کے اجتماعات تین چار دن سے برابر شہر میں ہمارے ہو رہے تھے، بلکہ یہ ہمارا مستقبل ہفتہ وار اجتماع ہے۔ ہمارے اس اجتماع کا مستقل نظام یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ جمعرات کو مغرب کی نماز یہیں آکے پڑھتے ہیں، نماز سے فارغ ہونے کے بعد مختصر کتابی درس ہوتا ہے جس میں رسول اللہ (ﷺ) اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے ایمان اور ایمانی جذبات پیدا کرنے والے حالات اور واقعات اور دین کی ضروری اور بنیادی تعلیمات کا کچھ حصہ مناسب اور منتخب کتابوں سے پڑھ کر سنایا جاتا ہے جیسا کہ آپ نے اس وقت دیکھا اور سنا، اس کے بعد حاضرین کے سامنے وہ دعوت پیش کی جاتی ہے جو اس اجتماع کی اور اس تحریک کی اصل دعوت ہے، یعنی یہ کہ ایمان اور ایمان والی زندگی خود حاصل کرنے کے لئے اور دوسرے اپنے بھائیوں میں بھی اس کو پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کا فیصلہ کیا جائے، اور اس کام کو اپنی زندگی کا جزو بنایا جائے، اس کے لئے محنت اور قربانی پر اپنے کو آمادہ کیا جائے اور جب ضرورت سمجھی جاتی ہے تو اس کام کے طریقے اور پروگرام کی بھی وضاحت کی جاتی ہے۔

آج چونکہ بہت بڑی تعداد میں ایسے نئے حضرات بھی ہیں جو گذشتہ تین راتوں کے اجتماعات میں ہماری تقریریں سن کر ہمارے خیال میں پہلی دفعہ یہاں تشریف لائے ہیں، اور ہماری اس دینی دعوت سے اور اس کے طریقے اور پروگرام سے وہ واقف نہیں ہیں، اس لئے اس وقت میں اسی موضوع پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کل اور پرسوں اور اس سے پہلے دن کے اجتماعات میں جو تقریریں آپ حضرات کے سامنے کی گئی تھیں اُن میں ہم نے اپنی اس دعوت اور تحریک کا صرف مقصد واضح کیا تھا، یا یوں کہنا چاہئے کہ ضرورت ظاہر کی تھی۔ ان تقریروں سے آپ نے یہ تو سمجھ ہی لیا ہوگا کہ ہمارے سامنے اصلی مسئلہ مسلمانوں میں اصلی ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کا ہے، اور یہی ہماری اس دعوت یا تحریک کا اصل مقصد ہے۔ اب آج میں ذرا تفصیل سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے ہم کس طریقہ پر کام کر رہے ہیں، اور ہمارا کیا پروگرام ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے ایک بنیادی نظریے کو سمجھ لینا چاہئے۔ اب تک کے ہمارے تجربے نے اور ہمارے غور و فکر نے ہمارے اس یقین کو بہت پختہ کر دیا ہے کہ خاص کر ہمارے اس زمانے میں مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور ایمانی زندگی کے پیدا کرنے میں دو چیزیں بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں، ایک کسی ایسے ماحول میں کچھ وقت گزارنا جہاں ایمان کی فضا ہو اور ایمان کی اور ایمانی زندگی کی دعوت دی جاتی ہو۔ اور دوسرے خود ایمان کا داعی بن جانا اور اس کی راہ میں ٹھوکریں کھانا اور تکلیفیں اٹھانا۔ آپ حضرات میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں غور و فکر کے قابل بنایا ہے وہ اگر غور کریں گے تو خود بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں گے، اور جو حضرات ہمارے غور و فکر اور ہمارے تجربوں پر اعتماد کریں تو ہم کہتے ہیں کہ الحمد للہ ہم پوری بصیرت کے ساتھ اس پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارے پروگرام کی بنیاد ہمارے اسی یقین اور ہمارے اسی نظریہ پر ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر ایسے دینی مرکز قائم کریں، جہاں ہفتہ کی کسی ایک رات کو عام اجتماع ہوا کرے، اور وہاں ایمان کی اور ایمانی زندگی کی دعوت دی جایا کرے، اور اُس رات کو لوگ وہیں قیام کیا کریں، اور اس کی پوری کوشش کی جائے کہ وہاں کی فضا ایمان کی فضا ہو۔

یعنی وہاں کا نقشہ جس قدر بھی ہو سکتا ہو اُس نقشہ کے مطابق ہو جو رسول اللہ (ﷺ) لائے تھے اور جو آپ کی تیار کی ہوئی جماعت یعنی صحابہ کرام کی زندگی کا نقشہ تھا۔ جس میں اللہ کا ذکر تھا، آخرت

کا لکھنا، دین کا درو تھا، دین کی طلب تھی، دین کا سیکھنا تھا، دین کا سکھانا تھا، دین کی دعوت تھی، دین کے لئے مشورے تھے، دین کے لئے فیصلے تھے، آپس میں محبت تھی، اخوت تھی، خدمت تھی، ہمدردی تھی، غم خواری تھی، بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ شہر بہ شہر ایسے دینی مراکز قائم ہوں جہاں ہفتہ کی ایک رات کو اس طرح کا اجتماع ہوا کرے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اس رات کو قیام وہیں پہنچا جائے، تو ہمارے کام کا ایک جزو تو ہیں اس قسم کے اجتماعات۔ اور دوسرا جزو جس کی ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں تک ایمان کی دعوت پہنچانے کے لئے اور ایمانی کیفیات اور ایمانی زندگی خود اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے اور اس کی ترقی اور تربیت کے لئے جماعتیں بنانا کر لگا کریں، اور جیسا موقع ہو دور کے یا قریب کے مقامات پر جایا کریں اور ان جماعتوں کی فضا بھی ایمان والی اور ایمانی زندگی اور ایمانی کیفیات والی فضا ہو، یعنی مقامی طور پر ہفتہ وار اجتماع کی رات کا جو نقشہ ہونا چاہئے وہی ان جماعتوں کا مستقل نقشہ ہو۔ گویا یہ جماعتیں اسی قسم کے چلتے پھرتے اجتماعات ہوں۔

یہ جہاں جائیں اپنا دن کا وقت دین کے سیکھنے سکھانے میں اور وہاں کے لوگوں سے ملنے ملانے میں گذاریں، حقیقی ایمان کی اور ایمانی زندگی کی وہاں کے اپنے بھائیوں کو دعوت دیں، آپس میں میل محبت سے رہنے کی اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی مشق کریں اور اس کی عادت ڈالیں، جہاں ان کو رات گزارنا ہو وہاں اللہ کے ذکر اور عابد بندوں والی رات گذاریں، حضور (ﷺ) کے زمانے میں دین کی خدمت اور دعوت کے لئے جو لوگ اور جو قافلے جاتے تھے ان کی زندگی کا نظام اور نقشہ یہی ہوتا تھا اور اسی طرح ان کی زندگی اسلامی زندگی بنتی تھی۔ تو ہمارے اس کام کے یہی دو حصے ہیں، ایک مقامی ہفتہ وار اجتماعات، اور دوسرے اپنی دینی ترقی اور تربیت کے لئے اور دوسروں تک دین کی یہ دعوت پہنچانے کے لئے جماعتیں بنانا کر دور اور قریب کے مقامات پر جانا۔ تو مسلمانوں کو ہماری دعوت یہ ہے کہ وہ ان دو چیزوں کو اپنی زندگی کے پروگرام کا جز بنائیں، اپنے اپنے مقامات پر اس کام کے لئے دینی مراکز قائم کئے جائیں، اور وہاں کے مسلمانوں کو دعوت دی جائے کہ وہ ہفتہ کی ایک رات (جورات بھی مشورہ سے مقرر ہو جائے) اپنے اس دینی مرکز میں گذارا کریں، اور ہر مہینہ کم از کم ایک دفعہ دین کی خدمت اور دعوت کے لئے اور خود اپنی ترقی اور تربیت کے لئے جماعتی نظام کے ساتھ سفر کیا کریں۔ ہم بس ان ہی دو چیزوں کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کے بعد میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اپنے ان اجتماعات میں اور اپنی جماعتوں کے ذریعہ ہم دین کی

کن باتوں کی مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ دین ایک وسیع سمندر ہے، اس میں عقائد بھی ہیں اور اعمال بھی، اور اخلاق بھی، پھر ایک ایک شعبہ سے متعلق حضور (ﷺ) کی تعلیمات سیکڑوں اور ہزاروں ہیں، اور ان میں سے ہر بات بلاشبہ دین کی بات ہے۔ تو ہم نے ان سب باتوں کی تفصیلی تبلیغ اور تعلیم اپنے ذمہ نہیں لی ہے۔ یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے اجتماعات میں یا سفروں میں دین کے سب احکام کی تبلیغ کرتے ہوں اور تمام اصول و فروع کی اور فرائض و واجبات اور محرمات و مکروہات کی فہرست بتلاتے ہوں۔ نہ تو ہم میں سے ہر ایک کے پاس دین کا اتنا علم ہے اور نہ ہم عوامی اصلاح کے لئے اس طریقہ کو صحیح اور مفید سمجھتے ہیں، اس لئے ہم نے بس چند بنیادی اور اصولی باتیں لے لی ہیں، ہم متعین طور سے دین کی تعلیمات میں سے بس ان ہی دو چار باتوں کی دعوت دیتے ہیں، اور ان ہی کا اپنے مسلمان بھائیوں سے مطالبہ کرتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلی بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت کو سمجھیں اور جس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے یعنی ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ اس کو اور اس کے معنی مطلب کو اور اس کی حقیقت اور اس کے فیصلے کو سمجھ کر وہ اس پر اپنا ایمان تازہ کریں، اور اس کو اپنی زندگی کی بنیاد بنائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کلمہ کے ماننے والوں اور پڑھنے والوں میں بہت کم ہیں جن کو اس کی حقیقت اور عظمت کا کچھ پتہ ہو، اس کلمہ کا پڑھنے والا دراصل دو بڑی اہم حقیقتوں اور اپنے متعلق دو بڑے معرکہ کے فیصلوں کا اقرار اور اعلان کرتا ہے۔

ایک یہ کہ اللہ کے سوا میں کسی کو معبود اور مالک نہیں مانتا، بس صرف اسی کو عبادت اور بندگی کے لائق سمجھتا ہوں، اس لئے اب میں صرف اسی کی عبادت اور بندگی کروں گا، اسی کے حکموں پر چلوں گا، اسی کو راضی رکھنے کی فکر رکھوں گا، اور اسی کے لئے جیوں گا اور مردوں گا۔

اور دوسرے یہ کہ میں نے مان لیا اور یقین کر لیا کہ حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے سچے پیغمبر ہیں، ان کا لایا ہوا دین اللہ کا اتارا ہوا دین ہے، اور ان کی لائی ہوئی شریعت اللہ کی مقرر کی ہوئی شریعت ہے، اور اب نجات اور اللہ کی رضا مندی صرف ان کی پیروی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، لہذا میں نے ان کے لئے ہوئے دین کو اور ان کی شریعت کو قبول کر لیا، اب میں ان کی شریعت پر چلوں گا، ان ہی کے طریقے پر جیوں گا، اور ان ہی کے طریقہ پر مردوں گا۔

تو دراصل اس مختصر سے کلمہ کے ذریعہ ان دو بڑی حقیقتوں کا اقرار اور فیصلہ کیا جاتا ہے، اور یہی

اقرار اور فیصلہ ہمارے دین کی بنیاد ہے۔

تو مسلمانوں میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کے سلسلہ میں پہلی بات ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کلمہ کی حقیقت اور عظمت اور اہمیت کو سمجھ کر ایمان تازہ کرنے کی نیت سے کثرت سے اس کو پڑھا کریں، اور اس کو اپنی زندگی کا بنیادی اصول بنائیں۔ یہاں تک کہ اس کلمہ کی حقیقت ان کے دل میں بس جائے اور ان کا حال بن جائے

اس کے بعد دوسری متعین چیز جس کی ہم مسلمانوں کو اس سلسلہ میں دعوت دیتے ہیں، وہ ”اقامتِ صلوٰۃ“ ہے، یعنی اللہ و رسول کے حکم کے مطابق نماز کا خاص اہتمام کرنا، یعنی صرف نماز پڑھنا ہی نہیں، بلکہ رسول اللہ (ﷺ) کی تعلیم کے مطابق نماز کو صحیح طور سے اور بہتر سے بہتر ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ نماز کلمہ کے بعد دین کی دوسرے درجہ کی بنیاد ہے، بلکہ میں کبھی کبھی کہتا ہوں کہ نماز گویا پڑا اور عملی کلمہ ہے یعنی کلمہ کے ذریعہ مختصر لفظوں میں جس حقیقت کا اقرار و اعلان کیا جاتا ہے، اور اللہ کی بندگی اور رسول اللہ (ﷺ) کی پیروی والی جس زندگی کا فیصلہ کیا جاتا ہے، نماز اسی کی ایک تفصیلی اور عملی شکل ہے۔ نماز میں شروع سے لے کر آخر تک جو کچھ پڑھا جاتا ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے، اگر آپ اس سب پر اور اس کی خاص ترتیب پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نماز کی نوعیت بالکل یہی ہے کہ وہ کلمہ کی تفصیل اور کلمہ والی زندگی کا ایک نمونہ ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کی مشق کا ایک مقررہ نصاب ہے۔

بندہ جب نماز کی نیت کر کے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ اللہ کی بندگی اور محمد رسول اللہ (ﷺ) کی پیروی کی مکمل تصویر بن جاتا ہے، اس کا کھڑا ہونا اور بیٹھنا اللہ و رسول کے حکم سے ہوتا ہے، اس کا جھکنا اور زمین پر گر جانا اللہ و رسول کے حکم سے ہوتا ہے، جس حالت میں اسے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے کا حکم ہے اس حالت میں وہ ہاتھ باندھ کے ہی کھڑا ہوتا ہے، اور جس حالت میں اسے ہاتھ چھوڑنے کا حکم ہے اس وقت وہ ہاتھ چھوڑ کے ہی کھڑا ہوتا ہے، ایک رکعت میں ایک رکوع کا حکم ہے تو اگر اس کا جی بھی دور کو کرنا چاہے تو نہیں کرتا، اسی طرح سجدے میں اسے اگر زیادہ لذت ملے اور وہ بجائے دو کے ایک رکعت میں تین یا چار سجدے کرنا چاہے تو نہیں کرتا، اور نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ نماز کے آخر میں جب اللہ کا اس کو حکم ہوتا ہے کہ اب اللہ سے مخاطب ہونے کے بجائے وہ اللہ کے بندوں کی طرف مخاطب ہو اور اللہ کی تسبیح و تحمید اور درود کے بجائے وہ دائیں اور بائیں والے اپنے ساتھیوں کو سلام کرے، تو وہ بے چون و چرا اس کی

بھی اطاعت کرتا ہے۔ اسی طرح جب اس کو حکم ہوتا ہے کہ اپنے رخ کو قبلہ ہی کی طرف رکھ، اور دائیں بائیں کچھ نہ دیکھ تو وہ اس کی پوری پابندی کرتا ہے، لیکن جب سلام کے وقت حکم ہوتا ہے کہ اب اپنے چہرے کو قبلہ کی طرف سے موڑ کر دائیں طرف اور بائیں طرف پھیر، تو وہ بے چون و چرا اس کی بھی تعمیل کرتا ہے۔

الغرض نماز اللہ کی بندگی والی اور رسول اللہ (ﷺ) کی پیروی والی اس زندگی کا پورا پورا نمونہ ہے جس کا اقرار اور اعلان کلمہ میں کیا جاتا ہے، گویا نماز ہمیں یہ سکھاتی ہے، اور اس کے ذریعہ دن میں کم از کم پانچ وقت اس کی تربیت دی جاتی ہے کہ اس دنیوی زندگی کو اس طرح گزاریں کہ ہمارا ٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، دیکھنا سننا، سوچنا سمجھنا، بولنا چالنا، اور مرنا جینا سب اللہ و رسول کے حکم اور قانون کے مطابق ہو۔

تو ایمان اور ایمان والی زندگی کو پیدا کرنے کے لئے اور اس کو ترقی دینے کے لئے کلمہ طیبہ کے بعد دوسری جس چیز کی دعوت دیتے ہیں وہ ”اقامت صلوٰۃ“ ہے، یعنی نماز ہے، اور دین کے ارکان میں سے تعین کے ساتھ نماز کی دعوت ہم اس کی خصوصیت کی وجہ سے دیتے ہیں کہ کلمہ کی طرح وہ بھی ایمان اور ایمان والی زندگی کی خاص بنیاد ہے اور جیسا کہ میں نے کہا وہ گویا کلمہ کی تفصیلی اور عملی شکل ہے، اور کلمہ والی ایمانی زندگی پیدا کرنے کا ایک خاص نصاب اور ذریعہ ہے۔

ان دو چیزوں کے بعد تیسری بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے کلمہ پڑھ کے جس زندگی کو قبول کیا ہے، اور اختیار کرنے کا فیصلہ کا ہے، یعنی اللہ کی بندگی والی اور رسول اللہ (ﷺ) کی پیروی والی زندگی کے سیکھنے کو اپنی زندگی کا جزو بنائیں، اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔

حضور (ﷺ) زندگی کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اور جس پر چلنے کا فیصلہ کلمہ پڑھ کے ہوتا ہے اور دراصل زندگی کے اسی طریقہ کا نام اسلام ہے، وہ صرف مسلمان گھر میں پیدا ہو جانے سے آپ سے آپ نہیں آجاتا، وہ تو جب ہی آتا ہے جب اس کو جانا جائے، سیکھا جائے، اور اس کے مطابق چلا جائے۔

تو ہر مسلمان کو ہم تیسری اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ دین سیکھنے کو وہ اپنے لئے ضروری سمجھے، اور کھانے پینے کی طرح یا دوا و علاج کی طرح اس کو بھی اپنی زندگی کی خاص ضرورت جانے، اور اسی کو اپنی زندگی بنانے کی فکر کرے۔

اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کسی عربی مدرسے کا باقاعدہ طالب علم بن کر، اور دس بارہ سال اس میں پڑھ کر پورا عالم فاضل بنے، بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا اور حلال

حرام کا اتنا علم ضرور حاصل کرے جس کی روشنی میں وہ اسلام والی زندگی گزار سکے، خواہ یہ علم مدرسے میں پڑھ کر حاصل کیا جائے، خواہ کتابوں کے مطالعہ سے اس میں مدد ملی جائے، خواہ دین جاننے والوں کے ساتھ رہ کر ان کی صحبت سے اور ان کی باتوں سے حاصل ہو جائے، اور سب سے آسان اور عمومی طریقہ یہی آخری طریقہ ہے، یعنی یہ کہ دین جاننے والوں اور دین پر چلنے والوں کے ساتھ رہ کر دین سیکھا جائے، اس طریقہ سے ہر شخص بڑی آسانی سے دین سیکھ لیتا ہے، اور یہاں علم عمل کے ساتھ آتا ہے اور اسی لئے بڑا پائیدار ہوتا ہے، ہماری تبلیغی جماعتوں میں دین سیکھنے سکھانے کا جو کام ہوتا ہے وہ زیادہ تر اسی طریقہ سے ہوتا ہے، اگرچہ جماعتوں میں کچھ کتابی درس بھی ہوتا ہے، لیکن ہم اصلی تعلیم اسی کو سمجھتے ہیں جو عمل سے دی جاتی ہے، اور صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے علم میں ایسے بہت سے اللہ کے بندے ہیں جنہوں نے دین کا علم کسی مدرسہ میں پڑھ کر حاصل نہیں کیا، نہ وہ مطالعہ والے آدمی ہیں، بلکہ مزدور طبقہ کے ہمارے بھائی ہیں، بس کبھی کبھی تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفر میں جاتے رہتے ہیں اور اس کو انہوں نے اپنی زندگی کے پروگرام میں داخل کر لیا ہے، اسی سے ان کو اپنی ضرورت کے قابل دین آگیا ہے، پہلے انہیں اگر نماز پڑھنا نہیں آتا تھا تو اب آگیا ہے، اگر ان کی نمازوں میں غلطیاں تھیں تو انہوں نے ان کی اصلاح کر لی ہے، اسی طرح دین کی دوسری ضروری باتیں جو پہلے انہیں معلوم نہیں تھیں اب تبلیغی جماعتوں میں مسلسل جاتے رہنے سے اور اس سلسلہ کے اجتماعات میں آمد و رفت سے الحمد للہ انہیں کچھ معلوم ہو گئی ہیں۔

اور اس راستے سے یعنی صحبت اور اجتماع و اختلاط کے ذریعہ سے جو دین سیکھا جاتا ہے اس میں یہی نہیں ہوتا کہ بس معلوم ہو گیا، بلکہ اس میں علم عمل کے ساتھ آتا ہے، بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ عمل کی کیفیات بھی ساتھ ہی آتی ہیں۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ کسی اچھے نماز پڑھنے والے بندے کی صحبت سے جو شخص نماز سیکھے گا تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ اس کو نماز پڑھنے کا طریقہ آجائے گا بلکہ وہ نماز پڑھنے لگے گا، اور اچھی نماز پڑھنے لگے گا، صحابہ کرام نے رسول اللہ (ﷺ) سے اسی آسان اور فطری طریقہ سے دین سیکھا تھا، اسی وجہ سے ان کا علم عمل کے ساتھ تھا اور ان کے اعمال میں حضور (ﷺ) کے اعمال کی کیفیات بھی آگئی تھیں۔ پھر یہ طریقہ بڑا سستا ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ بالکل نہ خرچ ہے، اس میں نہ فیس دینی پڑتی ہے، نہ کتابوں کی قیمت کی فکر کرنی پڑتی ہے، نہ مدرسوں کے لئے عمارتیں بنوانی پڑتی ہیں، نہ اسٹاف کی خواہ کا سوال ہے اور وقت بھی مستقل نہیں دینا پڑتا، اگر مسلمان ہماری بات مان لیں اور تبلیغی جماعتوں کے پروگرام اور طریقہ کے مطابق وہ کچھ وقت گزاریں اور اس کو زندگی کے پروگرام میں داخل کر لیں تو بغیر کسی

بڑے خرچ کے اور بغیر کسی وسیع تعلیمی انتظام کے انشاء اللہ عام مسلمانوں کو دین آسکتا ہے، اور ان کی زندگی دینی زندگی بن سکتی ہے۔

بہر حال کلمہ اور نماز کے بعد تیسری بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کا فیصلہ کریں کہ انھیں دین سیکھنا اور دین پر چلنا ہے، اور اپنی زندگی کو کلمہ والی زندگی اور نماز کے نمونے کی زندگی بنانا ہے، اور میں بتلا چکا ہوں کہ ہمارے نزدیک اس کا آسان اور عمومی طریقہ یہ ہے کہ دین سیکھنے سکھانے کے لئے اور دین کی دعوت پھیلانے اور اس کی تربیت حاصل کرنے کے لئے جماعتوں کی اور قافلوں کی شکل میں پھرنے کا رواج مسلمانوں میں عام ہو جائے۔

(اس کام میں یعنی اپنی زندگی کو دینی زندگی بنانے میں جن چیزوں سے خاص مدد ملتی ہے ان میں ایک اللہ کے ذکر کی کثرت بھی ہے، اس لئے ہم اس سلسلہ میں اس کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔)

چوتھی بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ ہماری ان تین باتوں کو قبول کرنے کے علاوہ اس کا بھی فیصلہ کریں کہ ان باتوں کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش کو بھی انھیں اپنی زندگی کا جزو بنانا ہے، اور اس کے لئے انھیں محنتیں اور قربانیاں کرنی ہیں۔ پھر اس کوشش کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک انفرادی، دوسری اجتماعی، اس اجتماعی کی بھی دو شکلیں ہیں، ایک اس مقصد کے لئے ہمارے اس اجتماع کے قسم کے دعوتی اجتماعات کا قائم کرنا اور لوگوں کو ان اجتماعات میں لانے کی کوشش کرنا، جہاں انھیں تفصیل سے اس دعوت کو اور اس کے پروگرام کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملے، اور دوسرے جماعتیں بنانا کہ اس مقصد کے لئے سفر کرنا اور لوگوں کے پاس پہنچ پہنچ کر ان کو دین کی اور دین کے لئے کوشش کی دعوت دینا۔ دونوں شکلیں اجتماعی کوشش کی ہیں۔ اور ہماری اس اجتماعی جدوجہد کے جس کو آپ حضرات تبلیغی تحریک کہتے ہیں یہی دوبازو ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دین کی دعوت اور کوشش کی بس یہی دو صورتیں ہیں، یہ تو دراصل اجتماعی جدوجہد کی صورتیں ہیں اور ان کا مقصد اس دینی جدوجہد کا امت میں ایک نظام قائم کرنا ہے، انفرادی کوششوں کا خانہ ان کے علاوہ ہے، اور اس کا کوئی متعین ضابطہ اور پروگرام نہیں ہے، اس کے لئے تو ہم ہر اس مسلمان بھائی سے جو ہماری اس دینی دعوت کو ٹھیک سمجھتا ہے بس یہ کہتے ہیں کہ اس کو اپنی ذاتی دعوت بنالے اور حکمت کے ساتھ انفرادی طور پر بھی دین کی طرف دعوت کا کام کرتا رہے، اور اللہ کے بندوں کو دین کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں سرگرم رہے، گھر میں، محلے میں، دفتر میں، کارخانے میں، دوکان پر، ہوٹل میں، غرض جہاں بھی اس کا وقت گزرے اور جب بھی اسے مناسب موقع نظر آئے وہ اپنے مسلمان بھائیوں میں دین کے لئے کوشش کرے۔

الغرض پہلی تین باتوں کے بعد چوتھی بات ہم مسلمانوں سے یہی کہتے ہیں کہ دوسرے مسلمان بھائیوں میں دین کی ان بنیادی باتوں کی تبلیغ کے لئے اور ان میں دینی زندگی کو عام کرنے کے لئے اور دین کی اس جدوجہد پر ان کو بھی لگانے کے لئے وہ ان میں بھی چل پھر کر کوشش کریں، جماعتوں کی شکل میں اور اجتماعات کی شکل میں اجتماعی کوشش بھی کریں اور اپنے طور پر انفرادی کوشش بھی کریں، اور اس کوشش کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں۔

دین کی جدوجہد اس امت کی روح حیات ہے، جب سے امت میں دین کے لئے جدوجہد کا رواج ختم ہوا اس وقت سے امت کا عموم گویا ایک بے روح جسم ہو کر رہ گیا ہے، ہمیں اس کا پورا پورا یقین ہے کہ موجودہ حالات میں دین کی جدوجہد کے عام ہونے سے ہی اس امت میں نئی زندگی اور نئی روح آ سکتی ہے، اس لئے ہم اس پر ہر چیز سے زیادہ زور دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ زمانہ عوامی دعوتوں اور تحریکوں کا ہے، اور اس دور میں وہ نظریے اور زندگی کے وہ طریقے باقی نہیں رہ سکتے جن کے لئے کوئی دعوت اور عمومی جدوجہد نہ ہو، اس لئے دین کی دعوت اور دینی زندگی کی جدوجہد کو ایک عمومی تحریک بنائے بغیر ہم اپنی موجودہ اسلامیت کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ لادینی تحریکوں کے اس طوفانی زمانے میں ہمارا اور ہماری نسلوں کا اسلام پر قائم رہنا اب بظاہر اسباب اسی پر موقوف ہے کہ دین کی دعوت اور جدوجہد کو ایک عوامی تحریک کی طرح مسلمانوں میں عام کر دیا جائے اور ہر شخص کو دین کا داعی بنانے کی کوشش کی جائے، ہم بس یہی کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے ہمارے پاس یہی پروگرام ہیں جو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کئے۔

ہم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمارے جھنڈے کے نیچے آجائیں، یا ہماری تنظیم میں داخل ہو جائیں، ہمارا کوئی جھنڈا اور کوئی نشان نہیں ہے، اور ہم نے کوئی جماعت منظم نہیں کی ہے، ہماری دعوت بس یہی ہے کہ حقیقی ایمان اپنے اندر پیدا کرو، دین کو اپنی زندگی بناؤ، اور دوسروں میں اس کے لئے جدوجہد کرو، اور اس راہ میں نقصانات اور تکلیفیں اٹھانے کی اور قربانیاں کرنے کے انبیاء کے طریقے کو پھر سے زندہ کرو، اللہ تعالیٰ اسی زندگی سے خوش ہیں اور اسی زندگی پر اس کی طرف سے رحمت کے اور دنیا و آخرت میں سرخ روئی اور سرفرازی کے وعدے ہیں۔

دین کے واسطے جدوجہد کی ہماری اس دعوت کو اللہ کے جو بندے قبول کر لیں ہم ان سے دو تین باتیں اور بھی کہتے ہیں، ایک یہ کہ دوسروں میں دین کی کوشش خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی وہ ہمیشہ اس نیت سے اور اس یقین کے ساتھ کریں کہ یہ خود ان کی اپنی ضرورت ہے اور اس میں خود ان کی دینی ترقی اور تربیت ہے،

اور یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور اگر قبول ہو جائے تو اس راستے کے ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب ثواب ملنے والا ہے۔ اس کے کہنے کی ضرورت ایک تو اس لئے ہے کہ ہماری اس دنیا میں خالص مادی اور دنیوی تحریکوں کے رواج اور غلبہ کی وجہ سے خود ہمارے ذہن اس قدر مخ ہو گئے ہیں کہ اس قسم کے کاموں میں اللہ کی رضا اور آخرت کے ثواب کے تصور کے بھی ہم عادی نہیں رہے، اور دوسرے یہ کہ دعوت و تبلیغ جیسے کاموں میں جاہ طلبی اور بڑا بننے کی خواہش کا بڑا خطرہ ہے۔ بہر حال اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ اس کام کے کرنے والے اپنی نیت کو درست رکھیں اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرنے کا خاص اہتمام کریں اور اپنے دل کی نگرانی کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہونے کے لئے ہر کام میں اخلاص شرط ہے۔

تو دینی جدوجہد کی ہماری دعوت کو قبول کرنے والے اپنے بھائیوں سے ایک بات تو یہ کہتے ہیں۔ اور دوسری بات ان سے یہ کہتے ہیں کہ اس کام کی وجہ سے ان کے اندر ہرگز ہرگز اپنی بڑائی اور بالا تری کا احساس نہ پیدا ہو، اور دوسرے بندوں کی تحقیر نہ ہو، نہ دل سے، نہ برتاؤ میں، ہر مسلمان کو ہم اپنا بھائی سمجھیں، اس کی خیر خواہی اور ہمدردی اور اس کے ساتھ نیک گمانی اور خیر اندیشی کو اس کا اپنے پر حق سمجھیں، کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس میں کچھ برائیاں اور کچھ خوبیاں نہ ہوں، ہمیں اپنی زندگی کا اصول یہ بنانا چاہئے کہ اپنی تو برائیوں کو ہم زیادہ دیکھیں اور دوسروں میں ہم خوبیوں کی تلاش کریں اور ان کی قدر کریں۔

آج کل کی ہماری مصیبتوں میں سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی صرف خوبیوں کو دیکھنے کا عادی ہے اور دوسروں میں اس کو صرف برائیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں، خود ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے کو بے قصور اور دوسروں ہی کو قصور وار ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہم کبھی اپنے پر الزام لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، سارا الزام دوسروں ہی پر رکھنا چاہتے ہیں، اور اپنے وقار کی حفاظت کے لئے بسا اوقات دوسروں کو ذلیل کرنے سے ہم نہیں چوکتے، بلکہ دوسروں کی تحقیر اور تذلیل میں اور ان کی برائیوں کی تشہیر میں ہمیں لذت ملتی ہے، یہ چیز بڑی مہلک اور تباہ کن ہے اور دین کی جس جدوجہد کی ہم آپ کو دعوت دے رہے ہیں اس کے لئے تو یہ زہر ہے زہر! اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی یہ چیز سخت مبغوض ہے، حدیث شریف میں ہے ”حسب امرء من الشر أن يحقر أخاه المسلم، التقوى ههنا، التقوى ههنا، التقوى ههنا، وأشار الى صدره ثلثاً“ یعنی کسی آدمی کے لئے یہ برائی بہت کافی اور بہت بڑی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی تحقیر کرے یا اس کو تحقیر سمجھے، تقویٰ (جس کی وجہ سے آدمی اللہ کے نزدیک مکرم اور محترم

ہوتا ہے) وہ یہاں سینے میں، دل میں چھپا ہوتا ہے۔

حضور (ﷺ) نے یہ آخری بات تین دفعہ ارشاد فرمائی اور ہر دفعہ آپ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا، حضور (ﷺ) کا مطلب یہ تھا کہ کسی شخص کو تقوے سے خالی سمجھ کر اس کی تحقیر کا تمہیں کوئی حق نہیں، کیونکہ تقویٰ سینے کی اور دل کے اندر کی چیز ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسلمان کی آبرو ایسی ہی احترام کے قابل ہے جیسا کہ اللہ کا شہر مکہ اور حج کا مقدس مہینہ اور خاص حج کا مبارک اور محترم دن۔

بہر حال اللہ کے جو بندے دین کی یہ خدمت کریں اور دینی جدوجہد کی ہماری دعوت کو قبول کریں ان سے خصوصیت کے ساتھ ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نیک گمانی، خیر خواہی اور اکرام و احترام کو اور ان کی تحقیر و تذلیل سے بچنے کو اپنا اصول بنائیں، دوسرے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو کی طرح عزیز سمجھیں اور اس کو اپنی مستقل عادت بنائیں، دوسرے مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل سے ہمیں ویسے ہی تکلیف ہونی چاہئے جیسی کہ اپنی تحقیر و تذلیل سے ہوتی ہے، میں بغیر کسی انکساری کے کہتا ہوں کہ یہ باتیں خود مجھے بھی پوری طرح حاصل نہیں ہیں، لیکن مجھے اور آپ کو یہ باتیں اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں اور ان کے لئے کوشش کرنی چاہئے اور ان کے لحاظ سے جو کمی ہے اس پر پرونا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنی چاہئیں۔

اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ اس دعوت اور اس جدوجہد کی مشکلات کے سلسلہ میں ہمیں اللہ کے ذکر کی اور دعا کی کثرت سے طاقت اور مدد حاصل کرنا چاہئے، اللہ کا ذکر روح کی اور دل کی طاقت ہے، اور دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، اگر ہم نے ذکر اور دعا کی اہمیت کو کبھی نظر انداز کیا اور خدا خواستہ ہمارا یہ پہلو کمزور ہوا تو ہماری یہ تحریک اور خود ہم اللہ کی نظر سے گر جائیں گے۔ قُلْ مَا يَعْجَبُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ۔

حضرات! بس یہ ہے ہماری دعوت، اور یہ ہیں ہمارے اس کام کے اصول، اور یہ ہے ہماری اس تحریک کا پروگرام اور طریقہ کار، میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم نے اس کام کے لئے کوئی جماعت یا انجمن قائم نہیں کی ہے، اس کام کے ساتھ خود ہمارے تعلق کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کو ہم نے دیکھا کہ وہ اس کام کو کر رہے ہیں اور دوسروں سے بھی کہتے ہیں کہ تم بھی اس کام کو اپنا کام بنا لو اور اپنی زندگی کے پروگرام میں اس کو داخل کر لو، ہم نے ان کی دعوت پر کام کو دیکھا، اس کے نتائج کو دیکھا، پھر خود کر کے دیکھا اور ہمیں اطمینان ہو گیا کہ یہ کام کرنے کا ہے اور اللہ و رسول کی مرضی کے مطابق ہے، اور اس کی راہ میں محنت اور قربانی کرنا اپنی زندگی کا اور ہماری قوتوں کا سب سے اچھا مصرف ہے، بس اللہ کی توفیق سے ہم نے

یہ فیصلہ کر لیا اور جیسا کچھ ٹوٹا پھوٹا ہو رہا ہے کر رہے ہیں، آپ سے بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ اس کام کو دیکھئے، سمجھئے، تجربہ کیجئے اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کا دل کھول دے تو اپنا کام سمجھ کے اپنے طور پر کیجئے، ہمارے ساتھ دامن باندھنے کی ضرورت نہیں، ہماری حیثیت محض اس مؤذن کی ہے جو اذن دے کر اپنی طرف نہیں بلاتا بلکہ اللہ کی طرف اور نماز کی طرف بلاتا ہے، ہاں ہمیں اس کی حرص ضرور ہے کہ اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندے ہماری اس دعوت اور ہمارے اس مشورہ کو قبول کر لیں اور جہاں تک ہو سکتا ہے ہم اس کی کوشش بھی کرتے ہیں، لیکن یہ اس لئے نہیں کہ ہم اپنا جتھا بڑھانا چاہتے ہیں، میں بتلا چکا ہوں کہ ہم نے کوئی جتھا بنایا ہی نہیں اور کوئی جماعت قائم ہی نہیں کی، بلکہ ہماری یہ حرص اور کوشش صرف اس لئے ہے کہ ہم دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) کی امت میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کا اس وقت یہی سہل اور عوامی راستہ ہے، اور جتنے اللہ کے بندوں کو ہم اپنی کوششوں سے اس طرف لگا سکیں گے اور پھر اس سلسلہ میں اللہ کو راضی کرنے والا وہ جو کام کریں گے اور دین کے لئے جدوجہد کریں گے، اس کے اجر کے حصے سے اللہ تعالیٰ ہم کو بھی محروم نہ رکھیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق تو میں بالکل ایمان داری سے بغیر کسی انکار کے کہتا ہوں کہ میرے اعمال بالکل بھروسہ کے قابل نہیں ہیں، اس لئے اس کی کوشش کرتا ہوں کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو دین کی طرف اور دین کی خدمت کی طرف متوجہ کروں، وہ جب اس طرف متوجہ ہوں گے تو ان کے اعمال انشاء اللہ مجھ سے بہتر ہوں گے اور قابل قبول ہوں گے، اور انشاء اللہ ان کے طفیل میں اس گنہگار کا بیڑا بھی پار ہو جائے گا۔ بس یہ خود غرضی ہے جو ہم سے اور ہمارے دوستوں سے یہ کوشش کراتی ہے، اور اس راستے میں کبھی کبھی ہم اپنے دوستوں سے اصرار بھی کر بیٹھتے ہیں جس سے ہمارے بہت سے احباب ہم نے سنا ہے کہ کبھی کبھی آزرہ بھی ہو جاتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ میری اس وقت کی اس گزارش سے آپ حضرات نے ہمارے کام اور ہماری دعوت کو اور اس سلسلہ میں ہماری پوزیشن کو بھی کسی حد تک سمجھ لیا ہوگا اور اب اس کا حق یہ ہے کہ آپ حضرات اس کام کے کرنے کا اور اس کو جزو زندگی بنانے کا فیصلہ بنائیں، دین کی دعوت صرف سننے کے لئے نہیں ہوتی، اور وہ لوگ دین کی بڑی ناقدری اور خود اپنے پر بڑا ظلم کرتے ہیں جو دین کی باتوں کو صرف سن لیتے ہیں اور ان کا حق ادا کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے۔

قرآن پاک میں ان خوش نصیب بندوں کو بشارت دی گئی ہے جو اچھی بات سن کر اس کو قبول کرتے ہیں اور اپنا لیتے ہیں، ارشاد ہے: ”فَبَشِّرْ عِبَادِيَ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ“

(۲)

آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور آپ کی منزل کیا ہے؟

مدارس عربیہ کے طلبہ سے خطاب

[ہمارے دینی مدارس کے طلبہ بالعموم ایک احساس کتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک فرد ہونے کے ناتے حضرت صاحب سوانح کو ہمیشہ اس کا تکلیف دہ احساس رہا۔ آپ کی تدریسی زندگی کے بیان میں اس تکلیف دہ تجربہ کا ذکر آچکا ہے۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی رکنیت شوریٰ کے نتیجہ میں نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء سے براہ راست تدریسی تعلق بھی کچھ وقت کے لئے رہنے کے زیر اثر اس احساس کو تازہ ہی ہوتے رہنے کا موقع قدرتی طور پر ملتا رہا۔ ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ آپ کے دل میں شدت سے داعیہ پیدا ہوا کہ مدارس کا ایک دورہ کریں اور طلبہ برادری سے براہ راست خطاب کے ذریعہ اس مرض کے ازالہ کی ایک کوشش کریں۔ پس بغیر کسی دعوت کے آپ نے ریاست گجرات کے دورہ کا از خود پروگرام بنایا۔ وہاں کی سرزمین مدارس کو بہت راس آ رہی ہے۔ اس دورہ میں متعدد مقامات کا سفر اور خطابات ہوئے۔ جن میں ایک، دارالعلوم اشرفیہ اور جامعہ حسینیہ کے شہر راندیر میں وہاں کی مرکزی مسجد چنار میں ہوا۔ یہاں اس خطاب کا کچھ حصہ پورا اور کچھ، جگہ کی تنگی کی بنا پر، اجمالی کی شکل میں دیا جا رہا ہے۔ شائقین پورا خطاب آپ کی تقریروں کے انتخاب ”منتخب تقریریں“ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں اور ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ دعا ہے کہ اس خطاب کے ذریعہ طلبائے مدارس عربیہ کو اپنی منزل کی یاد دہانی ہوتی رہے اور وہ دنیا میں اپنا مقام اور اپنی منزل پہچانیں۔]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

”۔۔۔۔۔ اب سے کوئی چودہ سو سال پہلے جب سیدنا حضرت محمد (ﷺ) کی بعثت ہوئی تو انسانی دنیا کے حالات اور نقشہ میں کچھ ایسی تبدیلیاں آچکی تھیں یا کہنا چاہئے اتنی ترقی ہو چکی تھی کہ حکمت الہی کا یہ تقاضہ تھا کہ اسی نبوت کو آخری نبوت قرار دے، اور آپ کے ذریعہ ایسی جامع اور کامل ہدایت دیدی جائے جو ہمیشہ

کے لئے کافی ہو اور اس کا بھی انتظام کر دیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے، اور پھر کسی نئی ہدایت اور وحی کی ضرورت ہی نہ رہے۔ چنانچہ ہمارا اور آپ کا اور سب مسلمانوں کا عقیدہ اور یقین ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کے ذریعہ ایسی ہدایت آگئی اور وہ بالکل محفوظ رہے گی۔ اس لئے اب نبیوں کا پہلا والا کام ختم ہو گیا۔ (یعنی) اب اس کی ضرورت نہیں رہی کہ کسی نبی پر ہدایت کی وحی آئے، بس اب دوسرا کام باقی رہ گیا، یعنی خداوندی ہدایت کو بندوں تک پہنچانا اور ان کو اس پر چلانے کی کوشش اور محنت کرنا۔ یہ کام قیامت تک کے لئے رسول اللہ (ﷺ) کی امت کے ذمہ کر دیا گیا۔

اب یہ امت، محمد یہ جس کے ہم اور آپ بھی فرد ہیں اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ دوسرے پیغمبروں کی امتوں کی طرح یہ بھی اللہ کے آخری پیغمبر سیدنا حضرت محمد (ﷺ) کی امت ہے اور اس کا فرض ہے کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت پر چلے اور اس کی پیروی کرے۔ اور اس کی دوسری حیثیت جو اس کا خاص امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد یہ نبیوں والے اس کام کی ذمہ دار بھی ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں کو وہ ہدایت پہنچائے اور اس پر چلانے کی نبیوں والی کوشش اور محنت کرے اور اس طرح یہ امت کا ربوبیت میں نبیوں کی نائب بھی ہے۔ پھر اس کی ذمہ داری اور نیابت کا ایک عمومی درجہ ہے جس کے لئے کسی خاص درجہ کے علم اور خاص معیار کی صلاحیت کی ضرورت نہیں، اس میں ہر ایمان والے کا حصہ ہے، یہ عام مسلمانوں کا مقام ہے اور یہ بھی بڑا شرف ہے۔ اور اس کا ایک خصوصی درجہ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ (ﷺ) کو اللہ کی طرف سے جو علم وحی کے ذریعہ ملا تھا اور جو ہدایت و شریعت ملی تھی، اپنی صلاحیت اور استطاعت کے مطابق اس کو حاصل کیا جائے اور آپ کی خصوصی نیابت کا حق ادا کیا جائے۔ یہ بہت بڑا درجہ ہے۔ یہ امت کے خواص کا مقام ہے، دراصل یہ لوگ وارثین انبیاء اور نائبین انبیاء ہیں۔

ہمارے یہ مدرسے دراصل وہ کارخانے تھے جن میں قرآن و حدیث اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم دے کر ایسے لوگ تیار کئے جاتے جو رسول اللہ (ﷺ) اس خصوصی نیابت و وراثت کی ذمہ داری سنبھالنے اور اس کو اپنا مقصد زندگی بنا لیتے اور اسی کے لئے وقف ہو جاتے۔ میرے عزیز و آپ کا اصلی مقام و منصب یہی ہے اور ہمارے ان مدرسوں کی اصل غرض و غایت یہی تھی۔

قرآن مجید میں کئی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ آل عمران میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جب ان کی والدہ (امراۃ عمران) نے بچہ پیدا ہونے کی امید محسوس کی (اور انھیں غالباً آثار و قرائن سے یہ گمان تھا کہ لڑکا پیدا ہوگا) تو انھوں نے نذرانی اور کہا کہ یا اللہ میں نے پیدا ہونے والے بچہ کو تیرے لئے وقف کر دیا۔ قرآن پاک میں ان کی نذر کا ذکر ازل

طرح ہے نَزَبَ اِنِّی نَذَرْتُ لَكَ مَا فِی بَطْنِی مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّی اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ..

بنی اسرائیل میں یہ دستور اور رواج تھا کہ اللہ کے نیک بندے اور بندیاں اپنے بعض نومولود بچوں کو اللہ کے لئے وقف کر دیتے تھے، ان کو مُحَرَّرُ زَکَہَا جاتا تھا (یعنی اللہ کے لئے آزاد چھوڑا ہوا) مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم نے اس بچہ کو خدا کی نذر کر دیا۔ اب یہ کوئی کاروبار اور دھندا نہیں کرے گا، شادی بیاہ بھی نہیں کرے گا، گھر بھی نہیں بنائے گا، بیوی بچوں کی ذمہ داری سے بھی آزاد رہے گا، بس خدا کی عبادت اور عبادتگاہ کی خدمت کرے گا۔

امام ابو بکر جصاص رازی نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھا ہے کہ اولاد کو خدا کی نذر کرنے اور وقف کرنے کا یہ طریقہ شریعت محمدی میں بھی ہے، لیکن اس کی شکل شریعت محمدی کے مزاج کے مطابق بدل گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ جن بندوں کو توفیق ہو وہ اپنے بچہ کے متعلق نیت کر لیں کہ ہم اس کو خدا کے لئے اور اس کے دین کی خدمت کے لئے وقف کرتے ہیں، یہ علم دین حاصل کرنے اور دین کی خدمت کے لئے وقف ہوگا۔ پھر وہ بس خدا کا ہو جائے گا اور دین کی خدمت اور اللہ کی رضا جوئی اور عبادت اس کی زندگی کا مقصد ہوگا۔ لیکن ہماری شریعت میں وہ نکاح بھی کر سکے گا، کوئی معاشی مشغلہ بھی اختیار کر سکے گا لیکن اس کا مقصد زندگی اور اس کا اصلی کام بس دین کی خدمت ہوگا اسی کے لئے جینا مرنا ہوگا۔ تو میرے عزیز وہم آپ جو ان دینی مدرسوں میں پڑھنے آتے ہیں ان کو دراصل اسی طرح کا ”محَرَّرُ“ ہونا چاہئے۔

میرا اندازہ ہے کہ آپ عزیزوں میں سے ایسے بہت کم ہوں گے جن کو ان کے والدین یا سرپرستوں نے اس طرح سوچ سمجھ کے اللہ کی نذر اور وقف کیا ہو اور اسی نیت سے دین کی تعلیم میں لگایا ہو، لیکن اب آپ کو یہ موقع حاصل ہے کہ آپ خود اپنے لئے یہ نیت اور فیصلہ کر لیں اور اپنے کو خدا کی نذر اور اس کے دین کے لئے وقف کر دیں۔ جس طرح آپ نماز کی نیت کرتے ہیں اور وہ نماز اللہ کے لئے ہو جاتی ہے اسی طرح آپ پوری زندگی کے بارے میں نیت کر لیں کہ وہ ہم نے اللہ کے لئے اور دین کے لئے وقف کی اب ہم اللہ کے لئے اور دین کی خدمت کے لئے رسول اللہ (ﷺ) کا لایا ہوا علم سیکھیں گے اور دین کی خدمت کریں گے، ہماری زندگی کا مقصد یہی ہوگا، اسی کے لئے ہمارا جینا مرنا ہوگا (مَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ) تو آپ کی پوری زندگی اللہ کے لئے ہو جائے گی، پھر آپ کی حیثیت یہ ہوگی کہ آپ ”حزب اللہ“ میں اور رسول اللہ (ﷺ) کے لشکر میں بھرتی ہو گئے۔

میرے عزیزو! خدا کے لئے سوچو، دنیا میں اس سے بلند کوئی مقام اور مرتبہ نہیں ہے، میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ میں سے کچھ عزیزوں نے اگر ابھی تک اس بات کو نہیں سمجھا تھا تو اب وہ ذہن کی پوری صفائی کے ساتھ یہ نیت اور فیصلہ کر لیں اور اب سے اپنے کو خود اللہ کے لئے اور دین کے لئے وقف

کردیں۔ اور اگر آپ کی نیت میں خلوص اور سچائی ہے تو یقین کر لیں کہ اللہ نے آپ کو قبول کر لیا۔

اس نیت اور فیصلہ کے ساتھ ان شاء اللہ آپ کے اندر بڑی تبدیلی آئے گی، آپ کبھی بھی اس احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں گے جس میں ہمارے مدرسوں کے بہت سے طلبہ بلکہ بد قسمتی سے بعض علماء تک گرفتار ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں بڑے خسارے اور گھٹائے میں ہیں، عالم، مولوی ہونے کے بعد ہمیں کوئی بڑی نوکری نہیں مل سکتی، ہم دنیا کے عیش و آرام سے ہمیشہ محروم رہیں گے، ہمیشہ غریبی اور مفلسی کی تکلیفیں اور ٹھوکریں ہمارا مقدر رہیں گی۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم خدا کے ہو گئے ہیں اور رسول اللہ (ﷺ) کے لائے ہوئے دین کی خدمت کو ہم نے اپنا مقصد زندگی اور مشن بنالیا ہے اور ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ خدا نے ہم کو اس کی توفیق دے کر قبول فرمایا ہے، تو پھر انشاء اللہ کبھی آپ کو یہ احساس کمتری نہیں ستائے گا بلکہ آپ کو احساس ہوگا کہ جو منصب آپ کا ہے اور جہاں آپ پہنچنا چاہتے ہیں وہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی حاصل نہیں ہے، پھر آپ کو وہ قلبی اطمینان اور سکون حاصل ہوگا جو خاص اللہ والوں کا حصہ ہے، اور آپ اپنی اس زندگی کو اور اس راستہ کی غربت اور افلاس کی تکلیفوں کو اللہ کے لئے قربانی اور مجاہدہ سمجھیں گے، اس سودے کو بڑے نفع کا اور کامیابی کا سودا سمجھ کے خوش ہوں گے۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے: فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔

اس سے ہرگز میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میں خدا نخواستہ غرور اور تکبر آجائے اور آپ اپنے کو خدا کالا ڈالا اور صاحب ولایت سمجھنے لگیں، یہ تو اللہ کی نگاہ میں مردود ہو جانے والی بات ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ آپ علم دین کی تحصیل اور خدمت دین کے کام اور اس کے منصب اور ڈیوٹی کو اتنا بلند سمجھیں اور اس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور اللہ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ آپ کو قبول فرمالے اور آپ کو اس طبقہ میں شامل فرمائے، اسی کے ساتھ اپنی ذات کو قصور وار سمجھ کر ہمیشہ اللہ سے معافی مانگتے رہیں اور اس کے سامنے روتے رہیں اور اس کے فضل و کرم سے بھی امید رکھیں۔ تو اپنے عزیزوں سے میری سب سے پہلی گزارش یا نصیحت یہی ہے کہ اگر آپ نے اب تک اپنے اس مقام و منصب کو نہیں سمجھا تھا اور اس طرح کا کوئی فیصلہ اپنے بارے میں نہیں کیا تھا تو خدا کے لئے اب کر لیں اور اس وقت مسجد میں بیٹھے بیٹھے کر لیں۔ جس طرح ایک سیکنڈ میں ایجاب و قبول کے بعد دو اجنبیوں میں بیوی اور شوہر کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اسی طرح آپ ایک سیکنڈ میں اپنے دل سے یہ فیصلہ کر کے اللہ کے ہو جاتے ہیں اور اللہ آپ کا ہو جاتا ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ اس کے بعد آپ کی نظر و فکر میں کیسی تبدیلی اور حوصلوں میں کیسی بلندی آتی ہے اور آپ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔۔۔ آج آپ اپنے آپ کو نہ پہچاننے اور اپنے مقام و منصب کو نہ جاننے کی وجہ سے اپنے کو بلکہ اپنے پورے

طبقہ کو بالکل بے قیمت اور اس دنیا کے بازار میں نہ چلنے والا سمجھ کر افسردہ اور غمزدہ ہیں، لیکن اگر آپ اپنے مقام و منصب کو سمجھ کر اپنے بارے میں وہ فیصلہ کر لیں جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور اپنے خود خدا کی نذر اور اس کے لئے وقف کر دیں جس طرح حضرت مریم صدیقہ کی والدہ نے کیا تھا تو پھر انشاء اللہ آپ کا احساس یہ ہوگا کہ ہماری قیمت خدا کے سوا کوئی ادا ہی نہیں کر سکتا ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اسی کے ساتھ میں یقین سے کہتا ہوں، ایسا یقین جس کی بنا پر مجھے قسم کھانا جائز ہے کہ آپ میں سے جو عزیز بھائی سچے دل سے یہ فیصلہ کر لیں گے اور استقامت کے ساتھ اس کی شرطیں پوری کریں گے وہ دیکھیں گے کہ ان پر انشاء اللہ اس دنیا میں بھی اللہ کا فضل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اُن راستوں سے عطا فرمائیں گے جن کا انھیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا، جو اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔ مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ لِلّٰهِ لَہٗ۔

میں اس موقع پر خود اپنی مثال آپ کے سامنے رکھنے میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں سمجھتا، میرا اصل وطن یوپی میں سنہیل (ضلع مراد آباد) ہے۔ یہ سنہیل اصطلاحی اور قانونی حیثیت سے تو قصبہ اور سب ڈویژن ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر ہے، ایک لاکھ سے اوپر آبادی ہے۔ اب سے ۶۰-۷۰ سال پہلے میرے والد ماجد اس قصبہ کے رئیسوں اور دولتمندوں میں شمار ہوتے تھے، ان کے لئے اس کی پوری منجائش تھی کہ اپنی اولاد کو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلاتے، لیکن انھوں نے نیت کر رکھی تھی کہ جہاں تک ممکن ہوگا وہ اپنے بچوں کو بس دینی تعلیم دلائیں گے تاکہ آخرت میں ان کے کام آئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میری عمر جب ۱۲-۱۳ سال کی ہوگی تو ہمارے ضلع میں جو انگریز کلکٹر تھا معلوم نہیں کیوں والد ماجد سے وہ اچھا تعلق برپا تھا (اس زمانہ کے انگریز افسران اردو پر قادر ہوا کرتے تھے) اسے جب ایک موقع پر معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے کسی بچہ کو انگریزی تعلیم نہیں دلائی تو اس نے والد صاحب کو ترغیب دی اور میری عمر وغیرہ معلوم کر کے خاص طور سے میرے بارے میں کہا کہ اس کو کل ہی ہائی اسکول بھیج دو، یہ پانچ سال میں انٹرنس کر لے گا اور میں اس کو نائب تحصیلداری دیدوں گا۔ اس زمانہ میں نائب تحصیلداری بڑی چیز تھی، اس سے ترقی کر کے آدمی تحصیلدار ہو جاتا تھا اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو جاتا تھا۔ اور یہی ہندوستانیوں کی معراج تھی۔ کلکٹر عام طور سے اس دور میں انگریز ہی ہوتے تھے، لیکن والد صاحب کی روح پر خدا کی بے شمار رحمتیں ہوں۔ وہ کلکٹر کے اس کہنے پر بھی مجھے انگریزی پڑھانے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ جب ان کے بعض مخلص احباب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے بہت اصرار سے ان سے کہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس کو ضرور اسکول میں داخل کر دینا چاہئے۔ والد صاحب نے آخر میں ان سے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے اطمینان

اور یقین ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھے اپنی اولاد کی کمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، انشاء اللہ میں خود ان کو کھلاتا رہوں گا۔ ہاں مرنے کے بعد قبر میں مجھے ضرورت ہوگی کہ ان کی کمائی مجھے ملے اس لئے میں تو ان کو وہی پڑھاؤں گا جو قبر میں میرے کام آئے۔ تو انھوں نے اس نیت سے مجھے دین کی تعلیم دلائی تھی کہ میں بس دین کی خدمت کروں اور وہ آخرت میں ان کے کام آئے، وہ میری طالب علمی کے زمانے کے بعد بھی مدت تک میری ضروریات کے لئے باقاعدہ تنخواہ دیتے رہے بلکہ زندگی بھر مجھ پر خرچ کرتے رہے۔ میرے نزدیک ان کی نیت اور ان کے اخلاص ہی کا یہ صدقہ ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل ہے، حالانکہ خود دولت مند نہیں ہوں، زکوٰۃ بھی کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ لیکن بہت سے دولت مندوں کو بھی وہ راحتیں اور نعمتیں نصیب نہ ہوں گی جو میرے مالک نے مجھے نصیب فرمائی ہیں۔ ہوائی جہازوں میں اڑتا ہوں، کاروں میں سفر کرتا ہوں حالانکہ خود میرے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہے۔ الحمد للہ زندگی کی سب ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پوری ہوتی ہیں اور بہت اچھے طریقے سے پوری ہوتی ہیں۔ اگر ڈپٹی کلکٹر بلکہ کلکٹر بھی ہو جاتا تو ایسی زندگی مجھے نصیب نہ ہوتی یہ سب میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی نیت اور اخلاص کا صدقہ ہے۔ اور یہ دولت مند نہ ہونا بھی ان ہی کی دعا کا صدقہ ہے۔ وہ حج کو تشریف لے گئے، واپسی پر مجھ سے تنہائی میں فرمایا کہ میں تیرے لئے کچھ نہیں لایا، ہاں ایک دعا میں نے تیرے لئے کی ہے اور ان شاء اللہ وہ قبول ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ تیرے پاس کبھی دولت نہ ہو اور تجھے کبھی تکلیف بھی نہ ہو۔ یہ بات اب سے (۱۹۷۳ء سے) قریباً چالیس برس پہلے کی ہے، اب تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ بالکل یہی ہے کہ دولت میرے پاس کبھی نہیں ہوئی اور الحمد للہ ہمیشہ راحت نصیب رہی، کبھی وہ تکلیف نہیں ہوئی جو غربت و افلاس کی وجہ سے ہوتی ہے اور میں اس پر دل سے راضی ہوں۔

تو میرے عزیزو! میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے اب تک اپنے کو اللہ نذر کر دینے اور دین کی خدمت کے لئے وقف کر دینے کی نیت نہیں کی ہے تو اب اللہ سے یہ معاملہ کر لیجئے، اور پھر اپنے کو اس کے مطابق بنالیجئے۔ میں قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر اللہ تعالیٰ کا بھی آپ کے ساتھ خاص معاملہ ہوگا جس کا اصل ظہور تو آخرت میں ہوگا جو دارالجزا ہے لیکن اس دنیا میں بھی آپ پر کھلا فضل ہوگا، غالباً ہمارے ضعف اور ہماری بے کسی و بے بسی اور ہمارے ماحول کی ناموافقت اور خرابی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ کریمانہ معاملہ برابر اس دور میں تجربہ اور مشاہدہ میں آ رہا ہے کہ جو اپنے کو اس کا بنادے، اللہ تعالیٰ اس کی کریمانہ

(۱) الحمد للہ، اس بیان سے ایک بڑا اشکال حل ہوا، راقم کے ذہن میں سوال آتا تھا کہ والد ماجد نے جب امر دہ کی مدرسی چھوڑ دی تو پھر وسیلہ معاش کیا تھا۔ کیسے وہ اہل و عیال کی ضروریات پوری کرتے تھے؟ اللہ دادا صاحب مرحوم کے درجات بلند کرے اور اجر جزیل سے نوازے۔ میرے دیوبند کے زمانہ تعلیم میں بھی میری ضروریات کا خرچ وہی بھیجتے تھے۔

کلمات فرماتا ہے۔ اور اپنے بندوں کے دلوں کو بھی اس کی طرف متوجہ فرمادیتا ہے۔ کوئی اس کا بن کر تو دیکھے! تو میری پہلی گزارش اور پہلی نصیحت ان دینی مدرسوں میں پڑھنے والے آپ بھائیوں کو یہی ہے کہ آپ اپنے مقام و منصب اور علم دین کے مقصد اور اس کی عظمت کو سمجھیں اور اگر اس راستہ پر چلنا ہو تو ذہنوں کو پوری صفائی کے ساتھ سوچ کر اور نیت کر کے اس راستے کو اپنائیں اور اپنے آپ کو خدا کی نذر کر دیں اور طے کر لیں کہ آپ کو اپنی پوری زندگی اور پوری صلاحیتیں اور توانائیاں حضور (ﷺ) والا علم حاصل کرنے پر اور اس کے ذریعہ دین کی خدمت پر لگا دینی ہیں اسی کے لئے آپ کا جینا اور مرنا ہے۔“

[خطاب کا بنیادی نکتہ یہی تھا جو اوپر آگیا، اس کے بعد تین نصیحتیں آپ نے اور ایسی ہی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ فرمائیں۔ ان باقی تینوں کو یہاں جگہ کی قلت کی بنا پر ہم مختصر اصراف ایک اجمالی انداز میں اور ممکن حد تک آپ ہی کے الفاظ میں دے رہے ہیں، اس سے خطاب کا باقی حصہ بھی انشاء اللہ فی الجملہ ذہن میں آجائے گا۔ تفصیل کے لئے جیسا کہ عرض کیا جا چکا اصل خطاب دیکھنا چاہئے۔ مرتب]

آگے فرمایا کہ: اس کے بعد میری دوسری نصیحت اور دوسرا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ جو علم حاصل کرنا چاہتے ہو جو رسول اللہ (ﷺ) کا بیش بہا ورثہ اور ترکہ ہے، اس کے شایان شاں محنت کرو۔ مدرسہ سے ضابطہ کی جو سند فراغ آپ کو ملتی ہے آپ خود بھی جانتے ہیں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، وہ علم حاصل کیجئے جس کے بعد آپ خود سنبھل جائیں اور اس کا راستہ یہی ہے کہ اپنے کو عاشقوں کی طرح علم کی تحصیل میں جھونک دو۔ اور یہ عاشقوں کی طرح خود کو جھونک دینے اور اس راہ میں ہر زحمت خوشی سے برداشت کرنے کی شان آپ میں جہی پیدا ہو سکے گی جب آپ کو اس کا پورا شعور ہوگا کہ آپ کتنی بڑی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری نصیحت: یہ ہے کہ یہ علم جو رسول اللہ (ﷺ) کا خاص ورثہ اور ترکہ ہے۔ اور پھر کارِ نبوت میں آپ کی نیابت یہ اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص نعمت ہے۔ یہ صرف محنت سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے محنت اور ریاضت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق اور تقویٰ بھی شرط ہے۔ اس لئے میں پورے خلاص اور پیار سے آپ عزیزوں سے کہتا ہوں کہ اپنی زندگی اللہ سے تعلق والی اور تقویٰ والی بنائیے۔ اللہ سے تعلق کا خاص ذریعہ عبادات مثلاً نماز اور تلاوت قرآن اور ذکر اللہ وغیرہ ہیں۔ لیکن یہ شرط ہے کہ نماز اور تلاوت اور ذکر کی صرف صورت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو اور اس میں روح ہو۔ میرا خیال ہے اور تجربہ ہے کہ عام طور سے ہمارے طلبہ کی نماز اور تلاوت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ہمارے عام مسلمانوں کی ہوتی ہے جو سب حانک

اللہم وغیرہ کسی چیز کے بھی معنی نہیں جانتے۔ لیکن وہ طلبہ جن کی تعلیم اتنی ہو گئی ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ اس کا مطلب جانتے ہیں اس کے باوجود توجہ الی اللہ سے اور معنی سے غافل ہو کر نماز پڑھتے ہیں تو سوچئے کہ یہ ان کے لئے کتنی خسارہ کی بات ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کی جیب میں ہزاروں لاکھوں کے نوٹ بھرے ہیں اور وہ انھیں ردی کاغذ سمجھ کر ان سے کام نہیں لیتا۔ پس عزیزو جس وقت آپ نماز کے لئے کھڑے ہوں تو مشکوٰۃ شریف میں پڑھی ہوئی حدیث کے مطابق اِنَّهُ یَسْأَلُ رَّبَّهُ کی کیفیت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ اسی طرح تلاوت کریں تو آپ کو دھیان ہو کہ اللہ میری تلاوت سن رہا ہے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ اللہ نے کیا ارشاد فرمایا۔ تو اگر صرف اتنا ہی کر لیں تو اللہ تعالیٰ کا تعلق حاصل ہونے کو ان شاء اللہ اتنا ہی کافی ہے اور اگر اس کے ساتھ تھوڑے سے ذکر کی عادت بھی ہو جائے تب تو ان شاء اللہ نور ہی نور ہے۔ اگر آپ اس معاملہ میں غفلت کریں گے تو اگرچہ آپ پڑھیں گے بخاری مسلم اور جلالین و بیضاوی لیکن شیطان آپ کو اپنا بنالے گا۔

عزیزو، ایک بات پتہ کی کہتا ہوں، یہ ہماری طالب علموں اور علماء کی جو برادری ہے اس کے لئے دو ہی راستے ہیں یا ہم اللہ والے ہوں گے یا خدا نخواستہ پھر شیطان کے ہوں گے، ہمارے لئے بیچ کا راستہ نہیں ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ابھی سے اللہ سے تعلق پیدا کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔ یعنی جن باتوں کو اللہ نے گندہ اور گناہ قرار دیا ہے ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو۔

اس کے بعد بس ایک آخری بات آپ عزیزوں سے اور عرض کرنی ہے۔ خدا تو فقیہ دے، آپ کو رسول اللہ (ﷺ) کا نائب اور وارث بننا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو حضورؐ سے خاص نسبت و مناسبت ہو اور آپ کے خصوصی اور امتیازی اوصاف میں آپ کا حصہ ہو۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ حضور کی ذات پاک میں کس وصف کا غلبہ ہے؟ آپ کے احوال میں غور کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپ کے اوصاف میں سب سے زیادہ غالب وصف دعا اور اللہ سے مانگنا تھا۔ دنیا میں اللہ سے کسی نے اتنا نہیں مانگا جتنا آپ نے مانگا اور ایسے سوز و گداز سے اور لا چاری و محتاجی کے ایسے شدید احساس اور الحاح کے ساتھ کسی نے نہیں مانگا جیسا آپ نے اللہ سے مانگا۔ تو میرا آخری مشورہ یا آخری نصیحت آپ عزیزوں کو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مانگی ہوئی دعاؤں سے خاص مناسبت پیدا کیجئے، جو حدیث کی کتابوں میں سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اور عادت ڈالنے کے دعا صرف زبان سے نہ ہو جیسا کہ عام خال ہے، بلکہ دل سے اور جہنمندی کے پورے احساس کے ساتھ ہو، دعائے ہی حقیقت میں دعا ہے ورنہ بس صورت دعا۔

(۳)

عید سعید کے موقع کا ایک خطاب

(لکھنؤ میں قیام ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء) کے کچھ عرصہ بعد سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عالیشان مسجد میں عیدین کی نماز کے بعد آپ کے خطاب کا وہ مبارک سلسلہ شروع ہوا تھا کہ اس سے مستفید ہونے والوں کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا تھا۔ لکھنؤ کی کریم کھنچ کر آجایا کرتی تھی۔ اس مبارک سلسلہ کا آخری خطاب یہ (۱۴۱۰ھ) کا خطاب تھا، اور اس کو پڑھ کر یہ کہنے میں ذرا سے بھی مبالغہ کا احساس نہیں ہے کہ۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

شوال المکرم ۱۴۳۲ھ کے الفرقان میں برادر عزیز میاں سجاد نعمانی (مدیر الفرقان) نے ”درد بھری پکار“ کے عنوان سے یہ خطاب شائع کرتے ہوئے ایک نوٹ اس پر لکھا تھا، نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تمہید میں اس کو بھی دوہرایا جائے:

”ہائے کیا دن تھے جو بیت گئے، لکھنؤ کے ہزاروں سنجیدہ اور باشعور مسلمان ہر سال عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا انتظار اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان دونوں موقعوں پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پر شکوہ مسجد میں انھیں ”بڑے مولانا“ کا خطاب سننے ملے گا، یعنی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا۔ ان کا خطاب کیا ہوتا تھا، بلا مبالغہ ہزاروں بندوں کی آنکھیں اس دن اتنے آنسو بہاتی تھیں کہ دل ڈھل جائیں، اور کتنوں کی زندگی کا رخ بدل جاتا تھا۔ ذیل میں ان کا ایک ایسا ہی خطاب پیش کیا جا رہا ہے جو انھوں نے شدید ضعف و نقاہت کے باوجود یکم شوال ۱۴۱۰ھ عید الفطر کی نماز کے موقع پر ان ہزاروں اہل طلب کے سامنے کیا تھا جو ہر سال کی طرح اس دن بھی ان کے ارشادات سننے اور ان کو ایک نظر دیکھنے کے شوق میں وہاں جمع ہوئے تھے۔ اس ناچیز کو بخوبی یاد

ہے کہ اس دن شدید ضعف کی وجہ سے حضرت والد ماجدؒ یہ طے فرما چکے تھے کہ آج کچھ بیان تو نہ کر سکوں گا، لیکن پھر نماز اور خطبہ کے بعد ان کے دل کی کچھ ایسی کیفیت ہوئی کہ اچانک مجھ سے فرمایا کہ: اعلان کر دو کہ میں کچھ عرض کروں گا۔ میں نے جب ان کی صحت کے حوالہ سے کچھ عرض کرنے کی کوشش کی تو گریہ کے ساتھ فرمایا: نہیں، نہیں! ان اللہ کے بندوں سے ضرور کچھ کہوں گا۔ لیجئے سنئے! اور دل کے کانوں سے سنئے! [

حمد و صلوة کے بعد!

میرے عزیزو! میرے دوستو! اور میرے بھائیو! آپ میں سے اکثر لوگوں کو میرا موجودہ حال معلوم ہوگا، اور جن کو نہیں معلوم ہوگا وہ دیکھ کر سمجھ جائیں گے، میرے لئے نقل و حرکت بھی مشکل ہو گئی ہے۔ آنکھ اور کان کی اور جسم و دماغ کی قوتیں رخصت ہو رہی ہیں۔ مجھے خود بھی امید نہ تھی کہ میں آپ کے ساتھ نماز عید میں شریک ہو سکوں گا۔ حسرت کے ساتھ دعائیں کر رہا تھا کہ اس مبارک موقع پر حاضری اور شرکت کا ایک موقع اور مل جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کے پروانے تقسیم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مجمعے اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور ان میں شریک ہونا بہت برکتوں اور سعادتوں کا سبب ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اپنے فضل و کرم سے حاضری کی توفیق عطا فرمادی۔ میرا برسوں کا معمول اس موقع پر آپ حضرات سے کچھ باتیں کرنے کا ہے۔ مجھے اس کی تو بالکل ہی امید نہ تھی کہ اس بار میں کچھ کہہ سکوں گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ صحیح لفظ میری زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے ہیں، لیکن حضور (ﷺ) کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک بات یاد آگئی، بس اس بات کی برکت سے ارادہ کر لیا کہ جو کچھ بھی بن پڑے گا کہوں گا۔ کوئی سمجھے گا یا نہیں، میرا اللہ تو دیکھے گا، اور کیا عجب یہی عمل میری مغفرت کا سبب بن جائے۔

دوستو! جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں، اور کوئی لمبی چوڑی بھی نہیں، لیکن اس سے پہلے سیدنا ابوذر غفاریؓ کا وہ ارشاد بھی آپ کو سنا دوں جس کا میں نے ابھی حوالہ دیا۔ آپ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جن کے دل میں اس ارشاد کو سننے کا شوق پیدا ہو گیا ہوگا، تو سنئے، انھوں نے ایک دفعہ فرمایا تھا:

لَوْ وَضَعْتُمْ الصَّبْصَمَةَ عَلَى هَذِهِ وَ أَشَارَ إِلَى قَفَاهُ . وَ انِّي ظَنَنْتُ نَسْمَعُكُمْ

كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لِأَسْمَعْتُكُمْ هَا قَبْلَ أَنْ تَجِيزُوا عَلَيَّ .

انھوں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اگر تم میری گردن پر تلوار رکھ دو

مگر مجھے امید ہو کہ میں تمہیں رسول اللہ (ﷺ) سے سنی ہوئی ایک بات ابھی سنا سکتا ہوں تو اس سے پہلے کہ تم میرا کام تمام کر دو وہ بات میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔

اور یہ سیدنا ابوذرؓ تھے کون؟ کس مرتبہ کے تھے؟ اس کا اندازہ ان کے بارے میں خود رسول اللہ (ﷺ) کے اس ارشاد سے کیا جاسکتا ہے:

مَا أَقَلَّتِ الْغِبْرَاءُ وَلَا أَظَلَّتِ الْخَضِرَاءُ عَلَى أَصْدَقِ لَهْجَةٍ مِنْ أَبِي ذَرٍّ أَوْ كَمَا قَالَ ﷺ۔ (یعنی یہ کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر بسنے والوں میں ابوذرؓ سے زیادہ سچی اور کھری بات کہنے والا کوئی نہیں۔) تو ان ابوذرؓ نے وہ بات فرمائی تھی، بس اس بات کو یاد کر کے میں نے نیت کر لی تھی۔ کچھ بھی ہو میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔

میرے بھائیو! مسلمان کہلانے والی قوم پر نظر ڈالو تو موٹے حساب سے تین قسم کے لوگ ملیں گے۔
(۱) بہت بڑی تعداد میں تو وہ لوگ ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ ان کے مسلمان ہونے میں ان کا اپنا کچھ حصہ نہیں۔ عملی طور پر ایک دن کے لئے بھی انھوں نے اسلام کو نہیں اپنایا۔ ایسے لوگوں کے مسلمان ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھیں مسلمان ہونے سے صراحتہ انکار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اسلام کو ایک برادری یا ایک قومی نسبت سمجھتے ہیں، یہ بتانے کی ضرورت آپ جیسوں کو نہیں ہوگی کہ یہ طبقہ بڑے خطرے میں ہے۔ اور ہم سب کو اس کے بارے میں فکر مند ہونا چاہئے۔

(۲) دوسرا طبقہ وہ ہے جو اتنا بے تعلق تو نہیں ہے، لیکن اُس نے بھی اسلام کو سیکھنے کی، اپنی زندگی کو، اپنی کمائیوں کو، اپنے اخلاق اور معاملات کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ بس وہ جس حال پر ہے قانع ہے، اگر وہ جمعہ جمعہ کی نماز پڑھتا ہے تو اُسی پر قانع ہے۔ اگر وہ صرف رمضان میں نمازوں کا اہتمام کرتا ہے تو بس اُسی پر قانع ہے۔ اگر اس کے اخلاق یا معاملات میں کوئی خرابی ہے، یا اس کے دل میں حسد کی، کینہ کی، یا بغض و عداوت کی، یا لالچ کی، یا کبر و ریا کی بیماریاں ہیں تو برسوں سے وہ اسی حال میں چل رہا ہے، لیکن اُس نے کبھی شبیدہ فکر نہ کی کہ مجھے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہئے، ان بیماریوں سے نجات ملنی چاہئے، اور مجھے دین کے اعتبار سے ترقی کرنی چاہئے۔ مسلمان کہلانے والی قوم کے مردوں اور عورتوں کی خاصی تعداد اس قسم کی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی اچھا اثر دنیا کی دوسری قوموں پر ہمارا نہیں پڑ رہا۔ اور دن رات کا ساتھ ہونے کے باوجود دنیا میں بسنے والے عام انسان کے دل میں ہمیں دیکھ کر کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا؟ وہ کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے۔

مسلمان کہلانے والی قوم کی جو غالب اکثریت ہے وہ دراصل ان دو قسموں کے لوگوں سے مل کر بنتی

ہے اور اجتماعی طور پر جو حالات ہم پر آرہے ہیں وہ اسی وجہ سے آرہے ہیں۔

(۳) ایک تیسری قسم اُن لوگوں کی ہے جنہوں نے سچے دل سے فیصلہ کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا

عہد کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں طے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو ماننا ہے۔ اور ظاہر و باطن پر ہر

طرف سے ہونے والے نفس، شیطان اور ماحول کے حملوں سے چوکنار ہنا ہے۔ یہ قسم جو بہت تھوڑی

تعداد میں ہے۔ اِنکا دُکا اور خال خال افراد کی شکل میں ہے، یہ بھی معصوم اور بے گناہ نہیں ہے۔ غلطیاں چھوٹی

بڑی ان سے بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے، توجہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ اللہ سے

معافی مانگتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، توبہ کرتے ہیں اور اپنا معاملہ ٹھیک کر لیتے ہیں۔ اور پھر سے طاعت اور

بندگی میں لگ جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ولی ہیں۔ ان کو اپنے تعلق کے بقدر دین کا مزہ آتا ہے۔ اطاعت کا

ذائقہ آتا ہے۔ ان کے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ تکلیفیں ان کو بھی ہوتی ہیں۔ بیماریاں انہیں بھی گھیرتی

ہیں۔ لیکن وہ نہ مایوس ہوتے ہیں، نہ غمگین ”لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون“ کا لطف انہیں اس دنیا

میں بھی جو خوف و حزن کا گہوارہ ہے آنے لگتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ نہیں ہیں جو ہواؤں میں اُڑتے ہیں،

اور پھونک مار دیں تو یہ ہو جائے، وہ ہو جائے، ان کی پہچان اللہ نے یہ نہیں بتائی ہے۔ اللہ نے اپنے ان

دوستوں کی اور ان اپنوں کی پہچان بتائی ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ ایک تو ان لوگوں نے ایمان کی

دولت حاصل کر لی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اس کی بندگی کا احساس انہیں

مسلل رہتا ہے۔ غفلت اور بھول اُن کا مستقل حال نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مستقل حال تو یاد اور احتیاط ہی ہے،

کبھی کبھی بھول جانا الگ بات ہے۔ اصل مسئلہ مستقل حال کا ہے، سو وہ ان لوگوں کا درست ہو جاتا ہے۔

دوستو! بس دو باتیں ہیں اللہ کا ولی بننے کے لئے، ایک ایمان اور دوسری تقویٰ۔ ایمان کا مطلب یہ

ہے کہ دل میں یقین اُتر جائے کہ جو کچھ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا وہ بالکل برحق ہے، اور اسی میں کامیابی

ہے۔ اور تقویٰ یہ کہ اس یقین کے مطابق زندگی میں احتیاط اور پابندی کی عادت پڑ جائے، بے لگام زندگی

سے پیچھا چھٹ جائے۔ عام طور پر لوگوں نے اللہ کا ولی ہونے کے جو مطلب سمجھ رکھے ہیں، یہ اُسی کا نتیجہ ہے

کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگان دین اولیاء اللہ تھے، اور بس! کیا حضور (ﷺ) صرف اسی لئے آئے

تھے کہ آپ کو پوری اُمت میں چار چھ اولیاء اللہ پیدا ہو جائیں۔ نہیں یہ خیال تو آپ کے فیض کی بڑی توہین

ہوگی۔ آپ تو دولت کو عمومی طور پر تقسیم کرنے آئے تھے۔ اور یہ اُسی کا نتیجہ تھا کہ شروع کے دور میں عام مسلمانوں کو یہ دولت ملی تھی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کے انسانوں کے دل اس پوری قوم کی طرف اور اس کے طریقہ زندگی کی طرف اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ کھینچے گئے تھے جتنے آج ان کا دُعا اللہ والوں کی طرف کھینچے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔

لہذا میرے بھائیو! آج ایک بات کا فیصلہ کرو، پہلی اور دوسری قسم سے نکل کر تیسری قسم میں آنا ہے۔ واقعی اب تک جو غفلت ہوئی اس کی تو معافی مانگو، اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والے ہیں۔ لیکن آگے کے لئے نئے سرے سے اللہ کی طرف سفر شروع کرو۔ سورہ زمر کی یہ آیت ہم سے یہی کہتی ہے:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ط إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَ آيِسُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَ اسْلَمُوا لَهُ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ۝

اے محمد! آپ (میری طرف سے میرے بندوں سے) کہہ دیجئے، اے میرے وہ بندو! جنہوں نے (اب تک) اپنے ساتھ بہت (غفلت برتی اور) زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا اور بہت مہربان ہے، اور رجوع ہو جاؤ اپنے رب کی طرف اور اس کی فرمانبرداری اختیار کر لو قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کسی طرف سے تم کو کوئی مدد نہ مل سکے۔

ایک بات اور سن لو! ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں جانے کے لئے بھی انسان کو حرکت کرنی پڑتی ہے، نیچے سے اوپر کی طرف جانے میں انسان کو زیادہ مشقت پڑتی ہے۔ پہلے اور دوسرے طبقہ سے نکل کر تیسرے طبقہ میں داخل ہونے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ راستہ میں مزاحم ہونے والے نفس و شیطان کو شکست دینے کے لئے مضبوط ارادہ اور مسلسل کوشش کی ضرورت یہاں بھی ہوگی۔ یہ جو لفظ اس آیت میں آیا ہے وَ آيِسُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ بس یہی ہے پہلی سیڑھی، ترقی کا پہلا زینہ۔ اور وہ دروازہ جس میں سے نکل کر ایمان اور تقویٰ والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ انابت علماء سے پوچھو، ہاتھ پر کاعل نہیں دل کا فعل ہے۔ یعنی دل سے ارادہ کرو کہ اپنے اللہ کو راضی کرنا ہے، صحیح مسلمان بننا ہے، ایمان اور تقویٰ حاصل کرنا ہے۔ جس دل میں طلب ہوتی ہے وہ اپنے لئے مناسب راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی رہبری فرماتے ہیں۔ وہ جماعتوں میں اسی چیز کی تلاش کے لئے جاتا ہے۔ وہ اہل طلب کی

صحبتیں اختیار کرتا ہے۔ وہ اسی جذبہ سے علماء ربانین کی کتابیں پڑھتا ہے۔ غرض کہ جہاں سے اُسے اس معاملہ میں مدد کی اُمید ہوتی ہے وہاں طالب اور سائل بن کر جاتا ہے۔ پھر جہاں سے اُسے اپنی مایا ملتی ہے وہیں پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔

بس اللہ کے بندو! اس بوڑھے، معذور اور قریب المرگ کی یہ وصیت سن لو، مان لو کہ اپنے موجودہ حال پر قانع نہ رہو، آگے بڑھنے کا فیصلہ کرو، اللہ سے لو لگاؤ، اس سے قرب بڑھاؤ، اور نئے سرے سے نئے حوصلہ سے اس کی طرف سفر شروع کر دو۔ جہاں معلوم ہو کہ یہاں کچھ لوگ اسی مقصد سے جمع ہوتے ہیں پہونچ جاؤ، بات کو سنو، جو راستہ بتایا جائے اس پر چل کے دیکھو، جن لوگوں کو اپنے گرد و پیش میں دین کے اعتبار سے اپنے سے بہتر نیاؤ ان سے پوچھو، مشورے کرو، غرض کہ دل میں ایسی فکر و طلب پیدا کرو کہ اللہ تعالیٰ کو ترس آجائے اور طلب پر اعتبار آجائے۔ کیونکہ وہ اپنے قرب کی دولت قدردانوں ہی کو دیتے ہیں۔

آؤ دعا کریں کہ اللہ ہمارے حال پر رحم کھائے اور ہمیں اپنے قرب کی طلب اور قرب کی دولت دونوں عطا فرمادے۔ اَلَا اِنْ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

سبحانک اللہم وبحمدک نشہد ان لا الہ الا انت تستغفرک و نتوب الیک۔ اللہم صل علی سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد کما صلیت علی سیدنا ابراہیم و علی آل سیدنا ابراہیم انک حمید مجید۔ اللہم اجعلنا من عبادک المسلمین۔ اللہم اجعلنا من عبادک الصالحین۔ اللہم اجعلنا من عبادک المخلصین۔

اے اللہ! ہم آپ کے بندے آپ کے حضور میں حاضر ہیں، ہم ایمان لائے کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور ایمان لائے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے رسول برحق ہیں۔ اے اللہ! ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس ایمان کے بعد جیسی زندگی گذرنی چاہئے تھی ویسی نہیں گذری۔ بہت سے کام جن کا آپ نے حکم دیا تھا ہم سے اُن کے کرنے میں بہت غفلت ہوئی، بہت سے کام جن سے آپ نے سختی سے منع فرمایا تھا ہم سے سرزد ہوئے۔ اے اللہ! ہمیں معاف فرمادے۔ اور آئندہ کے لئے ارادہ کرتے ہیں کہ ایمان اور تقویٰ والی زندگی گذاریں گے۔ اے اللہ! ہمیں اس ارادہ پر چلنے والا بنادے۔ اے اللہ! ہمیں ہمت و استقامت اور سچی طلب عطا فرمادے۔ اے

اللہ! ہم سب کو معاف فرمادے، اے اللہ! ہم سب کو قبول فرمالے! آمین، برحمتک یا ارحم
الرحمین!“

اے دادا حضور کی روح پاک! مرثوہ ہو، کہ حضور (ﷺ) کے دست مبارک سے ملنے والی ”چاندی
کی رکابی“ کے رویا میں جو بشارت تو نے جانی تھی وہ بحمد اللہ حق ثابت ہوئی اللہ تیری اولاد کو توفیق دے کہ وہ
تیری ہی طرح اس کی قدر پہچانے اور قرآنی ہدایت ”اعملوا الٰہ داؤد شکرًا“ (اے اولاد داؤد شکر
گزاری پہ عمل پیرا ہو) کو شعار بنائے رکھے۔

ان جملوں کی شرح حضرت دادا صاحب (صوفی احمد حسین صاحب) کی وفات پر لکھے گئے حضرت
صاحب سوانح کے مضمون کا وہ بیان ہے، جو سابق میں گزر چکا ہے کہ

”ایک زمانہ میں ان کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد کھڑے ہو کے اور اپنے کوروضہ مقدسہ
نبوی پر تصور کر کے چار ہزار بار درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ ذکر فرماتے تھے کہ انہی ایام میں
ایک دن پڑھتے پڑھتے ایک خفیف غنودگی کی سی طاری ہوئی اور ایک ایسی حالت ہو گئی جو نہ نیند تھی
اور نہ بیداری، اسی عالم میں مجھے حضور سرور عالم (ﷺ) کی زیارت نصیب ہوئی اور حضور نے
مجھے دور کا بیاں (پلیٹیں) عطا فرمائیں ایک مٹی کی اور ایک چاندی کی۔ فرماتے تھے میں نے اس
سے یہ سمجھا کہ مٹی کی رکابی دنیا ہے اور چاندی کی رکابی دین ہے، اور مجھے یہ دونوں عطا ہوں گی۔
پھر فرماتے تھے کہ دنیا تو الحمد للہ خوب مل گئی اللہ تعالیٰ نے گزراے کا پورا سامان دے رکھا ہے،
لیکن دین ابھی نصیب نہیں ہوا، شاید میری اولاد میں کوئی ”شام کی اڑان“ کا پیدا ہو جائے اور یہ
بشارت اس کے ذریعہ پوری ہو جائے۔“

یہ ”شام کی اڑان کا“ کبوتر بازی کی اصطلاح ہے۔ جو کبوتر اتنی لمبی اور اونچی پرواز کا ہو کہ صبح کو اڑے
اور پھر دن بھر اڑتا ہی رہے اور شام ہونے ہی پر اترے، اس کو ”شام کی اڑان کا“ کہا جاتا ہے۔ یعنی آخری
درجہ کی صلاحیت پرواز والا کبوتر۔ ایک زمانہ میں شہر اور محلہ میں کبوتر بازی کا شوق بہت عام تھا اور اس کی یہ
اصطلاح (”شام کی اڑان کا“) ایک محاورہ بن گئی تھی۔ بلکہ اب بھی سننے میں آ جاتی ہے۔ سو یہاں دیکھا
جائے، عمر رسیدگی اور عوارض سے ضعف کا یہ عالم کہ کھڑا ہونا مشکل اور الفاظ صحیح نہیں ادا ہو پارہے۔ پراصرار

ہے کہ خواہ جان جائے، بندگانِ خدا جو مجھ سے کچھ سننے کی توقع میں یہاں آئے ہیں میں ضرور ان سے کچھ کہوں گا۔ میں ”شام“ ہونے سے پہلے یہ ”اُڑان“ بند کرنے والا نہیں!

اے اللہ، رحمتِ بے پایاں ہو آپ پر اور آپ کے والدِ بزرگوار پر، اور صلوٰۃ و سلام حضورِ نبی رحمت پر!

بارہواں باب

(مذاق و مزاج، عادات و معمولات، ازواج و اولاد)

آپ کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت سراپا مقصدیت اور اس کے مطابق مشغولیت تھی۔ عمر کا کوئی لمحہ انھیں ضائع کرتے اور کسی ایسے کام میں صرف کرتے نہ پایا جس کے بارے میں خیال ہو سکے کہ آخرت میں کام آنے والا نہیں ہے۔ متعدد اصحاب نبی (ﷺ) کی روایت سے ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ حشر میں آدمی کو چار سوالوں کا سامنا کئے بغیر چھٹکارا نہیں ملے گا (۱) عمر کا ہے میں خرچ کی؟ (۲) اللہ کی دی قوتوں (خاص کر جوانی کی قوتوں) کا کیا مصرف رہا؟ (۳) جو علم پایا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ (۴) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ مال کے بارے میں تو ان کے والد ماجد کی دعا تھی کہ اے اللہ دولت تو اس کے پاس کبھی نہ ہو پر اس کا کام بھی کبھی نہ رکے۔ اور یہ دعا انھوں نے اپنے ابراہیم کے لئے جو انھیں بہت ہی عزیز تھا، عزیز تر ہونے ہی کی بنا پر بیت اللہ الحرام کے روبرو مانگی تھی۔ اور وہ زندگی بھر ان پر سایہ کئے رہی۔ اس لئے مال کے بارے میں تو بظاہر ایسا کوئی خاص سوال ہونے کی نوبت نہ آئی۔ واللہ عند اللہ۔ البتہ عمر انھیں بھرپور عطا ہوئی (۱۳۲۳ھ تا ۱۴۱۷ھ / ۱۹۰۵ء تا ۱۹۹۷ء)۔ جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی وہ سوائے آخری دس پندرہ سال کے نہایت خوش نصیب لوگوں میں تھے۔ اور علم کے باب میں تو ان پر اللہ کا احسان عظیم تھا ہی۔ مگر ان کی زندگی کی جس نمایاں خصوصیت سے بات شروع ہوئی وہ جیسے اللہ نے انھیں انہی تینوں سوالوں سے سرخرو ہو کر نکلنے کے لئے بخش تھی۔

جوان عمری کا حال

راقم الحروف جو آپ کی موجود اولاد میں سب سے بڑا ہے اس کی عمر کوئی تین چار سال رہی ہوگی کہ رنگون (برما) کا ایک سفر آپ کو، ۱۹۳۱ء میں، وہاں کے صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک دینی ضرورت کے لئے

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنؤیؒ کی سرکردگی میں کرنا پڑا اور کوئی چھ ماہ وہاں قیام رہا۔ کئی ہم سن علماء اور بھی ساتھ تھے۔ برما (اور اب مینمار) ایک نیا علاقہ تھا۔ اور ہر نئی جگہ کچھ نئی اور قابل دید چیزیں اور سیر و تفریح کے مقامات ہوتے ہیں۔ مہینوں کے طویل قیام میں پارٹی کے سب ہی افراد کبھی کبھی تفریح کی غرض سے یا نئی چیزیں دیکھنے کی خاطر نکلا کرتے تھے۔ مگر آپ کو وہ کبھی ساتھ نہ لے جاسکے۔ خود سناتے تھے کہ ایک دن ان لوگوں نے کہا کہ بھی آج تو ایک بالکل نرالی چیز دیکھنے چل رہے ہیں اس میں تو چلنا ہی چاہئے۔ پوچھا کیا چیز؟ کہا کہ سفید ہاتھی۔ سناتو بہت تھا مگر معلوم ہوا کہ یہاں عجائب گھر میں وہ موجود ہے، اسی کو دیکھنے چل رہے ہیں۔ فرماتے ہیں؛ میں نے جواب دیا: لا حول ولا قوۃ، یہ بھی کوئی ایسی شے ہوئی! ہاتھی میں نے بارہا دیکھا ہے اور سفیدی بھی۔ میں بآسانی دونوں کو یکجا تصور کر سکتا ہوں، پھر کاہے کے لئے اپنا وقت اس کے لئے کہیں آنے جانے میں لگا دوں، جبکہ میرے وقت کا نہایت بہتر مصرف (مطالعہ، تلاوت، ذکر) موجود ہے! اس وقت ۲۶-۲۷ سال آپ کی عمر رہی ہوگی۔

مردِ کار

وہ اپنی جبلت کے اعتبار سے مردِ کار تھے۔ ہر مشغلہ کو افادیت کی ترازو میں تولنا ان کا طبعی مذاق تھا۔ جہاں ٹھوس اور کھری افادیت نہ ہو ادھر کو ان کی طبیعت راغب ہی نہ ہوتی تھی۔ راقم السطور نے جب سے ہوش سنبھالا بندوق کے شکار کو اپنے گھرانے (دادا جان کی اولاد) کا ایک عمومی شوق پایا۔ مگر معلوم ہوتا ہے والد ماجد نے اس میں کبھی دلچسپی نہ لی، ورنہ ہم کبھی تو دیکھتے کہ سنبھل آئے تو ایک آدھ دن اس تفریح کے لئے بھی چلے گئے۔ ہمارے لئے تو سنبھل پہنچ کر ممکن نہ رہتا تھا کہ اس شوق کا شکار نہ ہوں۔

کوئی پچپن برس کی بات ہوگی، نیند کم آنے کی شکایت ہو گئی۔ کوئی علاج کارگر نہ ہو رہا تھا۔ اس زمانہ میں سال میں کم از کم ایک بار (تبلیغی اجتماع کے حوالہ سے) ضرور آپ کو بھوپال جانا ہوتا تھا۔ اور اہل بھوپال کو آپ سے کچھ خصوصی تعلق ہو گیا تھا۔ وہیں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے آپ کے مشاغل کی تفصیل دریافت

(۱) حضرت امام مالکؒ کے حلقہٴ درس کی بابت ایک روایت ہے کہ ایک دن درس ہو رہا تھا کہ مدینہ میں کہیں سے ہاتھی آ گیا، جو اہل مدینہ کے لئے ایک اجنبی شے تھی۔ شہر اسے دیکھنے کو نکل پڑا اور شور مچا۔ ہاتھی کے نام کا شور سن کر حلقہٴ درس بھی قابو میں نہ رہا، شاگرد بھی تماشاخیوں میں جا شریک ہوئے، بس ایک سچا اٹھو دی رہ گئے۔ (وہی یحییٰ جن کی روایت سے موطا امام مالک عام ہوئی) امام صاحب نے کہا سچے تم ہاتھی دیکھنے نہیں گئے؟ شاگرد نے عرض کی، میں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا میں تو آپ کو دیکھنے آیا ہوں۔ (حضرت مولانا علی میاں کی ایک تقریر سے)

کر کے رائے دی کہ نیند کے لئے آپ کو دواؤں کی نہیں ذہنی تفریح کی ضرورت ہے۔ آپ کا دماغ ہر وقت سنجیدہ مصروفیت میں رہتا ہے اس کو کوئی وقت تفریحی مشغلہ کا ملنا چاہئے۔ ایسے مشاغل کے سلسلہ میں ایک مشغلہ مثال کے طور پر انھوں نے یہ بتایا کہ کبوتر پال لیں اور تھوڑی دیر ان کا دانہ پانی کرتے ہوئے ان سے مشغول ہو جایا کریں۔ بھوپال سے واپس آ کر اس مشورہ کو لطیفہ کے طور پر سنایا اور یہ بس لطیفہ ہی ہو کر رہ گیا۔ یہ یا کوئی بھی دوسرا ہلکا سا تفریحی مشغلہ وہ طبی مشورہ پر اختیار کر لیتے تو یہ یقیناً کوئی وقت ضائع کرنے والی بات نہ ہوتی، لیکن رنگون والا قصہ بتا رہا ہے کہ ان کا مزاج تو بالکل نوجوانی ہی میں ”کام اور بس کام“ کے سانچے میں ڈھل چکا تھا، جبکہ تفریحی مشغلہ کا یہ مشورہ انھیں اس وقت دیا جا رہا تھا جب عمر بچاس سے بھی کچھ اوپر کی پختگی اختیار کر چکی تھی۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اس مزاج کی پختگی ہی نے انھیں دراصل اس مقام تک باذن اللہ پہنچایا جس مقام سے وہ اس دنیا سے اٹھ کر راہی آخرت ہوئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابراہیم الصالحین۔

اس مزاج و افتاد طبع کی فتوحات

آپ کی طالب علمی کے حالات میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابتدائی سات سال آپ نے ”محض ضائع“ کئے۔ اور پھر جب اللہ نے شوق کے اسباب پیدا کر دیئے تو آئندہ سات سال میں ساری کسر پوری کر کے تعلیم کی تکمیل کی۔ انہی سات سال میں آپ کے ”ہمتن کام“ والے مزاج کی بنیاد پڑی اور نتیجہ امتیازی حیثیت میں فراغت پائی۔ پھر اسی مزاج نے آپ کو مناظرہ کے اس میدان میں آکا فانا نمایاں کیا جو آپ کی زندگی کا اولین عملی میدان تھا۔ اپنے اس مزاج کی بدولت وہ اپنے موضوع پر اس غیر معمولی حد تک حاوی ہوئے کہ مقابل مناظر نے اگر کسی ایسی کتاب کی عبارت اپنی دلیل میں پڑھی جو کتاب آپ کے پاس اس وقت موجود نہ تھی تو اس سے کہا کہ کتاب کا ذرا فلاں صفحہ پڑھئے، وہاں آپ کا جواب موجود ہے۔ اس پر اگر مقابل مناظر نے کہا کہ نہیں وہ جواب آپ خود پڑھ کر سنائیے، تو برجستہ اسی ساز کی کوئی کتاب اپنی کتابوں میں سے اٹھالی اور کہا کہ کھولئے فلاں صفحہ فلاں سطر۔ اور حافظہ سے عبارت پڑھنا شروع کر دی۔ اور مقابل کو آخر تک شبہ بھی نہیں ہوسکا کہ عبارت کتاب سے نہیں حافظے سے پڑھی جا رہی ہے، ورنہ مقابلہ ایسی مخلوق سے تھا کہ ذرا شبہ گزرتا تو وہ معاف کرنے والے نہ تھے۔ یہ مناظرہ سلانوالی (۱۹۳۶ء) کا واقعہ ہے۔ تفصیل سابق میں گزر چکی ہے۔

وہ سات سال جس میں آپ نے دل لگا کے پڑھا انہی کے سلسلہ میں یہ کہتے ہوئے کہ اللہ معاف کرے، سناتے تھے کہ منطق کی کتاب قطبی میں نے حفظ کر ڈالی تھی، اور اپنے ساتھیوں کا امام بن کر ”تراویح“ پڑھایا کرتا تھا۔“ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ قطبی کوئی بڑے درجوں کی کتاب نہیں ہے، اس کے بعد کم

ترجمہ چار سال اور فراغت میں لگے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جہاں قطبی کے زمانے میں یہ حال ہو وہاں بخاری اور ترمذی کے زمانے میں کیا رہا ہوگا! اور اسی وجہ سے وہ بات ممکن ہو سکی ہوگی جو اوپر گزر چکی کہ تعلیم کے آخری زمانے میں ہی آپ نے کافی حد تک اس میدان کی علمی ضرورتوں سے خود کو مسلح کر لیا تھا جس میدان سے ”ہل من مبارز“ کی صدائیں آپ کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور فراغت کے ساتھ ہی بے محابا اس میدان میں اتر آئے۔

وقت کے معاملہ میں حساسیت

ہمہ تن کام ہی کے اس مزاج نے انھیں وقت کے معاملہ میں بے حد حساس بنا دیا تھا۔ طبعاً خشک نہ تھے، اس کو تمام قریبی تعلق والے جانتے تھے۔ لیکن بے ضرورت ایک منٹ بھی کسی کو دینا انھیں اپنے وقت کا ضیاع معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں مجلس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، کہ اس میں نشست اور گفتگو کو ان کے معیار ”ضرورت“ کا پابند بنایا جانا مشکل تھا۔ البتہ بعد عصر کے لئے دروازہ پر لکھوا دیا تھا کہ کوئی ملنے آنا چاہے تو اس وقت آجائے۔ کہ یہ وقت عام طور پر کسی خاص مصروفیت کا نہیں ہوتا تھا۔ اور اہل تعلق اس وقت کو بہت غنیمت جان کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے، خاص طور سے ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ۔ اور ان کی وجہ سے ایک غیر رسمی قسم کی مجلس اس وقت میں ہو جاتی۔

بعد عصر کی مجالس

مولانا عتیق احمد بستوی ان مجالس کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں:

”مولانا نعمانی مرحوم کی ہر مجلس بڑی علم آموز، معلومات افزا ہوتی تھی، ان کی مجلس میں لایعنی باتوں کا گنڈ نہیں تھا، حافظہ بڑا غضب کا تھا، پیری اور معذوری کے عالم میں بھی ان کا حافظہ جوان اور تازہ تھا، ساٹھ ستر سال پرانے واقعات اس طرح تفصیل اور یقین کیساتھ سناتے گویا ابھی کل کے واقعات ہوں، ماضی کے اوراق پلٹتے تو تاریخ کا دفتر کھل جاتا، اپنے اساتذہ اور اکابر کے علم و فضل، اخلاص و للہیت، تواضع و بے نفسی کے واقعات بہت مزے لے لے کر سناتے، تحریک آزادی، تحریک خلافت، لیگ و کانگریس کی کشمکش، جمعیۃ العلماء اور خاکسار تحریک کے بارے میں بہت سی وہ معلومات دیتے جو مدون تاریخ کے اوراق میں اب تک محفوظ نہیں ہو سکی ہیں۔ مولانا نعمانی کے بیان کردہ واقعات و حقائق قلم بند کر لئے گئے ہوتے تو تاریخ و سوانح کا بڑا قیمتی اور نادر ذخیرہ ہوتا۔“

مزید: ”ایک بار اکابر دیوبند کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان حضرات کے معاصرین میں ایسے متعدد علماء تھے جو علم و فضل میں ان سے کم رتبہ نہیں تھے، لیکن حد درجہ اخلاص و للہیت اور تواضع کی وجہ سے اکابر دیوبند کا چراغ زیادہ روشن ہوا۔“

انہی مجالس کے حوالہ سے مولانا برہان الدین سنہلی لکھتے ہیں:

”ایک مجلس میں مشہور حدیث جس کے الفاظ یہ ہیں: ان اللہ یبعث لہذہ الامۃ علی راس کل مملۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا“ (ابوداؤد شریف ص ۲۳۳ جلد ۲) پر گفتگو کرتے ہوئے کہ اس سے بظاہر ہر صدی کے سرے پر امت محمدیہ میں مجدد کے آنے کی پیشین گوئی معلوم ہوتی ہے (غالباً مولانا شاہ حلیم عطا سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حوالہ سے) فرمایا کہ یہاں ”راس“ کا لفظ ”مختم“ ہے (یہ ایک خاص اصطلاحی تعبیر ہے جس کا مفہوم قریب قریب ”زائد“ کا ہوتا ہے۔ یعنی ”راس“ کا لفظ زائد ہے) پس مطلب یہ ہوا کہ حدیث میں ہر صدی کے اندر ”مجدد“ آنے کی پیشین گوئی ہے۔ اب خواہ وہ صدی کے ابتداء میں آئے یا وسط میں یا آخر میں۔ پھر قرینہ یا دلیل کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ صدی کے ابتداء و انتہاء کی تعیین تو سنہ ہجری کی ابتداء کے تعیین سے ہو سکتی تھی، اور یہ تعیین آنحضرت (ﷺ) کی وفات کے خاصی مدت بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ہوا، تو حدیث میں عرف عام کے مطابق ابتدا کیونکر مراد ہو سکتی ہے؟ راقم کو یہ افادہ بہت ہی اہم اور گرہ کشا معلوم ہوا (شاید اسی لئے نہاں خانہ دل میں محفوظ بھی ہو گیا) کیونکہ اس سے وہ اشکال بھی دور ہو گیا کہ بہت سے مجددین مثلاً مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، نہ کسی صدی کی ابتداء میں پیدا ہوئے نہ وفات ہوئی۔۔۔۔۔“

(مولانا سے معذرت، کہ عبارت میں کچھ معمولی سا تصرف اسے عام فہم بنانے کے لئے

کرنا پڑا ہے تاکہ بات انہی کے طبقہ کے فہم تک محدود نہ رہ جائے۔۔۔ مرتب)

ایک کیفیت استغراق

ہم تن کام ہی کے اس مزاج نے جو زیادہ تر دماغ ہی سے تعلق رکھتا تھا ذہن و دماغ کو ایک ایسے استغراق کی کیفیت دیدی تھی کہ راستہ چلنے میں بھی ان کو پوری طرح اس سے چمٹکارا نہیں ملتا تھا۔ کسی کے ساتھ چلے ہوئے وہ اگر اس سے بات نہیں کر رہے ہیں تو چہرہ پر نگاہ پڑنے سے صاف نظر آ جاتا تھا کہ دماغ کہیں مشغول ہے۔ دیوبند کے سفر میں رکشا کا جوائیکیٹینٹ ۱۹۷۷ء میں ہوا جس نے کو لھے کی ہڈی میں فریکچر کیا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اسبابی طور پر وہ اسی ذہنی مشغولیت کا نتیجہ تھا، کہ ذہن چوکنای نہ ہو سکا کہ کیا ہونے جا رہا ہے اور کیا کرنا ہے؟ دیوبند کے سفر میں تو یہ ذہنی کیفیت یوں بھی لازمی تھی، کہ وہاں کے

انتظامی حالات آپ کے لئے چیلنج بنے رہتے تھے۔

اس انتہاک واستغراق کی بدولت روزہ ان کے لئے بہت آسان تھا۔ اپنے لکھنے پڑھنے کے کام پر بیٹھنے کے بعد ان کو وقت کا پتہ ہی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ تو روزہ کے عالم میں اس محویت نے عجب ہی تماشہ کیا۔ تبلیغی مرکز لکھنؤ والا مکان تھا، نہایت مختصر مکان۔ اوپر کی منزل میں فقط ایک چھوٹا سا کمرہ تھا بس ایک تخت اور پانک کی گنجائش کا۔ وہی ان کے لکھنے پڑھنے کی جگہ تھی، اس کی پشت کی طرف کھڑکی تھی جو بالائی بالامرکز کی طرف اتر جانے کا کام بھی دیتی تھی۔ اور اذان ہوتی تو اگر وضو نہیں کرنا ہے تو اسی کھڑکی سے نیچے مسجد میں آپ جاسکتے تھے۔ رمضان کے مہینہ میں ایک دن مغرب کی اذان ہو جانے کی بھی اس وقت تک خبر نہ ہوئی جب تک گھر والوں نے یہ دیکھ کر کہ ابھی تک افطار کے لئے نہیں آئے اوپر جا کر انھیں بتایا کہ اذان ہو چکی۔ حالانکہ اذان پکارنے کی جگہ کمرہ سے بالکل متصل تھی۔

دین و ملت کی راہ میں بے نفسی

جماعت اسلامی سے تعلق کے دور میں جو مہینہ ڈیڑھ مہینہ دارالاسلام پٹھانکوٹ میں قیام رہا جہاں راقم بھی ساتھ تھا، وہاں کا ایک واقعہ اس مزاج کی کبھی نہ بھولنے والی یادگار ہے۔ جمعہ کا دن تھا، دوپہر ہو رہی تھی، دیکھا کہ آپ ایک صاحب کے پیچھے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ رہے ہیں، کس لئے؟ پٹھانکوٹ کی کسی مسجد میں جمعہ کی نماز کے موقع پر پہنچ کر تقریر کرنا ہے۔ گزشتہ اوراق سے آپ کی جس حیثیت عرفی کا اظہار ہوتا ہے اس کا تصور کیجئے اور پھر کسی کے پیچھے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کر کہیں تقریر کرنے جانے کا۔ کوئی انتہا اس بے نفسی کی ہے؟ لیکن دین و ملت کی خدمت کے معاملہ میں کوئی چیز آپ کے لئے باعثِ عار نہ تھی۔ سابق میں جہاں کسی تحریکی کام کے لئے آپ کی بے چینی اور بیقراری کا ذکر آیا ہے وہاں یہ آچکا ہے کہ تحریک کی قیادت کے لئے آپ چاہتے تھے کہ یہ ذمہ داری کوئی دوسرا اٹھائے، خود اپنے لئے طے کیا ہوا تھا کہ ”ایسا کام شروع ہونے میں انشاء اللہ اس کا ساتھ دینے والا ایک سپاہی بن سکتا ہوں۔“ اور دارالاسلام کا یہ واقعہ اسی سپاہیانہ جذبہ کی تصدیق کر رہا تھا۔

۱۰۰۔ بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے، ورنہ کہنا صرف یہ تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو بالکل شروع ہی سے اپنے دین برحق کے سلسلہ میں ایسی مقصدی لگن عطا فرمادی تھی کہ عمر کے کسی لمحہ کے لئے کسی غیر شرعی مصرف کا تو سوال ہی کیا، محض مباحات (جائز امور) کا درجہ رکھنے والی باتوں کے لئے بھی مشکل ہی سے گنجائش آپ کے یہاں ہوتی تھی۔ اور یہ لگن اور اس کے مطابق مشاغلِ ظاہر ہے کہ علم پر عمل کے سوا اور کس

بھی خانہ میں نہیں ڈالے جاسکتے، یعنی یہ مشاغل تمام تر نتیجہ اپنے علم پر عمل کے ذوق و میلان کا تھے۔ اور علم مبارک بھی وہی ہے جو عمل کا تقاضہ کرے۔ ورنہ آں حضور (ﷺ) کی دعا ”واعوذُ بکَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ“ کے مطابق اس لائق کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔

دیگر ناگزیر مشاغل؟

رہے زندگی کے وہ تقاضے جن سے مفر نہیں اور جن کا بشری علاقہ مطالبہ کرتے ہیں، تو ان سب میں بھی راقم آثم کی واقفیت کی حد تک آپ کا قدم بس وہیں تک جاتا تھا جہاں فطرت کے تقاضوں اور علاقہ کے حقوق و مطالبات کی ادائیگی ہو جاتی ہو۔ البتہ اس زمرہ کے جن امور میں نفس کی لذت کا کوئی حصہ نہ ہوتا، تمام تر فضیلت ہی فضیلت ہوتے، ان میں وہ ایسے ہی ذوق و شوق سے مشغول ہوتے تھے جیسے کہ مذکورہ بالا مقصدی امور میں۔ مثلاً ”دوستوں“ میں (اور یہ لفظ ان کے یہاں بڑا وسیع تھا) کسی کا انتقال ہو جاتا تو غسل دینے کے لئے خود آگے بڑھتے اور قبر میں بھی اسے اپنے ہاتھوں سے سلانا چاہتے لیکن نماز جنازہ میں کوئی دوسرا صاحب علم موجود ہوتا تو خود پیچھے رہنے کی کوشش کرتے۔ حضرت ضونی عبدالرب صاحب صوفی ایم اے (۱۹۷۵ء) جن سے آپ کا بہت قدیم اور دلی تعلق تھا، دسمبر ۱۹۷۵ء کے الفرقان میں ان کی وفات پر لکھتے ہوئے اس بات کے انوس میں کہ ان کو غسل دینے کا موقع آپ کو نہ مل سکا، لکھا کہ ”اللہ کی توفیق سے میرا معمول ہے کہ اموات کو غسل دینے کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں، خاص کر اللہ والوں کو غسل دینے کی مجھے حرص ہے۔“

اسی طرح ایک طرف یہ حال کہ ضرورت سے زائد کسی کا بات کرنا بھی خوشگوار نہ تھا، دوسری طرف یہ کہ والد ماجد کو آنکھوں کے آپریشن کی ضرورت ہوئی ہے تو ان کو دلی لے جا رہے ہیں اور پھر آٹھ دن، دس دن، جس قدر بھی قیام کی ضرورت ہوئی (جیسا کہ گزشتہ زمانے میں ہوتا تھا) نہایت خوشی سے ان کے ساتھ رہ رہے اور خدمت گزار رہے ہیں۔ پھر والدہ ماجدہ (ہماری دادی صاحبہ مرحومہ) اس ضرورت کے مرحلہ میں آئی ہیں تو انھیں دلی لے جاتے اور خود ہی ساری خدمت گزاری کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب یہی ضرورت آپ کی خالہ صاحبہ مرحومہ کو لاحق ہوتی ہے، اور یہ وہ زمانہ ہے کہ قیام بریلی سے ہٹ کر لکھنؤ ہو گیا تھا، تو انھیں سیتاپور (جہاں لکھنؤ سے قربت کے ساتھ اسپتال بھی یکتا درجہ کا مانا جاتا تھا) لیجاتے اور حسب ضرورت عرصہ تک خدمت گزاری کرتے ہیں۔ پھر آخر میں اپنے بڑے بھائی صاحب (شیخ غلام امام صاحب مرحوم) کو یہ ضرورت لاحق ہوتی ہے تو انھیں لکھنؤ کی دعوت دیتے اور سیتاپور کے اسپتال لیجانے کے لئے اسی طرح وقت فارغ کرتے ہیں۔

رسمیات سے بعد کی کیفیت

اس کے برعکس کسی تقریب کے لئے وقت نکالنا ان کے لئے بڑا مشکل تھا، زیادہ وسیع عنوان سے کہنے تو رسمی قسم کے کسی بھی اجتماع سے ان کو مناسبت نہ تھی، جس کی بعض مثالیں اوپر اسفار کے باب میں گزری ہیں۔ کسی خاص تعلق کی رعایت سے شریک بھی ہوتے تو بالکل نپے تلے انداز میں، بس ایک معاشرتی فرض کی ادائیگی جیسا معاملہ ہوتا۔ کہنے کو کوئی خشک مزاجی بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن ان کی پوری زندگی پر نظر کرتے ہوئے انصاف کی بات غالباً یہ ہوگی کہ ان چیزوں میں ان کی روح کے لئے کوئی لذت کا سامان نہ تھا۔ اور یہ گویا ان کی ”کمزوری“ تھی کہ جہاں ان کی روح لذت نہ پائے وہاں ان کا دل نہیں گھلستا تھا۔ خاص طور سے اگر نمود و نمائش اور آسائش و زیبائش کی کوئی صورت تقریب میں نمود پذیر ہو تب تو وہاں روح جیسے گھٹتی ہو، پس قدم رکھنے کے بھی روادار نہ ہو پاتے تھے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب نے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھوانے کی خواہش کی۔ ان سے کوئی خاص تعلق تو نہ تھا لیکن بظاہر اس بات کو اہمیت دیتے ہوئے کہ وہ ایک دوسرے دینی حلقے سے باضابطہ اور گہرا تعلق رکھتے ہوئے یہ خواہش لیکر آئے تھے آپ نے منظور فرمالیا۔ اس منظوری میں یقیناً اس حسن ظن کا دخل رہا ہوگا کہ نکاح کی تقریب میں وہی سادگی ہوگی جو اہل دین (اور مزید داعی قسم کے اہل دین) کے یہاں ہونی چاہئے۔ بلکہ آپ کے مزاج میں معاملہ اور بات کی صفائی کا جو عنصر تھا اس کی بنا پر تو گمان یہ ہے کہ تقریبات کے سلسلہ میں اپنا اصول بھی بے تکلفانہ بتا دیا ہو۔ یہ تقریب لکھنؤ کی مشہور بارہ درہی قیصر باغ میں ہونا تھی جو ہمارے گھر سے قریب ہی ہے۔ آپ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ رہے تھے کہ مکمل رسمی تقریبات والی آرائش و زیبائش کا منظر سامنے پایا۔ بس وہیں سے گاڑی واپس کرائی اور ان سے معذرت کہلا بھیجی۔ اور جب ایسی ہی خلاف مزاج صورت کی خبر اپنی پوتی کی شادی کے سلسلہ میں پائی تو اس کے ساتھ بھی عدم شرکت کا معاملہ ہوا۔ اور وہ آپ کی کسی پوتی کی شادی کی پہلی تقریب تھی۔

راقم الحروف کے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمن کا نکاح تو راقم کے ساتھ ہی ہوا تھا پر خستہ ایک دو سال بعد ہوئی۔ اس وقت لکھنؤ کے جس مکان میں ہم رہ رہے تھے وہ دو منزلہ تھا۔ نیچے والد ماجد اور اوپر کی منزل میں ہم دونوں بھائی رہتے تھے۔ حفیظ میاں کی دلہن کی آمد کی تاریخ مقرر ہوئی تو جی میں آیا کہ ان کے والے کمرہ کے دروازوں پر روغن کر دیا جائے، کبھی کا پرانا روغن بے رنگ ہو چکا تھا نیز دروازہ پر پردہ ڈال دیا جائے۔ حفیظ میاں کے ایک دوست ان دنوں میں آئے ہوئے تھے ان کی وجہ سے اس کام میں آسانی بھی تھی۔ والد ماجد اس وقت سفر میں تھے باقی سب گھر والے سنبھل گئے ہوئے۔ والد ماجد کو سنبھل ہوتے ہوئے

ان سب کے ساتھ مع دلہن لکھنؤ آنا تھا۔ اس بات کا وہم بھی نہیں گزرا کہ آپ کو یہ نیاروغن اور بالکل سادہ سا رنگین پردہ ناگوار گزرے گا۔ واپسی کے بعد دوسرے تیسرے دن جو اوپر گئے اور دلہن کے کمرہ پر ”دلہیت“ کے آثار دیکھے تو نیچے آ کر نہایت ناخوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ تو اب یاد نہیں کیا فرمایا تھا، بات ۱۵۰۵ء کی ہے، غالباً ناگواری کی خاص وجہ دروازہ کا پردہ ہوا، جس نے ان کے حدیثی ذہن کو کاشانہ نبوت کا واقعہ یاد دلایا ہوگا کہ آنحضرت (ﷺ) ایک سفر سے واپس تشریف لائے تو ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے دروازہ پر ایک زیبائشی پردہ لٹکا ہوا پایا تو بے حد نا پسند فرمایا، کہ اللہ کا حکم نہیں کہ ہم درو دیوار کو لباس پہنائیں۔ (مشکوٰۃ باب التصاویر بحوالہ بخاری و مسلم، بروایت عائشہ)

سادگی و بے تکلفی سے انس

سادہ پسندی اور تکلفات سے دوری بلکہ وحشت مزاج میں بسی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۵ء کی بات یاد آ رہی ہے۔ راقم الحروف کی خرابی صحت پریشان کن بن گئی تھی۔ انگلینڈ میں اقامت پذیر گجرات ضلع بھروچ کے مولانا یعقوب قاسمی صاحب نے الفرقان میں بار بار اس کا تذکرہ دیکھ کر تبدیلی آب و ہوا کے عنوان سے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور ریڈن ٹکٹ ساتھ میں بھیجا۔ یہ ٹکٹ بمبئی سے سفر کا تھا۔ والد ماجد نے ضرورت سمجھی کہ بمبئی تک وہ خود بھی ساتھ چلیں۔ بمبئی ان مقامات میں سے ہے جہاں کے اپنے لوگ انھیں بہت ابتدائی دنوں سے جانتے مانتے آئے ہیں۔ بعض اہل تعلق کو آپ نے اطلاع دیدی تھی۔ خاصی تعداد میں لوگ ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے قیام کے لئے باہمی مشورہ سے جگہ تجویز کر رکھی ہوگی۔ چنانچہ ہم لوگ اسٹیشن سے وہاں لیجا کر اتارے گئے۔ یہ ایک شاندار قسم کا وسیع و عریض امیرانہ مکان، بلکہ صحیح الفاظ میں کوٹھی تھی۔ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا اشتہار ان دنوں الفرقان میں نکلا کرتا تھا۔ یہ اسی کے مہربان مالک کی کوٹھی تھی۔ خود اتفاق سے موجود نہ تھے، بہر حال کوئی غیر لوگ نہ تھے۔ ان کا اشتہار گویا الفرقان کی ایک مالی مدد تھی۔ مگر یہ یقیناً پہلا اتفاق تھا کہ والد ماجد کو وہاں اترنا ہوا۔ آپ پر اس امیرانہ ٹھاٹھ ہاتھ والے مکان کا قیام اس قدر بھاری ہوا کہ اسی شام یا دوسرے دن صبح (اب اچھی طرح یاد نہیں) وہاں سے کوچ کر کے کھوکھا بازار کی مسجد میں، جو تبلیغی جماعت کا مرکز تھی، قیام پسند فرمایا۔ اور پھر جہاز پر سیٹ کی بگنگ اور دوسرے مراحل سفر طے ہونے کے انتظار میں ہفتہ عشرہ کا قیام وہیں رہا۔ مسجد کے اوپر ایک سادہ سا کمرہ تھا، اس کے فرش پر سونا اور لیٹنا ہوتا تھا اور کھانا نہایت سادہ قسم کا نیچے کسی ہوٹل سے آجاتا تھا۔ یہ وہ ماحول اور معیار تھا جس میں ان کی روح خوش رہ سکتی تھی۔ تکلفات کا سایہ اس پر بھاری تھا۔

لکھنؤ میں تبلیغی کام کا کوئی مرکز نہ تھا اس کا ہفتہ وار اجتماع ندوۃ العلماء کی مسجد میں ہوتا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں اللہ کے فضل سے تبلیغ کا اپنا مرکز شہر میں کچہری روڈ پر موجود ایک مسجد کے ساتھ بن گیا۔ اور یہ اس قرارداد پر بنا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب اور حضرت والد ماجد اسی میں قیام کریں گے۔ مولانا علی میاں صاحب کے اہل خانہ تورائے بریلی میں رہتے تھے۔ پس آپ کے لئے تو ایک کمرہ کافی تھا جو باہر مسجد کے ساتھ بن گیا، لیکن والد ماجد کے قیام کے لئے ضروری تھا کہ اہل خانہ کے ساتھ قیام کا انتظام ہو، سو اس کے لئے ایک مختصر سا مکان اس مسجد کے متولی صاحب (حاجی خیراتی صاحب) کے ایثار سے بن گیا۔ یہ مکان اس قدر مختصر تھا کہ بس تھوڑے بہت دن کے ”گزارے“ بھر کا کہا جائے۔ صرف ایک کمرہ اور برآمدہ اور پانچ بچوں کے ساتھ سات نفر کا کنبہ۔ ایک ذرا سا کمرہ اور پر تھا جو آپ کے لکھنے پڑھنے کے کام آتا تھا۔ مگر اسی مکان میں رہنے کا مجاہدہ اس وقت تک کیا گیا جب ملت کے دوسرے وقتی ملتی مسائل نے (جن کا ذکر (باب میں آچکا ہے) آپ کو تبلیغی کام کے لئے خالص نہ رہنے دیا۔ اس مرحلہ پر آپ کا ضمیر اس مکان میں رہنے پر راضی نہ رہ سکا اور فیصلہ کیا کہ وطن (سنہجلی) میں مکان اور زمینوں میں جو حصہ اپنے والد ماجد کی وراثت سے پایا ہے اس میں سے کچھ فروخت کر کے اپنے لئے کوئی مکان خریدیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ مکان خریدا گیا جس میں ایک دفعہ پاکستان کے کوثر نیازی آئے تو کبھی مکان کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کے مکین کو، کہ یا اللہ یہ مکان اور ملت کا ایک ”بطل جلیل“! اتفاق سے مکان کا محل وقوع بھی اس طرح کے تاثر کو تیز کرنے والا۔

عزیزی یحییٰ نعمانی نے اپنے یادگاری نمبر والے مضمون میں لکھا ہے کہ ”نانا جان کی نظر میں کپڑوں وغیرہ مظاہر کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میری والدہ محترمہ (کوثر سلمہا) جو اکثر خدمت میں رہتی تھیں۔ (ع) کبھی

(۱) کوثر نیازی مرحوم بڑے تیز اور ذی صلاحیت لوگوں میں تھے، لاہور کی ایک مسجد کی امامت و خطابت سے اٹھ کر اولاً جماعت اسلامی کی صفوں میں نمایاں اور صاحب منصب ہوئے، پھر مس فاطمہ جناح اور ایوب خاں کے الیکشن کے قصہ میں یاد نہیں کیا پیش آیا کہ جماعت کے موقف کی تائید کرتے کرتے (جس میں راقم کے ساتھ بھی کچھ تحریری کہانسی رہی تھی) ایک دم مختلف الرائے ہوئے حتیٰ کہ باہر نکل گئے۔ بعد ازاں جب مسٹر بھٹو وہاں برسر اقتدار آئے تو ان کی حکومت میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر اس حکومت کا قصہ ختم ہوا تو موصوف بھی بے عہدہ ہوئے اور مختلف سرگرمیوں میں زندگی بتانے لگے، انہی میں ادبی دلچسپیاں بھی تھیں، لکھنؤ ان کا آنا اسی سلسلہ سے ہوا تھا۔ اپنے دینی پس منظر کی بنا پر حضرت صاحب سوانح سے خوب واقف تھے۔ اپنے میزبانوں سے خواہش کی کہ مولانا نعمانی سے ملنا چاہوں گا۔ ان لوگوں نے اس کی صورت بنائی اور ملاقات ہوئی۔ یہ زمانہ آپ کی معذوری کا زمانہ تھا۔ واپس جا کر اس سفر پر جو مضمون (روزنامہ جنگ میں) موصوف نے لکھا اس میں اس ملاقات کا تذکرہ بھی تھا۔ اس تذکرہ کے مطابق ان کی آنکھیں گویا (پاکستان کے علماء کی زندگی سے تقابل میں) پچھلے رہ گئیں کہ یہاں ملت اسلامیہ کا ایک ”بطل جلیل“ ایک ایسے ایسے بے حیثیت مکان میں درویشانہ زندگی گزار رہا ہے!

عرض کرتیں کہ نئے کپڑے بنالیں، تو فرمادیتے کہ بیٹی اب کپڑے کیا بنائیں، اب کفن ہی بنجائے گا۔ ایک کرتا میں کافی عرصہ سے دیکھتا تھا گھر میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ کرتا تیس سال سے زیادہ پرانا ہے۔ گذشتہ ۱۵-۱۶ سال میں ان کے لئے اندر پہننے کی بنیان نما کرتیاں تو کافی سلوائی گئیں مگر کرتے شاید ہی چار پانچ سے زائد سلے ہوں۔“

دوسری روایت اس سے کہیں بڑھ کر: ”ایک مرتبہ ایک تبلیغی اجتماع میں بیان کے لئے بہرائچ جانا ہوا، سفر میں رات کو دیر ہوگئی، اجتماع گاہ پہنچے تو سارے ہی لوگ سو چکے تھے۔ باہر چیلوں کی جگہ پر ہی خالی جگہ ملی، کسی کو جگانے کے بجائے چیلوں ہی پر بستر کھول کر سو گئے۔ آخر شب میں کچھ لوگ اجتماع گاہ سے باہر نکلے تو وہاں کسی کو نا مناسب جگہ سوتا ہوا دیکھ کر سخت ست کہا، مگر ان کی پشیمانی کی کوئی حد نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ سونے والا کون ہے!“

اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ اپنے گھر کا کوئی کام انھیں خود کرنے میں تکلف نہ تھا۔ گھر کی ہر طرح کی ضرورت کے لئے وہ بازار جاسکتے تھے۔ گوشت، سبزی ترکاری لانا ہو، کپڑا خریدنا ہو، غرض جو بھی گھر کی ضرورت ہو اسے وہ بے تکلف انجام دیتے، الا یہ کہ کوئی دوسرا اسے انجام دینے کو ہو۔ اور اللہ کا فضل تھا کہ دین کے فہم کے ساتھ امور دنیا کی سمجھ بھی اس نے بھرپور عطا فرمائی تھی۔ گھر کے کام کے علاوہ اپنے ذریعہ معاش کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات کی تیاری کے سلسلہ میں حسب ضرورت ہر کام بے تکلف خود انجام دیتے۔ کتابت کی تصحیح تو اکثر خود ہی کرتے تھے، ضرورت ہو تو پریس جاسکتے، کاغذ کی خریداری میں اگر ضرورت سمجھتے تو خود ہی جاتے۔

خادم نہ کہ مخدوم

اس مزاج نے انھیں عمر کے اس آخری دور کے سوا جس میں معذورانہ مجبوری کی صورت پیدا ہوگئی تھی ”خدا م“ سے ہمیشہ بے نیاز رکھا۔ سفر آئے دن تیار رہتا تھا اور تنہا ہی کرتے۔ محض خدمت یا معاونت کے نام سے کسی کو ساتھ لینے کا سوال نہ تھا بلکہ کوئی تعلق والا کسی عنوان سے از خود کسی سفر میں ساتھ ہو گیا اور دل میں یہ سوچ لیا کہ راستہ میں خدمت کا بھی موقع ملے گا تو اسے محض مایوسی کا موقع ملا۔ چودھری عبدالمنان نام کے ایک صاحب (اللہ غریقِ رحمت کرنے) بہت محبت و عقیدت رکھتے تھے، غالباً دیوبند کے ایک سفر میں اسی طور پر ساتھ ہو لئے۔ واپس آ کر بتانے لگے کہ ”بھئی کان پڑے، خدمت کا سوچ کر گئے تھے اُلٹے مخدوم بن کر آئے ہیں۔ جس ضرورت کے موقع پر چاہا کہ اسے انجام دیں تو فرمایا کہ نہیں تم بیٹھو میں زیادہ واقف ہوں

کہ مثلاً چائے اس اسٹیشن پر کہاں اچھی ملتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے ساتھ ہماری بھی خدمت کرتے گئے۔ اور کرتے آئے۔“

شیخ بے مشینت

آپ کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر شیخ سے خلافت حاصل تھی۔ اور پھر شیخ کی نظر میں ان کا درجہ وہ تھا جس کے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ راوی ہیں کہ ”اگر اللہ نے قیامت کے دن پوچھا کہ میرے لئے کیا لائے ہو؟ تو آپ نے دو نام لے کر جن میں ایک مولانا منظور صاحب کا تھا فرمایا کہ ان دو کو بارگاہ الہی میں پیش کروں گا۔“ اس مرتبہ و منزلت کے باوجود نہیں دیکھا گیا کہ دینی خدمات کا وہ ذوق و شوق رکھتے ہوئے جو زندگی بھر ان کی پہچان بنا رہا، بیعت و ارشاد کے ذریعہ انجام دی جانے والی دینی خدمت کی اس نہایت بلند مرتبہ راہ کو بھی اسی ذوق و شوق والے انداز سے اپنایا ہو۔ حالانکہ انھیں تو خود اس راہ سے بہت کچھ نفع پانے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ بیعت وہ کر لیتے تھے مگر عام طور پر ایسی خاموشی و پردہ داری سے کہ بیعت ہونے والوں کے سوا کم ہی لوگ ان کی زندگی کے اس پہلو کو جانتے ہوں گے۔ حد یہ ہے کہ راقم نے بھی کبھی کسی کو ان کے ہاتھ پر بیعت ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور اس کا راز بھی راقم کی نظر میں یہی ہے کہ ایسا نہ کرتے تو خواہی نہ خواہی مشینت کا ہالہ ان کے گرد بن جاتا۔ ان کے آگے پیچھے لوگ ہوا کرتے، اور یہ بات انھیں بالکل پسند نہ تھی۔

یہاں حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کا واقعہ یاد آتا ہے۔ حضرت ابن کعبؓ کا یہ مرتبہ صحابہ کے درمیان تھا کہ خود آنحضرت (ﷺ) سے استاذ القراء کی سند ملی ہوئی تھی، اس امتیاز کی بنا پر ان کا قرآنی حلقہ درس مسجد نبوی میں ہوتا تھا۔ ایک دن درس کے بعد مسجد سے نکل کر جا رہے تھے اور شاگردوں کا حلقہ پیچھے چل رہا تھا، اسی میں حضرت عمر فاروقؓ کہیں سے نکل آئے اور یہ منظر دیکھا تو بے اختیار اپنا ذرہ حضرت ابن کعبؓ پر اٹھایا۔ حضرت ابن کعبؓ نے ٹوکا: خیریت تو ہے، یہ کیا ہے؟ فرمایا: ”بات یہ ہے کہ تمہارے لئے یہ صورت فتنہ ہے اور ان پیچھے والوں کے لئے ذلت!“ کاش لوگ سمجھیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا فرمایا۔

اسی سلسلہ کی بات ہے کہ بعض ریسرچ اسکالر اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے آپ کی شخصیت کا انتخاب

(۱) دوسرا نام خود حضرت مولانا کا تھا، مگر وہ ازراہ افتاء و اکسار آپ کی زبان پر نہیں آیا۔ یہی ان دونوں بزرگوں کی ادائیں تھیں، خود حضرت صاحب سوانح اس بات کے بیان میں صرف حضرت مولانا کا نام لیتے،

کر کے آپ کی طرف راجع ہوتے کہ کچھ ضروری معلومات لکھوادیں۔

عزیزی مولوی یحییٰ میاں راوی ہیں کہ ”ایسا بارہا ہوا مگر آپ نے ہمیشہ ازراہ تواضع و انکسار ان سے معذرت کر لی۔ اور پھر ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا ”اس سے مجھے اپنی نیت کے لئے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔“ (یعنی یہ معذرت کہیں نفس کی ریا کاری نہ ہو۔ ع) نیز برادر محترم عبید الرحمن صاحب بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں وہ لکھنؤ میں تھے اور خطوط کے جواب لکھنے کی ذمہ داری انہی پر تھی، جب بھی ایسے خطوط آئے آپ نے یہی جواب دلویا کہ ”آپ کے حسن ظن پر اللہ آپ کو جزائے خیر دے، میری ذات اس قابل نہیں ہے کہ اس کو باقاعدہ تحقیق و ریسرچ کا موضوع بنایا جائے۔“

مشینٹ کو بھلا کیوں کر راہ ملے؟

عمر بھر طالب ہی رہنے کا ذوق جسے ملا ہو مشینٹ کو بھلا کیسے اس کے یہاں راہ ملے؟ ”تحدیثِ نعمت“ ان کی آخری کتاب، جس کی اشاعت عین مرض و وفات میں ہوئی، اس ذوق کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اس میں وقت کے ان معروف مشائخ و اکابر کی صف میں، جن سے تعارف اور تعلق کو آپ نے اپنی سعادت کے طور پر بیان کیا ہے، ایک نام ”حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جو دھپوری“ بھی ملتا ہے ان حاجی صاحب کو شاید ہی کوئی اس تذکرہ کی اشاعت سے پہلے اس حیثیت سے جانتا ہو کہ وہ بھی کوئی قابلِ استفادہ بزرگ شخصیت تھے۔ مگر آپ کو ایک دفعہ جو دھپور (راجستھان) کے سفر میں حاجی صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو آپ کی طالبانہ نظر نے اللہ کے اس بندہ میں، جو تعمیراتی ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا اور علمی لحاظ سے ایک خط بھی اپنے ہاتھ سے لکھنے کا اہل نہیں تھا، حتیٰ کہ اس کا تلفظ بھی پورا صحیح نہ تھا، دین کا وہ فہم پڑھ لیا جو ”سیکڑوں پڑھے لکھوں بلکہ فارغ التحصیل عالموں سے بھی اچھا تھا۔“ اور جس کی عملی زندگی کے بارے میں محسوس کیا کہ ”ہم جیسوں کے لئے بڑی سبق آموز ہے۔“ اور پھر عمر بھر حاجی صاحب کے ساتھ وہی عقیدت مندانہ معاملہ رکھا جو معاملہ بزرگوں کے ساتھ اہل طلب کا ہوا کرتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ ”مدظلہ“

کیا کیا باتیں اس مشینٹ نا آشنائی کی ذکر میں لائی جائیں۔ ۱۹۹۰ء کی بات ہے، آفتابِ عرب لمپ بام آ رہا ہے، سارے بزرگ جا چکے اور اپنی عمر کے بس اب وہی باقی رہے ہیں۔ یہ راقمِ آثم ان کے ارشاد پر اپنے ایک پرانے مضمون پر نظرِ ثانی کر کے اسے ”واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر“ نامی کتاب کی شکل میں لانا

ہے۔ یہ کام محض ان کے ارشاد کی تعمیل میں ہوا تھا اس لئے اس کو انہی کے نام منسوب کرتے ہوئے انتساب کی عبارت میں جب نام لکھا تو اس کے ساتھ دامت برکاتہم کے احترازی الفاظ شامل کئے۔ مسودہ ہی کی حالت میں اس کو دیکھا تو فرمایا ”یہ تو بہت زیادہ ہے، زیادہ سے زیادہ مدخلہ لکھ دو۔“ یعنی زیادہ سے زیادہ وہ لکھ دو جس نے کم درجہ کا کوئی لفظ ایک باب کیلئے دستیاب نہیں۔

آپ کے ایک مسٹر ضلع بہرائچ (یوپی) کے ایک گاؤں کے بھائی رحمت اللہ صاحب تھے۔ آپ ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، اور وہ واقعی محبت کے اہل تھے اور۔ ہیں اور یہ راقم ان سے دعا کا خواستگار رہتا ہے۔ آپ کی یاد میں شائع ہونے والے الفرقان خاص نمبر میں ان کا بھی ایک مضمون شامل ہے۔ اس میں بڑی لذت کے ساتھ اپنے تعلق کی تفصیل اور حضرت کی محبت و مہربانیاں گنتی ہیں۔ ان مہربانیوں کے ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ”۔۔۔ لیکن حضرت کبھی اپنی تعریف سننا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ شروع میں تعلق ہونے کے بعد ہم نے خط لکھا۔ القاب میں آقائی مولائی لکھ دیا۔ حضرت نے تحریر فرمایا: آقائی مولائی ایسے بڑے الفاظ مت لکھنا۔“

خود کو کمتر سمجھنے کی طلب و دعا

آپ کی خصوصیات میں دعا سے وہ خصوصی مناسبت بھی ہے کہ کچھ بھی قریب رہنے کا موقع جس شخص کو ملا ہو گا وہ اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہا ہو گا۔ اس سلسلہ میں آپ کا عمل اور عام معمول گواہی دیتا تھا کہ بڑا گہرا یقین دعا کی افادیت پر تھا، اور یہ افادیت یہ تھی کہ اس کا اثر مطلوبہ شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے (الدعاء مُغُ العبادۃ) اس ذوق و یقین کو آپ نے ”تحدیثِ نعمت“ میں اللہ کی خاص نعمتوں میں سے ایک نعمت کے طور پر گنایا ہے۔ اور آنحضرت (ﷺ) سے ماثور و منقول ان دعاؤں میں خاص طور پر ایک دعا کی توفیق کو آپ نے اللہ کا خاص ہی احسان بتایا ہے، جو ہے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا (اے اللہ مجھے اپنی نظر چھوٹا اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا)

اس خاص دعا میں آپ کے خلوص کی ایک نمایاں اور منفرد غیر معمولی کہے جانے والی شہادت لکھنے میں گزرنے والے آپ کی زندگی کے طویل عرصہ میں ہر کہہ و مہ کو نظر آنے والا وہ معاملہ ہے جو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے ساتھ آپ کا رہا۔ عمر میں آپ حضرت مولانا سے دس سال بڑے تھے۔ لوگ بھی اکثر ان دونوں بزرگوں کا حوالہ بڑے مولانا اور چھوٹے مولانا کے مختصر الفاظ سے دیدیا کرتے تھے۔ اور خود مولانا

علی میاں آپ کے علم و فضل کے جس قدر قائل تھے وہ آپ کی کتابوں پر حضرت مولانا کے مقدمات کے اوپر گزرے حوالوں سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن ۱۳۶۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۹ء تک کے طویل عرصہ کی رفاقت میں نہ کوئی بڑا نظر آتا رہا نہ کوئی چھوٹا۔ اور یہی اس ضرب المثل درجہ کی رفاقت کے بنے رہنے کا راز تھا، کہ بعض سخت مرحلے بھی اگر آئے تو گزر گئے۔ اللہ ہر دو کی قبریں نور سے بھرے اور ان کی یہ راجہ اللہ رفاقت دار آخرت تک دراز ہو۔

تنقید و تنقیص کی برداشت

اس دعا کی عند اللہ قبولیت کہیں، یاد دعا میں ان کے صدق و خلوص کا ایک نشان کہ مزاج میں ایک گونہ حدت کے باوجود اپنے بارے میں تنقید و تنقیص پر متغیر ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ مثالیں تو کئی یاد آرہی ہیں مگر طوالت سے بچنے کیلئے یہاں صرف ایک، اور یہ ہے غیظ و غضب سے بھرے ہوئے مولانا مودودی صاحب مرحوم کے وہ الفاظ جو ۱۳۵۸ء میں مولانا کے فلسفہ حکمتِ عملی پر راقم کے مضمون ”دین میں حکمتِ عملی کا مقام“ کا نوٹس لیتے ہوئے مولانا کے قلم سے نکلے تھے، اور جو یہ تھے کہ

”اصل بنائے بحث بجائے خود یہ مسائل نہیں ہیں بلکہ دل کا ایک پرانا بخار ہے جو مدتوں سے موقع کی تلاش میں دبا پڑا تھا اور اب اس کو نکالنے کے لئے کچھ مسائل بطور حیلہ ڈھونڈ لئے ہیں۔ اگر خدا کا خوف اور ایک ایک لفظ پر اس کے حضور باز پرس کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بطور نمونہ بتاتا کہ ——— آدمی تقویٰ اور خشیت کا لباس زور پہن کر کیسی کچھ باتیں خود ان لوگوں کے خلاف بنا سکتا ہے۔“

دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ یہ الفاظ راقمِ سطور جیسے نوعمر پر تو منطبق ہو نہیں سکتے تھے، ان کا نشانہ تو اس کے والد ماجد حضرت صاحبِ سوانح ہی ہو سکتے تھے جن سے مولانا کو تقوے ہی کے مسئلہ پر جماعت چھوڑنے سے جس قدر تلخی ہو گئی تھی وہ ان کے اس تہدیدِ خط سے ظاہر تھی جس کا تذکرہ اوپر جماعت کے قصہ میں ذکر آچکا ہے۔ القصہ، مولانا محترم کے مذکورہ بالا پُر غضب جملے پڑھئے اور پھر سنئے کہ راقم کو تو بیحد ناگواری ہوئی کہ مولانا نے اس کے مضمون کے بہانے بالکل بلا جواز اپنا کبھی کا غصہ اس کے والد ماجد پر اتار لیا، اس کے مضمون میں تو تقوے وغیرہ کی کوئی بحث تھی ہی نہیں۔ لیکن، کیسے یقین کیا جائے گا کہ، والد ماجد پر مولانا کی اس زیادتی کا کوئی ادنیٰ اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ کوئی ایک لفظ اس وقت یا اس کے بعد کبھی مولانا کی شان میں سخت ان کی زبان سے نہیں سنا گیا۔

الغرض آپ نے خود کو ایسا بڑا کبھی نہ سمجھا کہ تنقید و تنقیص سے چراغ پا ہوں۔ وہ تو خود اپنی ایسی تنقیص کرتے تھے کہ ”تجدیدِ نعمت“ نامی کتاب ”شرعی قسم کے ساتھ خدا کو گواہ بنا کے“ ان الفاظ سے شروع ہوئی تھی کہ: ”اگرچہ ظاہری زندگی کے لحاظ سے میں دینداروں میں سمجھا جاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نماز روزہ جیسے فرائض کی ادائیگی اور معصیات سے اجتناب کا ایک گونہ اہتمام بھی نصیب ہے لیکن ارشادِ خداوندی ”ہَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ“ (انسان اپنے آپ کو خود ہی خوب جانتا ہے) کے مطابق سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر ایسے ایسے رذائل اور اللہ تعالیٰ کے اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں اتنی بڑی بڑی کوتاہیاں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کی پاداش میں اس دنیا میں پینے کے پانی سے بھی محروم کر دے یا العیاذ باللہ حذف یا مسخ کا فیصلہ فرما دے تو عدل و انصاف کے خلاف نہ ہوگا۔“ (تجدید ص ۲۱)

حزبیت اور گروہ بندیانہ ذہنیت سے بالاتری

دیوبند میں پڑھا، مسلکِ دیوبند اور اکابرِ دیوبند سے وہ محبت اور ان کے لئے وہ حمیت کہ تعلیم کے دوران ہی اس مسلک اور اکابر کے خلاف غوغا آرائی سنی تو اس سے نپٹنے کی تیاری وہیں سے شروع کر دی اور عملی زندگی کے میدان میں جو پہلا نقش ثبت کیا وہ اس مسلک اس کے اکابر کے خلاف فتنہ اٹھانے والوں کا تعاقب تھا، ایسا تعاقب کہ برصغیر میں پھیلی پوری جماعت کے لئے موجبِ فخر بنا۔ مگر مسلک سے ایسی وابستگی اور اکابر و اہلئے دیوبند کی طرف سے یہ قدر افزائی حزبیت اور گروہ بندیانہ ذہنیت سے انھیں آلودہ نہیں کر سکی اس چیز سے وہ جتنے دور تھے اس کا اندازہ کرنے کو صرف ایک مثال کافی ہے۔

دارالعلومِ دیوبند میں تحفظِ ختمِ نبوت کے عنوان سے ایک وسیع پیمانہ کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس اجلاس کے دعوت نامے میں ایک بات یہ لکھی گئی تھی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا تعاقب سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے فرمایا۔ یہ دعوت نامہ جب آپ کو پہنچا تو اس بیان کو اصل واقعہ کے خلاف جانتے ہوئے (کہ فی الواقع یہ علماء پنجاب تھے جنہوں نے مرزا کے تعاقب کا آغاز کیا) آپ نے دارالعلوم کو تو اس غلطی کی تصحیح کے لئے فوراً لکھا ہی اس کے علاوہ یہ دعوت نامہ چونکہ پاکستان بھی جانا تھا اس لئے وہاں کی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے ذمہ دار کی حیثیت سے مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (شہید) کو بھی اس غلطی کی تصحیح کے لئے خط لکھا، جو مولانا مرحوم نے آپ کے انتقال پر اپنے تعزیتی مضمون (ماہنامہ الہیات کراچی اگست ۱۹۹۷ء) میں نقل کیا تھا۔ حزبیت سے بالاتری کا مزاج جاننے کے لئے اسے پڑھئے:

بہر حال اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سواحلی زبان بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسلک ہے کتاب الصلوٰۃ میں جہاں بھی فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جائے وہ ضرور لکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے۔۔۔۔۔“ اے

دلوں کا حال اللہ جانتا ہے، لیکن تمام ظاہری علامات کے اعتبار سے آپ کی زندگی کا سب سے اہم اور رہنما اصول آخرت کی فکر اور یوم حساب کا خوف تھا۔ آخرت کا خیال اور وہاں کی باز پرس کا استحضار عام حالات میں تو بہت مشکل نہیں لیکن اختلافات کے موقع پر یہ آسان نہیں، **إلا** یہ کہ اللہ آسان کر دے۔ آپ کی زندگی میں ایسے آزمائشی مواقع راقم کے دورِ شعور میں کئی ایک آئے ان میں سب سے سنگین موقع دارالعلوم دیوبند کے اختلافی قضیہ کا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت لکھنے کی ضرورت پڑی جو سب الفرقان میں شائع ہوتا رہا، ایک منصف قاری کے لئے وہ ساری تحریریں اس بات کی گواہی کو کافی ہیں کہ قضیہ میں ان کے موقف اور رویہ کی اصل بنیاد بحیثیت رکنِ شریٰ اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے آخرت کے سوال و جواب کی فکر تھی۔ اور اسی لئے ان بیانات کی تمام سختی اور صراحت کے باوجود آدمی کہیں وہ بات نام کو بھی نہ پائے گا کہ ”جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے۔“ ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر مولانا حبیب الرحمن قاسمی صاحب نے مئی رجون (۱۹۷۷ء) کے شمارہ کے تعزیتی ادارے میں بہت تفصیل سے آپ پر لکھا۔ اس قضیہ کے حوالہ سے ان کا بیان تھا کہ ”حضرت مولانا نعمانی نور اللہ مرقدہ کی ایک اور صفت جس سے بندہ بیحد متاثر ہوا وہ ان کی آخرت کی جوابدہی کی فکر تھی، دارالعلوم کے اسی ہنگامے کے دوران میں بندے کو مولانا سے

(۱) پورا خط الفرقان کی اشاعتِ خاص (۱۹۹۸ء) بیا حضرت صاحبِ سوانح کے حصہ مکتوبات میں چمپا ہے۔ وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ اور ہنگامہ سے نپٹنے کے متعلق طویل طویل گفتگو کی بھی نوبت آئی مگر مولانا کو کبھی آخرت کی جوابدہی کی فکر سے خالی نہیں پایا، جبکہ ایسے معاملات میں عام طور پر اچھے دیندار اور پرہیزگار لوگ بھی تساہل سے کام لیا کرتے ہیں۔“

اس بیان کی خاص اہمیت یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی کا آپ کے ساتھ کوئی خصوصی یا عقیدت مندانہ تعلق کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ کبھی ملاقات کو آنا بھی یا نہیں۔ ایسا انسان کسی کے بارے میں یہ اعلیٰ درجہ کی شہادت دینے کی حد تک بظاہر اسی وقت جاسکتا ہے جب کسی کے اندر کا یہ وصف اسے غیر معمولی اثر لینے پر مجبور ہی کر دے، فللہ الحمد۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

فکر آخرت کا تقاضہ ہے کہ آدمی اللہ اور بندوں کے حقوق پہچانے اور ادا کرے۔ اس کے بغیر ”فکر آخرت“ ایک بے معنی بات ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ حضرت صاحب سوانح کی فکر کا اس معیار پر کیا حال رہا تھا۔ پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حقوق کی بات!

حقوق اللہ

اللہ جل شانہ کا اولین حق تو عقیدہ توحید اور اس کی شہادت ہے۔ لیکن اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت آپ کے اُن احوال نے نہیں چھوڑی جو اوپر گزر چکے۔ یہ مقدس عقیدہ اور اس کی شہادت کیا، اس راہ میں تو شہادت کی آرزو کرتے اور اُس کے صدق کا ثبوت دیتے زندگی گزری۔ ہاں اس کے بعد شریعت کے جو احکام درجہ بدرجہ آتے ہیں ان کے بارے میں دیکھنا برحق ہے۔ ان احکام میں، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، اول درجہ ”ارکان اربعہ“ (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بیت اللہ) کا ہے۔ پس اول ان کا معاملہ دیکھیں، اور پھر جو دوسرے درجہ کے فرائض ہوں۔

نماز

نماز اللہ تبارک و تعالیٰ سے مناجات ہے۔ اس میں اُسی کی سکھائی ہوئی دعا (سورہ فاتحہ) اور اس کے بعد کوئی دوسری سورہ یا کسی بڑی سورہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں، جو سورہ فاتحہ کی درخواست ”اھدنا الصراط المستقیم“ (اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا) کے جواب میں کسی نہ کسی ایسی بات کی یاد دہانی

کرتی یا تعلیم دیتی ہیں جس میں ہدایت کا کوئی پہلو پنہاں یا نمایاں ہوتا ہے۔ اور پھر آیات الہی کی تلاوت کا جو اثر اہل ایمان کے قلب پر ہونا چاہئے، اس کے بارے میں قرآن بتاتا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ اٰيٰتُهُ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دھل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں۔ سورہ انفال) یہی اہل ایمان ہیں جن کے لئے فوز و فلاح کی بشارت سے قرآن کی سورہ المؤمنون شروع ہوتی ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلٰوةِهِمْ خٰشِعُونَ۔ (فائز المرام و فلاح یاب ہوئے وہ مومن کہ جو اپنی نمازوں میں خشوع کی تصویر ہوتے ہیں۔)

نماز تو ہم جیسے سبھی پڑھتے ہیں۔ اور امید ہے کہ جیسی بھی پڑھ پاتے ہیں اگر خالصۃ اللہ کے لئے پڑھتے ہیں تو کام انشاء اللہ ضرور دے گی۔ مگر اصل نماز اور ”معراج المؤمنین“ کا لقب پانے والی نماز وہی ہے جس کا پتہ مذکورہ بالا آیتوں سے چلتا اور اس کی کامرانی کی ضمانت ملتی ہے۔ بظاہر اللہ نے اپنے کرم سے ایسی ہی نماز کی توفیق حضرت صاحب سوانح کو عطا فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک تجربہ اور اس کا بیان بہترین گواہی کا درجہ رکھتا ہے۔ مولانا اسیر ادروی، جن کا حوالہ اوپر مناظرہ ادروی کے بیان میں آیا ہے، جمیعۃ العلماء سے وابستگی کے ناطے کچھ عرصہ صوبائی جمیعہ کے آفس لکھنؤ میں رہے تھے، موصوف نے اپنے مضمون مشمولہ الفرقان ”اشاعت خاص بیاد حضرت بانی الفرقان میں آپ کے جن اوصاف سے خصوصی تاثر کا اظہار کیا ہے ان میں سے ایک نماز سے متعلق بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

”مولانا سے بالمشافہ ایک دو بار ملنے کے باوجود میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا، بس ایک ارادتمند کی طرح کبھی کبھی سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کر لیا کرتا تھا۔ البتہ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں چار سال تک آپ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت ملی۔ میری قیام گاہ سے چند قدموں کے فاصلہ پر مرکز کی مسجد تھی جس میں آپ جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے۔ دو رکعت نماز جو چند منٹوں میں ادا ہو جاتی تھی اس کا تاثر آج تک میرے دل میں موجود ہے۔ مولانا پر خوف و خشیت الہی کا غلبہ تھا، آپ کے خشوع و خضوع و استغراق کا عالم دیدنی ہوتا تھا، قرأت کرتے ہوئے آپ کی آواز شدت گریہ سے بھرا جاتی تھی۔ ترغیب و ترہیب کی آیتوں پر ہچکیاں بندھ جاتی تھیں، تھر تھراتے ہوئے ہونٹوں اور کپکپاتی ہوئی زبان سے الفاظ قرآنی کی ادائیگی اور اس پر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آپ کی غمناک آواز ایسی کیفیت پیدا کرتی تھی کہ خود میری آنکھیں بھر آتی تھیں۔۔۔۔۔“

یہ باہر کی شہادت ہوئی، اور اندر کا حال اندروالوں سے سنئے۔ برادر عزیز میاں حسان نعمانی جن کے ساتھ حضرت والد اکا قیام تھا، اس سلسلہ میں ان کا بیان، جو الفرقان کی اشاعتِ خاص میں نکل چکا ہے، یہاں کچھ اختصار و تلخیص کے ساتھ۔

”نفل نمازیں اکثر بہت طویل ہوتیں، کسی بھی آیت یا دعائیہ کلمہ کو بار بار پڑھتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب تک دل کی کوئی خاص کیفیت نہ ہو جائے اس سے آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بعض دفعہ قعدہ اخیرہ میں اللّٰھم اِنّی ظلمت نفسی والی دعا کو درجنوں بار دوہراتے سنا۔ خاص طور پر تہجد کی نماز میں جو کیفیت ہوتی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گریہ کا غلبہ ہوتا تھا۔ سجدوں میں ماثور دعاؤں کی کثرت اور ان کی ادائیگی کا خاص انداز، بندہ کا اپنے رب سے بلک بلک کر سوال کرنا، یہ ایک عجیب و غریب روح پرور منظر ہوتا تھا۔ یہ تنہائی کا وقت ہوتا تھا اس لئے اخفاء کے سارے پردے اُٹھ جاتے تھے۔ اور آپ کی اصل شخصیت سامنے آ جاتی تھی۔ تہجد کے بعد جہری ذکر کا معمول تھا، خاصا وقت اس میں صرف ہوتا تھا۔ پھر نماز فجر۔“

آپ کے لائق نواسے عزیز ی مولوی تکی نعمانی کو بھی بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا، عزیز موصوف نے یہی بات اپنے مضمون میں ان الفاظ سے بیان کی ہے:

”اللہ تعالیٰ نے نانا جان پر جو احسانات فرمائے تھے میں سمجھتا ہوں کہ ان میں ایمان کے بعد سب سے عظیم انعام عبادات کے باب کی وہ خاص توفیق ہے جو ان کو عطا ہوئی تھی۔۔۔ خاص طور پر نماز میں تو ایسا معلوم ہوتا کہ صرف عبدیت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی نمونہ نہیں مل سکتا۔ ان کی نماز و روح نماز، یعنی رجوع و انابت، خشیت و تقرب اور حضوری کی کیفیات سے معمور ہوتی تھی عام طور پر نماز سوائے جماعت کی امامت کے طویل ہی پڑھتے تھے، لیکن خاص طور پر تہجد بہت طویل ہوتی جس میں تقریباً ایک ڈیڑھ پارہ یومیہ پڑھتے، بسا اوقات سورہ فاتحہ ہی میں کافی وقت لگ جاتا۔ اھدنا الصراط المستقیم ۱ وراں کے بعد کی آیات کو دہراتے جاتے، آواز کچھ بلند ہو جاتی اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی، بقیہ قرأت میں بھی ایسا ہی حال ہوتا۔۔۔۔۔

”رکوع سجدہ دونوں طویل ہوتے، مگر سجدہ کچھ زیادہ لمبا ہوتا، سجدہ میں مسنون دُعا ثور دعائیں بکثرت مانگتے۔ ٹانگ میں فریکچر کی وجہ سے کھڑا ہونا دشوار ہو گیا تھا اسلئے نمازیں بیٹھ کر پڑھتے تھے مگر سجدے اتنے طویل ہوتے کہ اچھا بھلا محنت مند آدمی تھک کر چور ہو جائے۔ سجدہ میں تسبیحات کے بعد دعاؤں کا سلسلہ جو شروع ہوتا تو یکے بعد دیگرے دعائیں آتی جائیں۔۔۔ مگر یہ

کی وجہ سے سانس ٹوٹ جاتی، الفاظ منہ سے نہ نکلتے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسی نماز اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، بس!! ”لا تسئل عن حسنہن و طولہن“

جماعت کا اہتمام

نماز میں جماعت کے اہتمام کی بہت فضیلت اور اہمیت حدیث میں آتی ہے۔ معذوری کے دور میں جب مسجد جانا کسی طرح بھی ممکن نہ رہا اور گھر ہی پر نماز کی ادائیگی کرنا پڑی تو شاید ہی کبھی تنہا نماز پڑھ لی ہو، ورنہ ہمیشہ کسی کو امام بنا کر جماعت کا اہتمام فرماتے تھے۔ جماعت کی خاطر نماز کو عام اوقات کے لحاظ سے مقدم اور مؤخر بھی کر دیتے، اس کے لئے جمع بین الصلوٰتین بھی جائز رکھتے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی ہدایت فرماتے کہ مسجد کی جماعت چھوٹ جائے تب بھی حتی الامکان جماعت کی صورت میں نماز ادا کرو۔ ضمناً یہ ذکر بھی مفید ہوگا کہ معذوری سے پہلے جماعت کی امامت فرماتے تو نماز کو بہت طول نہ دیتے تھے، مقتدیوں کی رعایت مد نظر رکھنا ضروری سمجھتے۔

روزہ

رمضان کے روزے تو اپنی جگہ پر تھے، تراویح اپنی جگہ، اعتکاف کی سنت بھی ہمیشہ معمول رہی۔ بریلی میں تو یاد نہیں آتا کہ کوئی دوسرا بھی آپ کے ساتھ ہوتا ہو۔ لیکن لکھنؤ میں یہ بات نہیں رہی تھی۔ اور جب سے قیام تبلیغی مرکز میں ہوا تب سے تو رمضان مرکز کی مسجد میں موسم بہار ہوتا۔ اور صبح و شام کا منظر دیکھنے اور روح کو تازگی بخشنے والا۔ ماہ مبارک کی تلاوت کے بارہ میں عزیزی یحییٰ بتاتے ہیں کہ ”ضعف و کمزوری کے باوجود بھی پندرہ پارے ختم کرنے کا معمول رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کا معمول اس سے زیادہ رہ چکا تھا۔ بالکل آخری سالوں میں جب ضعف اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور خود زیادہ تلاوت کی سکت نہ رہی تھی تب بھی دوسروں سے قرآن مجید اور حضرت تھانویؒ کی مرتب کردہ دعائیں بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔ قرآن سے شغف کے ماتحت اسکا بڑا حصہ حفظ ہو گیا تھا۔ برادر مہمان میاں کا بیان ہے کہ بائیس (۲۲) پارے ہو گئے تھے، پھر یہ محسوس کر کے آگے یہ سلسلہ نہ بڑھایا کہ محفوظ رکھنا آسان نہ ہوگا۔

نفل روزے بھی کثرت سے رکھنے کی عادت تھی۔ میاں حسان ہی کا بیان ہے کہ جن دنوں میں معارف الحدیث کی تالیف کے سلسلہ میں لکھنا ہوتا یا اور کوئی دوسرا اہم مضمون زیر تصنیف ہوتا تب تو روزہ کا معمول ہی تھا۔

زکوٰۃ

میاں حسان ہی لکھتے ہیں: ”زکوٰۃ کا پورا حساب رکھتے تھے۔ اپنی زکوٰۃ پیشگی ادا کرتے رہتے تھے۔ اور ماہ مبارک (رمضان) آنے پر باقی ماہ جب ایک ایک پیسے کا حساب لگا کر بے باقی کرتے تھے۔ بعض اہل تعلق اپنی زکوٰۃ آپ کے ذریعہ ادا کرانے کے لئے رقم بھیج دیا کرتے تھے، اس کا مکمل حساب رکھتے۔ جب تک خود اس قابل رہے خود لکھتے رہے، بعد میں یہ خدمت میرے حصہ میں آئی۔“

حج بیت اللہ

راقم کو نہیں معلوم کہ حج کبھی آپ پر فرض ہوا ہو، غالب گمان ہے کہ نہیں ہوا۔ لیکن اللہ نے بار بار اس سعادت کے لئے صورتیں پیدا فرمائیں ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں آپ کے ایک معتقد و مسترشد ضلع گونڈہ کے ماسٹر یلین صاحب مرحوم نے حج کا ارادہ کیا اور آپ سے معیت کی خواہش کی۔ وہ بہت خاص اہل تعلق میں تھے، ان کے گہرے تعلق کے پیش نظر کوئی حرج نہ سمجھ کر آپ نے رضامندی دیدی۔ اور اس طور پر آپ کو پہلے حج کی سعادت اللہ نے نصیب فرمائی۔ مگر اس میں آپ نے ماسٹر صاحب کی طرف سے صرف جہاز کا کرایہ قبول فرمایا، باقی مصارف کے سلسلہ میں صراحت فرمادی کہ وہ میرے خود کے ذمہ ہوں گے، اور ان مصارف کے لئے آپ کے پاس کچھ موجود تھا نہیں، اس لئے سہارنپور کا سفر کر کے حضرت شیخ الحدیث سے اس ضرورت کی خاطر قرض لیا (تحدیث نعت ص ۲۸۹-۲۸۸) ”آپ حج کیسے کریں“ نامی مشہور و مقبول کتاب آپ سے اسی حج کے تجربہ نے لکھوائی۔ پھر دو سال بعد اسی طرح کا دوسرا حج لکھنؤ کے ایک اہل تعلق جناب محمد شفیع صاحب مرحوم کی خواہش پر ہوا۔ آپ کا مختصر سا کتابچہ ”آسان حج“ اس دوسرے حج کا نتیجہ تھا۔ تیسرا حج، یو۔ پی۔ ہی کے ضلع اناوہ کے ایک مخلص دوست حاجی رئیس الدین صاحب کی فرمائش پر ان کے والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کے طور پر کیا گیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی رکنیت حاصل ہونے کے بعد تو یہ سعادت اس وقت تک ہر سال میسر آتی رہی جب تک رابطہ کے سالانہ اجلاس کیلئے موسم حج ہی مقرر رہا۔ اور پھر حج نہیں تو زیارت بیت اللہ اور مدینہ الرسول (ﷺ) کی حاضری کا شرف اس وقت تک بہر حال ہر سال حاصل ہوا کیا جب تک کہ آپ اس سفر کے قابل رہے۔ اس سلسلہ کے آخری سفر کا حال تو اوپر ابھی گزرا۔

رابطہ کے سلسلہ سے حاصل ہونے والی سعادت حج کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے، جس کی

آپ نے ”تحدیثِ نعمت“ میں تصریح فرمائی ہے، کہ ۶۵ء میں رابطہ کی رکنیت آپ تک حضرت مولانا علی میاں کے ذریعہ آئی، جو کہ ۶۲ء سے رابطہ کے اولین ارکان میں سے تھے۔ آپ کی تصریح کے مطابق ۶۳ء میں رابطہ کی مجلس نے طے کیا کہ ہندوستان، پاکستان سے دودو نمائندے ہوں۔ ہندوستان سے دوسرے نمائندہ کے نام کی تجویز مولانا علی میاں صاحب کے سپرد کی گئی۔ آپ نے دوسرے نام کی بابت حضرت صاحب سوانح سے مشورہ چاہا، جس پر دو نام آپ نے تجویز فرمائے۔ یہ بات آخر شعبان میں ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ ”شوال میں میرے نام رابطہ کی طرف سے رکنیت کی اطلاع اور اجلاس کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں حیران ہوا کہ کیا معاملہ ہے! شاید کوئی غلط فہمی ہوئی۔“ حضرت مولانا رمضان رائے بریلی میں گزارتے تھے اور ندوہ کی تعطیل ختم ہونے پر لکھنؤ تشریف لاتے۔ مولانا واپس تشریف لائے تو ”ان سے بتایا کہ ایسا خط موصول ہوا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو پتہ چلا کہ یہ مولانا ہی کا کیا ہوا ہے، انھوں نے میرا ہی نام بھیجا تھا۔“ آپ کو اس پر بڑا اشکال اس پہلو سے ہوا کہ ”یہ تو ایک ہی گھر سے دو نام ہو گئے۔“ حضرت مولانا کا قیام بھی اس زمانہ میں تبلیغی مرکز ہی میں تھا جہاں اندروالے مکان میں آپ کی رہائش تھی اور باہر کے کمرے میں حضرت مولانا قیام فرماتے تھے۔ اس اشکال پر حضرت مولانا جواب یہ تھا ”کہ آپ کے ہونے سے مجھے مشورہ کا فائدہ ملے گا۔“ فرماتے ہیں ”اس پر میرے لئے کچھ کہنا مشکل تھا۔“ آگے اور بہت کافی تفصیل ہے جس کے آخر میں آتا ہے کہ

”بلا سامان و گمان رابطہ کی رکنیت کا آنا اور پھر پاسپورٹ کے سلسلہ میں غیر مترقبہ آسانیاں فراہم ہونا (جبکہ وہ ایک مشکل مسئلہ نظر آتا تھا) اس سب سے میں نے یہ سمجھا کہ یہ سب منجانب اللہ ہے اور ہر سال حج اور حسبِ توفیق عمروں کی سعادت کا جو راستہ کھل رہا ہے اسے نعمتِ خدا داد کے طور پر برسرِ چشم قبول کیا جانا چاہئے۔۔۔۔۔“

پس چوتھے رکن، حج، کے ساتھ یہ معاملہ آپ کا تھا۔ اللہ قبولیت سے نوازے۔

دین کی نصرت و خدمت

ان بنیادی فرائض کے بعد ایک مومن پر اللہ کے دین کی خدمت و نصرت کی بھی بقدر استطاعت و حسبِ احوال ذمہ داری آتی ہے۔ اس سلسلہ میں اوپر اتنا کچھ آچکا کہ مزید کی نہ گنجائش نہ ضرورت۔ الحمد للہ الحمد للہ کہ یہ فرض کفایہ بھی آپ نے اس کی مختلف صورتوں میں زندگی بھر ایک فرضِ عین کی طرح دل و جان سے لگائے رکھا۔ اور آخری سانس لینے کے بعد جو جنازہ اٹھا تو وہ ایک داعی الی اللہ کی شان ہی کا جنازہ تھا۔

جبکہ دس بارہ سال سے معذوری کی بنا پر آپ بالکل خانہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ مگر لوگ آپ کی شانِ دعوت و نصرتِ حق کو جیسے ذرا بھی نہ بھول نہیں پائے تھے! ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں اُس دن تک ایسے کسی جنازہ کا منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔ امید ہے کہ ہزار ہا اہل ایمان کا حسنِ ظنِ رایگاں ان شاء اللہ نہ جائے گا۔

حقوق العباد

اس معاملہ کے دو شعبے ہیں۔ معاشرت اور معاملات۔ معارفِ الحدیث کی چھٹی اور ساتویں دو جلدیں ان ہی دونوں شعبوں سے متعلق احکام و ہدایات والی احادیث پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد (۶) کے دیباچہ میں تفصیل درج ہے کہ معاشرت میں کیا کیا چیز آتی ہے اور معاملات کے عنوان میں کون کون چیز داخل ہے۔

آپ کی معاشرتی زندگی

(۱) معاشرتی احکام و ہدایات کے ذیل میں درجہ بدرجہ رشتہ داروں کے، کسی بھی نوعیت کے واسطہ تعلق والوں کے اور عام لوگوں کے حقوق آتے ہیں۔ نیز انسان کا ذاتی اور خانگی رہن سہن و آداب۔ اس پہلو سے ہم آپ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ذہن چند صفحات پیچھے گزرے عنوان ”دیگر ناگزیر مشاغل“ کی طرف چلا جاتا ہے جس میں والدہ ماجدہ اور دیگر اقرباء کے حوالہ سے ان کی ضروری خدمت گزاری کی بات آگئی ہے۔ اس سے آگے اقرباء میں سے کمزور حال اور حاجتمندی والوں کی خبر رکھنے کی کوشش اور ممکن حد تک ان کی اعانت کرنے کا معمول تھا۔ برادرِ مہمانِ حسان میاں جن کو رہائشی قرب میسر تھا ان کا بیان ہے کہ ”مدد کا بھی ان کا عجیب طریقہ تھا، انتہائی خاموشی سے تو ہوتی ہی تھی لیکن اس کی بھی کوشش کی جاتی تھی کہ جس کی مدد کی جارہی ہے وہ عادی نہ ہو جائے۔ اس لئے یہ کبھی کبھی ”قرض“ کے نام سے بھی کی جاتی تھی۔ خاندان اور اہل تعلق کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔“ اسی طرح جن دوسرے اہل حاجت کا علم آپ کو ہو جاتا یا وہ خود رجوع ہوتے ان کے سلسلہ میں بھی اس فرض کی حتی الامکان ادائیگی آپ کا معمول تھی، خود نہیں تو دوسرے ذی استطاعت دوستوں کو توجہ دلا دیتے۔

(۲) اہل و عیال جن کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا ان کے حق میں آپ کے دود و رگز رے، ایک راقم،

(۱) اور بھول کیسے پاتے؟ کہ آپ نے تو اس سلسلہ میں ”جب تلک بس دم چلے ناغر“ کی روش اپنائی ہوئی تھی۔ ۸۵ء میں جب درس قرآن کی عوامی خدمت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اہل طلب کو دیکھا کہ وہ رابطہ میں رہنے کے خواہشمند ہیں تو اسی درس والے دن (اتوار کو) گھر ہی پر بلکی سی دینی مجلس شروع کر دی اور جب تک دم میں رہا وہ مجلس بھی چلتی رہی۔

اس کے بھائی اور والدہ مرحومہ کے ساتھ، کہ اولاً آپ کا بس یہی کنبہ تھا۔ یہ دور ۱۹۲۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۳ء میں والدہ مرحومہ کے انتقال پر ختم ہو گیا۔ دوسرا ۱۹۳۴ء میں عقد ثانی سے شروع ہوا جس سے ہمارے دو بھائی تو انتقال کر گئے اور اب دو بھائی اور دو بہنیں بھمد اللہ حیات ہیں (اللہ تادیر سلامت رکھے) اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات انتہائی خوشی کے ساتھ یہ کہہ دینے کی ہے کہ اس دوسرے دور میں جو راقم کی اور برادر مر حفیظ کی بالترتیب عمر ۱۵ اور ۱۳ سال کے وقت سے شروع ہوا آپ کا حقوق شناسی کا معاملہ بالکل ایک مثالی درجہ کا معاملہ رہا، ورنہ جو لوگ دوسرے عقد کی آزمائش میں پڑتے ہیں ان کی پہلی اولاد کو بالعموم جایا بیجا شکوہ و شکایت ہی کرتے دیکھا جاتا ہے (اور اللہ ہماری مرحومہ دوسری والدہ کو راحتوں سے نوازے کہ یہ معاملہ ان کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انھوں نے یقیناً پورا پورا تعاون اس معاملہ میں والد ماجد سے کیا۔) نتیجہ یہ تھا کہ شادیوں کے کچھ عرصہ کے بعد ہم دونوں بڑے بھائی جب الگ رہنے لگے تب بھی والد ماجد کا گھر ہمارے لئے بالکل اپنے کی طرح رہا، کسی طرح کا تکلف رکھنے کی ہم لوگوں کو ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ چنانچہ ہم سب بھائی بہنوں کے درمیان سکے سوتیلے کا کوئی شائبہ بھمد اللہ نہیں پایا جاتا۔

(۳) بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیم حدیث شریف میں آتی ہے اس کے بارہ میں آپ کے حال کا نہایت واضح اندازہ کرانے کے لئے ہر دو خوش نصیب خواتین کے انتقال پر لکھے گئے آپ کے تاثراتی مضامین بہت کافی ہیں۔ ان مضامین کا کچھ حصہ آگے ”ازواج و اولاد“ کے زیر عنوان آتا ہے۔

(۴) بچوں کے ساتھ لاڈ پیار کا معاملہ آپ کا نہیں تھا، تربیت کا پہلو ہمیشہ غالب رہا۔ اور مزاج میں چونکہ ایک گونہ حدت تھی اس کے زیر اثر خاصی تادیب کی بھی نوبت آ جاتی تھی۔ راقم کو اپنے بارے میں تو صرف تادیب یاد ہے، اور وہ آپ کی بالکل نو عمری کا زمانہ بھی تھا۔ بعد میں اس کا تجربہ جب ہمارے چھوٹے بھائیوں کو ہوا تو اس کے بارے میں برادر مر حسان میاں تحریر کرتے ہیں:۔۔۔

”ابنی کو بچوں کا دوستوں میں بیٹھنا، کھیل کود میں وقت صرف کرنا بہت ناپسند تھا، خاص طور پر ترک نماز بالکل ہی برداشت نہیں کرتے تھے، بچوں کی غلطیوں پر وہ غصہ ہوتے اور غصہ میں ان کی اچھی مرمت بھی کر دیتے، لیکن غصہ کے بعد ان کا عمل بیان کرنے کے قابل ہے۔ جب بھی زیادہ غصہ آتا تو اس کے فوراً بعد مکان سے باہر مسجد میں چلے جاتے اور وضو فرماتے، اکثر وضو کے بعد نفل پڑھتے اور دعا و استغفار کرتے۔“

”شاید اس پر یقین کرنا آسان نہ ہو کہ اپنے چھوٹوں بلکہ بہت چھوٹوں سے بھی معافی

مانگنے میں انھیں ذرا تکلف نہ ہوتا تھا۔ اپنی اولاد یا خادم کو کچھ کہہ دیا تو ان سے فوراً معافی مانگتے۔ مولوی ارشاد ہے: ”تو بعض مرتبہ ایک دن میں کئی کئی مرتبہ معافی مانگتے تھے۔“

لیکن لاڈ پیار کا معاملہ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خونی محبت کے پدرانہ جذبہ سے بھی آپ کا دل خالی ہو، جو ایک بالکل غیر فطری بات ہے۔ میاں حسان نے اپنے نام کا ایک ناصحانہ خط اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ جو وفات سے دس پندرہ سال پہلے بڑھتے ہوئے ضعف کا احساس کر کے آپ نے لکھا تھا۔ اس کی یہ تہیدی سطریں اندر کے جذبہ پداری کو الم نشرح کر کے رکھ رہی ہیں:

”میرا اندازہ ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہیں ہوتا وہ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ ماں باپ کو اولاد سے کیا تعلق ہوتا ہے! کوئی شخص اپنے حقیقی بھائی اور باپ کے بارے میں بھی نہیں چاہتا کہ وہ اس سے بڑھ جائیں لیکن اولاد کے بارہ میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اللہ وہ بھی عطا فرمادے جو مجھ کو نہیں عطا ہوا۔ ان کی راحت سے دلی راحت اور ان کی تکلیف سے دلی تکلیف اور بے چینی ہوتی ہے۔

”اللہ تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے جب کبھی تم درِ گردہ کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہو تو تمہیں یا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ میرا حال کیا ہوتا ہے۔ صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعائیں کرتا ہوں اور جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کرتا ہوں۔ تمہارے ہی ساتھ نہیں تم سب بھائی بہنوں کے ساتھ یہی معاملہ ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے اور غیر اختیاری ہے“

یہ تو آپ کا بیان ہے، اور راقم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر گواہی دیتا ہے کہ بچپن کی تادیب کو چھوڑ کر خود اُس کے ساتھ آپ کی شفقت کا یہی حال رہا۔ اور وہ اپنی صحت کی بنا پر سب بھائی بہنوں میں اس کا حاحتمند بھی زیادہ رہا تھا۔ آپ کو دعائیں بھی شاید سب سے زیادہ اس کے لئے ہی کرنی پڑی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی غیر معمولی مہربانیوں، بالخصوص ”اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا“ کے ظہور کو وہ انہی دعاؤں کی برکت کے سوا کچھ اور سمجھنے سے قاصر ہے۔ اللہ ہی ہے جو اس کے اجر سے ان کو نوازے۔

(۵) زندگی میں سادگی کی اور عیش و عشرت و نمود و نمائش سے دوری کی جو تعلیم احادیث پاک میں نکلتی ہے، آپ کو قریب سے دیکھنے اور برتنے والے کسی شخص کو بھی آپ کی زندگی اس تعلیم کے دائرہ سے الحمد للہ کبھی

(۱) یہ مولوی ارشاد آپ کی معذوری کے زمانے میں آپ کو اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ تھے، برسہا برس بڑی خدمت کی۔ اور جیسا نقل رکھتے تھے وہ آپ کی وفات پر ان کے مرثیہ (مطبوعہ بانئ الفرقان نمبر) میں منعکس ہے۔ اللہ ان کو شاد و آباد رکھے۔
(۲) اللہ کی مشیت کہ ہمارے بھائی میاں حسان کو صاحب اولاد ہونے کا تجربہ نہیں ہو سکا۔

باہر نہ نظر آئی ہوگی۔ اوپر اس سلسلہ میں آپ کے ذوق و مزاج کی کئی مثالیں ”سادگی و بے تکلفی سے اُس“ کے زیر عنوان گزر چکی ہیں۔ یہاں ایک چیز اور یاد آ رہی ہے۔ اور اہم ہے۔

۱۹۵۷ء میں سفرِ پاکستان سے لوٹ کر جماعتِ اسلامی کے بارے میں جو اظہارِ خیال الفرقان میں ایک مضمون لکھ کر کیا وہ قدرتی طور جماعت سے کسی بھی درجہ کے متعلق حضرات کے لئے تکلیف دہ تھا۔ بہت سے تلخ جوابات نکلے انہی میں لکھنؤ کے ایک اچھے خاصے تعلق والے ایک وکیل صاحب کا تھا۔ انھوں نے مضمون کے اس جز کو خاص طور سے بہت قابلِ اعتراض جانا جس میں مولانا مودودی سے ان کے ماہانہ اخراجات کے بارہ میں سوال جواب تھا۔ اور تقابلی میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ خود مولانا نعمانی کے یہاں اخراجات کون سے کم ہیں اور پھر کچھ متعین شواہد پیش کئے۔ اس پر کانپور سے جہاں کے اخبار ”سیاست“ میں وکیل صاحب کا مضمون چھپا تھا ایک مخلص کا خط آیا جس میں بڑی معذرت کے ساتھ اپنی تسلی کیلئے دریافت کیا تھا کہ

- (۱) الفرقان اور کتب خانہ الفرقان سے آپ کی آمدنی کا اوسط کیا ہے؟ آپ کے گھر کے اخراجات کا اوسط کیا ہے؟ کیا آپ کا حساب بینک میں بھی رہتا ہے؟
 - (۲) آپ کی صاحبزادیوں کے پاس اور آپ کے گھر میں سونے کا کتنا زیور ہے؟
 - (۳) آپ کے صاحبزادہ کے متعلق جو باتیں اس مضمون میں لکھی گئی ہیں میں اگر چہ جانتا ہوں کہ وہ ناجائز احرام نہیں ہیں پھر بھی جاننا چاہتا ہوں کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟
- اس پر آپ نے الفرقان ہی کے صفحات پر جواباً تحریر فرمایا تاکہ کوئی اور متجسس ہو تو اس کی بھی تسلی ہو جائے:

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مکرمی و محترمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

”آپ نے اپنے خط میں ”سیاست کانپور“ میں شائع ہونے والے مضمون کا ذکر کیا ہے، یہ تو واقعہ ہے کہ اُسے پڑھ کر طبیعت تھوڑی دیر کے لئے مکدر اور کبیدہ ہوئی تھی، لیکن بعد میں میں نے ان وکیل صاحب کو لائقِ ہمدردی اور مستحقِ دعا سمجھا۔ دراصل اس مضمون کا ایک خاص پس منظر ہے جس کا ذکر کرنا میں کچھ مناسب نہیں سمجھتا، ہاں آپ کے سوالات کا جواب دینا آپ کا حق سمجھتا ہوں۔

”آپ نے سوالات کے متعلق بڑی معذرت بھی کی ہے، میرے نزدیک اس کی بالکل

ضرورت نہیں۔ اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے برسرِ منبر یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ جس کپڑے کا جوڑا بہمن کے آپ منبر پر کھڑے ہوئے ہیں، دوسروں کے حصے میں تو اتنا نہیں آیا جس سے پورا جوڑا بن سکتا، پھر آپ کا یہ جوڑا کیسے بن گیا؟ — تو میرے دوست مجھ سے میرے خانگی مصارف وغیرہ کے بارہ میں پوچھ سکتے ہیں، اور میں اگر بُرا مانوں تو یہ میری کمزوری ہوگی، ہاں پوچھنے والوں کی نیت بُری نہ ہونی چاہئے۔ الحمد للہ آپ کے خُسنِ نیت پر مجھے اطمینان ہے، اس لئے پوری خوش دلی کے ساتھ آپ کے سوالات کا ترتیب وار جواب دیتا ہوں۔

(۱) آپ کا پہلا سوال الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے ذریعہ میری آمدنی اور میرے معیارِ معیشت اور بینک کے حساب سے متعلق ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ الفرقان تو اب سے ۴-۵ سال پہلے سے میں نے اپنے بڑے لڑکے مولوی عتیق الرحمن سلمہ کے اس طور پر سپرد کر دیا ہے کہ اس کے سارے کاموں (ادارت و ترتیب وغیرہ) کے بھی وہی ذمہ دار ہیں اور اس کے آمد و صرف کا بھی تعلق انھیں سے ہے، اور اس وقت تک یہی صورت چل رہی ہے، اگرچہ پرنٹر و پبلشر کی حیثیت سے میرا ہی نام اس پر ضابطہ کی خانہ پڑی کے لئے پڑا رہتا ہے اور اس کی تبدیلی کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کے معاملات اور آمد و صرف کا نہ مجھ سے تعلق ہے اور نہ مجھے اس کا پورا علم ہے، اجمالاً اتنا جانتا ہوں کہ مولوی عتیق الرحمن سلمہ اپنے اخراجات اسی سے پورے کرتے ہیں۔ میرے پانچ چھوٹے بچے ہیں جن کا میں کفیل ہوں، قریباً دو سو روپے ماہوار میرے گھر کا خرچ ہے اور الحمد للہ کتب خانہ سے یہ خرچ پورا ہو جاتا ہے۔ گویا کتب خانہ کی آمدنی کا یہی اوسط ہے۔ اپنی معیشت کے بارے میں خود میرا اندازہ ہے کہ نہ تو وہ عسرت اور تنگی کی ہے اور نہ زیادہ وسعت اور فراخی کی، بلکہ اس کو اوسط درجہ کی معیشت کہا جاسکتا ہے (ہاں چائے کا خرچ میرا خود میرے خیال میں درجہ اوسط سے کچھ زیادہ ہے، دن رات میں کئی دفعہ چائے پینے کی عادت ہے۔)

بینک کے حساب والی بات جو اُن وکیل صاحب نے لکھی ہے وہ بالکل بے اصل تو نہیں ہے، لیکن جس طرح لکھی ہے وہ ہر شخص کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے والی ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ الفرقان اور کتب خانہ کی کتابیں ہندوستان سے باہر بھی جاتی ہیں اور بعض ملکوں سے قیمت کی رقم صرف بینک ہی کے ذریعہ وصول ہو سکتی ہے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔ اب سے کوئی ۷-۸ سال پہلے جب اس سلسلہ میں مشکلات بڑھیں تو اس کی ضرورت پڑی کہ بینک میں حساب کھولا جائے تاکہ

بینک کے ذریعہ آنے والی رقم آسانی سے وصول ہو سکیں، تحقیق سے معلوم ہوا کہ بینک میں ایک حساب ایسا بھی کھولا جاسکتا ہے جس میں سود نہیں لگتا (اس کو ”کرنٹ اکاؤنٹ“ یا ”جاری حساب“ کہتے ہیں۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر پانچ سو روپے کی رقم برابر جمع نہ رہے تو حساب رکھنے والے کو ایک خاص حساب سے اس کی فیس ادا کرنی ہوتی ہے)۔ بہر حال اس ضرورت کو حل کرنے کے لئے وہ حساب بینک میں کھول دیا گیا، لیکن چونکہ حالات اور ضروریات کی وجہ سے اتنی رقم بینک میں جمع نہیں رہتی اس لئے قریباً ہر مہینے اس حساب کے رکھنے کی فیس خود اپنے پاس سے بینک کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ یہ ہے بینک کے حساب کی اصل حقیقت!

(۲) دوسرا سوال آپ نے میری بچیوں اور میرے گھر میں زیور سے متعلق کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ بچیوں اور عورتوں کے لئے زیور کا استعمال کرنا بالکل جائز ہے، لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس مد میں خرچ کرنا میرے مزاج اور میرے ذوق کے خلاف ہے، بلکہ میں اس کو ایک درجہ کی ”جائزہ یوتی“ سمجھتا ہوں، اس لئے میرے گھر میں اتنا زیور بھی نہیں ہے جتنی کہ مجھ میں استطاعت ہے اور میرے خاندان میں جتنے کا رواج ہے، تفصیل بھی بے تکلف سن لیجئے۔ میرے دو بچیاں ہیں، بڑی کی عمر دس سال کے قریب ہے، چھوٹی کی عمر چھ سال کے قریب ہے، بڑی کے پاس قریباً ۳ ماشے کے کان میں سنہری بندے ہیں۔ چھوٹی کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری موجودہ اہلیہ اب سے پندرہ برس پہلے میرے عقد نکاح میں آئی تھیں، جب کہ میرے مرحوم والدین حیات تھے۔ عقد سے دو تین دن پہلے جب میرے والد ماجد مرحوم کو معلوم ہوا کہ میں نے اپنے خاص ذوق کی وجہ سے زیور کا مطلق انتظام نہیں کیا ہے تو انھوں نے اس بات کو اپنے مزاج اور اپنی خاندانی روایات و مصالح کے خلاف سمجھتے ہوئے ۳-۴ سو روپے اس مد میں صرف فرمائے اور میری اہلیہ کے لئے ۴-۵ تو لے سونے کا زیور منگوا کے دیا، جو اب بھی ان کے پاس ہے، اور ان ہی کی ملکیت ہے، اس کے علاوہ کان میں پہننے کے ۳-۴ ماشے کے بندے بھی ان کے پاس ہیں جو انھوں نے خود بنوائے ہیں۔ یہ ہے میرے گھر کا سنہری زیور!

بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ اگر اس سے زیادہ ہوتا تو (اس مد کے خرچ کو ایک بے وقوفی

سمجھنے کے باوجود) میں اس کو اللہ کی ایک نعمت ہی سمجھتا اور اس کا شکر ادا کرتا اور یہ جو کچھ ہے اس کو

بھی نعمت ہی سمجھتا ہوں اور اس کے لئے کسی معذرت اور تاویل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

(الفرقان شوال ۱۳۷۱ھ)

(۳) تیسرا سوال خود آپ کی ذات سے متعلق نہیں تھا اور جن صاحبزادہ سے متعلق تھا وہ آپ کے ساتھ بھی نہیں رہتے تھے۔ کہ کسی درجہ میں بھی اعتراض کا جواز ہو۔

مہمان نوازی

(۶) مہمانوں کے لئے بھی زیادہ تکلف کے قائل نہ تھے۔ الا یہ کہ خود مدعو کیا ہو، اس صورت میں مہمان کے مرتبہ کے مطابق ضروری اہتمام ہوتا۔ بعض دفعہ، اس زمانہ میں جب کہ معذوری صاحب فراش ہی کر دینے تک آگئی تھی بیرونی ممالک سے آئے ہوئے، بالعموم تبلیغ سے تعلق رکھنے والے، اصحاب جب ازراہ عقیدت زیارت کے لئے تشریف لے آتے تو آپ کا جی اگر چاہتا کہ ان کو ایک آدھ وقت کھانے کی دعوت دیں تب دل کے اس تقاضہ پر حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ طریقہ کے مطابق مناسب نقد رقم ان حضرات کو پیش کرتے کہ آج وہ آپ کی طرف سے کھانا اپنی مرضی کے مطابق کھائیں۔

معاملاتی زندگی

معاملات کے بارہ میں تو اصحاب معاملہ ہی کی شہادت ہونی چاہئے، اور اس سلسلہ کی کوئی شہادت، مثبت یا منفی، اپنے علم میں یا حافظہ میں نہیں۔ البتہ دارالعلوم دیوبند سے متعلق اجلاس صد سالہ سے متعلق اوپر گزرے ہوئے بیان میں مذکور ایک معاملہ کو اس سلسلہ میں بجا طور پر قیاس کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آپ سفر عموماً پرانے زمانے کے تھرڈ کلاس میں کرتے تھے، اگر کبھی اس درجہ میں سفر ناقابل برداشت ہوا تو اس سے اوپر کے درجہ میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اس سفر کے مصارف دارالعلوم ادا کیا کرتا تھا۔ دیوبند پہنچنے تک کے مصارف کا علم تو آپ کو پوری طرح ہوتا تھا لیکن واپسی کے مصارف اندازہ ہی سے لینے پڑتے تھے، جس میں کمی زیادتی کا امکان رہتا تھا، اس لیے آپ نے یہ معمول مقرر کر لیا تھا کہ کبھی کبھی خاص اسی مد میں دارالعلوم کو کچھ رقم بھیج دیا کریں، تاکہ دارالعلوم کی کچھ رقم آپ کے ذمہ رہ گئی ہو تو وہ ادا ہو جائے۔ پھر جب رکشہ ایکسیڈنٹ کے بعد حالت ایسی ہو گئی کہ سفر اب مشکل نظر آنے لگا تو آپ نے آخری دفعہ پانچ سو روپے کی رقم اسی مد میں بھیجی تاکہ ضمیر بالکل مطمئن ہو جائے کہ قیامت میں اب دارالعلوم کے ایک پیسے کا بھی حساب انشاء اللہ آپ کو دینا نہیں پڑے گا۔ اس سے ہم آپ کی معاملاتی زندگی کے بارے اس کے سوا کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آپ نے قیامت میں حساب دینے کو حتیٰ الوسع کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ والعلم عند اللہ۔

ازواج و اولاد

آپ کے اپنے بیان کے مطابق یہ ۱۹۲۵ء تھا کہ آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ یہ رشتہ آپ کے والد ماجد کے اہل تعلق میں قریبی موضع حاجی پور کے چودھری عبدالحکیم صاحب کی صاحبزادی لطیف النساء سے ہوا۔ جن سے آپ کی اولاد میں دو بیٹے، عتیق الرحمن اور حفیظ الرحمن، ہیں (باقی ایک بھائی اور دو بہنیں شیرخوارگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ لیہ اہلیہ (راقم کی والدہ ماجدہ) ۱۳۶۲/۱۹۴۳ء تک آپ کی شریک حیات رہیں۔ رمضان ۶۲ھ میں بریلی میں وفات پائی، غفرھا اللہ تعالیٰ ورحمہا۔ رمضان مبارک میں یہ لمحہ میسر آنے کے علاوہ ان کے حق میں دوسری نیک فال وہ جگہ ہے جو مدفن کے لئے محلہ کی مسجد کی عین فصیل کے نیچے ان کو ملی، کہ مؤذن وہاں پانچ وقت مبارک کلمات کی صدا بلند کرتا ہے۔

حضرت صاحب سوانح نے آپ کی وفات پر الفرقان میں جو لکھا، اس کی چند سطریں:

”یہ تقریباً ۱۸ سال سے میری زندگی کی شریک تھیں، اور اللہ پاک کا احسان ہے کہ ”دنیا“

سے زیادہ دین میں میری رفیقہ تھیں۔ ان کی صابرانہ سیرت کے ساتھ سلیقہ داری اور دانشمندی

نے مل کر خانگی افکار سے مجھے آزاد کر دیا تھا۔ قریباً دائمی خرابی صحت کے باوجود میری اور بچوں کی

خدمت اور گھر کے سارے کام کاج کے ساتھ ان کی کثرت عبادت، فرط خشیت اور بالخصوص

رات کی اور صبح کی نماز میں دعاؤں یا سجدوں میں کبھی کبھی اللہ کے حضور میں ان کا رونا میرے لئے

نازیباہ عمرت بن جاتا تھا۔ ہاتھ اتنا وسیع تھا کہ دروازوں پر عام طور سے پھرنے والے ساکوں کو

دینے کے خلاف میری سخت رائے معلوم ہونے کے باوجود ان کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی کو خالی نہ

واپس کیا جائے۔ دل اتنا درد آشنا تھا کہ کسی مصیبت زدہ کو تکلیف یا حسرت کی حالت میں دیکھ لیتیں تو

کئی کئی دن متاثر اور درد مند رہتیں اور بار بار اس کا ذکر کرتیں۔“

(۱) ایک بہن حمیرا سب سے پہلی اولاد تھی، شیرخواری ہی میں واپس چلی گئی۔ اس کے بعد عتیق حفیظ اور پھر ایک بھائی، وہ بھی نام ہی کی عمر لیکر آیا، اور آخر میں پھر ایک بہن، اس نے بھی حمیرا ہی نام پایا اور کوئی سال بھر زندہ رہی، اس سے حضرت والد صاحب کو جو تعلق خاطر تھا اس کے بیان میں آپ کی زندگی کا ایک گوشہ نمایاں ہوتا ہے۔ یہ کوئی ۱۰ سال کے وقفہ سے پیدا ہوئی تھی اور گھر میں اس کے بس دو بھائی دس بارہ سال کی عمر کے تھے۔ ایسے میں یہ والد والدہ کے لئے کھلونا بن گئی تھی۔ یاد ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے اور بڑے تسلیے میں بٹھا کر نہلائی جارہی اور پانی سے چھپ چھپ کر کے محظوظ ہو رہی ہے تو والدہ سے زیادہ والد ماجد لطف اندوز ہو رہے ہوتے۔ اس کا انتقال والد والدہ، دونوں کے لئے بالخصوص بڑے ملال کا باعث ہوا تھا۔ ان شاء اللہ ذخیرہ آخرت ہو کر ملے گی۔

عقد ثانی

والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد بریلی کی رہائش کا، جہاں اعزہ واقارب میں سے کوئی نہ تھا، ناگزیر تقاضہ تھا کہ پھر سے گھر بسانے میں بہت زیادہ دیر نہ روارکھی جائے، چنانچہ آپ کی بہنوں نے جلد ہی اپنے عزیزوں میں رشتہ تلاش کر کے یہ مسئلہ حل کیا۔ اور ہمارا گھر پھر سے آباد ہوا۔ مگر اللہ کو منظور تھا کہ حضرت صاحب سوانح پھر بھی زندگی کا بڑا عرصہ بے رفیق حیات ہی گزاریں۔ سو ہماری یہ دوسری والدہ (آفتابی بیگم) بھی، جنہیں ہم ”آپا“ کہتے تھے، ۲۸ سال ساتھ رہ کر اور دو بیٹے دو بیٹیاں چھوڑ کر شعبان ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء میں راہی آخرت ہوئیں۔ ان کی نیک خصلتی کے لئے اوپر گزری ہوئی اس بات کے حوالہ سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ہم لوگوں میں سکے سوتیلے کا احساس نہیں انھوں نے پیدا ہونے دیا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے یہ جس درجہ کی نیکی کہی جانی چاہئے اسے بیان کی حاجت نہیں۔ ان کے چھوڑے ہمارے بھائی بہنوں میں بیٹے برادر مہمان نواز اور سجاد نعمانی اور بیٹیاں کوثر بی اور حمیرا نسیم۔ ان کی وجہ سے گھر کی آبادی میں الحمد للہ بڑا فرق نہیں آیا، اور خاص کر بیٹیوں کی وجہ سے وہ مسئلہ والد ماجد کے لئے اس دفعہ نہیں بنا جو راقم کی والدہ کے انتقال سے پیدا ہو گیا تھا، اگرچہ جو کی ہوئی تھی وہ بہر حال محسوس ہوتی رہنے والی تھی۔ آپا مرحومہ بھی بچوں کو تقریباً اُسی عمر میں چھوڑ کر گئیں جس عمر میں راقم کی والدہ نے چھوڑا تھا۔ لیکن کوثر بی سلمہا نے گھر سنبھال لیا اور اللہ کی عنایت سے پھر سب کے اپنے اپنے گھر بستے گئے۔ اور اس مرحلے پر والد ماجد کا قیام حسان میاں کے ساتھ ہوا۔ اور انہی سے اب اس گھر کی آبادی ہے۔

ہمارے ان بھائی بہنوں میں سب سے بڑی کوثر بی سلمہا عزیز ی مولوی تکی نعمانی کی والدہ ہیں۔ پھر حسان میاں، پھر حمیرا سلمہا اور آخر میں سجاد میاں (خلیل الرحمن) ان کے علاوہ دو بھائی شعبان اور سلمان اور ہوتے تھے، مگر وہ تھوڑی ہی زندگیاں لیکر آئے، شعبان تو سال بھر سے بھی کم اور سلمان کوئی آٹھ سال، مگر وہ آٹھ سال اس مرحوم کے لئے اور والدہ والدہ کے لئے بس آزمائش کے سال، ہوئے۔ قریب سال بھر کی عمر میں گود کھلانے والے بچہ کے ہاتھ سے گر جانے کے حادثہ میں دماغ ایسی چوٹ کھا گیا کہ پھر جسم حرکت کی صلاحیت سے محروم ہو گیا، زندگی کی مدت لیٹے ہی لیٹے پوری ہوئی اور دوسروں پر انحصار سے۔

آپا مرحومہ کے انتقال پر حضرت والد ماجد کے مضمون سے چند سطریں یہاں بھی پڑھ لیجئے:

”وہ میرے والد ماجد مرحوم کی حقیقی بھانجی کی لڑکی تھیں، دیدار اور عبادت گزار اپنے بچپن سے تھیں۔ میرے گھر آنے سے بہت پہلے اپنی ابتدائی عمر ہی میں حضرت مولانا حسین احمد

صاحب مدنی قدس سرہ سے بیعت ہوئی تھیں، پھر حضرت کے وصال کے بعد خود میرے ساتھ سہارنپور حاضر ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب دامت برکاتہم سے بیعت کی تجدید کی تھی۔“

مرحومہ کا انتقال ان کے سفر حج سے واپسی کے کچھ ہی بعد (جس کی وہ بہت شائق رہتی تھیں) ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء میں اس طرح ہوا کہ حضرت والد ماجد لکھنے ہیں:

”پھر چند ہی روز بعد ان کے اس مرض کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کو ان کی زندگی کے خاتمہ کا ذریعہ بننا تھا، اور ۲۶ شعبان ۱۳۹۰ھ کو ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سفر حج دراصل ان کے سفر آخرت کی تمہید اور اس کی تیاری کا ذریعہ و وسیلہ تھا۔“ اللہم اغفر لہا وارحمہا وادخلہا الجنة الخلد التي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ.

ضمیمہ

تدریس حدیث

[آپ کی کتاب زندگی کا ایک اہم ورق دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس حدیث ہے، لیکن اب تک کوئی باب اس کے تذکرہ کے لئے موزوں نہ ہو سکا، اس لئے یہ ”ضمیمہ“ کے مستقل عنوان کے تحت جگہ پارہا ہے۔ اہل علم کے لئے خاصے کی چیز کہے جانی بجا ہے۔]

شروع میں گزر چکا ہے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد چار سال تدریس علم دین کی خدمت بھی اپنے اساتذہ اور اکابر کے طریقے پر انجام دی لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ ترک کر کے دین و ملت کی آزادانہ خدمت کا فیصلہ فرمایا۔ یہ ۱۹۳۱ء / ۱۳۵۰ھ کی بات ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ کے زمانہ قیام میں جو (۱۹۳۶ء سے آخر دم، یعنی ۱۹۹۷ء تک قائم رہا) یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حلیم عطا صاحبؒ کے بیمار ہو جانے سے صحیح بخاری اور مسلم شریف کا درس بند ہو جاتا ہے۔ یہ سوال ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۵ء ہے۔ تب اس بکے لئے آپ سے خواہش کی جاتی ہے کہ شاہ صاحب کی صحت بحال ہونے تک یہ سبق پڑھا دیئے جائیں۔ درس کا یہ سلسلہ پانچ سال تک قائم رہا۔ تحدیث نعت میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”۔۔۔۔۔ دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ جب تک شاہ

صاحب صحت یاب ہوں اور درس کے لائق ہو سکیں میں دو گھنٹے کے لئے دارالعلوم آ کر یہ دو سبق پڑھا دیا کروں اس کے لئے مشاہیرہ کی بھی پیش کش کی گئی۔ اتفاق سے اس سال ان دونوں کتابوں کی پڑھنے والی جماعت میں بعض ایسے طلبہ بھی تھے جو اس عاجز سے گہرا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اور میرے دل میں ان کی قدر تھی، انہوں نے بھی اس کے لئے اصرار کیا اور خود مجھے بھی ان کے تعلیمی نقصان کا احساس تھا۔ میں نے اپنے مستقل ضروری مشاغل اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات سے عرض کیا کہ میں روزانہ دو گھنٹے تو نہیں دے سکتا ہوں اتنا کر سکتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے لئے آ کر صرف صحیح مسلم

کاسبق پڑھا دیا کروں، شاہ صاحب جب صحت یاب ہو جائیں گے تو وہ بخاری شریف پڑھا دیں گے، اس طرح اس جماعت کا تعلیمی نصاب بھی پورا ہو جائے گا۔ میں اس ایک گھنٹہ کا کوئی مشاہرہ اور معاوضہ نہیں لوں گا، البتہ میری آمد و رفت رکشہ سے ہوگی، اس کا کرایہ دارالعلوم کی طرف سے ادا کر دیا جائیگا۔ یہی طے ہو گیا اور میں ایک گھنٹہ کے لئے دارالعلوم جا کر صحیح مسلم کا درس دینے لگا۔ شاہ صاحب کا علاج جاری تھا، امید تھی کہ انشاء اللہ کچھ عرصہ میں شفا یاب ہو کر وہ درس کا سلسلہ جاری کر سکیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ چند مہینے کے بعد مرض کا اختتام اُن کے سفر آخرت پر ہوا۔ (رحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین)۔

”میں جو مسلم شریف پڑھا رہا تھا بفضلہ تعالیٰ تعلیمی سال کے اختتام تک وہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جب دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا تو دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے پھر مجھ سے کہا گیا کہ اب میں مستقل دو گھنٹے دے دیا کروں اور حدیث کے دو سبق پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لوں۔ میں اپنے دوسرے مستقل مشاغل کی وجہ سے اس وقت بھی اپنے کو اس کے لئے آمادہ نہیں کر سکا، میں نے عرض کیا کہ جب تک شاہ صاحب مرحوم کی جگہ کسی استاذ حدیث کا انتظام ہو میں ایک گھنٹہ جس طرح اب تک دیتا رہا ہوں انشاء اللہ دیتا رہوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد بھی روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے دارالعلوم آتا رہا اور ایک سبق پڑھا تا رہا۔ دو تین سال اسی طرح گزر گئے اور شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم و مغفور کی جگہ کسی استاذ حدیث کا انتظام نہیں ہو سکا تو پھر دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اصرار کے ساتھ فرمائش کی گئی کہ میں دارالعلوم کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس ذمہ داری کو قبول کر لوں اور روزانہ صرف دو گھنٹے کے لئے دارالعلوم آ کر حدیث شریف کے دو سبق پڑھا دیا کروں اور اس کے لئے معقول مشاہرہ کی پیش کش بھی کی گئی۔

”میں نے اگرچہ طالب علمی سے ریکی فراغت کے بعد ۳-۴ سال تک بااختیار مدرس کی حیثیت سے تدریس کی خدمت بھی انجام دی تھی، لیکن اس کے بعد کسی مدرسہ سے ملازمت کا تعلق نہیں رکھا۔ طبیعت آزاد رہ کر ہی حسب توفیق کام کرنے کی عادی ہو گئی اور اسی کو اپنے لئے بہتر سمجھا (بعض تلخ تجربے بھی اس کا سبب بنے تھے)۔ اس وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اس پیش کش کو قبول کرنے پر بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوئی، دوسری طرف یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ حدیث شریف اور صرف حدیث شریف کی مستقل تدریسی خدمت کا موقع مل رہا ہے، اس سے انشاء اللہ خود مجھے بھی علمی اور دینی نفع ہوگا اور مشاہرہ کی شکل میں

دنیوی منفعت بھی ہے، وہ بھی اللہ کی نعمت ہے اور طبیعت کا انکار شاید نفس کے استکبار اور استکاف کی وجہ سے ہے جو بات خواہ ملازمت کو اپنے لئے گھنیا درجہ کی بات سمجھنے لگا ہے، اور اگر ایسا ہے تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

”میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کافی غور فکر کے بعد بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو مشورہ کے لئے سہارنپور حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری بات عرض کی“ (تحدیثِ نعمت باب دوم۔ تذکرہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب)۔

آگے حضرت شیخ الحدیث کے اس مشورے کا ذکر ہے کہ پیش کش قبول کر لینی چاہئے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا اور درس حدیث کا یہ سلسلہ پھر کئی سال چلا۔ غالباً ۱۹۶۳ء تک۔

زندگی کے اس ورق کی اہمیت

آپ کی زندگی کے اس ورق کی اصل اہمیت کیا ہے؟ اسے اہل علم خوب سمجھ سکتے ہیں۔ تدریس کا شغل آپ نے ۱۹۳۲ء سے ترک کر دیا تھا، یعنی ۱۹۷۷ء میں جبکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خاطر یہ شغل پھر سے اختیار کرنے کی نوبت آئی، یہ مشق ۳۲ سال پرانی ہو چکی تھی۔ لیکن آپ کو ادنیٰ تا مل اس خدمت کی ذمہ داری لینے میں نہ ہوا، جو بخاری و مسلم کی تدریس کی جیسی بھاری ذمہ داری تھی۔ اور پھر جیسے احسن طریقے پر اس ذمہ داری کے ادا کرنے پر آپ بفضلِ خدا قادر ہوئے وہ اس سے ظاہر کہ آپ معذرت خواہ ہوتے اور اربابِ ندوہ مصر کے سلسلہ دراز کریں۔

اس رسوخ فی العلم (علمی پختگی) کے حوالہ سے حضرت مولانا علی میاں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اپنی تعزیتی تقریر میں فرمایا تھا کہ:

”۔۔۔۔۔ ان کو علم میں بڑا رسوخ و کمال حاصل تھا، ان کا یہ رسوخ آخر عمر تک باقی رہا، ہمارے مشاہدہ اور علم میں یہ بات ہے کہ بعض حضرات کو ابتدائی دور میں رسوخ فی العلم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں ان کی مشغولیتیں بڑھتی جاتی ہیں، راحت اور آرام اور خانگی زندگی کے مطالبات بڑھتے ہیں، دینی و ملی اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا پڑتا ہے ان سے متاثر ہو کر بلکہ ان سے دب کر وہ ایسے ہو جاتے ہیں کہ صحیح عبارت کا پڑھنا بھی ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے، لیکن مولانا کا رسوخ آخر عمر تک باقی رہا، جو بہت کمیاب بلکہ نادر بات ہے۔۔۔۔۔ اس کا میں عینی شاہد ہوں اور قریب ترین رفیق کی حیثیت سے مجھے خود اس کا تجربہ ہے۔“

بریلی کا قرآنی اسکول

مدریس کے تذکرہ نے یاد دلایا کہ اس سے پہلے بریلی کے زمانہ قیام (۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶) میں بھی آپ نے ایک چھوٹا سا تدریسی شغل خود اپنے شوق سے اختیار فرمایا تھا۔ بریلی کے محلہ شاہ باد شرقی میں چند گھروں کا ایک احاطہ، جیسا کہ اوپر ایک جگہ ذکر میں آچکا ہے، ”گھیر مولوی عبدالقیوم صاحب“ کہلاتا تھا، جو ایک بڑے زمیندار تھے۔ اسی گھیر میں آپ کو رہائش کے لئے مکان ملا۔ اس گھیر کے سب مکین آپس میں رشتہ دار تھے اور سب کم و بیش جدید تعلیم یافتہ نیز دین میں آپ کے ہم مسلک اور کم و بیش دیندار بھی۔ گویا قیام کے لئے ایک موزوں ترین جگہ۔ زیادہ دیندار گھرانوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دینی اعتبار سے سب ہی کا مرجع بفضل اللہ تعالیٰ بن گئے۔

بریلی میں مناظرانہ سرگرمیوں سے یکسو ہونے کے بعد جو ایک نئے ذہنی رُخ کا دور آپ کی زندگی میں شروع ہوا تو اس کے ضمن میں ایک تقاضہ دل میں ابھرا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہم اہل علم دین کی خصوصی توجہ کا محتاج ہے، اور اس کی خدمت کی فکر نہ کی گئی تو آنے والے حالات میں (وہ حالات جن کے تصور سے الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر نکالا گیا تھا) ملت کی مشکلات اس طبقہ کے سبب سے دوچند ہو سکتی ہیں۔ پس اس کے اور اپنے درمیان کا ”مولوی اور مسٹر“ والا بعد دور کیا جائے اور پھر اسے اُس کے دین سے آشنا کرنے اور دل میں اس کی قدر ڈالنے کی تدبیر کی جائے۔ خود آپ کا حال بحمد اللہ یہ تھا کہ راقم نے جب سے ہوش سنبھالا اس جدید طبقہ سے وہ بچاؤ اور کھنچاؤ کبھی نہیں دیکھا جو آپ کے قدیم طبقہ میں لوگوں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ بلکہ گھیر مولوی عبدالقیوم صاحب کی رہائش کو پسند کرنا ہی (جو جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا مسکن تھا) اس بات کی صاف علامت تھی کہ آپ ”قصہ جدید و قدیم“ کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ایک صاحب علم دین کی حیثیت سے اس طبقہ کو ضرورت مند سمجھ کر اپنا فرض جانتے تھے کہ اسے اپنے علم سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔ چنانچہ آپ نے خود غور و خوض سے کام لیکر اس کی تدبیر ایک تعلیمی سلسلہ سے گھیر میں شروع کر دی۔ اور آپ کے لئے یہ کام شروع کر دینا اس لئے آسان تھا کہ جس ماحول میں رہ رہے تھے وہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں ہی کا ماحول تھا، اگرچہ وہاں بگاڑ خدا کے فضل سے نہیں آیا تھا، اور یہ چیز آپ کے کام کو اور بھی آسان کرنے والی تھی۔ الغرض دل میں اللہ کے ڈالے تقاضہ سے ایک مجتہد معلم آپ کے اندر سے نکل کے آگیا۔ حالانکہ تعلیم و تدریس کا شغل چھوڑے ہوئے کم از کم دس سال تو ہو ہی چکے تھے۔

ان دنوں میں ضلع مظفر نگر کے مولانا مشتاق احمد صاحب چڑھتھاولی کی اردو میں تیار کردہ ابتدائی عربی صرف و نحو کی کتابیں معروف ہوئی تھیں۔ یہ اور اسی طرح کی بعض اور کتابیں آپ کو اپنے مقصد کے لئے فی الجملہ موزوں نظر آئیں۔ دفتر الفرقان جو مکان کے باہر متصل ہی دو کمروں کی عمارت میں تھا اس سے متصل ایک ایسا ہی کمرہ اور تھا جس میں ہماری ہی طرح ایک بیرونی طالب علم (بدیع الدین نظر) بریلی کالج میں تعلیم پانے کے لئے مقیم ہوئے۔ یہ مزاجاً دیندار تھے حضرت صاحب سوانح کی قربت انھیں راس آئی ہی تھی۔ جہاں تک یاد ہے آپ نے انہی کو اس تعلیمی منصوبہ کو عمل میں لانے کا ذریعہ بنایا جس کے مطابق تھوڑے سے عرصہ میں اتنی عربی آسکتی تھی کہ طالب علم قرآن کا سادہ انداز کا درس لے سکے اور اس طرح قرآن سے اور اہل علم دین سے اس کے رشتہ کی داغ بیل پڑ جائے۔ نظر صاحب (جنھیں ہم نظر بھائی کہتے تھے اور راقم کو انھوں نے ABCD پڑھائی تھی) کے توسط سے بریلی کالج کے کافی نوجوان اس سے فائدہ اٹھانے کو تیار ہوئے۔ اور ہفتہ کے مقررہ دن پر دفتر الفرقان کے باہر چوتراہ پر کلاس لگنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ تعلیمی منصوبہ اس سوچ پر مبنی تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جو دینی بگاڑ آتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ ان کا تعلیمی ماحول، دینی لٹریچر سے ان کی نا آشنائی اور علماء کے طبقہ کے بارے میں ایسے تصورات ہیں جو ان کے بعد اور تحقیق پیدا کریں۔ چنانچہ دینی تعلیمات جو علماء ہی کے ذریعہ علم میں آسکتی ہیں وہ ان کی نگاہ میں بے وقعت ہو جاتی ہیں۔ ”لیکن (جیسا کہ فرماتے ہیں) اس علمی محرومی اور دینی بے مائیگی کے باوجود اس طبقہ کے عام افراد کو، اسلام، پیغمبر اسلام اور کتاب اسلام (قرآن) سے اجمالی درجہ میں عقیدت و محبت کا خاص تعلق بجز اللہ ابھی باقی ہے۔ اور یہی ہمارے لئے آخری شعاع امید ہے۔ چنانچہ اگر ان کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ ان مسائل و معتقدات کی بنیاد رسول اللہ (ﷺ) کے ثابت شدہ ارشادات اور قرآن حکیم کی واضح آیات پر ہے تو ان میں سے اکثر ان شاء اللہ تسلیم و انقیاد کی گردن جھکا دیں گے۔

پس اس سوچ کے ماتحت اس طبقہ کے مسئلہ کا حل یہ ٹھہرا کہ اسے قرآن تک پہنچا دیا جائے، جس کے لئے اس کے دل میں پوری عقیدت ہے۔ اور قرآن تک پہنچانے کے لئے ضرورت ہے کہ اسے قرآن کی زبان سے آشنا کرنے کا وہ طریقہ سوچا جائے جس کا وہ آسانی سے متحمل ہو سکے۔ اس مسئلہ پر آپ کے غور و فکر نے آپ کی رہنمائی اس حقیقت کی طرف کی کہ قرآن پاک کے پچاس فی صدی الفاظ اردو میں آئے ہوئے ہیں۔ طالب علم کا ذکر اس طرف موڑ دیا جائے تو منزل بہت آسان ہو سکتی ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ ہی کو لیا جائے تو ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کے تمام کلمات اردو میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر ”الحمد للہ رب العالمین“ کا بھی یہی حال

ہے صرف "عالمین" کو بتانا پڑے گا کہ وہ "عالم" کی جمع ہے۔ آگے "الرحمن الرحیم" کا حال ابھی گزر چکا "مالک یوم الدین" میں صرف "دین" کا مطلب بتانا پڑے گا۔ "مالک" اور "یوم" دونوں اردو میں بولے جاتے ہیں۔ اسی طرز پر آگے دیکھتے جائیں تو یہ تجربہ بالکل درست ٹھہرتا ہے۔ اور آپ نے اس سلسلہ کے اپنے مضمون "تھوڑے وقت میں عربی تعلیم کے چند اصول" (الفرقان جمادی الاولیٰ والاخریٰ ۱۳۶۲ھ) میں تحریر بھی فرمایا ہے کہ "میں نے اس نظر سے قرآن پاک کو خوب کھنگالا ہے۔۔۔۔۔"

پس اس منصوبہ پر مطمئن ہو کر جدید طبقہ کے سلسلہ میں اپنے دینی فرض سے عہدہ براہونے کے لئے آپ نے اس منصوبہ پر کام شروع کر دیا۔ راقم کو بس اتنا ہی یاد ہے، یہ یاد نہیں کہ یہ سلسلہ کتنے دن تک چلا۔ خود شروع کرنے کے علاوہ آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے مدارس بھی اس طبقہ کی اسی طرح سے تعلیم کے لئے اپنے نظام میں گنجائش نکالیں، اس لئے کہ انفرادی طور پر کچھ اشخاص کی جدوجہد سے پورے طبقہ کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے ان دنوں میں ارباب مدارس کو الفرقان کے ذریعہ پوری شد و مد سے توجہ بھی دلائی اور اس کے لئے نظام کا نقشہ بھی نمونہ بنا دیا تھا۔

الغرض آپ سے جو کچھ امت کے اس اہم مسئلہ میں ہو سکتا تھا اسے اپنے امکان بھر انجام دینے کی کوشش فرمائی۔ والاجر عند اللہ۔

بریلی کا مسکن اور اہل محلہ

بریلی کا ذکر آجانے پر بے مروتی ہوگی کہ وہاں جس جگہ ۱۳-۱۴ سال قیام رہا اس کی تھوڑی بہت تفصیل نہ رقم کی جائے، جبکہ اس عرصہ قیام سے کبھی نہ بھلائی جاسکے والی یادیں وابستہ ہیں۔ جو مکان رہائش کو اللہ نے اپنے کرم سے دلایا وہ محلہ شاہ بادشرتی کے "گھیر مولوی عبدالقیوم صاحب" میں واقع، ماسٹر عبدالرحمن حنیف صاحب کا مکان تھا۔ یہ دراصل ایک بڑے مکان کا نصف حصہ تھا، نصف میں ماسٹر صاحب کی رہائش تھی دوسرا نصف ان سے کرایہ پر ہمیں مل گیا تھا۔ ماسٹر حنیف صاحب کے علاوہ اس گھیر کے مینون میں ایک طرف ہمارے سامنے منصرم عبدالماجد صاحب کا نہایت شاندار نو تعمیر مکان تھا، آپ بریلی کلکٹری کچہری میں منصرم کا عہدہ رکھتے تھے۔ پوری شرعی داڑھی کے ساتھ کامل دینداری سے مشرف۔۔۔ محلہ کی مسجد میں جو گھیر والوں ہی سے متعلق تھی، رمضان مبارک میں منصرم صاحب مرحوم کی

مغرب کی اذان کا منظر بے ساختہ ذہن میں کھنچ رہا ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کاملۃً اسی مسجد میں راقم اور برادرِ محفیظ الرحمن نے قاعدۂ یسرنا القرآن سے لیکر قرآن مجید مرحوم و مغفور مولوی محمد احسن صاحب سے پڑھا۔

منصرم صاحب کے علاوہ ان کے مکان کی اوٹ میں، آپ کے برادر اکبر محترم عبدالحال صاحب (حکیم جی) کا سادہ سا قدیم مکان جس میں ان کے صاحبزادگان عبدالرازق صاحب اور عبدالستار صاحب کی بھی مع اہل و عیال رہائش تھی۔ پھر مغربی رخ پر ہماری ہی طرح کے ایک مختصر سے بیرونی کنبہ کا مختصر سا مکان۔ گھیر کے یہ دو برادران کے گھر، اور ان میں بھی خاص طور سے حکیم جی کا گھر (جس کی یادگار بھائی عبدالرؤف صاحب اب کراچی میں ہیں) پوری دینداری کا رجحان رکھنے والے تھے۔ ان کے علاوہ گھیر کے ساکنین میں مولوی عبدالقیوم صاحب مرحوم کے گھرانے کے ایک انسپکٹر عاشق صاحب ہوتے تھے، دوسرے جمیل الدین صاحب (ان کا بھی نام کراچی کی ملاقات میں گزرا ہے) نیز سر اپا نظافت و نفاست ڈپٹی عبداللطیف صاحب کے فرزند، پروفیسر عبدالشکور صاحب اور ماسٹر عبدالحسب صاحب، جبکہ ڈپٹی صاحب کا قیام گھیر سے باہر مصلیٰ ہی تھا۔ ان سب گھروں سے ایسا اپنائیت کا تعلق کم و بیش قائم ہو گیا تھا کہ جیسے عزیزداری ہو۔ خواتین میں تو کوئی تفریق اس معاملہ میں تھی ہی نہیں، مردوں میں البتہ یہ اپنائیت ان کی دینی زندگی کے مطابق تھی۔

گھیر سے باہر اس کی شمالی سمت میں اُن لوگوں کے عزیزداروں کا ایک بڑا گھرانہ، بس ایک سڑک کے پار، ”باغ والوں“ کا تھا۔ یہ ہمارے گھر سے تعلق میں سب ہی سے بڑھا ہوا تھا، علیٰ ہذا دنیاوی حیثیت میں بھی فائق۔ یہ ضلع میرٹھ کا خاندان تھا، اس کے بزرگ میاں بیوی حضرت حکیم الامت کے دستِ گرفتہ تھے۔ باغ جس کے اندر بنی کوٹھی اور بارہ دری اس گھرانہ کا مسکن تھی، کبھی روہیلہ نواب رحمت علی خان مرحوم

(۱) حضرت مولانا عبید اللہ سندھی جب ۱۹۳۸ء میں ہندوستان واپس تشریف لے آئے تو سورت کے ایک جلسہ میں جہاں حضرت صاحبِ سوانح بھی مدعو تھے آپ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا سندھی حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر اختصاص کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے حضرت مولانا کی خدمت میں گزارش کی کہ شاہ صاحب کی ”حجۃ اللہ الباقیہ“ کے بعض مقامات ذرا دقت طلب محسوس ہو رہے ہیں، کوئی وقت عنایت فرمائیں کہ میں دلی حاضر ہو کر (جہاں مولانا کا قیام تھا) ان مقامات کے بارے میں اطمینان حاصل کروں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ نہیں، میں خود بریلی آ کر تمہارے پاس کچھ ٹھہروں گا، پس اس کے بعد جب آپ کی تشریف آوری بریلی ہوئی تو قیام منصرم صاحب مرحوم کے اسی مکان کی بالائی منزل رہا تھا۔

ہا سکن ہوا کرتا تھا۔ اسی گھرانہ کے پروفیسر خلیق احمد صاحب کا ذکر پاکستان کے سفر ۱۹۷۸ء میں گزرا ہے۔ پروفیسر صاحب کی والدہ ماجدہ راقم کی والدہ مرحومہ سے بالکل اپنی بیٹیوں والا تعلق برتی تھیں۔ بزرگ عمری کے باوجود خود ہمارے گھر تشریف لے آیا کرتیں اور والدہ مرحومہ کو تو بلاتی ہی رہتی تھیں (اللہ رحمہما) بے پایاں سے نوازے)

پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو انگریزی تعلیم کے زیر اثر اور ملازمت پیشہ ہونے کے سبب یہاں کے سب گھرانے کم و بیش اس کے حامی تھے۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد سب ہی رفتہ رفتہ کراچی کو سدھار گئے، زیادہ تر تو کراچی ہی میں رہے، بعض اپنی ملازمتوں کے سلسلہ میں لاہور اور پشاور وغیرہ میں جا بے۔ پروفیسر عبدالشکور صاحب، جہانگیر یاد آتا ہے، انڈیا ہی میں رہے۔

گھیر سے باہر کے خاص اہل تعلق

بریلی میں حضرت والد ماجد کا قیام دیوبند کے ترجمان وکیل اور بریلوی یلغار کو چیلنج کرنے والے کی حیثیت سے عمل میں آنے کی بدولت آپ پوری بریلی کے دیوبندی گھرانوں کے مرجع کی حیثیت قدرتی طور پر پائے گئے تھے۔ یعنی گھیر سے باہر بھی تعلق والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا، اس حلقہ کے چند نمایاں اور زیادہ قریبی تعلق والے حضرات کا ذکر بھی لازم ہے۔ سب سے پہلے مدرسہ اشاعت العلوم سرائے خام کے صدر نشین حضرت مولانا یسین صاحب، جو بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے اور انہی سے راقم کی والدہ ماجدہ کی نماز جنازہ والد ماجد نے پڑھوائی تھی۔ آپ کا مدرسہ دیوبندی مسلمانوں کا خاص مرجع تھا، راقم نے یہیں بالکل اوائل عمر میں سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی زیارت ان کی ایک تقریر میں کی۔ پھر (۲) بریلی کے بزرگ اور نامور طبیب حکیم مختار احمد صاحب امر دہوئی۔ (۳)، ڈاکٹر مبارک علی شاہ صاحب۔ (۴) حکیم شمشاد علی خاں صاحب۔ (۵) مرزا عبدالحمید بیگ صاحب۔

حکیم مختار احمد صاحب، ڈاکٹر مبارک علی شاہ صاحب اور حکیم شمشاد علی خاں صاحب ان تینوں حضرات سے خاص تعلق ان کی بلتی حیثیت کے پہلو سے تھا، بزرگم ان حضرات کا ہمارے گھر پر بحیثیت معالج تھا رہا۔ اور تینوں حضرات اپنے پیش میں مقام رکھتے تھے۔ حکیم مختار احمد صاحب کو تو گھر پر تشریف لانے کی زحمت نہ صرف والدہ مرحومہ کی وجہ سے کبھی کبھی ہوتی تھی، وہ دور بھی نہ تھے اور صاحب موٹر کار تھے۔ باقی دونوں حضرات ہم سے بہت کافی فاصلہ پر پرانے شہر میں ہوتے تھے۔ مگر جب بھی گھر تک زحمت کی ضرورت ہوئی،

بے عذر تشریف لائے اور بس تعلق کے ناتے۔ ڈاکٹر صاحب کو تو ایک مرتبہ شاید مہینہ بھر تک ہر دوسرے تیسرے دن آنا ہوا، کہ حضرت والد صاحب کے پاؤں میں ٹخنے کے نیچے آپریشن کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ اور بہت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ اور قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ دینی رحمان اس درجہ کار کھتے تھے کہ اچھی پختہ عمر میں اپنے پرانے شہر کے مدرسہ اشفاقیہ سے باقاعدہ فراغت کر کے عالم دین بنے۔ چہرہ بھی کیا ہی نورانی اللہ نے بخشا تھا اور بندہ بھی شکر گزار اس کی توفیق سے ثابت ہوا۔

ڈاکٹر مبارک علی شاہ صاحب اور حکیم شمشاد علی خاں صاحب کے بارے میں تو اب کچھ معلوم نہیں کہ ان کی جگہ کسی نے لی یا نہیں، البتہ حکیم مختار احمد صاحب کی جگہ سنبھالنے کے لئے آپ کے صاحبزادہ حکیم صدیق احمد صاحب موجود تھے جو آپ کی حیات میں بھی فی الجملہ شریکِ مطب تھے اور والد صاحب کے ہم عمر ہی ہوں گے۔ ان کے بعد بھی مطب کا یہ سلسلہ حکیم صاحب کی نسل میں آج تک قائم ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ۔ آجکل آپ کے پوتے یا پر پوتے (مجھے تحقیق نہیں) حکیم خورشید احمد صاحب کے ذریعہ خاندانی روایت اس شان سے قائم ہے کہ شاید پورے ملک سے مریضوں کا رجوع ہے۔

پانچویں، مرزا عبدالحمید بیگ صاحب کا نام سفر پاکستان ۱۹۷۱ء کی روداد میں گزر چکا ہے۔ ان کا تعلق ان سے ملاقات کے تذکرہ نے یاد دلایا۔ ورنہ شاید یہ نام مجھے یاد نہ آتا، کیونکہ ان کا تعلق ان طیب حضرات کی طرح کا نہ تھا جو مجھ پر بھی پوری طرح عیاں ہوتا، بس اتنا یاد ہے کہ اکثر تشریف لاتے تھے۔ یہ تعلق بظاہر دینی و علمی تھا۔

تیرہواں باب

(بندہ اپنے رب کے بلاوے پر!)

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
(قرآن سورۃ الحجر)

گذشتہ اوراق سے یہ بات عیاں ہوتی رہی ہے کہ حضرت صاحب سوانح کی صحت میں انحطاط برابر بڑھ رہا تھا۔ ۲۵/۲۴ مارچ ۱۹۹۷ء کی درمیانی شب میں اس ناتواں وجود کو فالج کے حملہ سے سابقہ ہوا۔ اور پورے چالیس دن گزرنے پر، ۴ مئی ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ کی شب ساڑھے آٹھ بجے (بوقتِ عشاء) روح پاک اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتی جسمِ عنصری کے ۹۴ سالہ رشتہ سے آزاد ہو گئی۔ فَاِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُونَ۔ جاں سپردگی کے لمحات کے ایک بڑے ہی مبارک منظر کی گواہ برادرِ میاں حسان کی نگاہ ہوئی کہ تین بار آپ کے ہونٹ اس طور پر کھلے جیسے کوئی مشروب پی رہے ہوں، اور تیسرے گھونٹ کے معابد روح پرواز کر گئی۔

آپ کے یہ معنی خیز ”چالیس دن“ (اربعین لیلۃ) ڈاکٹر غوث احمد قریشی صاحب کے سحرِ نرسنگ ہوم میں گزرے، ڈاکٹر صاحب کو بزرگوں کی طبی خدمت گزاری کا خصوصی ذوق اللہ نے دیا ہوا ہے۔ اور عرصہ سے وہ بڑی مجاہدانہ اداؤں کے ساتھ آپ کی دیکھ بھال کرتے آرہے تھے۔ صبح کو مرض کا احساس ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب کو فون کیا گیا اور وہ فوراً خود ہی ایسولینس لے کر پہنچے اور اپنے نرسنگ ہوم لے آئے۔ شروع کے ایک ہفتہ میں علاجِ معالجہ سے امید بخش آثارِ بفضلِ خدا نمایاں ہوئے، پر اس کے بعد حالتِ گراوٹ ہی کی طرف پلٹ گئی اور یہ صورت بڑھتی رہی۔ وفات سے ایک دن پہلے یعنی شنبہ کے دن سہ پہر سے حالت میں

زیادہ تغیر ہوا، تنفس بڑھ گیا، بخار تیز ہو گیا، شام ہوتے ہوتے حالت اور زیادہ نازک ہو گئی، رات دو بجے کے لگ بھگ کچھ افادہ محسوس ہوا صبح ہوتے ہوتے طبیعت میں کافی سکون دکھائی پڑا، مگر پھر اگلے دن کے بعد سے حالت پھر بدلی، تنفس پھر تیز ہونا شروع ہوا، بخار بڑھنے لگا، پیشانی پر بار بار پسینہ بھی آ رہا تھا۔ مگر زبان پر مسلسل اللہ اللہ کا اسمِ اعظم جاری تھا جو بالکل آخری سانس تک جاری رہا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے کہ وقت موعود آ پہنچا اور روحِ قفسِ عضری سے پرواز کر کے عالمِ قدس میں پہنچ گئی۔ خانوادہ نعمانی، اور اس کے ساتھ پیہ نہیں اور کتنے، اب صرف آپ کی چھوڑی ہوئی دعاؤں کے سائے میں رہ گئے۔ رہے نام اللہ کا کہ

”کلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَإِنَّ وَيَقْنَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ.“

ضروری انتظامات کے بعد آپ کا جسدِ خاکی گھر لایا گیا اور یہ خدمت بھی ڈاکٹر غوث احمد صاحب ہی نے اپنی ایسولینس کے ذریعہ انجام دی۔ حدیث کے مطابق تدفین میں بے وجہ تاخیر مناسب نہیں۔ چنانچہ اخبارات کے پوچھنے پر نماز جنازہ کا وقت صبح نو بجے بتا دیا گیا۔ علی الصبح غسل دیا گیا، غسل دینے والوں میں سر فہرست آپ کے نہایت محبوب مسترشد جناب حافظ محمد اقبال صاحب تھے، جن کی مدد کرنے والوں میں حفیظ میاں، حسان میاں اور سجاد میاں اور سنبھل سے آئے برادرانِ عمر ادمولوی عبدالحمید و غیرہ۔ غسل کے بعد تکفین کا کام بھی تیزی سے انجام دیا گیا چنانچہ جنازہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دروازہ سے باہر تھا۔ جسے باہر منتظر سینکڑوں سوگوار چین نے ہاتھوں ہاتھ لیا، آگے ہر قدم پر ہجوم میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ کوئی سوانو بجے جنازہ ندوۃ العلماء کے پھاٹک میں داخل ہوا جہاں نمازِ جنازہ کے لئے رات زرنگ ہوم ہی میں برادرِ محترم مولانا سید محمد رابع صاحب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے دارالعلوم کے وسیع میدان کی پیش کش فرمادی تھی۔ جنازہ پھاٹک میں داخل ہوا تو دیکھا گیا کہ قریب ہی حضرت مولانا علی میاں ایک کرسی پر تشریف فرما منتظر ہیں۔ انتقال کی خبر پر آپ رائے بریلی سے تشریف لائے تھے۔ آپ خود ضعف کے عالم میں چل رہے تھے۔ پھر بھی بے ساختہ کندھادینے کے لئے اٹھے، جنازہ رک گیا۔ راقم اپنی کمزوری اور مٹی کی شدید گرمی کی بنا پر جنازہ میں کافی پیچھے تھا، پر برادرِ سجاد موقع پر موجود تھے۔ عرض کی کہ حضرت اس کا ارادہ نہ فرمائیں اور آپ کے بعض اعزہ کی تجویز پر آپ کا تقاضہ نرم کرنے کے لئے وہیں چہرہ دکھا دینے کی صورت اس طور پر پیدا کی گئی کہ جنازہ کے جلوس میں کوئی انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔ ہزاروں کے مجمع میں بڑی مشکل بات تھی مگر اللہ نے آسان فرمادی۔ اور جنازہ نماز کے لئے متعین میدان کی طرف بڑھ گیا۔ حضرت قازی محمد صدیقی

صاحب باندوئی، جن کے لئے امامتِ نماز کی وصیت تھی، حضرت مولانا اعلیٰ میاں کے ایماء پر امامت کے لئے بہ تکلف آگے بڑھے اور نماز ادا ہوئی۔

تدفین

ندوہ سے قبرستان تک کا فاصلہ ۷ کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہی رہا ہوگا، پورے راستے مجمع میں اضافہ ہی ہوتا گیا، ٹریفک پولیس کے افسران نے پورے راستے کی ایک طرف کی ٹریفک بالکل بند کر رکھی تھی، سخت گرمی کا موسم تھا، جگہ جگہ لوگوں نے اپنے طور پر سیلیس لگا رکھی تھیں۔ پونے دو گھنٹے میں یہ فاصلہ طے ہوا، قبرستان پہنچے تو دیکھا کہ ہزاروں لوگ وہاں منتظر کھڑے ہیں، ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی اس موقع پر سیدھے وہاں پہنچے تھے کہ ”دوسری نماز جنازہ“ یہاں ہوگی، ہم یہیں پڑھ لیں گے۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر جنازہ اپنی آخری آرامگاہ کے قریب پہنچا، وہاں پہلے سے قبر کو چاروں طرف سے سیکڑوں لوگوں نے اپنے مضبوط حصار میں لے رکھا تھا۔ سجاد میاں اور مولوی عبدالمومن قبر میں اترے اور چشمِ زدن میں ہمارے عزادار برادران ڈاکٹر خالد، راشد مرحوم، عمر میاں، زبیر میاں اور حبیب میاں وغیرہ نے جسدِ خاکی کو سجاد میاں و مولوی عبدالمومن کو تھمایا اور ان دونوں نے انھیں ان کی لحد میں لٹا دیا۔ ان دونوں کے باہر نکلتے ہی آنا فانا راشد میاں نے پڑے لگا کر قبر بند کی۔ اس پورے عمل میں مشکل سے ۵۔۷ منٹ لگے ہوں گے۔ عجیب مشاہدہ یہ ہوا کہ ہزار ہا لوگ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کندھا دینے کی کوشش میں بے نظم و بے ضبط ہوئے جا رہے تھے، اتنی دیر بالکل ساکت و صامت کھڑے رہے، قبر جب بند ہوگئی تو مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰی پڑھتے ہوئے سب نے مٹی دی۔

انتقال اور وقتِ نماز کی خبر اخبارات کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو، بلکہ بی بی سی اردو ہندی سروس، سے بھی نشر ہوگئی تھی اس لئے بیرونِ کھنؤ کے سینکڑوں اصحاب بھی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ شہر کے بہت لوگوں کو شکوہ رہ گیا کہ شہر میں گلی کو چہ والا اعلان عام نہ ہونے سے وہ اس لئے محروم رہ گئے کہ ریڈیو اخبار کی رسائی نہیں رکھتے تھے۔ مگر اول تو اعلان کے لئے وقت ہی کہاں تھا، جبکہ نوبتِ نماز ہونا تھی۔ اور پھر ایسا اعلان تو ایک طلب اور اظہارِ ضرورت کا بھی پہلو رکھتا ہے، اسے کیسے گوارا کیا جاتا؟ خاص کر اس ہستی کے لئے جس نے ہمیشہ خود کو کچھ نہ سمجھنے اور نہ سمجھنے دینے کی خور کھی تھی۔ اللہ ان شکوہ خنرِ نجیدگان کو اجرِ محبت دے، حضرت مرحوم کو جنت الفردوس کا نشین اور ہم آلِ نعمانی کو اُس زندگی کی توفیق جو آپ کی روح کو شاد رکھے۔

مقامی اخبارات کے خراج عقیدت سے

چند چند سطریں

روزنامہ ”قومی آواز“

”(لکھنؤ ۴ مئی ۱۹۹۷ء) یہ خبر نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے ملک پر بجلی بن کر گری کہ بلند مرتبت اسلامی مفکر و مصنف، عظیم خطیب اور ماہر حدیث مولانا محمد منظور نعمانی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مولانا عرصہ سے صاحب فراش تھے لیکن ان کا وجود ہی دینی اور اسلامی حلقوں میں تقویت کا باعث تھا۔

”مولانا گذشتہ ۶ دہائی سے اسلام کے صحیح عقائد اور اس کی روح کو عام کرنے میں کوشاں تھے اس کے لئے وہ باقاعدہ اپنے قلم اور زبان سے سعی کر رہے تھے۔ انھوں نے اسلام کی صحیح تصویر اور اس کی عظمت دنیا کے سامنے رکھی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے تقریباً سو کتابیں لکھیں۔۔۔۔۔۔“

روزنامہ ”صحافت“

(لکھنؤ ۵ مئی) عالمی شہرت کے مالک مولانا محمد منظور نعمانی کو جن کا کل رات ۸ بجے مقامی زرسنگ ہو م میں انتقال ہوا سپرد خاک کرنے کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت آج عیش باغ میں جیسے سارا شہر امنڈ پڑا۔ اتنی زیادہ پر غم آنکھوں، اتنے زیادہ متفکر چہروں اور اتنے بہت سے کانپتے ہاتھوں نے شہر میں کسی شخصیت کو اس کی آخری آرام گاہ تک شاذ و نادر ہی پہنچایا ہو گا۔ مولانا کے انتقال کی خبر شہر پر بجلی بن کر گری اور خبر عام ہوتے ہی پرانے لکھنؤ میں زندگی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی۔۔۔۔۔۔“

روزنامہ ”ان دنوں“

(لکھنؤ ۵ مئی) آج صبح فجر کی نماز کے بعد سے محدث جلیل حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے مکان

واقعہ نظر آباد میں جو تعزیت کرنیوالوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت تک ہجوم بڑھتا ہی رہا جب تک جنازہ باہر نہیں لایا گیا۔ ہزاروں عقیدت مند صبح ہی سے ندوہ میں جمع ہو کر صفیں بنائے بیٹھے تھے اور ہزاروں فرزندانِ توحید اپنے کاندھوں پر جنازہ لیکر ندوہ جا رہے تھے۔ نماز کے بعد عیش باغ تک تقریباً سات کیلومیٹر کا سفر گرمی کے سخت موسم کے باوجود پیدل ہی کیا گیا اور مجمع برابر بڑھتا رہا۔ وزیر اعلیٰ کے پرنسپل سکریٹری مسٹر بی ایل پونیا اور سکریٹری مسٹر سراج حسین صاحبان نے زبردست انتظامات کئے۔ اتنے طویل راستے میں پانی کے ٹینکر اور ٹریفک کنٹرول کرنے کے لئے پولیس کے افسر ہر جگہ مستعد نظر آئے۔ جنازہ جیسے ہی عید گاہ کے قریب پہنچا ٹریفک بند کر دیا گیا اور انسانوں کا سیلاب بہتا ہوا سیدھا قبر کے پاس جا کر رکا۔ کسی اعلان کے بغیر دوسرے شہروں تک کے سینکڑوں اہل تعلق شریک ہوئے وزیر بھی تھے، سکریٹری بھی، ممتاز وکلا اور ماہرینِ تعلیم بھی، شیعہ حضرات بھی، غیر مسلم بھی۔

بیرونی اخبارات و مجلات سے تعزیتی مضامین کی جھلکیاں

”اٹھ گیا علم و عمل کا آفتاب“

ہفت روزہ ”نئی دنیا“ دہلی ☆

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب جنھیں ”مرحوم“ لکھتے ہوئے آنکھیں نمندیدہ، قلب رنجیدہ اور جگر پاشیدہ ہے، جن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں بلکہ وہ جہاں منظورِ خدا تھے وہیں منظورِ نظرِ انبوہ انسانی بھی، اسی وجہ سے ان کے سانچہ ارتحال، حادثہ وفات کی کسی مخصوص خاندان، جماعت یا کسی محدود دائرہ ہی نے لک محسوس نہیں کی بلکہ جہاں تک یہ خبر پہنچی وہیں اس حادثہ کو اپنا حادثہ اور اس غم کو اپنا غم بلکہ ملتِ اسلامیہ کا غم سمجھا گیا۔ کیونکہ حضرت مولانا ان لوگوں میں تھے جو دوسروں کے لئے جیتے تھے، جن کے اہم قلم کی تیز گامیوں نے باطل کو پسایا اور حق کو سرخ روئی بخشی تھی، جن کا فیضانِ دریا کی طرح رواں، ہوا کی طرح عام، سورج کی شعاعوں کی طرح اُمنڈ رہا تھا۔ ان کی وفات پر جو آنکھ نمناک نہ ہو اس کا کوئی عذر قابلِ قبول

نہیں۔۔۔ اس شخصیت پر بلکہ شخصیت ساز شخصیت پر بہت سے علم و عمل کے آفتاب قلم اٹھائیں گے اور ان کے زندگی بخش کارناموں کو قلم و قریطاس کی سلامی دیں گے اور انہی کو اس کا حق بھی ہے۔ البتہ ہم نے بھی مولانا کی سادگی، پرکاری لطیف و مؤثر تحریرات سے فائدہ اٹھایا اس لئے دل روتا ہے۔

نالہ کر لینے دیں، اللہ نہ چھیڑیں احباب

ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

☆ تحریر مولانا انعام اللہ قاسمی

”علم دین کا ایک چراغ اور بجھا“

مجلہ ”الماثر“ مٹو☆

۲۴ مئی کو سفر حج سے واپسی ہوئی، امسال منی میں آتشزدگی کے واقعہ سے دل و دماغ پہلے ہی سے متاثر تھا، سینکڑوں حجاج کی موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا، ابھی وطن پہنچنے دو روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ جماعت دیوبند کے قابلِ فخر فرزند اور ہم سب کے مخدوم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ۲۴ مئی کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے اپنے اکابر رحمۃ اللہ علیہم کے سچے جانشین تھے، دیوبندیت اپنی پوری روح کے ساتھ مولانا مرحوم کے اندر رچی بسی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قلم اور ان کی زبان نے ہر باطل اور ہر فتنہ کا مقابلہ کیا اور کسی تساہل کا کبھی شکار نہ ہوئے۔ بریلویت کی جڑ انھوں نے خود بریلی میں قیام کر کے اکھاڑ ڈالی، الفرقان کا اجراء اللہ کے اس شیر نے بریلی ہی سے کیا جہاں اس عقیدہ و مذہب کے بڑے بڑے جفا داری تھے اور حق یہ ہے کہ مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تنہا جس پامردی اور جواں ہمتی سے اس فتنہ کا سد باب کیا یہ انہی کا حصہ تھا، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مناظروں اور ان کی تحریروں نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا اور کم از کم رضا خانی علماء علم اور عقل کی راہ سے اپنی بات کہنے سے عاجز ہو چکے ہیں۔ یہ مولانا نعمانی مرحوم کا وہ کارنامہ ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

مولانا نعمانی کو اللہ نے دین کا حقیقی داعی بنایا تھا۔ الفرقان کی پچاس سال سے زیادہ کی فائلیں اور مولانا کی تمام تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ مولانا پر دین کی دعوت کا جذبہ غالب تھا، ان کی تحریر بڑی سنجیدہ با وقار

اور سہل ممتنع و موثر ہوتی تھی۔ اپنی بات کو دل میں اتار دینے کا ان کو ملکہ حاصل تھا، کسی کی تحریر کی ایسی اثر انگیزی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی کتاب ”اسلام کیا ہے“ نے نہ معلوم کتنی زندگیوں میں اسلام کی روح پھونک دی۔ اللہ نے اس کتاب کو جو مقبولیت دی دورِ حاضر کی دوسری کتابیں بہت کم ایسی ہیں جن کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

مولانا مرحوم کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، علم کی محفل میں ایسی نابغہ روزگار شخصیتیں بہت کم آتی ہیں اور جب وہ رخصت ہو جاتی ہیں تو ان کی جگہ پر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے، بال بال ان کی مغفرت فرمائے، ان کی لفظوں سے درگزر فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔۔۔۔۔ (آمین)

☆ تحریر: مولانا ابو بکر غازی پوری

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا سانحہ ارتحال

ماہنامہ ”الحق“ (جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک، پاکستان) ☆

گزشتہ دو ماہ سے عالم اسلام کا نشین برق حوادث و آفات کی زد میں ہے۔ ابھی منیٰ کے جاں سوز واقعہ فاجعہ کے غم کی تپش سرد نہیں ہوئی تھی کہ جس میں ہزاروں کی تعداد میں جہاں کرام بے سروسامانی کی حالت میں جان بحق ہو گئے تھے۔ اس دل گداز جان سوز اور جگر خراش واقعہ پر جتنا بھی افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔ ابھی اس طرح کے جھٹکوں سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ ہندوستان سے یہ جگر دوز خبر آئی کہ فخر العلماء بقیۃ السلف، ادیب بے بدل، محدث کبیر، مناظر اسلام اور ماہنامہ ”الفرقان“ کے مدیر اور بانی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی قدس سرہ العزیز جو کہ ہندوستانی ”قافلہ دعوت و عزیمت“ کے آخری سپہ سالاروں میں سے تھے وہ بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

حضرت مولانا نعمانی مرحوم کیسی شخصیت تھے؟ حقیقت میں آپ کی شخصیت تو وہ گہر تا بدار تھی جو کسی تعارف و تعریف کی محتاج بیان نہیں۔ آپ نے اپنی ساری زندگی خدمتِ دین کے لئے وقف کر رکھی تھی اور

عمر بھر مختلف علمی، دینی، دعوتی، تحقیقی اور ادبی محاذوں پر مصروف کار رہے۔ آپ کا شہرہ آفاق ماہنامہ ”الفرقان“ آپ کی فکری، علمی اور قلمی کاوشوں کی جولانگہ رہا اور ساتھ ہی ساتھ ترویج سنت و احادیث، تبلیغ اسلام، علوم قرآنیہ کی تشریح اور اصلاح امت کی ہر تحریک اور ہر کوشش میں پیش پیش رہے اور آپ کئی اعلیٰ کتابوں کے مصنف تھے، خصوصاً احادیث رسول اللہ (ﷺ) کا ایسا عام فہم ذخیرہ عام اردو دان طبقہ کے لئے پیش کیا، یعنی سات جلدوں میں (آٹھ جلدوں میں۔ مرتب) ”معارف الحدیث“ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ پھر آخری وقت میں آپ نے انقلاب ایران پر ”معرکتہ الآراء“ کتاب لکھ کر اس ”انقلاب“ اور اس انقلاب کے بانی ”خمینی“ کی اصل حقیقت عالم اسلام پر واضح کر دی۔ حضرت مرحوم کی شخصیت ہم جیسے ہی دامنوں کے لئے ایک درس عبرت اور مشعل راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی باصلاحیت، قابل اور علمی و دینی جوہروں سے آراستہ صالح اولاد بھی عطا فرمائی ہے جو الحمد للہ دین کے مختلف شعبوں میں اپنے عظیم والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دن رات مصروف عمل ہیں۔

☆ تحریر: مولانا راشد الحق سمیع

۔۔ ایک اور چراغ گل ہو گیا

ماہنامہ ”الرشاد“ اعظم گڑھ ☆

ناظرین کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے جانکاہ حادثہ وفات کی اطلاع ضرور مل چکی ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موت تو ہر انسان کے لئے مقدر ہے، اور اس کی خبریں ہمارے کانوں میں روزانہ پڑتی ہیں، مگر بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کانوں اور آنکھوں سے گزر کر دل و دماغ کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ تڑپا دیتی ہیں اور ان کی چھبھن برسوں محسوس ہوتی ہے۔ انہیں میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا حادثہ وفات ہے۔۔۔۔۔۔

دو تہائی صدی تک ملت کے مشکل مسائل حل کرنے کے لئے جن دو چار شخصیتوں کی طرف نگاہ اٹھتی تھی ان میں ایک نمایاں مقام انھیں بھی حاصل تھا، جماعت اسلامی کی تشکیل ہو، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ہو یا دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا آغاز ہو یا تبلیغی جماعت کی ابتدائی نشوونما ہو ان سب میں

پورے خلوص کے ساتھ حصہ لیا اور اس کے لئے نہ تو ملامت کرنے والوں کی پروا کی اور نہ ذاتی نفع و نقصان کی
 نزاد میں اسے تو لا اور نہ بڑے بڑے آدمی کے سامنے اپنی رائے دینے سے گھبراتے، جو بات صحیح سمجھ میں آئی
 اس میں دل و جان سے لگ گئے اور اگر غلط معلوم ہوئی تو اس سے برأت کا اظہار کرنے میں بھی تاثر نہیں
 ہوا۔ بعض لوگ اس کو ان کی کمزوری پر محمول کرتے تھے مگر یہ ان کی حق پرستی کی بات تھی کہ امت کے مسائل
 کے سلسلہ میں نہ انھیں خریدا جاسکا اور نہ وہ کسی کے سامنے جھکے اور نہ کسی کی کاسہ لیس کی، وہ اس شعر کے
 مصداق تھے۔

قیمتیں کھو کے جو بازار خوشامد میں چلیں
 ایسے سکے میری خود داری نے کم ڈھالے ہیں

☆ تحریر: ”الرشاد“ مولانا مجیب اللہ ندوی

جوبادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند ☆

ملک اور بیرون ملک کے علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی ہوگی کہ عالمی
 شہرت کے حامل نامور مصنف اور تبحر عالم دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ ۲۴ مئی
 ۱۹۹۷ء بوقت ۸ بجے شب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ عصر حاضر کی ان ممتاز
 ہستیوں میں سے تھے جن کی زندگی ایک مستقل تاریخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی و عملی انحطاط کے اس دور میں
 جبکہ جانے والا اپنا کوئی بدل چھوڑ کر نہیں جاتا موصوف کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس پر اظہار کرب و الم
 کے تمام الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صرف مولانا کے اعزہ کا نہیں، پورے ملک کا، برصغیر کا، بلکہ
 پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے۔

مولانا نعمانی قدس سرہ کی ذات گرامی دارالعلوم کے اس بابرکت عہد کی دلکش یادگار تھی جس نے
 حضرت شیخ الہند، حضرت حکیم الامت، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی، حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ
 کشمیری وغیرہ علم و عمل کے مجسم پیکروں کے جلوہ جہاں آرا کو دیکھا تھا اور ان میں سے اکثر کے علمی و عملی حسنات

ویرکات سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔
 ان کے رگ و پے میں یہ یقین پیوست تھا کہ اکابر علماء دیوبند اس عہد میں ”ما انا علیہ واصحابی“ کی عملی تفسیر تھے اور ان کا فہم دین اس دور میں خیر القرون کے مزاج سے سب سے زیادہ قریب ہے، اس لئے وہ اکابر دیوبند رحمہم اللہ کے علم و عمل اور فکر و نظر کے مظہر اتم اور امین و نقیب تھے۔ دارالعلوم میں تحصیل علم کے لئے داخلہ کو ”باب رحمت“ میں داخلہ سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ دارالعلوم کی خدمت کو ایک دینی و ملی فریضہ تصور کرتے تھے اور جس بات کو وہ دارالعلوم کے حق میں مفید و بہتر باور کرتے اس کے اظہار و بروئے کار لانے میں اپنے پرانے کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی وفات بلاشبہ پوری امت کے لئے ایک سانحہ ہے اور ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انھیں ایصالِ ثواب کرے،

اللّٰهُمَّ اَكْرِمْ نَزْلَهُ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ وَابْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهِ وَاهْلًا خَيْرًا مِنْ اهْلِهِ وَنَقْهَ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يَنْقِي الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ خَطَايَاهُ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. اللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اجْرَهُ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ

☆ تحریر: مدیر ”دارالعلوم“ مولانا حبیب الرحمن اعظمی

ایک مدبر عالم اور دردمند مصلح کی وفات

ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ ☆

گذشتہ مہینہ کا معارف اشاعت کے مرحلہ میں تھا کہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مولانا محمد منظور نعمانی ۴۵ مئی کی درمیانی شب میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس خطہ الرجال میں مولانا جیسے حکمت دین سے واقف، صاحبِ فہم و بصیرت اور مدبر عالم، قوم کے دردمند مصلح اور ملت کے ہمدرد و نگسار کا اٹھ جانا کس قدر المناک سانحہ ہے۔

مولانا ایک عالم و مصنف اور صاحبِ سلوک و عرفان بزرگ ہی نہ تھے بلکہ زمانہ کے نبض شناس، وقت کے تقاضوں اور حالات سے باخبر اور عاقبت میں بھی تھے جن کا عمل اس پر تھا کہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

وہ مذہبی، اصلاحی، قومی، ملی، تعلیمی اور اجتماعی جدوجہد کے ہر محاذ پر سرگرم و متحرک دکھائی دیتے تھے، انھیں مسلمانوں کی موجودہ پستی زبوں حالی کا پوری طرح احساس بھی تھا اور وہ اس کے ازالہ کے لئے فکر مند بھی رہتے تھے۔ آزاد ہندوستان میں جن مسائل نے مسلمانان ہند کی زندگی تلخ و مکدر کر رکھی ہے ان پر شور و غوغا مچانے، لچھے دار باتیں اور دھواں دھار تقریریں کرنے اور پر جوش تحریریں لکھنے والے تو بہت سارے لوگ ہیں لیکن ان پر مولانا کی طرح تڑپنے، بچپن ہو جانے، درد و کرب اور خلش و اضطراب میں مبتلا ہونے والے بہت کم لوگ ہیں۔ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے دعا و مناجات میں بھی مصروف رہتے تھے اور ملک کے گوشہ گوشہ کی خاک بھی چھانٹتے رہتے تھے، ان کے گریہ شب اور دعا ہائے سحر گاہی سے گھبرا کر ابلیس بھی پکارتا رہا ہوگا کہ۔

خال خال اس قوم میں اب بھی نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ایسے بیدار مغز و ہوشمند عالم کی وفات مسلمانوں کی بد نصیبی، قوم و ملت کا زیاں اور علم دین کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

مولانا کا شمار اس عہد کے ممتاز اور صفِ اول کے علماء میں ہوتا تھا، دینی علوم میں ان کو بڑا رسوخ اور پختگی حاصل تھی۔ تفسیر، فقہ کلام اور کتبِ معقولات پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی۔ لیکن حدیث سے ان کو زیادہ شغف و مناسبت تھی جس کی تحصیل ہندوستان کے مشہور اور نابغہ روزگار محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے کی تھی۔ اور کئی برس تک خود بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کا درس دیا، ان کی کتاب معارف الحدیث بھی ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

مولانا نے بڑی مصروف و مشغول زندگی گزاری، وہ مدت العمر دین و ملت کی خدمت و سر بلندی اور مسلمانان ہند کی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، مولانا زہد و تقویٰ، حسن سیرت و خوش خلقی سے متصف تھے، طبیعت میں درد مندی اور قلب میں رقت تھی، سرچِ لُحس تھے اس لئے واقعات و حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے، دینی مسائل میں ان کا ذہن کھلا ہوا تھا، جزئیات میں متوسل تھے، شرعی امور میں تشدد اور تصلب کے بجائے سہولت، تخفیف اور عافیت پیدا کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔

☆ تحریر: مدیر معارف، مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مسلمانان ہند کیلئے ایک بڑا حادثہ

(ماہنامہ ”اشراق“ لاہور) ☆

۳۱ مئی ۱۹۹۷ء کو دنیائے اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین مولانا محمد منظور نعمانی وفات پا گئے۔ ان کا اس دنیا سے رخصت ہونا ملت اسلامیہ اور خاص طور پر مسلمانان ہند کے لئے ایک بہت بڑا علمی حادثہ ہے۔ برصغیر نے گزشتہ دو صدیوں میں جو عظیم الشان رجال امت پیدا کئے وہ ان میں ممتاز تھے، ہندوستان کے درو دیوار گواہ ہیں کہ اس مجسمہ علم و اخلاق کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین اسلام کی نصرت و حفاظت میں گزرا، درس و تدریس، ارشاد و ہدایت اور وعظ و نصیحت ہی ان کے شب و روز کے مشاغل تھے۔ وہ ہندوستان کے ان چند علماء میں سے تھے جنہیں علوم اسلامیہ میں فی الواقع رسوخ حاصل تھا، دینی حمیت کے معاملہ میں ہندوستان میں ان کا ثانی شاید کوئی نہیں تھا۔ فتنہ قادیانیت ہو، خاکسار تحریک ہو، یا مشرکانہ عقائد کے حاملین ہوں، وہ تمام زندگی ان کے مقابلہ میں دین کے محافظ بن کر کھڑے رہے۔ ان فتنوں کے خلاف انھوں نے خطابت کے میدان میں بھی جنگ لڑی اور تحریر کے میدان میں بھی۔ اس جنگ میں معلوم ہوتا ہے خدا کی نصرت ہمیشہ ان کے شامل حال رہی۔

مولانا نعمانی نے تصنیف و تالیف کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، ان کی شہرہ آفاق کتاب ”معارف الحدیث“ ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ اسکے علاوہ انھوں نے تفہیم دین کے سلسلے میں سادہ اور عام فہم اسلوب میں متعدد کتابیں تحریر کیں، یہ کتابیں عوام الناس میں بہت مقبول ہوئیں، ان میں ”اسلام کیا ہے“ ”آپ حج کیسے کریں“ ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے“ اور ”دین و شریعت“ جیسی کتابیں اسلامی لٹریچر میں نہایت ممتاز اور منفرد درجہ رکھتی ہیں۔ مولانا منظور نعمانی کی تحریروں کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے:

مولانا کا یہ بڑا امتیاز تھا کہ آپ نے اس وقت انگریزی و اداں طبقہ کے سامنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ

کے سامنے اور خود نو جوان علماء کے سامنے دین کو ایسی زبان میں اور ایسی تعبیر کے ساتھ اور ایسی ترکیب و انتخاب کے ساتھ اور ایسی حسن تفہیم کے ساتھ پیش کیا جس کی مثال بہت کم ملے گی۔

مولانا منظور نعمانی کی دینی اور علمی خدمات اتنی وسیع ہیں کہ انھیں احاطہ بیان میں لانا شاید ممکن ہی نہیں، اسلئے ان الفاظ کی تائید ہی پر کفایت کی جاتی ہے جو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کی وفات پر کہے ہیں:

”اللہ کی نعمت کے طور پر اور اس زمانے کے حالات کو دیکھ کر کہئے کہ ایک کرامت کے طور پر مولانا کا وجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لئے جو اجتماعی جگہوں پر بہت کم کئے جاتے ہیں، تصنیف کرنے والے دعوت سے گریز کرتے ہیں، جلسوں میں تقریر کرنے والوں کے لئے تصنیف کا کام مشکل ہے اسلئے کہ وہ یکسوئی کی طالب ہے (جبکہ) بقدر ضرورت دینی ملی کاموں میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے مولانا کو اللہ نے یہ جامعیت عطا فرمائی تھی۔ مولانا نے تمام سرگرمیوں کے ساتھ رسالہ الفرقان نکالا جو برصغیر کا ایک ممتاز دینی و دعوتی ماہنامہ تھا بلکہ ایک ایسا مکتب خیال اور مدرسہ فکر تھا جس سے لوگوں کو رہنمائی ہوتی تھی، توحید خالص اور سبت صحیح کا پیغام ملتا تھا۔ مولانا کی وفات ملت کا ایک عظیم خسارہ ہے۔ مولانا کی وفات سے ایک بڑا سرچشمہ قوت بند ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے کارناموں کو زندہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

☆ تحریر جناب منظور الحسن

ورق تمام ہوا ، مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے

(برمرقدِ نعمائی)

(۱)

اٹھا سر سے ہمارے آہ! ایسا ظنِ قربانی
وہ جس پر تاز کرتی ہے سدا تاریخِ انسانی

وہ تھا دراصل حزبِ اللہ کی تفسیر قرآنی
رہا تا عمر نصبِ العین جس کا دیں کی سلطانی

اسی کو دیکھ کر آتی سمجھ ”دین و شریعت“ کی
کہ یہ ”اسلام کیا ہے؟“ اور کیا شے ہے مسلمانی

(۲)

کہا خالق نے عزرائیل سے اس کو بلا لاؤ
پسند اب آگئی جس کی مجھے ہر ایک قربانی

منایا جس نے جان و مال اپنا راہ میں میری
مرا عاشق، میرا شیدا، وہی ”منظورِ نعمائی“

ہلا دیں جس نے بنیادیں جہانِ شرک و بدعت کی
کچھ ایسی غیب سے اس کو ملی توفیقِ یزدانی

مری خاطر مشقت پر مشقت کا وہ عادی تھا
کبھی دیکھی نہ راہِ حق میں اپنی آسانی

فنا ہو جائیں سب دل سے نقوشِ آلامِ دنیا کے
یہاں ایسی کروں اس پر لذائذ کی فراوانی

کچھ اس انداز سے لینے نسیم خوشگوار آئی
گھٹائیں ٹوٹ کر برسیں ہوا ماحول نورانی

فرشتوں کی قطاریں وجد میں یہ گنگناتی تھیں
چل اب پاکیزہ جنت کی طرف اے روحِ ایمانی

عجب انداز سے ہونٹوں کا کھلنا یاد ہے اب تک
کہ جیسے پی رہے ہوں کوثر و تنیم کا پانی

پھر اک ہچکی میں دیدی جان پیدا کرنے والے کو
مٹائی جس کی خاطر آپ نے یہ ہستی فانی

جمال و نور کی بارش نے حیراں کر دیا سب کو
جو دیکھی بعد مرنے کے رُخِ انور کی تابانی

فلک پر پہنچے عزرائیل لیکر روحِ اقدس کو
تو رضواں نے کہا ”قربان تم پر میری درباری“

یہ کون آیا ہے باطل سے ہزاروں بار ٹکرا کر
فروغِ کلمہ حق میں مٹا کر ہستی فانی

جی ہے دھوم کس کے واسطے یہ خیر مقدم کی؟
ہوئی جاتی ہیں حورانِ جنان کیوں آج دیوانی

یہ بندہ جاہ و ثروت پر سدا ٹھوکر لگاتا تھا
نہ کی دنیائے تخت و تاج و سطوت کی ثنا خوانی

یہ اربابِ سیاست سے ہمیشہ دور رہتا تھا
نہ کرنے دی شریعت میں کبھی باطل کو من مانی

یہی بندہ تھا جس نے کی تھی اس فتنے کی سرکوبی
بشکلِ انقلاب اٹھا تھا جو از خاکِ ایرانی

کیا اس نئے نہ ایک پل برباد دنیا میں،
جہاں زندگانی میں ہر اک لمحہ تھا طوفانی

اسی بندہ نے رخ موڑا تھا سیل قادیانی کا
غرض ہر طرح کی باغ محمد (ﷺ) کی تنہائی

(۳)

یہ کیسے لٹ گئی دنیا اچانک قلب مضطر کی
نہیں جاتی، نہیں جاتی، دل محروں کی خیرانی

پھاپوں ساتھ اک کمرے میں ہر پل آٹھ برسوں کا
نہ سمجھ گا کوئی برباد الفت کی پریشانی

بھٹکا پھر رہا ہے اب سنان راہوں میں
غمِ فرقت کی سینے میں لئے ”میراثِ نعمانی“

تمہیں نے پھیر لیں آنکھیں اس دیائے فانی سے
نظر آتی ہے اب دنیا کی ہر ایک چیز انجانی

اکیلا جان کر جب ظلمتیں مجھ پر لپکتی ہیں
تو اشکِ خوں رلاتا ہے وہی ماحولِ نورانی

لے کر وہی سببیاں تھا جسے ذکر و تلاوت کی فضاؤں سے
کیسے گوارا آپ کو اُس گھر کی ویرانی؟

اب تک اپنی محرومی پہ اشکِ خوں بہائے گی
وہ ناداں قوم جس نے آپ کی قیمت نہ پہچانی

دہائیوں سے قلم سے آگے نکلے اور آنکھیں خون برسائیں
نہ کم ہوگی بخشی صورت یہ بحرِ غم کی طغیانی

تڑپ کر پاد کرتی ہیں فضا میں آج سنبھل کی
بچھائی جس زمیں کو آپ نے توحید ربانی

بہت دیران لگتی ہے زمیں ہیر نگاروں کی
بچھائی تھی جہاں تم نے بساطِ بزمِ عرفانی

یہ مرکز یاد کرتا ہے ، وہ مسند یاد کرتی ہے
دیا تھا آپ نے برسوں جہاں پر درسِ قرآنی

تڑپ جاتے تھے جس کا نام سن کر آپ پل بھر میں
مبارک ہو اب اس خلاقِ دو عالم کی مہمانی

پکارے گا ہر ایک پل کون اب ”ارشاد“ کہہ کہہ کر
یہ کہتی ہے نداءِ رورو کے میری چاکِ دامانی

وہ باتیں یاد آتی ہیں وہ لمحے یاد آتے ہیں
ملیں شفقت بھری گودی میں جب لذاتِ روحانی

(۴)

خداوند! دیا تھا جتنا گہرا ساتھ دنیا میں
عطا کر غلہ میں بھی ”اتنا گہرا قُربِ لافانی“

خداے پاک اُن کی قبر کو تو نور سے بھرا دے

بنا اُس کو ریاضِ جنتِ الفردوس کا دھانی

خداوند! نہ کر محروم اُن کی ”خیر و نسبت سے“

لگا دے ہم غریبوں پر وہی برکاتِ روحانی

اب اُن کا ساتھ ہم کو جنتِ الفردوس میں دے دے

جہاں کی زندگی باقی جہاں کا عیشِ لافانی

اور۔۔ خود اپنی نگاہ میں!

[۱۹۷۷ء میں الفرقان نے ”وفیات نمبر“ شائع کیا، جس میں وہ تمام تعزیتی مضامین جمع کر دئے گئے تھے جو ۱۹۷۲ء تک کے شماروں میں نکل چکے تھے۔ اس نمبر کے ادارہ میں حضرت صاحبِ سوانح نے خود اپنے وقتِ آخر کا تصور کر کے پسند کیا کہ اپنے بارے میں بھی خود اپنے ہی قلم سے کچھ لکھ چھوڑیں۔ اس کی معنویت اور افادیت کا احاطہ کرنے والے الفاظ ذہن میں نہیں آرہے۔ پس یہ قارئین ہی پر ہے کہ وہ کیا محسوس کرتے ہیں۔ مختصراً کہا جائے تو یہ حاصل کتاب ہے۔ یہ خیال رہنا چاہئے کہ یہ وفات سے ۲۰ سال قبل کی تحریر ہے۔]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بَعَزْتَهُ وَجَلَّالَهُ تَتَمُّ الصَّلَاحُ

نمبر سے متعلق چند ابتدائی سطریں تحریر فرمانے کے بعد تحریر ہوا ہے:

”آج ان سطروں کا لکھنے والا ابھی یقیناً ایک دن مرنے والا ہے، وہ دن اور وہ گھڑی بس اللہ ہی کو معلوم ہے، جب بھی وہ وقت آئے گا تو اپنے بارے میں نہ کچھ لکھا جاسکے گا، نہ کہا جاسکے گا۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس وفیات نمبر کے نگاہِ اولیں کے ان صفحات میں خود ہی اپنے بارے میں کچھ لکھ دوں۔ ہَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهِ بَصِيْرَةٌ۔“

قمری حساب سے میری عمر کا ۴۷ سال ہے اور شمسی حساب سے ۷۲ سال چل رہا ہے، اس لئے بظاہر بہت زیادہ وقت باقی نہیں ہے۔ تاہم جو کچھ باقی ہے اللہ تعالیٰ اس میں توبہ و انابت اور تلافیِ مافات کی توفیق عطا فرمائے۔

اب تک جو طویل عمر اور مہلت ملی (بغیر ادنیٰ تواضع اور انکسار کے عرض کرتا ہوں) اس کو بہت ضائع اور برباد کیا۔ رب کریم کی طرف سے ہر طرح کے انعامات سنئے بے حساب نواز گئے۔ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جہاں دنیا بھی تھی اور دین بھی تھا، پھر والد ماجد کو توفیق دی کہ انھوں نے لہیت اور آخرتِ طلی کے جذبہ سے مجھے دینی تعلیم میں لگانے کا فیصلہ فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی نے دینی تعلیم کی تکمیل خاص کر

حدیث کی تحصیل کے لئے اب سے نصف صدی پہلے کے ”دارالعلوم دیوبند“ میں پہونچایا، جو اُس وقت دینی تعلیم و تدریس بالخصوص علم حدیث و سنت اور اس کے مطابق زندگی کی جامعیت کا بے مثال نمونہ اور مرکز تھا، اور امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ جیسے علم کتاب و سنت اور شریعت و طریقت کے جامع اساتذہ مسند تدریس کی زینت تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ علم بھی نصیب فرمایا۔ پھر اُسی کے ساتھ یہ عظیم ترین نعمت بھی عطا فرمائی گئی کہ اس نصف صدی کی پوری مدت میں جن اللہ والوں کو پایا اُن سب کی عقیدت و محبت اور اُن کے طرف سے بے استحقاق غیر معمولی شفقت و عنایت نصیب ہوئی، اُن کی خدمت میں حاضری کی توفیق بھی ملی، استفادہ ہی کی نیت سے کبھی کبھی کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ کچھ ذکر و شغل کی توفیق بھی ملی۔ لیکن اپنی شوی قسمت اور بے استعدادی کی وجہ سے ان کی اصل دولت نسبتِ احسانی اور تزکیہ اخلاق کی نعمت سے محرومی کی حسرت کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکا۔

حیدرستانِ قسمت راجہ سود از رہبرِ کامل - کہ خضر از آبِ حیاں تشنہ مے آرد سکندر را

بظاہر دین کی خدمت کے مختلف شعبوں سے تعلق بھی نصیب رہا، قرآن مجید اور حدیث شریف کے درس و تعلیم کے بہت اچھے مواقع عطا فرمائے گئے، دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف، مضامین و مقالات اور تقریر و بیان کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کی توفیق بھی ملی، اور ان راہوں سے خوب شہرت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن اپنے اندر کا حال یہ ہے کہ ان کاموں کی عند اللہ مقبولیت کی جواؤ لیں شرط ہے، یعنی صرف رضائے الہی کی نیت اور اخلاص و احتساب، اُس کے بارے میں کبھی اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ اور معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے ان کاموں میں اگر اخلاص نہ ہو تو یہ سب منہ پر مار دئے جانے کے لائق ہیں، بلکہ کبھی دینی کام (جو بظاہر نیابتِ نبوت کے سلسلہ کے مقدس کام ہیں) اگر دنیا طلبی یا عند الناس مقبولیت و شہرت کے لئے کئے جائیں (تو جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مروی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث سے معلوم ہوتا ہے تو پھر یہی کام) دوسرے سب گناہوں سے پہلے جہنم میں ڈلوانے والے بدترین گناہ ہیں۔۔۔ اَعَاذَ اللہ تعالیٰ من ذالک۔

اس طویل زندگی میں بے گنتی واعظانہ اور مصلحانہ تقریریں کیں، ہزاروں کو گناہوں سے توبہ کرائی، اللہ و رسول کی فرمانبرداری، اتباعِ شریعت و سنت اور گناہوں سے بچنے کی خوب تلقین و تاکید کی، پورے ۴۵ سال کی مدت میں الفرقان ہی کے صفحات میں سیکڑوں دینی و اصلاحی مضامین و مقالات لکھے۔ لیکن پوری سچائی کے ساتھ اپنی اس کوتاہی اور بے نصیبی کا اقرار ہے کہ ایک مومن صادق اور داعی حق کے قول و عمل میں جو مطابقت اور یکسانی ہونی چاہئے اُس میں ہمیشہ بے حد و حساب کمی محسوس ہوئی۔ اگر خدا نکرہ ”لَمْ تَقُولُوا مِثْلَ لَا

تَقْتُلُونَ، وَالْأَمْوَاغُذَهُ هُوَ تُو كُوئی عذر اور جواب نہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اس حال کی اصلاح فرمائے اور اب تک کی تعمیرات کو اپنے رحم و کرم سے معاف فرمادے، اَللّٰهُمَّ لَا مَنَجًا وَلَا مَلْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ۔

اپنی رائے اور اپنے فہم و فکر پر زیادہ اعتماد اور اس کے ساتھ فیصلہ اور اقدام میں جلد بازی بھی میری بُری عادتوں میں سے رہی ہے اور اس نے زندگی میں بڑی بڑی غلطیاں کرائی ہیں، لیکن احساس ہو جانے پر اللہ تعالیٰ نے رجوع اور اصلاح کی بھی توفیق دی۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَلِلّٰهِ الشُّكْرُ۔۔۔ اگر میں نے کبھی کوئی ایسی بات لکھی یا کہی ہے یا کوئی ایسا اقدام کیا ہے جو علماء و راہبین و زانیین کی عام رائے کے خلاف ہے تو اس کو غلط اور مرجوع منہ سمجھا جائے۔

الحمد للہ نماز، روزہ، جیسے فرائض کی کم از کم ظاہری ادائیگی نصیب ہے، اسی طرح وہ گندے حیوانی معاصی جن کو شریعت کی خاص اصطلاح میں ”کبائر و فواحش“ کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے ان سے بھی بڑی حد تک محفوظ رکھا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ظاہر و باطن کے طرح طرح کے گناہوں میں اپنے کبیر سے پاؤں تک ملوث دیکھتا ہوں، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق بھی ملتی ہے، اس لئے ارحم الراحمین کی رحمت سے معافی اور مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ ان شاء اللہ الرحیم الکریم اُس زمرہ میں شامل کیا جاؤں گا جن کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَالَّذِينَ اِذَا فَعَلُوا فَاسِحَةً اَوْ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرُوا لِلذَّنْبِ بِهٖمْ ط وَمَنْ يَغْفِرِ الذَّنْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يَصِرْوا عَلٰی مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَاءُ هُمْ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ (آل عمران ع ۱۳)

دینی اور آخرتی نقطہ نظر سے میری نہایت مہلک اور خطرناک بیماری یہ ہے کہ اخلاقی رذائل، حُبِ جاہ، ریا، کبر، غصہ اور اس کے نتیجہ میں بندگانِ خدا کی دل آزاری، اور غرباء و مساکین سے کم آمیزی اور ان کی محبت و ملاطفت سے محرومی جیسے رذائل کی جڑیں دل کی گہرائی میں جمی ہوئی ہیں، حالانکہ یہ شیطانی معاصی ہیں، جو زنا شراب جیسے حیوانی معاصی سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی میں قدرت ہے کہ وہ ان خبیث امراض کی جڑوں کو دل سے نکال کے مرنے سے پہلے قلب و روح کو پاک فرمادے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِحَسَنِ الْاَعْمَالِ وَالْاِخْلَاقِ اِنَّهٗ لَا يَهْدِيْ لِحَسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَاتِيْ وَلَا يَصْرِفْ سَيِّئَاتِيْ اِلَّا اَنْتَ۔

ایک وصیت اور چند گزارشات

جیسا کہ عرض کیا گیا تھی حساب سے میری عمر کا ۴۷ سال چل رہا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ زندگی کے کتنے دن باقی ہیں، حدیث شریف میں وصیت کرنے کا سخت تاکید کی حکم ہے۔ اس عاجز نے اپنے خاگی اور مالی معاملات سے متعلق ایک یادداشت ”وصیت نامہ“ ہی کے طور پر گزشتہ رمضان مبارک میں شدید بیماری کی حالت میں جبکہ میں اسپتال میں داخل تھا، لکھا ہی تھی لیکن وہ ناتمام اور نامکمل تھی، اب اس پر نظر ثانی اور ممکن حد تک اس کی تکمیل کر کے گھر والوں کے لئے محفوظ کر دینے کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اس کے علاوہ کچھ باتیں عام دینی نصیحت اور خیر خواہی کی عرض کرنا اپنا فرض سمجھ کر

وصیت کے طور پر یہاں لکھتا ہوں۔۔۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان ”قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا“ اور ”وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْآقْرَبِيْنَ“ کی تعمیل کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے نفس اور اپنی ذات کو، اُس کے بعد اپنی اولاد، اپنے عزیزوں اور دوستوں اور درجہ بدرجہ سب اہل تعلق اور اُس کے بعد اُن سب اہل ایمان کو جن تک میری بات پہنچ سکے، میری وصیت ہے کہ:

قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے مطابق خالص توحید پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور اس یقین اور دھیان کے ساتھ شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے۔ ہمارا گھروں باطن ہر لمحہ اس کے سامنے ہے اور مرنے کے بعد اُس کے سامنے پیش ہونا اور پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔

اہتمام کے ساتھ شریعت کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ادا کریں، خصوصاً نماز باجماعت کی پابندی کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں (اگر نماز نہیں تو گویا ایمان نہیں) جن چیزوں کو اللہ و رسول نے ناجائز و حرام قرار دیا اور منع فرمایا ہے اُن سب سے خاص کر کبائر اور فواحش سے اپنے کو بچانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہیں، اگر اغوائے شیطانی یا اپنے شریر نفس کے تقاضے سے گناہ ہو جائے تو سچے دل سے توبہ و استغفار کریں، اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت فرمادے گا۔ اس کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجْعِدِ اللَّهُ غُفْرًا رَّحِيمًا ۝
جو کوئی بندہ بُرا کام کرے یا اللہ کی نافرمانی کر کے اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان پائے گا۔ (النساء۔ ع۔ ۱۶)

اگر خدا غواستہ توبہ و استغفار کے بعد پھر گناہ ہو جائے اور بدبختی سے بار بار ہو جائے تب بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر ہزار بار گناہ کر کے بھی بندہ سچے دل سے توبہ کرے گا اور اللہ سے معافی مانگے گا

تو وہ رحیم و کریم معاف فرمادے گا۔

مگر ہزار بار توبہ شکستی باز آ

کس درگاہ درگہ نومیدی نیست

عمر کا بڑا حصہ غفلت اور گناہوں میں گزارنے کے بعد بھی اگر توبہ واستغفار اور اصلاح حال کی توفیق ملے تو کچھ نہیں گیا۔ اولیاء اللہ میں ہزاروں وہ ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ غفلت بلکہ فسق و فجور میں گزرا، پھر جب اُن کے اندر ایمانی احساس جاگا اور انھوں نے اپنے کو شیطان کے پنجے سے نکال کر خدا کے راستہ پر ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو مقام ولایت تک پہنچا دیا۔ ایسے لوگوں کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے لگیں، اللہ کے ایسے بندوں سے قریب ہوں جو اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہوں۔ انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اچھا یا بُرا اثر ڈالنے والی چیز محبت ہے۔

محبتے صالح تراصلح کند
محبتے طالح تراطالح کند

جن لوگوں نے بظاہر خدا سے بے تعلقی اور آخرت کے طرف سے بے فکری والی زندگی ہی کو اپنا لیا ہے اور اسی میں وہ مست و گمن ہیں، بخدا وہ بدترین قسم کی خودکشی کر رہے ہیں۔ اگر وہ میرے قریبی عزیز بھی ہیں، تو میں اُن سے بری ہوں۔ اُن کو بہت ڈرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ توبہ و اصلاح کی توفیق سے بلکہ ایمان سے بھی ان کو محروم نہ کر دے۔ اُس کو کسی کی پروا نہیں، وہ غشی عن العالمین ہے اس کی بندگی اور فرمانبرداری خود ہماری ضرورت ہے۔ ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق اور محسن چچا تھے، لیکن جب انھوں نے اپنے لئے ایمان کو پسند نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے باوجود) اُن کے لئے ایمان پسند نہیں فرمایا اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَخْبَتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اُس کا تعلق حقوق اللہ سے تھا۔ حقوق العباد کا معاملہ اس حیثیت سے زیادہ اہم اور قابل فکر ہے کہ اس میں اگر تقصیر اور کوتاہی ہو جائے، یعنی کسی بندہ کی ہم سے حق تلفی یا اس پر ظلم و زیادتی ہو جائے تو اس سے نجات کا اور سبکدوشی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے (جو رحیم و کریم ہے) اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا ہے، بلکہ اُس کی صورت صرف یہی ہے کہ یا تو اُس مظلوم بندہ کو اسی دنیا میں اس ظلم و زیادتی کا بدلہ اور معاوضہ دے کر سبکدوشی حاصل کی جائے یا معاف کر لیا جائے۔ اگر دونوں میں سے کوئی بات بھی یہاں نہ ہو سکی تو آخرت میں خدا اگر مدد نہ کرے عذاب بھگتنا ہوگا۔ صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد مروی ہے، جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے کہ:

جس کسی نے کسی دوسرے بندہ پر ظلم و زیادتی کی ہو، اُس کی آبروریزی کی ہو یا اُس کا کوئی

حق بار لیا اور دبا لیا ہو تو اُس کو چاہئے کہ اس زندگی ہی میں اس سے معاملہ صاف کر لے، قیامت

کے اُس دن کے آنے سے پہلے جب اُس کے پاس ادا کرنے کے لئے روپیہ پیسہ کچھ نہ ہوگا۔ اگر اُس کے پاس اعمالِ صالحہ ہوں گے تو اس کے ظلم اور حق ماری کے بقدر اس مظلوم کو دلوادیئے جائیں گے اور اگر وہ اعمالِ صالحہ سے خالی ہوگا تو مظلوم بندہ کے گناہ اس پر لا دیئے جائیں گے۔ (اور وہ جہنم میں سب کی سزا بھگتے گا)

الغرض حقوق العباد کا معاملہ بہت زیادہ قابلِ فکر ہے، لیکن زندگی اور معاشرت کے بگڑ جانے کی وجہ سے فی زمانہ بہت سے دیندار اور عبادت گزار بھی حقوق العباد کے معاملہ میں بہت کوتاہیاں کرتے ہیں۔ یہ عاجز سب سے پہلے اپنے نفس، اپنی اولاد، اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل تعلق کو اور سب اہل ایمان کو اس بارہ میں خصوصیت سے وصیت اور تاکید کرتا ہے۔ اگر کسی بندہ کا کوئی مالی یا غیر مالی حق ہمارے ذمہ ہے تو اس کو ادا کرنے یا معافی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا اپنے پر عظیم ظلم اور اپنے ساتھ شدید دشمنی ہے۔

اس عاجز سیہ کار کا زندگی میں جن حضرات سے تعلق اور واسطہ رہا ہے۔ اُن میں سے بہت سوں کو میری کسی بات یا عمل سے دل آزاری ہوئی ہوگی، بہت سوں کی غیبت کی ہوگی، بدول نے بہت سوں کے بارہ میں بدگمانی کی ہوگی یا اسی طرح کی کوئی اور کوتاہی اُن کے بارہ میں مجھ سے ہوئی ہوگی۔ تو جن حضرات تک میری یہ گزارش پہنچ جائے، اپنی اس تحریر کے ذریعہ میں اُن سب سے اللہ کے لئے معاف کر دینے کی استدعا کرتا ہوں، وہ اللہ کے واسطے مجھے معاف فرمادیں، مجھ پر اُن کا یہ بہت ہی بڑا احسان ہوگا اور وہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ اور اگر اس طرح کے حقوق کسی مسلمان بھائی پر بالفرض میرے ہوں تو میں نے اللہ سے اجر کی امید رکھتے ہوئے اُن کو بالکل سبکدوش کر دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کسی عزیز یا دوست کا مجھ پر قرض یا کوئی اس طرح کا مالی حق باقی نہیں ہے، اگر بالفرض کسی صاحب کا ہو تو وہ مجھے بتلا دیں اور یاد دلادیں، اگر اطمینان ہو گیا تو انشاء اللہ ضرور ادا کر دیا جائے گا اور میں اُن کا ممنون ہوں گا۔ اور جن حضرات کے ذمہ میرا کوئی مالی حق باقی ہے، اگر اُن کے لئے ادائیگی مشکل ہو تو مجھ سے گفتگو یا خط و کتابت کر لیں، انشاء اللہ اُن کے لئے سہولت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

الفرقان اور کتب خانہ الفرقان سے متعلق حقوق

قریباً ۴۵ سال سے الفرقان جاری ہے اور اسکے ساتھ کسی نہ کسی پیمانے پر کتابوں کی فروخت کا سلسلہ

(۱) یہ ناچیز (عتیق الرحمن) اپنے علم کی حد تک پوری ذمہ داری سے عرض کرتا ہے کہ آپ سے کسی کی غیبت کبھی نہیں سنی گئی۔ آپ اور آپ کے رفیق و ہمدم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں کے بارے میں یہ بات گویا مسلم تھی کہ ان بزرگوں کی مجلس میں غیبت کا گزر نہیں۔

بھی رہا ہے۔ اور بہت مدت سے میں ان دونوں سلسلوں کے معاملات سے خود تعلق نہیں رکھتا، لیکن ذہنی کے سارے معاملات دوسرے کارکن ہی کرتے رہے ہیں، لیکن بلاشبہ مالکانہ حیثیت سے میری ذمہ داری رہی ہے۔ قریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں یقیناً ہزاروں بندگان خدا الفرقان، یا کتابوں کے طرغیہ دار رہے ہوں گے۔ اگرچہ میں کارکنوں کو ہمیشہ تاکید کرتا رہا ہوں کہ کسی کا کوئی حق ہمارے ذمہ نہ رہ جائے، لیکن غالب گمان یہی ہے کہ کم از کم نادانستہ یا غفلت و لاپرواہی سے بہت سے بندگان خدا کے ساتھ معاملہ میں کوتاہی یا اُن کی کوئی حق تلفی ہوئی ہوگی، اور ان کا کوئی حق رسالہ یا کتب خانہ کے سلسلے میں باقی رہ گیا ہوگا۔ اس لئے میں ایسے سب حضرات سے جن کا کوئی حق دفتر الفرقان یا کتب خانہ الفرقان کے ذمہ باقی رہ گیا ہو، گزارش کرتا ہوں کہ وہ مجھے مطلع فرما کر اپنا حق وصول کر لیں۔ یہ اُن کا مجھ پر احسان ہوگا۔ اور اگر شرافت و مروت کی وجہ سے ان کو تکلف ہو تو ارادہ کے ساتھ لہجہ اللہ معافی فرمادیں اور آخرت کے مواخذہ سے مجھے سبکدوش کر دیں۔

میری ایک وصیت یا گزارش یہ ہے کہ میرے انتقال کے بعد میرے نجی خط نہ شائع کئے جائیں۔ اگر کسی خط کی اشاعت میں کوئی خاص افادیت سمجھی جائے تو میرے بڑے لڑکے مولوی عتیق الرحمن کو خط دکھا کر ان کی اجازت سے شائع کیا جائے۔

دعائے مغفرت کی التجا

عزیزوں، دوستوں اور سب مسلمان بھائیوں سے جن تک میری بات پہنچ سکے آخری گزارش اور التجا یہ ہے کہ دعائے مغفرت کا مجھے انتہائی درجہ میں حاجت مند سمجھ کر جب بھی توفیق ہو، میرے لئے مغفرت و رحمت کی دعا کریں۔ انشاء اللہ اس کے صلہ میں آپ کے لئے اللہ کے مقرب فرشتے مغفرت و رحمت کی دعا کریں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ کوئی دعا کرتا ہے تو فرشتے ”آمین“ کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ”و لک مثل ذالک“ یعنی تجھے بھی اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائے جو تو اپنے مومن بھائی کے لئے مانگ رہا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین و سلام علی المرسلین

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ ۱۲ مئی ۱۹۷۶ء

چودھواں باب

کچھ خاص رشتوں کے معاصرین

۱۔ مولانا محمد اسماعیل سنہلی

۲۔ مولانا ابولوفاشا جہانپوری

۳۔ مولانا عبدالحمید بلادی

۴۔ مولانا نسیم احمد فریدی

۵۔ مولانا مناظر احسن گیلانی

۶۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

۷۔ سید صوفی عبدالرب صاحب

۸۔ مولانا محمد سجاد

مولانا محمد اسماعیل سنبھلی علیہ الرحمہ

[مولانا محمد اسماعیلؒ آپ کے ہم وطن بھی تھے، جنم ورس بھی تھے اور عملی زندگی کے اولین رفقاء میں سے۔ آپ کی زندگی کا اولین دور، جیسا کہ گزرا، دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک تدریس، دوم دفاع دین حق، جس کی اولین شکل مناظروں کی تھی۔ مولانا اسماعیل صاحب اسی مناظروں والے دور کے اولین رفیق تھے۔ اکثر مناظروں میں ساتھ رہے اور آپ کی طرف سے صدارت کا فرض وہی انجام دیتے تھے۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں مولانا کے انتقال پر الفرقان (فروری ۱۹۷۶ء) میں اپنے اس رفیق قدیم کی یاد میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔]

اب سے ۵۰-۵۵ سال پہلے جب اس عاجز کی طالب علمی کا زمانہ تھا، سنبھل میں، جو ضلع مراد آباد کا ایک سب ڈویژن (پرگنہ) ہے، علماء بلکہ اکابر علماء و اساتذہ کی بڑی تعداد تھی اور اس لحاظ سے سنبھل کو نہ صرف صوبہ یوپی بلکہ پورے ہندوستان میں ایک شرف امتیاز حاصل تھا، صرف ہمارے ایک محلہ میں حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالجید صاحبؒ، حضرت مولانا شبیر حسین صاحبؒ ملک کے جید علماء و اساتذہ میں تھے، جن سے درس نظامی کی بعض مشکل ترین کتابیں پڑھنے کے لئے دوسرے ملکوں تک سے شوقین طلبہ آیا کرتے تھے۔ ان تین حضرات کے علاوہ بھی متعدد علمائے کرام ہمارے ہی محلہ میں تھے۔ یہ سب حضرات اللہ کے مقرر کئے ہوئے قانون کے مطابق اپنے اپنے وقت پر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، اور ان کے بعد کوئی نہ رہا جس کو علمی رسوخ میں اُن کا جانشین کہا جاسکے۔ تاہم ان ہی حضرات کے شاگردوں کی ایک صف رہ گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضا و قدر کا فیصلہ کہ لگ بھگ ایک ہی سال کی مدت میں وہ سب ہی راہی ملک بٹھا ہو گئے۔ مولانا محمد عابد صاحب، مولانا وحید اللہ صاحب، میرے بڑے بھائی مولانا محمد حسن صاحب۔ ان سب نے اس گزرنے والے سال میں دنیا کو خیر باد کہا۔ آخر میں مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی رخصت ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

مولانا عمر میں مجھ سے قریباً ۸ سال بڑے تھے، میں جس زمانہ میں صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا

تھا وہ ”ہدایہ“ وغیرہ متوسطات پڑھتے تھے۔ غالباً ۱۹۲۱ء میں وہ دیوبند چلے گئے اور دارالعلوم میں داخلہ لے لیا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا، علی برادران اور اُن کے رفقا حضرت مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کی گرفتاری کے بعد سے ملک میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا، ہمارے مولانا اسماعیل اُن لوگوں میں تھے جن کو اللہ نے دینی دلتی جذبہ کے ساتھ طلاقِ لسانی اور تقریر و خطابت کی خاص صلاحیت بھی عطا فرمائی تھی۔ وہ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں بھی بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ دیوبند سے اپنے وطن سنہیل آئے ہوئے تھے، وہیں تحریک خلافت سے متعلق ایک جلسہ میں گورنمنٹ کے خلاف سخت تقریر کی، گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا، دو سال کی قید با مشقت کی سزا ہوئی، اپنے ضلع مراد آباد ہی کی جیل میں رہے، یہ وہ منحوس دور تھا جب ہندوستان کی جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بھی اخلاقی مجرموں، چوروں ڈاکوؤں کی طرح سخت مشقت کے کام لیے جاتے تھے اور ان کو پہننے کے لئے ان ہی کے جیسے کپڑے دیے جاتے تھے۔ مولانا نے قید کی پوری مدت اسی طرح گزاری۔ بتلاتے تھے کہ ان دنوں میں چکی بھی ٹیسی، بیلوں کی طرح کوٹھو بھی کھینچا، جس کے کھینچنے میں اتنا پسینہ بہتا تھا کہ زمین کے جس دائرہ میں ہم کوٹھو کا چکر چلاتے تھے وہ پورا چکر ہمارے پسینہ سے ایسا تر بہ تر ہو جاتا تھا جیسے بارش ہوتی ہے اور اُس پر خود اپنا پاؤں پھسلے لگتا تھا۔۔۔ قید کی پوری مدت ختم ہونے پر رہائی ہوئی۔

اس کے بعد کچھ عرصہ جامعہ ملیہ میں بھی قیام رہا، اُس وقت تک جامعہ ملیہ غالباً علی گڑھ ہی میں تھا (اس قیام کی نوعیت کیا تھی اور کتنے دن رہا؟ راقم کو اس کا علم نہیں)۔ بہر حال اس گرفتاری اور قید کی وجہ سے تین سال سے زیادہ مولانا کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد پھر مولانا نے درسیات کی تکمیل کا ارادہ کیا، اس مرحلہ پر میر اور اُن کا تعلیم میں ساتھ ہو گیا، اور یہیں سے اُن کے ساتھ ایک طرح کی رفاقت کا تعلق قائم ہوا۔

استاذنا حضرت مولانا کریم بخش صاحب ”سنہیلی شوال ۱۳۴۲ھ میں سنہیل کے ”مدرسۃ الشرع“ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے آئے تھے۔ اُس سال، اُن ہی سے ہم دونوں نے منطق و فلسفہ اور اصول فقہ کی آخری کتابیں پڑھیں۔ ”میرزا ہد ملا جلال“ اور اس کا حاشیہ ”بحر العلوم“ ”حمد اللہ“ ”قاضی مبارک“ ”صدر“ ”توضیح تلوح“ یہ سب اسی سال پڑھیں۔ ”امور عامہ“ ”شمس بازغہ“ اسی سال رمضان مبارک کی تعطیل میں حضرت مولانا عبد المجید صاحب سے پڑھیں۔

اگلے تعلیمی سال شوال ۱۳۴۳ھ کے شروع میں ہم دونوں دیوبند چلے گئے، میں نے چونکہ مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین نہیں پڑھی تھی اس لئے میں نے ان اسباق میں شرکت کی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب دورہ حدیث میں شریک ہو گئے اور اسی سال فارغ ہونے کے بعد غالباً شوال ۱۳۴۴ھ میں مدینہ منورہ

شاهی مسجد مراد آباد میں مدرس ہو گئے، اور یہ تعلق ۲۰ سال سے زیادہ قائم رہا۔۔۔ اس مدت میں بھی جنگ آزادی کے سلسلہ میں کئی مرتبہ گرفتار ہوئے اور مختلف جیلوں میں رہے۔ آخری دفعہ غالباً اس وقت گرفتار ہوئے جب دوسری جنگ عظیم کے درمیان کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دیا تو تحریک کا نعرہ بلند کر کے آزادی کی فیصلہ کن جنگ چھیڑی۔ جمعیۃ العلماء کے قریباً سب ہی اکابر اور کانگریس کے تمام لیڈر جو روپوش نہیں ہوئے تھے گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کو بھی اس موقع پر گرفتار کر کے غیر معینہ مدت کیلئے مراد آباد جیل میں نظر بند کر دیا گیا، قریباً ایک سال کے بعد رہا کئے گئے۔

مدرسہ شاہی کی مدرس ہی کے زمانہ میں دوبار مولانا نے صوبائی اسمبلی کی ممبری کا الکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ پہلی دفعہ ۱۹۳۱ء کے جنرل الکشن میں جوائنڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ہوا تھا۔ اُس میں مولانا تحصیل سنبھل اور بلاری کی سیٹ پر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے (جس میں اُس وقت جمعیۃ العلماء بھی شریک تھی) دوسری دفعہ ۱۹۳۶ء کے جنرل الکشن میں جو برطانوی حکومت کے دور کا آخری الکشن تھا، مولانا کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے، اس الکشن کے بعد مولانا کو پٹیشن لڑنا پڑا اور دوبارہ الکشن ہوا اور مولانا کامیاب ہوئے، انہی دنوں میں ملک آزاد ہوا۔

اس کے بعد مولانا کی اس سلسلہ کی مصروفیتیں اتنی بڑھ گئیں کہ مدرسہ شاہی مراد آباد کی تدریسی ذمہ داری سے سبکدوشی کا فیصلہ کرنا پڑا۔۔۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب اسمبلی کی ممبری کی مدت ختم ہو گئی تو درس و تدریس اور وعظ و تقریر کی اپنی پرانی لائن پر واپس آ گئے۔ گزشتہ ۱۵-۲۰ سال کے عرصہ میں وہ مختلف مدرسوں میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث پاک کا درس دیتے رہے۔ ادھر دو تین برس سے جب عمر ۷۵ سے متجاوز ہو چکی تھی وطن ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا اور مطالعہ اور تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔

مدرسی کے ابتدائی دور ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے اور بعد میں اجازت سے بھی سرفراز ہوئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کی ساری بلندیاں عطا فرمائیں، گزشتہ رمضان مبارک کے آخری دنوں میں ایک سفر سے مریض ہو کر واپس ہوئے، اس بیماری کا سلسلہ تشییب و فراز کے ساتھ چلتا رہا، آخر اکتوبر (شوال) میں مرض نے تشویشناک شکل اختیار کر لی، کوئی علاج سازگار نہ ہوا اور آخر ۲۳ نومبر کو وہ گھڑی آگئی جو سب کے لئے موعود اور مقرر ہے۔ روح نے جسم کو الوداع کہا اور ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔

اللہ تعالیٰ اُن کی دینی اور ملی خدمات اور قربانیوں کو قبول فرمائے اور مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

مولانا ابوالوفا شاہجہانپوریؒ

[مولانا ابوالوفا صاحبؒ زندگی کے اسی مرحلہ کے رفقاء خاص میں تھے جس مرحلہ میں مولانا اسلمیل صاحبؒ کی خصوصی رفاقت رہی۔ لاہور کے مناظرہ (۱۵۲ء) کے سلسلہ میں حضرت تھانویؒ نے جو کالت نامہ عنایت فرمایا تھا، جس کا ذکر اوپر گزرا، اس میں ان دونوں حضرات کا نام بھی اسی خاص رفاقت کی وجہ سے شامل تھا۔ مولانا نے فروری ۱۹۸۰ء میں انتقال فرمایا۔ حضرت صاحب سوانح کو اس کا علم اخبار سے ہوا اس پر الفرقان مارچ ۱۹۸۰ء میں تحریر فرمایا:]

۱۷ فروری (۱۹۸۰ء) کے اخبار سے اچانک معلوم ہوا کہ ہمارے رفیق قدیم مولانا ابوالوفا شاہجہانپوریؒ ۶ فروری کو شاہجہانپور ہی میں رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۵

اس خبر کو پڑھ کر پوری نصف صدی پہلے گزرا ہوا وہ دور آنکھوں کے سامنے آ گیا جب دین حق اور راہ حق کی حمایت میں ہم دونوں ساتھ رہا کرتے تھے، جلسوں میں ساتھ جاتے۔ مناظروں میں ساتھ رہتے۔ اس دور کی جمعیۃ العلماء کی خاص و عام میٹنگوں میں ساتھ شرکت کرتے، اور اکثر معاملوں میں ہم دونوں کی رائے ایک ہوتی۔ مجلس احرار بھی اُس وقت کی متحرک و فعال اور با اثر مذہبی و سیاسی جماعت تھی۔ مولانا ابوالوفا کا اُس سے بھی گہرا تعلق تھا، بلکہ وہ اس کے صوبہ یوپی کے رہنماؤں میں تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ملک کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان میں مجلس احرار گویا ختم ہو گئی۔ جمعیۃ العلماء سے مولانا ابوالوفا صاحب کا تعلق برابر اور گہرا رہا، جہاں تک معلوم ہے وہ طویل مدت سے جمعیۃ العلماء ہند کے نائب صدر تھے۔

مولانا مرحوم راقم سطور سے کئی سال پہلے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، علمی اور درسی استعداد بہت اچھی تھی، شروع میں خاصی مدت تک اصل مشغلہ تعلیم و تدریس ہی رہا۔ شاہجہانپور کے ایک مدرسہ سے تعلق تھا۔ دوسرے مشاغل کا درجہ ثانوی تھا، لیکن بعد میں وعظ و تقریر ہی کا مشغلہ غالب آ گیا۔

اب سے قریباً ۴۰ سال پہلے کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تبلیغ سے بھی تعلق رہا۔ مولانا کا اصل وطن لاہور پور ضلع سیٹاپور تھا۔ تدریس ہی کے تعلق سے شاہجہانپور میں قیام ہوا تھا، پھر یہیں کے ہو گئے اور اسی کو وطن

بنالیا۔ قادیانیت کے رد میں مولانا کو تخصص کا درجہ حاصل تھا۔ اب سے نصف صدی پہلے ریاست بھادلوپور کا وہ تاریخی مقدمہ جس نے ہندوستان میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ جس میں سرکاری عدالت سے قادیانیوں کے مسلمان یا نا مسلمان ہونے کا فیصلہ ہونا تھا اور اس میں بیان دینے کے لئے امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے بیماری اور سخت نقاہت کی حالت میں سفر فرمایا تھا اور جا کر عدالت میں بیان دیا تھا۔ اس پورے کیس کی پیروی آخر میں مولانا ابوالوفا صاحب ہی نے کی تھی اور آخر کار جج کی عدالت نے پہلی دفعہ قادیانیوں کے ”نامسلمان“ ہونے کا فیصلہ دیا تھا، یہ فیصلہ بڑے کتابی سائز کے ڈیڑھ سو صفحے پر تھا۔

کئی سال پہلے مولانا پر فالج کا حملہ ہوا تھا، طویل مدت تک صاحب فراش اور چلنے پھرنے سے معذور رہے، زبان پر بھی بہت اثر تھا، پھر الحمد للہ حالت کافی بہتر ہو گئی۔ بضرورت سفر بھی کرتے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ کچھ دن پہلے فالج کا دوسرا حملہ ہوا اور ۶ فروری کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ رحمہ اللہ رحمة واسعة

ناظرین کرام سے اس عاجز محمد منظور نعمانی کی گزارش ہے کہ ان کے لئے مغفرت و رحمت کی دعا فرمائیں اور ہو سکے تو کم از کم ۳ بار سورہ اخلاص پڑھ کر ایصال ثواب پہنچائیں، یہ آپ کا احسان ہوگا۔ واللہ یُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔

مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم

[حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (جو راقم کے استاد بھی ہوتے تھے) آپ کے ان رفقاء میں تھے کہ جولائی ۱۹۷۱ء میں وفات کی اطلاع پانے پر الفرقان (ماہِ رجب ۱۳۹۱ھ) میں جو کچھ تحریر فرمایا اس کا پہلا عنوان تھا: ”ایک ۴۰ سالہ رفیق کی رحلت“ ذیل میں الفرقان کی وہ تحریر درج کی جاتی ہے۔]

الفرقان اب سے ۳۹ سال پہلے بریلی سے جاری ہوا تھا، اُس کے سال دو سال پہلے سے راقم سطور کی آمد و رفت اس وقت کے خاص مشغلہ اور خاص دلچسپی کی وجہ سے بریلی زیادہ رہتی تھی۔ وہاں کے قدیمی دینی مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا عبدالحق صاحب سنبھلی مرحوم صدر مدرس اور وہی مہتمم بھی تھے۔ میں نے اُن سے کچھ اسباق بھی پڑھے تھے اور قریبی عزیز داری بھی تھی اس وجہ سے جب بریلی جاتا تو اکثر مصباح العلوم بھی جانا ہوتا اور کبھی وہیں قیام رہتا۔

مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی اس زمانہ میں وہاں مدرس دوم تھے، اپنے ہم مذاق ہونے کے علاوہ بڑے خوش مزاج بھی تھے۔ اس وقت سے ان سے خاص رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ پھر جب ۱۳۵۲ھ کے اواخر (۱۹۳۳ء کے اوائل) میں بریلی ہی سے ”الفرقان“ کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا تو راقم سطور کا مستقل قیام ہی بریلی ہو گیا۔ اور ۱۳ سال تک (یعنی الفرقان کے لکھنؤ منتقل ہونے تک) وہیں قیام رہا۔ اس پوری مدت میں مولانا عبدالحفیظ صاحب الفرقان کے کام میں راقم سطور کے بریلی میں سب سے بڑے معاون رہے۔ مولانا کو دفتری کاموں کا بھی خاص سلیقہ تھا، بڑے خوش خط اور زود نویس تھے اور ساتھ ہی انتہائی بے نفس بھی، جب کبھی الفرقان کے ناظم دفتر چمشی پر چلے جاتے تو اکثر مولانا موصوف کئی کئی بیٹے بلکہ کبھی کبھی کئی کئی مہینے تک کے لئے دفتری کام اپنے ذمہ لے لیتے اور اس کا بالکل خیال نہ کرتے کہ یہ کام اُن کے علمی مقام سے فروتر ہے۔

الفرقان کا دفتر جب تک بریلی رہا اُس کے کاموں میں مولانا کی رفاقت اور یہ معاونت برابر حاصل رہی، اس کے بعد جب وہ لکھنؤ منتقل ہو گیا تو مولانا موصوف بھی پہلے کچھ مدت نور العلوم (مہراج) اور کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند رہنے کے بعد اس عاجز ہی کی تحریک پر دارالعلوم ندوۃ العلماء آگئے۔ یہاں عربی ادب

کے اکثر اونچے اسباق مولانا کے سپرد ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ حسب ضرورت فقہ اور حدیث کے اسباق بھی پڑھاتے تھے۔ یہاں دارالعلوم میں مولانا موصوف کی یہ خصوصیت تھی کہ نصاب تعلیم کی ہر کتاب ان کو دی جاسکتی تھی۔

تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اُن کی متعدد کتابوں اور بعض کتابوں کے ترجموں کے علاوہ جن کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اُن کی دو معروف و مقبول کتابیں اُن کے علمی مقام اور کامیاب محنت کی یادگار ہیں۔

ایک ”مصباح اللغات“ جس میں پچاس ہزار سے زیادہ عربی الفاظ کی اردو میں تشریح کی گئی ہے، نہایت جامع اور ضخیم لغت ہے۔ اندازہ ہے کہ قریباً بیس ایڈیشن اس کے شائع ہو چکے ہیں، مرحوم نے اس کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف لغت ہی پر نہیں بلکہ دوسرے علوم عربیہ پر بھی اُن کی نظر کتنی وسیع اور عمیق تھی۔

دوسری کتاب ”اردو عربی ڈکشنری“ ہے جو اردو الفاظ کی عربی معلوم کرنے کے لئے بہترین اور مستند کتاب ہے۔ اس کے بھی متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، ان دونوں کتابوں پر حکومت ہند نے مولانا کو انعام بھی دیا تھا۔

ادھر کافی عرصہ سے موصوف کی صحت خراب تھی، اب سے ۴-۵ مہینے پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا اور حالت بظاہر مایوس کن ہو گئی تھی، فوراً ہی کنکرنو میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا اور اُس وقت اللہ کا فضل ہو گیا، چند ہی روز میں حالت قابلِ اطمینان ہو گئی اور ہم لوگ بھی مطمئن ہو گئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کئی سال سے گرمی کی شدت کی وجہ سے ماہ جون کی چھٹی ہو جاتی ہے۔ اس چھٹی میں مولانا کا قیام اپنے وطن رسوا ضلع بلیا میں رہا، جون ختم ہونے پر مولانا نے کچھ مزید چھٹی دارالعلوم سے لے لی۔ جولائی کے آخری ہفتہ میں وہیں فالج کا دوسرا حملہ ہوا، وہی آخری مرض وفات بن گیا اور ۲۶ جولائی (۱۹۷۱ء) کو انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ غُفْرَانُکَ رَبَّنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۝ جب بھی دور یا قریب کے کسی تعلق والے کا انتقال ہوتا ہے تو اس ناچیز کو ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے حقوق ادا کرنے میں بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ مولانا مرحوم کے بارے میں خصوصیت سے یہ احساس ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ دعا و ایصالِ ثواب کے ذریعہ اُس کی کچھ تلافی ہو سکے۔ الفرقان کے ناظرین گرام سے بھی عاجزانہ گزارش ہے کہ مولانا مرحوم کے لئے مغفرت و رحمت کی اور اُن کے پسماندگان کے لئے دین و دنیوی صلاح و فلاح کی دعا فرمائیں۔ ناچیز راقم سطور پر بھی احسان ہوگا۔

(۱) نہایت افسوس ہے کہ پاکستان کے ایک مکتبہ نے اس کا نام بدل کر بغیر مولانا کے حوالہ کے اسے چھاپ لیا ہے۔

مولانا نسیم احمد فریدی امر وہوئی

[ادرجن تین رفقاء کا تذکرہ گزرا، مولانا فریدی کے تذکرہ کو ان کی طرح تعارفی الفاظ کی حاجت نہیں، حضرت مولانا کا تعلق گئے گزرے زمانہ کی بات نہ تھی۔ بلکہ الفرقان کی قلمی معاونت کی صورت میں تقریباً سترہ وفات (۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء) تک یہ تعلق بقید حیات رہا، جبکہ حضرت صاحب سوانح خود ”پابہ رکاب“ کی منزل میں چل رہے تھے۔ اس تعلق کا اندازہ قارئین کو ”باب اسفار“ میں آپ کے نام حضرت صاحب سوانح کے اس طویل مکتوب سے ضرور ہو چکا ہوگا جو ۱۹۸۵ء کے سفر حجاز سے تحریر فرمایا گیا تھا۔ اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ الفرقان نے آپ کی وفات پر ایک خاص نمبر کے ذریعہ آپ سے متعلق یادیں تازہ کیں۔ اس نمبر (بابت مئی۔ اگست ۱۹۸۹ء) میں حضرت صاحب سوانح نے اپنے اس مرحوم رفیق کو یاد کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ذیل میں وہ فی الجملہ اختصار کے ساتھ پڑھئے۔]

آپ کے مضمون کا عنوان تھا:

ایک قابل رشک دوست۔۔۔ ایک بے مثال رفیق

اس عنوان کے نیچے ارشاد ہوتا ہے:

قریباً ۶۲، ۶۳ سال پہلے کی بات ہے، امر وہہ ضلع مراد آباد کے مدرسہ عالیہ (چلہ) میں یہ عاجز مدرس تھا، تین سال وہاں اس سلسلہ میں قیام رہا، میں فطری طور پر کم آمیز واقع ہوا ہوں، اس لئے بس مدرسہ کے طلبہ، اساتذہ اور مدرسہ سے خاص تعلق رکھنے والے بعض حضرات ہی سے تعلق تھا، اس کے علاوہ شہر کے لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم تھا مگر ایک نوجوان جن کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال کے قریب رہی ہوگی بہت مہذب اور اس نوجوانی میں بہت صالح تھے، اکثر ملتے تھے، ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت فہیم اور سلیم الفطرت ہیں۔۔۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا ہو کہ آپ نے کیا پڑھا ہے اور کیا پڑھ رہے ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ مڈل اسکول، اردو اعلیٰ قابلیت اور فنی کامل (فارسی) کے امتحانات پاس کر لئے تھے،

اس زمانے کے خاص حالات میں ان امتحانات کے پاس کر لینے کے بعد ان کو کسی اسکول یا کالج میں اردو فارسی کے استاد کی حیثیت سے اچھی ملازمت مل سکتی تھی۔ اور ان کے گھر کے معاشی حالات کا یہی تقاضہ بھی تھا کہ وہ اسی لائن کو اختیار کر لیتے، لیکن انھوں نے خالص دینی جذبہ اور حسنہ آخرت کی طلب میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی نوجوان تھے جو بعد میں مولانا مفتی نسیم احمد فریدی کے نام سے معروف ہوئے۔

یہ عاجز تین سال امرودہ قیام کے بعد مدرسہ سے بلکہ تدریس کے مشغلہ ہی سے ترک تعلق کر کے چلا آیا تھا، پھر محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۳ء) میں بریلی سے الفرقان جاری کیا۔ مولانا نسیم احمد فریدی اپنے وطن امرودہ ہی میں درس نظامی کے درجہ موقوف علیہ تک کی تعلیم پوری کر کے دیوبند چلے گئے، وہیں انھوں نے دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد عربی ادب اور معقولات، منطق و فلسفہ کی بعض کتابیں پڑھنے کے لئے جو دورہ حدیث سے پہلے نہیں پڑھی جاسکتی تھیں دارالعلوم دیوبند ہی میں رہے۔

۱۳۵۶ھ کا آغاز تھا کہ بریلی کے مدرسہ اشفاقیہ کے صدر مدرس مولانا رونق علی سلطانپوری کا انتقال ہو گیا، مدرسہ کے مہتمم صاحب نے ان کی جگہ کسی صاحب کے تقرر کے لئے اس عاجز سے مشورہ کیا، میں نے مولانا نسیم احمد فریدی کے بارے میں مشورہ دیا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ہی اُن کو بلا دیجئے، میں نے دیوبند مولانا کو خط لکھا، یاد آتا ہے کہ میں نے اس میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مدرسہ میں دورہ حدیث پڑھنے والے طلبہ بھی ہیں، اس لئے صدر مدرس کی حیثیت سے بخاری شریف، ترمذی شریف آپ ہی کو پڑھانی ہوگی اور یاد آتا ہے کہ میں نے یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے امید ہے کہ آپ انشاء اللہ کامیابی کے ساتھ یہ خدمت انجام دے سکیں گے۔ انھوں نے میرا خط اپنے (اور اس عاجز کے بھی) شفیق ترین استاذ حضرت مولانا اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھا کر مشورہ چاہا، حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ آپ فوراً چلے جائیے، کچھ تردد تاہل نہ کیجئے، مولانا نے یہ پوری بات مجھ کو لکھ دی اور لکھا کہ انشاء اللہ فلاں تاریخ کو آپ کے یہاں پہنچ جائوں گا، چنانچہ وہ تشریف لے آئے، میں نے مدرسہ اشفاقیہ کے مہتمم صاحب کو اطلاع دے دی، وہ خود آکر مولانا کو اپنے ساتھ لے گئے اور طے ہوا کہ فی الحال مولانا کا قیام میرے ہی پاس رہے گا۔ اور اس طرح جس تعارف کا آغاز امرودہ میں ہوا تھا وہ قریبی تعلق بلکہ رفاقت میں بدل گیا۔

جیسا کہ میں نے مولانا کو لکھ دیا تھا، دورہ حدیث کی کتابوں میں سے بخاری شریف اور حدیث کی دو ایک اور کتابوں کے درس کی بھی ذمہ داری مولانا کو لینی پڑی۔ بلاشبہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ دارالعلوم

دیوبند سے فراغت کے بعد سلسلہ تدریس کے آغاز ہی میں بخاری شریف وغیرہ کتب حدیث پڑھانے کا ان کو موقع ملا، ظاہر ہے اس کے لئے ان کو شدید محنت کرنی پڑتی تھی۔ مدرسہ اشفاقہ میں بخاری شریف کی کوئی شرح نہیں تھی، حسن اتفاق کہ میں نے اسی سال علامہ بدرالدین عینی کی شرح بخاری ”عمدة القاری“ خریدی تھی جو پچیس جلدوں میں چھپ کر اسی زمانہ میں مصر سے آئی تھی، اہل علم واقف ہیں کہ بخاری کی یہ شرح بہت ہی مبسوط ہے، مولانا نے درس بخاری میں اُس سے پورا فائدہ اُٹھایا، مولانا اگرچہ جسمانی حیثیت سے جوانی کی اس عمر میں بھی بہت ہی نحیف اور لاغر تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو درس و مطالعہ میں محنت و جافٹسانی کی بڑی قوت و ہمت عطا فرمائی تھی، بہت کم وقت آرام کرتے، سارا وقت کتابوں کے مطالعے اور درس میں مصروف رہتا۔

یہی سال تھا جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا تھا، مولانا فریدی مرحوم جو میرے ساتھ ہی مقیم تھے، تدریس میں مشغولیت کے باوجود اس کی ترتیب و تیاری میں برابر میرے شریک رہے، انھوں نے اس نمبر کے لئے امام ربانی مجدد الف ثانی کے خلفاء پر ایک مبسوط مقالہ بھی لکھا جو اس نمبر کے اہم مقالات میں سے تھا، جس میں حضرت کے ستائیں خلفاء کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ آگیا ہے۔

الفرقان میں مولانا فریدی علیہ الرحمۃ کا یہ پہلا مضمون تھا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان کے مضامین اور مقالات شائع ہوتے رہے، جنھوں نے بلاشبہ الفرقان کے مزاج کے عین مطابق اس کے پیغام کو عام کرنے، اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور مقبولانِ بادشاہ کی توجہات کو کھینچنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

مولانا کا خاص محبوب موضوع تھا امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے لے کر اب تک کے اپنے سلسلہ کے اکابر و مشائخ، مصلحین امت کا تذکرہ، ان کی سوانح حیات اور ایمان افروز مکتوبات و ملفوظات (جو عموماً فارسی زبان میں ہیں) عہد حاضر کے اردو خواں مسلمانوں کے لئے سادہ و سلیس اور دلکش و دلنشین اردو زبان میں منتقل کر کے مرتب کرنا۔ اس سلسلہ میں وہ جو کچھ لکھتے تھے جہاں تک اس عاجز کا اندازہ ہے اللہ کی رضا، اجر آخرت کی طلب اور امت محمدیہ کی خدمت ہی کی نیت سے لکھتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ سب سے پہلے خود ان کا قلب سلیم اس سے سبق اور اثر لیتا تھا، ان کے اخلاص اور الٰہیت اور قلبی کیفیت کے اثر سے ان کی یہ تحریریں، ہر پڑھنے والے کے دل کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ان کے ان مقالات نے کتنے بندوں کے دلوں میں خدا طلبی، آخرت کی فکر اور ان اکابر و مشائخ عباد اللہ الصالحین کے نقش قدم پر چلنے کا شوق و جذبہ پیدا کیا، ایمان و یقین کی کیفیت میں اضافہ ہوا، اعمال

صالحہ کی توفیق ملی، اور قرب و راضاء الہی کی نعمت عظمی نصیب ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمائے ہوئے خداوندی قانون و منشور رحمت ”مَنْ ذَلَّ عَلَىٰ خَيْرٍ فَلَهُ أَجْرٌ مِثْلُ فَاعِلِهِ“ کے مطابق یقین ہے کہ ان سب بندگانِ خدا کے اعمال کا اجر بھی ان کو عطا ہوگا۔

ناظرین کرام کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ادھر قریباً پندرہ سال سے مولانا کی بینائی بالکل ختم ہو گئی تھی، لکھنا تو درکنار، ایک سطر خود پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مطالعہ اور تحریر و تصنیف کا کام جاری رہا۔ دوسروں سے پڑھوا کر سنتے، یہ ان کا مطالعہ تھا اور خود بول کر دوسروں کے قلم سے لکھواتے، یہ ان کی تحریر و تصنیف تھی۔ ہم جیسوں کے لئے ان کا یہ حال بڑا ہی سبق آموز ہے۔

اسی نابینائی کی حالت میں تحریری اور تصنیفی کام کے علاوہ امت محمدیہ کی دینی خدمت جس طرح بھی ان کے لئے ممکن ہوتی اس سے دریغ نہ کر کے، تبلیغ جماعتوں کے ساتھ سفر بھی کرتے، میلوں پیدل چل کر قرب و جوار کے دیہاتوں میں بھی کام کرتے، مکاتیب قائم کرنے کی بھی کوشش فرماتے۔ لوگوں کے باہمی جھگڑوں کو سلجھانے کے سخت صبر آزمایا کام میں بھی وقت اور دماغ کھپاتے۔ دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علماء ہند اور دینی دعوت کے اس سلسلہ سے جو تبلیغی جماعت کے نام سے معروف ہو گیا ہے ان کو گہرا قلبی و جذباتی تعلق تھا، مزاج و فطرت کے لحاظ سے بہت ہی حلیم اور متحمل تھے، لیکن اس عاجز کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان تین اداروں کے بارے میں اتنے غیر معمولی حساس تھے کہ ان کے خلاف کچھ سننا ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔

یوں تو ہمیشہ ہی سے ان کی زندگی سادہ و غربانہ تھی، لیکن قریباً پندرہ سال سے محلہ کی مسجد ہی کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا تھا۔ وہ ایک درویش صفت، فقیرانہ زندگی گزارنے والے، اکثر زمین اور چٹائی پر سونے والے، اس طرح کے صاحب درس و افتاء اور صاحب قلم و صاحب تصانیف عالم دین تھے جیسے پہلے کبھی ہوا کرتے تھے، جن کا تذکرہ ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

مولانا فریدی علیہ الرحمۃ کے احوال اور اوصاف کے بارے میں دیگر حضرات کے مضامین میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، یہ عاجز ان کے جن حالات سے بہت زیادہ متاثر ہوا ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ جس زمانہ میں وہ بریلی میں میرے ساتھ مقیم تھے، اس وقت ان کی عمر ۳۰ کے لگ بھگ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ان دنوں ان سے ان کی شادی کے سلسلہ میں بات کی تو انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ میرے دو بھائی ایسی دماغی حالت میں ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی پوری فکر نہیں کر سکتے، ان کے اہل و عیال کی ممکن خدمت میں

نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، اگر میں خود گھریسالوں گا تو ان کی کچھ خدمت نہ کر سکوں گا۔ یہ بات جوانی کے زمانے کی ہے، وہ اپنے اس عہد پر زندگی بھر قائم رہے۔ اور صرف اپنے معذور بھائیوں کے بچوں کی خدمت کی خاطر پوری زندگی تجرد میں گزار دی۔ اللہ اکبر! اس زمانہ میں ایسا ایثار، ایسی قربانی انھیں خواص بندگانِ خدا ہی کے بس کی بات ہے۔ اور دوسرا واقعہ وہ ہے جو پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جس زمانہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم شعبہ دینیات کے صدر تھے، انھوں نے چاہا کہ مولانا فریدی یونیورسٹی کے اس شعبہ سے وابستہ ہو جائیں، پہلے بطور خود اس کے لئے تحریک کی، مگر جب مولانا نے معذرت کی تو پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کو واسطہ بنا کر پھر کوشش کی (جو مولانا مرحوم کے نہایت عزیز حقیقی بھانجے ہیں) لیکن مولانا نے کسی طرح اس کو منظور نہیں فرمایا۔ مجھے معلوم ہے کہ مولانا کی زندگی ہمیشہ عسرت اور غربت کی زندگی رہی، بریلی اور اردوہ کے جن مدرسوں میں پڑھایا وہاں ان کی تنخواہ بیس پچیس روپے یا اس کے قریب رہی، اگر مولانا اکبر آبادی کی پیش کش قبول کر لیتے تو اس عاجز کا خیال ہے کہ وہاں ان کا مشاہرہ پانچ چھ سو سے کم نہ ہوتا۔

یہ واقعہ بجائے خود مولانا کے مقام کی بلندی اور ہم جنسوں میں ان کے امتیاز اور علوِ اہمیت کی دلیل ہے، لیکن یہ عاجز اس بات سے انتہائی متاثر ہے کہ میرے ساتھ اتنے قریبی تعلق کے باوجود کبھی اشارہ بھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں فرمایا، مجھے یہ واقعہ پہلی دفعہ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کے اس مضمون سے معلوم ہوا جو اس نمبر میں شامل ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہر شخص اس بات کی غیر معمولی اہمیت محسوس نہ کر سکے، لیکن یہ عاجز ان کی زندگی کے تمام دوسرے حالات سے زیادہ ان کی اس بات سے متاثر ہوا کہ چونکہ اس واقعہ سے ان کی بلند مقامی، علوِ اہمیت اور فقر پسندی کا پتہ چلتا تھا اس لئے کبھی اس کو میرے جیسے قریبی رفیق و دوست سے بھی ظاہر نہیں کیا، میرے نزدیک بہت سی نفل نمازیں اور بکثرت نفل روزے رکھنا اور اسی طرح ذکر و تلاوت جیسی عبادات کی کثرت آسان ہے لیکن ہمارے اس زمانے میں اپنے ایسے حال اور کمال کا اس درجہ انحاء بہت مشکل، حیرت انگیز اور سوبار رشک کے قابل، اور اس لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق مانگی جائے۔ سلسلہ سلوک و طریقت میں مولانا فریدی علیہ الرحمۃ نے پہلے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی، اور حضرت ممدوح کے تلقین فرمائے ہوئے اذکار و اشغال معمول رہے، اُس سے پہلے حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن امر وہی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں سے بھی استفادہ کیا تھا (جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کے خلیفہ و مجاز تھے) حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کے وصال کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تجدید کی، حضرت شیخ نے ان کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ و مجاز تھے۔ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن امروہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث شریف میں تلمذ اور صحبت سے استفادہ کی سعادت حاصل تھی، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ بھی بیک واسطہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے خلیفہ و مجاز تھے، الغرض ان تین واسطوں سے مولانا فریدی علیہ الرحمہ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی نسبت حاصل تھی۔

اس عاجز کا اندازہ ہے کہ مولانا فریدی علیہ الرحمہ تقویٰ اور فتویٰ میں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے قدم بہ قدم تھے۔ اس خصوصی نسبت کا اثر تھا کہ وفات سے کچھ پہلے (جیسا کہ ان کے خاص خادموں کا بیان ہے) مولانا نے خادموں سے فرمایا کہ حضرت گنگوہی تشریف لائے ہیں (ظاہر ہے کہ یہ روحانی شاہدہ تھا) فطوبیٰ لہ ثم طوبیٰ لہ۔۔۔

آخر میں یہ عاجز راقم سطور اپنے اس قصور کا اعتراف کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ قریباً ساٹھ سالہ تعلق، بریلی کی تین چار سالہ رفاقت، خط و کتابت کے مسلسل رابطے اور اکثر سالوں میں ایک دو دفعہ ملاقات کے باوجود، میں مولانا کے بلند مقام کو نہیں جان سکا، وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے، انھوں نے میرے ساتھ معاملہ ایسا ہی رکھا جیسا کہ چھوٹوں کا بڑوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس عاجز کا رویہ بھی کچھ اسی طرح کا رہا، لیکن ان کے دنیا سے جانے کے بعد احساس ہوا کہ وہ بہت بڑے تھے، میں اُن سے بہت چھوٹا تھا، مجھے اُن کے ساتھ اس طرح کا تعلق رکھنا چاہئے تھا جس طرح چھوٹے بڑوں کے ساتھ رکھتے ہیں، اب اپنی تقصیر پر بے حد افسوس ہے۔ ہم جیسوں کا عام مرض ہے کہ نعمت کی قدر اس سے محروم ہو جانے کے بعد ہوتی ہے۔ خدا کرنے کے میں اپنے باقی ماندہ دنوں میں ان کے لئے زیادہ سے زیادہ دعاؤں کا اہتمام کر کے اپنے قصور کی خطائی کر سکوں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے، درجاتِ عالیہ سے نوازے، ان کے فیوض کو جاری رکھے اور شر و فساد کے اس زمانے میں ان جیسے علماء صالحین اور مخلص خادمانِ دین پیدا فرمائے۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللَّهِ بَعِيزٌ۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

[مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کا آغاز الفرقان کی اشاعت کے پانچویں سال میں، الفرقان ہی کے حوالہ سے ہوا، مولانا کا مستقر اس وقت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن تھا، جہاں آپ صدر شعبہ دینیات کے عہدہ پر فائز تھے، اس رشتہ کا آغاز الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کے لئے مضمون سے ہوا تھا، جس نے بعد میں الفرقان کی مستقل قلمی معاونت کی شکل ہی مولانا کی عنایت و محبت سے اختیار نہ کر لی، بلکہ پورا ایک سال ایسا بھی گزرا کہ آپ اس کے باقاعدہ مدیر اعزازی رہے لہٰذا میں اس قلمی رشتہ کی داستان حضرت صاحب سوانح کے قلم سے پڑھئے۔]

۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۹۳۸ء) میں جو الفرقان کی عمر کا پانچواں سال تھا ”مجدد الف ثانی نمبر“ نکالنا طے کیا گیا، اسکے لئے اپنے جن بزرگوں سے مضامین کی درخواست کی گئی ان میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم بھی تھے، ایک عریضہ اسی سلسلہ میں اس ناچیز نے مولانا گیلانی مرحوم کو بھی لکھا مولانا موصوف سے اس عاجز کا اس وقت تک کوئی تعلق اور تعارف نہیں تھا جس کی بنا پر درخواست کی پذیرائی کی کوئی خاص امید کی جاسکتی، اور اس باب میں مولانا کی سخاوت اور فیاضی کا جو تجربہ بعد میں ہوا اس کا اس وقت وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، اس لئے خط تو اگرچہ لکھ دیا گیا تھا لیکن مولانا کے مقالہ کی کوئی خاص توقع نہ تھی، لیکن اللہ کی شان بالکل بلا قصد بلکہ بلا شعور خود مجھ سے یا دفتر الفرقان کے اس وقت کے محرر سے یہ غلطی ہو گئی کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا خط بھی حضرت مولانا عثمانی مرحوم والے عریضہ کے ساتھ ملفوف ہو کر ان ہی کے لفافے میں چلا گیا، چند روز بعد ڈاک بھیل سے حضرت مولانا ممدوح کا جواب آیا جس میں خود کچھ لکھنے سے معذرت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا ”آپ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے نام کا خط میرے پاس غالباً اس لئے بھیجا ہو گا کہ (۱) یہ دو وقت تھا جب ۴۳ء ۱۳۶۲ھ میں حضرت صاحب سوانح کو بحالی صحت کی غرض سے خانقاہ رائے پور میں قیام کرنا پڑا تھا ذیل میں بھی اس کا حوالہ آ رہا ہے۔

میں اس میں اپنی طرف سے کچھ لکھ کر انکو بھیج دوں میں نے ایسا کر دیا ہے مجھے امید ہے کہ وہ آپ کے نمبر کے لئے انشاء اللہ ضرور کچھ لکھ دیں گے۔

بہر حال مجھے حضرت مولانا کے اس خط ہی سے معلوم ہوا کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا میرا خط بجائے حیدر آباد جانے کے حضرت مولانا عثمانی والے خط کے ساتھ ملفوف ہو کر ڈابھیل چلا گیا لیکن یہ معلوم کر کے کہ حضرت مولانا نے اپنی طرف سے کچھ لکھ کر حیدر آباد روانہ فرما دیا ہے، اس اتفاق غلطی پر خوش ہوئی، یاد آتا ہے کہ اس کے بعد میں نے مولانا گیلانی کو دوسرا خط لکھا اور اس میں اصل واقعہ لکھنے کے ساتھ اپنے خیال کا بھی اظہار کر دیا کہ اگرچہ یہ غلطی بالکل بلا قصد محض اتفاق سے ہوئی تھی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ غلطی کرا کے میری بڑی مدد فرمائی اگر یہ غلطی نہ ہوئی ہوتی تو صرف میرا عریضہ آپ کو لکھنے پر شاید آمادہ نہ کر سکتا۔ مولانا نے اپنے جواب میں کسی حد تک میرے اس خیال سے اتفاق فرمایا اور لکھا کہ بہر حال آپ کے نمبر کے لئے مقالہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔

پھر چند دن بعد قریباً ساٹھ صفحے پر مولانا کا وہ تاریخی مقالہ آ گیا جو مجدد الف ثانی نمبر میں بعنوان ”الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ“ شائع ہوا تھا اور جو اہل نظر کی نگاہ میں مولانا مرحوم کے چند منتخب شاہکار اور یادگار مضامین میں ہے، اور جس نے حضرت مجدد الف ثانی کے مقام اور ان کے اصل تجدیدی کام کو سمجھنے کی ایک نئی راہ کھولی۔

الفرقان میں شائع ہونے والا مولانا مرحوم کا سب سے پہلا مقالہ یہی تھا اور اسی سے الفرقان اور ناچیز مدیر الفرقان پر مولانا کی عنایتوں کا آغاز ہوا، کچھ عرصہ بعد اس مقالہ کا ایک تترہ بھی قریباً ۳۰ صفحے کا مولانا نے لکھا۔ اسکے بعد ایک دو قسطوں میں پورے ہو جانے والے متعدد مقالات کے علاوہ ایک اہم اور مبسوط مقالہ مولانا نے امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی پر الفرقان کے لئے لکھا جو ۱۳۵۸ھ و ۱۳۵۹ھ میں بالاقساط الفرقان میں شائع ہوتا رہا اور بعد میں کچھ اضافہ اور تکمیل کے بعد وہ مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ پھر ۱۳۵۹ھ میں الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکلا، اسکے لئے مولانا نے میری گزارش پر اپنا وہ مبسوط مقالہ لکھا جس میں شاہ ولی اللہ نمبر کے قریباً سو صفحات لئے، یہ مقالہ دراصل ایک کتاب کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ پہلے کتب خانہ الفرقان کی طرف سے اور اسکے بعد بعض دوسرے اشاعتی اداروں کی طرف سے کتابی شکل میں بھی اسکو شائع کیا گیا۔

اسکے بعد سے الفرقان کے ساتھ مولانا مرحوم کا تعلق کچھ ایسا ہو گیا کہ گویا انہوں نے اسکو اپنا لیا، اور اپنی خاص سرپرستی میں لے لیا خود بھی مسلسل لکھتے رہتے اور جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ دینیات کی حیثیت سے بی، اے، ایم، اے کے اپنے ہونہار شاگردوں کو خاص خاص موضوعات پر مواد دے کر اپنی رہنمائی اور نگرانی میں جو تحقیقی مقالات ان سے لکھاتے ان میں سے بھی انتخاب کر کے الفرقان کے لئے بھیجتے رہتے۔

اس زمانہ میں میری توجہ بعض دوسرے کاموں کی طرف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے میں الفرقان کی طرف سے بہت کم توجہ کر سکتا تھا اللہ تعالیٰ نے ٹھیک اسی زمانہ میں مولانا مرحوم کو الفرقان کی خصوصی سرپرستی کی طرف متوجہ فرما کر اور اس کے ساتھ ایک خاص لگاؤ انکے دل میں پیدا فرما کر اسکی زندگی کا ایک سامان پیدا کر دیا، اگر مولانا کی عنایت لطیفہ غیبی کے طور اس وقت الفرقان کو حاصل نہ ہوتی تو شاید اس زمانہ میں یعنی اب سے تقریباً ۱۵-۱۶ سال پہلے الفرقان بند ہو گیا ہوتا۔ مولانا کی یہ نوازش اور عنایت محض للہ فی اللہ تھی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ احسن ما یجزی بہ عبادہ المحسنین۔

پھر ۶۱ھ اور ۶۲ھ میں میری صحت بہت خراب رہی، دودفعہ بیماری کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ صحت و مرض کے عام تجربی قانون کے تحت زیست کی امید کے لئے بہت کم گنجائش رہ گئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے صحت و حیات بخشی، ان دنوں الفرقان کی اشاعت بہت ہی غیر مظہم رہی، زیادہ تر پرچے دودو تین تین مہینے کے مشترک ہی شائع ہوئے، شعبان ۱۳۶۲ھ کی آخری تاریخوں میں جبکہ بستر علالت سے اٹھا ہی تھا، مولانا نے ازراہ شفقت و دردمندی اپنے ایک کرم نامہ میں مجھے لکھا۔

”اس مہینے کے تمام پرچے نکل چکے۔۔۔ بھی۔۔۔ بھی، الفرقان بیچارہ ابھی نازل نہ ہوا،

میرا تو جی چاہتا ہے کہ الفرقان کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لوں۔۔۔ اگر وقت پر آپ چھاپنے کے لئے آمادہ ہوں تو مضامین و شذرات وغیرہ ہر مہینے تیار کر کے بھیجنے پر فقیر اپنے کو تیار کر لے۔“

مولانا کا یہ خط مجھے رمضان المبارک کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو ملا، اسکے ملنے سے دو ہی دن پہلے میری مرحومہ امیہ (مولوی عتیق الرحمن سلمہ کی والدہ) پر اچانک مرض کا سخت حملہ ہو چکا تھا، ان کے اس مرض اور تکلیف کا خاتمہ پانچویں دن انکے انتقال پر ہوا، اور وہ اس دنیا سے اٹھالی گئیں (اللہ تعالیٰ انکے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے اور انکی روح کو شاد رکھے)

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے میں خود چند ہی دن پہلے بستر علالت سے اٹھا تھا، بلکہ درحقیقت ابھی

نیم بیمار ہی تھا، اس حادثے نے پھر صحت پر اثر ڈالا اور میں بیمار پڑ گیا میرے معالجین نے اصرار کے ساتھ مجھے یہ مشورہ دیا کہ عرصہ تک اب کسی قسم کا کوئی کام مجھے نہیں کرنا چاہئے، میں نے مولانا مرحوم کو گھر کے اس مفا جاتی حادثے کی اور اپنی حالت اور معالجین کے مشورہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی عرض کیا کہ اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے خط میں آپ سے شفقت و دردمندی کے یہ انتہائی لفظ کیوں لکھائے تھے، بہر حال اسبق حالات ہی ایسے کر دئے گئے ہیں کہ الفرقان کے زندہ اور جاری رہنے کی صورت صرف یہی ہے کہ آپ ہی اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں۔

مولانا نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور اپنے افتتاحی شذرات کے لئے بجائے نگاہ اولیں کی ”فوائح“ کا عنوان پسند فرمایا۔ شوال ۱۳۶۲ھ کا پرچہ مولانا ہی کی ادارت میں نکلا، افتتاحیہ کی ابتدائی چند سطریں یہ تھیں۔

سبحان اللہ وبحمده والصلوة والسلام علی رسولہ وعلی آلہ وصحبہ

مخدوم و محترم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان صرف بیمار ہی نہیں ہیں بلکہ انکی تیمارداری کرنے والی جنت نصیب بی بی کو بھی اللہ میاں نے بلالیا، یہ وقت صرف ان ہی کے لئے نہیں الفرقان بیچارہ کے لئے بھی سخت تھا، اور ہے، میرے ایک مجذوبانہ خط کو مولانا نے پکڑ لیا ”النمرء یؤخذ بآقراہ“ جو وعدہ کیا گیا یا کرایا گیا ہے، بہر حال اس کی تکمیل کسی نہ کسی حد تک ”تحلۃ للقسم“ ہی کی حد تک اب تو میرے ذمہ عائد ہو ہی گئی، مشاغل کی کثرت، درس و تدریس، تحقیقی کاموں کی نگرانی کے ساتھ صدارت شعبہ کے فرائض بھی انجام دینا، کچھ ٹوٹے پھوٹے علمی مشغلوں میں بھی الجھے رہنا اور اسی کے ساتھ ایفاء عہد کا یہ بوجھ، اللہ جانتا ہے یہ کیسے اٹھاؤں گا، سر حاضر کر دیتا ہوں گٹھری لا دوں گے اٹھ سکے گی تو اٹھا لوں گا ورنہ بیچ کر بھاگوں گا لیکن جس نے عہد کر دیا ہے، امید ہے کہ وہی قوت بھی عطا کریگا۔ فعلى الله توكلت والیه انیب والیه المصیر ولا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم۔

(الفرقان بابت شوال ۱۳۶۲ھ ص ۲)

مولانا کی ادارت کا یہ شرف الفرقان کو قریباً ایک سال تک حاصل رہا اور افتتاحی شذرات بعنوان ”فوائح“ مولانا ہی لکھتے رہے اسکے بعد جب میری صحت بحال ہو گئی تو اگرچہ یہ خاص نوعیت باقی نہیں رہی لیکن اپنے مسلسل مقالات کے ذریعہ میری مدد اور الفرقان کی سرپرستی مولانا مرحوم برابر فرماتے رہے۔ پھر غالباً ۱۳۶۳ھ میں ایسا ہوا کہ میرے اور مولانا کے درمیان ایک مسئلے میں اختلاف رائے ہو گیا،

اور میں نے مولانا کو آزر دہ کر دیا، میری اور انکی جو نسبت تھی اور ہمارے باہمی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس کی بنا پر مجھے ہی چاہئے تھا کہ میں مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کرتا، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں کم ظرف ثابت ہوا اور مدوح کو راضی کرنے اور منانے کی میں نے کوئی کوشش نہیں کی یہاں تک کچھ مدت کے بعد خود مولانا مرحوم ہی نے اُلٹا مجھے منایا، سچ ہے ”پھل دار درخت ہی جھکتا ہے“۔

اس کے بعد الفرقان کو انہوں نے پھر اسی طرح اپنایا اور اپنی خاص سرپرستی میں لیا۔۔ بلاشبہ یہ ان کی بڑی عالی ظرفی تھی۔۔

قریباً ایک ہزار صفحات

الفرقان کی پرانی جلدوں کی ورق گرانی سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کے اُس پہلے مقالے سے لے کر جو اواخر ۵۷ھ میں ”محمد والف ثانی نمبر“ میں شائع ہوا تھا سلسلہ ”مادام اللذات“ کی اس آخری قسط تک جو رجب ۷۷ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی اور جس کے بعد مرض کے تسلسل نے مولانا کو الفرقان کے لئے کچھ اور نہیں لکھنے دیا، یہاں تک کہ اپنے رب کے حضور میں پہنچ گئے، قریباً ایک ہزار صفحات خود مولانا مرحوم کے قلم کے لکھے ہوئے الفرقان میں شائع ہوئے ہیں، اور اپنے بعض شاگردوں سے لکھوا کر خود صحیح اور نظر ثانی کر کے جو مضامین انہوں نے الفرقان کو عنایت فرمائے وہ انکے علاوہ ہیں، اُن کے صفحات کی مجموعی تعداد بھی دوسو سے زیادہ ہے۔

اللہ کی شان! الفرقان کے صفحات میں سب سے آخری سلسلہ انہوں نے ”مادام اللذات“ کے عنوان سے شروع فرمایا گویا موت کے یاد کرنے اور موت کے یاد دلانے کو اپنا موضوع بنایا۔۔ اس سلسلہ کی پہلی قسط ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی۔ اس کا افتتاحی نوٹ یہ تھا۔

”مشہور حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”اَکْثَرُ رِذَالٍ مَّا دَامَ

اللذات“ لذتوں کو ڈھا کر رکھ دینے والی یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کیا کرو سچ پوچھئے تو اسی نبوی

وہیت کی تعمیل اس مضمون سے مقصود ہے ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے انہیں کا ذکر اس

عنوان کے تحت انشاء اللہ کیا جائے گا موت کو یاد کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے بڑے بڑے علما

مواعظ اور لمحے دار تقریروں کے مقابلہ میں موت کا ہلکا سا خیال زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ سیدنا

عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں کہتے ہیں کہ ”يَكْفِي لِلْمَيِّتِ بِالْمَوْتِ وَالْغُلَا“ (آدمی کے لئے موت

کافی واعظ ہے) کے الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہر مہینے میں الفرقان کے ناظرین کے سامنے یہی زندہ واعظ کھڑا ہوگا۔ سب سے زیادہ یاد رکھنے کی مستحق جو چیز ہے، اسی کو یہ زندہ واعظ آپ کو یاد دلاتا رہے گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ سلسلہ (ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۲ء) سے شروع ہو کر برابر جاری رہا قریباً دو سال گزرنے پر ۱۳۷۳ھ کے اواخر سے مولانا پر سخت قلبی دوروں کا حملہ شروع ہوا جس کا سلسلہ قریباً ۶ مہینے جاری رہا، اس زمانہ میں ”ہادم اللذات“ کے ذکر و تذکیر کا یہ سلسلہ بھی قدرتی طور پر بند رہا دسمبر ۱۹۵۳ء میں کچھ طبیعت سنبھلی تو مولانا نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اس افاقہ کے بعد جو پہلی قسط آئی اس کے ابتدائی نوٹ کی چند سطریں یہ تھیں:-

چھ ۶ مہینے سے زیادہ مدت گزر گئی ”ہادم اللذات“ کی کہانیاں سنانے والا خود ”ہادم اللذات“ کی پرچھائیوں کے نیچے آ گیا، لیکن بقول اکبر مرحوم

کمزوری ہی میری صحت بھی کمزوری ہی میری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مرنے سکا

کچھ نہیں معلوم کہ مہلت جو ملی ہے اس کی مدت بھی کتنی ہے۔ غل ان الموت الذی تعروون منہ
فانہ ملا فی کمر۔۔۔ مدیر الفرقان کا اصرار ہے کہ

جب تک بس چل سکے ساغر چلے

بحول اللہ وقونہ ساغر کو پھر ہاتھ میں اٹھا لیتا ہوں، جو پینا چاہتے ہیں اُن کے لئے ”صلائے عام“ ہے، انسانی زندگی کے چند لازوال زندہ حقائق جن کا شعور عہد حاضر کے قلوب میں مردہ کہئے یا پڑ مردہ ہو کر رہ گیا ہے اسی شعور کا جگانا اس جھنجھوڑ سے مقصود ہے۔

”ہادم اللذات“ کی یہ قسط قریباً ۶-۷ مہینے کے نانغہ کے بعد (جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ مطابق جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مولانا کو صرف دو قسطیں اس سلسلہ کی اور لکھنے کا موقع ملا ایک ہندوستان کے مشہور مسلمان حکمران شیر شاہ سوری (مطابق ۱۹۵۲ء) کے کارنامہ اور اس کی وفات کے متعلق، یہ (قسط جمادی الاخریٰ ۱۳۷۳ھ مطابق فروری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی، اس کا عنوان تھا:- ہندوستان کی

ایک قدیم پنچالہ اکسیم، جس نے موت کو بھی زندگی بنا دیا۔۔۔ دوسری قسط میں اس چودھویں صدی ہجری کے چودھویں سال میں وفات پانے والے ہندوستان کے ایک مشہور عالم اور محدث حضرت قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بعض خاص سبق آموز پہلوؤں کا تذکرہ کر کے ان کی وفات کا حال لکھا گیا تھا۔ یہ قسط (رجب ۱۳۷۷ھ مطابق مارچ ۱۹۵۵ء) کے الفرقان میں شائع ہوئی تھی اس کا عنوان تھا ”اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی کا ایک دل آویز مرقع“

یہی اس سلسلہ کی آخری قسط تھی، اس کے بعد مولانا پھر ”ہادم اللذات“ کی پرچھائیوں کے نیچے آ گئے، دل کے دوروں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کے بعد مرض نے الفرقان کے لئے کچھ اور لکھنے کا موقع نہ دیا یہاں تک کہ جون ۱۹۵۶ء میں ”ہادم اللذات“ نے آپ کو ہم دنیا والوں سے الگ کر کے ملاء اعلیٰ میں پہنچا دیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

ان سطروں کے پڑھنے والے اور مولانا مرحوم کے اس مجموعہ مضامین کا مطالعہ کرنے والے اپنے سب دوستوں سے اس عاجز کی عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مولانا مرحوم کی مغفرت اور رفع درجات کے لئے اہتمام کے ساتھ دعا کریں، یہ اُن کا اس عاجز پر بھی بڑا احسان ہوگا، کسی مصنف اور مضمون نگار کی زندگی میں تو کسی کی داد و تحسین بھی تھوڑی دیر کے لئے اس کو خوش کر سکتی ہے۔ اور وہ اس سے کچھ ذائقہ لے سکتا ہے، لیکن مرنے کے بعد کام آنے والی چیز صرف دعا ہے، اور اپنے کسی محسن کا سب سے بڑا حق اور احسان مندی و شکر گزاری کا صحیح ترین ایمانی طریقہ یہی ہے کہ اس کے لئے اہتمام سے دعائیں کی جائیں اور بار بار کی جائیں۔

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

دعا کی ضرورت ہے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

[اس رشتے اور اس تعلق کا بیان، جو نصف صدی سے زیادہ کی یگانہ رفاقت کا رشتہ تھا؟
”سفینہ چاہئے اس بحر پیکراں کے لئے“

لیکن کچھ تو بیان کرنا ہی ہے، اختصار ہی کے ساتھ سہی۔

اور مذکورہ بالا اصحاب کی طرح خود صاحبِ سوانح کی تحریر اگرچہ ہمیں آپ کے بارے میں دستیاب نہیں، کہ حضرت مولانا آپ کے بعد (۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء تک) تقریباً دو سال بحمد اللہ ہم لوگوں کی دنیا میں رہے تھے، مگر حضرت صاحبِ سوانح کی وفات پر حضرت مولانا کی تعزیتی تقریر خوش قسمتی سے اس خلا کو بہت کچھ پُر کرنے کے لئے دستیاب ہے۔ یہ تقریر ۲۸/مئی ۱۴۱۷ھ - ۵/مئی ۱۹۹۷ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کی گئی تھی۔ یہاں اس کے کچھ اقتباسات اور کچھ اپنے

[معلومات:]

”عالم ربانی، داعی الی اللہ، و خدامِ دین مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ذات کم از کم ہندوستان کے دینی و علمی حلقہ اور خصوصیت کے ساتھ راقم کے حلقہٴ احباب کے لئے قطعاً محتاجِ تعارف نہیں۔ شاید دو حقیقی بھائیوں میں بھی اتنی قریبی رفاقت، یکجائی، ہم نشینی، ہمسفری اور اتحاد و فکر و عمل رہا ہو جو ہم دونوں میں تھا۔ سلوک و تربیت، تحریک و دعوت، تصنیف و اظہار خیال کے علاوہ تقریباً پندرہ سال کے قریب لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع محمد علی لین امین آباد میں یکجائی رہی، ہجگانہ نمازوں میں معیت و شرکت، اجتماع سے خطاب اور درس، کھانے اور ناشتہ کی یکجائی سالہا سال قائم رہی۔ دہلی کے مرکزِ تبلیغ اور حضرت مولانا الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری، ان کی دعوت میں شرکت و ہم سفری، پھر رائے پور، سہارنپور کی حاضری، عارف باللہ و مرشدِ زمانہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے انتساب و ارادت، پھر رابطہٴ عالمِ اسلامی مکہ

معتزہ کی رکنیت و شرکت میں رفاقت اور سفر حج و زیارت مدینہ میں بار بار مصاحبت، اتحاد خیال و اتحاد عمل یہ سب وہ خصوصیتیں اور امتیازات ہیں جو ان دو شخصوں میں کم دیکھنے میں آئی ہیں جن کا مولد و منشاء، مدرسہ و دانشگاه، شہر وطن اور خاندانی انتساب الگ الگ ہو۔

”میرے لئے اس وقت بڑی آزمائش کی بات ہے کہ میں اپنے رفیقِ مخلص، رفیقِ فاضل، رفیقِ مکرم، محبوبِ رفیق اور رفیقِ رفاقتِ طویلہ (حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ عرض کروں۔ یوں تو تعلقات اور روابط کی کثرت، واقفیت کے وسیع میدان اور دینی خدمات کے مختلف انواع و اقسام کی وجہ سے مجھے بار بار اس طرح کا ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑا ہے، لیکن اس وقت مجھے جو آزمائش پیش آ رہی ہے اور اس سلسلہ میں جو مجاہدہ کرنا ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔

”میں نے مولانا کو سب سے پہلے ”دارالمبلغین“ میں مولانا عبدالشکور صاحب کے پاس دیکھا، اس کے بعد تعارف اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب میری کتاب ”سیرت سید احمد شہید“ شائع ہوئی تو جن جن خاص لوگوں کو کتاب بھیجی ان میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی تھے۔ مولانا نے کتاب ملنے کے بعد خط لکھا اس میں انھوں نے تحریر کیا کہ یہاں جو وقت ڈاک کا ہوتا ہے وہی کھانے کا ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب آئی تو میں اس میں اتنا مشغول ہو گیا کہ میرے لئے کھانا مشکل ہو گیا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں ایک نئی تحریک چلی تھی جس کے بانی علامہ مشرقی نام کے تو مشرقی تھے لیکن ذہنی اور فکری لحاظ سے علامہ مغربی تھے۔ وہ خاکسار تحریک تھی جو اس دور کی خطرناک ترین تحریک تھی، اس وقت ہندوستان میں تحریکوں کا دور تھا اس تحریک نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ مقبولیت حاصل کی اور ایک طوفان کی طرح پھیل گئی۔ مولانا کو غالباً سب سے پہلے اس کا احساس ہوا کہ اگر یہ تحریک پھیلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے اس کا رابطہ ہو جاتا ہے تو ایمانی ربط جس میں غیرتِ اسلامی بھی ہو باقی نہیں رہے گا، معروف و منکر اور کفر و ایمان میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ مولانا اس وقت رائے بریلی تشریف لائے اور انھوں نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اس کی ذمہ داری قبول کروں کہ ایک جماعت بنائیں اور تحریک چلائیں اور میں اس کی قیادت اور ترجمانی کروں۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ کام اُس شخص کے سپرد کرنا چاہئے جو انگریزی پر پوری قدرت رکھتا ہو، انگریزی میں تقریر کر سکے، بیان دے سکے اور اخبارات میں مضامین لکھ سکے۔ انھوں نے کہا دو کون ہے؟ تو میں نے اپنے پیر بھائی حاجی عبدالواحد صاحب کا مشورہ دیا، جو انگریزوں کے دور میں پورے پنجاب میں ایم۔ اے۔ انگریزی میں فرسٹ ڈیویژن پاس ہوئے تھے، ان دنوں وہ فورٹ سنڈین میں تھے،

معیار کے سلسلہ میں بھی آپ نے برملا اظہار فرمایا کہ وہ صرف ایک دینی ماہنامہ نہیں ہے، ایک ملک فکر ہے، ہندوستان میں اس کی زندگی ضروری ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کے اس دور میں جو وہ ایک وقت الفرقان کی زندگی میں آیا (جس کا ذکر گزر چکا ہے) کہ حضرت صاحب سوانح اس کے بند کرنے کے اعلان پر مجبور ہوئے تو حضرت مولانا جیسے تڑپ اٹھے ہوں، ایک بڑی موثر اپیل اس کے حق میں جاری فرمائی، اور دوسرے بہت سے مخلصین کی کوششوں نے اسکے ساتھ ملکر الفرقان کی بقا کا سامان باذن اللہ کر دیا۔ اور یہ دو افراد کی رفاقت نہ تھی، دو اداروں کی رفاقت تھی، مولانا ندوۃ العلماء کے فرزند، فرزند ہی نہیں، استاذ، پھر معتمد تعلیمات، اور پھر ناظم اعلیٰ۔ اور الفرقان ایک دیوبندی عالم کے افکار و خیالات کا آئینہ دار۔ مگر یہاں کوئی ادنیٰ فکری فرق اپنے اور صاحب الفرقان کے درمیان آپ نہیں پاتے تھے۔ اسی مذکورہ بالا تقریر میں فرمایا بھی ہے کہ ”مولانا اگرچہ دیوبند کے فاضل اور اس کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے مگر ندوۃ العلماء کی تحریک سے بھی اور ندوۃ العلماء کے ادارہ سے بھی ان کا مخلصانہ تعلق رہا ہے۔۔۔۔۔“

مولانا مودودی کے ساتھ حضرت صاحب سوانح کے رشتہ کی روداد گواہی دیتی ہوئی گزری ہے کہ دین حق کی خدمت کے حوالہ سے جو شخصیت آپ کو بھا جاتی تھی، اس میں کچھ ذاتی کمزوریاں دیکھتے ہوئے بھی، آپ کے دل کی محبت اس کے ساتھ ”عشق“ کا درجہ اختیار کر جاتی تھی۔ حضرت مولانا سے رشتہ کی داغ بیل بھی، جیسا کہ ابھی گزرا، اس کا کام ”محبت“ کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی، اس رشتہ کو پروان چڑھنا مقدر تھا، تو باہم مناسبت اور اللہ محبت نے سکونت میں بھی یکجائی لکھوائی اور بریلی کی جگہ لکھنؤ نے پالی، پھر تو زندگی بچ بچ ”ہم پیالہ وہم نوالہ“ کا مصداق ہوئی، حضرت مولانا صرف ایک ہم ذوق ہی نہ تھے بلکہ صاحب صلاح و تقویٰ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ سے خاندانی نسبت کے حامل، ان کے لئے جس قدر بھی جوڑ محبت آپ میں نہ ہوتا کم تھا۔ پس ایک طرف محبت تھی تو دوسری طرف اس کی قدر۔ مرکز تبلیغ میں قیام کا وہ دور جس نے دیکھا ہے بس وہی بتا سکتا ہے کہ طرفین سے خلوص و محبت کے کیا کیا رنگ دیکھنے میں آئے۔ (اب اس کے دیکھنے والوں میں ہمارے گھر سے باہر شاید صرف حضرت مولانا کے بھانجے اور راقم کے دوست مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی رہ گئے ہیں (اور شاید آپ کے بھتیجے میاں سید حمزہ حسنی) اللہ انھیں تادیر حضرت مولانا کی قائم مقامی کے لئے سلامت رکھے) بلکہ مرکز کے قیام سے بھی پہلے جب ہم لوگ اعظم سلیمان قدر میں رہ رہے تھے جو حضرت مولانا کی قیام گاہ گوئن روڈ سے زیادہ دور نہ تھا تو مولانا اکثر تشریف لے آتے اور کچھ وقت ”رفیق محترم“ کیساتھ گزرتا۔ خاص طور سے جب مولانا نے کوئی خاص

مضمون تحریر فرمایا ہوتا تو تب تو اسے لیکر ضرور ہی تشریف لے آتے اور الفرقان میں چھپنے سے پہلے وہ مولانا کی زبان مبارک سے ہم لوگوں کے سننے میں آ جاتا۔ مولانا کا نہایت اہم مضمون ”اپنے گھر سے بیت اللہ تک“ جو بعد میں ”آپ“ حج کیسے کریں“ کا جزو بنا اس کا حضرت مولانا سے سننے کا کیف تو آج تک یاد ہے۔

”انا“ کا یہ زمانہ دیکھیں اور اس ”رفاقتِ محبوبہ“ کی یہ شان کہ ہر دو اصحاب اپنی اپنی ذات میں صاحب مقام، مگر تقریباً ساٹھ سال تک دونوں میں کا ہر ایک دوسرے کو بڑا بنا کر آگے چلتا جا رہا ہے، کہ اللہ رفاقت کی یہی شان ہے۔ اسی سے سات درویش ایک گھیم (کملی) میں بسر کرتے بتائے گئے ہیں، جبکہ دو اصحاب ”انا“ ایک اقلیم میں بھی چین سے نہیں پائے جاتے۔ اس ساٹھ سالہ رفاقت سے دین و ملت کے حق میں جو خیر و جود میں آیا، ملت کے سنجیدہ حلقوں میں شاید ہی کوئی اس کا منکر ہو۔ ورنہ ایک منفرد مثال کی حیثیت سے یہ رفاقت یاد کی جاتی ہے۔

اللہ اپنے شایانِ شاں اجر سے ان ہر دو خادمانِ دین و ملت کو نوازے۔ اور ان کا بدل اپنی شانِ کریمی سے عطا فرمائے۔ آمین، کہ حاجت اور ضرورت کا پیمانہ ہر دم بڑھتا ہی جا رہا ہے اور رع
”کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ افکنِ عشق“

کی صدا بلند سے بلند تر!

پاکستان کے سفر ۱۹۵۲ء میں ”احتفالِ علماء“ نامی ایک کانفرنس میں شرکت کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت صاحبِ سوانح نے تحریر فرمایا تھا:

”۔۔۔ یہ عاجز تو عمر بھر کے تجربے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ اگر اللہ کے صرف

دو مخلص بندے جن میں اخلاص کے علاوہ صلاحیت اور باہم اعتماد اور ایک خاص حد تک فکری اتحاد ہو دین کی خدمت و نصرت اور اس امت کی صلاح و فلاح کے لئے جدوجہد کو اپنی زندگی کا مسئلہ بنا کر کسی شکستہ مسجد کے گوشہ یا جنگل کے کسی درخت کے ہی نیچے کچھ وقت کے لئے سر جوڑ کے بیٹھ جائیں اور باہم مشورہ سے جو کچھ ملے کریں اس پر اپنی زندگی کا سرمایہ لگانے کا فیصلہ کر لیں تو ان دو بندوں کا یہ مجو کے بیٹھنا اس امت کے اور اس کے دین کے حق میں انشاء اللہ اس قسم کی کئی عالمی کانفرنسوں سے کہیں زیادہ خیر کا باعث ہو گا۔۔۔“

یہ گویا اس ساٹھ سالہ رفاقت کے تجربہ کا نچوڑ بیان ہو رہا تھا، اور اس نقطہ نظر کی صداقت کی جیسی گواہی یہ رفاقت دے رہی ہے وہ اپنا بیان آپ ہی ہے۔

حضرت صوفی سید عبدالرب صاحبؒ

[حضرت صوفی عبدالرب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اپنے رنگ کی ایک یگانہ ہستی تھے خوش نصیبی کہ برسوں زیارت کا شرف ہی حاصل نہیں رہا بلکہ شفقت بھی ایسی کہ گنہگار کو مغفرت کی امید دلائے۔ حضرت والد صاحب سے جو تعلق تھا اس کا بیان آپ کی درج ذیل تحریر ہے، جو الفرقان کے دو شماروں (فروری مارچ اور دسمبر ۷۵ء) کی تحریروں سے اخذ کر کے مرتب کی گئی ہے۔]

غالباً ہجری ۱۳۵۲ھ تھا اور عیسوی ۱۹۳۳ء، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنؤیؒ نے لکھنؤ میں ادارہ ”دارالمبلغین“ قائم فرمایا، جس میں عربی مدارس کے فارغین اور فضلاء کو دوسرے مذاہب اور فرقوں سے متعلق تحقیقی مطالعہ کرایا جاتا تھا اور تقریر اور بحث مباحثہ کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس دور میں راقم سطور کو بھی اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی اس لئے مولانا نے مجھے بھی طلب فرمایا اور ادارہ کے ایک رفیق کی حیثیت سے میرا قیام بھی دارالمبلغین میں رہا۔ روزانہ صبح اول وقت خود مولانا دارالمبلغین ہی میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے، یہ درس عوامی ہوتا تھا اور شہر کے کچھ حضرات بھی اس میں شرکت کرتے تھے، ان میں ایک صاحب تھے جن کو ان کے جاننے والے ”ماسٹر عبدالرب“ کہا کرتے تھے، یہ لکھنؤ ہی کے کسی انگریزی اسکول میں ماسٹر تھے، لیکن شکل و صورت اور وضع قطع سر سے پاؤں تک مولویانہ بلکہ کہنا چاہئے کہ ”بزرگانہ“ تھی۔ سر پر اکثر ٹوپی اور سردی کے دنوں میں عمامہ، نیچے کرتے پہ خوب لالہ لانی چھ کلیہ اچکن، مگر جسم مضبوط پہلوانوں کا سا۔ جہاں تک یاد ہے اُن سے تعارف اور تعلق کی ابتداء قیام لکھنؤ کے ان ہی دنوں میں ہوئی تھی۔ چونکہ صوفی صاحب کا مزاج باطل سے لڑنے کا تھا۔ اور مجھے انھوں نے کسی درجہ میں اپنا ہم مشرب و ہم مذاق پایا تھا، اس لئے وہ مجھ سے اُس سے بہت زیادہ محبت فرمانے لگے جس کا میں مستحق ہو سکتا تھا۔ پھر چند ہی مہینوں کے بعد (۱۳۵۳ھ کے آغاز میں) ”الفرقان“ بریلی سے جاری ہوا، وہ شروع

سے صوفی صاحب کے مطالعہ میں رہا، اُس کی وجہ سے مستقل رابطہ قائم ہو گیا اور اُن کی محبت و عنایت میں اضافہ ہوتا رہا۔

پھر غالباً ۱۳۵ھ میں وہ اور اُن کے ایک ہم مشرب رفیق و دوست ماسٹر ابراہیم اللہ آبادی (جو صوفی صاحب ہی کی طرح حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی بیعت سے مشرف تھے اور اصلاح کا تعلق بھی حضرت مولانا محمد عیسیٰ اللہ آبادی سے رہا تھا) ایم اے کا امتحان دینے کے لئے بریلی تشریف لائے اور میرے اصرار پر ہفتہ عشرہ میرے ہی پاس قیام فرمایا، دن رات کی اس چند روزہ صحبت و مصاحبت میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو زیادہ جانا پہچانا، مجھے اُن سے وہ عقیدت ہوئی جو خاص اللہ والوں سے ہوتی ہے اور انھیں میرے بارے میں غیر معمولی قسم کی خوش فہمی اور حسن ظن۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب کو ان ہی دنوں میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اُن سے بھی بڑا اُنس ہو گیا، میں نے اُن کو بڑا فہیم اور بے نفس پایا، صوفی صاحب اُن کو ”شاہ ابراہیم“ کہتے تھے، میں بھی یہی کہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اسی نام سے معروف ہیں، یہ تو بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ صوفی صاحب ہی نے اُن کے نام کے ساتھ ”شاہ“ لگایا تھا، ورنہ اُن کے حلقہ تعارف میں اُن کو ”ماسٹر ابراہیم“ ہی کہا جاتا تھا۔ ان دونوں حضرات کے بریلی میں قیام کے ان ہی دنوں میں یہ بھی طے ہو گیا کہ آنے والی گرمیوں کی تعطیل میں ہم تینوں نظام الدین (دہلی) کی تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کریں گے۔ بعد میں خط کتابت سے تاریخ کے تعین کے ساتھ پروگرام طے ہو گیا اور وقت آنے پر ہم لوگوں نے ایک جماعت کے ساتھ یوپی کے کئی مشرقی اضلاع گورکھ پور، اعظم گڑھ، وغیرہ کا دورہ کیا، اس دینی تبلیغی سفر کی رفاقت نے ہماری عقیدت و محبت اور ہمارے لٹری تعلق میں اور اضافہ کیا، اور الحمد للہ یہ اضافہ کسی نہ کسی رفتار کے ساتھ برابر جاری رہا، اور انشاء اللہ آخرت میں بھی ہم تینوں کے لئے نفع مند ہوگا۔

۲۵ محرم (۱۳۹۵ھ) ۷ فروری (۱۹۷۵ء) جمعہ کا دن تھا، صبح ۸ بجے کے بعد ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ رات ایک بجے کے قریب اناؤ میں حضرت صوفی سید عبدالرب صاحب کا انتقال ہو گیا، جنازہ کی نماز اور تدفین جمعہ کی نماز کے بعد ہوگی۔ یہ عاجز اور لکھنؤ کے چند اور احباب جن کو یہ اطلاع مل گئی تھی نماز جمعہ سے پہلے اناؤ پہنچ گئے، اور نماز اور تدفین میں شرکت ہو گئی۔

الفرقان کے ناظرین میں خاصی بڑی تعداد اُن حضرات کی ہوگی جو صوفی صاحب سے واقف ہوں

مے۔ صوفی صاحب غالباً ابتدائی عمر ہی میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے تھے۔ اور ان ہی کے حکم سے ”اصلاح“ کا تعلق اُن کے خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی سے قائم کر لیا تھا، پھر جب ۱۹۳۳ء (۱۳۹۲ھ) میں حضرت حکیم الامت کا اور اُن کے چند مہینے بعد حضرت مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی صاحب کا بھی وصال ہو گیا تو صوفی صاحب نے اصلاح کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ سے قائم کر لیا، اور اللہ تعالیٰ نے ان تینوں حضرات کے فیوض سے صوفی صاحب کو بہرہ مند فرمایا۔ جہاں تک اپنا اندازہ ہے۔ واللہ اعلم۔

صوفی عبدالرب صاحب اپنے رب کے بڑے وفادار بندے اور مثالی مرد مومن تھے۔ بعض تابعین کے بارے میں کتابوں میں منقول ہے کہ وہ اپنے مخاطبین اور شاگردوں سے، جنہوں نے صحابہ کرام کو نہیں پایا اور دیکھا تھا، فرماتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو پھر ہماری اس دنیا میں واپس بھیج دے تو تم اُن کو جانیں (عقل مارے ہوئے دیوانے) سمجھو گے اور وہ تم کو منافق ہمارے صوفی صاحب کا یہی حال تھا، دین کے بارے میں اُن کی لہنی اللہ شدت کی وجہ سے بہت کم لوگ اُن سے راضی رہ سکتے اور وہ بھی بہت کم لوگوں کو پسند کرتے۔ اس باب میں وہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے خال کے وارث و ہم مشرب تھے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا مشہور مصرعہ ”یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے“ ان کے بالکل حسب حال تھا۔ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے۔ ”مجھے امید ہے کہ اللہ فرشتوں کو حکم دے گا کہ میرے

اس بندہ عبدالرب کو کان پکڑ کے جنت میں داخل کر دے، یہ ہمارے لئے لوگوں سے بہت لڑتا تھا۔“ صوفی صاحب نے انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور پھر گورنمنٹ کے نچرل تعلیم ہی سے وابستہ ہو گئے اور ریٹائر ہونے کی عمر تک اسکولوں ہی میں ماسٹری کی، گویا پوری عمر اُن اسکولوں اور کالجوں ہی کے ماحول میں گزاری جن کو لوگوں نے ”ایمان کی قتل گاہیں“ کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا وہ ”مثالی مرد مومن“ تھے۔ اپنی ٹھیک ملا یا نہ شکل و صورت اور مولویانہ لباس کے ساتھ اسکول جاتے۔ قرآن شریف اور مناجات مقبول گلے میں حائل رہتی، جو گھنٹہ خالی ہوتا اس میں تلاوت کرتے یا اپنا رومال کسی کونے میں بچھا کر نوافل پڑھتے رہتے۔ اسکول کا مقوضہ کام محنت اور دیانت داری سے انجام دیتے، جیسا کہ سچی ڈیفنڈازی کا تقاضا ہے، لیکن اپنے اصولوں میں بے پلک ہونے کی وجہ سے بسا اوقات اختلافات بھی پیدا ہو جاتے اور اس کی وجہ سے جلدی جلدی تباہ لے بھی ہوتے رہتے۔

صوفی صاحب پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام یہ تھا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ پر بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا جو خاص درجہ کے اصحاب یقین کو ہوتا ہے۔ ایک دفعہ محکمہ کی طرف سے (غالباً سزا کے طور پر) اُن کا تبادلہ بہت بُری جگہ کے لئے کر دیا گیا جہاں ایک بھی مسلمان کا گھر نہ تھا اور پینے کا پانی ایک میل سے لانا پڑتا، وہ لکھنؤ تشریف لائے اور اس تبادلہ کے معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ وہ کیا حدیث ہے کہ جس کا مضمون یہ ہے کہ بعضے بندے وہ ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی معاملہ میں اللہ پر قسم کھا جائیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم پوری کر دیتا ہے؟ میں نے کہا، ہاں حدیث میں آیا ہے کہ رُبُّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ لَوْ اَقْسَمَ عَلٰی اللّٰهِ لَا يَبْرُؤُ۔ صوفی صاحب نے ایک خاص انداز میں فرمایا۔ ”اے اللہ! میں تیرے بھروسہ پر قسم کھاتا ہوں کہ اس جگہ کو میرا تبادلہ نہیں ہوگا۔“ پھر ایسا ہی ہوا، اور ایک دوسری بہتر جگہ کے لئے حکم آ گیا۔

ایک زمانہ میں صوفی صاحب فتحپور مسوہ کے سرکاری اسکول یا کالج سے وابستہ تھے، طلباء میں کچھ ہندو مسلم مناقشہ ہو گیا اور معاملہ خاصا سنگین ہو گیا، اس اسکول یا کالج کے افسر اعلیٰ (ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل) نے صوفی صاحب کے پتے مسلمان ہونے کی وجہ سے سارے فساد کا ذمہ دار انہی کو قرار دیا۔ معاملہ چونکہ بہت ہی سنگین نوعیت کا ہو گیا تھا اس لئے صوبہ کا ڈائریکٹر تعلیم جو انگریز تھا، خود تحقیق و تفتیش کے لئے آیا، مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کی اور بیانات لئے، ہیڈ ماسٹر وغیرہ نے صوفی صاحب کی موجودگی میں انہی کو سارے فساد کا ذمہ دار قرار دیا۔ صوفی صاحب اس ساری کارروائی کو خاموشی سے سنتے اور دیکھتے رہے۔ آخر میں ڈائریکٹر نے غصہ بھرے انداز میں صوفی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”تم کچھ کیے گا؟“

صوفی صاحب نے فرمایا جی ہاں! میں بھی کچھ کہوں گا۔ ان ہیڈ ماسٹر صاحب کا ایک لڑکا ہے، اسی اسکول میں پڑھتا ہے، پہلے اُس کو یہاں بلایا جائے۔ ڈائریکٹر نے جو غالباً یہ رائے قائم کر چکا تھا کہ صوفی صاحب ہی فساد کے بانی اور ذمہ دار ہیں۔ کہا کہ لڑکے کو کیوں بلایا جائے؟۔ صوفی صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ وہ ان کا (ہیڈ ماسٹر کا) اکلوتا لڑکا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ وہ ان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ یہاں آجائے تو میں یہیں دو رکعت نماز پڑھ کے دعا کروں گا کہ میرے خلاف جو کچھ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا ہے وہ اگر سچ ہے اور میں ایسا ہی شرارتی اور فسادی ہوں تو زمین شق ہو جائے اور میں ابھی سب کے سامنے اس میں دھنسا دیا جاؤں اور اگر انھوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے تو ان کا لڑکا ابھی زمین میں دھنس جائے۔

صوفی صاحب نے یہ بات دل کے ایسے تاثر اور ایسے جلالی انداز میں کہی کہ انگریز ڈائریکٹر دہشت زدہ ہو کر کرسی سے کھڑا ہو گیا اور صوفی صاحب کو پادری صاحب، پادری صاحب کہہ کر مخاطب کرنے لگا اور اس نے تحقیق و تفتیش کا سلسلہ اسی پر ختم کر دیا۔ آگے سننے کی خاص بات یہ ہے کہ بعد میں صوفی صاحب کے ایک خاص ہم مشرب دوست نے جو اُن کے پیر بھائی بھی تھے اُن سے کہا کہ آپ نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ اس وقت مجھے پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دے گا۔

ہمارے اکابر بلکہ سارے ہی محققین کے نزدیک کشف کی کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ایمان اور عمل صالح کے ساتھ کسی بندہ کا یہ حال ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے بعض مخفیات کو منکشف فرمادے تو وہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام اور اس بندہ کی مقبولیت کی علامت اور از قبیلہ کرامات ہے۔ صوفی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعت نصیب فرمائی تھی۔ ایک واقعہ جو خود اس عاجز سے متعلق ہے یہاں ذکر کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

شعبان ۱۳۶۶ھ (جون یا جولائی ۱۹۴۷ء) کی کسی تاریخ کو رفیق محترم مولانا علی میاں حج کے لئے روانہ ہو رہے تھے، اُن کے اعزہ اور اُحباب اُن کو رخصت کرنے کے لئے لکھنؤ اسٹیشن پر جمع تھے، اُن میں راقم سطور (محمد منظور نعمانی) اور صوفی صاحب بھی تھے، اس کے چوتھے یا پانچویں دن جمعہ آنے والا تھا، اسی جمعہ کے لئے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ میرے کرسی (ضلع بارہ بنکی) جانے کا پروگرام پہلے بن چکا تھا، صوفی صاحب سے بھی اس پروگرام کا ذکر آگیا تھا (صوفی صاحب کا اصل وطن کرسی سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک موضع ہے) انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ جمعہ کے دن کس وقت کرسی پہنچنے کا اندازہ ہے؟ میں نے بتلایا کہ ۱۰-۱۱ بجے تک پہنچ جانے کا ارادہ ہے۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ میرے والد صاحب بیمار ہیں اور یہ اُن کا آخری مرض ہے اُن کا انتقال انشاء اللہ جمعہ ہی کے دن ہوگا، آپ کوشش کریں کہ جتنا سونیرے کرسی پہنچ سکیں پہنچ جائیں، اور پہلے میرے گاؤں آکر والد صاحب کی نماز جنازہ پڑھا کر کرسی واپس ہو جائیں۔ مجھے ان کی اس بات پر کچھ تعجب بھی ہوا، لیکن عقیدت اور محبت تھی اُن کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کر لیا۔ مگر اللہ کی مشیت جس لاری سے ہماری جماعت کرسی کے لئے روانہ ہوئی اس نے کسی وجہ سے کئی گھنٹہ کی تاخیر سے پہنچایا، ہم ایسے وقت پہنچے کہ جمعہ کی نماز بالکل تیار تھی۔ ایک صاحب جو صوفی صاحب کا خط لائے تھے، میرے منتظر تھے، انھوں نے مجھے خط دیا، اس میں لکھا تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا، نماز جنازہ

میں آپ کا انتظار کیا جائے گا۔۔۔ صوفی صاحب نے یہ خط لکھ کر آدمی صبح ہی کرسی بھیجا ہوگا، لیکن ہم لوگوں کے بہت تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے مجھے نماز جمعہ کے وقت غالباً مسجد ہی میں ملا تھا۔۔۔ میرا خیال تھا کہ زیادہ دیر انتظار کرنا مناسب نہ سمجھ کر جنازہ کی نماز اور تدفین سے فراغت ہو چکی ہوگی، تاہم میں نے اسی وقت وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور نماز جمعہ سے فارغ ہو کر اپنے چند رفقاء کے ساتھ صوفی صاحب کے گاؤں کو روانہ ہو گیا، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ انتظار کے بعد ماپوس ہو کر نماز جنازہ ہو چکی ہے اور اس کے بعد تدفین کے لئے میت کو قبر میں اتارا بھی جا چکا ہے۔۔۔ لیکن صوفی صاحب نے فقہ حنفی کا مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود اصرار فرمایا کہ آپ لوگ اسی حال میں دوسری نماز جنازہ پڑھیں، اُن کے اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی۔۔۔ الغرض صوفی صاحب نے ۴-۵ دن پہلے لکھنؤ اسٹیشن پر جمعہ کے دن والد صاحب کے انتقال کے بارہ میں جو کہا تھا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی وقوع میں آیا۔ بلاشبہ یہ اُن کا کشف صادق تھا۔

اس طرح کے صوفی صاحب کے اور بھی بہت سے واقعات ان کے دوستوں کے علم میں ہیں۔۔۔ لیکن جہاں تک راقم سطور کو معلوم ہے صوفی صاحب کا یہ رنگ اور حال اب سے قریباً ۲۰ سال پہلے تک رہا، اُس کے بعد (غالباً جب وہ دوسری دفعہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے) عبدیت اور تقویٰ و تسلیم کا رنگ غالب آ گیا۔ صوفی صاحب شاعر بھی تھے اور بہت قادر الکلام شاعر، لیکن ادھر بہت عرصہ سے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ اُن کی بہت سی نظمیں الفرقان میں شائع بھی ہوئی ہیں جو اس کے قدیم فالکوں میں محفوظ ہیں۔ اگر اُن کا کلام جمع کیا جائے تو اچھا ضخیم دیوان تیار ہو جائے گا۔

صوفی صاحب کی جسمانی صحت بھی خدا کے فضل سے بہت اچھی تھی، عمر کے ساٹھ سال سے بھی متجاوز ہونے کے بعد بھی فرماتے تھے کہ میں اپنے کو بالکل جوان محسوس کرتا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ زیابطلس میں مبتلا ہو گئے، اس نے چند سالوں میں جسم کو بالکل ہی گھلا دیا، آنکھوں کی بینائی بھی ختم ہو گئی، ادھر کچھ عرصے سے ٹانگوں سے بھی بالکل معذور ہو گئے، لیکن معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ملاقات اور عیادت کرنے والے دوستوں سے کہتے کہ اس حال میں بھی اپنے اللہ سے بالکل راضی ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرا اللہ بھی مجھ سے

(۱) صوفی صاحب کے والد ماجد مرحوم پہلے حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ ان کے وصال کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے قیام کانپور کے زمانہ میں بیعت ہوئے تھے۔ صوفی صاحب بیان فرماتے تھے کہ میرے والد ماجد صاحب سب سے پہلے وہ شخص تھے جن کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمایا۔

راضی ہوگا۔ خود بھی مغفرت کی دعا بہت زیادہ کرتے اور دوسروں سے بھی کہتے۔ اسی حال میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور اپنے خاص کرم سے درجے بلند فرمائے۔ پس اندگان کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق اور صبر و اجر عطا فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کی توفیق دے۔

راقم سطور کو اپنی اس تفصیر اور کوتاہی کا بڑا قلق ہے اور رہے گا کہ لٹاؤ اگرچہ لکھنؤ سے دور نہیں ہے، ۴۰ میل سے بھی کم مسافت ہے اس کے باوجود حضرت صوفی صاحب کی زندگی کے آخری مہینوں میں ان کی زیارت و عیادت کے لئے جانا نہیں نصیب ہوا۔ اگرچہ ان مہینوں کا کوئی ہفتہ غالباً ایسا نہیں گزرا جس میں اٹاؤ جانے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ لیکن مشاغل و مصروفیات کی وجہ سے ہمیشہ اگلے ہفتہ کے لئے ملتوی ہوتا رہا، یہاں تک کہ صوفی صاحب کے لئے وہ وقت آگیا جو ہر ایک کے لئے مقدر ہے، میں اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کر سکا کہ میری تفصیر کی وجہ سے یہ محرومی اور حسرت میرے لئے مقدر کی گئی تھی۔

زندگی میں بھی ایک دو دفعہ حضرت صوفی صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر تمہاری زندگی میں میرا وقت آجائے اور تمہارے لئے ممکن ہو تو تم مجھے غسل دینا اور نماز جنازہ پڑھانا (بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے ”وصیت نامہ“ میں یہ تحریر بھی فرمادیا تھا) اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میرا معمول بھی ہے کہ اموات کو غسل دینے کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں، خاص کر اللہ والوں کو غسل دینے کی مجھے حرص ہے، لیکن اس بارہ میں بھی میری محرومی مقدر تھی، اگرچہ حضرت صوفی صاحب نے اہتمام سے وصیت فرمائی تھی کہ جب اُن کا انتقال ہو تو مجھے ٹیلیفون سے اطلاع دی جائے، تاکہ میں غسل دینے کے لئے بروقت پہنچ سکوں مگر اُن کے صاحبزادے عزیزی صدیق سلمہ کے اس وقت موجود نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بروقت اطلاع نہیں دی جاسکی اور میں غسل کی سعادت سے محروم رہا، لیکن نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت نصیب ہوگئی۔ ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔

حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

[اوپر جن حضرات کا تذکرہ گزرا وہ سب، اپنے اپنے درجہ میں، وہ تھے جن سے بہت قریبی تعلقات کا معاملہ رہا تھا، حضرت مولانا سجادؒ اس زمرہ کی شخصیت تونہ تھے لیکن جس زمانہ میں حضرت صاحب سوانح جمعیتہ العلماء ہند سے وابستہ رہے تھے اس زمانہ میں جمعیتہ کے پلیٹ فارم پر آن مرحوم سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسے تاثر اور ذہنی قربت کا باعث ہوا تھا کہ آپ کے انتقال کی خبر ملنے پر اپنے تاثر کا جو حال حضرت والا نے ذیل کی تحریر میں بیان فرمایا ہے وہ آپ کی زندگی کا شاید اکیلا واقعہ تھا۔ تحریر کا عنوان تھا:

”دواؤ انسو“

حضرت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

حضرت مولانا صوبہ بہار کے علماء کرام میں سے ایک نامور ہستی رہے تھے۔ آپ کے انتقال (۱۹۳۰ء) پر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسی مسلم شخصیت کے قلم سے جو تحریر آپ کے بارہ میں نکلی اس میں اس موت کے حادثہ کو اس غیر معمولی حادثہ موت سے تعبیر فرما کر ”جس کی خبر سن کر زبان بند ہو جاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں۔“ لکھا تھا کہ ”عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہے کہ میرا قلم جو احباب کی سوگواری میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ہے، اس دفعہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہوا ہے۔ مگر کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ لگ گئی ہے۔۔۔۔۔“ (حیات سجاد۔ شائع کردہ امارت شرعیہ بہار واڈیسہ)

یہ امارت شرعیہ بہار واڈیسہ آپ ہی کے دینی و ملی فکر کا ثمرہ تھا۔ آپ کی کوشش تو پورے ملک کے پیمانہ پر امارت شرعیہ کے قیام کی تھی۔ مگر وقت کے رکاوٹوں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا تو اپنے صوبہ بہار میں آپ نے اسے بہر حال انجام تک پہنچا کر چھوڑا۔ یہ ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء کی بات ہے، اور بعد میں اس کا دائرہ صوبہ واڈیسہ تک وسیع ہو گیا۔ مولانا نے سب کچھ کیا، لیکن خود امیر نہیں بلکہ نائب امیر رہے۔

ملت کی ایسی خالص دینی خدمات میں انہماک کے ساتھ سیاسی خدمات میں بھی قدم پوری طرح سرگرم رہا اور یہ سرگرمی ثابت کر گئی کہ اللہ نے ایک بور یہ نشین اور درویش مفت کو اس میدان میں بھی کس اہلیت اور قابلیت کے جوہر سے نوازا ہے۔ اپنے صوبہ میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی قائم کر کے ایکشن لڑا اور حکومت بنائی۔ (تفصیل کا یہ موقع نہیں اس کے لئے ”حیات سجاد“ دیکھئے) آپ جمعیۃ علماء کی بھی ہائی کمان میں ہوتے تھے اور انتقال کے وقت اس کے ناظم اعلیٰ کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس تمہید کے بعد آپ یہ آنسوؤں میں ڈوبی تحریر پڑھئے۔

جب سے حضرت مولانا سجادؒ کی وفات کی خبر ملی ہے، ایک دن بلکہ شاید کسی دن کا پھر بھی ایسا نہ گذرا ہوگا کہ حضرت مرحوم کی یاد نہ آئی ہو، اُن کو یاد کرتا ہوں اور مرحوم اقبال کا یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجھے مرحوم سے ایسی ملاقات کا شرف (جس کو ملاقات کہا جاتا ہے) پہلی بار غالباً ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جمعیۃ علماء نے اپنی راہ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر کانگریس سے الگ کر لی تھی۔ مراد آباد میں جمعیۃ مرکزیہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا، اس سے فارغ ہو کر میں اپنے اس وقت کے اقامتی وطن امردہ کے لئے مراد آباد سے دہلی کی ٹرین میں سوار ہوا۔ اسی گاڑی سے حضرت مفتی (کفایت اللہ) صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا محمد سجاد مرحوم دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ مراد آباد سے امردہ تک راستہ تقریباً صرف ایک گھنٹہ کا ہے، اتنے ہی وقت میں وقتی مسائل کے متعلق گفتگو رہی، جس میں زیادہ تر حصہ مولانا سجاد مرحوم ہی کے افادات کا تھا، اس سے میں نے پہلی بار یہ اندازہ کیا کہ یہ شخص اپنی شان کا نرالا ”عالم“ ہے۔

اسی دن میرے قلب پر اُن کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا، اور میں اُن کو دورِ حاضر میں کم از کم طبقہ علماء میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھنے لگا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ پھر اُس کے بعد سے آج تک اس باب میں حلقہ علماء میں سے کسی کی بھی عظمت و جلالت کا اس درجہ قائل نہیں ہوسکا۔ پھر اس پہلی صحبت کے بعد کی ہر صحبت اور ملاقات ان کی عظمت کے اس احساس میں اضافہ ہی کرتی رہی۔ مجھے مرحوم کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ پارٹی فیلنگ اور جماعتی مسلک سے بالاتر ہو کر وہ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے، پہلے کوئی رائے قائم کر کے یا کسی جماعت کے فیصلہ کو سامنے رکھ کر خواجہ اس کی تائید میں مواد فراہم کرنے کے وہ عادی نہ تھے۔ بلکہ پہلے ملتی ضروریات اور واقعات و حالات پر غور کرتے اور تہ میں ڈوب کر غور کرتے اور پھر

جس نتیجہ پر پہونچتے اسی کو مسلک بنانے اور اپنے رفقاء سے منوانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں بھی بس اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی ضروریات ہی آپ کی غور و فکر کا مرکز اور محور تھے۔

آپ کے قلم سے نکلی ہوئی چند متفرق چیزیں اب بھی لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ مثلاً جمعیت علماء کے اجلاس منعقدہ مراد آباد ۱۹۲۵ء کا خطبہ صدارت، مسلم انڈینڈنٹ کانفرنس کا خطبہ صدارت، کچھ ”نقیب“ میں شائع شدہ متفرق مقالات، نظارت امور شریعہ کی مختصر اسکیم اور مسلم انڈینڈنٹ پارٹی کی وہ مفصل تجویز جو مسلم آزاد کانفرنس کے اجلاس دہلی منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء کے لئے مولانا مرحوم ہی نے مرتب کی تھی۔ ان ہی چیزوں سے سیاسی دور بینی اور ہندوستانی مسلمانوں کے اصل مسئلہ کی گرفت اور اس کے ممکن العمل اور متوقع الحصول صحیح حل کے دریافت میں دوسرے حضرات پر آپ کی سادہ سادگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس تجربہ بالا احزاب کے زمانے میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی جو رشتے مثلاً ہم استاذی، ہم شینی یا کسی ایک خاص سلسلہ میں انسلک وغیرہ وغیرہ جو عموماً اتحاد و ارتباط میں موثر سمجھے جاتے ہیں، مجھے حضرت ممدوح سے کوئی ایک بھی ان میں سے حاصل نہ تھا، لیکن اُن کے اخلاص، ورع و تقویٰ، دین کی بے لوث فدایت اور سب سے زیادہ سیاسیات میں ان کے پختہ اسلامی انداز فکر نے مجھے ان سے اس قدر وابستہ کر دیا تھا کہ اپنے جن بزرگوں سے مجھے اس قسم کی نسبتیں حاصل ہیں ان کے ساتھ بھی مجھے اس سے زیادہ وابستگی نہیں۔

کوئی چھپی حقیقت نہیں اور کم از کم جمعیت علماء سے تعلق رکھنے والوں میں تو سب ہی کو معلوم ہو گا کہ کانگریس کے فٹری قبول کر لینے کے بعد سے راقم الحروف کی ذاتی رائے شرکت کانگریس کے مسئلہ میں جماعت کے عام رجحان کے خلاف رہی۔ اسی زمانہ میں حضرت مرحوم نے جو اس وقت اس مسئلہ میں بہ نسبت دوسرے اکابر کے مجھ سے قریب الخیال تھے، منظم شرکت کی ایک خاص شکل تجویز فرمائی۔ فی الحقیقت شرکت کا یہ صحیح راستہ تھا اور اس نظام کے ماتحت جو شرکت ہوتی وہ یقیناً بہت وزن دار ہوتی۔ مولانا مرحوم نے وہ اسکیم مطالعہ کے لئے مجھے بھی عطا فرمائی۔ میں نے دیکھ کر عرض کیا کہ اگر آپ اس کو جماعت سے منوالیں تو میں اس اصول پر شرکت کا سب سے بڑا حامی ہوں، اور اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے چھ مہینے کے لئے اپنی خدمات بھی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن بد قسمتی کہ اس وقت غالباً ہمارے تیز رو طبقہ کے اس سے متفق نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسکیم بس یوں ہی رہ گئی اور بعد میں حالات بھی اس کے لئے سازگار نہیں رہے۔

(۱) غالباً یہ وہی اسکیم ہے جس کو لے کر صاحب سوانح حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب کا حصہ دوم۔ عتیق

۱۹۳۷ء سے آخر ۱۹۳۹ء تک اسلامی ہند کی سیاست میں جو بحرانی دور گزرا جس میں ہر خیال کے کارکنوں کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا اس وقت جو چیدہ چیدہ حضرات اس رد میں پہنچے سے محفوظ رہے ان میں ایک ممتاز ہستی حضرت مولانا مرحوم کی تھی، میں اس دور میں ان کے خیالات سے اگرچہ کلیہً یعنی سو فی صدی تو متفق نہ تھا بلکہ صرف قریب تر تھا، لیکن اگر کسی کی رائے کو اپنے شرح صدر کے بغیر ماننا ہوتا ہے تو حضرت مرحوم کی رائے کو یقیناً میں اس کا مستحق سمجھتا تھا۔

میں عرض کر چکا کہ ہر معاملے میں دینی مصلحت کو وہ ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، اس لئے اس بارے میں ان سے چوک اور غفلت نہیں ہوتی تھی۔ کانگریس سے اشتراک کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ میں بہار کی کانگریسی حکومت کے غلط اور مسلمانوں کے لئے دینی حیثیت سے سخت مضرت رساں رویہ کی مصلحانہ مخالفت انھوں نے جس ایمانی شان کے ساتھ کی اور پھر جس طرح وزارت کو اپنے رویہ کی تبدیلی پر مجبور کیا، یہ صرف ان ہی کی بے لاگ عزیمت اور دانشمندی کا کرشمہ تھا۔ اخبار میں طبقہ کو یاد ہوگا، اسی ۱۹۴۰ء کے شروع مہینوں میں واحد قومیت کے مسئلے پر گاندھی جی نے اپنے اخبار ”ہریجن“ میں مسلسل مضامین لکھنے شروع کیے اور ان میں ایک قوم کے نظریے کو ایسے انداز میں انھوں نے پیش کیا جس کو اسلام کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ اگر مسلمان اس کو قبول کر لیں تو یقیناً ان کو دین کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ کانگریس سے تعلق رکھنے والے ذمہ دار حضرات میں حضرت مولانا مرحوم ہی نے سب سے پہلے پوری تفصیل کے ساتھ گاندھی جی کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ واحد قومیت کا جو تصور آپ رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہونے کے علاوہ واقعات کے لحاظ سے بھی محض غلط ہے اور ایسی متحدہ قومیت کا کوئی تصور اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی ہے، بلکہ گاندھی جی یا ان کے چیلوں کا اس غلط اور مفروضہ پر اصرار ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو بجائے آسان کرنے کے اور زیادہ مشکل کر دے گا۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ گاندھی جی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام میں ”اہلسا“ کا تصور ہے تو اپنے حلقہ میں مولانا ہی نے پوری جرأت و عزیمت کے ساتھ سب سے پہلے خلاف قلم اٹھایا اور بتلایا کہ شریعت حیثیت سے بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود گاندھی جی کی معلومات اسلام کے بارے میں ایک طفل کتب سے زیادہ نہیں ہیں۔

غرض مولانا نے اپنے سیاسی انہماک کے باوجود اپنی ایمانی ذمہ داریوں سے کسی وقت بھی غافل نہیں

ہوتے تھے اور جب کوئی چیز اسلام یا مسلمانوں کے مذہبی مفاد کے خلاف سامنے آتی تھی تو اپنی جماعت میں سب سے پہلے اکثر انہی کا قلم حرکت میں آتا تھا، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کی خاص بصیرت بھی عطا فرمائی تھی اس لئے معاملہ کے مخفی سے مخفی گوشوں کو بھی وہ دیکھ لیتے تھے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ لکھنؤ میں مرح صاحبہ ایجنسی ٹینشن جاری تھا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ اور مولانا مرحوم اس کی قیادت فرما رہے تھے، جمعہ کا دن تھا جس دن کہ قانون امتناع مرح صاحبہ کی خلاف ورزی کر کے اجتماعی سول نافرمانی کی جاتی تھی۔ ٹیلہ والی مسجد اس جنگ کا محاذ تھا، نماز جمعہ کے بعد وہیں پر جلسہ ہوتا تھا، اس کے بعد سول نافرمانی کی جاتی تھی، مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی بڑا مجمع ہو جاتا تھا اور ان کے لئے قاتوں کے ذریعہ پردہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشین عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط ایک بچہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے پاس پہنچا۔ اس میں ایک عورت نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ ایجنسی ٹینشن میں عملی حصہ لینے کا موقع مجھ کو اور میری بہنوں کو بھی دیا جائے، اس کے لئے اس خط میں صحابیات کی شرکت غزوات کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ نے جو اس دن جلسہ کے صدر تھے راقم الحروف سے فرمایا کہ لاؤ ڈاؤ اسٹیکر کے پاس جا کر تم اس خط کا میری طرف سے زبانی جواب دے دو اور ان بہنوں کو بتلا دو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے یہ گوارہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس راہ میں کوئی تکلیف اٹھائیں۔ میں چلنے لگا تو حضرت امیر صاحب (حضرت مولانا مراد ہیں۔ ع) مرحوم نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ ”حرب سلمیٰ“ (یعنی آئینی جنگ یا سول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جدا گانہ ہیں۔ تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورت کے لئے بھی شرکت کا موقع ہو جاتا ہے، مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرایا جائے اس میں شرکت کا عورتوں کے لئے کوئی موقع نہیں ہوتا، بلکہ شرعاً ان کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کر کے قید میں جائیں، لہذا ان بہنوں کا جذبہ قربانی تو قابل قدر ہے لیکن سول نافرمانی میں عملی شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال دیں کہ ان کے حق میں وہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کا باعث ہے۔

یہی حضرت مرحوم کی وہ خصوصیات تھیں جنہوں نے مجھے ان کا فریفتہ کر دیا تھا۔ واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام کرنے والے نوجوان علماء کے لئے تو فرض قرار دیتا کہ وہ پہلے کچھ دنوں حضرت مرحوم کی زیر نگرانی ٹریننگ حاصل کریں۔

حضرت مرحوم سے میری آخری ملاقات گذشتہ جولائی کے اواخر میں دہلی میں ہوئی، دوران گفتگو میں میں نے مختلف سیاسی کانفرنسوں میں دیکھی ہوئی بعض سخت درجہ کی شرعی بے عنوانیوں کا ذکر کر کے عرض کیا کہ اس قسم کی سیاسی مجالس میں بعض اوقات بڑی کھلی ہوئی اور خدا کو انتہائی ناراض کرنے والی منکرات بھی دیکھی جاتی ہیں، اُن کا بقدر استطاعت انسداد اور کم از کم نکیر تو نہایت ہی ضروری ہے، لیکن ہم لوگ اس میں اکثر کمزوری دکھاتے ہیں اور بے دینوں کے تنگ خیالی کے طعنہ سے ڈر کر خاموش رہتے ہیں، حالانکہ اس سے ایک بڑا ضرر یہ پہونچ رہا ہے کہ عوام ہم لوگوں کو ہی ایسے منکرات میں شریک سمجھتے ہیں، پھر یا تو دین کے معاملہ میں وہ ہم کو متہم اور ناقابل اعتماد سمجھنے لگتے ہیں اور یا ان کے دلوں سے ان منکرات کی برائی کا احساس زائل ہو جاتا ہے۔

فرمایا: ”میں تو اس بارے میں ادنیٰ رواداری کو مدامت سمجھتا ہوں۔“ پھر ایک سیاسی کانفرنس کا حوالہ دے کر (جو چند ہی روز پہلے دہلی میں ہو چکی تھی) فرمایا کہ اس میں ایک واقعہ اس قسم کا پیش آیا، ہم نے خاموشی جائز نہ سمجھی اور فوراً کہہ دیا کہ یہ چیز غلط اور معصیت ہے، پھر یک لخت آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے اور فرمایا کہ فتنہ والی حد کے عموم و شیوع کی وجہ سے ہماری دینی جس بڑی حد تک مآؤف ہو چکی ہے اور مجھے تو بسا اوقات شبہ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں ایمان کا ادنیٰ درجہ بھی ہے یا نہیں؟ حدیث میں فرمایا گیا کہ ہاتھ یا زبان سے برائی کو روکنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں اس سے قلب میں نفرت اور عند الاستطاعت اس کے خلاف عملی یا قوی جہاد کی نیت ہر مسلمان کا فرض ہے اور یہ ایمان کا ایک ادنیٰ درجہ ہے جس کے بعد کوئی اور درجہ ہی نہیں۔ (ولیس وراء ذلک مثقال حبة خردلة من ایمان أو كما قال عليه الصلوة والسلام) اور ہم ملاحظہ اور فساق بلکہ کھلے کفار و مشرکین کو علانیہ فتنہ والی اور کفر و شرک کرتے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ہمارے قلب میں بھی اس کے خلاف غیظ و غضب پیدا نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے اس ادنیٰ اور آخری درجے سے بھی اس وقت شاید ہم خالی ہوتے ہیں۔“

در حقیقت اپنے ایمان پر خوف و خشیت ہی ”روح ایمان“ ہے اور یہی وہ تقویٰ ہے جس کو ابن ابی ملیکہؒ نے صحابہ کرامؓ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

(فی البخاری تعلیقاً) قال ابن ابی ملیکہ لقیث ثلثین من اصحاب النبی

صلی اللہ علیہ وسلم کلہم یخشی علی نفسه النفاق۔

(ابن ابی ملیکہ تابعیؒ نے فرمایا کہ میں نے تیس اصحاب بنی (علیہ السلام) کو پایا ہے، وہ سب یہ جملہ

کے سب اپنے بازے میں نفاق کے اندیشہ سے خائف رہتے تھے۔ ع)

یہ تو تھے حضرت مرحوم کے متعلق میرے تاثرات اور منتشر معلومات۔ اب مجھے دو کلمے حضرت مرحوم کے اُن احباب و رفقاء اور ان کے عقیدت کیش و نیاز مندوں سے بھی عرض کرنے ہیں جو ان کی وفات سے غم زدہ اور اس حادثہ سے سوگوار ہیں۔

میرے بزرگوار میرے بھائیو!! دنیا میں یہ دن تو کبھی کے لئے آتا ہے، جو یہاں آتا ہے اس کے لئے یہاں سے چلا جانا بھی مقرر ہے، تاہم حضرت مولانا کی جدائی کا رنج ضرور ہے اور وہ برحق ہے اور خود میں تو اس کو اس درجہ محسوس کرتا ہوں کہ۔

آنچہ از من گم شدہ گراز سلیمان گم شدہ
ہم سلیمان ہم پری ہم اہرمن نگر پیسے

لیکن کفرانِ نعمت ہوگا اگر اس کا احساس نہ کیا جائے کہ جانے والے نے آپ کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے، ان کے پچاننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ ”ملتِ اسلامیہ ہندیہ“ کے دو مسئلے اس آخری زمانے میں بلکہ ان کی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے اور خدا کی قسم اگر قدرت کی طرف سے آج بھی ان کو بولنے اور اپنی آواز ہم تک پہنچانے کا موقع مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ قبر میں سے پکار کے ان ہی دو چیزوں کے متعلق عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو وصیت فرمائیں گے۔ ایک۔ قیامِ نظامِ امارت اور نصبِ امیر فی الہند۔ دوسرے۔ کم از کم مسلمانوں کی حد

تک ”نظامِ شرعی“ کو اپنی پوری وسعت کے ساتھ ہندوستان میں مستقل آئینی حیثیت حاصل ہو جانا۔

ان دونوں کاموں کے متعلق حضرت مرحوم نے روشنی حاصل کرنے والوں کے لئے کافی سامان چھوڑا ہے۔ اب حضرت مرحوم کے ساتھ عقیدت و نیاز مندی کا جن کو تعلق ہے یا کم از کم ان دونوں مسئلوں میں وہ حضرت مرحوم کے نقطہ نظر سے متفق ہیں، ان کا فرض ہے کہ ان دونوں کی تکمیل کی طرف وہ بیش از بیش توجہ کریں اور مرحوم کے نامکمل کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں، یہ چیز حضرت مرحوم کی روح پاک کو یہاں کی فکروں سے مطمئن اور متوسلین کی طرف سے خوش کر سکتی ہے۔

آخر میں تعزیت مسنونہ اور دعائے رحمت پر اختتام کرتا ہوں۔ اِنْ فِی اللّٰہِ عِزَّاءٌ مِنْ کُلِّ مِصِیْبَةٍ وَدَر کَأَمِنْ کُلِّ فَاثِتٍ فِی اللّٰہِ فَتَقْوَا وَاِیَّاهُ فَارْجِعُوْا اِنَّمَا الْمَصَابِ مِنْ حَرَمِ الثَّوَابِ، اللّٰہُمَّ اغْفِرْ لَہُ وَارْحَمْہُ اجْعَلِ الْجَنَّةَ الْخُلْدَ مَثْوًۢا ہرِ حَمَّتْکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

حضرت علیؓ فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی ہے کہ وہ میری امت میں
 سے ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے جو میری امت کے لیے رہنما بن سکیں۔
 میں نے دعا کی ہے کہ وہ میری امت میں سے ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے جو میری امت کے لیے رہنما بن سکیں۔
 میں نے دعا کی ہے کہ وہ میری امت میں سے ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے جو میری امت کے لیے رہنما بن سکیں۔
بندگانِ حق کی یافت
 میں نے دعا کی ہے کہ وہ میری امت میں سے ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے جو میری امت کے لیے رہنما بن سکیں۔
 میں نے دعا کی ہے کہ وہ میری امت میں سے ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے جو میری امت کے لیے رہنما بن سکیں۔

[یہ حصہ خود حضرت صاحب سوانح کے قلم سے، الفرقان میں نکلے ہوئے
 ۱۴ مضامین پر مشتمل ہے، اور، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ اللہ کے اُن
 بندگان خاص کے مناقب و اوصاف کے بیان میں ہے جن سے ربط و استفادہ کا
 یا کم سے کم زیارت کا موقع آپ کو حاصل ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آپ کی نظر میں
 ”حاصل زندگی“ تھا، کہ اِن خاصانِ خدا کی بارگاہ میں نہ صرف حاضری،
 نہ صرف استفادہ بلکہ نگاہِ کرم و التفات کی عزت بھی میسر آئی۔

کس کو پایا ؟ کیا پایا ؟

- ۱۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۳
- ۲۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۷
- ۳۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ۵۱۰
- ۴۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ ۵۱۵
- ۵۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ ۵۴۵
- ۶۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ ۵۶۵
- ۷۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ ۵۷۷
- ۸۔ حاجی عبدالرحمن صاحب نو مسلم رحمۃ اللہ علیہ ۵۸۵
- ۹۔ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ ۵۹۱
- ۱۰۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۵۹۷
- ۱۱۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمۃ والرضوان ۶۱۱
- ۱۲۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ ۶۲۱
- ۱۳۔ حضرت حاجی عبدالغفور جودھیوری رحمۃ اللہ علیہ ۶۳۹
- ۱۴۔ حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ ۶۵۶

؟ ۱۰۰

| | | |
|------|------|------|
| ۱-۱ | ۱-۱ | ۱-۱ |
| ۱-۲ | ۱-۲ | ۱-۲ |
| ۱-۳ | ۱-۳ | ۱-۳ |
| ۱-۴ | ۱-۴ | ۱-۴ |
| ۱-۵ | ۱-۵ | ۱-۵ |
| ۱-۶ | ۱-۶ | ۱-۶ |
| ۱-۷ | ۱-۷ | ۱-۷ |
| ۱-۸ | ۱-۸ | ۱-۸ |
| ۱-۹ | ۱-۹ | ۱-۹ |
| ۱-۱۰ | ۱-۱۰ | ۱-۱۰ |
| ۱-۱۱ | ۱-۱۱ | ۱-۱۱ |
| ۱-۱۲ | ۱-۱۲ | ۱-۱۲ |
| ۱-۱۳ | ۱-۱۳ | ۱-۱۳ |
| ۱-۱۴ | ۱-۱۴ | ۱-۱۴ |
| ۱-۱۵ | ۱-۱۵ | ۱-۱۵ |
| ۱-۱۶ | ۱-۱۶ | ۱-۱۶ |
| ۱-۱۷ | ۱-۱۷ | ۱-۱۷ |
| ۱-۱۸ | ۱-۱۸ | ۱-۱۸ |
| ۱-۱۹ | ۱-۱۹ | ۱-۱۹ |
| ۱-۲۰ | ۱-۲۰ | ۱-۲۰ |

شیخ الہند

حضرت مولانا محمود حسنؒ کی زیارت

ایک طالب علم کی حیثیت سے میں دارالعلوم دیوبند میں شوال ۱۳۳۳ھ میں داخل ہوا تھا جب کہ حضرت شیخ الہندؒ کا وصال اس سے ۴-۵ سال پہلے اوائل ۱۳۳۹ھ میں ہو چکا تھا۔ مالٹا کی اسارت سے واپس آ کر آپ صرف ۵-۶ مہینے حیات رہے تھے۔ میں اُن دنوں اپنے وطن سنہیل میں صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا، اس لئے اُس وقت میرے دیوبند جانے اور حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کر سکنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا لیکن یہ سعادت میرے لئے مقدر تھی، الحمد للہ حاصل ہوئی اور عجیب طریقہ سے حاصل ہوئی۔ اِن رَہِی لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَاءُ ط

مالٹا سے حضرت کی واپسی رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کے اواخر میں ہوئی تھی۔ ٹھیک ان ہی دنوں میں میرے بارے میں فیصلہ ہوا کہ آگے کی تعلیم کے لئے مجھے حضرت مولانا کریم بخش صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے سپرد کر دیا جائے، وہ اس زمانہ میں دہلی کے ”مدرسہ عبدالرب“ میں مدرس تھے اور رمضان مبارک کی تعطیل میں حسب معمول وطن تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا سے ہم وطنی کے علاوہ قریبی رشتہ داری کا بھی تعلق تھا، ان سے جب میرے بارے میں عرض کیا گیا تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنا منظور فرمایا اور بتلایا کہ شوال کی فلاں تاریخ کو میں دہلی کے لیے روانہ ہونے والا ہوں۔ حضرت مولانا کے ساتھ میرا جانا بھی طے ہو گیا۔

غالباً شوال کے پہلے ہفتہ کی کوئی تاریخ تھی۔ مولانا سنبھل سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے، میں بھی ساتھ تھا، مولانا کے دو بڑے صاحبزادے بھی ساتھ تھے، ایک مولانا عبدالحق صاحب مرحوم جو اس وقت سیالکوٹ کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے، دوسرے ان سے چھوٹے مولانا ضیاء الحق صاحب مرحوم جو اس وقت کی ریاست جودھپور کے ایک قصبہ پیپڑ میں مدرس تھے، ان دونوں حضرات کو اپنے مقام پر جانا تھا۔ سنبھل سے روانہ ہو کر ہم سب مراد آباد پہنچے، مجھے یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اور دونوں صاحبزادوں کے سفر کا پروگرام یہ ہے کہ پہلے اپنے استاذ و مخدوم حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لیے دیوبند جائیں گے پھر وہاں سے اپنی اپنی منزلوں کے لیے روانہ ہوں گے (جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے حضرت شیخ الہند بس ہفتہ عشرہ پہلے ہی مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لائے تھے) مجھے جب سفر کا یہ پروگرام معلوم ہوا تو بیحد خوشی ہوئی کہ حضرت شیخ الہند کی زیارت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوگی، اُن دنوں ہر طرف حضرت کا ایسا چرچا تھا گویا کہ وہ ہندوستان کے ”امام المسلمین“ ہیں۔

ہم سب عصر کے قریب مراد آباد پہنچے تھے، وہاں سے دیوبند کے لیے ٹرین رات کو جانے والی تھی، مراد آباد کے ”اسلامیہ مسافر خانہ“ میں قیام کیا جو ریلوے اسٹیشن کے بالکل متصل اور سامنے تھا۔ اب تو ماشاء اللہ اس کی عالیشان دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارت ہے، اُس وقت کچی خستہ سی عمارت تھی۔ چھوٹے چھوٹے پرانے حجرے تھے یا کہنے کو کٹھریاں تھیں جن کے آگے کھریل کا سائبان تھا، مگر اچھی طرح یاد ہے کہ مسافر خانہ سے تعلق رکھنے والے چھوٹے بڑے سب ملازمین میں گہری دینداری تھی اور خدمت کا جذبہ تھا۔ ایک درجہ میں خانقاہ کی سی فضا تھی۔ یہ میرے لیے عمر کا سب سے پہلا سفر تھا، اس سے پہلے کبھی مراد آباد بھی آنا نہیں ہوا تھا، کسی مسافر خانہ کو دیکھنے اور اس میں ٹھہرنے کا بھی پہلا ہی موقع تھا۔ اتنا یاد ہے کہ یہاں کے آدمیوں کو اور اُن کی دینداری اور خدمت گزاری کو دیکھ کر کم عمری کے باوجود بڑا خوش ہوا تھا۔ اُس وقت کے اُس خستہ اور پرانی کچی عمارت اور کھریل والے مسافر خانہ کی نورانی فضا اور بیچارے غریب دربان اور محرر صاحب کی مولویانہ صورت، نیک سیرت اور خوش اخلاقی، ۵۵ سال گزر جانے پر آج بھی حافظہ میں پوری طرح محفوظ ہے۔

مسافر خانہ کی جدید پختہ عمارت بننے کا فیصلہ اُس وقت ہو چکا تھا، صدر دروازہ پر لوہے کا قد آدم سیاح بورڈ لگا ہوا تھا، جس میں اُن چند حضرات کے نام تھے جنہوں نے جدید عمارت کے لیے رقم دی تھیں، ان میں سب سے اوپر بہت جلی قلم سے ”حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی“ کا نام نامی ان ہی الفاظ میں تھا، اور چندہ کی رقم جہاں تک یاد ہے ۲۵ روپے لکھی تھی۔ یہ بھی اس وقت معلوم ہوا

مسند درس پر جب بٹھا دیا جاتا تو بالکل تندرستوں کی طرح پڑھاتے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے اس سفر کے پروگرام میں ایک دن دہلی کا قیام ان ہی کی زیارت و ملاقات کے لیے رکھا تھا۔

مدرسہ عبدالبرب میں ہمارے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد حضرت شیخ الہند مع اپنے رفقاء کے تشریف لے آئے اور اس طرح راقم سطور کو بھی نعمت غیر مترقبہ کے طور پر زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔

اُس وقت تو عمر اور علم و شعور کی کمی کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ اس شرف و سعادت کی قدر و قیمت سمجھتا، اس کے باوجود یاد ہے کہ صرف زیارت اور دیدار ہی سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا کچھ شعور بخشا تو جانا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی کچی تڑپ رکھنے والے اور اس کی رضا طلبی کی راہ میں اعداء اللہ اور اعداء اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانے والے اور اُس کی یاد اور چاہ میں اپنی ہڈیاں تک پگھلا دینے والے اس بندہ کی صرف زیارت ہی اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ خاصانِ خدا کو عقیدت اور محبت کے ساتھ صرف دیکھنے سے بھی اُن کے ساتھ ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے، اسی لئے جس کسی نے کسی صحابی کی صرف زیارت کی اُس کو ”تابعین“ میں اور جس نے کسی تابعی کی زیارت کی اس کو ”اتباع تابعین“ میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ مقبولین بارگاہِ خداوندی کی صرف خواب میں زیارت بھی بڑی سعادت اور خوش بختی ہے اور کبھی کبھی اُس کے بڑے غیر معمولی آثار و برکات ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کیا تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کن کمالات سے نوازا تھا اس کے جاننے کے لیے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ”نقش حیات“ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ منصب اور عہدہ کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے مفتی اکبر (مکویا بعد کی اصطلاح میں صدر مفتی) تھے، تفسیر یا حدیث کا کوئی سبق بھی پڑھا دیتے تھے، اسی کے ساتھ وہ نقش بندی مہمدی طریقت کے صاحب ارشاد شیخ بھی تھے، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت امولانا شاہ رفیع الدین دیوبندی علیہ الرحمۃ کی رہنمائی اور تربیت میں راہ سلوک طے کی تھی اور ان ہی کے مجاز تھے۔ وہ دارالعلوم کے اُس وقت کے اکابر و اساتذہ میں سب سے بڑے بلکہ منتخب کے بڑے تھے اور سب ہی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب میں جو کمال بہت ہی نمایاں تھا جس کو ہم جیسے صرف ظاہری آنکھیں رکھنے والے بھی دیکھتے رہتے، وہ ان کی انتہائی بے نفسی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کے اس بندہ کے اندر وہ چیز ہے ہی نہیں جس کا نام نفس ہے۔ یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ گھروں کے جو کام نوکروں اور نوکرانیوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، حضرت مفتی صاحب عند الضرورت وہ سب کام (جیسے گھر میں جھاڑو دینا، برتنوں کا دھونا، نمنا وغیرہ) یہ سب بے تکلف بلکہ بشاشت اور خوشی کے ساتھ کر لیتے ہیں، آس پڑوس کے غریب گھرانوں کا پیسے پیسے دو دو پیسے کا سودا بھی خرید کے بازار سے لا دیتے ہیں، دوسروں کے پھٹے ٹوٹے جوتے لے جا کر ان کی مرمت کر لاتے ہیں۔ راقم سطور شہادت دے سکتا ہے کہ بے نفسی کا ایسا دوسرا نمونہ اس عاجز نے نہیں دیکھا۔

دارالعلوم کے اُس وقت کے اکابر و اساتذہ میں ایک امتیازی فضیلت حضرت مفتی صاحب کی یہ بھی تھی کہ ان کی سند سب سے عالی تھی، اُن کو صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث کی اجازت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حاصل تھی اور وہ حدیث میں براہ راست حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اگرچہ مشہور یہ بھی ہے کہ حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور اُن سے بھی اجازت تھی، لیکن راقم سطور نے اس بارے میں حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا تو حضرت نے بتلایا کہ حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بیان فرمایا تھا کہ حدیث کی کتابیں میں نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی ہیں اور ان ہی سے مجھے اجازت ہے، ہاں بچپن میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں اور اُن کی مجالس میں حاضر ہوتا تھا، اُس وقت میری عمر بہت کم تھی، چھوٹے بچوں کی طرح میں حضرت شاہ صاحب کے گھر میں بھی آتا جاتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب کے علو سند کے اس امتیاز کی وجہ سے دورہ حدیث کے بہت سے طلبہ اُن سے حدیث کی خصوصی سند اور اجازت بھی لیتے تھے، اس عاجز کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی، رجب ۱۳۴۵ھ میں جب دورہ حدیث کی اکثر کتابیں ختم ہو چکی تھیں یہ ناچیز اور بعض اور رفقاء درس حضرت کی مسجد ہی میں حاضر ہوئے اور اجازت و سند کی درخواست کی، حضرت نے شیوخ حدیث کے طریقہ پر صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، موطا امام مالک، موطا امام محمد، اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے اوائل ہم لوگوں سے سنے اور ان سب کتابوں کی اور ان کے ساتھ حصین کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسی صحبت میں حدیث کسلسل بالاؤلیہ بھی سنائی اور اس کی بھی اجازت دی اگرچہ اس کی اولیت کا تسلسل دوسری صدی ہجری میں ختم ہو چکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم کے اس وقت کے اکابر و اساتذہ میں سب سے زیادہ عقیدت و محبت تو اس عاجز کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھی، اُن کے بعد قلب میں سب سے زیادہ عظمت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔

دارالعلوم کی رسمی طالب علمی کا سلسلہ تو شعبان ۱۳۵۵ھ میں ختم ہو چکا تھا لیکن وہاں آمد و رفت کا سلسلہ

اس کے بعد برابر رہا، کسی نہ کسی تقریب یا بہانہ سے سال میں دو چار دفعہ تو نوبت آ ہی جاتی تھی۔
 ۱۳۴۷ھ کا غالباً کوئی مہینہ تھا، راقم سطور امر وہہ میں مدرس تھا، دیوبند جانے کا کوئی محرک پیش آیا اور میں روانہ ہو گیا، جہاں تک یاد ہے، شام کے وقت یا رات کے ابتدائی حصے میں دارالعلوم پہنچا ہوا، کسی نے بتلایا کہ حضرت مفتی صاحب سخت علیل ہیں، ارادہ کر لیا کہ انشاء اللہ صبح زیارت و عیادت کے لیے حاضر ہوں گا، لیکن اللہ کی مشیت کہ اسی شب میں حضرت کا وصال ہو گیا، بعد نماز فجر غسل دیا گیا اُس وقت یہ عاجز اپنی خوش قسمتی سے حاضر تھا۔ غسل کے وقت اور پھر کفن پہنانے کے وقت قلب کو ایک عجیب سکینت کی کیفیت حاصل تھی جس کا کم از کم اس عاجز کو نہ کبھی اُس سے پہلے تجربہ ہوا تھا نہ اس کے بعد ہوا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن کے پاس کعبہ مکرمہ کے خلاف کے اُستر کا کبھی کار کھا ہوا ایک ٹکڑا تھا قریباً سوا گز لمبا رہا ہو گا وہ کفنی کے بالائی حصہ کے لیے کافی ہو سکتا تھا، یہ دیکھنے میں ایک خستہ پرانا سا کپڑا تھا، کبھی اس کو دھویا بھی نہیں گیا تھا (اور دھونا چاہئے بھی نہیں تھا) اس کو جوڑ کر کفنی بنائی گئی۔ جب غسل کے بعد وہ کفنی پہنائی گئی تو اس بظاہر خستہ پرانی بے ڈھلی فقیرانہ کفنی میں حضرت مفتی صاحب کو دیکھ کر دل پر ایک خاص اثر ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے۔ پھر نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔
 حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم کی درخواست پر دارالعلوم کے استاذ حدیث اور اپنے دور کے مسلم ولی اللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب (عرف حضرت میاں صاحب) نے نماز پڑھائی۔ اس عاجز کو اس کی بڑی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اُس دن دیوبند پہنچا دیا۔
 یقیناً یہ بھی اس بندہ پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا۔ فلہ الحمد ولہ الشکر۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ

راقم سطور شوال ۱۳۴۳ھ میں جب ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی صاحب کو اُس وقت کا غذات میں ”نائب مہتمم دارالعلوم“ دیوبند ہی لکھا جاتا تھا اور ضابطہ میں اُن کا عہدہ اور منصب یہی تھا لیکن فی الحقیقت وہی مہتمم تھے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب جو عہدہ کے لحاظ سے اصل مہتمم تھے، کچھ مدت پہلے سے ”مرحوم ریاست حیدر آباد“ کے ”مفتی عدالت عالیہ“ کا منصب قبول فرما چکے تھے اور اس کی وجہ سے وہیں قیام فرماتے۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ حضرت حافظ صاحب کے حیدر آباد تشریف لے جانے سے پہلے بھی اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب ہی سے رہتا تھا۔ غالباً اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ دونوں حضرات میں ایسا تعلق تھا کہ دوئی کا احساس ہی نہیں تھا۔

ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب مہتمم کہتا اور لکھتا ہوں لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لیے مامور اور مقرر کیا تھا تو مجھے ”نائب مہتمم“ نہیں بلکہ ”مہتمم ثانی“ بنایا تھا۔

بہر حال ہر قسم کی ذمہ داری اور عمل دخل کے لحاظ سے وہی اُس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے اور حق یہ ہے کہ مثالی مہتمم تھے۔ ہر طرف سے یکوہو کر صرف دارالعلوم ہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مصرف اور موضوع بنالیا تھا، اہل و عیال کے جھمیلوں سے بھی اللہ نے آزاد رکھا تھا، بس اپنی اکیلی زندگی تھی، دارالعلوم کا دارالاہتمام (یا دفتر اہتمام) ہی ان کا مسکن تھا، اسی کے ایک کونے میں پلنگ پر اُن کا بستر لگا رہتا تھا۔ دیکھنے میں نہایت ضعیف اور منحنی تھے، معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھی اور سوکھی ہڈیوں کا ایک کشیدہ قامت ڈھانچہ ہے

جس پر کھال منڈھی ہوئی ہے، مگر آنکھوں میں غیر معمولی قسم کی ایک چمک تھی، چلتے پھرتے ہمیشہ تسبیح ہاتھ میں رہتی لب متحرک۔ لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ کی تصویر نظر آتی۔

مشہور تھا کہ غذائے نام ہی ہوتی ہے، بس چائے اور دواؤں پر گزارا ہے۔ سنتے تھے کہ چائے بہت اعلیٰ قسم کی استعمال ہوتی ہے، ذوق نہایت لطیف ہے، دودھ بھی پیالی میں چھلنی سے چھان کر ڈالا جاتا ہے کہ بالائی کا کوئی ریشہ نہ آجائے۔ کیا عجب کہ ذوق کی یہ لطافت اپنے مرشد حضرت گنگوہیؒ کی خدمت کی برکات میں سے ہو۔ میں نے کئی بزرگوں سے یہ واقعہ سنا ہے کہ یہی حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی ایک زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کے ہاں خادمانہ طور پر مقیم تھے، تہجد کے وقت حضرت کے لیے چائے تیار کرنے اور پلانے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی، ایک رات کو چائے تیار کر کے حضرت کو پیش کی۔ حضرت نے چائے پینا شروع کیا اور فرمایا، مولوی حبیب! آج چائے میں کچے پانی کا اثر ہے۔ اگلے دن انھوں نے چائے کے تیار کرنے میں خاص احتیاط کی، کیتلی کو پہلے کھولتے ہوئے پانی سے گرم کیا اس کے بعد اس میں چائے بنائی پھر پیالی تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے پیالی منہ سے لگائی اور فرمایا مولوی حبیب آج بھی کچے پانی کا کچھ اثر ہے، انھیں سخت ندامت ہوئی اور تعجب بھی ہوا۔ اگلی رات کو انھوں نے پھر بہت احتیاط اور اہتمام سے چائے تیار کی اور مزید یہ کیا کہ پیالی کو دھو کر پہلے تولیہ سے خشک کیا، اس کے بعد اس میں چائے بنا کر حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے چائے پی اور فرمایا۔ مولوی حبیب! آج کچے پانی کا وہ اثر نہیں ہے۔

حضرت گنگوہیؒ قدس سرہ کی لطافت مزاج کے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی طرح اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں، تو ممکن ہے کہ چائے کے بارہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے ذوق و مزاج کی لطافت قیام گنگوہ کی برکات میں سے ہو۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ بہت ہی ضعیف اور منحنی تھے، اُن کے دُبلے پتلے اور سوکھے جسم کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ ان کی رگوں میں خون بس برائے نام ہی ہوگا، مگر اس حالت میں بھی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی ضرورت سے دارالافتاء کی طرف سے گزرنا ہوتا حضرت مولانا کو کام ہی میں مصروف و مہمک دیکھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے بڑا ہی حیق دیا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دارالعلوم کے ہر گوشے اور شعبے کی خبر رکھتے تھے، سب بڑوں اور چھوٹوں پر اُن کا غیر معمولی اثر اور بڑا رعب تھا۔ طلبہ کے ساتھ اُن کا رویہ بڑا ہی مشفقانہ تھا، جو طالب علم اپنی کوئی ضرورت لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، پوری توجہ اور ہمدردی سے اس کی بات سنتے اور

چاہے اس بیچارہ کا کام بالکل نہ ہو پاتا لیکن وہ یہی احساس اور تاثر لے کر واپس آتا کہ مجھ پر حضرت مہتمم صاحب کی خاص نظر عنایت ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ خاص کمال حضرت ممدوح کو عطا فرمایا تھا۔ خود اپنا ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دو سال دارالعلوم میں رہا (میرا قیام چند اور طلبہ کے ساتھ دارالعلوم سے باہر مطیع قاسمی کے ایک خستہ سے کمرے میں تھا) میری برابر یہ خواہش اور کوشش رہی کہ دارالعلوم کے احاطہ کے اندر کسی مناسب حجرہ میں قیام کی جگہ مل جائے، کئی دفعہ حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوا۔ خوب یاد ہے جب پہلی دفعہ اس ضرورت سے حاضری ہوئی اور درخواست پیش کی، حضرت ممدوح نے بڑی ہمدردی اور شفقت کا معاملہ فرمایا، درخواست پڑھ کر فوراً اس پر کچھ لکھا اور اپنے پیش کار مولوی عبدالاحد صاحب کو (جو برابر کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے) خود بلند آواز سے پکارا۔ مولوی عبدالاحد فوراً حاضر ہوئے، میری طرف اور میری درخواست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے فرمایا۔

”یہ حجرہ کے لیے مولوی صاحب کی درخواست ہے، اس کو اپنے پاس رکھئے اور جب بھی کوئی مناسب جگہ خالی ہو پہلے مولوی صاحب کو دی جائے۔“ میں مطمئن بلکہ بہت خوش ہو کر واپس آ گیا۔ لیکن جب دو تین مہینہ تک کوئی انتظام نہیں ہوا تو پھر دوسری درخواست لے کر حاضر ہوا۔ حضرت مہتمم صاحب نے پھر ویسی ہی شفقت کا معاملہ فرمایا، پھر اسی طرح پیش کار مولوی عبدالاحد صاحب کو خود ہی پکار کے بلایا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے فرمایا کہ ”بھئی مولوی صاحب کی درخواست پہلے بھی آئی تھی، آپ کے لیے ابھی تک حجرہ کا انتظام نہیں ہو سکا؟“ انھوں نے اپنے خاص انداز میں عرض کیا کہ ”حضرت ابھی تک کوئی اچھی جگہ خالی نہیں ہوئی۔“ حضرت مہتمم صاحب نے پھر فرمایا کہ ”بھئی خیال رکھنا چاہئے اور جب بھی کوئی مناسب جگہ نکلے مولوی صاحب کو پہلے دینا چاہئے۔“ اور میری دوسری درخواست بھی کچھ لکھ کر مولوی عبدالاحد صاحب کے حوالہ کر دی گئی، میں پھر مطمئن ہو کر واپس آ گیا اور میرے دل نے پوری طرح محسوس کیا کہ حضرت مہتمم صاحب کو میرا بڑا خیال ہے اور مجھ پر خاص نظر عنایت ہے اور اب تک مجھے حجرہ نہ مل سکتے کا خود اُن کو بھی رنج اور قلق ہے۔

دارالعلوم کے دو سالہ قیام میں کم از کم ۳-۴ دفعہ اس طرح درخواست لے کر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضری کی نوبت ضرور آئی تھی، اگرچہ نتیجہ یہ رہا کہ اپنے قیام کے آخری دن تک بھی مجھے دارالعلوم کے احاطہ میں جگہ نہیں مل سکی لیکن یہ خیال مجھے کبھی نہ ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب نے بے توجہی برتی، بلکہ میرا تاثر ہر دفعہ یہی رہا کہ ان کو تو میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور بڑی مریبانہ فکر ہے لیکن اتفاق سے کوئی

جگہ ہی نہیں نکل سکی، یا نیچے کے حضرات نے دوسرے لوگوں کو ترجیح دی اور میں محروم رہا۔
بہر حال حضرت مہتمم صاحب کا رویہ اس قدر مشفقانہ تھا کہ اُن کی طرف سے دل میں شکایت کی کبھی
لہر بھی نہیں پیدا ہوئی۔

ایک دفعہ طلبہ میں دارالعلوم کے بعض انتظامی کارکنوں کے کسی نامناسب طرزِ عمل سے براہِ فروختگی پیدا
ہوئی، لیڈرانہ مزاج رکھنے والے کچھ طالب علموں نے اس کو ایک احتجاجی تحریک کی شکل دینے کی کوشش شروع
کی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نے طلبہ کو جمع کر کے خطاب فرمایا۔ ان کی اس تقریر کے یہ الفاظ
اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

”سن لو! تم میرے ہواور میں تمہارا، تم ہی میری اولاد ہو، تمہارے ہی ساتھ جی رہا ہوں،
انشاء اللہ تمہارے ہی درمیان رہتے ہوئے مروں گا، تم ہی میری تجھیز و تکفین کرو گے، تم ہی میری
نماز جنازہ پڑھو گے، تم ہی مجھے دفن کرو گے۔“

اس طرح اپنا کے خطاب کرنے کے بعد تنبیہ بھی خوب فرمائی۔ اُس وقت بالکل ایسا محسوس ہوا کہ
شاید سب کے دلوں کا غسل ہو گیا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کوئی رسمی اور رواجی قسم کے واعظ اور خطیب نہیں تھے لیکن بڑی ٹھوس
دل اور دلنشین تقریر فرماتے تھے۔ میں نے ان سے بہتر کسی سے مسلکِ جماعتِ دیوبند کی ترجمانی نہیں سنی۔
میری طالب علمی کے آخری سال میں پنجاب کے ایک بہت بڑے پیر صاحب جو ایک ایسی درسگاہ
کے صاحبِ سجادہ تھے جس کا حلقہ اثر و عقیدت وہاں کی درسگاہوں اور گدیوں میں غالباً سب سے زیادہ وسیع
ہوگا، دارالعلوم تشریف لائے۔ یہ پیر صاحب پنجاب کے اکثر سجادہ نشینوں کی طرح بے علم نہیں تھے، بلکہ
صاحبِ علم تھے لیکن اندازہ کیا جاتا تھا کہ اگرچہ ان کے دل میں اکابر علماء دیوبند کا احترام ہے اور وہ بریلوی
ذہن کے قطعاً نہیں ہیں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں جماعتِ دیوبند کے بارہ میں اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا
ہیں جن میں ناخدا ترس مخالفین کے پروپیگنڈہ سے بہت سیے ناواقف مخلص حضرات بھی مبتلا ہو جاتے ہیں
— دو تین دن اُن کا قیام دارالعلوم میں رہا، ایک دن غالباً اُن کے بعض رفقاء کی یہ خواہش معلوم ہوئے پر کہ
”وہاں کے حضرات اکابر سے کچھ سننا اور مستفید ہونا چاہتے ہیں، حضرت پیر صاحب کے اعزاز و اکرام میں
دارالعلوم کی طرف سے ایک خاص جلسہ ہوا اس میں حضرت الاستاذ العلامة محمد انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا

سید محمد رفیع حسن صاحب چاند پوری نے بھی خطاب فرمایا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے مدلل انداز میں اور بڑے مؤثر و دلنشین طریقہ پر اپنے اکابر کے مسلک و مشرب کی وضاحت فرمائی۔ جہاں تک یاد رہ گیا ہے اُس کا حاصل اور خلاصہ یہ تھا کہ — ہم اور ہمارے اکابر عقائد اور اصول میں طریقہ اہل السنۃ والجماعۃ کے متبع ہیں اور پوری طرح مطمئن ہیں کہ وہی طریقہ ما انا علیہ و اصحابی کا مصداق ہے۔

فروع میں ہم پوری بصیرت کے ساتھ فقہ حنفی کا اتباع کرتے ہیں اور اتباع ہوئی اور اعجاب کل ذی رأی براہیہ کے اس دور میں عام امت کے دین کی حفاظت کے لیے اور فتنوں سے ان کو بچانے کے لیے ائمہ کی تقلید شخصی کو ہم پورے شرح صدر کے ساتھ ضروری سمجھتے ہیں۔

اور حضرات صوفیاء کرام کی نسبت احسانی اور تزکیہ اخلاق کو ہم روح دین سمجھتے ہیں۔ ان تینوں اصولی باتوں پر حضرت مہتمم صاحب نے پوری تفصیل اور بھرپور استدلال کے ساتھ روشنی ڈالی تھی۔ خاص کر تقلید کے بارہ میں جو کچھ اس تقریر میں فرمایا تھا وہ بہت ہی بصیرت افروز اور اطمینان بخش تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر آج تک بھی میں نے ایسی اطمینان بخش نہ کوئی تحریر پڑھی نہ کسی کی تقریر سنی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں صرف دارالعلوم کے مہتمم اور انتظامی افسر ہی نہیں تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پوری جماعت کے زعم و قائد، ترجمان اور گویا غیر رسمی امیر کا مقام بھی ان کو حاصل تھا۔ ہر اہم معاملہ میں وہی پالیسی طے فرماتے تھے، ان کو اطمینان رہتا تھا کہ پوری جماعت دارالعلوم میرے ساتھ ہے اور یہ اطمینان برحق ہوتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ آخری دور میں جماعت کی وحدت اور یکگاہی کو نظر لگ گئی، باہمی اعتماد و اتحاد کی خاص برکات اٹھ گئیں اور اُن کی جگہ اختلاف و انتشار کے نامبارک اثرات نے لے لی، اور جب صحابہ کرام کی مقدس جماعت بھی نزاع باہمی کے خداوندی امتحان سے نہ بچ سکی تو کون طبقہ اور کون گروہ ہو سکتا ہے جو اس ابتلاء اور امتحان سے ہمیشہ محفوظ رہنے کا استحقاق رکھتا ہو۔ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید۔

۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمن صاحب عہدہ اور منصب کے لحاظ سے بھی دارالعلوم کے مہتمم قرار پا گئے تھے لیکن اس کے بعد صرف ایک سال کے قریب حیات رہے اور ۱۳۴۸ھ میں وفات پا گئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابراز الصالحین علیہ۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

پہلی زیارت

عربی تعلیم شروع ہونے کے بعد جس مدرسہ میں بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا، وہاں اپنے اساتذہ سے اس دور کے بہت بڑے عالم و بزرگ اور شیخ وقت کی حیثیت سے سب سے زیادہ تذکرہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہی کا سنا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت کے مواعظ و ملفوظات اور دینی و اصلاحی کتابیں اُس وقت کثرت سے شائع ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لیے حضرت مددِ وح اُس زمانہ میں سفر بھی کثرت سے فرماتے تھے، شہروں و شہروں وعظ ہوتے تھے، بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی اُس وقت کے مشائخ حق میں جہاں تک اندازہ ہے سب سے زیادہ وسیع تھا، اور جماعت و یوبند کے مخالفین اہل بدعت اپنی بدگوئی اور مخالفانہ پروپیگنڈے کا نشانہ بھی سب سے زیادہ آپ ہی کی شخصیت کو بناتے تھے۔ ان سب وجوہات نے ہمارے مدارس اور دینی حلقوں میں میری طالب علمی کے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ تذکرہ حضرت تھانویؒ ہی کا رہتا تھا۔ لیکن پہلی دفعہ زیارت کی سعادت ۱۳۴۲ھ میں اُس وقت حاصل ہوئی جب میں دارالعلوم منو (ضلع اعظم گڑھ) میں شرح عقائد، میرزا ہد رسالہ اور دیوانِ منتہی وغیرہ پڑھ رہا تھا۔ حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی، جس ٹرین سے حضرت تشریف لانے والے تھے، وہ ٹھیک دوپہر کے وقت پہونچتی تھی۔ موسم بھی سخت گرمی کا تھا، اس کے باوجود ہمارے مدرسہ کے قریب آستب ہی اساتذہ اور ذمہ دار حضرات اور طلبہ، اور قصبہ منو کے بہت سے علماء کرام اور اصحاب و جاہت اور عام دیندار مسلمان بہت بڑی تعداد میں حضرت کی زیارت و استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔

اس وقت لوگوں سے سنا تھا کہ حضرت کے ساتھ رفقاء سفر کی اچھی خاصی تعداد رہتی ہے۔ یہ سب

مختلف مقامات کے مسٹر شہین اور طالبین اصلاح ہوتے ہیں جو محبت سے استفادہ اور اپنی اصلاح و تربیت کے لیے حضرت سے اجازت لے کر سفر میں ساتھ ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہر شخص اپنے مصارف کا بار خود ہی اٹھاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے میزبان کو بھی مولانا اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ آپ کے ان رفقاء کو بھی اپنا مہمان بنا لے۔ وہ لوگ ہر جگہ پہنچ کر اپنے قیام کا انتظام بھی حضرت سے الگ بطور خود کسی دوسری جگہ کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ سب پابندیاں اس لیے ہیں کہ کسی میزبان پر میزبانی و انتظام کا بار نہ پڑے۔ یہ بھی سنا تھا کہ ان سب باتوں کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔

ٹرین اپنے وقت پر آئی۔ حضرت مولانا ٹرین سے اترے تو پہلی مرتبہ زیارت کی، جیسا کہ پہلے سن لیا تھا، حضرت کے ساتھ رفقاء سفر کی بھی اچھی خاصی تعداد اتری، لوگوں کو پہلے سے کہہ دیا گیا تھا کہ زیارت و مصافحہ کے لیے جہوم نہ کریں، اس ہدایت پر سب نے عمل کیا، حضرت ٹرین سے اتر کر پلٹ فارم ہی پر ایک جگہ دیوار کے سایہ میں کھڑے ہو گئے اور یہاں سب نے سلام اور مصافحہ کیا۔ اس ناچیز کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اب تک یاد ہے کہ حضرت کا ہاتھ ایسا نرم معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی ایسا نرم کسی ہاتھ کا دیکھنا یاد نہیں۔ اس کے بعد حضرت اسٹیشن سے اپنی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ دوسرے رفقاء کو جہاں جہاں جانا تھا وہاں چلے گئے، ہم مدرسہ واپس آ گئے۔

یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نماز عصر کے بعد قیام گاہ پر حضرت سے ملاقات ہو سکے گی اس وقت مجلس بھی ہوگی اور رات کو بعد عشاء وعظ ہوگا۔ دارالعلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی (علیہ الرحمۃ) جو گویا میرے سرپرست بھی تھے، زیارت و ملاقات کے لیے نماز عصر مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر حضرت کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ گیا۔ حضرت حکیم الامتہ حضرت مولانا کریم بخش صاحب سے اچھی طرح واقف تھے، کھڑے ہو کر معاف فرمایا اور بڑے اکرام کا معاملہ فرمایا اور اصرار کر کے اپنے برابر میں بٹھایا۔ یہ مجلس کا وقت تھا۔ حضرت کے تمام رفقاء سفر بھی موجود تھے۔ اُن کے علاوہ مئو کے علماء و خواص کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مغرب تک حضرت کی مجلس جاری رہی۔ مجلس سے اُٹھ کر مغرب کی نماز حضرت کی اقتدا میں قریب کی مسجد میں پڑھی۔ حضرت حکیم الامتہ کی خدمت میں ناچیز راقم سطور کی یہ پہلی حاضری تھی اور یہ پہلی نماز تھی جو حضرت کی اقتدا میں پڑھی تھی۔ یہ یاد ہے کہ اس نماز میں حضرت کو اتنا پسینہ آیا تھا اور کرتے کا بالائی حصہ اس طرح تر ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی اوپر سے انڈیل دیا گیا تھا، اسی وقت کسی سے سنا تھا کہ کسی زمانہ میں حضرت کو زہر دیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندگی تو ختم نہیں ہوئی لیکن اس کے اثر سے مزاج میں ایسی

حدت اور گرمی پیدا ہو گئی ہے اور یہ پسینہ اسی کے اثر سے ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر عشاء کے بعد حضرت کا وعظ ہوا۔۔۔ بہت ہی بڑا مجمع تھا، اور یہ پہلا وعظ تھا جو راقم سطور نے حضرت کا سنا تھا، اس کے کچھ مضامین اور دلچسپ لطیفے اب تک یاد ہیں۔

اس کے بعد تین سال طالب علمی میں گزرے۔ شعبان ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم کے دورہ حدیث سے فارغ ہوا اور شوال سے درس و تدریس کا دور شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں پہلے یہ عظیم تاریخی واقعہ یا حادثہ ہو چکا تھا کہ مکہ مکرمہ کے شریف حسین کو (جو ترکی حکومت اور خلیفہ المسلمین سے بغاوت و غداری کر کے برطانوی حکومت کی حاص مدد سے حجاز پاک کا فرماں روا بن گیا تھا) نجد کی سعودی حکومت کے سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شکست دے کر حجاز مقدس پر قبضہ کر لیا اور اپنے مسلک کے مطابق وہاں کے بہت سے مزارات کے اُن قبوں کو منہدم کر دیا جن کو وہ شرعاً منکر اور ”واجب الازالہ“ سمجھتے تھے۔ حجاز پاک میں ہونے والے اس واقعہ نے یہاں ہندوستان میں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے متبعین اور قبر پرست مبتدعین کو اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اکابر علمائے دیوبند وغیرہ علمائے حق کے خلاف جن کو وہ وہابی کہتے تھے، فتنہ پردازی کا وہ بازار اور کاروبار پھر گرم کریں جو تحریک خلافت و ترک موالات کے اثر سے بالکل سرد پڑ گیا تھا۔ بہر حال بریلوی فتنہ پردازوں نے نجد کی وہابی سعودی حکومت کے قبہ شکنی کے واقعہ کو ”قیص عثمان“ بنا کر ہندوستان کے طول و عرض میں پھر ایک طوفان برپا کر دیا۔ اور اکابر علمائے حق، خاص کر حضرت تھانوی کو اپنی تکفیر بازی کا خاص نشانہ بنایا۔ اس زمانہ میں ہمارا ضلع مراد آباد بریلوی فرقہ کے مشہور زعیم و رہنما مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی کی وجہ سے اس فتنہ کا خاص مرکز تھا، گلی کوچے بلکہ گھر گھر یہی چرچا تھا، میری نوعمری کا زمانہ تھا، میں نے اس حملہ کی مدافعت اور اس فتنہ کے مقابلہ کا فیصلہ کیا اور درس و تدریس کے ساتھ اس زمانہ میں یہ بھی میرا مستقل شغل بن گیا۔ اس سلسلہ میں قلم سے بھی کام لینا پڑتا اور زبان سے بھی۔ دو بدو مناظروں کی بھی بار بار نوبت آئی۔ (جن کی مفصل روئدادیں بھی اسی زمانہ میں چھپ کر شائع ہوئی تھیں) چونکہ وہ لوگ سب سے زیادہ حملہ حضرت حکیم الامت پر کرتے تھے اس لیے قدرتی طور پر انہی کی طرف سے مدافعت اور جواب دہی زیادہ کرنی پڑتی تھی، مگر اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خود حضرت کو بھی اس کی کوئی خبر ہے یا نہیں، اگرچہ جی چاہتا تھا کہ حضرت کو اس کی اطلاع ہو، لیکن اس سلسلہ میں نہ کبھی حضرت سے خط و کتابت کی نہ اس موضوع سے متعلق اپنا کوئی رسالہ یا کسی مناظرہ کی روئداد کبھی حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ بات ہمارے حلقہ میں عام طور سے مشہور تھی کہ حضرت کو

بریلویوں کی افترا پر دازی کی طرف مطلق التماس نہیں ہے اور وہ ان خالوں کے مسئلہ کو سپرد خدا کر کے اس اصول پر عامل ہیں کہ ”با خدا داریم کار و باخلایق کار نیست“۔

عالمگیر ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں بریلویوں کے تمام مشہور الزامات و اعتراضات کے جواب میں راقم سطور نے ایک جامع کتاب ”سیف یمانی“ کے نام سے لکھی، اس میں حضرت تھانوی پر عائد کئے جانے والے بہت سے الزامات و اعتراضات کا جواب تھا، لیکن حضرت سے متعلق پنجاب کے کسی عقیدت مند شخص کے اُس خواب کی بحث بہت مفصل تھی جس کی بنا پر بریلویوں کی طرف سے حضرت کے خلاف بہت ہی غلیظ پروپیگنڈہ بڑے وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا اور اس کو سن کر بہت سے خالی الذہن عقیدت مند بھی اپنی ناواقفگی کی وجہ سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد و توفیق سے ”سیف یمانی“ میں یہ بحث ایسی ہو گئی تھی جو میرے نزدیک بہت ہی تشفی بخش تھی اور اس سے مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا تھا۔ مجھے اس بحث کے بارہ میں بڑا اطمینان تھا اور بڑی خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی توفیق دی۔

اس کتاب (سیف یمانی) کے تیار ہو جانے پر میرا جی چاہا کہ حضرت تھانوی سے کوئی تعارف نہ ہونے کے باوجود گزارش کروں کہ وہ اس بحث کو ملاحظہ فرمائیں اور اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

میں نے سنا تھا کہ حضرت حکیم الامتہ خط کتابت میں بھی بے ضرورت طوالت اور تکلف و تصنع کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کوئی بات کرے یا خط لکھے تو ضرورت کے مطابق مختصر الفاظ میں صاف اور سیدھی بات کہے۔ میں نے حضرت کی خدمت میں ”سیف یمانی“ کا ایک نسخہ ڈاک سے بھیجا اور اس کے ساتھ عریضہ بھی لکھا، جس کا مضمون تعظیمی خطاب اور تحیہ مسنونہ کے بعد یہ تھا۔

”مجھے حضرت سے تعارف کی سعادت حاصل نہیں ہے، اس لئے غالباً حضرت مجھ سے

بالکل واقف نہ ہوں گے۔ میں دارالعلوم دیوبند کا چند سال پہلے کا ایک طالب علم ہوں، آج کل

امروہہ کے مدرسہ اسلامیہ (محلہ چلہ) میں کچھ اسباق پڑھاتا ہوں۔ بریلوی جماعت نے

ہمارے اکابر کے خلاف جو طوفانی فتنہ آج کل برپا کر رکھا ہے، ایک ضروری دینی خدمت سمجھ کر

اس کی تردید و مدافعت کا کچھ کام بھی اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق سے کر لیتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں ایک

کتاب ”سیف یمانی“ حال ہی میں لکھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ آج ہی ڈاک سے ارسال خدمت

کیا ہے۔ اگر حضرت کے اوقات و اشغال میں گنجائش ہو اور زحمت نہ ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ

حضرت والا اس کتاب کو یا کم از کم اس کی صرف اس بحث کو جو حضرت ہی کے متعلق ایک صاحب

کے مشہور خواب کے بارے میں کی گئی ہے اور جو کتاب کے فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک ہے،

ملاحظہ فرمائیں اور اگر اصول کے خلاف نہ ہو اور کسی قسم کی گرائی اور زحمت نہ ہو تو حضرت اپنی رائے گرامی سے بھی مطلع فرمادیں، لیکن اگر اوقات میں گنجائش نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کا ملاحظہ باعث زحمت ہو تو مجھے بالکل اصرار نہیں ہے۔ اور اس صورت میں بھی کتاب کی واپسی کی زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے محض ہدیہ کی نیت سے یہ کتاب حضرت کی خدمت میں بھیجی ہے۔ اگر قبول فرمائی جائے تو میرے لیے باعث منت وسعدت ہو گا ورنہ کسی کو بھی عنایت فرمادی جائے۔“

حضرت حکیم الامتہ کی خدمت میں یہ میزاسب سے پہلا عریضہ تھا۔ میں نے جواب کے لیے لفافہ بھی رکھ دیا تھا۔ چوتھے پانچویں دن حضرت کا جواب آیا۔ اپنے عام اصول و معمول کے مطابق میرے اس خط ہی پر جواب تحریر فرمایا تھا۔ اس جواب کے جو قابل ذکر اجزاء یاد رہ گئے ہیں وہ یہ تھے۔

”آپ کا خط پڑھ کے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے بغیر کسی تکلف کے اپنی بات صاف سیدھے انداز میں لکھ دی اور میرے اوقات اور اصول و مزاج کی بھی پوری رعایت کی، اس پر دل سے دعا نکلی۔

میں آپ سے ناواقف نہیں ہوں۔ آپ کا اور آپ کے کاموں کا ذکر سن رہا ہوں، اس لیے آپ سے غائبانہ محبت و تعلق ہے اور دعا کرتا ہوں۔

آپ کی تطبیق خاطر کے لیے لکھتا ہوں کہ میں نے آپ کے ہدیہ کو دل سے قبول کیا، کتاب کو اس ارادہ سے کھولا کہ جتنے جتنے اس پر نظر ڈالوں گا اور خواب والی جس بحث کے لیے آپ نے خاص طور سے لکھا تھا، اس کو پورا پڑھوں گا۔ لیکن جب کتاب پڑھنی شروع کی تو اس کے کسی حصے کو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور جب تک پوری کتاب ختم نہ کر لی، اپنے مقررہ ضروری کاموں کے سوا کوئی دوسرا کام درمیان میں نہیں کیا۔ پوری کتاب سے جی بہت ہی خوش ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

خواب والی بحث کو خاص طور سے غور سے پڑھا۔ بے تکلف لکھتا ہوں کہ اگر میں خود کو شش

کرنا تو مسئلہ کی ایسی اطمینان بخش وضاحت نہ کر سکتا۔ بَارَكَ اللهُ تَعَالَى فِي عَمَلِكُمْ وَعِلْمِكُمْ۔“

حضرت نے اپنے معمول کے مطابق یہ جواب میرے عریضہ ہی پر لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ خط محفوظ نہیں رہا لیکن اپنے عریضہ کا مضمون اور حضرت کے جواب کے یہ اجزاء اچھی طرح یاد ہیں اور حافظہ کی مدد ہی سے یہاں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت نے الگ سے ”سیفِ یثربی“ پر مختصر تقریظ بھی تحریر فرمائی جو اس کے ساتھ اسی وقت چھپ گئی تھی۔ جیسا کہ عرض کیا، حضرت حکیم الامتہ قدس سرہ کے ساتھ خط کتابت کا یہ پہلا رابطہ تھا۔

حضرتؒ کی خدمت میں پہلی حاضری

غالباً ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں بریلویوں کے ایک مشہور و بدنام، نہایت بد زبان اور فتنہ پرداز مقرر و مناظر رنگون (برما) پہنچے۔ (برما اس وقت ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا) ان کی وجہ سے وہاں سخت فتنہ برپا ہو گیا۔ ہمارے اکابر سے تعلق رکھنے والے وہاں کے احباب و مخلصین نے مجھے خطوط لکھے اور تار پہ تار دیئے۔ میں رنگون پہنچا بریلوی مقرر صاحب کی فتنہ پردازی کے نتیجہ میں وہاں اُن کے ایک جلسہ میں بلوہ اور فساد بھی ہو گیا اور معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ وہاں کے دوستوں نے اصرار کیا کہ جب تک یہ قضیہ ختم نہ ہو جائے، تم یہاں سے نہ جاؤ۔ میرے لیے طویل قیام بہت مشکل تھا۔ وہاں کے ہماری جماعت کے بعض حضرات نے جو حضرت حکیم الامتؒ سے خاص نیاز مندانہ تعلق رکھتے تھے، حضرت کی خدمت میں لکھا کہ حضرت والا اپنی طرف سے مجھے (محمد منظور نعمانی کو) تحریر فرمادیں کہ جب تک یہاں رنگون میں ضرورت ہو، وہ اس وقت تک یہاں قیام کرے، حضرت نے اس بارے میں مجھے براہ راست تو کچھ تحریر نہیں فرمایا لیکن اپنے سے خاص تعلق رکھنے والے ایک بزرگ عالم کو تحریر فرمایا کہ وہ مجھے حضرت کا یہ پیام پہنچادیں کہ رنگون کے مخلص احباب اس قضیہ کے ختم ہونے تک وہاں آپ کا قیام ضروری سمجھتے ہیں، اور وہ بے چارے ہمدردی اور رعایت کے مستحق ہیں، پس اگر اس میں آپ کا کوئی خاص حرج نہ ہو اور واپسی کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو میں بھی اس کی سفارش کرتا ہوں۔

حضرت کا یہ پیام ملنے کے بعد میں نے قیام کا ارادہ کر لیا۔ اور غالباً حضرت کو بھی لکھ دیا اور پھر کئی مہینے رنگون میں رہنا پڑا۔

رنگون کے اس قیام کے زمانہ میں ارادہ کر لیا تھا اور غالباً حضرت کو لکھ بھی دیا تھا کہ یہاں سے واپسی پر انشاء اللہ تھانہ بھون حاضر ہوں گا۔ چنانچہ کئی مہینے کے بعد جب واپسی ہوئی تو تھانہ بھون حاضر ہوا۔ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں یہ پہلی حاضری تھی، صرف ایک دو دن قیام رہا۔ حضرت نے بڑی عنایتیں فرمائیں۔ اب تک حضرت کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس سے کچھ ایسا خیال قائم ہو گیا تھا کہ حضرت کے یہاں بڑی سختی ہے۔ بات بات پر دار و گیر ہوتی ہے لیکن مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ بات بہت ہی غلط ہے۔ ہاں! یہ ضرور محسوس ہوا کہ لوگوں کی بے وقوفیوں اور بے اصولیوں سے اور تصنع اور بناوٹ سے (جس کا عام رواج ہو گیا ہے) حضرت کو سخت اذیت اور ناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر ڈانٹ پڑ جاتی ہے۔

دوسری حاضری اور ایک غیر معمولی واقعہ

میری تعلیم دارالعلوم دیوبند کی تھی اور اس سے پہلے جن دوسرے مدارس میں پڑھا تھا، ان کے اساتذہ بھی دارالعلوم کے فیض یافتہ تھے، اسی وجہ سے میرا سیاسی ذہن وہی تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اثر سے اور پھر خلافت کی تحریک سے جماعت دیوبند کا بن گیا تھا، اسی بنا پر شروع ہی سے ”جمعیتہ العلماء“ سے تعلق رہا۔ اگرچہ جمعیتہ کی سیاسی سرگرمیوں میں میرا کوئی قابل ذکر عملی حصہ کبھی نہیں رہا، لیکن جس زمانہ کی میں اس وقت بات کر رہا ہوں اُس زمانہ میں میرا ذهنی اور فکری تعلق جمعیتہ سے خاصا گہرا تھا۔ اس کے صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور ناظم (آج کی زبان میں جنرل سکریٹری) حضرت مولانا احمد سعید صاحب خاص عنایت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ الفرقان اس زمانہ میں چونکہ دہلی میں چھپتا تھا، اس لیے ہر مہینہ چار پانچ دن کے لیے مجھے دہلی جانا پڑتا تھا اور وہاں قیام زیادہ تر جمعیتہ العلماء کے دفتر میں اور کبھی جامع مسجد کے قریب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ رحیمیہ کی بالائی منزل پر ہوتا تھا، اس وجہ سے ان بزرگوں کی خدمت میں حاضری اور گفتگوؤں کا بہت موقع ملتا تھا۔

اپنے بڑوں کے سامنے بھی بولنے کی اور اگر رائے میں اختلاف ہو تو صفائی سے اُس کے بھی عرض کر دینے کی، بُری یا اچھی، میزنی عادت شروع سے رہی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ غالباً اس کی قدر فرماتے تھے، اور اگرچہ میں مرکزی جمعیتہ کی عاملہ کا رکن کبھی نہیں رہا مگر اس کے اہم جلسوں میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ اکثر طلب فرما لیتے تھے۔ جمعیتہ کے اس وقت کے نظام میں تیسری اہم شخصیت حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ (نائب امیر شریعت بہار) کی تھی، جمعیتہ کے کاموں ہی کے سلسلہ میں مہینوں ان کا قیام دہلی جمعیتہ کے دفتر ہی میں رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان سے باتیں کرنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ میں ان کے علمی رسوخ اور فقیرانہ زندگی سے بہت متاثر تھا۔ اور خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ان کی سیاسی بصیرت کا بہت قائل اور معتقد تھا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ۱۹۳۶ء میں جنرل الیکشن ہو چکا تھا اور اس کے نتیجے میں صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جن میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں تھیں، جنہوں نے اس شرط کے ساتھ حکومت قبول کی تھی کہ گورنر اُن کے کاموں میں دخل نہیں دے گا (اور ان صوبوں کے گورنروں نے یہی

رویہ اختیار کر لیا تھا) اُس وقت یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ ہندوستان جلد ہی کامل آزادی حاصل کر لے گا۔ اور یہاں قومی جمہوری حکومت ہوگی یعنی عوام کے منتخب نمائندوں کی پارلیمنٹ اقتدار کی مالک ہوگی۔ اور یہ بات بھی بالکل ظاہر تھی کہ وہ حکومت کانگریس ہی کی ہونگی (آج کانگریس کے علاوہ جو سیاسی پارٹیاں کسی قدر نمایاں ہیں ان کا اُس وقت وجود ہی نہیں تھا)۔

شروع سے جمعیۃ العلماء کے سامنے سب سے اہم مقصد یہ رہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں شرعی نصیب العین کے مطابق مسلمانوں کے لیے نظام شرعی قائم ہو سکے، آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ جمعیۃ کی شرکت کا یہ ایک خاص محرک تھا لیکن یہ شرکت یا جمعیۃ کے بہت سے ارکان کا مقامی کانگریس کمیٹیوں کا ممبر بن جانا کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر حضرت مولانا محمد سجادؒ نے ایک اسکیم تیار کی اس کا حاصل اور خلاصہ جواب یاد رہ گیا ہے، یہ تھا کہ جمعیۃ العلماء مسلمانوں کی ایک عوامی جماعت قائم کرے جس کے نظام میں جمعیۃ کو موثر دخل رہے (غالباً اس کا نام ”نظام ملت“ تجویز کیا گیا تھا) کانگریس کی طرح اس کی ممبری کی فہم ہو۔ اور بہت ہلکی بس برائے نام ہو۔ ہر عاقل بالغ مسلمان کو اس کا ممبر بنانے کی کوشش کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جو آدمی اس کا ممبر بنے، وہ لازمی طور پر کانگریس کا بھی ممبر بنے۔ اس طرح مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو کانگریس کے نظام میں شریک کیا جائے اور ان سب کا رابطہ ”نظام ملت“ کے واسطے سے جمعیۃ العلماء سے بھی رہے۔ خیال تھا کہ اس راستے سے جمعیۃ العلماء کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکے گی (یہ ملحوظ رہے کہ جمعیۃ العلماء اُس وقت نہ عوامی جماعت تھی اور نہ انتخابی، اس کے نام اور عنوان کے مطابق عموماً علمائے کرام ہی اس کے ارکان ہوتے تھے)۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ کا خیال تھا کہ اس طرح کی کسی تدبیر اور کوشش کے بغیر آزاد ہندوستان میں ہم اپنے وہ مذہبی و ملی مقاصد حاصل نہیں کر سکیں گے جن کے لیے اور جن کی امید پر ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ مولانا موصوفؒ نے یہ اسکیم بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کی تھی اور ابھی اس پر وہ خود اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب غور فرما رہے تھے (یہ ۱۹۳ء کا ذکر ہے) ان ہی دنوں میں میرادہلی جانا ہوا، حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے پہلے زبانی اپنے اس خیال کا ذکر فرمایا، پھر بتلایا کہ انھوں نے اس کا پورا خاکہ تحریری شکل میں بھی مرتب کر لیا ہے۔ میرے عرض کرنے پر وہ مجھے مطالعہ کے لیے عنایت بھی فرمادیا میں نے اس کو بہت غور سے پڑھا اور میرے دل نے اس کو پوری طرح

سے قبول کر لیا۔ ساتھ ہی شدت کے ساتھ دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا ہو وہ سب کیا جائے۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اپنی جماعت کے وہ اکابر بھی اس سے اتفاق کر لیں جو جمیعۃ العلماء اور اس کی سیاسی طرز کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کو ایک گونہ بعد یا اختلاف رہا ہے۔ ان اکابر میں میری نظر میں سب سے اہم اور با عظمت شخصیت حکیم الامتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ تھانہ بھون حاضر ہو کر حضرت کی خدمت میں اس مسئلہ کو رکھوں۔ جمیعۃ العلماء کے طریق فکر اور طرز کار سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ذہنی اور ذوقی اختلاف مجھے اچھی طرح معلوم تھا اور اس کی ذہن سے امید کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں تھی، لیکن حضرت کے اخلاص، للہیت اور فہم و فراست کی بنا پر یہ یقین تھا کہ اگر تفصیل کے ساتھ حضرت کے سامنے پورے مسئلہ کو رکھا جاسکے تو اس پر غور و ضرور فرمائیں گے اور اگر ذہن نے قبول کر لیا تو انشاء اللہ اتفاق بلکہ کھلی تائید و حمایت پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے اس خیال یا خطبہ کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا۔ اور اگلے دن صبح جمیعۃ کے دفتر سے سیدھا شاہدرہ آیا اور وہاں سے تھانہ بھون روانہ ہو گیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر راستے میں حضرت سے گفتگو کرنے کے لیے ایک مفصل نوٹ تیار کیا تاکہ وقت پر کوئی ضروری بات رد نہ جائے۔

غالباً ظہر کی نماز کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی۔ حسب معمولی شفقت و عنایت کے ساتھ مصافحہ فرمایا، خیریت دریافت کی، اور فرمایا کہ ”کیا اس وقت کسی خاص ضرورت سے آنا ہوا؟“ میں نے عرض کیا کہ ایک خاص معاملے کے بارے میں حضرت سے کچھ عرض کرنا ہے! فرمایا: ”کیا اسی وقت؟“ میں نے عرض کیا نہیں۔ میں قیام کروں گا۔ آج یا کل جس وقت حضرت کو فرصت و فراغت ہو۔۔۔ فرمایا کہ ”پھر آج ہی انشاء اللہ مغرب کے بعد۔“

یہ حضرت کی مجلس کا وقت تھا، شعبان کی غالباً ۱۲ تاریخ تھی، ہمارے عربی مدارس میں تعلیم و تدریس کا کام عام طور سے شعبان سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے اس لیے حضرت سے بیعت اور اصلاح و تربیت کا تعلق رکھنے والے بعض مدارس کے اساتذہ بھی آئے ہوئے تھے اور مجلس میں شریک تھے، (جن میں سے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ خاص طور سے یاد ہیں) حضرت نے مجھے اپنے برابر میں بیٹھنے کا حکم فرمایا، میں تعمیل حکم میں بیٹھ گیا، لیکن جیسا کہ چاہئے تھا، ادب سے بیٹھا، ارشاد فرمایا بے تکلف ہو کر آرام سے بیٹھے! اس سے مجھے انشراح ہوگا، میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔۔۔ پھر مجلس کے پورے وقت میں

حضرت کا خاص التفات رہا۔ (اور اس کے علاوہ بھی) جب کبھی حاضری ہوئی حضرت کا یہی طرز عمل رہا، لیکن الحمد للہ کبھی بھی حضرت کے اس رویہ کی وجہ سے ا۔ بے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، اُس وقت بھی یہی احساس تھا اور آج بھی یقین ہے کہ یہ سیدہ کا حضرت کے دنیٰ خادموں کی صف میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد خانقاہ کی مسجد ہی کے ایک کنارے چٹائی پر حضرت بیٹھ گئے، وہیں مجھے یاد فرمایا، میں حاضر ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اُس کے بارے میں خود مجھے شبہ ہے کہ شاید حضرت اس کو پسند نہ فرمائیں، لیکن بہت غور کرنے کے بعد میں نے اپنے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ حضرت کی خدمت میں اس کو عرض کر دوں، حضرت نے بڑی عنایت و شفقت کے ساتھ فرمایا کہ آپ پوری بے تکلفی کے ساتھ اپنی بات کہیں، میں بالکل خالی الذہن ہو کر سنوں گا اور غور کروں گا۔

میں نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر وہ سب باتیں میں نے نمبر وار نوٹ کر لی تھیں جو مجھے حضرت کے سامنے عرض کرنی تھیں۔ حضرت نے اس پر خوشی اور تحسین کا اظہار فرمایا کہ میں نے گفتگو کے لیے اہتمام سے تحریری یادداشت مرتب کر لی ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی بات شروع کی، جس کا سلسلہ قریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ حضرت نہایت توجہ کے ساتھ سنتے رہے، درمیان میں کبھی کبھی یہ فرمادیتے کہ ”اس بات کو ذرا پھر سے کہہ دیجئے“۔ میں دوبارہ عرض کر دیتا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ سب تو اب محفوظ نہیں لیکن اس کے اہم اجزاء جہاں تک یاد ہے یہ تھے:-

(الف) انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی کچھ وضاحت اور یہ کہ اس کے ذریعہ حکومتی اختیارات کا کتنا بڑا حصہ ہندوستانوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور کتنا حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔
(ب) اب یہ بات یقینی نظر آتی ہے کہ جلدی ہی انگریزی اقتدار کئی طور پر ختم ہو جائے گا اور سارے اختیارات ہندوستانوں کے ہاتھ میں آ جائیں گے اور یہاں قومی جمہوری حکومت ہوگی۔ جس طرح اس وقت صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہیں۔

(ج) یہ بھی ظاہر ہے کہ الیکشن کے ذریعہ یہاں حکومت کا ٹکریس ہی کی قائم ہوگی اور سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں گے۔

(د) آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ہم جو کچھ چاہتے ہیں بالخصوص اُن کے لیے اپنے نظام

(۱) انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا اردو ترجمہ جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں چھپ چکا تھا اس وقت میرے ساتھ تھا۔

شرعی کے قیام کا حق۔ اس کا بظاہر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں میں دینی مزاج کے مسلمانوں کا بھی عمل دخل ہو۔

(۵) اس کے بعد میں نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی تجویز اور اسکیم کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا اور عرض کیا کہ یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کو ہمارے دینی حلقوں کی زیادہ سے زیادہ تائید و حمایت حاصل ہو اور ہم سب اس کے لیے کوشش اور محنت کریں، جو کانگریسی مسلمان دینی ذہن کے نہیں ہیں وہ تو اس کی مخالفت کریں گے۔

آخر میں میں نے عرض کیا کہ حضرت اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور اگر حضرت کی رائے اس سے متفق ہو اور اس بارے میں شرح صدر ہو جائے کہ یہ کوشش اسلام اور مسلمانوں کے لیے انشاء اللہ مفید ہوگی تو پھر حضرت اس کی تائید فرمادیں۔ پھر انشاء اللہ مخلص اور دیندار مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا تعاون حاصل ہو جائے گا اور اُس وسیع پیمانے پر کام ہو سکے گا جس کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، میری یہ گفتگو بہت طویل اور مفصل تھی۔ اس کے یہ چند اجزاء اور نقاط تھے جو یاد رہ گئے ہیں۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی اور عرض کیا کہ جو مجھے عرض کرنا تھا وہ میں عرض کر چکا، تو حضرت نے فرمایا۔ ”میں نے آپ کی بات اور مقصد کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے اس وقت بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا معلوم ہونا ضروری تھا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں جلدی رائے قائم نہیں کرتا ہوں۔ پہلے خود اچھی طرح غور کرتا ہوں، پھر ضرورت سمجھتا ہوں تو ان دوستوں سے مشورہ بھی کرتا ہوں جن کو مخلص اور صاحب رائے سمجھتا ہوں، اس لیے اپنی رائے تو اُس وقت ظاہر کر سکوں گا جب قائم ہو جائے گی، لیکن میرا حال اس وقت یہ ہے کہ آپ کی بات نے میرے دل کو بہت متاثر کیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اس سے پوری طرح اتفاق کر لوں، لیکن میں غور کر کے رائے قائم کروں گا اور انشاء اللہ کل صبح بتلا دوں گا کہ میری رائے کیا قائم ہوئی؟“

اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت نے مسجد ہی میں مجھ سے فرمایا۔ ”میں نے غور کیا، میری وہی رائے ہے جو میں نے رات بظاہر کی تھی، اب میں یہاں کے اپنے خاص احباب سے مشورہ کروں گا لیکن اُس کی صورت یہ ہوگی کہ آپ نے جس طرح میرے سامنے پوری تفصیل سے بات رکھی تھی، اسی طرح ان کے سامنے بھی آپ رکھیں، میں ان کو اطلاع دوں گا کہ وہ آٹھ بجے یہاں خانقاہ ہی آجائیں۔“

وہ حضرات آٹھ بجے جمع ہو گئے۔ ان میں ایک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ تھے۔ دوسرے مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گنگوہیؒ مرحوم تھے، جو حضرت حکیم الامتہ کے ممتاز اصحاب علم خلفاء میں سے تھے۔ تیسرے صوبہ بہار کے ایک عالم تھے جو اس زمانہ میں خانقاہ کے مدرسہ میں غالباً صدر مدرس تھے، (ان کا نام اب یاد نہیں) ان کے علاوہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ بھی تھے۔ غالباً صرف یہی چار حضرات تھے۔ حضرت حکیم الامتہ نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر میرا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ ”رات انھوں نے ایک بہت اہم مسئلہ پر مجھ سے بات کی، میں نے آپ حضرات کو اس وقت اس لیے جمع کیا ہے کہ آپ بھی اس کو سنیں، اس پر غور کریں اور مشورہ دیں“۔ اس کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ جو بات آپ نے جس طرح تفصیل کے ساتھ مجھ سے کہی تھی اسی طرح ان حضرات کے سامنے بھی آپ وہ بات رکھیں۔

میں نے اس مجلس میں بھی پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مسئلہ کو رکھا۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو حضرت نے ان حضرات سے فرمایا کہ اب آپ حضرات اس مسئلہ میں اپنی اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ یہ سب حضرات خاموش رہے، کچھ دیر کے بعد حضرت نے دوبارہ یہی فرمایا، اس پر بھی کسی نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور خاموشی ہی رہی، تو حضرت نے فرمایا کہ ”میں نے رات سے اب تک اس مسئلہ پر جو کچھ غور کیا ہے اس کی بناء پر میرا رجحان تو یہ ہے کہ مولانا نے (یعنی راقم سطور محمد منظور نعمانی نے) جو بات ہمارے سامنے رکھی ہے وہ صحیح ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہئے یہ خیال ہمارے لیے مانع نہیں ہونا چاہئے کہ تحریکات کے بارے میں اب تک ہمارا جو طریقہ اور مسلک رہا ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ ہماری اب تک جو رائے رہی اور ہم نے جو کچھ کیا، حق سمجھ کر کیا اور اللہ کے لیے کیا۔ اور اب اگر یہ رائے قائم ہو جائے کہ یہ دوسرا طریقہ جمعیتہ علماء دالے حضرات کا صحیح ہے اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں خیر کی امید ہے تو اس کو بھی ہم اللہ ہی کے لیے اختیار کریں گے“۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ ”اگر اس رائے کے بارے میں اطمینان اور شرح صدر ہو جائے تو پھر میں اپنی ذات سے اس کے لیے تیار ہوں کہ جمعیتہ العلماء میں شامل ہو جاؤں اور کانگریس کا بھی ممبر بن جاؤں۔“

حضرت کی زبان سے یہ آخری بات سن کر میں حیران رہ گیا، اس حد تک تو میرا وہم و خیال بھی نہیں جاسکتا تھا۔ میں تو زیادہ سے زیادہ بس تائید اور حمایت ہی کی توقع کر سکتا تھا، میری طرح اور سب جاضرین کو بھی حضرت کی یہ بات سن کر حیرت ہوئی ہوگی، لیکن اس مرحلہ پر بھی کسی نے اختلافی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ نے اصولی طور پر حضرت کی رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا کہ میری گزارش یہ ہے کہ حضرت اپنی ذات کے بارے میں تو ابھی کوئی اقدام اور اعلان نہ فرمائیں، بس زیادہ سے زیادہ تائید فرمادیں لیکن اپنے خاص معتمد چند حضرات کو ارشاد فرمادیں کہ وہ شامل ہو جائیں اور دو یا تین مہینے کی مدت مقرر کر دی جائے۔ اس مدت میں وہ جمعیت العلماء کے حضرات کے ساتھ کام کر کے حضرت کی خدمت میں اپنا تجربہ اور اپنی رائے عرض کریں، اس کے بعد اپنی ذات کے بارے میں حضرت کوئی فیصلہ فرمائیں۔

میں نے حضرت مولانا جالندھریؒ کی اس رائے کی تائید کی۔ حضرت نے بھی اس کو پسند فرمایا اور اس حد تک بات اس مجلس میں گویا طے پا گئی۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت ہے کہ خود جمعیت العلماء کے حضرات سے بھی گفتگو ہو، میں نے عرض کیا کہ حضرت ارشاد فرمائیں تو میں دہلی چلا جاؤں اور ان حضرات سے عرض کروں، انشاء اللہ وہ ضرور تشریف لے آئیں گے، چنانچہ میرا دہلی جانا طے ہو گیا، مجھے حضرت نے ایک رقم بھی عنایت فرمائی۔ یہ میرے اور ان اکابر جمعیت کے کرایہ کے لیے تھی۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ یہ بہتر ہو گا کہ دیوبند اور سہارنپور کے حضرات بھی اس مشورہ میں شریک ہوں چنانچہ طے ہو گیا کہ فلاں صاحب حضرت کا خط لے کر سہارنپور اور دیوبند جائیں گے۔

صرف ایک دن درمیان میں چھوڑ کے دوسرے دن صبح کا وقت اس مشاورت کے لیے مقرر کیا گیا۔

میں اسی دن دہلی روانہ ہو گیا، سب سے پہلے جمعیت کے دفتر پہنچا، وہاں مولانا سجاد صاحب تشریف فرما تھے، ان کو تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روئداد سنائی اور عرض کیا کہ آپ کو حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں۔

مولانا کو یہ سن کر کہ حضرت تھانویؒ اس حد تک آمادہ ہو گئے ہیں، بڑی حیرت ہوئی اور مولانا اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لیے ”کوچہ چیلان“ حضرت مفتی صاحب کے ہاں پہنچے، وہاں بھی میں نے پوری تفصیل سے تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روئداد سنائی، حضرت مفتی صاحب نے بھی بڑی حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ آج ہی شام کو آپ حضرات کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے، کل صبح آٹھ بجے کا وقت گفتگو کے لیے مقرر ہے، سہارنپور اور دیوبند کے حضرات کو بھی بلایا گیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب اور ان کے ساتھ ہم دونوں (راقم سطور اور حضرت مولانا محمد سجاد) مولانا احمد

سعید صاحب کے مکان پہنچے جو وہیں کوچہ چبلاں میں قریب ہی تھا، وہ اُس وقت گنبد کے سفر کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والے تھے، حضرت مفتی صاحب نے ان سے میرے بھانڈے بھون کے سفر کا مختصر طور پر تذکرہ کر کے فرمایا کہ آج ہی شام کو ہم تینوں کو (یعنی حضرت مفتی صاحب، مولانا سجاد صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کو) بھانڈے بھون کے لئے روانہ ہونا ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ میں تو اسی وقت گنبد جا رہا ہوں، حافظ ابراہیم صاحب کے الیکشن کے سلسلہ میں مجھے دو تین جگہ جانا ہے، مولوی حفظ الرحمن صاحب کے دو تار آچکے ہیں، الیکشن کا بالکل اخیر وقت ہے، اس لیے میرے لئے اس وقت بھانڈے بھون جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بس آپ دونوں حضرات تشریف لے جائیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کے بعد بھی فرمایا کہ میری رائے میں تو بھانڈے بھون کا سفر مقدم ہے لیکن مولانا احمد سعید صاحب نے پھر مولانا حفظ الرحمن صاحب کے تار کا حوالہ دے کر معذرت کی اور اسی وقت الیکشن کے لئے روانہ ہو گئے۔ پھر اسی دن شام کو حضرت مفتی صاحب، مولانا سجاد صاحب اور یہ عاجز شاہد رہ سہارنپور ٹرین سے بھانڈے بھون کے لیے روانہ ہو گئے، وہاں ٹرین رات کو پہنچتی تھی۔ حضرت تھانویؒ نے میرے دہلی جاتے وقت یہ فرمادیا تھا کہ اُن حضرات کو اس میں راحت رہے گی کہ قیام مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر رہے۔ یہ حضرات بستر وغیرہ ساتھ لانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ ہم لوگ الیکشن پر اترے، خانقاہ کے خادم خلیفہ اعجاز صاحب ہاتھ میں لائین لئے موجود تھے۔ اُن کے ساتھ ایک دو آدمی اور بھی تھے، الیکشن سے راستہ پیدل ہی کا تھا، خلیفہ صاحب کی رہنمائی میں ہم تینوں مولانا شبیر علی صاحب کے مکان پر پہنچے، وہاں بستر لگے ہوئے تھے، غالباً کھانے کا بھی بندوبست تھا لیکن ہم سب فارغ ہو چکے تھے اس لیے معذرت کر دی اور سو گئے صبح فجر کی نماز کے لئے خانقاہ پہنچے، حسب معمول حضرت تھانویؒ نے خود نماز پڑھائی نماز سے فارغ ہو کر ملاقات ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا سجاد صاحب سے حضرت نے معاف بھی فرمایا، مزاج پرسی ہوئی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ حضرات کی راحت کے لیے میں نے مولوی شبیر علی صاحب کا مکان قیام کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس مکان میں راحت کے انتظامات زیادہ ہیں۔

چائے ناشتہ بھی مولانا شبیر علی صاحب ہی کے یہاں ہونا تھا، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے مجلس اور گفتگو کے لیے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا، ہم لوگ کچھ پہلے خانقاہ پہنچ گئے۔ حضرت تشریف لا چکے تھے، سہارنپور سے

(۱) یہ حافظ ابراہیم مرحوم کا وہ الیکشن تھا جو انھوں نے بحالہ میں یو پی کی کانگریس حکومت میں وزارت قبول کرنے کے بعد مسلم لیگ کے مطالبہ اور چیلنج پر اسمبلی کی ممبری سے استعفاء دینے کے بعد دوبارہ لڑا تھا اور اس میں بھی کامیابی حاصل کی تھی، مولانا احمد سعید صاحب اسی الیکشن کے سلسلہ میں گنبد جا رہے تھے

حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، بھی تشریف لے آئے تھے، وہیں ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب، مولانا مفتی عبدالکریم صاحب اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب بھی موجود تھے۔

مجلس کا آغاز ہوا۔ حضرت نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اس وقت ہم سب کے یہاں جمع ہونے کا آپ ہی باعث ہوئے ہیں، اس کا جو مقصد ہے اور جس مسئلہ پر غور کرنا ہے آپ ہی اس کو ان سب حضرات کے سامنے رکھیں۔

میں نے بات شروع کی اور تمہید کے طور پر اپنے تھانہ بھون حاضر ہونے اور حضرت کی خدمت میں اپنا ایک خاص خیال عرض کرنے کا اجمالی تذکرہ کیا اور بتلایا کہ آخر میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس مسئلہ کو آپ سب حضرات کے سامنے رکھا جائے اور سب حضرات غور فرمائیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر میں نے موضوع سے متعلق نمبر وار نوٹ لکھ رکھے تھے اور پھر جس تفصیل سے میں نے پہلے دن حضرت کی خدمت میں اور دوسرے دن خانقاہ کی خصوصی مجلس میں اپنے خیالات عرض کیے تھے۔ اسی تفصیل و وضاحت سے اس تیسری مجلس میں بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

میں بات ختم کر چکا تو مولانا ظفر احمد صاحب نے گفتگو شروع فرمائی۔ اور آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک سے فقہی بنیاد پر اپنا اختلاف ظاہر کیا، جہاں تک یاد ہے، مولانا کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ اگر دو فریقوں میں جنگ ہو اور مسلمانوں کو یہ امید ہو کہ ان میں فلاں فریق کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں کلمہ اسلام یعنی اسلامی اقتدار قائم ہو جائے گا تو مسلمانوں کو اس میں شریک ہو جانا چاہیے اور اگر جنگ کے نتیجہ میں کلمہ اسلام کی بلندی اور اسلامی اقتدار کے قائم ہونے کی امید نہ ہو تو اس جنگ میں مسلمانوں کو شریک ہونا اور قربانی دینا جائز نہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی کسی کتاب کی عبارت بھی پڑھی تھی جو اس وقت اُن کے ساتھ تھی اور غالباً امام محمد کی سیر کبیر تھی۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ اس وقت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے مسئلہ کی جو نوعیت ہے، کتاب کی اس عبارت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کانگریس اپنے خاص طریقہ پر انگریزی حکومت کے خلاف طویل مدت سے جنگ کر رہی ہے۔ اس کی یہ جنگ اسلحہ سے نہیں ہے۔ کانگریس کی اس جنگ نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ حکومتی اختیارات

ہندوستانیوں کے حوالہ کرے، وہ اختیارات کا کافی حصہ دے بھی چکی ہے اور حالات جس رفتار سے چل رہے ہیں اُن سے اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب ہی میں برطانوی حکومت باقی اختیارات بھی ہندوستانیوں کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو جائے گی، اور یہاں قومی جمہوری حکومت اُس کی جگہ لے گی، ہم مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں جب بھی یہی ہوگا، اور کانگریس کا ساتھ نہ دیں جب بھی یہی ہوگا، زیادہ سے زیادہ کچھ دیر سویر کا فرق پڑے گا، یہاں جو جمہوری حکومت قائم ہوگی ہمیں ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے اور کسی کو بھی یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ وہ اسلامی حکومت ہوگی۔ وہ ہندوستانی جمہوری حکومت ہوگی۔

اب ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں، ایک یہ کہ ہم آزادی کی اس جنگ میں کوئی حصہ نہ لیں، اس صورت میں جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ظاہر ہے کہ ہم اس میں مؤثر نہیں ہو سکیں گے اور ہمارے اندر سخت کمتری کا اور شرمندگی کا احساس ہوگا، ہم خود اپنے کو برابر کا شریک اور حق دار نہیں سمجھیں گے اور روزِ اُردو قوت سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی جنگ میں شریک ہوں، اس صورت میں ہمیں یہ امید ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ہم اُس میں مؤثر اور دخل ہوں گے، وہ اسلامی حکومت تو نہیں ہوگی لیکن ہمارے دینی مقاصد کے لیے بھی موجودہ انگریزی حکومت سے ہمارے لیے وہ بہتر ہوگی، اور ہماری حیثیت اُس میں ایک ایسے شریک کی ہوگی جو جنگ اور قربانی میں بھی شریک رہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنے اس نقطہ نظر کی وضاحت کے بعد فرمایا۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے، ہم مسلمانوں کے لیے اس دوسرے راستہ کو صحیح سمجھتے ہیں اور فیما بیننا وبين اللہ اس پر مطمئن ہیں۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے اس پر اتنا اضافہ فرمایا ”لتكون كلمة الله هي العليا“ (کلمہ اسلام کے بلند ہونے کا) اعلیٰ درجہ تو بے شک یہ ہے کہ صحیح دینی اصولوں پر اسلامی حکومت قائم ہو۔ اس کا تو ایک دوسرا درجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی امور اور معاملات کے لحاظ سے اس وقت ہماری جو حالت ہے، اس سے بہتر حالت ہو جائے، ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسی امید پر کر رہے ہیں اور اس کا راستہ ہمارے نزدیک یہی ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے غالباً اسی مرحلہ پر یہ بھی فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں یہ بات بھی اس مجلس میں ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس راستہ میں جس کو ہم مسلمانوں کے لیے صحیح سمجھتے ہیں اور جس کو ہم نے اختیار کیا ہے، بعض منکرات بھی پیش آتے ہیں، مثلاً ہم کانگریس کی میٹنگ شریک ہیں۔ اس کے ارکان اور ممبران میں عورتیں بھی ہیں وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوں گی، بحث مباحثہ میں حصہ لیں گی،

جلسہ میں تقریر بھی کریں گی یہ سب ہماری موجودگی اور ہمارے سامنے ہوگا، اگر ہم شرکت ضروری سمجھتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم شریک رہیں، اور کارروائی میں حصہ لیں اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں۔ ہم نے اس پر بھی بار بار غور کیا ہے اور فیما بیننا و بین اللہ ہم مطمئن ہیں کہ ان منکرات کے باوجود ہمیں کانگریس میں شریک ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ — اس طرح کے منکرات سے واسطہ تو مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی پڑتا ہے۔

اس گفتگو میں جہاں تک اب یاد ہے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اور حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کے سوا حاضرین میں سے کسی نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا، حضرت تھانویؒ نے بھی اس دن اس سلسلہ میں اپنے کسی رجحان کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ پہلی دو گفتگوؤں کے آخر میں حضرت نے اپنے جس تاثر اور رائے کا اظہار فرمایا تھا اب اس میں غالباً فرق پڑ چکا ہے اور حضرت کا موقف وہ نہیں رہا ہے جو میرے دہلی جانے سے پہلے تھا یا کم از کم یہ کہ میں نے جو سمجھا تھا۔

حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب (ناظم مظاہر علوم سہارنپور) نے بھی اس مجلس میں کچھ گفتگو فرمائی تھی اور مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گتھلوی مرحوم نے بھی ایک مختصر تحریر پڑھ کر سنائی تھی جو وہ قلم بند کر کے لائے تھے، لیکن یہ دونوں چیزیں مجلس کے اصل موضوع سے غیر متعلق تھیں اور اب اُن کا ذکر کرنا غالباً مناسب بھی نہ ہوگا۔

یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ مجلس شرکاء میں جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی تھے، حضرت نے ان کو بھی بلوایا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے وہ اُس وقت پہنچ سکے تھے جب بات شروع ہو چکی تھی۔ یہ مجلس قریباً ۳-۴ گھنٹے جاری رہی، آخر میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اب کافی وقت ہو گیا اور مسئلہ سے متعلق سارے پہلو سامنے آ گئے، اب آپ حضرات کھانے سے فارغ ہو لیں اور آرام فرمائیں۔ چنانچہ مجلس برخاست ہوئی۔ ہم لوگوں نے مولانا شبیر علی صاحب مرحوم کے مکان پر آکر کھانا کھایا اور آرام کیا۔ یہ شعبان کی ۱۵ تاریخ تھی، خود حضرت تھانویؒ کا اور وہاں کے اکثر دوسرے حضرات کا بھی اور غالباً بہارنپور سے آنے والے حضرات کا بھی اُس دن روزہ تھا۔ ظہر کی نماز ہم لوگوں نے خانقاہ میں پڑھی، ظہر کے بعد حسب معمول حضرت کی مجلس ہوئی۔ جہاں تک یاد ہے، سب حضرات نے مجلس میں شرکت فرمائی۔ رات کے کھانے کا اہتمام خود حضرت نے اپنے بڑے گھر پہ کیا تھا۔ صحیح گفتی تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ کھانے کی انواع و اقسام بہت تھیں، اور حضرت نے بڑا اہتمام فرمایا تھا۔

جلس کے موضوع پر پھر کسی گفتگو کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری سے (جو خانقاہ کے اس مجمع میں اور حضرت کے خاص معتمدین میں میرے خیال سے نسبتاً قریب تھے) تنہائی میں دریافت کیا کہ آپ کا کیا اندازہ ہے، حضرت نے پرسوں کی مجلس میں اپنے جس رجحان کا اور آخر میں جس رائے کا اظہار فرمایا تھا جس میں جمیعۃ العلماء اور کانگریس میں شرکت تک کی بات فرمائی تھی، کیا اب حضرت کی رائے وہ نہیں رہی؟۔ انھوں نے فرمایا میرا اندازہ یہی ہے کہ اب حضرت کو اُس رائے پر اطمینان نہیں رہا اور مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس فرماتے ہیں۔

اُسی رات میں یا اگلے دن صبح کی ٹرین سے ہم لوگوں کی تھانہ بھون سے واپسی ہو گئی۔ اُس کے بعد دوسرے ذرائع سے مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ حضرت کی رائے کے بارے میں میرا اور مولانا خیر محمد صاحب کا اندازہ صحیح تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں حضرت نے میری بات سن کر جو غیر معمولی اثر فوری طور پر لیا گیا تھا اور اس کی بنا پر جو رائے ہو گئی تھی، جس کا پہلی مجلس میں اظہار بھی فرمایا تھا، وہ حضرت کے عمر بھر کے طرز فکر اور طرز عمل اور ذوق و مزاج کے بالکل خلاف نیز حضرت کے پورے ماحول کے بھی بالکل خلاف ہونے کی وجہ سے خود میرے لیے بھی انتہائی حیرت کا باعث ہوا تھا، اس لیے اُس رائے میں تبدیلی واقع ہو جانے کی اطلاع سے اگرچہ قدرتی طور پر مجھے افسوس ہوا لیکن کوئی تعجب نہیں ہوا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کا ہے جبکہ صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کو قائم ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے، بعد میں ان حکومتوں کے رویہ سے مسلمانوں میں عام طور سے کانگریس سے بدظنی اور دوری بڑھتی ہی رہی، ان ہی چند مہینوں میں خاص کر ہمارے صوبہ یوپی میں مسلم لیگ کا زور شروع ہوا اور اُس نے کانگریس اور اس کی حکومتوں کے خلاف وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈے کی مہم شروع کی (جس کے لیے کسی حد تک مواد کانگریسی حکومتوں کے رویہ نے بھی فراہم کیا) اس صورتحال نے حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کی ”نظام ملت“ والی اسکیم کی کامیابی کے امکانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا اور غالباً اسی وجہ سے پھر جمعیۃ العلماء کے کسی جلسہ میں بھی باضابطہ اُس پر غور و بحث کی نوبت نہیں آئی۔

حالات کی اس رفتار نے قدرتی طور پر حضرت تھانویؒ کے اس احساس کو اور آگے بڑھایا کہ کانگریس کے بارے میں ہمارا جو طرز عمل اور طرز فکر رہا ہے وہی صحیح تھا اور صحیح ہے اور اس طرح مسلم لیگ کے ساتھ ایک

مرح کا چنی قرب اور ہمدردی کا جذبہ بڑھتا رہا اور بعد میں تو کھلی حمایت کا فیصلہ بھی فرمایا۔ قُلْ كُلُّ
يَفْعَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ فَرُبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا

دارالعلوم دیوبند کے میرے خاص متعارف اساتذہ میں ایک صاحب مولانا سید حسن صاحب
دیوبندی مرحوم تھے۔ بڑے صالح عالم دین تھے، حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے بیعت اور اصلاح
و تربیت کا تعلق تھا۔ جلدی جلدی تھانہ بھون حاضر ہونے کا اُن کا معمول تھا۔ حضرت کے وصال کے بعد ایک
دن انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ حضرت کی مجلس میں تھانہ بھون حاضر تھا۔ حضرت نے تم سے
متعلق کسی واقعہ کا کچھ ذکر کیا جس کا تعلق جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے تھا اور تمہارے بارے میں فرمایا کہ
”میں اُس وقت ان کے اخلاص سے مغلوب ہو گیا“۔ مولانا سید حسن صاحب نے یہ بات بیان
کر کے مجھ سے دریافت کیا کہ وہ کیا واقعہ تھا؟ حضرت نے مجلس میں واقعہ تفصیل سے نہیں فرمایا تھا، اور پوچھنے
کی میری ہمت نہ ہوئی، اگر آپ کو یاد ہو تو بتلائیے! مجھے مولانا سید حسن صاحب مرحوم کے اس بیان سے
پہ معلوم کر کے کہ حضرت قدس سرہ نے مجھے اس درجہ کا مخلص گمان کیا، بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے
اس حسن ظن کو میرے حق میں واقعہ بنادے۔ میں نے مولانا سید حسن صاحب کو یہ واقعہ پوری تفصیل سے
سنا یا، انھوں نے غالباً فرمائش کی کہ اس کو اسی تفصیل میں لکھ دو۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات جن
کے سامنے یہ واقعہ بیان کرنے کی نوبت آئی، انھوں نے بھی یہی فرمائش کی، خود میں بھی ضروری سمجھتا تھا کہ
اس واقعہ کو لکھ کر محفوظ کر دیا جائے کیونکہ اس کے سارے اجزاء اور اس سلسلہ کی ساری کڑیاں میرے سوا کسی
بھی دوسرے کے علم میں نہیں تھیں اور نہیں ہیں۔ آج قریباً ۳۶ سال کے بعد اس کو حوالہ قلم کرنے کی
توفیق ملی ہے۔

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام واحسان یہ بھی ہے کہ اس طرح کے واقعات اپنی پوری
تفصیلات کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ لَا اُخْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ
اَنْتَ كَمَا اَتَيْتَ عَلٰی نَفْسِكَ!

تیسری حاضری اور ایک قابل ذکر واقعہ

گزشتہ صفحات میں حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں ۱۷۳۷ء کی حاضری کا وہ غیر معمولی واقعہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے جو بہت سوں کے لیے موجب حیرت ہوگا، اور اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ اسی وقت سے ملک میں مسلم لیگ کا زور عوامی پیمانہ پر شروع ہوا۔ اس سے پہلے مسلم عوام سے اس کا کوئی رابطہ اور تعلق نہیں تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے حضرت تھانویؒ نے ہمارے دوسرے اکثر اکابر کے طرز عمل کے برخلاف اپنے کو سیاسی تحریکات سے ہمیشہ الگ رکھا تھا اور اپنے لیے اس کو بہتر سمجھا تھا۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ حضرت کا ذہن اور ذوق جمعیۃ العلماء کے سیاسی مسلک سے مختلف اور مسلم لیگ کے طرز فکر اور طرز عمل سے قریب تھا اور ۱۹۳۷ء کے بعد یہ قرب جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، بڑھتا ہی گیا۔

اسی زمانہ میں (یعنی ۱۹۳۷ء و ۱۹۳۸ء میں) یہ ہوا کہ کانگریسی حکومتوں کے بعض معاملات اور کارروائیوں پر مسلمانوں کے تعلق سے ”الفرقان“ میں سخت تنقیدیں کی گئیں۔ اسی کے ساتھ جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے بعض ایسے حضرات کے رویہ سے (جن کو ہم لوگ اُس زمانہ میں جمعیۃ کا ”بایاں بازو“ اور ”فارورڈ بلاک“ کہا کرتے تھے) کھل کر اختلاف کا اظہار کیا گیا۔ الفرقان کے ان مضامین کو مسلم لیگ کے حامی بعض اخبارات نے بھی نقل کیا۔ غالباً ان باتوں کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ خیال کر لیا کہ راقم سطور مسلم لیگ سے قریب ہو رہا ہے۔ اُس وقت کے اس ماحول اور اس صورتحال کو ذہن میں رکھ کر مندرجہ ذیل واقعہ پڑھئے۔

سنہ اور مہینہ ٹھیک سے یاد نہیں، غالباً ۱۹۳۸ء کے اواخر یا ۱۹۳۹ء کے اوائل کی بات ہے، راقم سطور بریلی رہتا تھا، الفرقان وہیں سے نکلتا تھا، ایک دن حضرت حکیم الامتؒ قدس سرہ کا تار ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ ”ایک مشورہ کے لئے تمہاری ضرورت ہے“۔ میں غالباً اسی دن تھانہ بھون کے لیے روانہ ہو گیا۔ حضرت سے ملاقات ہوئی، حسب معمول سلام و مصافحہ ہوا، اسی وقت فرمایا کہ ایک معاملہ میں بات کرنے کی ضرورت تھی اس لیے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے، لیکن وہ بات آپ سے مولوی ظفر کریں گے، وہ میری ہی بات ہوگی، یہ میں نے اس لیے مناسب سمجھا ہے کہ آپ زیادہ آزادی اور بے تکلفی سے بات کر سکیں۔

مولانا ظفر احمد صاحب بھی اس وقت تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ان کو اجازت دے دیں یہ رات کا کھانا میرے یہاں کھالیں اور وہیں رات کو آرام کریں، اس طرح باتیں زیادہ اطمینان سے ہو سکیں گی۔ یہی طے ہو گیا۔ کھانے سے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہ گفتگو ہوئی۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ ابھی چند روز پہلے نواب اسماعیل خاں^۱ اور کنور جمشید علی خاں یہاں آئے تھے، انھوں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ”جمیۃ العلماء اور خاص کر مولانا حسین احمد صاحب اپنی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس کے ساتھ ہیں اور مسلمانوں کو اس کی حمایت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس کا مسلمانوں پر بہت اثر پڑ رہا ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہمارے تمام علماء کرام کی یہی رائے ہے؛ اس کی وجہ سے مسلم لیگ کے کام میں بہت رکاوٹ پڑ رہی ہے، ہم یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ حضرت کی طرف سے بھی مسلم لیگ کی کھلی تائید اور حمایت ہو، اس کے لیے حضرت ایک بیان تحریر فرمادیں اور ہم کو اس کی اشاعت کی اجازت دے دیں“۔ حضرت نے فرمایا کہ ”اگرچہ مجھے مسلم لیگ سے اور آپ حضرات سے ہمدردی ہے لیکن جس طرح کی تائید آپ چاہتے ہیں اُس کے لیے جیسا اطمینان قلب ہونا چاہئے وہ مجھے نہیں ہے اس لیے اس سے معذور ہوں“۔ اُن دونوں حضرات نے عرض کیا کہ ”حضرت کے اطمینان کے لیے جو شرط ہو ہم اُس کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے“۔ حضرت نے مسلم لیگ کے نظام اور فیصلوں کے طریقہ کار کے بارہ میں اُن سے دریافت کیا تو انھوں نے بتلایا کہ فیصلوں کا زیادہ تر دارو مدار رنگ کمیٹی پر ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ ”اگر آپ حضرات یہ طے کر لیں کہ ورکنگ کمیٹی میں ایک آدمی وہ ہوگا جس کو میں منتخب کروں گا اور دینی معاملات میں اُسی کی رائے کو فیصلہ کن سمجھا جائے گا تو میں اس طرح کی تائید کر سکوں گا جس طرح کی آپ چاہتے ہیں“۔ (مولانا ظفر احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ) اس بارہ میں دیر تک گفتگو رہی، آخر میں انھوں نے عرض کیا کہ اس کا قطعی جواب چند روز کے بعد ہم دے سکیں گے۔ چند دن کے بعد وہ پھر (تھانہ بھون) آئے اور عرض کیا کہ حضرت کی شرط مان لی گئی ہے البتہ یہ گزارش ہے کہ جن صاحب کو حضرت نامزد فرمائیں وہ سیاسی مسائل و معاملات اور ہماری مشکلات سے واقف ہوں۔ حضرت نے فرمایا ”میں اس بات کا پورا لحاظ رکھوں گا اور اب غور کر کے نام کے بارے میں اطلاع دوں گا۔“

(۱) نواب اسماعیل خاں مرحوم (میرٹھی) اس وقت ہمارے صوبہ کی مسلم لیگ کے صدر اور مسلم لیگ کی اہم شخصیتوں میں سے تھے اور مسلم طور پر مسلمانوں کے صاحب کردار لیڈر، کنور جمشید علی خاں مرحوم (باغپت) بھی مسلم لیگ کی نمایاں شخصیتوں میں تھے، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت کا خاص تعلق تھا اور آمدورفت بھی رکھتے تھے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ واقعہ سنانے کے بعد مجھے بتلایا کہ ”اس کے بعد حضرت نے ہم لوگوں سے مشورہ فرمایا۔ متحد حضرات کے نام سامنے آئے لیکن کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں ہو سکا، آخر میں خود حضرت نے تمہارا نام لیا تو سب نے اطمینان ظاہر کیا اور یہی طے ہو گیا۔ حضرت نے تم کو تار دے کر اسی لیے بلوایا ہے کہ تمہاری منگھوری کے بعد تمہارا نام وہاں بھیج دیا جائے۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے اس بیان سے اپنے بارے میں حضرت حکیم الامت کا اس درجہ حسن ظن اور اعتماد معلوم کر کے مجھے قدرتی طور پر بے حد خوشی ہوئی، اسی کے ساتھ انتہائی حیرت بھی ہوئی کہ میرے بارہ میں ایسی غلط فہمی کیوں ہوئی، میں اُس وقت جمعیۃ العلماء سے باضابطہ وابستہ تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اسی کے سیاسی مسلک کو اصولی اور بنیادی طور پر صحیح سمجھتا تھا، اگرچہ بعض معاملات میں میری مستقل ذاتی رائے تھی۔

میں نے مولانا ظفر احمد صاحب سے عرض کیا کہ میرے بارہ میں حضرت کو اور آپ حضرات کو غالباً غلط فہمی ہوئی ہے، میں تو مسلم لیگ کے راستہ کو اصولی طور پر صحیح نہیں سمجھتا، اس لیے جو کچھ آپ حضرات نے سُنا ہے، اُس کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے، میں تعمیل نہیں کر سکوں گا۔ اس کے علاوہ میں عرض کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں کوئی بھی سیاسی یا قومی جماعت کسی ایک آدمی کو اور وہ بھی مجھ جیسے ایک غریب مولوی کو ایسا اختیار اور بالاتر مقام ہرگز نہیں دے سکتی، مجھے تو شبہ ہے کہ شاید اس بارہ میں بھی کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسٹر جناح نے اس کے لیے رضامندی دے دی ہو، اور مسلم لیگ میں اصل شخصیت اُن ہی کی ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے مجھے سمجھانے کی اور اپنی بات منوانے کی کوشش فرمائی لیکن میں اپنی رائے اور موقف پر قائم رہا۔ اس گفتگو کا سلسلہ دیر رات تک جاری رہا تھا۔ آخر میں مولانا نے فرمایا کہ اس وقت کے اپنے جواب کو آخری جواب قرار مت دو۔ آج رات کو استخارہ بھی کرو اور آخری جواب مجھے صبح دو! میں نے عرض کیا کہ استخارہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں کسی معاملہ میں تردد اور تذبذب ہو لیکن جس معاملہ میں قطعیت کے ساتھ ایک رائے قائم ہو وہاں استخارہ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن مولانا نے اس کے بعد بھی استخارہ کے لیے فرمایا۔

اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے استخارہ کیا یا نہیں، صبح کو مولانا نے دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ جواب وہی ہے جو رات عرض کر چکا ہوں۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے میری اور اپنی گفتگو کا ذکر حضرت حکیم الامت سے کر دیا ہو گا خود حضرت نے اس سلسلہ میں مجھ سے کوئی بات نہیں فرمائی۔ غالباً صرف اس لیے کہ میرے دل پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔

مجھے اس کا بذا تلقی رہا کہ حضرت نے جس مقصد سے مجھے تار دے کر طلب فرمایا تھا وہ میرے ذریعہ پورا نہ ہو سکا لیکن دل کو اطمینان رہا کہ میرے اس رویہ سے حضرت کو ذرہ برابر گرائی نہ ہوئی ہوگی بلکہ اس سے خوشی ہوئی ہوگی کہ جس بات کو میں نے صحیح نہیں سمجھا اُس کے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ پھر مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلہ کا آخری انجام کیا ہوا، راقم سطور کا یہ خیال ہے کہ پھر اس تجویز پر غالباً عمل ہی نہیں ہوا۔ تاہم جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، بعد میں حضرت نے اپنے خاص انداز میں شرعی قیود و تحفظات کے ساتھ مسلم لیگ کی کھل کر تائید و حمایت بھی فرمائی اور ظاہر ہے کہ مسئلہ اجتہادی تھا جس میں غلطی ہونے کی صورت میں بھی۔ بشرط اخلاص اجر موعود ہے۔

حضرت حکیم الامت کا مستقل معمول تھا کہ صبح (غالباً ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر) خانقاہ تشریف لے آتے تھے اور دو پہر تک پورے انہماک و یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تحریر کے کام میں مشغول رہتے، کسی غیر معمولی ضرورت اور خاص استثناء کے بغیر اس وقت میں کسی سے ملاقات بھی نہیں فرماتے تھے، جس رات کو مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکان پر مذکورہ بالا گفتگو فرمائی اس کی صبح کو میں خانقاہ کے ایک حجرہ میں تھا۔ ۹ بجے کا وقت ہوگا، حضرت کے ایک خادم حضرت کا یہ پیام لائے کہ حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج میں اس وقت فارغ ہوں اگر جی چاہے تو آجائیں۔ حیرت ہوئی اور میں نے اس کو حضرت کی خاص الخاص عنایت ہی سمجھا۔ میں اسی وقت حاضر ہو گیا۔ جہاں تک یاد ہے اس وقت کوئی اور صاحب حضرت کے پاس نہیں تھے۔ حضرت نے بغیر کسی تمہید و تقریب کے اور بغیر میرے سوال کے سلوک اور تزکیہ کی ضرورت اور دین میں اس کی اہمیت پر ایک تقریر شروع فرمائی، یہ تقریر تسلسل کے ساتھ کم از کم ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی۔ اگر وہ قلمبند کی گئی ہوتی تو اس موضوع پر ایک کافی شافی تصنیف ہو جاتی، میں خاموشی اور توجہ سے صرف سنتا رہا۔ یہاں میں اپنا یہ حال بھی ظاہر کر دوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں سلوک و تصوف سے ذہنی طور پر کچھ دور ہو گیا تھا، اور میرے اندر اس کی کوئی طلب بھی نہیں تھی اور غالباً طلب کے اس فقدان ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت حکیم الامت کی اس نہایت مبسوط اور مدلل تقریر کا بھی مجھ پر وہ اثر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا اور وہ فائدہ اس سے میں نے اس وقت نہیں اٹھایا جو اٹھانا چاہیے تھا۔ بلاشبہ یہ بڑی محرومی تھی۔ لیکن اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور رائے پور کی خانقاہ میں وہ واقعہ پیش آیا جو ناظرین کرام چند ہی ورق کے بعد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں اس عاجز کی حاضری کے سلسلے میں انشاء اللہ ^{تجلی} برہیں گے۔ اور بفضلہ تعالیٰ اُس ذہنی بیماری سے نجات مل گئی۔

فالحمد لله الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لولا ان هدانا الله.

چوتھی بار حاضری

حضرت حکیم الامت کی وفات سے قریباً دو سال پہلے کی بات ہے، کافی عرصے سے حضرت کی علالت اور مزاج کی ناسازی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ناچیز راقم سطور نے زیارت اور عیادت ہی کی نیت سے تھانہ بھون کا سفر کیا، بریلی سے سہارنپور پہنچا، وہاں سے تھانہ بھون جانے والی چھوٹی لائن کی ٹرین کے ایک ڈبہ میں سوار ہو گیا۔ اتفاق سے اسی ڈبے میں دو صاحب اور بھی تھے جو حضرت کی زیارت ہی کے لیے جا رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب بخجور کے کسی کالج یا اسکول کے استاد تھے جن کو میں نے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ تھانہ بھون میں دیکھا تھا، وہ حضرت حکیم الامت سے بیعت تھے اور خاص درجہ کا تعلق رکھنے والوں میں سے تھے۔ افسوس ہے اس وقت مجھے ان کا نام یاد نہیں آیا۔ دوسرے صاحب جوان کی رفاقت میں جا رہے تھے غالباً سیوہار ضلع بخجور کے ایک مولوی صاحب تھے، یہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ تھے اور آج پہلی دفعہ حضرت کی زیارت کے لیے تھانہ بھون جا رہے تھے۔ حضرت کے جلالی مزاج کے بارے میں جو عام شہرت ہمارے حلقہ میں بھی تھی، یہ مولانا صاحب اس کی وجہ سے بہت خائف تھے اور ان کے رفیق ان کو بتلا رہے تھے کہ یہ شہرت بالکل غلط ہے، حضرت کے مزاج میں تو بڑی شفقت ہے۔ ہاں! بے اصولیوں اور بے عنوانیوں سے حضرت کو تکلیف و ناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کبھی مزاج میں برہمی بھی آ جاتی ہے، وہ ان کو بتلا رہے تھے کہ آپ بس ان چند باتوں کا لحاظ رکھیں۔

مجھے چونکہ ہمیشہ حضرت کی عنایتوں اور شفقتوں ہی کا تجربہ ہوا تھا اور اپنے بارہ میں یہ بھی خوش گمانی تھی کہ حضرات کے مزاج کو میں نے سمجھ لیا ہے اس لیے خواہ مخواہ میں بھی ان مولوی صاحب کا اتالیق بن گیا۔ اور حضرت کی عنایتوں، شفقتوں کے تجربے ان کو سنا کر مطمئن کرنے لگا۔ اور حضرت کے کسی بڑے مزاج والے صحبت یافتہ کی طرح ان کو مشورے بھی دینے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں تھانہ بھون پہنچ کر اپنی حقیقت معلوم ہو گئی۔

ظہر کی نماز جماعت نے خانقاہ کی مسجد میں پڑھی، اس سے پہلے حضرت سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

حضرت جب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے اپنی نشست گاہ کی طرف جانے لگے تو ابھی حضرت صحن مسجد ہی میں تھے اور سخت ضعف و نقاہت کی وجہ سے حضرت کے قدم بہت ہی آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے کہ مجھ سے یہ بے تمیزی سرزد ہو گئی کہ بجائے اس کے کہ اس کا انتظار کرتا کہ حضرت اپنی نشست گاہ پر پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ جائیں فرط شوق سے راستہ ہی میں حضرت کے سامنے آ کر سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے حضرت نے ٹھہر کر مصافحہ تو فرمایا لیکن ساتھ ہی بڑے مظلومانہ انداز سے فرمایا۔

یار پہ تو رحم کھانا چاہیے

حضرت کے ان الفاظ سے اس وقت دل کی جو کیفیت ہوئی اور اپنی بے تمیزی کے احساس سے قلب پر جو بوجھ پڑا اس کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال میں اپنی غلطی کے احساس اور اس سے پیدا ہونے والے تاثر میں ڈوب گیا۔ حضرت خانقاہ کی سہ دری میں اپنی نشست گاہ پر جا کر تشریف فرما ہو گئے، دوسرے سب لوگ بھی مجلس کے معمول کے مطابق بیٹھ گئے۔ میں پیچھے اس طرح بیٹھا کہ حضرت کی نظر نہ پڑے۔ حضرت نے حاضرین پر نظر ڈالی اور میرا نام لے کر فرمایا کہ ”میرا خیال ہے کہ وہ تھے“۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت میں حاضر ہوں، حضرت نے بڑی شفقت اور عنایت کے ساتھ قریب بلایا اور بالکل برابر میں بیٹھنے کے لیے حکم فرمایا۔ مجھے تعیل کرنی پڑی لیکن جیسا کہ چاہیے تھا ادب سے غالباً دو زانو بیٹھا حضرت نے فرمایا بے تکلف آرام سے بیٹھے۔ اس سے مجھے انشراح ہوگا۔ میں نے اس حکم کی بھی تعیل کی۔ لیکن اپنی غلطی اور بے تمیزی کا بے حد اثر تھا۔ حضرت نے غالباً اسکے ازالہ ہی کے لیے اس دن کی مجلس میں اس نالائق پر بہت ہی غیر معمولی عنایت مبذول فرمائی۔

جب عصر کی اذان پر مجلس ختم ہوئی تو قیام کے بارے میں دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا آج رہوں گا کل واپسی کا ارادہ ہے۔ فرمایا کہ آج کل میں بیمار اور ضعف کی وجہ سے صرف ظہر اور عصر کی نمازیں یہاں (خانقاہ کی مسجد میں) پڑھتا ہوں۔ مغرب عشاء اور فجر کی نماز میں نہیں آتا۔ اگر طبیعت اچھی رہی تو میں مغرب کے بعد آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ آپ کا جی چاہے تو اس وقت گھر پہنچ جائیں۔ مجھے جیسے بے مایہ اور ذلیل آدمی پر عنایت و شفقت کی یہ آخری حد تھی۔ ورنہ جہاں تک معلوم ہے بہت ہی خاص استثنائی صورتوں کے علاوہ حضرت کا یہ معمول بالکل نہیں تھا۔

میں نے مغرب کی نماز خانقاہ کی مسجد میں پڑھی، جب نوافل سے فارغ ہوا تو مولانا جمیل احمد تھانوی تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری طبیعت اس وقت اچھی ہے، اگر آپ کا جی چاہے تو میرے پاس آجائیں۔ میں حاضر ہو گیا۔

حضرت ایک تخت پر تشریف فرماتے۔ اس کے بالکل برابر میں پلنگ تھا، جو تخت سے قریب ایک باشت اونچا رہا ہوگا۔ سرہانے ایک بڑا تکیہ بھی لگا ہوا تھا۔ میں حاضر ہوا تو حضرت نے مجھے اس پلنگ ہی پر بیٹھنے کو فرمایا۔ مجھے یہ بات اپنے لیے کچھ خلاف ادب معلوم ہوئی کہ میں حضرت سے بلند جگہ پر بیٹھوں، اس لیے کچھ تامل ہوا۔ حضرت نے محسوس فرمایا اور پھر پلنگ ہی پر بیٹھنے کے لیے فرمایا، مجبوراً تعمیل کی، قریباً ایک گھنٹہ یہ حاضری نصیب رہی، طبیعت کی ناسازی اور سخت ضعف و نفاہت کے باوجود ارشادات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

اس زمانہ میں میرا حافظہ ایسا تھا کہ اگر دو چار دن کے بعد بھی اس صحبت کے ملفوظات قلمبند کرنے کی کوشش کرتا تو بڑی حد تک حضرت ہی کے الفاظ میں قلمبند کر لیتا۔ لیکن افسوس اُس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ کچھ مدت کے بعد حافظہ میں اتنا فرق پڑ جائے گا۔

اُس مجلس اور اس صحبت کا ایک ملفوظ اب تک بھی اچھی طرح یاد ہے لیکن اب روایت بالمعنی ہی ہوگی۔ سلسلہ کلام میں اپنی اصول و اوقات کی پابندی کی عادت کے بارے میں فرمایا کہ بعض اوقات دوستوں کو اس سے شکایت پیدا ہوتی ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کی رعایت نہیں کرتا حالانکہ میں اپنے نزدیک رعایت نگہی پوری کوشش کرتا ہوں۔ ہاں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے اصول و اوقات کی بھی حتی الوسع پابندی کروں اس سے کام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو میرے استاد تھے تشریف لائے، میرے یہاں قیام تھا۔ میں ان دنوں میں (مثنوی شریف کی شرح) ”کلید مثنوی“ لکھ رہا تھا اور اس کا ایک وقت مقرر کر لیا تھا، لکھنے کی جگہ بھی مقرر تھی، جب اس کے لکھنے کا وقت آیا تو میرے دل میں اس کا تقاضا پیدا ہونے لگا، پہلے تو میں نے سوچا کہ نانہ کر دوں پھر خیال ہوا کہ دل ادھر لگا رہے گا اور اس کا وقت گزر جانے کے بعد بھی دل پر نانہ کا اثر رہے گا، اور جیسی یکسوئی اور فراغ قلب کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بیٹھنا چاہیے وہ بات نصیب نہ ہوگی، تو میں نے طے

کیا کہ حضرت مولانا سے اپنا حال عرض کر دوں، پھر جو فرمادیں اس پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میں مثنوی شریف کی شرح لکھ رہا ہوں اور اس کے لیے وقت مقرر کر لیا ہے، عادت کے مطابق اس وقت بھی دل میں اس کا تقاضا ہے، لیکن اس کے لیے دل آمادہ نہیں کہ حضرت یہاں تشریف فرما ہوں اور میں کسی کام کے لیے الگ جا کر بیٹھ جاؤں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت جا کر وہی لکھو۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ جتنی دیر میں غیر حاضر ہوں گا اتنے وقت میں حضرت کو کیا ضرورت پیش آسکتی ہے، جو کچھ سمجھ میں آیا اس کا میں نے انتظام کیا، پھر ایک عزیز کو جو میرے نزدیک فہیم بھی تھے سب سمجھایا اور ان سے کہا کہ میری واپسی تک وہ حضرت کی خدمت میں رہیں، اس کے بعد میں ”کلید مثنوی“ لکھنے چلا گیا، لیکن اس دن صرف ایک شعر کی شرح لکھی، اس سے آگے لکھنے کے لیے خود دل آمادہ نہیں ہوا اور جلد ہی حضرت کی خدمت میں آ گیا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اتنی جلدی کیوں آ گئے؟ میں نے عرض کیا کہ بس ایک شعر کی شرح لکھ کر دل کا تقاضا ختم ہو گیا۔ اس کے آگے لکھنے کے لیے دل ہی نہ چاہا اس لیے چلا آیا۔

اسی سلسلہ کلام میں اس سیدہ کار کے بارے میں ایک بات ایسی ارشاد فرمائی جس کا مصداق میں اپنے کو کسی طرح نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے حضرت کی زبان کی برکت سے وہ چیز نصیب فرمادے۔ وما ہو علیہ بعزیز —

اس دفعہ کی حاضری میں حضرت قدس سرہ کی جو خاص الخاص اور غیر معمولی عنایات نصیب ہوئیں، میرا خیال ہے کہ سب اس کا طفیل تھا کہ مجھ سے ایک بے تمیزی سرزد ہوئی جس پر حضرت نے یہ فرما کر کہ ”بہار پر تو رحم کھانا چاہیے“ مصلحانہ تنبیہ فرمائی، جس سے مجھے اپنی غلطی اور بے تمیزی کا شدید احساس ہوا اور میں اس احساس و تاثر میں ڈوب گیا، حضرت نے اس کے ازالہ کے لیے اور میری تطہیب خاطر کے لیے یہ غیر معمولی عنایتیں فرمائیں، اس طرح اپنی ایک غلطی اور بے تمیزی بھی اتنے عظیم خیر کا وسیلہ بن گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ کریمانہ اخلاق تو بس ان اللہ والوں ہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تَخْلَقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ کی نعمت اس سیدہ کار کو بھی نصیب فرمادے۔

آخری حاضری

مرض، جو بالآخر مرض وفات ثابت ہوا، اس کا سلسلہ تو کئی سال سے چل رہا تھا، لیکن آخری چند مہینوں میں ضعف بہت بڑھ گیا تھا۔ یہ عاجز حضرت کی وفات (۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ م جولائی ۱۹۴۳ء) سے غالباً دو دو حائے مہینے پہلے زیارت اور عیادت ہی کی نیت سے تھانہ بھون حاضر ہوا۔ ان دنوں حضرت خانقاہ کسی بھی وقت تشریف نہیں لاتے تھے اور تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ دولت کدہ کے قریب ہی ایک مکان کی بیرونی نشست گاہ میں ظہر کے بعد کچھ وقت کے لیے تشریف لاتے تھے، اور مجلس ہوتی تھی۔ یہ مکان حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب کا تھا (جو حضرت حکیم الامت کے عاشق اور محبوب خلیفہ تھے اور انھوں نے کچھ عرصہ پہلے سے تھانہ بھون ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی)۔

یہ عاجز ظہر سے کچھ پہلے پہنچا تھا، خانقاہ کی مسجد میں ظہر پڑھ کے وہیں حاضر ہو گیا، جو حضرات مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے وہ وہاں کے ضابطے کے مطابق بیٹھ گئے تھے، حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے، میں بھی پیچھے ایک طرف بیٹھ گیا اور بالارادہ اس طرح بیٹھا کہ جو جاننے پہچاننے والے حضرات مجلس میں تھے اُن کو بھی میری حاضری کی خبر نہیں ہوئی، اس وقت میں نے کسی وجہ سے یہی مناسب سمجھا تھا، میرے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد خواجہ صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ حضرت تشریف لانے والے ہیں کوئی صاحب کھڑے نہ ہوں اور مصافحہ کی کوشش نہ فرمائیں، حضرت خود ہی حاضرین مجلس کو سلام کریں گے، آپ حضرات جواب دے دیں، اگر خود حضرت کسی صاحب سے کچھ دریافت فرمائیں تو وہ جواب دے دیں۔

خواجہ صاحب یہ اعلان کر کے بیٹھ گئے اور حضرت فوراً ہی تشریف لے آئے، ایک ہاتھ میں عصا تھا جس کے سہارے چل کر آرہے تھے، اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ شدتِ ضعف کی وجہ سے بہت مشقت سے چل رہے ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں ٹین کا ایک گول اور لانا سا ڈبہ تھا جس میں مخطوط رہتے تھے۔ مجلس میں داخل ہوتے ہی فرمایا السلام علیکم۔ حاضرین نے جواب عرض کیا، ایک چوکی بھی ہوئی تھی اُس پر بکریہ بھی لگا ہوا تھا، حضرت اس پر خود ہی بیٹھ گئے، میں نے دیکھا کہ شدتِ ضعف کی وجہ سے بہت مشقت اور تکلیف سے بیٹھ سکے، غالباً کسی کو اس کی اجازت نہ تھی کہ بیٹھنے میں سہارا دے، یہ اصول اور معمول تھا کہ جہاں تک ممکن

میں باہر سے آنے والے حضرات کو پوچھنا پڑتا تھا کہ ”من محمد فیکم“؟ یا ”ایکم محمد“؟ (آپ لوگوں میں محمد کون ہیں؟) ایک دفعہ ایک آنے والے نے پوچھا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ”ہذا لابیض المتکئی“ ”یہ گورے رنگ والے جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں“۔ پھر حدیث کے لفظ ”متکی“ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ ”متکئی“ کا ترجمہ کر دیتے ہیں ”ٹکیہ لگائے ہوئے“۔ میرے خیال میں یہ ٹیک نہیں ہے، اگر وہ مراد ہوتا تو اس کے لیے ”متوسدا“ کا لفظ زیادہ بہتر تھا۔ متکی کا صحیح ترجمہ ہے دیوار وغیرہ کی چیز سے ٹیک لگائے ہوئے۔ (اسی سلسلہ میں فرمایا) ایک دوسری حدیث میں ہے ”لا اکُلُ متکناً“ مطلب یہ ہے کہ میں کھانے کے وقت کسی چیز سے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتا، یہ کھانے کے ادب کے خلاف ہے، کھانے کے لئے، اللہ کے عاجز بندے اور فقیر کی طرح بیٹھنا چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے ”اکل کما یا کل العبد“، یعنی میں ایسے کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے۔ کھانا کھاتے وقت یہ دھیان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کھلا رہے ہیں اور میں اُن کے خوان پر کھا رہا ہوں، اس لیے پوری عاجزی اور ادب کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔

پھر تقریباً آدھا گھنٹہ اور تشریف فرما رہے اور برابر ارشادات اور ملفوظات سے نوازتے رہے اور یہ سب کارخصویت کے ساتھ مخاطب رہا۔ حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد خواجہ صاحب نے بھی شکایت فرمائی کہ آپ ایسے چڑ کے اور چھپ کے بیٹھے کہ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ پہچانا،۔۔۔ حاضرین میں سے متعدد حضرات نے دعائیں دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری وجہ سے آج مجلس بہت طویل ہو گئی اور اتنے ارشادات اور ملفوظات سننا نصیب ہو گیا۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں اس عاجز کی یہ آخری حاضری اور آخری زیارت تھی۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ

[ذیل کا مضمون حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحبزادہ مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔
 اس مرحوم نے حضرت شاہ صاحب پر ان کے شاگردوں کا ایک مجموعہ مضامین شائع کرنے کے ارادے سے
 اس مضمون کی فرمائش حضرت صاحب سوانح کی تھی، یہ الفرقان (ربیع الثانی و جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ) میں بھی
 شائع کیا گیا تھا۔ سوانح کی ضرورت سے تلاش و جستجو کے ضمن میں یہ مضمون سامنے آیا تو ”کس کو پایا؟ کیا پایا؟“
 کے سلسلہ مضامین میں اس کی عدم شمولیت کی کوئی وجہ اس کے سوا کچھ میں نہیں آئی کہ بہت پرانا ہونے کی بنا پر
 اس کی طرف سے ذہول ہو گیا اور مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوا کہ سوانح کے اس باب میں اس کا اضافہ
 کر دیا جائے۔ ———— حقیق]

خدا داد نورانیت و محبوبیت

حضرت استاذ قدس اللہ سرہ کے کمالات میں یقیناً علم و عمل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور
 اللہ تعالیٰ کی نظر اور مخلوق کی نگاہ میں بھی زیادہ قدر و قیمت علم و عمل ہی کی ہے، اس لحاظ سے مجھے پہلے حضرت
 ممدوح کے وہی واقعات و ارشادات اور اپنے وہی تاثرات ذکر کرنے چاہئیں جن کا تعلق علم و عمل جیسے اعلیٰ
 کمالات سے ہے لیکن یہ عاجز چوں کہ سب سے پہلے حضرت کی ظاہری نورانیت و محبوبیت ہی سے واقف اور
 متاثر ہوا اس لئے سلسلہ سخن اسی سے شروع کرتا ہوں۔

آج سے قریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اگلے سال دارالعلوم
 دیوبند جانے کا ارادہ تھا، مراد آباد میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس ہوا، یہ عاجز بھی گیا، حضرت شاہ صاحب کا
 ذکر اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا لیکن ابھی تک آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، غالباً صبح کا وقت تھا،
 دیکھا کہ چند حضرات علماء کرام ایک طرف سے تشریف لارہے ہیں، ان میں ایک بزرگ جو گہرے سبز رنگ کا

عبا پہنے ہوئے تھے اور غالباً ہلکے زرد رنگ کا عمامہ زیب سر تھا، بڑے حسین و جمیل اور بڑے نورانی نظر پڑے، آپ سے آپ دل میں آیا کہ شاید یہی دیوبند کے ”حضرت شاہ صاحب“ ہیں۔ کسی سے پوچھا۔۔۔ جواب ملا کہ ہاں شاہ صاحب یہی ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اس دید ہی سے دل میں ایک خاص محبت و عقیدت ڈال دی۔۔۔ اجلاس کے سلسلہ میں تین دن میں مراد آباد رہا، اب تک یاد ہے کہ اس تاک میں رہا کرتا تھا اور گھوم پھر کے بھی اس کی کوشش کیا کرتا تھا کہ حضرت کو کہیں دیکھوں۔ غالباً دیکھنا تو بار بار نصیب ہوا لیکن تقریر یا بات سننا کیا معنی، ان دنوں میں آواز سننا بھی یاد نہیں۔

چند مہینے کے بعد دیوبند پہنچ گیا، اس سال چونکہ میں نے دورہ حدیث نہیں لیا تھا اس لئے حضرت کے یہاں میرا کوئی سبق تو نہیں تھا لیکن پھر بھی روزانہ کئی بار آنکھوں کو دید کا موقع ملتا تھا، مگر خوب یاد ہے کہ جی بھرنا نہیں تھا اور ہر دفعہ دیکھنے میں لذت ملتی تھی۔۔۔ اگلے سال میں نے دورہ لیا اور حسب معمول بخاری شریف اور ترمذی شریف پوری پوری حضرت کے یہاں ہوئیں اور ان دونوں سبقوں کے سلسلہ میں روزانہ قریباً ۳-۴ گھنٹے خدمت میں حضوری کی سعادت نصیب ہوتی تھی، لیکن اپنی اس گذشتگی کے ذکر اور اس کی یاد میں آج بھی لذت محسوس کرتا ہوں کہ حسب توفیق علمی استفادہ کے علاوہ یہ عاجز آنکھوں کے ذریعہ بھی لذت و سرور حاصل کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ میں اس حال میں منفرد نہ تھا بلکہ بہت سے شرکاء درس غالباً میرے شریک حال تھے۔

سیرت و باطن کے کمال کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو صورت و ظاہر کی نورانیت و زیبائی اور اس میں جذب و کشش بھی نصیب فرمائے تو بلاشبہ یہ بڑا انعام ہے اور میرا خیال ہے کہ افادہ و استفادہ میں اس سے بڑی جان پڑ جاتی ہے۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر پیغمبر کو ظاہر و صورت کی زیبائی بھی عطا فرمائی جاتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔ ”ما بعث اللہ نبیا الا حسن الوجه حسن الصوت و صاحبکم احسنهم و جہاً و احسنهم صوتاً“۔

کمال علمی اور علوم میں جامعیت

یوں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو گونا گوں ظاہری و باطنی کمالات سے نوازا تھا لیکن

۱۔ یہ حدیث امام قاضی عیاض نے اپنی کتاب ”الشفاء“ میں نقل کی ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے وہ سب خور وادر خوش آواز تھے اور ہمارے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ دونوں چیزیں بھی دوسروں سے زیادہ عطا فرمائی گئی تھیں اور آپ اُس پہلو میں بھی سب سے فائق تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا علمی کمال دوسرے تمام کمالات پر غالب تھا اور اتنا غالب کہ دوسرے سب کمالات گویا بالکل اس کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ ۱۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے متعلق صرف یہی سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے ایک علامہ تھے اور بعض حضرات جن کی واقفیت اور زیادہ ناقص ہے وہ علوم میں بھی صرف علم حدیث میں آپ کے امتیاز اور علو مقام کے قائل ہیں اور آپ کو اس دور کے صرف ایک ممتاز محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حضرت کے مقام علمی سے کچھ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت ممدوح کا خاص امتیاز علوم کی جامعیت تھی اور وہ بھی ایسی جامعیت کہ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس علم میں حضرت کی مہارت اور مناسبت نسبتاً زیادہ تھی۔

وسعتِ علم کے ساتھ دقتِ نظر

اس موقع پر بعض حضرات کی ایک اور غلط فہمی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، ہمارے زمانے کے ایک نامور عالم جنہیں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات سے بلا واسطہ واقف ہونے کا غالباً کبھی موقع نہیں ملا، ان کے متعلق میں نے سنا کہ کسی موقع پر انہوں نے حضرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بہت قوی تھا اس لئے آپ بذاتِ خود ایک وسیع کتب خانہ تھے، لیکن نظر میں گہرائی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وسیع النظر اور کثیر المعلومات تو تھے لیکن دقیق النظر اور عمیق العلم نہیں تھے۔

یہ عاجز پورے وثوق اور بجد اللہ پوری بصیرت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ جن اہل علم و نظر کو حضرت کی علمی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے انہیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت کے یہاں دقتِ نظر کا پلہ کسی طرح بھی وسعتِ نظر کے مقابلے میں ہلکا نہیں تھا، البتہ علم کی سطح ہمارے اس زمانہ کی عام سطح سے اتنی بلند تھی کہ نہ سمجھ سکنے والے بھی معذور سمجھے جانے کے قابل ہیں..... ایک دفعہ خود فرمایا کہ:

۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض شخصیتیں جامع الکملات ہوتی ہیں لیکن ان میں کوئی ایک کمال اتنا غالب اور ایسا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دوسرے کمالات اس کی وجہ سے دب جاتے ہیں اور لوگ ان کو محسوس بھی نہیں کرتے.... مثال میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت میرزا مظہر جانِ جاں شہید و حضرت شاہ غلام علی صاحب (رحمہم اللہ) کی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے کہ اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا پایہ فقر و درویشی مجھ سے کم نہیں ہے لیکن ان پر کمالِ علم اتنا غالب ہے کہ ان کا نام سن کر لوگوں کا ذہن فقر و درویشی کی طرف جاتا ہی نہیں، بخلاف حضرت مرزا صاحب و شاہ غلام علی صاحب کے، کہ اگرچہ وہ علم سے خالی نہیں ہیں لیکن ان پر درویشی کا ایسا غلبہ ہے کہ ان کا نام سن کر لوگوں کا ذہن علم کی طرف بالکل نہیں منتقل ہوتا بلکہ صرف فقر و درویشی ہی کی طرف سبقت کرتا ہے۔ ۱۲۔

”بعض اوقات بہت نیچے اتر کر بات کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ نہیں سمجھتے۔“

یہ ایک بڑا علمی سانحہ ہے کہ حضرت ممدوح نے اپنے علم کی نشانی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہوئی کہ حضرت کو اہل زمانہ کی طرف سے مایوسی تھی۔ تاہم بعض خاص مسائل اور موضوعات پر جو چند رسالے خود آپ کے لکھے ہوئے ہیں اُن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی سطح زمانہ کی عام سطح سے کس قدر بلند ہے اور آپ کی نظر کتنی دقیق اور علم کتنا عمیق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے اہل علم اپنے کو ان رسالوں کے سمجھنے سے عاجز و قاصر پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تعبیر وادامیں کوئی اغلاق و تعقید ہے، بلکہ یہ صرف علمی سطح کے غیر معمولی تفاوت کا نتیجہ ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کے بہت سے اہل علم حضرت امام محمد اور امام شافعی کی کتابوں سے اتنی آسانی سے استفادہ نہیں کر سکتے جتنی آسانی سے متاخرین کی کتابوں سے وہ استفادہ کر لیتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت کا طرز فکر اور طرز استدلال بہ نسبت متاخرین کے متقدمین سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

قرآن مجید میں تدبر و تفکر

علم کی گہرائی اور دقت نظر کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نے اپنا یہ حال ایک دفعہ بیان فرمایا کہ:

”میں رمضان مبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا، جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان مبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خالص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اُس دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں۔“

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ رمضان مبارک میں کبھی حضرت کے قریب رہنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ ”أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ“ والے اس مبارک مہینہ میں زیادہ وقت قرآن مجید ہی کی تلاوت اور تدبر و تفکر پر فرماتے تھے، اس کے باوجود قرآن مجید ختم نہیں کر پاتے تھے۔

حدیث میں غور و تدبر

خود حضرت نے ایک دن بیان فرمایا:

”کہ میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا

ہے۔ شروع یا حواشی کے ساتھ جو مطالعہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔“

قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی مثالیں تو بہت سی ہیں اور کتابوں میں بھی پڑھی ہیں لیکن حدیث میں تفکر کی ایسی مثال نہ سنی نہ کتابوں میں کہیں نظر نہ گزری۔

اور جن لوگوں کو حضرت کے درس حدیث سے کچھ مستفید ہونے کا موقع ملا ہے غالباً وہ سب اس کی شہادت دیں گے کہ آپ کے درس کا رنگ بھی یہی تھا کہ اُس میں اسنادی و روایتی بحث و تنقید کے مقابلہ میں معنوی اور درایتی مباحث کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے اور اُس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے صرف ایک صاحب روایت محدث کی حیثیت سے حدیث کے متون و اسانید ہی سے واقفیت حاصل نہیں کی ہے، اور اسی طرح یہ کہ آپ کے علم کا ماخذ و مبلغ صرف چند حواشی و شروح ہی نہیں، بلکہ ایک صاحب فکر و درایت اور دقیق النظر فقیہ کی طرح آپ نے احادیث کے معانی و مقاصد پر بطور خود بھی بڑا گہرا غور کیا ہے۔ اور چند خاص خاص مسکوں پر حضرت کے جو بعض رسائل ہیں وہ بھی حضرت کی اس خصوصیت و جامعیت پر شاہد ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو شاید بہت سے اہل علم کے لئے ایک ”نیا انکشاف“ ہو اچھا ہے اس بہانہ سے وہ بھی قمر طاس کی امانت بن جائے۔

علامہ نیوی کی آثار السنن اور حضرت استاذ

حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیوی اور ان کی معرکہ الآرا نا تمام تالیف ”آثار السنن“ سے اور اس کی غیر معمولی اہمیت سے کم از کم حضرات اہل علم ضروری واقف ہوں گے۔ ہمارے زمانہ طالب علمی میں تو علمی اور درسی حلقوں میں اس کتاب کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ محدثانہ طرز پر حقیقت کی تائید میں یہ کتاب ہمارے اس زمانہ کا شاہکار ہے، افسوس یہ پوری نہیں ہو سکی اور اس کے پہلے دو حصے تالیف فرما کر علامہ مدوح اس عالم سے رحلت فرما گئے۔

حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن درس میں اس کتاب کے متعلق یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ”جس زمانہ میں مولانا ظہیر احسن صاحب نیوی رحمۃ اللہ علیہ آثار السنن تالیف فرما رہے تھے انہوں نے اس کے کچھ اجزاء حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت شیخ الہند) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ کچھ ملاحظہ فرما کر مشورے دیں اور جو اضافے فرمائے جاسکیں وہ اضافے فرمادیں۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ملاحظہ فرما کر وہ اجزاء واپس فرمادئے اور ان کو میرا پتہ لکھ دیا کہ آپ اس مقصد کے لئے اس پتہ پر خط و کتابت فرمائیں۔ میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔۔۔ مولانا ظہیر احسن صاحب نے حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مجھے خط لکھا اور اس طرح میری اُن کی خط کتابت شروع ہو گئی اور پھر انہوں نے اپنی کتاب بھیجنی شروع فرمائی، جتنی لکھ لیتے تھے وہ مجھے بھیج دیتے تھے اور میں اُن کے حکم کی تعمیل میں اضافے کرتا تھا۔۔۔ میں نے جو اضافے کئے وہ مقدار میں اُن کی اصل کتاب سے زیادہ تھے، لیکن میرے یہ اضافے زیادہ معنوی بحثوں سے متعلق تھے کیونکہ مولانا موصوف نے علل و اسانید کی بحثوں کے اضافہ کی

مجبائش کسی کے لئے بہت کم چھوڑی تھی۔ مگر چونکہ میری وہ معنوی بحثیں مولانا کے ذوق کی چیز نہیں تھی اور وہ اپنی کتاب میں خالص محدثین کے طرز پر علل و اسانید ہی سے بحث کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے میرے اس باب کے (یعنی علل و اسانید کے متعلق) اضافے کو قبول فرمائے اور کتاب میں لے لئے لیکن معنوی مباحثہ تمام تر حذف کر دیئے۔“

اس عاجز نے حضرت استاذ سے یہ پوری بات درس میں خود سنی ہے اور حضرت ہی کے ذریعہ یہ معلوم ہے کہ علامہ شوق نیویؒ جب تک رہے حضرت سے علمی مراسلت اور مشاورت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے سنے ہوئے بعض جزئیات اس عاجز کو یاد بھی ہیں لیکن وہ خالص علمی باتیں ہیں اس مقالہ میں ان کا ذکر مناسب نہ ہوگا۔

علامہ نیویؒ حضرت استاذ کی نظر میں

جب علامہ شوق نیویؒ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آگیا ہے تو اس واقعہ کا اظہار بھی میرے لئے ضروری ہے کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ فن حدیث میں علامہ ممدوح کا مقام بہت بلند مانتے تھے اور معرفتِ علل و اسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل و مثیل نہیں قرار دیتے تھے۔ اس عاجز کو خوب یاد ہے کہ یہاں تک فرماتے تھے کہ مولانا ظہیر احسن صاحب حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں لیکن صناعیتِ حدیث میں اُن سے بہت فائق ہیں۔

اس سے یہ اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے اکثر علمی حلقوں میں جو یہ بیماری آگئی ہے کہ اپنے خاص حلقہ اور اپنی خاص جماعت سے باہر ان کو کوئی صاحبِ کمال نظر ہی نہیں آتا اور ہر میدان میں وہ اپنے ہی حلقہ اور سلسلہ والوں کا جھنڈا اونچا رکھنا چاہتے ہیں، حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو الحمد للہ یہ بیماری بالکل نہیں لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں یہ بڑی ہی خراب بیماری ہے۔

خیر! یہ باتیں تو اسطر ادا ذکر میں آگئیں ورنہ میں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اب پھر وہیں آجائیے!

حیرت انگیز یادداشت

اپنے حافظہ کے انحطاط پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک دن فرمایا:

”پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر آج ایک مضمون متعدد کتابوں میں دیکھوں اور مجھے اُن کتابوں کی عبارتیں نقل کرنی ہوں لیکن کسی وجہ سے آج نقل نہ کر سکوں اور کل بھی موقع نہ ملے تو پڑوسوں تک بھی اس پر قدرت رہتی

تھی کہ ہر کتاب کی اصل عبارت صفحہ کے حوالہ کے ساتھ دوبارہ کتاب دیکھے بغیر نقل کر سکتا تھا۔ لیکن اب حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ صبح کی دیکھی کتابوں کی عبارتیں شام تک تو نقل کر سکتا ہوں لیکن رات درمیان گزر جانے کے بعد کل نقل نہیں کر سکتا۔“

یادداشت کے متعلق اپنے بعض تجربے

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے کئی سال بعد تک درس و تدریس اس عاجز کا مشغلہ رہا، اور اُس زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ سے بھی کچھ زیادہ شغف تھا۔ کبھی زیرِ درس کتابوں میں اور کبھی خارجی مطالعہ میں ایسے اشکالات بھی پیش آ جاتے تھے جن کے حل کرنے سے اپنا غور و فکر عاجز رہتا تھا۔ میں ایسے تمام اشکالات کو اپنی نوٹ بک میں نوٹ کرتا رہتا تھا اور جب حضرت استاذ کی خدمت میں حاضری میسر ہوتی تو وہ نوٹ بک جیب سے نکال کر اکثر پہلی ہی ملاقات کی مجلس میں حضرت کے سامنے میں اپنے وہ اشکالات عرض کرتا اور حضرت میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دیتے گویا اس سوال کے تمام اطراف پر آپ نے خاص طور سے حال ہی میں غور فرمایا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس تجربہ کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جس نے کوئی علمی اشکال کبھی حضرت کے سامنے پیش کر کے جواب چاہا ہو۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ جب تک حضرت اس دنیا میں رہے میرا ابراہیم دستور رہا بلکہ اپنے مطالعہ کے اشکالات کے علاوہ بعض دوسرے اہل علم و اصحابِ درس کے اشکالات و سوالات بھی اُن سے دریافت کر کے میں اپنی نوٹ بک میں لکھ کر لے جاتا تھا۔ اگر یہ عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری کے ہر موقع پر میری نوٹ بک کے یہ سوالات ہی حضرت کے لئے میرا خاص ہدیہ ہوتا تھا جس کا میں بڑا اہتمام کرتا تھا۔ اور حضرت کا معاملہ بھی یہ تھا کہ اگر کبھی میں حاضر ہوا اور کسی وجہ سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا تو حضرت خود فرماتے تھے۔ ”مولوی صاحب کچھ پوچھنا ہے؟“ اور پھر اس کے بعد میں پوچھتا تھا۔

خیر یہ تو تمہید تھی اب یادداشت اور قوتِ حافظہ کا وہ واقعہ سنئے جس کے لئے مجھے یہ لمبی تمہید لکھنی پڑی۔ ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے بہت غور کیا حل نہیں ہو سکا۔

فرمایا۔۔۔ مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر

گزر جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں چلتا ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا سب کو پیش آنا چاہئے۔ پھر فرمایا — صحیح عبارت اس طرح ہے۔

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہو گیا۔ اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنئے! — سورہ نساء کے سولہویں اور سترہویں رکوع کی آیتیں چوری اور دھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، اس واقعہ کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے، مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ایسی ملیں جن میں آیات سے متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے میں نے اُن سب کو دیکھ ڈالا مگر واقعہ کا زمانہ اور سنہ مجھے کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ عاجز آ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سنہ وقوع کی تلاش ہے کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا۔ ”فرمایا کون کون کتابیں آپ نے دیکھیں؟“ میں نے تفسیر ابن جریر و ابن کثیر و معالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لئے۔ فرمایا — درمنثور میں نہیں دیکھا؟ میں نے عرض کیا کہ درمنثور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے اس لئے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔ فرمایا — جاؤ اس میں دیکھ لو اُس میں مذکور ہے۔

چنانچہ تلاش کر کے درمنثور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ اُس میں موجود تھے۔

وکان ذلک فی شہر ربیع سنۃ اربع (کہ یہ واقعہ ماہ ربیع ۴ھ میں پیش آیا)

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں کبھی حضرت نے دیکھی تھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوئی تھی۔

حدیث کے درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ چند اور حدیث کی کتابیں حضرت کے سامنے رکھی رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو صرف زبانی حوالہ پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ تقریر جاری رکھتے ہوئے بے تکلف اسی کتاب پر ہاتھ جاتا تھا اور ”حسبنا اللہ ونعم الوکیل“ ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے ایسا اندازہ فرما کر کتاب کھولتے تھے کہ بعض اوقات تو وہ ہی صفحہ کھلتا تھا جس پر وہ حدیث ہوتی تھی، ورنہ بس دو چار ورق ادھر سے یا ادھر سے اُلٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی۔ جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا انہیں آج یہ سن کر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو

حضرت استاذؒ کے علمی امتیازات اور خصوصیات میں ایک نہایت اہم اور قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں آپ سے رجوع کیا جاتا آپ جواب اس طرح دیتے کہ گویا اس کے سارے پہلوؤں اور تمام مالذ و ماعلیہ پر آپ نے ماضی قریب ہی میں غور فرمایا ہے اور آپ بالکل مطمئن ہیں۔ شاید یوں ہو، یا شاید یوں ہو۔۔۔ والی بات آپ کے یہاں بالکل نہ تھی۔

جس سال یہ عاجز دورہ حدیث کا طالب علم تھا (اور وہی سال دارالعلوم دیوبند میں حضرت کے درس کا آخری سال تھا) شعبان کے مہینہ میں جب کہ طلبہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے وطن جانے والے تھے، آپ نے ایک دن بعد نماز عصر تمام طلبہ سے بالعموم اور دورہ حدیث سے فارغ ہونے والے اپنے تلامذہ سے بالخصوص خطاب فرمایا۔ اُس میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی فرمائی:

”ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل کیا جائے، سو الحمد للہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارے میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استناد کرتے ہیں کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لئے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔“

یہاں مجھے فقہ حنفی کے بارے میں تو حضرت کا صرف اتنا ہی ارشاد نقل کرنا تھا جو دراصل حضرت نے ایک دوسری بات کے لئے بطور تمہید کے فرمایا تھا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں وہ اصل بات بھی ذکر کر دی جائے جس کی یہ تمہید تھی۔

حضرت نے فقہ حنفی کے سلسلہ میں اپنی تیس سالہ محنت و تحقیق اور اس کے نتیجہ میں اپنے اس الطیفان کا ذکر فرمانے کے بعد ہم خدام سے فرمایا۔۔۔ سننے والے گوش دل سے سنیں کیا فرمایا۔۔۔ فرمایا:

”لیکن اب مجھے افسوس ہے! کاش میرا یہ وقت دین کے اس سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری کام میں صرف ہوا ہوتا تو آخرت میں اُس کے کام آنے کی زیادہ امید کر سکتا تھا۔“

پھر اسی تقریر میں آپ نے فرمایا:-

”میں نے اپنے عربی اور فارسی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیشہ اردو لکھنے پڑھنے سے احتراز کیا یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط و کتابت کی زبان بھی میں نے عربی اور فارسی ہی رکھی لیکن اب مجھے اس پر بھی افسوس ہے، ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین سے دفاع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ میں اس بارے میں آپ صاحبوں کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں۔“

آگے کسی موقع سے انشاء اللہ میں اس کا مستقلاً ذکر کروں گا کہ حضرت استاذ کو اس زمانہ میں دو فتنوں کی طرف سے بڑی سخت فکر تھی، اندرونی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ اور خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا فتنہ، اپنی زندگی کے اس دور میں حضرت کے دل کی خاص لگن بس یہ تھی کہ امت محمدیہ کو ان فتنوں کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اہل علم پوری تیاری اور طاقت سے میدان میں آئیں اور حضرت سمجھتے تھے کہ یہ کام اس زمانہ میں اردو اور انگریزی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کیلئے خاص طور سے فرمایا کرتے تھے۔ اسی سے ناظرین یہ بھی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خالص ”کتاب میں عالم“ ہونے کے باوجود آپ کے ذہن و فکر میں کتنی وسعت تھی اور آپ کی نظر میں وقت کے تقاضوں کی کتنی اہمیت تھی۔

خیر یہ تو گویا ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ میں فقہ کے سلسلہ میں حضرت کی بعض علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اب آگے اسی سلسلہ میں سنئے:

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول

ایک موقع پر فرمایا:

اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اور مرتجعین اور اصحاب فتویٰ مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اُس قول کو زیادہ وزنی اور قابل ترجیح سمجھتا ہوں جو از روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے ائمہ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہو جاتا ہو۔ (اسی سلسلہ میں فرمایا) میرا اپنا اصول تو یہی ہے لیکن دوسرے اہل فتویٰ اپنے اصول پر جو فتوے لکھتے ہیں ان کی بھی تصدیق کر دیتا ہوں اور میری اس تصدیق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ از روئے فقہ حنفی یہ جواب بھی صحیح ہے۔

بعض مسائل میں آپ کی خاص تحقیق

وسعت علم و نظر اور خاص فقہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علماء احناف سے الگ تھی، بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ عام علماء و اہل فتویٰ کے لئے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی، اس کی کئی ایک مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں لیکن اُن میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اردو کے اس مقالہ میں بھی نامناسب نہ ہوگا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا، مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند ایک دن دیکھا گیا تو اگر شرعاً قابل اعتبار ذریعہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہنچ جائے تو اُن کو بھی اسی حساب سے روزہ رکھنا ہوگا، خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ، حنفیہ کے یہاں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عام طور پر علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم اور مشہور ہے اور عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور حنفی فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے۔ حالانکہ ہیئت کے حساب سے یہ بالکل ناقابل فہم ہے۔

حضرت اُستاذ قدس سرہ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنفین سے اس کی تعبیر میں لغزش ہو گئی ہے اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، فرماتے تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرنا بدلتہ غلط ہے اور حضرت استاذ اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی ہدایت الجہت، اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے زیلی، شرح کنز اور بدائع کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

[واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابل غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لئے اشکال اور غلبان کا باعث ہوتا تھا، لیکن اب یہ واقعاتی مسئلہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ اکثر ممالک عربیہ میں عموماً ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آ جاتا ہے۔ اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ اور ہوائی جہاز جدہ سے پرواز کر کے صرف ۴ گھنٹے سے کم میں ممبئی آ جاتا ہے اور ۶ گھنٹے سے کم میں دہلی آ سکتا ہے، پس یہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدہ میں عید کا چاند دیکھا اور اسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر رات ہی میں ممبئی پہنچے تو اگر اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو ان لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں کے لئے اُس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا حالانکہ یہاں اُس روز اثنیہواں (۲۹) بلکہ کبھی تو

اٹھائیسواں (۲۸) ہی روزہ ہوگا۔۔۔۔۔ اپنے زمانہ کے بعض اکابر علماء و اہل فتویٰ کے متعلق سنا ہے کہ جب اُن کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اگر اُن بزرگ کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت استاذ کی مندرجہ صدر تحقیق و تنقیح پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہ حنفی کو چھوڑ کے دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے۔ [

علم اسرار و حقائق

حضرت استاذ علم اسرار و حقائق میں بلاشبہ اس دور کے شیخ اکبر تھے، شیخ ممدوح کے علوم سے خاص مناسبت بھی تھی، اور شیخ کے بہت سے نہایت اعلیٰ اور قیمتی افادات زیادہ تر اُن کی مشہور کتاب ”فتوحات مکیہ“ کے حوالہ سے درس میں بیان بھی فرمایا کرتے تھے اور بلاشبہ بعض مشکل دینی حقیقتوں کے بارے میں اُن سے بڑا انشراح اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

حضرت استاذ کے شاگرد رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے انہوں نے فیض الباری لے لیں بھی حضرت کے اس سلسلہ کے افادات کا خاصا حصہ لے لیا تھا اور اسکے بعد حدیث کی جو ایک نئی جامع کتاب وہ خود مرتب فرما رہے تھے۔۔۔۔۔ جو اُن ہی کے اُردو ترجمہ اور مفصل تشریحی نوٹوں کے ساتھ ”ندوة المصنفین دہلی“ سے ”ترجمان السنۃ“ کے نام سے شائع ہوئی ہے اور پہلی دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں..... اُس میں بھی انہوں نے حضرت استاذ کے اس خاص الخاص علمی شعبہ کے نہایت گراں قدر افادات کو اُردو میں منتقل کرنے کی اور غیر عالم اُردو خوانوں کو بھی سمجھا دینے کی بڑی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کے مضامین کو صحیح سالم اور محتاط طریقہ پر اُردو جیسی کسی زبان میں منتقل کر دینا یقیناً بڑا مشکل کام ہے۔ مگر ”ترجمان السنۃ“ کے ابتدائی ابواب ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا بدر عالم صاحب کے لئے اس کو کس حد تک آسان فرما دیا ہے۔

۱۔ مولانا بدر عالم صاحب نے مسلسل کئی سال حضرت استاذ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے درسی افادات کو خاص محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور مجلس علمی ڈابھیل نے بڑے اہتمام سے مصر میں چھپوا کر اس کو شائع کیا۔ گویا صحیح بخاری کے سلسلہ میں یہ حضرت استاذ کے ”امالی“ ہیں اسی کا نام ”فیض الباری“ ہے۔ چار ضخیم جلدیں ہیں۔ حضرت کی علمی درسی خصوصیات کا ایک خاص حد تک اس سے اندازہ ہو جاتا ہے، مولانا بدر عالم صاحب اور مجلس علمی کا بلاشبہ یہ بڑا کارنامہ اور ہم لوگوں پر بڑا احسان ہے مگر کاش یہ کتاب حضرت کی زندگی میں مرتب ہو کر نظر انور سے بھی گزر چکی ہوتی۔

جدید مغربی علوم پر بھی نظر

مصر والوں نے جدید مغربی علوم پر عربی میں جو کتابیں شائع کی ہیں اور مختلف مغربی زبانوں سے جو تراجم کئے ہیں حضرت استاذ اُن کے ذریعہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے طبیعیات میں یورپ نے جو علمی ترقی کی ہے اس کے معترف اور اس کے افادی پہلو کے قدر دان تھے اور اسی وجہ سے مشہور مصری فاضل طنطاوی جو ہری کی تفسیر جواہر القرآن کے مطالعہ اور اُس سے علمی استفادہ کا مشورہ دوسرے اہل علم کو بھی دیتے تھے، حالانکہ اُس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو سخت ناپسندیدہ ہیں۔

سلسلہ درس کی بعض قابل ذکر چیزیں

جو طلبہ صرف ونحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے حضرت استاذ اُن کے لئے حدیث پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر طالب علم سے سبق کی قرأت میں کسی ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوتی جو سلسلہ سند میں بار بار اور کثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت اذیت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ایک دن ترمذی شریف کا سبق ہو رہا تھا، ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی، شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی سلسلہ سند میں آیا ”عَنِ الشَّعْبِيِّ“ اُس بے چارہ نے بجائے شعبی کے شعبی پڑھا، حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا ”عَنِ الشَّعْبِيِّ“ لیکن اس بندہ خدا نے سمجھا نہیں اور پھر پڑھا ”عَنِ الشَّعْبِيِّ“ حضرت نے پھر فرمایا ”عَنِ الشَّعْبِيِّ“ لیکن اس بندہ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا ”عَنِ الشَّعْبِيِّ“..... حضرت نے اسی وقت سبق سے اٹھادیا اور فرمایا جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سبق میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتانے سے بھی نہ سمجھ سکیں ان کو دورہ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔

صحیح قسم کے طالب علم علما نہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے لیکن مہمل قسم کے اور لائیعی یا غیر متعلق سوالات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی۔ جس سال یہ عاجز دورہ حدیث میں تھا اُس سال دورہ میں تقریباً سو طالب علم تھے، ان میں سے صرف ۴۵ کو حضرت نے خود متعین فرمایا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ

پوچھنا ہو وہ پہلے ان کو بتلا دے، اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں، حضرت کے اس طرز عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لالچنی بات میں بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویہ تھا یا اسی سال یہ طرز عمل اختیار فرمایا تھا۔

حضرت استاذ قدس سرہ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر کرنے کے لائق علمی اور درسی سلسلہ کی جو باتیں اس وقت یاد آئیں وہ یہی تھیں جو حوالہ قلم ہو چکیں۔۔۔۔۔ اب زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی بعض جستہ جستہ چیزیں جو حافظہ میں ہیں وہ بھی ہدیہ ناظرین کرام ہیں۔

دو فتنوں کا شدید احساس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی امت کے بارے میں آپ کو دو فتنوں کی طرف سے بڑی گہری فکر تھی (۱)۔ خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا مغربی فتنہ جو اقوام مغرب کے سیاسی غلبہ اور علوم و فنون میں ان کی بالاتری کی وجہ سے تمام عالم پر چھایا جا رہا ہے (۲)۔ اور داخلی فتنوں میں مسیلہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ!۔۔۔۔۔ ان دونوں فتنوں کی شدت احساس سے آپ بے چین رہتے تھے اور ان کے مقابلہ اور امت کی ان سے حفاظت کرنے کے واسطے تیاری کرنے کے لئے آپ طلبہ کو بڑے درد کے ساتھ ترغیبیں دیتے تھے اور اس کے لئے درس کے علاوہ آپ مستقل تقریریں بھی کرتے تھے بلکہ اُس زمانہ میں حضرت کی تقریروں کا موضوع عموماً یہی ہوتا تھا۔

قادیانی فتنہ سے آپ کی غیر معمولی بے چینی

خاص طور سے موخر الذکر قادیانی فتنہ کے بارہ میں آپ کی فکر اور بے چینی کا جو حال تھا جن لوگوں نے دیکھا نہیں وہ اُس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ارتداد کی جو وبا پھیلی تھی اور خاص کر مسیلہ کذاب کی جموٹی نبوت پر ایمان لانے کا فتنہ جو اُس وقت ایک دم زور پکڑ گیا تھا، اُس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بے چینی اور حرارت ایمانی کا ذکر جو روایات میں آتا ہے، حضرت استاذ قدس سرہ کے احوال میں بالکل اُس کی جھلک نظر آتی تھی اور اُس زمانہ میں حضرت اپنی اکثر تقریروں میں اُس فتنہ ارتداد کے زمانہ کے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جوش ایمانی سے بھرے ہوئے خطبات اور کلمات اکثر دوہرایا کرتے تھے، خاص طور سے

حضرت صدیق اکبرؓ کا وہ ایمان افروز جملہ جو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اُس وقت فرمایا تھا جب مرتدین کے خلاف جنگ کے بارے میں مصلحت اندیشی سے کام لینے کا حضرت صدیق اکبرؓ گواہوں نے مشورہ دیا تھا۔ وہ جملہ کتب حدیث و سیر میں آج تک محفوظ ہے اور حضرت ابو بکرؓ کے مقام صدیقیت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس کے الفاظ جو حضرت استاذ اُس زمانہ میں اکثر دہرایا کرتے تھے یہ ہیں: ”اجبار فی الجاہلیۃ و خوار فی الاسلام انه قد انقطع الوحی و تم الدین، اینقص و انا حی۔“

بہر حال قادیانی فتنہ کی فکر حضرت استاذ کی سب سے بڑی فکر تھی اور اس معاملہ میں آپ کا حال وہ تھا جو اُن بندگان خدا کا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنا کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے اور پھر اس کی فکر اور اُس کے لئے بے چینی اُن پر طاری کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت استاذ نے قادیانیت سے متعلق اپنے تین خواب سنائے تھے جو آپ نے دس دس سال کے فاصلہ سے دیکھے تھے۔۔۔ اپنی اس نالائقی پر آج سخت رنج و افسوس ہے کہ نہ کہیں ان کو نوٹ کیا اور نہ یاد رکھا۔ اجمالاً صرف اتنا یاد ہے کہ پہلا خواب آپ نے قیام دہلی کے زمانہ میں دیکھا تھا، دوسرا اُس سے ٹھیک دس سال کے بعد، اور تیسرا اُس کے ٹھیک دس سال بعد دیکھا تھا۔ ان تینوں خوابوں میں آپ کو پنجاب کے اس متنبیؒ کذاب کے فتنہ سے امت محمدیہؑ کے ایمان کی حفاظت کے لئے جدوجہد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اس راستہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی بشارت تھی۔ مجھے اجمالاً اتنا ہی یاد رہ گیا ہے، حضرت نے ایک موقع پر پوری تفصیل سے یہ تینوں خواب سنائے تھے، شاید حضرت کے خدام اور تلامذہ میں سے کسی اور کو یاد ہو۔

اس فتنہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کام حضرت استاذ سے لئے اُن کا ذکر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں دو تین باتیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(۱) قادیانی فتنہ کے ظہور نے جن مسائل اور مباحث پر گفتگو کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے اُن میں دو مسئلے مختلف وجوہ و اسباب سے علمی طور پر کچھ مشکل ہیں، یعنی ان میں لوگوں کے لئے مغالطہ کھانے کی گنجائش بہ نسبت دوسرے مسئلوں کے کچھ زیادہ ہے۔ ایک مسئلہ حیات مسیح علیہ السلام۔۔۔ اور دوسرا ایمان و اسلام مطلب یہ ہے کہ ”تم جاہلیت میں تو بڑے سخت اور زور آور تھے اور آج اسلام کی حالت میں ایسی کمزوری اور ناردی کی باتیں کرتے ہو۔ نبوت ختم ہو چکی، وحی کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا اور دین ہر طرح مکمل ہو گیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دنیا میں زندہ ہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔“

کفر کے حدود کا مسئلہ۔

یہ دوسرا مسئلہ اگرچہ فی نفسہ مشکل نہیں ہے بلکہ سیدھی سادی بات ہے، لیکن کچھ تو مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی بعض مبہم اور غیر واضح تعبیروں نے اور کچھ تکفیر جیسے سنگین معاملہ میں بعض لوگوں کی بے احتیاطیوں نے مسئلہ کو اچھا خاصا مشکل بنا دیا ہے اور اُس میں ایسی الجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ بہت سے لوگ خواہ مخواہ اُس میں الجھ جاتے ہیں۔ حضرت استاذ نے ان دونوں مسئلوں کی طرف خود توجہ مبذول فرمائی۔

مسئلہ حیاتِ مسیح پر پہلے ایک رسالہ ”عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام“ لکھا، اس کے بعد بطور اس کے حواشی یا ضمیمہ کے دوسرا رسالہ ”تحیۃ الاسلام“ تالیف فرمایا۔ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ بیان و استدلال متاخرین کا سانہیں ہے جس کا سمجھنا ہم جیسوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے، بلکہ ائمہ متقدمین کا سا ہے اس لئے افسوس ہے کہ ہر عربی داں کے لئے بھی ان دونوں رسالوں کو پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو سلیم القلب ان دونوں رسالوں کو سمجھ کر پڑھ لے اس کو انشاء اللہ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہے گا کہ قرآن مجید کی قطعی شہادت قادیانیوں کے دعوے ”مات مسیح“ کے خلاف ہے اور قادیانیوں کی طرف سے جو سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں اُن کی بنیاد یا لکھنے والوں کی جہالت پر ہے یا علمی خیانت اور دھوکہ بازی پر۔

جس سال یہ عاجز دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اُسی سال ممالکِ عربیہ میں سے غالباً مہر کے ایک بڑے وسیع النظر عالم اور ممتاز فاضل جو مغربی علوم میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے اور جرمنی میں ایک عرصہ تک ان کا قیام بھی رہا تھا، دیوبند تشریف لائے تھے اور دارالعلوم میں چند روز قیام فرمایا تھا، اُن کی تشریف آوری کا باعث جیسا کہ اُس وقت تھا صرف یہ ہوا تھا کہ حضرت استاذ کے رسالہ ”عقیدۃ الاسلام“ کا نسخہ کہیں ان کی نظر سے گزرا، اُس کو دیکھنے کے بعد انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس علم کا آدمی اگر دنیا میں کہیں زندہ موجود ہے تو مجھے اُس سے ضرور ملنا چاہئے!

دوسرے مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت استاذ نے رسالہ ”اکفار الملحدين فی شیء من ضروریات الدین“ تالیف فرمایا، یہ بھی عربی میں ہے اور ہر عربی داں کے لئے یہ بھی سہل الفہم نہیں ہے، لیکن کفر و اسلام کے حدود کی ایسی تنقیح غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی، اس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک شبہ باقی نہیں رہتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کر کے اور اس کی امت نے اس کو نبی مان کے اپنے کو اسلام کے وسیع دائرہ سے اس طرح نکال لیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے

ہوئے دین پر ایمان رکھتا ہو وہ اب کسی طرح ان لوگوں کو مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتا اور اگر وہ قادیانیت سے اور قادیانیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایسا کرے گا تو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے بعض اہم حصوں کی تکذیب یا آپ کی بعض واضح تعلیمات میں تحریف کرنی پڑے گی اگرچہ وہ اپنی کج فہمی یا نادانی کی وجہ سے اپنی اس پوزیشن کو سمجھتا نہ ہو۔

”اکفار الملحدين“ کا تعلق چونکہ کفر و اسلام کے مسئلہ سے تھا اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا اور بلاشبہ یہ بہت اہم معاملہ تھا، اس لئے حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس زمانہ کے دوسرے اکابر اور مشاہیر اہل علم کی آراء بھی اس کے بارے میں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ کچھ اکابر اہل علم مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری وغیرہ کی آراء تو پہلے ہی اڈیشن میں شامل کر دی گئی تھیں اور اس عاجز کے پاس اسی اڈیشن کا نسخہ ہے لیکن دوسرے حلقوں کے بعض علماء و افاضل کی رائیں اور تصدیقیں بعد میں حاصل ہوئی تھیں، مثلاً مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی (صدر یار جنگ) مرحوم کے متعلق راقم سطور کو معلوم ہے کہ پہلے اڈیشن کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد موصوف کی تصدیق موصول ہوئی تھی، مگر مجھے معلوم نہیں کہ بعد کے اڈیشنوں میں بعد والی وہ تصدیقات شامل ہوئیں یا نہیں، اگر نہیں شامل ہوئیں ہیں اور کہیں محفوظ ہیں تو ان کو شامل ہونا چاہئے۔

الغرض قادیانی فتنہ کی غارت گری سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک کام تو آپ نے یہ کیا کہ ان دو مسئلوں کو خود صاف کیا، لیکن چونکہ اردو میں لکھنے کی حضرت کو عادت نہ تھی اس لئے مجبوراً یہ دونوں رسالے عربی میں لکھے اور اس امید پر لکھے کہ خود علماء کے ذہن جب ان دونوں مشکل مسئلوں کے بارہ میں ان رسالوں سے صاف اور مطمئن ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دے گا وہ ان کے مضامین کو حسب ضرورت اردو وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل کر دیں گے۔

ایک رسالہ آپ نے مسئلہ ختم نبوت پر ”خاتم النبیین“ کے نام سے فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا، کیونکہ وہاں کے جس طبقہ کو آپ سمجھنا چاہتے تھے اس کیلئے آپ کے نزدیک فارسی زبان ہی اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔

(۲) ان رسالوں کے علاوہ آپ کی فکر اور بے چینی نے آپ کے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے اس فتنہ کے اسناد میں مختلف شکلوں میں بہت کچھ کام لیا۔ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے جس مضمون کا ابھی اوپر میں نے تذکرہ کیا ہے اس سے ناظرین کو اس کی کچھ تفصیل معلوم ہوگی۔

سلوک و تصوف

میں عرض کر چکا ہوں کہ علمی شغف و انہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے پہلو اس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے، چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو سلوک و تصوف سے تعبیر کرنا چاہئے، اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا، اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اس رخ سے بالکل ناواقف ہیں، یہ عاجز بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے، لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ سے مجاز بھی تھے، لیکن اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی، البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سنایا اور اس سلسلہ میں کچھ جوش آگیا تو ایک آدھ بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سنی میسر آگئی جس سے کچھ سمجھا جاسکے کہ اس فضا میں بھی حضرت استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے۔ جو واقعہ حضرت نے سنایا وہ یہ تھا۔

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کیلئے چلا، راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی، راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے، اور ان ہی کے پاس جا رہے تھے، یہ مجھ سے اپنے ان پیر صاحب کا اور ان کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے، ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں، اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا، میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہونچے تو ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کیلئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے میں پہلے جا کر آپ کیلئے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے، ان بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے لینے کیلئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے، خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین و طالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر ان پر توجہ دینی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹے اور تڑپنے لگے، میں یہ سب دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر آپ توجہ فرمائیں۔ انہوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا، بے چاریوں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنی ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا۔
 ”یہ کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں، معمولی
 مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔۔۔ ان باتوں کا خدارسیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔“
 پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا۔

”اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ کلب سے

اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے، لیکن یہ بھی کچھ نہیں، اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت
 و سنت پر استقامت ہے۔“

اس ایک موقع کے سوا حضرت سے کبھی کوئی ایسی بات سننا اس عاجز کو یاد نہیں جس سے حضرت کے
 اس باطنی کمال کا کچھ سراغ ہم کو ملا ہو۔

اپنے بعض اکابر سے خصوصی تاثر

جیسا کہ میں عرض بھی کر چکا ہوں سلوک و تصوف کے سلسلہ کی باتیں کرنے کی حضرت استاذ کی
 عادت نہیں تھی، کم از کم اس عاجز کا علم و تجربہ تو یہی ہے۔ اسی لئے اس سلسلہ کے اپنے اکابر کے خاص احوال
 و واقعات یا ان کی زندگی کے خاص اس شعبہ کے متعلق اپنے تاثرات حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سننے کا
 ہم نیاز مندوں کو کبھی شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا، ایک ہی دفعہ کی بات یاد ہے درس ہی میں کسی سلسلہ میں فرمایا:

”ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہی کے یہاں دیکھا، اس کے

بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ)۔

کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے یہاں جا کر دیکھے۔“

اپنے سلسلہ کے ان اکابر کے علاوہ، ہم عصر مشائخ میں سے دو اور بزرگوں کے بارہ میں بھی حضرت
 استاذ کے بہت بلند کلمات اس عاجز کو یاد ہیں، ایک حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی نقشبندی اور
 دوسرے حضرت مولانا احمد خاں صاحب مجددی نقشبندی، ان دونوں بزرگوں کے متعلق حضرت فرماتے تھے
 کہ اس عصر میں یہ نقشبندی سلوک کے امام ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ضلع میانوالی کے تھے، دونوں کے وصال کو عرصہ ہو چکا ہے۔ دونوں ایک ہی شیخ کے
 تربیت یافتہ اور مجاز تھے۔ لیکن بعض مسائل میں نقطہ نظر کے فرق کی وجہ سے درمیان میں کچھ بعد پیدا ہو گیا
 تھا، لیکن حضرت استاذ دونوں کو سلوک کا امام مانتے تھے۔ یہ عاجز بھی ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے
 شرف ہوا ہے، واللہ الحمد و المنة۔

بعض شمائل نبوی کی جھلک

اگرچہ شمائل و اخلاق میری اس تحریر کا موضوع نہیں ہے اور غالباً ان چیزوں پر کوئی اور صاحب مسئلہ لکھیں گے، لیکن یہاں پہنچ کر حضرت استاذ کی دو تین عادتیں ذکر کرنے کو بھی بے اختیار رنجی چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق و شمائل کتب حدیث میں روایت کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ عادت مبارکہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے (گویا بلا ضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ ہیں ”کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت“ یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مبارک عادت کا جیسا کامل نمونہ حضرت استاذ کو دیکھا ایسا کوئی اور دیکھنا یا دہنیں، معلوم ہوتا تھا کہ ان کو صرف علمی و دینی افادہ و استفادہ کے لئے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے لئے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی مضبوط کیفیت اور ایک خاص نوعیت سے محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس کے شغل میں برابر مشغول ہیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات مبارکہ میں صحابہ کرام ذکر فرماتے ہیں کہ:-

”مسکرانے کی تو بہت زیادہ عادت تھی لیکن کھل کھلا کر ہنسنے کبھی نہیں دیکھا۔“

بالکل یہی حال حضرت استاذ کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہو گئی ہے اور اُس سے اور اُس کے اڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا کتنا مشکل ہو گیا ہے، اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہو لیکن اس عاجز کو خوب ہے اور اس لئے میرا یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دور میں غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے۔ مگر حضرت استاذ قدس سرہ کو الحمد للہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارہ کنایہ بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یا دہنیں، بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت ان کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

حضرت استاذ کے متعلق بس یہی کچھ منتشر باتیں اس وقت اس مقالہ میں ذکر کے قابل یاد آئیں جو

حوالہ قلم و قرطاس کو دی گئیں۔

☆ ☆ ☆

اصوفیہ کے شغال میں سے صرف پانچ انفاس کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ اس کی اصل حدیث و سنت نے کچھ معلوم ہوئی ہے اس لئے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنے والے نیاز مندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی خدمت میں

اللہ کی رحمتیں ہوں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی روح پر سب سے پہلے انہی سے حضرت رائے پوری قدس سرہ کے حالات بار بار سن کر دل میں حضرت کی عظمت و عقیدت پیدا ہوئی تھی۔ پھر ۱۹۳۹ء کے اواخر میں رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی اور ایک دوسرے ہم مشرب و مسلک اور ہم ذوق دوست الحاج عبدالواحد (ایم اے) کے ساتھ حضرت کی خدمت میں رائے پور پہلی حاضری ہوئی اور دورا میں حضرت کی خانقاہ میں قیام رہا، جو آبادی اور آبادی کے شور و شغب سے الگ جنگل میں واقع ہے، پورا ماحول نہایت شاداب باغات اور سرسبز کھیتوں کا ہے، قریب ہی ندی بہہ رہی ہے اس لحاظ سے بھی بڑا دلکش ماحول ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے حضرت قدس سرہ ایک مشہور شیخ طریقت اور مرشد تھے اور آپ کی خانقاہ کا بچی خاص موضوع تھا، لیکن ہماری یہ حاضری سلوک و تصوف کی طلب میں نہ تھی، بلکہ ایک دوسرے مقصد سے ہم لوگوں نے یہ سفر کیا تھا، مگر ہم تینوں ہی حضرت کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور ہم نے خانقاہ میں بہت ہی غیر معمولی درجہ کارو حانی سکون و سرور محسوس کیا۔ اس کے قریباً ڈیڑھ سال بعد مجھے ایک سخت ذہنی اور روحانی صدمہ پہنچا اور شاید اسی کے اثر سے میں بیمار پڑ گیا، بیماری نے بہت طول کھینچا، آخر میں میرے معالجوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دنوں کے لئے کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں ذہن پر کسی فکر کا بوجھ نہ پڑے اور روحانی و قلبی سکون و اطمینان کی زیادہ امید ہو۔

اس کیلئے میں نے رائے پور کی خانقاہ کو سب سے بہتر مقام سمجھا، حضرت اقدس قدس سرہ کی نعمتوں اور

شفقتوں کا ایک دفعہ تجربہ ہو چکا تھا اس لئے بغیر اسکے کہ پہلے خط و کتابت کر کے اجازت حاصل کی جائے میں نے رائے پور جانے کا پروگرام بنالیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جیسا کہ اندازہ تھا حضرت نے بڑی ہی عنایت و شفقت کے ساتھ خصوصی مہمان بنایا۔ غالباً میں نے پہلے ہی دن اپنی حاضری کی وجہ بھی عرض کر دی تھی۔

یہاں اپنا یہ حال بھی عرض کر دوں کہ چونکہ میری تمام تر تعلیم ان مدارس میں ہوئی تھی، جن کے اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے، اور آخر میں دو سال دارالعلوم ہی میں وہاں کے ان اکابر و اساتذہ کے قدموں میں رہا تھا جو شریعت و طریقت کے جامع تھے، اسلئے ان کے اتباع و پیروی میں دین کے دوسرے شعبوں کی طرح تصوف و سلوک کے بارے میں بھی میرا وہی خیال تھا جو میں نے اپنے ان اکابر و اساتذہ کا دیکھا اور سمجھا تھا۔ لیکن رائے پور کی اس حاضری سے کچھ پہلے بعض خاص حالات و اسباب کی وجہ سے میرے اندر یہ ذہنی تغیر پیدا ہو گیا تھا کہ تصوف کے اصل مقصد اور اس کی روح کو تو میں دین کا ایک ضروری شعبہ سمجھتا تھا، لیکن ذکر و شغل کے جو خاص خاص طریقے خانقاہوں میں (ہمارے سلسلہ کی بھی خانقاہوں میں) غام طور سے رائج اور معمول ہیں ان کو صحیح نہیں سمجھتا تھا، بلکہ اجتہادی قسم کی غلطی سمجھتا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ قلب میں ان بزرگوں کی جو عظمت تھی اور ادب کا جو رویہ تھا اس میں فرق نہیں آیا تھا۔ بہر حال جب میں رائے پور کی خانقاہ میں کچھ دن قیام کی نیت سے حاضر ہوا ہوں تو میرا یہ حال و خیال تھا۔ اب آگے سنئے:

غالباً پہلا ہی دن تھا کہ حضرت قدس سرہ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ ازراہ شفقت و عنایت مجھے بھی ساتھ ہی بٹھالیا۔ جہاں تک یاد ہے کوئی دوسرا شخص اس وقت وہاں پر نہیں تھا، قریب ہی خانقاہ کی سردری میں چند حضرات ”نفی و اثبات“ کا اور بعض حضرات ”اسم ذات“ کا ذکر کر رہے تھے، یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور خاص طریقہ سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ میں نے ادب و احترام کے ساتھ حضرت کی خدمت میں عرض کیا:

”حضرت ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین وہی ہے جو رسول اللہ (ﷺ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جس کی تعلیم آپ نے صحابہ کرام کو دی اور پھر صحابہ سے بعد والوں نے سیکھا اور جو صحیح نقل و روایت کے ساتھ ان سے ہم تک پہنچا۔ اور (ذاکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ حضرات جس طرح جہر و ضرب کے ساتھ ذکر کر رہے ہیں، جہاں تک اپنا علم ہے نہ تو رسول اللہ (ﷺ) نے صحابہ کرام کو تعلیم فرمایا نہ

صحابہ کرام نے تابعین سے اس طریقہ پر ذکر کرایا۔ اس لئے اس ذکر کے بارے میں مجھے غلبان ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ غلبان اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس کی تصحیح اور اصلاح ہو جائے۔“

حضرت رائے پوری قدس سرہ نے میری توقع کے بالکل خلاف ایک عجیب انداز میں فرمایا:

”مولوی صاحب! یہ بیچارے جو میرے یہاں آتے ہیں یہ اور کسی کام کے نہیں ہوتے، بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں اس لئے میں ان کو یہی بتلا دیتا ہوں۔ آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تحریر و تقریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے آپ تو یہ کرتے رہیں اس چکر میں نہ پڑیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ بات کا جواب نہ تھا۔ لیکن حضرت نے میری بات کے جواب میں اتنا فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے کی مہلت دے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل پر گفتگو کا نیا سلسلہ شروع فرمادیا، حضرت کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کی طرف توجہ دلانا میں نے مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب یہ مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن بعد مغرب پھر یہی ہوا کہ ذکرین نے اسی دھن کے ساتھ سہ دری میں اپنا ذکر شروع کر دیا۔ آج بھی حضرت نے مجھے اپنے ساتھ ہی پلنگ پر بٹھایا تھا، مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے اپنا کل کا اپنا سوال پھر دوہرایا۔ لیکن حضرت نے وہی گزشتہ کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی ماضی اور حال کی تحریکوں پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرمادیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

حضرت کے اس رویہ سے میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا اس لئے یہ اس سے پہلو تہی فرما رہے تھے۔ بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ میرے سوال کو ایک طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا، بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت سوال سے اپنی تشفی مقصود بھی نہیں تھی بلکہ نیت تنقید ہی کی تھی۔

.....

اپنے خیال پر نئے سرے سے غور اور نتیجہ

نماز عشاء سے فارغ ہو کر میں خانقاہ کے اس حجرہ میں جا کر لیٹ گیا جہاں میرے سونے کا انتظام تھا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی مسائل تھا اور خود ہی عجیب۔

ذہنی بحث و مباحثہ میں مجھے دیر تک نیند نہیں آئی، میں چاہتا تھا کہ اس مسئلہ میں ذہن بالکل یکسو ہو جائے۔ اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں تو اس بارہ میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کروں اور ان باتوں کے غلط ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت و نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید، اور حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں بلکہ بدعت کا حامی اور رواج دینے والا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضہ سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح یا تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انھوں نے انہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلدی ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم و ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کر جانا زیادہ ممکن اور زیادہ ترین قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید جیسے اکابر دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے۔ اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری اور فکری ہے اور ان حضرات کا ساری عمر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوم فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب حضرات اپنے اپنے زمانے میں اسرار دین کے عارف اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود چند بدعتوں کو قرب خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر ان میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحبِ وحی

نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا داعی اور رواج دینے والا بھی نہیں ہو سکتا، خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دین کے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا داعی ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو۔ اس میں اگر وہ بدعت اور غیر بدعت کا امتیاز نہ کر سکے تو وہ یقیناً اصلاح سے زیادہ فساد اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔

بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن تک پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ ہی سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں کچھ غلطی ہو رہی ہے اور اب مجھے اس غلطی کو پکڑنے اور پالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ رات کافی گزر چکی تھی، اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور و فکر کا سلسلہ اس وقت ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا اور سو گیا۔

حضرت رائے پوری قدس سرہ کا روزانہ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد دو تین میل چلتے تھے۔ اس وقت حضرت کے خاص خادم مولانا عبدالمنان صاحب ساتھ ہوتے تھے۔ ایک دن پہلے کی آئی ہوئی ڈاک ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی، وہ ایک ایک خط حضرت کو سناتے جاتے تھے۔ حضرت ہر ایک کا جواب بتلاتے جاتے تھے، واپس آ کر وہ جوابات لکھتے تھے۔ اس معمول کے مطابق صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت تشریف لے چلے مولانا عبدالمنان صاحب بھی ساتھ تھے، میں بھی اس دن ساتھ ہولیا، تھوڑی دور چلنے کے بعد مولانا عبدالمنان صاحب غالباً حضرت کا کوئی اشارہ پا کر واپس ہو گئے اور میں تنہا حضرت کے پاس رہ گیا۔ میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا میں نے جو سوال حضرت سے کیا تھا اس کے بارہ میں میں نے خود گزشتہ رات بہت غور کیا۔ میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا کہ تصوف و سلوک کے ان اعمال و اشغال کے بارہ میں اب تک میں نے جو سمجھا ہے وہ غالباً صحیح نہیں ہے اور اسکے بارے میں مجھ ہی کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے لیکن میں ابھی تک اس غلطی کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔ چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ وہ غلطی معلوم ہو جائے۔ یہ سن کر حضرت مسکرائے اور فرمایا:

”مولوی صاحب آپ کو شاید یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں۔ یہ بتلائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ علماء نے بدعت کی تعریف کئی طرح سے کی ہے۔ لیکن جو زیادہ صحیح اور محقق ہے وہ یہ ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لئے شرعی دلیل نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مکمل ہو رہی ہو،

اللہ ورسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو لیکن زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے وہ اس طریقہ سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو جس طریقہ سے رسول اللہ (ﷺ) اور صحابہ کرام کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی بلکہ اس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ دین میں ”اضافہ“ اور ”بدعت“ کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے اور اس کا نہایت تاکید حکم ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) اور صحابہ کرام کے زمانے میں صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کا کوئی مستقل نظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے نہ کتابیں تھیں۔ لیکن بعد میں ایسے حالات ہو گئے کہ اس مقصد کے لئے صحبت کافی نہیں رہی بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دینی تعلیم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقہ میں اس تبدیلی کو بھی دین میں ”اضافہ“ اور ”بدعت“ کہا جائے گا؟

میں نے عرض کیا — نہیں، دین میں اضافہ جب ہوتا ہے جب کہ مقصود اور امر شرعی سمجھ کر کیا جائے لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے قدیمی طریقہ ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو دین میں اضافہ نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔

حضرت نے فرمایا:

”مولوی صاحب سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے ان سب کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ان سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی۔ بلکہ یہ سب اللہ سے وہ تعلق پیدا کرنے کے لئے کرایا جاتا ہے جو دین میں مقصود اور نما مور یہ ہے۔“

”مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کا دھیان رہنا اور کسی وقت بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان و اسلام کامل نہیں ہوتا، لیکن رسول اللہ (ﷺ) کے زمانے میں دینی تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی محبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضور کے فیضانِ محبت سے صحابہ کرام کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی، لیکن بعد میں زمانہ کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے صحبت کافی نہیں رہی تو دین کے اس شعبے کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لئے صحبت کے ساتھ ”ذکر و فکر“ کی

کثرت کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لئے ان کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور قلوب میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا، تو ان میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مآ مور یہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اور اسی لئے اصل مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑادی جاتی ہیں اور مشائخ اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں کی بیشی اور رد و بدل کرتے رہے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے ان کے حالات اور استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کر دیتا ہے۔ اور اللہ کے بعض بندے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی ذکر و شغل کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔“

حضرت کی یہ تقریریں کر میرا وہ دہنی خلیجان دور ہو گیا اور جو کچھ حضرت نے فرمایا اس کو ذہن نے پوری طرح قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ یہ احساس اور داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے بھی اس سے خالی اور محروم نہ رہنا چاہئے۔ لیکن میرے حالات ایسے تھے کہ میں اس کی تحصیل کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے میں نے حضرت کی خدمت میں بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا کہ حضرت اگر یہ ذکر و شغل اس لئے کرایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خشیت و محبت وغیرہ کیفیات حاصل ہوں تو میں بھی اس کا محتاج اور طالب ہوں لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں زیادہ اور مستقل وقت نہیں دے سکتا کیوں کہ دین کے جن دوسرے کاموں سے تعلق ہے میں ان کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت نے فرمایا:

”مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے جن کو اللہ نے دین کے کاموں کی اچھی استعداد دی ہے وہ اب ادھر توجہ نہیں کرتے۔ اگر وہ تھوڑی سی توجہ ادھر کریں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے، ماوا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں کیں اور ان کے جو نتیجے نکلے اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستے سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ

ہے کہ اس طرف صرف وہی بچا رہے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں، ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔“

پھر حضرت نے اس سلسلہ میں مزید فرمایا:

”خدا معلوم تصوف کو لوگ کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ

ہے۔ اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“

میں نے عرض کیا کہ جو شخص پہلے سے کسی دین کے کام میں لگا ہوا ہو اور وہ محسوس کرتا ہو کہ اسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں تو کیا وہ کسی مدت تک اس کام کو چھوڑ کر پہلے عشق و اخلاص کی تحصیل میں لگ جائے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کرتا رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے؟

حضرت نے فرمایا:

”ہاں ہو سکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں کچھ مدت تک کے لئے یکسوئی کیساتھ اس طرف مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

بیعت کی درخواست اور فتح باب

”پھر غالباً کسی دوسری صحبت میں میں نے حضرت سے بیعت اور تلقین کی درخواست کی۔ اس پر

فرمایا:

”مولوی صاحب حدیث میں ہے: المستشار مؤتمن (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین

ہے اس کو دیانتداری سے صحیح مشورہ دینا چاہئے) میں آپ کے لئے بہتر سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے آپ حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) یا حضرت شیخ الحدیث کی طرف رجوع کریں، آپ جیسے اہل علم کے لئے میں ان ہی حضرات کو بہتر سمجھتا ہوں۔“

میں نے عرض کیا ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے دل میں ہے لیکن چونکہ مجھے یہ طلب حضرت ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے اس لئے میں اپنے لئے حضرت ہی کی رہنمائی چاہتا ہوں۔

حضرت نے اپنی محبت اور شفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک دوبار پھر انہی دونوں بزرگوں کے بارے میں فرمایا لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا:

”جب میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا

اور بیعت کی درخواست کی تو حضرت نے اس وقت بیعت نہیں فرمایا، ذکر کی تلقین فرمادی اور ارشاد فرمایا ”دیر آید درست آید“ آئندہ کسی وقت پر بیعت بھی ہو جائے گی۔ میں نے ذکر شروع کر دیا اور پھر دو سال کے بعد حضرت نے بیعت بھی فرمایا۔“

اسکے بعد مجھ سے فرمایا: آپ ذکر شروع کر دیں بیعت کی بات پھر کسی وقت دیکھی جائے گی۔ میں نے اس کے بعد بیعت کے لئے اصرار نہیں کیا۔ ذکر کی تلقین کی درخواست کی۔ حضرت نے میرے حالات و مشاغل کا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرمادیا اور میں نے اسی دن سے وہیں عمل شروع کر دیا۔ پھر اس واقعہ کے قریب دو سال بعد بیعت بھی فرمایا۔

بلاشبہ حضرت کی خدمت میں حاضری اور پھر بیعت کی توفیق اس بندے پر اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت تھی جن کا شکر ادا کرنے سے یہ بندہ ہمیشہ عاجز و قاصر رہے گا۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ۴۲ء میں حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہ کی حاضری اور بیعت و سلسلہ سے وابستگی ہی کا تذکرہ تھا، اس کے بعد قریباً بیس سال حضرت ہماری اس دنیا میں رہے اور یہ عاجز بندہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت کی خدمت میں بار بار حاضر ہوتا رہا، کبھی کبھی طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے بارے میں کچھ اپنے تجربات اور احساسات و مشاہدات بھی لکھ دئے جائیں۔

اس عاجز نے جو باتیں خاص طور پر محسوس کیں اور جن سے زیادہ تر متاثر ہوا، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ حضرت کی زندگی میں ہم نے تصوف کے مقصد اور اس کے مغز کو دیکھا۔ حضرت کے یہاں ساری فکر اور سارا اہتمام اس مغز اور مقصد ہی کا تھا، رسوم تصوف کے نہ خود پابند تھے نہ دوسروں سے پابندی چاہتے تھے۔ نسبت اور تعلق مع اللہ کے حصول کے لئے بقدر امکان یکسوئی کے ساتھ کثرتِ ذکر و فکر پر تو عموماً زور دیتے تھے اور اس کو گویا اس دروازہ کی کنجی سمجھتے تھے، اس کے علاوہ زمانہ کے تغیرات، لوگوں کے حالات اور مختلف طبائع کا لحاظ رکھتے ہوئے بالکل مجتہدانہ رہنمائی فرماتے تھے، بہت سونے کے لئے ایک شغل تجویز فرماتے اور بعض دوسروں کو باوجود درخواست کے اس سے منع فرمادیتے تھے۔ مسترشدین اور متوسلین میں سے جو افراد دین و ملت کی کسی خدمت میں لگے ہوتے آپ ذکر کے ساتھ اس خدمت ہی کو ان کا خاص شغل اور وظیفہ قرار دیتے اور فرماتے کہ بس اخلاص نیت کا اہتمام کرو، یہی وہ اکسیر ہے جو ہر عمل کو عبادت و قربت اور وصول الی اللہ کا وسیلہ بنا دیتی ہے۔ مصنفین سے فرماتے کہ جب لکھنے کے لئے بیٹھو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نیت کی تصحیح اور اللہ تعالیٰ سے صواب و سداد کی دعا کر لیا کرو۔ مدرسین سے فرماتے کہ درس شروع کرو تو

نیت کی درستی کا اہتمام کر لیا کرو۔ واعظین و مقررین سے فرماتے کہ جب وعظ و تقریر کا موقع آئے تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین و ملت کی خدمت کی نیت کر کے اللہ سے اپنے اور دوسروں کے لئے دینی نفع کی اور ہر قسم کے زلیغ و ضلال سے حفاظت کی دعا کر لیا کرو۔ کسانوں، محنت کشوں اور نوکری پیشہ لوگوں سے فرماتے کہ اپنے اور بال بچوں کے لئے حلال روزی کی نیت سے تمہارا محنت کرنا اور کھیتوں میں ہل چلانا بہت سونے کے نوافل سے افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ایسے ہی متوسع اور صاحب اجتہاد مشائخ تصوف کی صحیح نمائندگی اور خدمت کر سکتے ہیں۔ حضرت کی اسی خصوصیت نے تعلق اور فیض کے دائرہ کو بہت وسیع کیا اور اسی وجہ سے امت کے مختلف طبقات کی بہت بڑی تعداد آپ سے دینی نفع اٹھا سکی۔

حضرت کی دوسری خصوصیت جس نے اس عاجز کو بہت متاثر کیا اور جس کا میں سال مسلسل تجربہ ہوتا رہا یہ تھی کہ دنیا کے جھیلوں سے بالکل بے تعلق اور خانقاہ نشین درویش ہونے کے باوجود دنیاوی معاملات کو بھی اتنا بہتر سمجھتے تھے اور اپنے خدام و مخبین کے اس قسم کے معاملات میں ان کی طلب پر ایسا صحیح و صائب مشورہ دیتے تھے کہ ان امور کے کسی اچھے تجربہ کار اور دانشمند سے بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح قومی و سیاسی تحریکات اور ملکی معاملات سے بظاہر بالکل بے تعلق ہونے کے باوجود ان کے بارہ میں ایسی متوازن، صحیح اور صائب رائے رکھتے تھے جس سے وہ عمائد اور زعمائے قوم بھی رہنمائی حاصل کریں جن کی عمریں انہی میدانوں میں گزری ہیں۔ لیکن خدام و متوسلین کو بالکل آزادی تھی کہ اس دائرہ میں ان کی جو رائے ہو اس پر قائم رہیں اور عمل کریں۔ اسی لئے اس میدان میں حضرت کے خاص متوسلین کے خیالات میں بعض اوقات باہم سخت اختلاف اور تضاد بھی ہو جاتا تھا، اور بعض خدام کی رائے اور کبھی کبھی عملی سرگرمیاں بھی خود حضرت کے رجحان کے خلاف ہوتیں، لیکن ان کی وجہ سے حضرت کی شفقت اور قلبی تعلق میں ذرہ برابر فرق نہ آتا۔ یہ عاجز اس بارہ میں جتنا غور کرتا ہے اس کو حضرت کی غیر معمولی کرامت سمجھتا ہے، ہم جیسے عام انسانوں کے لئے یہ بات بالکل ناممکن ہی ہے۔

اسی طرح ایک خصوصیت اور جامعیت اللہ تعالیٰ نے حضرت کو یہ عطا فرمائی تھی کہ ایک طرف تو توکل اور تجمل کا وہ اعلیٰ مقام حاصل تھا جس سے ارفع مقام کم از کم اپنی آنکھوں نے نہیں دیکھا اور قرآنی وعدہ کے مطابق اس کے نتیجہ میں ”لا یحتسبی“ نعمتوں کی موسلا دھار بارش بھی جنگل میں اس خانقاہ پہ دن رات برتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مقرر کئے ہوئے سلسلہ اسباب اور انسانی تدبیر و کوشش کے قدرتی نظام کی اہمیت پر بھی بے حد زور دیتے تھے اور زندگی کے کاروبار میں ترک تدبیر اور تعطیل اسباب

(۱) ”توکل“ صرف اللہ پر اعتماد اور بھروسہ۔ اور ”تجمل“ سب سے کٹ کر صرف اللہ سے وابستگی۔

کے سخت مخالف تھے۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں آپ نے آخری حج فرمایا، اس حج کے احوال و واردات کا ذکر کرتے ہوئے بار بار آپ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ”میں دیکھتا تھا کہ اللہ کے بندے بیت اللہ سے چٹ چٹ کے اور اس کا غلاف ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کے اور خوب ردو کے ان باتوں کی دعائیں کرتے تھے جن کے لئے وہ عالم اسباب میں کوشش بھی نہیں کرتے، ان کا یہ حال دیکھ کر میرے دل سے فوارہ کی طرح یہ بات نکلتی تھی کہ تمہاری ان دعاؤں سے بلا پیٹرول اور ڈرائیور کے ایک موٹر تو چل نہیں سکتی ساری دنیا الٹ پلٹ کیسے ہو جائے گی۔“ اپنے اسی مزاج اور اسی اصول کی بنا پر اپنی ذات کے بارہ میں بھی دوا علاج اور ہر ہیز کا پورا اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اسی طرز عمل کی ہدایت فرماتے لیکن قلب اس یقین سے معمور و مطمئن رہتا کہ کارساز و موثر صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ہے مگر اشیاء میں خاصیتیں بھی اللہ تعالیٰ ہی نے رکھی ہیں اور اسی نے تدبیر اور اسباب کے استعمال کا حکم دیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) اور صحابہ کرام اور محققین امت کا توکل ہمیشہ یہی رہا ہے۔ اسباب ہی کو سب کچھ سمجھنا اور انہی پر نگاہ رکھنا جیسا کہ آج کل ہمارا عام حال ہے مقام ایمان کے منافی ہے، اور ان کی اسبابی حیثیت کا انکار بھی سنگین غلطی ہے۔ اعتدال کی راہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔

اللہ کے مقبول بندوں کے الوان مختلف ہوتے ہیں ”ہر گلے زارنگ و بوئے دیگر است“ کسی پر خون و شگلی کا غلبہ ہوتا ہے، کسی پر احساسِ نعمت و انبساط کا، کسی پر جلال کے آثار زیادہ ہوتے ہیں کسی پر جمال کے، کسی پر کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر کسی دوسری کیفیت کا۔ مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ پر جہانگیر اس بے بصرو بے بصیرت کا اندازہ ہے ”فتائیت“ اور ”انا کی نفی“ کا غلبہ تھا، انہی آنکھوں نے اس باب میں جو حال حضرت کا دیکھا اس کے آگے کے درجہ اور مقام کے تصور سے بھی کم از کم اس ناچیز کا ذہن تو عاجز ہے۔ بارہا اس کا اظہار فرمایا کہ ہر آنے والے کو میں اس خیال سے بیعت کر لیتا ہوں کہ شاید یہی اللہ کا بندہ میری مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔ بہت ہاؤس (سہارنپور) کے آخری زمانہ قیام میں میرے ایک عزیز مولوی تحسین احمد سنہجلی جو حضرت سے بیعت تھے، سنہجلی سے حاضر خدمت ہوئے اور انھوں نے اپنے والد ماجد (ایک رشتہ کے میرے بڑے بھائی منشی بشیر احمد صاحب) کا یہ پیغام مجھے پہنچایا کہ بینائی سے محرومی کے باعث میں خود سفر کر کے حضرت کی خدمت میں حاضری سے معذور ہوں، تم حضرت کی خدمت میں میری موزوری کا حال عرض کر کے درخواست کرو کہ میری بیعتِ غائبانہ قبول فرما کر مجھے بھی اپنے خدام میں شامل فرمائیں۔ میں نے ایک مناسب وقت پا کر حضرت کی خدمت میں ان کا یہ حال عرض کیا کہ وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ایک مل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اللہ کی توفیق سے اس زمانہ میں بھی بہت دیندار اور خوش اوقات تھے، ایک رات اچانک بغیر کسی خاص تکلیف کے ان کی بینائی چلی گئی اور صبح معلوم ہوا کہ کالا پانی اُتر آیا ہے جو لاعلاج

سمجھا جاتا ہے۔ جب لکھنؤ سے سنبھل میرا جانا ہوا، اور میں عیادت اور تعزیت کی نیت سے ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ اللہ کے اس فیصلہ پر دل سے راضی ہیں بلکہ ایک درجہ میں اس کی خوشی ہے کہ اب میرے مالک نے مجھے ایسا کر دیا کہ ہر طرف سے یکسو ہو کے بس اسی میں مشغول رہوں۔ پھر ان کے جو قابل رشک دینی حالات اور معمولات میرے علم میں تھے وہ بھی میں نے حضرت سے ذکر کئے اور آخر میں عرض کیا کہ تائینائی کی مجبوری کی وجہ سے چونکہ حاضری سے معذور ہیں اس لئے حضرت سے غائبانہ بیعت کی درخواست کرتے ہیں۔ حضرت پر ان کا حال سن کر رقت طاری ہوئی اور گلوگیر آواز میں فرمایا ”ان کا درجہ بہت اونچا ہے اللہ کے ایسے بندوں کو بیعت کرنے سے شرم آتی ہے۔ انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں، آپ یہی جواب ان کو لکھ دیں“۔ حضرت نے یہ بات اس وقت اس طرح فرمائی کہ میں اس کے بعد کچھ عرض نہیں کر سکا اور خاموش ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد حضرت نے خود مجھے طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے بہت ہی اچھے بندے ہیں، شاید انہی کا تعلق میری مغفرت کا ذریعہ بن جائے آپ انھیں لکھ دیں کہ میں نے ان کا تعلق قبول کر لیا۔ الحمد للہ ہمیں حضرت کے کشف و کرامات کا بھی بار بار تجربہ ہوا، لیکن بخدا ہزاروں کھلی کراہتیں اس نعمت عظمیٰ ”فنائیت“ اور ”انا کی نفی“ کے برابر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کے قلب و باطن کو حُبِ جاہ کے جذبہ سے بالکل ہی پاک کر دیا تھا۔ وہی جاہ جس کے متعلق ائمہ معرفت کا ارشاد ہے ”آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ“ (یعنی طالبین اور سالکین ہی نہیں بلکہ صدیقین کے قلوب سے جو روحانی بیماری سب سے آخر میں نکلتی ہے وہ حبِ جاہ کا جذبہ ہے۔)

آخر میں یہ سیدہ کار اپنے بارے میں صفائی سے عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ ایسے کامل شیخ سے بیعت اور قریباً بیس سالہ وابستگی اور حضرت کی بے انتہا شفقت و عنایت سے جو حاصل کرنا چاہئے تھا اپنے لاابالی پن اور آرام طلبی کی وجہ سے وہ کچھ بھی حاصل نہ کیا جاسکا۔

تہیدستان قسمت راجہ سودا زرہمیر کامل کہ خضر از آب حیواں تشہ می آرد سکندر را
 کہیں اور اب جب کی کبر سنی کے اثر سے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی ظاہری اور باطنی تمام قوتیں تیزی سے رخصت ہو رہی ہیں اس کی بھی امید نہیں کہ زندگی کے باقی دنوں میں اس تقصیر کی تلافی ہو سکے گی، اس لئے اب جو کچھ آسرا ہے ارحم الراحمین کے قانونِ رحمت ہی سے ہے۔ فرمایا گیا ہے: **أُولَٰئِكَ قَوْمٌ لَا يَشْقَىٰ جَلِيسُهُمْ**
 شاید کسی نے اسی کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں

اسی سلسلہ میں چند ہی صفحات پہلے ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ اس عاجز نے جب مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے بیعت کی درخواست کی تو حضرت ممدوح نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ یا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا، لیکن جب میں نے اس کے بعد بھی اپنی گزارش اور درخواست پر نیاز مندانا اصرار کیا تو قبول فرمایا۔ اس کے چار دن بعد جب میں حضرت سے رخصت ہو کر جانے لگا تو بڑی شفقت کے ساتھ مجھے حضرت نے تاکید فرمائی کہ حضرت دہلوی کے یہاں زیادہ جایا کرو (حضرت رائے پوری قدس سرہ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو ”حضرت دہلوی“ کے ہی لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے)۔ میں نے عرض کیا کہ میں حضرت مولانا محمد الیاس کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں اور میرے دل میں الحمد للہ ان کی عظمت ہے لیکن مجھے مولانا کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں ہو سکی۔ میری زبان سے یہ سن کر حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ کا خاص تعلق بیک وقت بہت سے بندوں سے بھی ہوتا ہے، لیکن خاص الخاص تعلق بس کسی کسی کے ساتھ ہوتا ہے، فی الحقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس بندے کے ساتھ اُس کا کیسا تعلق ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت حضرت دہلوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص تعلق ہے۔“

حضرت کی زبان سے یہ کلمات سن کر میں نے ارادہ کر لیا کہ حضرت مولانا الیاس کی خدمت میں حاضری کا انشاء اللہ اب زیادہ اہتمام کروں گا۔

میں رائے پور سے رخصت ہو کر سہانپور آیا، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت و ملاقات کی

(۱) یہ واقعہ ۱۳۴۲ء کے اواخر یا ۱۳۴۳ء کے اوائل کا ہے جبکہ زاقم سطور حضرت رائے پوری قدس سرہ کی خانقاہ میں ایک ہفتہ کے قریب مقیم رہا تھا، واقعہ کی تفصیل ناظرین گزشتہ ادراق میں پڑھ چکے ہیں۔

نیت سے مدرسہ مظاہر العلوم پہنچا۔ اس وقت حضرت شیخ ابوداد شریف کا سبق پڑھا رہے تھے، میں خاموشی سے طلبہ کے ساتھ ایک کنارے بیٹھ گیا اور سبق کی سماعت میں شریک ہو گیا۔ جب سبق ختم ہوا تو ابوداد شریف کے طلباء سے مخاطب ہو کر حضرت شیخ نے فرمایا کہ میں چچا جان کی علالت کا آپ لوگوں سے ذکر کر چکا ہوں، آج کے خط سے معلوم ہو ہے کہ ضعف بہت بڑھ رہا ہے، آٹھ دن سے غذا بالکل نہیں ہوئی ہے، حضرت چچا جان کی صحت کے لیے آپ سب حضرات دعا کریں (حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد الیاسؒ کو حضرت چچا جان ہی کہا کرتے تھے)۔ حضرت شیخ الحدیث نے یہ کہہ کر ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کی، طلبہ نے بھی دعا کی، یہ عاجز بھی دعا میں شریک رہا جب دعا ختم ہوئی تو میں حضرت شیخ کے قریب گیا، سلام مصافحہ ہوا، میرے دریافت کرنے پر حضرت شیخ نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی علالت کی کچھ مزید تفصیل بتلائی، میں نے حضرت کی عیادت و زیارت کے لیے اُسی وقت دہلی جانے کا ارادہ کر لیا، حضرت شیخ الحدیث سے بھی عرض کر دیا، اور اب یاد نہیں رہا کہ اُسی دن یا اگلے دن روانہ ہو گیا۔ رات کو عشاء کی نماز کے کافی دیر بعد نظام الدین پہنچنا ہوا، مسجد میں دو ایک صاحبان نظر پڑے جو ابھی سوئے نہیں تھے، غالباً اُن میں کوئی صاحب میرے پہچاننے والے بھی تھے، میں نے اُن حضرات سے عرض کر دیا کہ حضرت مولانا اگر جاگ بھی رہے ہوں تو میری حاضری کی اطلاع اس وقت نہ دی جائے میں انشاء اللہ صبح حضرت سے ملوں گا (میرا مقصد یہ تھا کہ میری وجہ سے حضرت کے آرام اور نیند میں خلل نہ پڑے)۔ ان حضرات نے مجھ سے کہا کہ حضرت مولانا جاگ رہے ہیں اور اُن کو تمہاری اطلاع ہو گئی ہے، اور فرمایا ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر ابھی میرے پاس آ جائیں، میں حضرت کے حجرے میں حاضر ہوا، میں نے بستر ہی پر حضرت سے مصافحہ کرنا چاہا، حضرت نے مصافحہ نہیں فرمایا اٹھ کر بستر سے کھڑے ہو گئے، میرے دونوں ہاتھ جو میں نے مصافحہ کے لیے بڑھائے تھے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی، میں نے اصرار سے عرض کیا کہ حضرت کی طبیعت ناساز ہے، حضرت بستر پر آرام فرمائیں، لیٹ جائیں! حضرت نے فرمایا کچھ بیمار نہیں ہوں، تم ہی لوگوں کا بیمار ڈالا ہوا ہوں، آ کے دین کا کام کرو انشاء اللہ میں اچھا ہو جاؤں گا، میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، حضرت لیٹ جائیں، آرام فرمائیں، حضرت نے فرمایا وعدہ کرو آؤ گے، وقت دو گے، جب میں بیٹھوں گا میں نے عرض کیا کہ میں ابھی حاضر ہوں، جیسے حضرت فرمائیں گے انشاء اللہ وہی کر دوں گا۔

اُس وقت حضرت مولانا اس قدر کمزور تھے کہ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ جب میں نے حضرت کے فرمانے کے مطابق وقت دینے کا وعدہ کر لیا تو حضرت تکیہ کا سہارا لے کر نیچے فرش پر بیٹھے اور ایک صاحبِ دوز

اور صاحب حال کی طرح گفتگو فرماتے رہے، کافی دیر کے بعد غالباً میرے باصرار عرض کرنے پر گفتگو کا سلسلہ ختم فرمایا اور مجھ سے فرمایا:

اچھا اب آرام کر لو انشاء اللہ صبح بات کروں گا۔ میں آکر اُس حجرے میں سو گیا جہاں میرے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صبح کو فجر کی نماز کے بعد بلکہ اشراق کے بعد پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت میں نے ایک ہفتہ کا ارادہ کر لیا ہے۔ حضرت نے فرمایا، بہت اچھا، اور دعائیں دیں۔ اُسی کے ساتھ فرمایا کہ اس وقت تو آپ چلے جائیے انشاء اللہ میں اس بیماری سے جلد ہی اچھا ہو جاؤں گا، جب میرا کوئی سفر ہوگا تو اطلاع دلاؤں گا اس وقت آپ آجائیں۔ میں صرف ایک دو دن حضرت کی خدمت میں نظام الدین رہ کر اُس وقت کے اپنے مستقر بریلی واپس آ گیا۔

ایک دو دن کے اس مختصر قیام میں مختلف صحبتوں میں حضرت کی جو باتیں سنیں اُن سے اندازہ ہوا کہ اللہ نے اپنے دین کا اور اپنے رسول پاک کی اُمت کا وہ درد و فکر حضرت مولانا کو دے دیا ہے جس کا غالباً ہزارواں حصہ بھی ہمیں نصیب نہیں۔

میں دہلی سے بریلی واپس آ گیا، کچھ مدت کے بعد حضرت مولانا کی طرف سے اطلاع ملی کی فلاں تاریخ کو میوات میں تبلیغی اجتماع ہے، حضرت مولانا بھی انشاء اللہ تشریف لے جائیں گے اگر ممکن ہو تو اس موقع پر آ جانا چاہیے۔ میں بریلی سے روانہ ہو کر نظام الدین حاضر ہو گیا، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی لکھنؤ سے پہنچ گئے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خاص عنایت فرمائی کہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ ہی کار میں بٹھایا، حضرت پورے راستہ ارشادات فرماتے رہے۔ اس سفر میں اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا کو اس سے پہلے جو کچھ سمجھا تھا حضرت کا مقام اُس سے بہت زیادہ بلند ہے۔

رفیق محترم مولانا ندوی نے بھی اپنا یہی احساس اور تاثر بتلایا۔ اسی سفر میں حضرت کے ارشادات اور ملفوظات پہلی دفعہ قلم بند کئے، بعد میں ایک دوسرے سفر میں حضرت کو سنا کر اس کی تصحیح و توثیق کرانے کا بھی موقع مل گیا اور وہ پہلی دفعہ ”الفرقان“ میں شائع ہوئے، پھر بعد میں جب حضرت کے ارشادات و ملفوظات اس عاجز نے کتابی شکل میں مرتب کیے تو ان کی پہلی قسط غالباً انھیں ملفوظات پر مشتمل ہے جو میوات کے اس سفر میں قلمبند کیے گئے تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ اس سفر میں حضرت کے حال کے مطالعہ اور ارشادات سننے کا جو موقع ملا اس نے ذہن

اور طرز فکر پر بہت گہرا اثر ڈالا، اور پہلی دفعہ گویا آنکھوں سے دیکھا کہ ”دل والوں“ اور ”دماغ والوں“ میں کیا خاص فرق ہوتا ہے۔

اس کے چند مہینے بعد حضرت مولانا نے ایک بڑی ”جماعت“ کے ساتھ لکھنؤ کا تبلیغی سفر فرمایا۔ راقم سطور کو اس کی بھی اطلاع دی گئی تھی، مقررہ پروگرام کے حساب سے یہ عاجز بھی لکھنؤ پہنچ گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پوری جماعت کا قیام تھا۔ اس جماعت میں مختلف مقامات و طبقات کے جہاں تک یاد ہے، قریباً اسی (۸۰) افراد تھے۔ تبلیغی جماعت اور اس کے کام کو دیکھنے کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کام کو تفصیل سے دیکھ کر اس کے طریقہ کار اور اصولوں کو سمجھ لوں۔ جب میں لکھنؤ پہنچا اور حضرت مولانا سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے عرض کر دیا کہ اس پورے سفر میں انشاء اللہ ساتھ رہوں گا تو ارشاد فرمایا کہ تم بس میرے ساتھ رہو، اور یہ شرط ہے کہ سات دن تک مجھ سے کوئی سوال نہ کرو، بس میری سنتے رہو اور جو کام ہو رہا ہے اُسے دیکھتے رہو، میں نے ایسا ہی کیا۔ چار دن گزرنے پر میں نے اندازہ کیا کہ جماعت کے کام کو دیکھ کر اور حضرت مولانا کے ارشادات مسلسل سن کر تبلیغی جماعت کے کام اور طریقہ کو میں نے سمجھ لیا اور میرے ذہن میں جو سوالات اور اشکالات تھے اُن سب کا جواب مجھے مل گیا۔

میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے جو فرمایا تھا کہ ایک ہفتہ تک کچھ نہ بولو، کچھ نہ پوچھو بس دیکھتے سنتے رہو! مجھے وہ یاد ہے اور میں اس پر قائم ہوں، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے خوشی سے اجازت دی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ سمجھا تھا کہ حضرت نے کوئی بات پوچھنے سے جو منع فرمایا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ میں کام کو سمجھنے سے پہلے اس کے بارے میں کوئی سوال اور اشکال عرض نہ کر دوں، تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب کوئی سوال و اشکال باقی نہیں رہا، کام اور اس کے طریقے اور اصولوں کے بارے میں الحمد للہ پورا اطمینان ہو گیا ہے اور انشاء اللہ اب دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہوں! حضرت نے فرمایا بس یہی مقصد تھا، اب وہ پابندی ختم۔

لکھنؤ کے اس سفر میں قریباً ایک ہفتہ حضرت کے حکم سے حضرت کے ساتھ ہی رہنا اور اٹھنا بیٹھنا ہوا تو اندازہ ہوا کہ حضرت کا مقام اس سے بھی بہت بلند ہے جو میوات کے پچھلے سفر میں ہم نے اندازہ کیا تھا۔ سفر کی اس رفاقت سے سب سے بڑا نفع اپنے کو یہ ہوا کہ دین کی خدمت اور دعوت و تبلیغ جیسے کاموں میں اخلاص اور صفتِ ایمان و احتساب کا ایک نمونہ دیکھ لیا اور اپنے اندر کم سے کم اس کی حسرت پیدا ہو گئی۔

مرض وفات کا آنکھوں دیکھا حال

حضرت مولانا کا یہ سفر جب ۱۳۶۲ء میں ہوا تھا، اُس سے واپسی کے چند ہی مہینوں کے بعد حضرت مولانا کے اُس آخری مرض کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا اختتام ۲۱ رجب ۱۳۶۳ء کو وصال پر ہی ہوا۔ حضرت کے وصال سے قریباً ۴ مہینے پہلے (رجب الاول یا رجب الثانی ۱۳۶۳ھ میں) مراد آباد کے ایک سفر میں جو تبلیغی کام ہی کے سلسلہ میں کیا گیا تھا، بعض ایسے حضرات سے ملاقات ہوئی جو دہلی سے آئے ہوئے تھے اور حضرت مولانا سے عقیدت و محبت اور ان کے تبلیغی کام سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اُن سے حضرت کی بیماری کی تشویش ناک نوعیت کا اس عاجز کو علم ہوا تو زیارت و عیادت کی نیت سے میں وہیں سے دہلی روانہ ہو گیا۔ بحسن اتفاق جس دن میں نظام الدین پہنچا اس سے کئی دن پہلے سے مخدومنا حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری (قدس سرہ) اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ بھی مولانا کی زیارت و عیادت ہی کے لیے وہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اور اُسی دن ان حضرات کی واپسی کا پروگرام تھا۔ حضرت رائے پوری قدس سرہ نے روانہ ہوتے وقت مجھے الگ مسجد کے ایک کونے میں بلایا اور ارشاد فرمایا کہ۔

”مبولوی صاحب! اور کام تو عمر بھر کرو گے اس وقت جتنا بھی ہو سکے یہاں پڑے رہو آج

کل یہ پچاس میاں ہزاروں میل روز کی رفتار سے جارہے ہیں۔“

گجی بات یہ ہے کہ میں حضرت کے اس ارشاد کا مطلب تو پوری طرح سمجھ نہیں سکا، کیونکہ اُس روحانی پرواز سے خود واقف نہ تھا جس کی طرف حضرت نے اشارہ فرمایا تھا، تاہم میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک حضرت مولانا کی بیماری کا سلسلہ ہے میں انشاء اللہ یہیں رہوں گا، اور دو تین ہفتے کے بعد رسالہ الفرقان اور اس کی دفتری ضروریات کی دیکھ بھال کے لیے دو چار دن کے واسطے بریلی چلا جایا کروں گا۔ پھر یہی معمول رہا۔

جب میں نظام الدین حاضر ہوا ہوں تو حضرت کا ضعف اس درجہ کو پہنچ چکا تھا کہ خود کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے، دوسرے ہی لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کی خدمت کی سعادت بخشی تھی اٹھا کر کھڑا کرتے، اور نماز کے وقت وہی خدام امام کی جگہ مصلے پر لا کر کھڑا کر دیتے لیکن نہیں معلوم، کہ مصلے پر کھڑے ہونے اور تکبیر تحریر یہ کہہ کے نماز شروع کرنے کے بعد کہاں سے قوت آجاتی کہ پوری نماز اچھے خاصے

الفرقان اس زمانہ میں بریلی سے نکلتا تھا، اور اُن کی وجہ سے میرا استقرار قوت بریلی ہی تھا۔

تندرستوں کی طرح کھڑے ہو کر اور ہمیشہ کی عادت کی طرح رکوع و سجود کے ساتھ پڑھاتے، کسی سہارے کی بالکل ضرورت نہ ہوتی — لیکن سلام پھیرنے کے بعد فوراً ہی حالت میں ایسا فرق پڑ جاتا کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے اور وہی خدام دیوار سے کمر لگا کر بٹھا دیتے پھر اُسی حالت میں فجر کی نماز کے بعد روزانہ تقریر بھی فرماتے، اور اس تقریر کے دوران پھر قوت سی آ جاتی — یہ واقعہ ہے کہ اگر حضرت کا یہ حال پچھتم خود نہ دیکھا ہوتا تو کسی کے بتلانے سے صحیح طور پر سمجھ نہ سکتا اور سمجھ لیتا تو یقین نہ آتا کہ ایسا کمزور اور بے جان آدمی اس طرح نماز پڑھا سکتا ہے اور اس طرح دل کے پورے جذبے کے ساتھ تقریر کر سکتا ہے۔

کچھ دنوں بعد جب ضعف اور زیادہ بڑھ گیا تو خود امامت نہ فرماتے لیکن جب جماعت کھڑی ہوتی اور اقامت کہی جاتی تو خدام آپ کو صفِ اول میں بٹھا دیتے اور آپ امام کی اقتدا میں پوری نماز کھڑے ہو کر ہی ادا کرتے — پھر جب کچھ دنوں کے بعد ضعف اور زیادہ ہو گیا تو آپ کو صفِ اول میں بٹھا دیا جاتا اور بیٹھ کر نماز ادا کرتے۔

آخری دنوں میں جب بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے تو آپ کے پلنگ کو پہلی صف کے ساتھ لگا دیا جاتا اور آپ لیٹے لیٹے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے، آخری دن تک یہی معمول رہا۔

اس آخری حالت میں بھی دین کی فکر اور مسلمانوں کی دین سے دوری کے درد کا غلبہ اتنا زیادہ تھا کہ جس نے نہیں دیکھا وہ سن کر یا تحریر میں پڑھ کر سمجھ نہیں سکتا — حالت یہ ہو گئی تھی کہ کمزوری کی وجہ سے اتنی آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی کہ قریب کا آدمی سن سکے، بعض خاص خادموں کو اشارہ فرماتے کہ اپنا کان میرے لبوں سے لگا دو، جب وہ کان لگا دیتے تو آپ ان سے فرماتے کہ میری طرف سے یہ بات حاضرین سے کہہ دو، وہ منہ پر کان رکھ کے بھی بشکل ہی آپ کی بات سمجھ سکتے اور پھر لوگوں کو آپ کا پیام پہنچاتے۔

* آپ کے وطن کا کھٹکھٹ سے آپ کے بعض احقرہ عیادت اور مزاج پرسی کے لیے آئے، ان سے آپ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آپ کی خیریت اور خبر لینے آئے ہیں — آپ نے فرمایا کہ جو مرنے اور مٹنے ہی کے لیے ہے اس کی خبر اور خیریت کے لیے اتنی دور سے آئے ہو؟ اور رسول اللہ (ﷺ) کا لایا ہوا دین عزیز مٹ رہا ہے اس کی خبر لینے کی کوئی فکر نہیں۔

کسی حکیم یا ڈاکٹر کو علاج کے لیے بلانے کی اجازت تب ہی دیتے جبکہ یہ اطمینان ہوتا کہ ان سے دین کی بات کہی جاسکے گی اور ان کو دعوت دی جاسکے گی۔

بیماری کے آخری مرحلہ میں (جہاں تک یاد ہے وصال سے قریباً دو آہٹ پہلے) حضرت مولانا مفتی

کفایت اللہ صاحب ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری کو لے کر آئے (جو اس وقت دلی کے ممتاز ڈاکٹروں میں تھے) ان کے ساتھ ایسے ہی ایک دوسرے بڑے ڈاکٹر اور بھی تھے — حضرت کو اطلاع دی گئی، فرمایا کہ جب وہ مجھے دیکھنے کے لیے میرے پاس آئیں تو ان کے بیٹھنے کا انتظام ایسا کرو کہ وہ فوراً ہی مجھے دیکھنے نہ لگیں، میں پہلے اُن سے اپنی بات کہوں گا، اس کے بعد وہ مجھے دیکھیں — چنانچہ ایسا ہی انتظام کیا گیا — حضرت مفتی صاحب اور دونوں ڈاکٹر صاحبان اندر حجرہ میں جہاں حضرت کا پلنگ تھا، تشریف لائے اور پلنگ سے ذرا فاصلہ پر ان حضرات کے لیے جو قالین بچھوایا گیا تھا، اس پر بیٹھ گئے۔

حضرت نے انتہائی کمزور آواز میں ڈاکٹر صاحبان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس ایک فن ہے جس سے مخلوق استفادہ کرتی ہے اور میں

نے اس فن میں آپ کی تعریف سنی ہے، لیکن یہ فن جس کو ماند کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چند ظاہری معجزے (مادرزادانہوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا) دے کر بھیجا، اور یہ تو آپ جان سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو روحانی علوم دیے گئے تھے وہ ان ظاہری معجزوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل تھے — تو مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ہمارے حضرت خاتم الانبیاء (ﷺ) کے ذریعہ جو روحانی علوم اور دینی احکام بھیجے گئے ہیں وہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روحانی علوم اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو غیر چلن دار کر دیا، تو ذرا سوچئے کہ حضور کی لائی ہوئی روحانی چیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا کتنی بڑی چیز کی ناندری ہے — لوگوں سے ہم بس یہی کہتے ہیں کہ وہ اس نعمت سے فائدہ اٹھائیں ورنہ گھاٹے میں رہیں گے۔“

حضرت نے جب اپنی بات پوری فرمائی تو ڈاکٹر صاحبان کو طبی معائنے کا موقع دیا۔ اُن حضرات نے اپنے طریقے پر خوب اچھی طرح دیکھا بھالا — حجرہ سے باہر آکر ان دونوں حضرات نے آپس میں انگریزی زبان میں کچھ گفتگو کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے کہا کہ ہم دونوں اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ ہمارے فنی اور طبی حساب سے تو اس شخص میں کچھ بھی نہیں رہا ہے پھر یہ شخص بولتا کہاں سے ہے۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکے کہ یہ بات ہمارے فن سے بالاتر ہے، کوئی روحانی طاقت ہے جس سے یہ شخص زندہ ہے اور بول رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی اس آخری بیماری میں حضرت کی خدمت میں قیام کی جو توفیق ملی یہ اس گنہگار بندہ پر اُس کے رب کریم کی خاص الخاص نعمت تھی، دین کی بہت سی حقیقتیں جو

کتابوں کی عبارتوں سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں حضرت کا حال دیکھ کر کے الحمد للہ کچھ سمجھ میں آ گئیں۔ اور رسول اللہ (ﷺ) اور خواص امت کے احوال کا سمجھنا کچھ آسان ہو گیا۔

میرے ایک دوست اور دورہ حدیث کے ہم سبق عالم دین، جو کتب تصوف کے مطالعہ کا بھی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے سنایا کہ ایک دفعہ میں نے تصوف کی ایک کتاب کا نام لے کر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے وہ کتاب تو ملاحظہ فرمائی ہوگی؟

حضرت نے ارشاد فرمایا:—

”مولانا! میں نے کتب زیادہ نہیں دیکھیں، ہاں ایک قُطْب دیکھا ہے۔“

اس سے حضرت کا اشارہ اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر کی قدس سرہ کی طرف تھا۔ سبحان اللہ! کس قدر بلیغ اور کیسا حقیقت افروز ارشاد ہے۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ایک خاص رفیق اور نیاز مند حاجی عبدالرحمن صاحب نو مسلم

اسلام کا ایک معجزہ

حاجی صاحب نے اپنے اسلام لانے کا عجیب و غریب واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس عاجز کو خود سنایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے وہ واقعہ جوں کا توں یاد ہے اور میں قریباً تیس سال کے بعد اس وقت اُس کو حافظہ ہی سے لکھ رہا ہوں۔

حاجی صاحب میوات کے ایک بڑے گاؤں اُٹاؤر کے ایک دولت مند بننے کے بیٹے تھے، ان کا نام مکندرام تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ”میری عمر ۱۱-۱۲ سال کی تھی، میں گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا اور پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ میرے ساتھ مسلمان لڑکے بھی پڑھتے تھے، میں نے گاؤں کے مسلمانوں سے اور ساتھ لڑکوں سے رسول اللہ (ﷺ) کا ذکر اور آپ کا نام پاک سنا تھا، اس سے میرے دل میں حضورؐ کے ساتھ ایک محبت سی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے باپ کی دکان تھی جو گاؤں میں خوب چلتی تھی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنی دکان پہ ہوں، باپ نہیں ہیں، میں ہی ان کی جگہ بیٹھا سودا بیچ رہا ہوں، گاؤں کی کچھ عورتیں جن میں میری رشتہ دار بھی ہیں سودا لینے کے لیے دکان پر کھڑی ہیں اور میں سودا دے رہا ہوں، اتنے میں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کی سواری آرہی ہے، میں ان کے درشن کے لیے دکان چھوڑ کر جانے لگا، اُن عورتوں نے مجھے نہیں جانے دیا اور کہا کہ مکندا! پہلے ہمیں سودا دے دے پھر کہیں جا، میں نے جلدی جلدی ان کو نپٹانا چاہا، ابھی نپٹانا نہیں سکا تھا کہ معلوم ہوا کہ حضرت کی سواری آگئی اور بہت مجمع ہے۔ میرے ہاتھ میں سودا تو لینے کی جوترا زو تھی میں نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور حضورؐ کو دیکھنے کے لیے دکان چھوڑ کر بھاگ پڑا، مگر جب میں پہنچا تو آپ کی سواری آگے بڑھ چکی تھی، اور میں چہرہ مبارک نہیں دیکھ سکا، پیچھے کی جانب سے بس گردن دیکھ پایا اُسی سے دل میں ایک عجیب عشق کی سی کیفیت تھی، میں نے گھر میں کسی

سے ذکر نہیں کیا اور دل میں طے کر لیا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ صبح کو اسکول گیا لیکن لکھنے پڑھنے میں بالکل جی نہیں لگا۔ رات جو خواب دیکھا تھا بیٹھے بیٹھے بس اسی کو سوچتا تھا، جو پنڈت جی پڑھاتے تھے انھوں نے دیکھا تو کہا، مکند! آج کیا بات ہے کیوں گم سم بیٹھا ہے، پڑھتا کیوں نہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ آج میں نے ایسا پنڈا (خواب) دیکھا ہے، انھوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا: جا اپنی جگہ بیٹھ، اپنا کام کر، میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی نے سلیٹ ہاتھ میں لے کر نجومیوں کے طریقہ پر کچھ حساب لگایا، تھوڑی دیر کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا مکند! ذرا پھر بتا تو نے رات کو کیا پنڈا دیکھا ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ انھیں پھر بتایا، انھوں نے پھر مجھے ڈانٹا اور کہا کہ جا اپنی جگہ بیٹھ، اپنا کام کر! میں آکے بیٹھ گیا، پنڈت جی نے پھر سلیٹ پر اپنا کچھ حساب لگایا اور کچھ دیر کے بعد مجھے پھر بلایا اور رات کے خواب کو پھر پوچھا اور جب میں نے بتایا تو پھر مجھے ڈانٹا۔ کئی دفعہ ایسا ہی ہوا، جب اسکول کی چھٹی کا وقت آیا تو پنڈت جی میرے ساتھ ہمارے گھر آئے اور میرے باپ کو الگ بلا کے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ تیرا بیٹا مکند مسلمان ہوگا۔ مجھے اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوا کہ پنڈت جی نے میرے باپ سے کیا کہا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہو گیا، باپ نے میری ماں کو بھی بتا دیا، وہ دونوں بہت فکرمند اور پریشان ہو گئے، میرا اسکول جانا بھی بند کر دیا، مگر میں نے دل میں طے کر لیا کہ جو کچھ بھی جو مجھے مسلمان ہونا ہے۔ اب میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کہاں چلا جانا چاہیے۔ میں اسی ٹوہ اور فکر میں رہتا تھا میں نے کچھ مسلمانوں سے ذکر سنا تھا کہ دہلی کے پاس ایک بستی ہے ”نظام الدین“، وہاں ایک بنگلہ والی مسجد ہے، اس میں ایک میاں صاحب رہتے ہیں، بڑے نیک اور اللہ والے آدمی ہیں، جو کوئی ان کے پاس جائے وہ اس کو اپنے پاس رکھ کر پڑھاتے بھی ہیں اور کھلاتے پلاتے بھی ہیں۔ میں نے انہی کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ چپکے چپکے راستہ کی معلومات کرتا رہا، پھر ایک دن موقع پا کر گھر سے ایک رقم لے کر نکل گیا اور کسی طرح نظام الدین کی اس مسجد میں پہنچ گیا، گھر اور گاؤں والوں کو بالکل خبر نہ ہوئی کہ میں کہاں گیا بعد میں معلوم ہوا کہ ماں باپ بہت دنوں تک روتے رہے۔

یہ بزرگ، حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے سب سے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد صاحبؒ تھے، انھوں نے بڑی شفقت سے رکھا، پڑھایا اور وہی میرے باپ اور میری ماں بن گئے اور میں بھی انہی کا ہو گیا، ان کی وفات کے بعد یہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) یہاں آ گئے اس وقت سے انہی کے ساتھ ہوں۔ میں جو رقم گھر سے ساتھ لایا تھا میں نے بہت دنوں تک حضرت مولانا محمد صاحبؒ سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا پھر ایک دن بتا دیا۔ میں بننے کا بیٹا تھا، جب کوئی نفع کا کام سامنے آیا میں نے وہ رقم اس میں لگا دی، اللہ نے بہت برکت دی، جس کام میں لگائی بہت نفع ہوا۔ اللہ کی توفیق ہے اس کی راہ میں خرچ بھی کرتا رہا۔

حاجی صاحب غیر مسلموں میں (غالباً زیادہ ترمیوات کے علاقہ میں) ذاتی اور انفرادی طور پر کام کرتے تھے، اللہ نے ان کی دعوت اور ان کی ذات میں بھی بڑی تاثیر اور کشش رکھی تھی۔ راقم سطور کو انھوں نے خود بتلایا تھا کہ اب تک ان کے ذریعہ قریباً ۱۴ سو (۱۴۰۰) آدمی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام قبول کر چکے ہیں۔ کسی نے یہ بھی بتلایا تھا کہ میوات ہی میں کسی مقام پر انھوں نے ایک خاص طرح کا مدرسہ بھی قائم کر رکھا تھا جس کے مصارف کے وہ خود ہی ذمہ دار تھے، جو لوگ اسلام قبول کرتے ان کی ضروری تعلیم و تربیت کا بھی اس مدرسہ میں کچھ انتظام تھا۔

وہ وعظ بھی فرماتے تھے، ان کا وعظ خاص کر میواتیوں کے لیے بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ بدعات اور مشرکانہ رسوم کی اصلاح ان کے وعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا، میوات ہی کے ایک جلسہ میں راقم سطور نے بھی ایک دفعہ ان کا وعظ سنا تھا۔ ان کے اوقات کا زیادہ حصہ تنہائی اور ذکر و عبادت میں گزرتا تھا، ان کے کسی خاص محرم راز اور واقف حال نے مجھے بتلایا تھا کہ حاجی صاحب کو ۷۱ پارے قرآن پاک کے حفظ ہیں اور روزانہ نوافل میں ان کے پڑھنے معمول ہے۔ ذکر و عبادت کا نور آنکھوں میں اور چہرہ پر صاف محسوس ہوتا تھا۔

ان کے جاننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ بھی اہم امور میں ان سے خاص طور سے دعا کرایا کرتے تھے۔ ان کے حلقہ تعارف میں ان کی مقبولیت دعا کے غیر معمولی قسم کے بہت سے واقعات مشہور تھے۔ ایک واقعہ کسی سلسلہ کلام میں انھوں نے راقم سطور کو خود سنایا۔ فرمایا کہ

”فلاں گاؤں کے لوگ بڑے جاہل اور بدعات و خرافات میں مبتلا تھے اور دین کی بات اور نصیحت سننے کو بھی تیار نہ ہوتے تھے، میں بار بار اس گاؤں گیا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس گاؤں میں کنوئیں کا پانی بہت کھاری تھا، پینے کا پانی دور سے لانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ میں اس گاؤں میں گیا، وہاں کے لوگوں نے کہا کہ دیکھ حاجی! ہمارے کنوئیں کا پانی کڑوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ دوسرا کنواں دوسری جگہ کھودیں، تو دعا کر کہ پانی میٹھا نکل آئے تو ہم سب تیری بات مان لیں گے۔ میں نے اپنے اللہ کے بھروسے پر ان سے کہا کہ تم جگہ تجویز کرو اور جتاؤ کہ کہاں کنواں کھودنا چاہتے ہو؟ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے گاؤں سے باہر جگہ طے کی، میں نے ان سے کہا کہ اب جاؤ کل صبح کو کھودنا شروع کجو۔ رات کو میں نے اسی جگہ مصلیٰ ڈالا اور نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی۔ صبح کو میں نے ان سے عہد لیا کہ اگر اللہ ان کو کنوئیں سے میٹھا پانی دے گا تو وہ نماز پڑھا کریں گے۔ اور کھدائی شروع ہوئی، سب سے پہلے پھاوڑا ہاتھ میں لے کر کھدائی میں نے شروع کی، پھر سارا گاؤں جٹ گیا۔ جب کھدائی پانی کے قریب تک پہنچ گئی تو میں نے

ان سے کہا کہ اب تم سب اوپر نکل آؤ، وہ سب آگئے اور میں نیچے اتر گیا میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی اور عرض کیا کہ کھاری پانی بھی تیرے ہی حکم سے نکلے ہے اور بیٹھا بھی تو ہی نکالے ہے، اور تجھے پوری قدرت ہے کہ جہاں سے چاہے کھاری یا بیٹھا نکالے۔ اے میرے اللہ اس وقت تو اس جگہ سے بیٹھا پانی نکال دے۔ یہ دعا کر کے اللہ کے کرم سے پوری امید رکھتے ہوئے میں نے زمین پر چھاؤڑا مارا فوراً ہی پانی نکلا میں نے دونوں ہاتھوں میں لے کر پیا، الحمد للہ بیٹھا نکلا، پھر میں نے شکر کے نفل پڑھے اور گاؤں والوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹھا پانی نکال دیا اب کھودلو، سب نے پانی پی کے دیکھا پھر وہاں کے لوگ دین کی بات سننے اور ماننے لگے۔

حاجی عبدالرحمن کی قبولیت دعا کا ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے جس کا تعلق خود اس عاجز راقم سطور کی ذات سے ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات اب سے قریباً ۳۲ سال پہلے رجب ۱۳۶۳ھ میں ہوئی، وفات کے اگلے دن میوات کے کسی گاؤں میں تبلیغی اجتماع تھا جو پہلے سے طے تھا، تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے جو اکابر یا اصیغہ حضرت کی وفات کی وجہ سے نظام الدین میں جمع تھے قریب قریب وہ سب ہی اس اجتماع میں شرکت کے لئے میوات گئے۔ یاد پڑتا ہے کہ کئی لاریاں بھر گئی تھیں۔ ان جانے والوں میں راقم سطور بھی تھا، جب وہاں سے واپسی ہونے لگی تو حاجی عبدالرحمن صاحب نے اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ ایک بیل گاڑی میں بیٹھا لیا، یہ بیل گاڑی کسی میواتی کی تھی جو حاجی صاحب کا معتقد تھا۔ گاڑی والے میواتی کے علاوہ اس پر صرف حاجی صاحب تھے اور یہ راقم سطور۔ جب گاڑی چل پڑی تو حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے تم سے ایک بات تنہائی میں پوچھنی تھی، اس لیے میں نے تمہیں زبردستی بیل گاڑی میں بیٹھا ہے اور تکلیف دی ہے، تنہائی کا ایسا اطمینان کا موقع ملنا بہت مشکل تھا۔ اس کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا۔

”کوئی دوڑ حائی برس پہلے کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دوپہر کا وقت تھا، میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی عادت کے مطابق حجرے کے کواڑ بند کر کے سونے کے ارادے سے لیٹ گیا تھا کہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) نے دروازے پر آ کر دستک دی اور آہستہ سے فرمایا کہ ”حاجی عبدالرحمن اگر تم جگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

میں اگرچہ جگ رہا تھا ابھی سویا نہیں تھا، لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا اور کچھ بولا نہیں، تاکہ وہ واپس جا کر اس وقت آرام کر لیں، بات تو پھر بھی ہو جائے گی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں دروازہ کھول دوں گا تو یہ دیر تک باتیں کریں گے اور پھر ان کے آرام کا وقت نہیں رہے گا، تو میں نے ان کے آرام کے خیال سے نہ دروازہ کھولا، نہ کوئی جواب دیا۔ حضرت جی نے تھوڑا

انتظار فرما کے پھر وہی کہا کہ ”حاجی عبدالرحمن اگر جگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے اس کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا اور کوئی جواب نہیں دیا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنے حجرے میں آرام کر لیں۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی فرمایا۔ میں نے مجبور ہو کر دروازہ کھول دیا اور ان سے کیا کہ میں جگ تو رہا تھا لیکن میں اس لیے نہیں بولتا تھا کہ آپ اس وقت باتیں شروع کریں گے تو آرام نہیں کر سکیں گے، بات تو آرام کرنے کے اور ظہر کے بعد بھی ہو سکتی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تقاضا تھا کہ تمہیں اٹھا کے ابھی بات کروں۔ اس کے بعد حضرت جی نے تمہارا (راقم سطور محمد منظور نعمانی) کا نام لے کر فرمایا کہ ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ مجھے تو یاد نہیں، فرمایا وہ جن کا بریلی سے رسالہ نکلتا ہے اور وہ بدعات اور اہل بدعات کا رد کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں ان کو تو جانتا ہوں۔ فرمایا وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں، اسی وقت ان کے لیے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے نکال لے۔ پھر حضرت مجھے ساتھ لے کر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، پھر مجھ سے فرمایا کہ ان کے لیے اللہ سے دعا کرو اللہ سے مانگو، خود بھی دعا فرمائی۔“

یہ پورا واقعہ بیان کر کے حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تمہارا کیا قصہ تھا اور تم کہاں گئے تھے، میں نے حضرت جی سے پوچھا بھی نہیں۔ اگر تم بتا سکو اور بتانا مناسب سمجھو تو بتلاؤ کہ تم کہاں گئے تھے جس کی حضرت جی کو اتنی فکر تھی؟

میں نے ان کی بتلائی ہوئی مدت اور موسم کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں ”جماعت اسلامی“ کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے اس کے اس وقت کے مرکز اور مستقر (دار الاسلام جمال پور ضلع پٹھانکوٹ) میں جا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرہ چند رفقاء جماعت کے ساتھ مقیم ہو گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر چند ہی روز کے بعد میرے قلب کی جو ایک خاص کیفیت ہو گئی تھی اور جس شدید اندرونی کشش میں میں مبتلا ہو گیا تھا (جس کے نتیجے میں بالآخر چند ہی مہینے کے بعد میں جماعت سے مستعفی بھی ہو گیا) جس کے کچھ ظاہری اسباب و وجوہ بھی تھے۔ لیکن حاجی عبدالرحمن صاحب سے مذکورہ بالا واقعہ سن کر دل میں یہ یقین سا پیدا ہو گیا کہ میری اس قلبی کیفیت اور اندرونی کشش میں اصل عامل ان دونوں بزرگوں کی یہ دعا تھی۔ واللہ عند اللہ تعالیٰ۔

(۱) اس قصہ کی پوری تفصیل کے لئے راقم سطور کی کتاب ”مولانا مودودیؒ کی سادہ سادہ میری رفاقت اور اب میرا موقف“ ملاحظہ فرمائی جائے۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ حاجی عبدالرحمن صاحب نے بیان فرمایا اس وقت تک حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے میرا کوئی خاص تعلق نہیں تھا اور ان کے تبلیغی کام سے تو بالکل ہی تعلق نہیں تھا، بلکہ میں اس کی صحیح نوعیت کو جانتا بھی نہیں تھا، اس کے ساتھ اور ان کے تبلیغی کام کے ساتھ مجھے کسی درجہ کا جو تعلق ہوا وہ بعد کا واقعہ ہے۔

حاجی صاحب کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے گاؤں اور خاندان والوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا، برابر آنا جانا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ ان کے خاندان والے اسلام قبول کر لیں، راقم سطور کو معلوم نہیں کہ ان میں سے کسی کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی یا نہیں، لیکن یہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے اہل خاندان غیر مسلم، ان کا بڑا احترام اور اکرام کرتے تھے۔ غالباً اسی سفر میں جو حضرت مولانا محمد الیاس کی وفات کے اگلے ہی دن میوات کے کسی گاؤں میں ہونے والے تبلیغی اجتماع کی شرکت کے سلسلہ میں ہوا تھا، جس میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر بھی شریک ہوئے تھے (غالباً اسی سفر میں) حاجی عبدالرحمن صاحب کے گاؤں آنا اور بھی جانا ہوا تھا تو حاجی صاحب کے خاندان کے لوگ (جن کے بارہ میں معلوم ہوا تھا کہ وہ گاؤں کے بڑے دولت مند بنے ہیں) ہدیہ اور نذرانہ کے طور پر خود اپنے سروں پر مٹھائیوں کے تھال لے کر حاجی صاحب اور دوسرے اکابر کی خدمت میں ان کی قیام گاہ پر آئے تھے۔ اس وقت خود آنکھوں سے دیکھا کہ وہ حاجی صاحب سے ویسی ہی عقیدت رکھتے ہیں جیسی روحانی بزرگوں سے ہوتی ہے۔ حاجی صاحب نے اپنے خاندان والوں کے سامنے ہی حضرت رائے پوری سے مخاطب ہو کر بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ حضرت میں ان سے برابر کہتا ہوں کہ تم لوگ ایمان لے آؤ، تا تو سب دوزخ میں جلو گے، مگر ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حاجی صاحب کے اس انداز پر بھی ان لوگوں نے اپنی کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کے احترام اور اظہار عقیدت کے رویہ میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ حاجی صاحب کا دستور العمل ہے کہ جب اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں تو ان کے بچے اور بچیوں کو خوب پیسے بانٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے سبق لینے کی توفیق دے۔

راقم سطور کے ساتھ حاجی صاحب کا برتاؤ بڑی ہی عنایت اور شفقت کا تھا، بلاشبہ ایسے بندگان خدا کی شفقت و محبت اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات میں سے ہے۔

شکر نعمت ہائے تو چند ان کے نعمت ہائے تو

حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ

جہاں تک یاد ہے راقم الحروف نے سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں (جس کو عنقریب ساٹھ سال پورے ہو جائیں گے) علاقہ پنجاب کے بعض ہم درس طلبہ سے حضرت مولانا کا نام سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ وہ حضرت گنگوہیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں، نیز یہ کہ شرک کے خلاف جنگ اور توحید خالص کی دعوت کا جذبہ ان پر بہت غالب ہے اور اس لحاظ سے اپنے علاقہ میں وہ گویا اس دور کے ”شاہ الملیل شہید“ ہیں۔

میرا حال طالب علمی کے اس دور ہی میں (غالباً اپنے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش سنہلیؒ کی صحبت و تربیت کے اثر سے) یہ تھا کہ جن بزرگ کے متعلق معلوم ہوتا کہ شرک و توحید کے بارے میں ان کا حال وہ ہے جو حضرت شاہ شہیدؒ کا تھا تو دل میں ان کی خاص عظمت و محبت پیدا ہو جاتی، اس لئے جب حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب کے بارے میں یہ سنا تو اسی وقت سے ان کے ساتھ ایک قلبی ربط و لگاؤ پیدا ہو گیا۔

پھر ایک دن غالباً صحیح بخاری شریف کے درس میں استاذنا حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے کسی سلسلہ میں ان کا اور مجددی سلسلہ ہی کے اسی علاقہ کے ایک دوسرے صاحب ارشاد شیخ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں جہاں تک جانتا ہوں اس وقت ہندوستان میں یہ دونوں حضرات مجددی نقشبندی نسبت کے امین و امام ہیں.... حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سننے کے بعد اس عقیدت و محبت میں اضافہ ہو گیا جو حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب سے پیدا ہو چکی تھی، اور قدرتی طور پر ان کی زیارت اور ان کی خدمت میں حاضری کی آرزو بھی پیدا ہوئی لیکن اُس وقت بظاہر یہ ایسی آرزو تھی جس کے پورا ہونے کی میں اس زمانے میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے قریباً دس سال کے بعد اس آرزو کو عجیب و غریب طریقہ سے

پور افرامیا: اِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ.

دارالعلوم دیوبند کی میری طالب علمی ہی کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا تھا کہ نجد کے عبدالعزیز بن سعود نے اس وقت کے والی حجاز شریف مکہ (حسینؑ) کو نکلتے دے کر حرمین شریفین پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور اپنے مملکت کے مطابق وہاں اصلاحی اقدامات کئے۔ اس سلسلہ میں مکہ معظمہ کے قبرستان جنة المعلاة اور مدینہ کی جنة البقيع میں حضرات اہل بیت اور بعض صحابہ کرامؓ کی قبروں پر بنے ہوئے وہ قبے بھی منہدم کر دیئے جو کسی زمانہ میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہدایت کے خلاف) تعمیر کئے گئے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں قبوری اہل بدعت اور شیعوں کی طرف سے ایک طوفان برپا ہو گیا اور وہابیت و بدعت کی وہ جنگ جس کو خلافت کی تحریک نے بالکل ٹھنڈا کر دیا تھا، پھر زور شور سے چھڑ گئی۔ راقم سطور جب دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن سنبھل (ضلع مراد آباد) آیا تو یہ جنگ شباب پر تھی اور بریلوی جماعت کے اس دور کے سب سے بڑے پیشوا قائد نعیم الدین مراد آبادی کی وجہ سے ہمارا علاقہ اس جنگ کا خاص میدان تھا۔ بریلوی حضرات کی طرف سے عوامی جلسوں کی تقریروں اور پمفلٹوں، اشتہاروں کے ذریعہ حملوں کا سلسلہ جاری تھا، اور ان حملوں کا خاص نشانہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی دعوتِ توحید و سنت کے علمبردار اکابر علمائے دیوبند تھے۔ ہماری جماعت کی طرف سے بھی کچھ مدافعت اور جواب دی ہو رہی تھی۔

راقم سطور نے دارالعلوم سے فراغت اور واپسی کے بعد اپنے اساتذہ اور اکابر کے طریقہ پر تدریس کا مشغلہ اپنا لیا تھا، اسی کے ساتھ اس (بریلوی) جماعت سے اس لسانی اور قلمی جہاد میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر مناظروں کی بھی نوبت آئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں بھی احقاقِ حق و ابطالِ باطل کی توفیق عطا فرمائی۔ (ان مناظروں میں سے اکثر کی رودادیں بھی اس زمانہ میں شائع ہوئی تھیں جو اب نایاب ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض رودادیں پاکستان میں اب پھر شائع ہوئی ہیں)

قریباً ۶۷ سال کے تجربہ کے بعد احساس ہوا کہ مناظرہ کا مروجہ طریقہ بہت غلط ہے اور اہل باطل کی طرف سے مناظرے کرنے والے بالعموم پیشہ ور ہیں انہوں نے اس کو اپنا پیشہ اور معاشی ذریعہ بنا لیا ہے،

(۱) یہ شریف حسین سلطنت عثمانیہ ترکی کی طرف سے حجاز کے گورنر تھے پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۸ء) کے زمانہ میں انگریزوں کی سازش سے غداری اور بغاوت کر کے یہ خود حجاز کے حکمران بن گئے تھے۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ مناظرہ کا یہ طریقہ کہ ہر فریق کا مناظرہ پانچ پانچ یا دس دس منٹ تقریر کرے آریہ ساجیوں اور قادیانیوں کا ایجاد کیا ہوا تھا اس میں اہل باطل کو اپنی کمزوری چھپانے کا موقع مل جاتا ہے۔

حق و باحق سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہے، اس لئے عوام کو شرک و بدعت کی تاریکی سے لکانے اور ان کی اعتقادی اور عملی اصلاح کیلئے انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے نائبین کی طرح اخلاص اور دوسوزی کے ساتھ براہ راست عوام ہی پر محنت ہونی چاہئے اور تحریر و تقریر میں انہی کو مخاطب کرنا چاہئے، نیز مناظرہ کے مروجہ طریقہ میں بعض اوقات وہ رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو حق پرستوں کے لئے مناسب نہیں اور اپنے لئے معسر ہے۔ اس احساس کے بعد اس عاجز نے مناظرہ ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے پر چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن لاہور سے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی ملا۔ تحریر فرمایا تھا کہ —

حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب (واں پتھر، ضلع میانوالی) سے آپ غالباً واقف ہوں گے، وہ اس علاقہ پنجاب میں ہمارے اور ہماری جماعت کے سب سے بڑے بزرگ ہیں۔ ہمارے تمام اکابر کی طرح وہ بھی آج کل کے مناظروں کو پسند نہیں فرماتے، لیکن حضرت سے دینی تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اپنے علاقہ کے خاص حالات سے مجبور ہو کر اہل بدعت سے مناظرہ منظور کر لیا ہے۔ حضرت مولانا اس ضعیف العری میں چار سو میل کا سفر طے کر کے صرف اس کام کے لئے لاہور تشریف لائے ہیں کہ مناظرہ کے لئے آپ کو بلانا پرے ذمہ کر دیں.... یہ مناظرہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر طے پایا ہے۔ آپ ہی کو مناظرہ کرنا ہے۔ اس کے لئے فلاں تاریخ کو آپ پہنچ جائیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا، میں چند مہینے پہلے مناظرہ ترک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن حضرت مولانا لاہوریؒ کا مکتوب گرامی اور حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب کی طرف سے دعوت — سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا کہ اس مناظرہ کیلئے تو جانا ہے۔ حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں لکھ دیا کہ انشاء اللہ حسب ارشاد حاضر ہو جاؤں گا۔

یہ مناظرہ ضلع سرگودھا کے ایک مقام ”سلانوالی“ میں ہونا طے ہوا تھا۔ یہ عاجز مقررہ تاریخ پر وہاں پہنچ گیا۔ لاہور سے خود حضرت مولانا لاہوریؒ، حضرت مولانا عبدالحق خان ہزاری مرحوم اور دیگر متعدد علمائے کرام اور بہت سے دوسرے حضرات تشریف لے آئے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب ہم سے پہلے تشریف لا چکے ہیں۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مناظرہ سے پہلے حضرت کی خدمت میں حاضری نہیں ہو سکی.... یہ عاجز مقررہ وقت پر مناظرہ گاہ پہنچا تو حضرت مولانا وہاں تشریف لا چکے تھے، پہلی

(۱) حضرت مولانا لاہوریؒ کے مکتوب گرامی کا یہ مضمون حافظہ ہی کی مدد سے لکھا گیا ہے۔

ملاقات اور زیارت یہیں الٹیج پر ہوئی۔ مناظرہ کا موضوع اس علاقہ کے بعض اہل بدعت کا یہ مشرکانہ عقیدہ تھا کہ ”اللہ تعالیٰ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر وقت ہر چیز کا علم ہے“۔ یعنی آپ کا علم بھی ”محیطِ بکل شئی“ ہے، فرق صرف ذاتی اور عطائی کا ہے۔

قرارداد کے مطابق مناظرہ ہوا، اس عاجز نے اس عقیدہ کے ابطال و تردید میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، صحابہ و تابعین کے ارشادات اور سلف صالحین کی تصریحات کے علاوہ خود مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی کتابوں سے ان کی وہ عبارتیں بھی پیش کیں جن میں انہوں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور کسی بھی مخلوق کے لئے علم محیطِ تفصیلی کا عقیدہ باطل اور نصوص قرآن و حدیث کے خلاف ہے اور یہ کہ علامہ ملا علی قاریؒ نے اس عقیدہ کے موجب کفر ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

یہ مناظرہ دو روز جاری رہا، حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب انتہائی ضعف پیری کے باوجود اول سے آخر تک تشریف فرما رہے اور انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اس مناظرہ میں میری حیثیت دراصل حضرت مولانا کے وکیل کی تھی۔ مناظرہ کے ختم پر قیام گاہ کی طرف واپس ہوتے ہوئے حضرت نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اچانک میری بے خبری میں میرا ہاتھ چوم لیا، مجھے بے حد ندامت ہوئی اور شدت تاثر سے پسینہ سا آگیا، اسی موقع پر چلتے چلتے حضرت مولانا نے اپنے خاص پنجابی انداز میں (مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے بارے میں) فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے یہ بریلی والا پڑھا لکھا تھا، علم والا تھا، ہمارے ہاں کے یہ لوگ بالکل جاہل ہیں ان کا عقیدہ وہی ہے جو قطعاً شرک ہے۔

اس عاجز نے بعض اکابر علماء سے سنا تھا کہ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب کو فہم قرآن میں خاص کمال و امتیاز حاصل ہے اور ان کا درس قرآن کا ایک بالکل نرالا طریقہ ہے۔ مناظرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں مولانا کی خدمت میں حاضر تھا، موقع مناسب دیکھ کر عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ حضرت قرآن مجید کی کوئی سورت مجھے پڑھادیں! مولانا نے فوراً قرآن پاک منگو لیا اور اسی ایک نشست میں ایک عجیب انداز سے سورہ ”مومن“ سے ”اتحاف“ تک ان ساتوں سورتوں کا اجمالی درس دیا جو حم سے شروع

(۱) اس مناظرہ میں گوجرانوالہ کے ہمارے ایک مخلص مسٹر عنایت الہی بی اے شریک تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ کمال عطا فرمایا تھا کہ وہ ہر مقرر کی تقریر قریباً لفظ بہ لفظ لکھ لیا کرتے تھے، انھوں نے اس مناظرہ کے فریقین کی تقریریں اسی طرح قلمبند کی تھیں اس وجہ سے اس مناظرہ کی روداد اسی زمانہ میں جیسی مکمل شائع ہو گئی تھی غالباً کسی تقریری مناظرہ کی روداد ایسی مکمل شائع نہ ہوئی ہوگی۔ معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں بعض اشاعتی اداروں نے اس کو پھر شائع کیا ہے۔

ہوئی ہیں۔ یہ پورے دو پارے ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا صاف اردو بولنے پر قادر تھے۔ وہ بس تفسیری اشارے فرماتے جاتے اور پوری سورت کے حاصل اور اصل پیغام مختصر لفظوں میں بیان فرماتے تھے۔ مولانا اپنے تفسیری اشارے کے ساتھ تفسیر کی کسی کتاب کا نام بھی لیتے تھے، فرماتے ”مدارک، جلالین، بیضاوی، خازن، ابوسعود، کبیر، قرطبی، روح المعانی“ وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا وہ تفسیر کی اس کتاب میں ہے۔ اس سلسلہ کی آخری سورت ”احقاف“ کے مضامین پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو فرمائی۔ اس طرح اس عاجز کو حضرت مولانا سے تلمذ کی بھی سعادت حاصل ہوئی، **فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ**۔ اسی ایک درسی صحبت سے اندازہ ہوا کہ قرآن پاک سے حضرت مولانا کو عشق ہے اور اس کے درس سے ان کا روح کو غذا ملتی ہے۔ میں نے آخر میں دعا کی درخواست کی تو اسی وقت ہاتھ اٹھا کے خاص توجہ اور اہتمام سے دعا فرمائی۔

یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے، ۱۳۵۵ھ ختم ہو رہا تھا، اس کے آخری مہینے ذی الحجہ کا تیسرا ہفتہ تھا۔

ایک قابل ذکر واقعہ اس سفر میں یہ بھی پیش آیا کہ چند روز پہلے عید الاضحیٰ میں میں نے اپنی قربانی کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی گھر پہلے ہوئے ایک بکرے کی قربانی کی تھی۔ یہ بکرہ بہت ہی خوبصورت تھا اور گھر کے سب ہی لوگوں کو اس سے اُنس تھا، یہ سب چھوٹے بڑوں سے بہت ہی مانوس تھا۔ عید قربان کے ۳-۴ دن بعد یہ سفر ہوا تھا۔ راستہ میں کھانے کے لئے اس بکرے کا گوشت ایک ناشتہ دان میں بھر لیا تھا میرے ساتھ ایک رفیق سفر مولوی عطاء اللہ قاسمی بھی تھے۔ ریل کے ڈیڑھ دو دن کے سفر میں ہم دونوں یہی گوشت کھاتے رہے۔ مقام مناظرہ سلاوالی پہنچ کر اپنے اس ناشتہ دان کو گویا ہم بھول ہی گئے۔ وہاں کے قیام میں اس کو کھول کے دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، اس سفر سے واپسی میں ہم دونوں کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات ساتھ تھے، ایک بڑے اسٹیشن پر کھانا کھانے کا ارادہ کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کھانے کا کچھ سامان اسٹیشن سے بھی خرید لیا جائے، اس وقت ناشتہ دان یاد آیا، ساتھ ہی خیال آیا کہ اس میں کچھ گوشت باقی رہ گیا تھا وہ تو بالکل خراب ہو گیا ہوگا۔ اس کو کھول کے دیکھا، انتہائی حیرت انگیز مسرت ہوئی، اس گوشت

۱۰ مولانا غلام علی خاں صاحب ”جو“ شیخ القرآن“ ہی کے لقب سے معروف ہو گئے تھے (جنہوں نے اسی سال وفات پائی ہے) وہ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب کے علم و قرآن کے خاص وارث و امین تھے۔ انہوں نے حضرت کے تفسیری افادات کو تفسیر ”جواہر القرآن“ کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے حضرت مولانا کے علم قرآن کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

میں جو ۸-۱۰ دن پہلے پکا ہوا تھا اور اس میں سے کھایا بھی گیا تھا اور جو تھادہ پس خوردہ تھا اور ناشتہ دان میں بند رہا تھا، ہوا بھی نہیں لگی تھی، ذرا بھی تغیر نہیں آیا تھا۔ ہم نے اس کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی برکت اور آپ کا معجزہ سمجھا اور سب رفقاء سفر نے بہ طور تبرک کے اس کو کھایا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

دوسری اور آخری زیارت و ملاقات

فروری ۱۹۲۲ء میں لاہور میں ”جماعت اسلامی“ کا ایک اہم مشاورتی اجتماع تھا، یہ عاجز اس وقت جماعت کا سرگرم رکن و داعی بلکہ نائب امیر بھی تھا، جماعت کے تمام اہم ارکان اس موقع پر لاہور میں جمع تھے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مریض ہیں اور بسللہ علاج لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں، تحقیق سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیام فلاں جگہ ہے۔ زیارت و عیادت کے لئے خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا۔ امیر جماعت مولانا مودودی مرحوم، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور بعض اور حضرات نے بھی ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا اور پروگرام بن گیا۔ لیکن حضرت مولانا کی قیام گاہ کے قریب ہم ایسے وقت پہنچے جب وہ کہیں جانے کیلئے اس حال میں نکل رہے تھے کہ داہنے بائیں دونوں طرف سے خدام تھامے ہوئے تھے، نقاہت کا یہ حال تھا کہ معلوم ہوتا تھا ہڈیوں کے ڈھانچہ پر صرف کھال باقی رہ گئی ہے۔ اور بس سانس کی آمد و رفت اور اس کے ساتھ ذکر خفی جاری ہے۔ حضرت کے خدام میں بھی بعض وہ حضرات تھے جو مجھ کو پہچانتے تھے، میں نے سلام عرض کیا اور رفقاء کے بارے میں مختصر طور پر کچھ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت وہیں راستہ میں کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے دعا میں مشغول ہو گئے۔ ضعف و نقاہت کا یہ عالم تھا کہ دعا کیلئے اٹھے ہوئے ہاتھ خدام میں سے ایک صاحب کو تھامنے پڑے۔ بس یہی آخری زیارت و ملاقات تھی۔ اس وقت حضرت کا سن یقیناً سو سے تجاوز تھا۔

بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے علاوہ حضرت مولانا مظہر نانوتویؒ سے بھی آپ کو تلمذ کا شرف حاصل تھا، جو حدیث میں حضرت شاہِ احنؒ کے بلا واسطہ شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب کے تلامذہ کو صرف دو واسطوں سے حضرت شاہِ احنؒ صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے اور اس سعادت میں کسی نہ کسی درجہ میں راقم سطور بھی شریک ہے۔ فَلَلهُ الْحَمْدُ وَالْمَنَّةُ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی میری واقفیت اور تاثرات

غالباً ۱۳۳۸ھ کی بات ہے میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسے (مدرسۃ الشریعہ) میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا، میری عمر اس وقت ۱۲ سال کی ہوگی، حضرت شیخ الہندؒ کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا، اس لئے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں، اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مدرسہ کے سن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بنانوی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسہ تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کی خوشخبری پر اپنے جذباتِ مسرت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی نظم میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عزیز گل صاحب کا نام سنا۔

پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے۔ تشریف آوری رمضان مبارک ۱۳۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے، میرے والد ماجد نے آئندہ تعلیم کے لئے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم ان دنوں مدرسہ عبدالرب دہلی میں مدرس تھے) مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لئے دیوبند جائیں گے اور پھر وہاں سے دہلی۔ مجھے بھی اس کی خوشی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت نصیب ہوگی۔ اس زمانہ میں میرے وطن سنبھل اور مراد آباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی تھی، اس لئے سنبھل سے مراد آباد تک سفر گھوڑے یا تانگہ سے

ہوا، مراد آباد پہنچ کر دیوبند کے لئے ٹکٹ خرید لئے گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد مراد آباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت شیخ الہند آج ہی دیوبند سے فتح پور، مسوہ روانہ ہونے والے ہیں، اس لئے اس وقت دیوبند پہنچ کر حضرت کی زیارت نہ ہو سکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے وہ ٹکٹ واپس کر دیئے گئے۔ دہلی پہنچ کر مدرسہ عبدالرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش و فرش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند اسی وقت تشریف لا رہے ہیں، شام تک یہیں مدرسہ میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے فتح پور کے لئے روانگی ہو جائے گی۔ حضرت استاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقاء سمیت تشریف لے آئے۔ ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عزیز گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے، ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سن چکا تھا اس لئے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ نہیں ہیں۔

چند ہی مہینے کے بعد (ربیع الاول ۱۳۳۲ھ میں) حضرت شیخ الہند کا وصال ہو گیا۔ مالٹا سے حضرت کی آمد پر خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہو گئی، ملک بھر میں خلافت کے نام پر جلسے اور کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قریب قریب وہ سب بڑے علماء تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور مالٹا کی اسیری کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا۔ حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقع پر ہوئی، خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدمر نکلتے تھے مشا قان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ کی اپنی تقریر میں لوگوں کے اصرار پر ان تکلیفوں، مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی تھی جن سے پہلی جنگ عظیم کے دوران اہل مدینہ کو گزرنا پڑا۔ یہ واقعات ہر مسلمان کے لئے بہت دردناک تھے۔ مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزاء یاد ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لئے گئے اور وہ تاریخی مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ کے نتیجہ میں حضرت مولانا، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ رفقاء کے ساتھ دو سال کراچی جیل میں رہے، اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں دوسری دفعہ مولانا کی زیارت مراد آباد کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب نجد کے سلطان عبدالعزیز ابن سعود

نے مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف حسین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا، خبریں آرہی تھیں کہ شریف حسین بعض یورپین طاقتوں سے مدد حاصل کر کے نجدیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پر ہوگی۔ جمعیت العلماء کے اجلاس میں ایک رزلوشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا تھا اور مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ و اقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس رزلوشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنی نے ایک بڑی مبسوط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی حرمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ و جدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے پڑھ کر سنارہے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے دفتر کے دفتر حفظ ہیں، اور اس وصف میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلہ نہ ہوگا۔ میرے لئے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا۔

اگلے سال میں پڑھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند چلا گیا، وہاں دو سال قیام رہا، حضرت مولانا مدنی کا مستقل قیام اس زمانہ میں غالباً سلہٹ رہتا تھا۔ لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا، چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانہ میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی، اس زمانہ کی آپ کی تقریریں مطلوبات سے معمور ہوتی تھیں، خاص طور سے ہم طلباء ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض تقریریں قلمبند بھی کی تھیں۔

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا، اس وقت دارالعلوم کی صدارت تدریس کے لئے کوئی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا، چونکہ دارالعلوم میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہو چکا تھا اس لئے مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گزشتہ ۳۰-۳۲ سال کی مدت میں دیوبند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بنا پر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے میں انہیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا امتیاز

خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے، اس لئے حضرت مولانا جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو تو اس کو بندگی کا کمال نصیب ہو، اسی لئے نماز کو معراج المؤمن کہا گیا ہے اور اسی لئے سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسران اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ اِنَّ اَہَمَّ اُمُوْرٍ کُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ (تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے)۔

اصل بات یہ ہے کہ نماز صرف ایک دینی عمل نہیں ہے بلکہ دینی نظام میں اس کا مقام وہ ہے جو انسان کے جسمانی نظام میں اس کے قلب اور روح کا مقام ہے۔ قلب کے بارے میں مشہور حدیث ہے کہ اسی کے صلاح و فساد پر پورے وجود انسانی کی صلاح و فساد کا مدار ہے۔ (اِذَا صَلَحَ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ) اسی طرح نماز کے بارے میں بعض حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کو جانچا جائے گا۔ اگر بندہ کی نماز اچھی نکلی تو وہ کامیاب و بامراد ہوگا اور وہ ناقص و خراب نکلی تو وہ نامراد اور خسارہ میں رہے گا اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جس بندے کی نماز ٹھیک نکلے گی، اس کے سارے عمل ٹھیک مانے جائیں گے اور جس کی نماز خراب ہوگی اس کے سارے عمل خراب قرار دیئے جائیں گے۔

اسی قسم کی روایات کی بنا پر میں نے یہ کہا ہے کہ نماز کا مقام دینی نظام میں قلب و روح کا مقام ہے۔ نماز کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے یہ دعا نقل کی گئی ہے: رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ (اے میرے رب مجھے ایسا کر دے کہ میں اچھی نماز ادا کرنے والا ہو جاؤں اور میری نسل میں سے بھی)۔

بہر حال اللہ کے کسی بندے کو نماز کی حقیقت اور اس کی روح کا نصیب ہونا اس کا سب سے بڑا کمال اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہے۔

نماز کی روح کیا ہے؟ — اس کے جاننے کے لئے امام عارف حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ عبارت

پڑھ لیجئے:

”و روح الصلوة هي الحضور مع الله و الاستشراق للجبروت و تذکر جلال الله مع تعظیم ممزوج بمحبة و طمأنينة (حجة الله البالغة ص ۶۷ جلد ۱) یعنی اللہ کے سامنے حضوری اور سکینت و محبت آمیز تعظیم کے ساتھ اس کے جلال و جبروت کا تصور اور گہرا دھیان پس یہی نماز کی روح ہے۔“

حضرت شاہ صاحب نے نماز کی جو روح بتائی ہے وہ بلاشبہ ایک باطنی حال ہے جس کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا، لیکن جس طرح رنج و غم، فکر و الم، مسرت و شادمانی، لذت و سرور وغیرہ قلبی و باطنی کیفیات کے آثار کسی کے چہرے پر دیکھ کر یا اس کی گفتگو اور آواز میں ان کے اثرات محسوس کر کے ان اندرونی کیفیات کا اندازہ ہر ہوش و گوش والا کر لیتا ہے، اسی طرح نماز کی اس روح کے آثار بھی دوسروں کے لئے بعض اوقات اتنے عیاں ہو جاتے ہیں کہ وہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتے اور کانوں سے سن لیتے ہیں۔ بعض صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بیان کیا ہے کہ نماز کی حالت میں ہم آپ کے سینہ مبارک سے چکی چلنے کی سی (یا بعض راویوں کے بیان کے مطابق ہانڈی میں جوش آنے کی سی) ایک آواز سنتے تھے تو یہ دراصل اسی اندرونی کیفیت کا ایک اثر تھا جس کو دوسرے بھی محسوس کرتے تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب کبھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں، خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔ ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا، خاص کر سجدے میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دل دکھتا تھا لیکن اس تمام عرصہ میں فرائض ہی نہیں بلکہ اپاہین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طولی قرأت اور طولی قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف و مشقت سمجھ رہے ہیں ان کے لئے اسی میں راحت و لذت ہے، ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ”قرۃ عینی فی الصلاة“ اور ”یا بلال أرحنی بالصلوة“ والی کیفیت سے خاص حصہ ملا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع سنت

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے، بفرمایا گیا ہے

کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ سے محبت نہ ہو، اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضورؐ کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت اور آپ کی سنتوں اور عادات و اطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا اظہار اپنے موقع پر عملی زندگی میں قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔ اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف، عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے، تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ اس سلسلہ میں بعض عادات اور روزمرہ کی بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ جن سے اندازہ ہو سکے کہ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر گول ہوتا اور جس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے) سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے، حتیٰ کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقہ پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتیٰ کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریقہ سنت کی پابندی فرماتے۔ اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیاز مند اور خدام تعظیماً کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے بلکہ بعض اوقات اس اظہار ناراضگی میں برا فروختگی بھی ہوتی۔ اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے، کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ معاشرت اور عادات میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہوگا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جو لوگ ان کے

احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و وجاہت، بلندی و برتری حاصل ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی۔ دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درس گاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے۔ ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع و عریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت و سیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام — ان ساری عظمتوں اور بلند یوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے، بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لئے مضر ہو — اس سلسلہ میں بھی خود اپنے ساتھ گزرے ہوئے بعض واقعات کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۴۳ھ کی بات ہے، میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا۔ ہمارے وطن سنہیل کے ”مدرسۃ الشریعہ“ کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا، اس میں جماعت دیوبند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی) نے شرکت فرمائی تھی، حضرت مولانا مدنی بھی تشریف لائے تھے۔ مدرسہ کے مہتمم اور جلسے کے منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کھانے کا انتظام میرے والد ماجد نے اپنے یہاں کیا تھا۔ جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا اس لئے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعہ لانے کا انتظام کیا گیا تھا اور سب حضرات سواری ہی سے آئے۔ لیکن حضرت مولانا مدنی نے یہ کیا کہ سنہیل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیاز مند کو بطور راہ نما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشریف لائے۔ حالانکہ موسم گرما تھا اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا۔

سنہیل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں کے ایک صاحب نے جو بیچارے علمی، دینی، دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے اور حضرت مولانا سے ان کا کوئی تعارف بھی نہیں تھا، حضرت مولانا مدنی سے درخواست کی کہ میرے گھر پر چل کر چائے پیجئے، مجھے یاد ہے کہ ان کی یہ بات سب کو کچھ عجیب سے معلوم

ہوئی، لیکن مولانا نے بغیر کسی عذر و معذرت کے قبول فرمایا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جا کر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔

ایک عجیب واقعہ اور سنئے۔ حضرت کے ایک شاگرد نے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت ریل سے سفر فرما رہے تھے اور یہ صاحب خادم کی حیثیت سے حضرت کے ساتھ تھے انہیں استنجاء کا تقاضہ ہوا۔ بیت الخلاء کا دروازہ کھولا تو اس کو بہت غلیظ اور گندہ دیکھ کر واپس آ گئے اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلاء میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا، چند منٹ کے بعد تشریف لائے اور اپنے ان خادم سے کہا کہ اب چلے جاؤ۔ انہوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت ان کی واپسی کی وجہ محسوس کر کے بیت الخلاء صاف کرنے ہی کے لئے اندر تشریف لے گئے تھے اور جب لوٹے بھر بھر کے بہت سا پانی بہا دیا اور اس کو صاف کر دیا تو باہر تشریف لائے۔ کچھ حد ہے اس تو اضع اور بے نفسی کی؟

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعف پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر حضرت کے چند نیاز مندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کر کے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اب صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لئے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں، اور حضرت قبول فرما لیتے ہیں (اور اسی طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضرور ہی ہوتا ہے) یہ سلسلہ اب بند فرما دیا جائے، حضرت نے فرمایا میں کیا کروں لوگ آ جاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں، عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرمائیں کہ اس سلسلہ کو بند کرنا ہے، تو تھوڑے عرصہ تک تو ایسا ہو گا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرمادینے پر واپس چلے جائیں گے، اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرمایا ہے، تو پھر اس غرض سے لوگ آیا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لئے اصرار کریں اور میں انکار پر مجبور ہوں۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے، اس کو صرف ضرورت اور موقع ہی پر صرف ہونا چاہئے۔ حضرت نے خاکساری اور تواضع میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں، میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے؟ یہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام لے لینا چاہئے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ

حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجہ کی تھی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا کہنا سننا کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضا مندی یا نافرمانگی، کسی کی تحسین یا ملامت، حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کو اس راستے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلہ کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارے میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر انہوں نے اپنا لیا تھا، جو لوگ دس بارہ سال پہلے کے واقعات بھولے نہیں ہیں، انہیں یاد ہوگا کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت و آبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی، حضرت مولانا کو اس زمانہ میں اتنا ہی زیادہ مضبوط، غیر متزلزل اور پرجوش پایا گیا۔

اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علماء اور غیر علماء میں اور بھی بہت سے تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملے میں بالکل نرالی تھی، وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اپنے راستے کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلہ کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے۔ یہ میں نے ایک ایسے مسئلہ کی مثال دی ہے جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب پورے اسلامی ہند نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویہ کو اپنے لئے صحیح سمجھ لیا، پھر ان کے خاص معتمد اور نیاز مند بھی ان کا رویہ بدلوانے اور رخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے، الا یہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیلی ہو جائے۔ یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ ایسی ناکامیابی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثار و فیاضی اور مہماں نوازی

ناظرین نے ایثار و فیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے۔ خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں۔

۱۔ ملحوظ رہے کہ یہ مضمون حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا۔

لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو چھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ بیسوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر میر احتاط اندازہ ہے کہ برسہا برس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا، ان میں ایک خاصی تعداد تو ان اہل طلب کی ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونے کے لئے دور قریب کے مختلف مقامات سے روزانہ آتے تھے ان کے علاوہ ایک تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف زیارت و ملاقات کے لئے یا کسی معاملہ میں دعا کی درخواست کے لئے یا اپنی کسی ضرورت میں حضرت مولانا کی سفارش حاصل کرنے کیلئے یا ایسے ہی کسی اور کام سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے، ان کے علاوہ کچھ حضرات وہ بھی ہوتے تھے جو ذکر و شغل اور روحانی تربیت کیلئے کئی کئی مہینے حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ مہمانوں کی ان قسموں کے علاوہ کچھ لوگ حضرت مولانا کی اس فیاضی اور مہمان نوازی سے بے جا فائدہ اٹھانے والے بھی ہوتے تھے۔ میں نے واقفین سے سنا ہے کہ قرب و جوار کے دیہات کے بعض لوگ جو بازار، تھانہ یا تحصیل کے اپنے کاموں سے دیوبند آتے تھے وہ بھی کھانے کے وقت حضرت کے مہمان بن جاتے تھے اور حضرت ان کی اس نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی مہمان نوازی کرتے تھے، بلکہ خادموں تک کو سخت تاکید تھی کہ اگر کسی کے متعلق ایسا اندازہ ہو تب بھی مہمانوں ہی کی طرح اس کا اکرام کیا جائے۔ مجھے حضرت کے ایک خادم نے خود بتایا کہ ایک دفعہ انہوں نے ایسے ہی ایک صاحب سے کچھ کہہ دیا تو حضرت ان پر سخت غصہ ہوئے اور یہاں تک فرمایا کہ میرے یہاں آنے والے کسی بھی مہمان کا جو شخص دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔

بہر حال مختلف انواع و اقسام کے ان مہمانوں کی تعداد کا اوسط جیسا کہ اس ناچیز نے عرض کیا چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ تھا، اگر کبھی صرف تیس پینتیس ہوتے تھے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہو جاتے تھے۔ حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا تھا مثلاً پلاؤ پکنا یا ٹرید تیار کیا

جاتا، یا دیوبند کی مشہور فیرونی آتی تو بلا امتیاز سارے مہمان اس دن وہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

یہاں اس چیز کا ذکر کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت کے یہاں کار و زمرہ کا سادہ کھانا بھی (یعنی روٹی اور آلو یا آلو کی جیسی کسی ترکاری کے ساتھ بڑے گوشت کا شوربہ والا سالن) اس قدر لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا تھا کہ میں خود بھی شہادت دے سکتا ہوں اور بہت سے مہمانوں سے بھی میں نے سنا ہے کہ حضرت کے دسترخوان پر بیٹھ کر سوایا یا ڈیوڑھا کھانا کھایا جاتا ہے اور کبھی نقصان نہیں دیتا۔ جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنہوں نے حضرت کی عجیب و غریب اور بے مثال مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے ان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ روزمرہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری لٹھی مدوں میں حضرت کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا، خود اپنی ذات پر اور اہل و عیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال و اعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے، اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیخ اور حبّ مال سے حضرت کے قلب و روح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور انشاء اللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے:

وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شح اور حبّ مال کی بڑی خصلت سے بچا یا وہ یقیناً فلاح پانے والے ہیں۔ تغابن)

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سن لیجئے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی ایثار و فیاضی اور دوسروں کی راحت و رسانی کا فکر و اہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔ غالباً ۲۳ یا ۲۴ء کی بات ہے، سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی شخص کی تحریک کے اثرات سے مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت کیلئے جمعیۃ العلماء ہند کا شعبہ تبلیغ میدان میں اترا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے تبلیغی وفد کے ذریعہ وقتی دفاعی کوششوں کے علاوہ ان علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے، مذہبی مکاتب قائم کرنے کا ایک ٹھوس، مستقل اور وسیع کام بھی تھا، جس کیلئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی..... جمعیۃ العلماء ہند اور اکابر دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگون کے صاحب خیر تاجروں نے اس سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد پرما

بھیجنے کی درخواست کی، اس وقت برماہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا، یہ وفد رنگون پہنچا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیت کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی شخص کے دفاع میں دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقل کام ہو رہا تھا)۔

بہر حال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے۔ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے، ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں ان میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں، اس لئے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لئے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے۔ لیکن اس نے کہا، ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں، اس لئے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اُس نے اجازت دی۔ ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کر دی، حضرت نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کئے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا، لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہذا آپ حضرات کیلئے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں اور واپس چلا جاؤں، لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بے چارے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی اُن کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرمادیں گے، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس کے بعد کوئی تقریر نہ کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت مولانا نے (انہیں کی خیر خواہی کیلئے) اس

شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادل نا خواستہ مان لینا پڑا۔ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولانا نے خطبہ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی، کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا، اور یہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا، مجھے ان کے اس وعدے کا افسوس ہے لیکن بہر حال اب مجھے ان کے وعدے کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے۔ بیان کرنے والے کا بیان ہے۔ کہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کر آتے تو میں یہ بتاتا اور یہ بتاتا۔ آخر میں فرمایا کہ چونکہ ہمارے محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لئے میں مجبور ہو گیا ہوں اور میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا.... پھر چند کلمات وفد کے مقصد کے متعلق بھی کہہ کر تقریر ختم فرمائی۔

حضرت مولانا اپنی شرط کے مطابق غالباً دوسرے یا تیسرے ہی دن بحری جہاز سے کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ حاجی داؤد ہاشم مرحوم نے (جو وفد کے خاص داعی اور میزبان تھے) اپنے خاص ملازم محمد ذاکر صاحب کو بطور خادم کے کلکتہ تک کے لئے حضرت کے ساتھ کر دیا۔ حضرت کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور ذاکر صاحب کا ٹکٹ سرونٹ کی حیثیت سے تھروڈاکر تھا۔ حضرت مولانا کی سیٹ جس کمرے میں تھی اس میں کوئی دوسرا مسافر نہ تھا، اس لئے حضرت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب بھی زیادہ سے زیادہ وقت وہیں حضرت کے ساتھ رہیں، لیکن جہاز ”بوائے“ جب آتا تو ذاکر صاحب کے ہر وقت وہاں رہنے پر معترض ہوتا، اس لئے حضرت مولانا نے یہ کیا کہ وہ خود زیادہ وقت تھروڈاکر کلاس میں ذاکر صاحب کے ساتھ گزارنے لگے۔ بہر حال سفر ختم ہوا اور چوتھے دن کلکتہ کا ساحل آ گیا۔ رواج کے مطابق ”بوائے“ فرسٹ کلاس کے مسافروں سے ”انعام“ دیا۔ ”بخشش“ مانگنے آیا اگرچہ راستے میں اس نے حضرت مولانا کو تکلیف دی تھی لیکن ”انعام“ مانگنے کیلئے وہ حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، ذاکر صاحب بھی اس وقت ساتھ تھے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہم لوگوں کو بہت تکلیف دی ہے اسے ایک پیسہ نہ دیجئے، لیکن مولانا نے ہنس کے فرمایا کہ نہیں، ان کا حق ان کو ضرور دیا جائے گا... (آگے کی بات سننے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب کہ ایک روپیہ آج کے ۷-۸ روپے کے برابر تھا اس لئے جو لوگ بڑے سے بڑا انعام بھی ”بوائے“ کو دیتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہوتا تھا)۔ اس کے بعد سننے کے مولانا نے گن کر چار روپے نکالے اور

اس کو دینے لگے وہ سمجھا کہ یہ مجھ سے مذاق کرتے ہیں اور اس طرح میری بدسلوکی کا انتقام لینا چاہتے ہیں، اس لئے اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا لے لو یہ تمہارے ہی لئے ہیں، آخر بہت جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت نے وہ روپے اس کو دے دیئے۔ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ خود محمد ذاکر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کم بخت نے تو حضرت کو تکلیف دی کہ خدمت کے لئے مجھے حضرت کے ساتھ بھی نہ رہنے دیا اور حضرت نے اسے اکٹھے چار روپے دے دیئے۔ بڑے بڑے بڑا انگریز بھی ان لوگوں کو ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا، بھائی ذاکر اصل بات یہ ہے کہ یہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ انعام بس صاحب بہادروں سے ملتا ہے، ہماری صورتوں سے اسے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی اس لئے اس نے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، اب ہمارا سفر تو ختم ہو گیا۔ میں نے یہ روپے اسے اس لئے دیئے ہیں کہ اسے معلوم ہو کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زائد دے سکتے ہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندے کو انشاء اللہ یہ آئندہ نہیں ستائے گا بلکہ ان کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

اسی ایک واقعہ سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاج ایمانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عند اللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی

بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اس یاد کے لئے جس ایمانی مناسبت اور جس توشیح کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں، لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے ان میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہونے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہوگا، یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی۔ خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی اور رائے میں خاصا بعد ہوتا، لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کیلئے ان کی جو تیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار جھاڑنا بھی سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے ایمانی اوصاف کے ورثے سے ہم کو محروم نہ رکھے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمۃ والرضوان

حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت و محبت اور اس عاجز و عاصی پر حضرت مدوح کی عنایت و شفقت بھی اللہ تعالیٰ کی خاص قابل شکر اور لائق ذکر نعمتوں میں سے ہے، حضرت مدوح کا اصل وطن ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے مشہور قصبہ کوپانچ کے قریب ایک گاؤں ”فتح پور تال نرجا“ تھا۔ حضرت کا تذکرہ تو بار بار بہت پہلے سے سنا تھا لیکن زیارت کا اتفاق پہلی دفعہ اب سے قریباً ۳۰-۳۲ سال پہلے ۱۳۵۵ء یا ۱۳۶۱ء میں ہوا تھا، مہینہ غالباً جون کا تھا، راقم سطور کا قیام اس زمانہ میں بریلی میں تھا اور تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت اُس دور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ زیادہ نصیب ہوئی تھی (جس میں پہلے تو ضعف ہمت اور بعض خاص مصروفیات کی وجہ سے کمی آئی اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے بالکل ہی محرومی ہو گئی ہے، جس کو یہ عاجز اپنا بڑا خسارہ سمجھتا ہے، بہر حال اسی دور میں) ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ مشرقی یوپی کے چند اضلاع اعظم گڑھ، گورکھ پور وغیرہ کے دورہ کا پروگرام بنا۔ اس جماعت میں ہمارے نہایت محترم بزرگ دوست صوفی سید عبدالرب صاحب (ایم اے) مرحوم بھی تھے اور اُن کے خاص دوست اور رفیق مولانا سراج الحق صاحب چھلی شہری (بی اے) بھی (جو ابھی پچھلے مہینہ انتقال فرما کر انہیں کے ساتھ جا ملے، رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ) اور ان کے ایک دوسرے خاص رفیق ماسٹر محمد ابراہیم صاحب الہ آبادی، (ایم اے) بھی ساتھ تھے۔ یہ تینوں حضرات ہم مشرب و ہم مذاق تھے، انگریزی تعلیم گاہوں اسکولوں یا کالجوں کے اساتذہ تھے، تینوں کو حکیم الامت حضرت مرشد تھانویؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور تینوں کو تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

ہماری یہ جماعت ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ موپنچی، وہاں غالباً تین دن قیام کا پروگرام تھا، یہ تینوں حضرات حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ سے اچھی طرح واقف بلکہ اُن کے نیاز مندوں میں تھے۔ میں

صرف غائبانہ عقیدت رکھتا تھا۔ ان تینوں حضرات نے کہا کہ مٹو کے اس قیام ہی کے دوران میں ہم کسی وقت حضرت مولانا وحی اللہ صاحب کی زیارت کیلئے فتح پور تال نر جا جانا چاہتے ہیں، میں نے بھی ان حضرات کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ ”جماعت“ کے امیر ہمارے مولانا عبید اللہ صاحب بلیا دی تھے، ان سے اجازت لے کے فتح پور جانے کا پروگرام بنالیا گیا۔ ہم چاروں میں سے کوئی بھی اس سے پہلے فتح پور نہیں گیا تھا۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں سے کوپانگج کیلئے یکے جاتے ہیں، وہاں سے فتح پور پیدل جانا ہوگا۔ ہم لوگ شام کو بعد مغرب روانہ ہو سکے اور پروگرام یہ بنایا کہ رات کو کوپانگج کسی مسجد میں قیام کریں اور علی الصبح وہاں سے فتح پور یکے لئے روانہ ہو جائیں۔ ہم لوگ رات کو کچھ دیر سے کوپانگج پہنچ سکے۔ کسی سے کھانے کی دوکان کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایسی کوئی دوکان یہاں نہیں ہے (یا یہ کہ اب بند ہو چکی ہے)۔ جن صاحب سے ہم نے دوکان کے بارے میں دریافت کیا تھا، ان کو ہم نے ان کے دریافت کرنے پر یہ بتلادیا تھا کہ ہم لوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ مٹو آئے تھے، اس وقت فتح پور جانے کے لئے آئے ہیں، رات کو یہیں کسی مسجد میں قیام کریں گے اور صبح انشاء اللہ فتح پور حضرت مولانا وحی اللہ صاحب کی زیارت کے لئے جائیں گے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کھانا کسی دوکان سے نہیں مل سکے گا، ہم لوگوں نے طے کیا کہ چنے یا دال موٹ یا مٹھائی جیسی کوئی بھی چیز مل جائے تو اسی سے کام چلا لیا جائے، اتنے میں کچھ صاحبان آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ لوگ کچھ نہ خریدیں، ہم کھانا لاتے ہیں، ہم لوگوں نے شکر یہ اور دعا کے ساتھ مناسب انداز میں اُن سے معذرت کر دی، کیونکہ ہم اس سفر میں تبلیغی جماعت کے عام اصول کے مطابق کسی پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال اس وقت جو کچھ کسی دوکان سے مل گیا وہ لے کر مسجد میں آ گئے، پہلے عشاء کی نماز ادا کی، پھر کھانے کے ارادہ سے بیٹھے ہی تھے کہ ایک حاجی صاحب ایک طشت میں ہم تینوں کیلئے پورا کھانا لے کر مسجد میں تشریف لائے اور کہا کہ میں حضرت مولانا کا خادم ہوں، آپ حضرت کے مہمان ہیں، اور یہ کھانا گویا حضرت ہی کی طرف سے ہے، اس کو آپ قبول فرمائیں، ان کی بات سے یہ اندازہ کر کے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے اور حضرت کے تربیت یافتہ ہیں، ان کے شکر یہ اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ اس کا کھانا ہی سعادت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ سمجھ کر کھایا۔ کھانا بہت اعلیٰ قسم کا تھا جیسا کہ خاص مہمانوں کے لئے اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے۔ (یہ بات ظاہر تھی کہ وہ فوری طور پر تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ پہلے سے تیار شدہ تھا، یہ غذا بنی جانتا ہے کہ اُن حاجی صاحب نے کیوں تیار کرا کے رکھا تھا)۔ پھر صبح کو انہوں نے ناشتہ بھی ایسا لکڑیا اور اپنے ذاتی یکہ سے (جو بہت اعلیٰ قسم کا تھا) ہم لوگوں کو فتح پور تال نر جا پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو

بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔ ۲۰-۳۲ سال پہلے کی بات ہے افسوس ہے کہ ان کا نام اب یاد نہیں رہا۔
 راقم سطور کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا یہ پہلا موقع تھا۔ حضرت نے
 بڑی عنایت فرمائی، جتنی دیر مجلس میں حاضری رہی، اصلاح نفس اور تزکیہ اخلاق ہی حضرت کی گفتگو کا
 موضوع رہا۔ اُس وقت حضرت مدوح میں ایک خاص قسم کی اضطرابی اور سیلابی کیفیت محسوس ہوتی تھی،
 معلوم ہوتا تھا کہ پورے وجود میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہے۔ ہم لوگ صبح کو پہنچے تھے، اپنے پروگرام کے مطابق
 شام کو موٹو واپس آ گئے۔ حضرت کی خدمت میں اس پہلی حاضری اور زیارت کو راقم سطور نے اپنے حق میں
 اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت سمجھا۔

اس کے ۳-۴ سال بعد ۴۹ء میں فتح پور تال نر جا ہی میں حضرت کی خدمت میں دوسری دفعہ حاضری
 کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کچھ ہی پہلے فرقہ وارانہ فسادات کی ایک طوفانی لہر بنگال سے اٹھ
 چکی تھی اور بہت سے مسلمانوں کے سامنے (۴۹ء کے بعد) پھر یہ سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ
 سکیں گے یا نہیں؟ یہ عاجزانہی دنوں میں کسی ضرورت سے منو گیا تھا وہیں ایک خواب دیکھا جس نے
 ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ہندوستان ہی میں مقیم رہیں گے یا پاکستان
 تشریف لے جائیں گے؟ میں نے ضروری سمجھا کہ فتح پور حاضر ہو کر حضرت کی زیارت بھی کروں اور
 اگر موقع ملے تو اس بارہ میں دریافت کروں، چنانچہ حاضری کا پروگرام بنالیا۔ (جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے
 منو سے کوپاسخ تک یکے چلتے تھے اگے فتح پور کے لئے کئی میل پیدل چلنا ہوتا تھا۔ ایک دن میں ایک یکہ سے
 روانہ ہو گیا، اس یکہ پر ۴-۵ آدمی اور بھی سوار تھے جو سب کو پاس گنج جانے والے تھے۔ راستہ میں میں نے
 یکہ والے سے کہا کہ مجھے فتح پور تال نر جا جانا ہے اور آج ہی واپس لوٹنا ہے، اگر تم مجھے فتح پور تک پہنچا سکو تو پہنچا
 دو، جو کرایہ تم کہو گے میں خوشی سے دوں گا اور تمہارا احسان بھی مالوں گا۔ یکہ والے نے راستہ کی خرابی کا عذر
 کیا، بالآخر وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ جہاں تک راستہ زیادہ خراب نہیں ہے وہ مجھے وہاں تک یکہ ہی سے پہنچا
 دے گا۔ اسی یکہ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان بھی تھا، اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتح پور کس کے پاس
 جائیں گے؟ میں نے کہا وہاں ہمارے ایک بزرگ ہیں ان سے بس ملے جاؤں گا۔ اس نے کہا اچھا وہ
 جو فتح پور کے شاہ صاحب ہیں، آپ اُن کے درشن کرنے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا ہاں میں انہیں کے درشن
 کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس نوجوان سے پوچھا آپ اُن کو جانتے ہیں؟ اُس نے کہا بس اُن کا نام
 سنا ہے، مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اُن کے درشن کرنے کا کیوں

شوق ہے؟ اس نے کہا کہ میں کانپور کا رہنے والا ہوں، میرے ہاں رنگ کا بیو پار ہوتا ہے، میں اس کے سلسلہ میں ملک بھر میں گھومتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں سے واسطہ پڑتا ہے، یہاں کوپانچ میں بھی ہمارے ایک بیو پار ہی حاجی صاحب ہیں، وہ بڑے ہی ایمان دار سچے اور دھرمی آدمی ہیں، مہاتما ہیں، ایسا آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا، نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں، میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم میں ایسی سچائی اور ایمان داری کہاں سے آگئی؟ تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تو کچھ بھی اچھائی نہیں ہے میں تو بہت گندہ آدمی ہوں، ہاں یہاں سے قریب ہی فتح پور تال نر جا ایک گاؤں ہے، اس میں ہمارے ایک بزرگ مولانا صاحب ہیں، اُن کے پاس آتا جاتا ہوں، اگر تمہیں میرے اندر کوئی اچھائی نظر پڑتی ہے تو وہ اُن کا اثر ہوگا۔ اور بھی کئی آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے، اس لئے مجھے بھی اُن کے ورثہ کرنے کا شوق ہے۔ اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ ہمارے ملک کا بگاڑ جب ہی ٹھیک ہوگا جب یہ ”ملک“ (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

کوپانچ پہنچ کر یہ نوجوان اور دوسرے لوگ جو یکے پر ہوا رہتے سب اتر گئے۔ مجھے اس یکہ والے نے میل دو میل آگے وہاں تک پہنچا دیا، جہاں تک راستہ یکہ کے لئے زیادہ خراب نہیں تھا۔ اس کے آگے میں پیدل چل کر فتح پور پہنچ گیا۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میری اس حاضری سے کچھ ہی پہلے سخت خوں ریز فسادات کا ایک سلسلہ بنگال سے شروع ہو چکا تھا، جس نے مسلمانوں کے سامنے بڑے بڑے فسادات کے بعد پھر یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا انہیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا؟ اور ایک خواب کی بنا پر خود حضرت مولانا کے متعلق میرے ذہن میں یہی سوال پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایسے وقت پہنچا تھا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے تھے، جب حضرت ظہر کی نماز کے لئے باہر تشریف لائے تو ملاقات ہوئی۔ اُسی وقت فرمایا مجھے تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت نے وہ گفتگو فرمائی۔ اس وقت کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ حضرت نے مجھے ملکی حالات اور حکومتی معاملات کے بارے میں باخبر اور صاحب رائے سمجھتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا اندازہ ہے جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہے کیا وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان فسادات اور لوٹ مار سے تنگ آکر مسلمان یہاں سے چلے جائیں، یا یہ جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی منشا کے خلاف ہو رہا ہے اور وہ قابو نہیں پاسک رہے ہیں۔ میں نے اس بارے میں تفصیل سے اپنا خیال عرض کیا، جس کا حاصل یہ تھا کہ حکومت کے جو اصل ذمہ دار ہیں یعنی پنڈت جواہر لال

نہرو اور ان کے خاص رفقاء کا وہ تو نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کی زیادتیاں ہوں، لیکن پچھلے سالوں میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جس طرح کی کش مکش رہی اس نے اور پھر تقسیم کے فیصلہ اور پاکستان کے قیام نے عام ہندو ذہن کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہزارہ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی حق نہیں رہا۔ خود کانگریس والوں میں بھی اس مسلم دشمنی رجحان کا اچھا خاصا غلبہ ہو گیا ہے، اس لئے ان فسادات کو روکنے کیلئے جس قسم کی سختی کی ضرورت ہے حکومت کے ذمہ دار اس کی جرات نہیں کرتے۔

پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خود حضرت کا ارادہ ان حالات میں ہندوستان میں قیام کا ہے یا یہاں سے تشریف لے جانے کا؟ حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کے بعض احباب بہت دنوں سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں وہاں منتقل ہو جاؤں، لیکن میرا ارادہ یہیں رہنے کا ہے اور میں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔

تنہائی کی یہ گفتگو غالباً آدھ گھنٹے سے بھی کم میں ختم ہو گئی، اور اس کے بعد حضرت کی عام مجلس شروع ہو گئی جس کا انداز حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی نظر بعد کی مجلس ارشاد سے بہت ملتا جلتا تھا۔ مجلس میں بعض طالبین اصلاح کے خطوط پڑھے گئے جن میں انہوں نے اپنے احوال لکھے تھے اور ہدایت و رہنمائی چاہی تھی اور حضرت کی طرف سے اُن کے جو جوابات دیئے گئے تھے وہ بھی پڑھے گئے۔ اس دوسری حاضری سے قلب میں حضرت کی عظمت میں اور اضافہ ہوا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ حاضری ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی۔ اس کے کافی عرصہ بعد تک حضرت کا قیام اپنے اصلی اور آبائی وطن فتح پور ہی میں رہا، جہاں پہنچنا طالبین کے لئے آسان نہ تھا، اس وجہ سے چند مرتبہ اصلاح کے سوا دوسرے علاقوں کے اہل طلب خال ہی پہنچتے تھے۔ پھر تقدیر الہی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اپنے بعض اہل وطن کی کچھ بے عنوانیوں سے آزرہ ہو کر آپ گورکھ پور تشریف لے آئے، جو مشرقی یوپی کا بڑا مرکز اور مرکزی شہر ہے، اور اس کو مستقر بنالیا، کئی سال وہاں قیام رہا، اس زمانہ میں گورکھ پور ایک دینی و روحانی مرکز بن گیا اور طلب و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ راقم سطور گورکھ پور کے اس زمانہ قیام میں بھی ایک عقیدت مند زائر کی حیثیت سے طلب دعا اور استفادہ ہی کی نیت سے چند بار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر کچھ مدت کے بعد آپ نے وہاں سے الہ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ فرمایا، یہاں پہنچ کر حضرت کی مقبولیت کا اُس پیمانہ پر ظہور ہوا جو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بعض خواص اولیاء کے لئے

ہوتا ہے۔ یہ عاجز اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہاں بھی حاضر خدمت ہوتا رہا اور اپنی نااہلی کے باوجود حضرت کی عنایت و شفقت میں برابر اضافہ محسوس کرتا رہا۔

اللہ آبادی کے زمانہ قیام میں حضرت کی آمد و رفت ممبئی شروع ہوئی، جس کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ حضرت کو بعض ایسے امراض لاحق ہو گئے جن کی وجہ سے زیادہ گرمی بھی سخت مضر اور زیادہ سردی بھی سخت خطرناک، اور چوں کہ ممبئی میں نہ زیادہ سردی ہوتی ہے نہ زیادہ گرمی، اس لئے حضرت کے معالج اطباء نے مشورہ دیا کہ سخت سردی اور گرمی کے موسم میں حضرت کا قیام ممبئی رہا کرے، چنانچہ کئی کئی مہینے حضرت کا قیام ممبئی میں رہنے لگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ممبئی میں حضرت کے اس قیام کو وہاں کے لوگوں کیلئے رحمت اور رشد و ہدایت کا ایسا وسیلہ بنا دیا جس کے ظہور کے بعد محسوس ہوا کہ دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممبئی میں نور ہدایت پھیلنے کیلئے ایک غیبی انتظام تھا۔ شاید ہی اللہ کے کسی بندے سے اہل ممبئی کو اتنے وسیع پیمانہ پر اس طرح کا دینی فائدہ کبھی پہنچا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں کے تاجروں اور دوسرے اونچے طبقوں میں حضرت کے سیکڑوں عشاق پیدا کر دیئے جو دنیا دار تھے وہ اللہ والے بن گئے۔ ”اِنَّ رَّاسِيَ لَطَيِّفٌ لِّمَا يَشَاءُ اِنَّهُ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ“ پھر زندگی کے آخری سال (۶۷ء) میں تو آپ کا قیام اللہ آباد میں کم اور ممبئی ہی میں زیادہ رہا۔ اس عاجز کو اس آخری دور اور آخری سال میں دو دفعہ ممبئی میں حضرت کی خدمت میں کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ پہلی بار فروری میں حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی نیت سے ممبئی کا مستقل سفر کیا اور دو ہفتے تک حضرت ہی کا مہمان رہ کر بے انتہا عنایتوں اور شفقتوں سے مستمتع ہوتا رہا، پھر اس کے قریباً ۶ مہینے کے بعد مارچ اور حجاز مقدس جانے کے لئے ستمبر میں ممبئی پہنچا، اندازہ یہ تھا کہ ہوائی سفر کے قانونی مراحل ایک دو دن میں طے ہو جائیں گے اور میں انشاء اللہ اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو جاؤں گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ سے بھی زیادہ ممبئی میں قیام کرنا پڑ گیا، ان دنوں میں بھی میں زیادہ تر حضرت ہی کی خدمت میں اور آپ ہی کا مہمان رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے میرا ممبئی میں یہ جبری قیام، میرے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی خیر و برکت کا اور اس سفر کے لئے حضرت کی صحبت و ہدایات سے بہترین زاد راہ حاصل کر لینے کا ایک وسیلہ تھا۔

اپنے اس سفر سے پہلے ہی یہ بات معلوم تھی کہ حضرت مولانا کا ارادہ اس سال اپنے خاص رفقاء اور اعزہ کے ساتھ سفر حج کا ہے اور یہ بھی کہ غالباً رمضان مبارک سے پہلے ہی تشریف لے جائیں گے۔ یہ عاجز اپنے پروگرام کے مطابق پہلے مارچ اور ری یونین گیا اور وہیں سے ”رابطہ عالم اسلامی“ کے اجلاس کی

شرکت کیلئے مکہ معظمہ چلا گیا۔ اجلاس سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، حجاز مقدس میں مجموعی طور پر قریباً ایک مہینہ قیام کے بعد ۲۰ نومبر کی صبح ممبئی واپسی ہوئی، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی بھی واپسی کے سفر میں ساتھ تھے۔ ہم دونوں اسی دن ۱۰ بجے حضرت کی خدمت میں زیارت اور دعا کی درخواست کیلئے حاضر ہوئے۔ آپ دو ہی دن کے بعد ۲۲ نومبر کو سفر حج کے لئے مظفری جہاز سے روانہ ہونے والے تھے لیکن ہم دونوں کو ایک اہم ضرورت سے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا ضروری تھا، اسی لئے اگلے دن ۲۱ نومبر کی صبح ممبئی سے دہلی جانے والے طیارہ میں غالباً جدہ ہی سے رزرویشن کر لیا گیا تھا، اس مجبوری سے ہمارے لئے ممبئی میں ۲ دن بھی قیام کی گنجائش نہیں تھی، اس لئے اسی ملاقات میں ہم دونوں حضرت سے رخصتی مصافحہ اور دعا کی درخواست کر کے واپس آ گئے۔ یہ عاجز حج سے متعلق اپنی دو کتابوں ”آپ حج کیسے کریں“ اور ”آسان حج“ کے چند نسخے حضرت کے قافلہ کیلئے حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے رات کو پھر حاضر خدمت ہوا، حضرت نے بڑی محبت کے ساتھ کتابیں قبول فرمائیں۔ اس حاضری میں میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس کا امکان ہے کہ مجھے بھی اس سال حج میں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اس کے لئے حضرت دعا بھی فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا میں دعا کروں گا آپ کوشش کیجئے ضرور آئیے۔ وہم دوسرے بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ حضرت کی آخری زیارت اور آخری ملاقات ہے۔

یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں اپنے پروگرام کے مطابق ۲۱ نومبر کی صبح ممبئی سے روانہ ہو کر دہلی آ گئے اور اگلے دن ۲۲ نومبر کی صبح اپنے مستقر لکھنؤ پہنچ گئے۔ اسی دن حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ مظفری سے حجاز مقدس کیلئے روانہ ہو گئے۔ ۳۰ ہی دن ہوئے تھے ۲۵ نومبر کی شام کو ممبئی سے سیٹھ عبدالستار صاحب کا دیا ہوا تار دار العلوم ندوۃ العلماء میں موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آج صبح مظفری جہاز میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وصال ہو گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ) دو دن کے بعد ۲۷ کو ہمارے ایک دوسرے مخلص حاجی محمد یعقوب کا ۲۵ نومبر ہی کا ممبئی سے لکھا ہوا خط ملا جس میں یہ تفصیل تھی کہ۔۔۔

”حضرت کے رفقاء کا مظفری جہاز سے بذریعہ وائر لیس دیا ہوا تار آج دن کے ۱۱ بجے ممبئی پہنچا جس میں بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۶ بجے کر ۵ منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا اور جہاز کے کپتان کا کہنا ہے کہ جہاز کے قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھ کر میت کو سمند کے سپرد کر دیا جائے، اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ میت کو جدہ لے جائیں، آپ لوگ مغل کمپنی سے کیپٹن کو تار دلوایئے کہ وہ جدہ تک لے جانے کی اجازت دے اور انتظام کرے۔ چنانچہ کوشش کی گئی اور مغل کمپنی نے جہاز کے کپتان کو تار کے ذریعہ اس کی ہدایت دے دی اور ایک

تاریخ سعودی عربیہ میں حکومت ہند کے سفیر مذہب کاظمی کو بھی دے دیا گیا تاکہ وہ سعودی حکومت سے حضرت کی میت کو جدہ میں اتارنے اور مکہ معظمہ میں تدفین کی اجازت حاصل کر لیں۔ کامل قدوائی صاحب اور حجاز مقدس کے مقیم حضرت علیہ الرحمۃ کے خادم مولانا امجد اللہ صاحب گورکھپوری وغیرہ نے انتہائی جدوجہد کر کے سعودی حکومت سے یہ اجازت حاصل بھی کر لی، لیکن اللہ کی مشیت کہ اس اجازت کی اطلاع مظفری کے پستان کو نہ پہنچ سکی، اس لئے جدہ کے ساحل کے قریب پہنچ کر اُس نے حضرت کے رفقہ سے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ آپ لوگ نماز جنازہ پڑھ کے میت کو سمندر کے سپرد کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا۔ اور اب معلوم ہوا کہ تقدیر الہی میں یہی طے ہو چکا تھا کہ بیت اللہ کے راستہ میں جہاز میں حضرت کا انتقال ہو اور حجاز پاک کا ساحل آپ کا مدفن بنے۔ **يَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتُمُ مَا يُؤْتِلُ**۔

کچھ صفات و امتیازات

حضرت کے احوال حیات اور صفات و امتیازات سے متعلق کچھ لکھنے کا حق دراصل انہی حضرات کو ہے جنہیں حضرت کی خدمت میں طویل قیام اور استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی، اس عاجز کی واقفیت کا طول و عرض تو بس وہی ہے جو اوپر کی سطروں میں لکھا گیا، تاہم جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر چند سطروں میں اپنے بعض احساسات اور تاثرات بھی عرض کروں۔

جلال و جمال

حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت سے پہلے آپ کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اُس سے یہ سمجھا تھا کہ بڑے ”صاحب جلال“ بزرگ ہیں۔ پھر جب پہلی دفعہ (۲۵ یا ۲۶ء) میں حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ تو ”جلال“ کی وہ کیفیت تو نہیں تھی لیکن اس کا کچھ رنگ ضرور محسوس کیا تھا (اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور نہیں ہوں جن کا احساس ان امور میں کچھ زیادہ قابل اعتبار ہو) لیکن گورکھپور اور الہ آباد کے زمانہ قیام میں جب جب حاضری ہوئی تو عنایت و شفقت اور اُفت و رحمت کا رنگ ہی غالب پایا اور گزشتہ دو تین سالوں میں تو جب حاضری ہوئی تو محسوس کیا کہ رنگ و ریشہ پیار و محبت سے بھر پور ہے۔

قرآن مجید میں ”بالمومنین رؤف رحیم“ (یعنی اہل ایمان پر بہت زیادہ شفقت فرمانے والے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفت بیان فرمائی گئی ہے اس لئے اہل اللہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے روحانی حلقاء اور تائین ہوتے ہیں، ان کو ان کے اختلاف کے باوجود سب ہی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس گنہگار کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں کو دیکھنا نصیب فرمایا، ان سب کو اس صفت سے بھرپور رکھا لیکن حضرت مولانا شاہ وحی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خاص کر حیات کے اس آخری دور میں اس صفت کا انتہائی غلبہ تھا۔ جو بھی حضرت سے قریب ہوتا محسوس کرتا کہ رگ و ریشہ میں شفقت اور عنایت بھری ہوئی ہے۔ جو طالب بن کر آتا چاہتے کہ اس کے اعمال و اخلاق کی پوری پوری اصلاح ہو جائے اور اس کو تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے۔ اسی کے ساتھ بہت سوں کی دنیوی ضروریات کی بھی فکر فرماتے اور ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے سخت بے چین ہوتے۔

غیر معمولی تاثیر

اس کے اظہار میں ہرگز کوئی بے ادبی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ظاہری و جاہت والی شکل و صورت بالکل عطا نہیں فرمائی تھی، اسی طرح آپ صاحب زبان و بیان مقرر بھی نہیں تھے، آج کل کی اصطلاح کے مطابق صاحب قلم بھی نہیں تھے۔ اگرچہ مدت سے معمول تھا کہ روزانہ صبح ایک عام مجلس میں کچھ اصلاحی بیان فرماتے تھے، جس کا طریقہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اگلے اکابر علماء، محققین و مصلحین میں سے کسی کی کوئی کتاب ہاتھ میں لے کر اس کی کوئی عبارت پڑھتے اور اس پر کچھ فرماتے، کبھی ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھتے اور اس کے مضمون کی وضاحت فرماتے، لیکن اس بیان کی زبان اور اس کا انداز اکثر و بیشتر اس قدر علمی ہوتا تھا اور اس میں درسی اور فنی اصطلاحات کا اس قدر استعمال ہوتا تھا کہ خاص مناسبت رکھنے والے اعلیٰ علم ہی سمجھ سکتے تھے، پھر آواز کبھی کبھی اتنی دھمی ہوتی تھی کہ مانیکر و فون سامنے ہونے کے باوجود بہت سے حاضرین مجلس نہیں جانتے تھے کہ کیا فرمایا، لیکن تواتر کے طور پر لوگوں سے حاوہ خود محسوس بھی کیا کہ تاثر سے شاید کوئی بھی طالب خالی اور محروم نہیں رہتا تھا، اور اثر بھی ایسا جو اکثر و بیشتر کا پلٹ کر دیتا تھا۔

وفات سے قریب آدھی مہینے پہلے آخری ستمبر میں جب ایک ہفتہ کے قریب حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا تو ایک دن مجلس میں حضرت اپنی جگہ پر تشریف تو لے آئے لیکن دیر تک بس خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے وہ حدیث یاد آتی رہی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال بیان کیا گیا ہے: کسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک حال تھا کہ آپ بہت دیر تک خاموش رہتے اور محسوس ہوتا کہ مسلسل فکر و غم کی حالت میں ہیں، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ یہ ضروری نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ

بیان کروں گا، یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے صرف بیٹھنے میں بھی اپنا فائدہ سمجھیں۔
 بہر حال حضرت کی مجلس اس حقیقت کی روشن دلیل تھی کہ دینی فائدہ کا زیادہ تعلق زبان و بیان سے
 نہیں بلکہ قلب سے ہے۔ حضرت کی مجلس کے حاضر باشوں میں جو عظیم انقلاب آیا اس کو ہر آنکھوں والا صرف
 ایک شہر مہی میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

علمی رسوخ اور وسعت مطالعہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عام شہرت اگرچہ ایک شیخ طریقت اور صاحب ارشاد مصلح و مربی کی
 حیثیت سے ہے لیکن علم میں بھی اتنا رسوخ اور مطالعہ اتنا وسیع و عمیق تھا کہ اس دور کے اصحاب درس اور مصنفین
 میں بھی اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

ایک نیا انداز اور جذب و سلوک کا امتزاج

مشائخ طریقت میں اکثر و بیشتر وہ تھے جن کا ارشاد و اصلاح کا سارا کام بالکل اپنے شیخ کے
 منوال و منہاج پر ہوتا ہے لیکن بعض ایسے شہباز بھی ہوتے ہیں جو شیخ کی کامل محبت اور متابعت کے باوجود
 ایک مستقل انداز اور طریقہ کے بانی دیکھے جاتے ہیں، اس کی مثال میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں
 حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کا اور حضرت حاجی امداد اللہ کے خلفاء میں حضرت گنگوہی اور
 حضرت تھانوی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اگر چھوٹے منہ سے کسی بڑی بات کے کہنے کا کوئی جواز ہو تو یہ عاجز حکیم
 الامت حضرت تھانوی کے خلفاء میں حضرت شاہ ولی اللہ کا نام بھی اس کی مثال میں لے سکتا ہے۔ حضرت
 ممدوح میں جذب و سلوک کا ایسا واضح امتزاج تھا جس نے ایک نئے لے میں کما بین پیدا کر دیا تھا۔

در دست نہ تیرست نہ دست کمان است

ایں سادگی اوست کہ بسمل دو جہاں است

در مدرسہ از جنبش لعل تو حکایت

در میکدہ از مستی چشم تو نشان است

☆☆☆

بلے امام عبدالوہاب شعرانی (م ۱۳۰۷ھ) کا مشہور مقولہ ہے ”من لم ینفعہ سکوتنا لم ینفعہ کلامنا“ یعنی جس کو ہماری
 خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اس کو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا

کچھ یادیں ☆ کچھ باتیں

جہاں تک یاد ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مرتدہ کو سب سے پہلے اپنی طالب علمی کے زمانے (۱۳۳۳ھ) میں دارالعلوم دیوبند میں دیکھا تھا، کسی ضرورت سے تشریف لائے تھے، اور کسی جاننے والے نے بتلایا تھا کہ یہ ”مظاہر علوم سہارنپور“ کے استاذ مولانا محمد زکریا صاحب ہیں۔ اس کے بعد بھی زیارت و ملاقات تو کبھی کبھی ہوئی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانا کہ مظاہر علوم کے حدیث شریف پڑھانے والے بڑے اور مقبول اساتذہ میں ہیں۔

اپنی جماعت کے اصحاب ارشاد مشائخ و اکابر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی اس عاجز کے دل میں عظمت و عقیدت بھی تھی اور اپنے خیال میں کسی درجہ کی ذوقی مناسبت بھی، حضرت کی خاص شفقت و عنایت بھی حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت نگوینی اور اس کے ایک تقدیری فیصلے کے نتیجے میں ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں چند روز حضرت کی خانقاہ میں قیام کے ارادہ سے رائے پور کا سفر کیا اور قریب ایک ہفتہ قیام رہا۔ یہ سفر تو اس ارادہ سے نہیں کیا گیا تھا لیکن خانقاہ کے اس قیام کے دنوں میں حضرت سے بیعت اور اصلاحی تعلق قائم کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہوا۔ اور ایک دن اس کے لئے درخواست کی۔ حضرت نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اس مقصد کے لئے حضرت مولانا محمد الیاس یا حضرت شیخ الحدیث کی طرف رجوع کرنے اور ان سے یہ تعلق قائم کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی یہ تعلق قائم کرنے والے پور کا یہ سفر کیوں اور خانقاہ میں قیام کس غرض سے کیا تھا اور بیعت کا یہ داعیہ کن مرحلوں سے گزرنے کے بعد اور کس طرح دل میں پیدا ہوا، اس کا ذکر ”حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضری“ کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔

تعلق آپ کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں ان دونوں حضرات سے کچھ واقف ہوں ایک، ان میرے دل میں حضرت ہی سے یہ تعلق قائم کرنے کا داعیہ ہے۔ میرے اس عرض کرنے پر حضرت نے ان دونوں حضرات کے متعلق بہت بلند کلمات ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ میں نے اپنی درخواست ہی پر اصرار جاری رکھا اور بالآخر حضرت نے قبول فرمایا۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کی بلند مقامی سے مجھے باخبر کرنے کے لئے اس وقت جو کچھ حضرت نے ارشاد فرمایا اس کے نتیجہ میں ان حضرات کی وہ عظمت قلب میں پیدا ہوگئی، جواب تک نہیں تھی، اس کے بعد سے ان دونوں حضرات سے بھی خاص درجہ کی عقیدت و نیاز مندی کی سعادت بفضلہ تعالیٰ نصیب ہوگئی۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ آخری دور حیات تھا، قریباً ڈیڑھ سال بعد ہی (رجب ۱۳۶۳ھ میں) حضرت کا وصال ہو گیا۔ اس تھوڑی سی مدت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت کے ساتھ جو نیاز مندانہ تعلق نصیب ہوا اس کی برکتوں میں سے (یا کہا جائے کہ اس کی نشانی اور یادگار) اس عاجز کا مرتب کیا ہوا حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ البتہ حضرت شیخ الحدیثؒ اس کے بعد قریباً چالیس سال ہماری اس دنیا میں رہے، اور بلاشبہ اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے یہ عظیم نعمت بھی ہے کہ اس طویل مدت میں حضرت کی خاص شفقت و عنایت نصیب رہی۔ پچاسوں دفعہ حضرت کی خدمت میں حاضری اور بار بار طویل قیام بھی رہا۔ ایسے واقعات بے شمار ہیں جو قابل ذکر ہیں اور جن کا یہ عاجز عینی شاہد ہے، لیکن اس صحبت میں صرف چند ہی واقعات نذر ناظرین کرنے کا ارادہ ہے جن کا اس عاجز کی ذات ہی سے تعلق ہے۔ امید ہے کہ ان کا ذکر انشاء اللہ عام ناظرین کے لئے بھی نافع ہوگا۔



حضرت شیخ گے بارے میں مختلف حضرات سے سنا تھا کہ رمضان مبارک میں دن رات کے نوافل میں روزانہ ایک قرآن مجید ختم کر لینے کا معمول ہے، ایک دن میں نے عرض کیا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ معمول کب سے ہے اور اس کی ترتیب کیا ہے؟ شاید میرے ذریعہ اللہ کے کسی ایسے بندے کو معلوم ہو جائے جس کو اس معمول کے نقل کی توفیق ہو تو انشاء اللہ مجھے بھی کچھ مل جائے گا۔ میرے اس سوال کے جواب میں فرمایا: مولوی صاحب! جب پہلی دفعہ حج کیلئے مکہ معظمہ حاضری ہوئی تھی تو رمضان مبارک کا مہینہ تھا اور جوانی کا زمانہ تھا، وہاں روزانہ کا معمول یہ بنالیا کہ حرم شریف میں تراویح ختم کر کے تعظیم چلے جاتے اور وہاں

سے عمرہ کا احرام باندھ کے حرم شریف آ کر طواف اور اس کے بعد سعی کرتے اور حلق کراتے، اس طرح عمرہ سے فارغ ہو جانے کے بعد حرم شریف ہی میں تہجد کی رکعتیں پڑھتے، اس میں سحر کا وقت ہو جاتا، سحری سے فارغ ہو کر حرم شریف آ جاتے اور فجر کی نماز پڑھتے، اس کے بعد کچھ دیر کیلئے سو جاتے، پھر اٹھ کر چاشت کے نوافل پڑھتے اور اپنے مشاغل میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح رات کو سونا بالکل نہ ہوتا، بس فجر کے بعد ہی کچھ سو لیتے تھے۔ اس سال مکہ معظمہ میں رمضان مبارک اس طرح گزرا۔ اس کے بعد سے یہ طے کر لیا کہ اللہ توفیق دے تو رمضان مبارک اسی طرح گزرا کرے۔ اب میرا معمول یہ ہے کہ ماہ مبارک شروع ہو جانے پر مغرب کی نماز کے بعد اذان کی رکعتوں میں تین پارے پڑھتا ہوں پھر عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کے گھر آ جاتا ہوں اور تراویح گھر پہ پڑھتا ہوں، میری بچیاں مقتدی ہوتی ہیں، تراویح میں پھر وہی تین پارے پڑھتا ہوں، تراویح سے فارغ ہو کر انہی تین پاروں کی قرآن مجید میں دیکھ کر غور و فکر کے ساتھ تلاوت کرتا ہوں۔ اس وقت بعض تفاسیر بھی پاس رکھتا ہوں اور غور و فکر کے سلسلہ میں حسب ضرورت ان کا مطالعہ کرتا ہوں، اس کے بعد تہجد کی رکعتیں پڑھتا ہوں، ان رکعتوں میں بھی وہی تین پارے پڑھتا ہوں، اس میں سحری کا وقت آ جاتا ہے، سحری کھا کے فجر کی نماز کے لئے مسجد چلا جاتا ہوں، نماز سے فارغ ہو کر گھر آ جاتا ہوں، دو ڈھائی گھنٹے سو لیتا ہوں، پھر اٹھ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر چاشت کی رکعتیں پڑھتا ہوں اور ان میں بھی پھر وہی تین پارے پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد انہی تینوں پاروں کی قرآن مجید دیکھ کر تلاوت کرتا ہوں۔ اس کے بعد چار رکعتیں پڑھتا ہوں اور ان میں بھی یہی تین پارے پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد ظہر کا وقت آ جاتا ہے تو ظہر سے پہلی اور بعد کی سنتوں، نفلوں میں پھر وہی تین پارے پڑھتا ہوں، اس سے فارغ ہونے کے بعد ان ہی تین پاروں کی قرآن مجید دیکھ کر تلاوت کرتا ہوں، اس میں عصر کا وقت آ جاتا ہے، عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہی تین پارے کسی کو سنا تا ہوں۔ اس طرح یہ تین پارے دس دفعہ ہو جاتے ہیں اور ایک عشرہ میں دس قرآن پاک ہو جاتے ہیں، پھر جب عشرہ اخیرہ شروع ہو جاتا ہے تو مقدار اس حساب سے بڑھا دیتا ہوں کہ ۹ دن میں ۱۰ قرآن پورے ہو جائیں تاکہ اگر ۲۹ کو چاند ہو جائے تب بھی میرے تیس ۳۰ قرآن پورے ہو جائیں، پھر جب ۲۹ کا چاند نہیں ہوتا تو آخری دن میں ایک قرآن پاک مزید ہو جاتا ہے۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ حضرت شیخ کا یہ معمول اس وقت تک تھا جب انہوں نے میرے سوال کے جواب میں یہ بیان فرمایا تھا، لیکن یہ معلوم ہے کہ بعد میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس معمول میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور آخری سالوں میں تو پورے ماہ مبارک کے اعتکاف کا معمول رہا۔

۱۳۶۸ھ (۱۹۴۸ء) کا پورا رمضان مبارک حضرت رائے پوری قدس سرہ کی خدمت میں گزارنے کی نیت سے یہ عاجز ماہ مبارک شروع ہونے سے پہلے ہی رائے پور کی خانقاہ میں پہنچ گیا تھا۔ ۹ رمضان مبارک کو چھوٹے بھائی مولوی حکیم محمد احسن کا خط ملا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ کچھ دن پہلے والد ماجد نے خواب میں آفتاب غروب ہوتا دیکھا تھا، ہم لوگوں سے اس خواب کا ذکر کر کے فرمایا تھا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ ہماری زندگی کا آفتاب جلد ہی غروب ہونے والا ہے۔ خواب کی یہ تعبیر واقعہ بن کے سامنے آگئی۔ ۵ رمضان مبارک کو والد ماجد کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے خاص کر والدہ ماجدہ اور چھوٹی بہن کی تسلی تفسی کے لئے بلاتا خیر وطن پہنچنا ضروری سمجھا اور حضرت قدس سرہ کی خدمت میں عرض کر کے اور دعائے مغفرت کی درخواست کر کے رائے پور سے روانہ ہو گیا۔ سہارنپور ایسے وقت پہنچا کہ مغرب کی نماز ہو چکی تھی اور حضرت شیخ مسجد سے گھر تشریف لے جا چکے تھے، چونکہ رمضان مبارک کے شیخ کے نظام اوقات کا کچھ علم تھا اس لئے ارادہ کیا تھا کہ ان کو بس اطلاع دے کے اور دعائے مغفرت کی درخواست کر کے اجازت لے لوں گا اور اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ حضرت کو اطلاع دلوئی فوراً تشریف لے آئے۔ میں نے بھائی کے خط کا ذکر کیا اور دعائے مغفرت کی درخواست کی اور اسی وقت جانے کی اجازت چاہی، حضرت نے کچھ تعزیتی کلمات فرمائے اور دعا فرمائی، اور فرمایا کھانا تو ابھی کھایا نہیں ہوگا، میں نے عرض کیا کہ اس وقت حضرت زحمت نہ فرمائیں، فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ گھر میں تشریف لے گئے اور چند منٹ کے بعد کھانا خود ہاتھ میں لئے ہوئے تشریف لائے، جس میں سالن کے ساتھ صرف ایک تازہ روٹی تھی جو اسی وقت چولھے سے اتر کر آئی تھی، مجھ سے فرمایا مولوی صاحب! کھانا شروع کرو، میں نے شروع کر دیا حضرت پھر تشریف لے گئے اور ویسی ہی تازہ گرم گرم چند روٹیاں اور لے آئے۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت گھر میں پکی ہوئی روٹی موجود نہیں تھی، میری وجہ سے اسی وقت پکانی پڑی ہے، اس احساس سے مجھے بڑا افسوس اور دکھ ہوا۔ میں نے اپنا یہ احساس حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا، حضرت فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور روٹیوں سے بھری ہوئی ایک ڈلیا میرے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ مولوی صاحب! پکی ہوئی روٹیاں تو اتنی رکھی ہوئی تھیں، لیکن جب میں نے بچیوں کو تمہارے بارے میں بتلایا کہ وہ رائے پور سے آئے ہیں اور ابھی جا رہے ہیں، تو بچیاں اس پر راضی نہیں ہوئیں کہ شام کی پکانی ہوئی روٹیاں

کھائیں، انہوں نے خود ہی اصرار کر کے تازہ روٹی پکانی شروع کر دی۔ لے

اس کے بعد فرمایا: مولوی صاحب! اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے میری بچیاں بڑی نعمت ہیں، رمضان مبارک کو خوب وصول کرتی ہیں۔ رات اور دن میں بیس بیس، بچیس بچیس پاروں کی تلاوت کر لیتی ہیں، پھر شام کو تھوڑے سے وقت میں کھانے پکانے کا سارا کام بھی کر لیتی ہیں، مختلف مسجدوں میں بھیجنے کیلئے افطاری بھی تیار کرتی ہیں۔ پھر افطار سے کافی پہلے ان سارے کاموں سے فارغ ہو کر تسبیح اور دعا وغیرہ میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پھر میں نے دعا کی درخواست کی اور اجازت لے کر رخصت ہوا۔



راقم سطور کی والدہ ماجدہ مرحومہ کا انتقال رمضان مبارک ۱۳۶۹ھ میں ہوا، وہ کئی مہینے سے مریض تھیں، ان کی علالت اور نازک حالت کی اطلاع پا کر یہ عاجز غالباً شروع رمضان مبارک ہی میں ان کی خدمت میں وطن پہنچ گیا تھا۔ ان کو خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ میرا آخری مرض ہے اور سفر آخرت کا وقت قریب ہی ہے، انتقال سے چند روز پہلے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ میں کسی بزرگ سے بیعت نہیں ہوئی، اب چاہتی ہوں کہ دنیا سے جانے سے پہلے کسی بزرگ سے بیعت ہو جاتی۔ میں نے اسی دن حضرت شیخ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ میری والدہ ماجدہ کا یہ حال ہے اور ان کی یہ خواہش اور آرزو ہے، میری درخواست ہے کہ حضرت ان کو عاتبانہ بیعت فرمائیں، اس سے ان کو اطمینان ہو جائے گا اور انشاء اللہ آخرت میں ان کے لئے نافع ہوگا۔ والدہ ماجدہ مرحومہ کی نازک حالت دیکھتے ہوئے اس کی زیادہ امید نہیں تھی کہ حضرت کی طرف سے جواب آنے تک وہ اس دنیا میں رہیں گی لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کہ حضرت کو میرا عریضہ اور مجھے حضرت کا جواب بہت جلد مل گیا۔ حضرت نے تحریر فرمایا تھا کہ میں ان کی اور تمہاری تطہیب خاطر کی نیت سے اور اپنے لئے اخروی نفع کی امید رکھتے ہوئے ان کو بیعت کرتا ہوں، تم میری طرف سے اپنے اکابر کے طریقہ پر ان سے بیعت لے لو اور ان کو بتلا دو کہ میں نے بیعت کر لیا۔ میں نے ایسا ہی کیا، والدہ ماجدہ کو بڑی خوشی اور بڑا اطمینان ہوا۔ اس عاجز نے غالباً اسی دن خواب میں دیکھا (جس کی پوری تفصیل تو اب یاد نہیں، اتنی بات یاد ہے) کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کا کفن اور جنازہ بہت ہی غیر معمولی قسم کا ہے، اس کی تعبیر یہی سمجھی کہ انشاء اللہ والدہ ماجدہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ ہوگا۔ بس اس کے ایک دو دن بعد ہی ٹھیک مغرب کی اذان کے وقت والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا۔ رحمہا اللہ تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

۱۔ حضرت شیخ کے ہاں مہمانوں کے لئے تازہ تازہ گرم گرم روٹیوں کا خاص اہتمام ہوتا تھا، ہر چند سیکنڈ کے بعد گھر میں سے ایک تازہ روٹی آتی تھی، حضرت اپنے ہاتھ سے اس کے چند ٹکڑے کر کے مہمانوں کو عنایت فرماتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اکرامِ ضیف کے سلسلہ کا ایک عمل تھا۔



۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) میں اس عاجز کے ایک مخلص دوست (ضلع گونڈہ کے رہنے والے ماسٹر محمد یسین صاحب مرحوم و مغفور) نے سفر حج کا ارادہ کیا اور مجھ سے اصرار کیا کہ ان کے ساتھ میں بھی چلوں، اس وقت نہ توج مجھ پر فرض تھا اور نہ میں اس حال میں تھا کہ سفر حج کے مصارف کا انتظام کر سکتا، انہوں نے پورے اخلاص اور اصرار کے ساتھ پیش کش کی کہ سفر کے سارے مصارف وہ ادا کریں گے، اس کیلئے تو میں اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا، لیکن ان کے اخلاص اور اللہ تعالیٰ تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس کو حرمین شریفین کی حاضری اور حج و زیارت کی سعادت اور برکت حاصل کرنے کیلئے منجانب اللہ ایک انتظام سمجھ کر اس حد تک قبول کر لیا کہ جہاز کا کرایہ وہ ادا کریں۔ باقی مصارف کا میں خود انتظام کروں۔ اس کیلئے میں نے قرض لینا طے کیا، سہارنپور حاضر ہو کر حضرت شیخ الحدیث سے عرض کیا، حضرت نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور مطلوبہ رقم عنایت فرمادی، حرمین شریفین کے زمانہ قیام کی ضروریات زیادہ تر اسی سے پوری ہوئیں (اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کو اور میرے ان مخلص دوست کو جو اس سفر کا باعث بنے اپنی شانِ عالی کے مطابق صلہ عطا فرمائے اور رحمت خاص سے نوازے)۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس قرض کی ادائیگی میرے لئے آسان فرمائی اور میں نے حضرت کی خدمت میں رقم پیش کی، تو حضرت نے فرمایا کہ — مولوی صاحب! میں بھی اپنی ضروریات کے لئے دوستوں سے قرض لیتا رہتا ہوں، لیکن اس کا پورا اہتمام کرتا ہوں کہ اگر کسی وقت تک ادائیگی کا وعدہ کیا ہے تو جس طرح بھی ہو سکے اس وقت ادا کر دوں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے پاس ادائیگی کے لئے اس وقت تک انتظام نہیں ہوتا تو میں وعدہ کے دن سے ایک دن پہلے کسی دوسرے دوست سے قرض لے لیتا ہوں اور مقررہ وقت پر اس سے ادا کر دیتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے بڑے سے بڑا قرض ملنا بھی بہت آسان ہے کیونکہ دینے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی رقم مقررہ وقت پر اس کو انشاء اللہ ضرور مل جائے گی۔ پھر فرمایا کہ اب کچھ دن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ جس دن مجھے کوئی قرض ادا کرنا ہوتا ہے اور میرے پاس ادائیگی کا انتظام نہیں ہوتا تو ایک دو دن پہلے ہی اللہ کا کوئی بندہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اتنی رقم آپ کے پاس امانت رکھنا چاہتا ہوں، میں اس سے کہہ دیتا ہوں کہ بھائی امانت نہ رکھو، اس میں تمہارا تو یہ نقصان ہے کہ اگر بالفرض کوئی ایسا حادثہ پیش آیا کہ رقم ضائع ہوگئی تو تمہارا نقصان ہوگا، اس کی ادائیگی میرے ذمہ نہ ہوگی، اور مجھے یہ تکلیف ہوگی کہ دل و دماغ پر اس کی حفاظت کی فکر سوار رہے گی، تم چاہو تو بطور قرض رکھ سکتا ہوں، تم جب

واپس لینا چاہا تو ایک دن پہلے تہلا دو، انشاء اللہ اگلے دن واپس ہو جائے گی۔ وہ اس پر خوشی سے راضی ہو جاتا ہے اور رقم قرض کے طور پر میرے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لئے قرض کی ادائیگی کا انتظام ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے۔



۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) میں حضرت رائے پوری قدس سرہ نے سفر حج کا ارادہ فرمایا، حضرت کی خواہش تھی کہ اس سفر میں ہمارے رفیق محترم مولانا علی میاں بھی ساتھ ہوں، حضرت شیخ الحدیث کی ایک صاحبزادی کا چند ہی مہینے پہلے انتقال ہوا تھا، یا تو میں جانب اللہ حضرت شیخ کے قلب پر وارد ہو یا حضرت رائے پوری کی خواہش کا ان کو علم ہو گیا تھا، بہر حال انہوں نے مرحومہ صاحبزادی کے حج بدل کے لئے مولانا علی میاں ہی کا انتخاب فرمایا، میں انہی دنوں میں سہارنپور حاضر ہوا، حضرت شیخ نے مجھ سے اس کا تذکرہ فرمایا اور چونکہ میں نے اس سے پہلے ہی سال حج کا سفر کیا تھا اس لئے سفر کے مصارف کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا، میں نے جو مناسب سمجھا عرض کیا، غالباً اسی کے مطابق حضرت شیخ نے رقم عنایت فرمائی۔

اس زمانے میں مولانا علی میاں اور یہ عاجز بھی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی طرف منسوب دینی دعوت کے کام میں دلی جوش و جذبہ اور سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، مشورہ سے یہ طے ہو گیا تھا کہ حضرت رائے پوری تو اپنے پروگرام کے مطابق واپس تشریف لے آئیں گے، مولانا علی میاں اس کے بعد بھی قیام کریں گے اور دینی دعوت کے سلسلہ میں کام کریں گے، مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب کا اس کام ہی کے سلسلہ میں محجاز مقدس میں مستقل قیام تھا۔ مزید برآں مشورہ سے یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ اس دینی دعوت کے اصولوں کے تحفظ کے ساتھ مصر و شام وغیرہ ممالک عربیہ کا بھی سفر اس دعوت کے سلسلہ میں کیا جاسکے تو کر لیا جائے۔ مولانا علی میاں نے اس کے لئے اپنے کو آمادہ کر لیا تھا۔

حضرت رائے پوری قدس سرہ کے ساتھ مولانا ناروانہ ہو گئے اور حج و زیارت کے سلسلہ میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حضرت ہی کے ساتھ رہے۔ بلاشبہ اس مبارک سفر میں حضرت کی یہ معیت بڑی قابل

(۱) تبلیغ کام کے ساتھ اس عاجز کا تعلق کن مراحل سے گزرا اور اس کا اس کے بارے میں کیا حال و قال ہے، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اللہ اگر توفیق دے تو دنیا سے جانے سے پہلے اس کو بھی تفصیل سے بیان کر جاؤں۔

(۲) ان اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ تھا کہ اس سلسلہ میں مالی تعاون صرف انہی خلیصین کا قبول کیا جائے جو اپنے جسم و جان سے بھی دعوت کے اس کام میں لگے ہوئے ہوں۔ جو حضرات صرف مالی تعاون کرنا چاہیں ان سے خوبصورتی کے ساتھ معذرت کر دی جائے۔

ربک نعمت تھی۔ پھر حضرت قدس سرہ توجہ و زیارت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لے آئے، اور مولانا حسب مشورہ وہیں رہ گئے۔ اس زمانے میں مولانا کے خطوط آتے رہے اور ان میں سے بعض ’الفرقان‘ میں اور رسالہ ’تعمیر‘ میں شائع بھی ہوتے رہے۔ (یہ رسالہ ’تعمیر‘ اس زمانے میں مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم کے قائم کئے ہوئے ادارہ تعلیمات اسلام سے شائع ہوتا تھا)۔

کچھ عرصے کے بعد مولانا کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ باہر کے کسی سفر کے لئے اپنے اصول کے مطابق کوئی ایسا انتظام نہیں ہوا جس پر قلب مطمئن اور منشرح ہوتا اس لئے اب واپسی ہی کا ارادہ ہے، جب واپسی کا پروگرام طے ہو جائے گا تو اطلاع دی جائے گی۔ اس خط کے ملنے کے ایک دو ہی دن بعد کسی سلسلہ میں میرا سہارنپور کا سفر ہوا۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دریافت فرمایا کہ علی میاں کی کیا خبر ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی ایک ہی دو دن پہلے اُن کا خط آیا تھا جس میں لکھا ہے کہ باہر کے سفر کا کوئی قابل قبول انتظام نہیں ہو سکا اس لئے اب واپسی ہی کا ارادہ ہے۔

حضرت شیخ نے ایک خاص انداز سے فرمایا کہ مولوی صاحب! یہ بات تو تبلیغ والوں کے اصول کے خلاف ہے کہ دین کا کام اس وجہ سے نہ ہو کہ پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکا، تبلیغ والوں کا اصول تو یہ ہے کہ دین کے کام کے لئے اگر ضرورت ہو تو اللہ کے بھروسہ پر قرض لے لیا جائے، مجھے بھی ضرورت ہوتی ہے تو دوستوں سے قرض لے لیتا ہوں۔ تم بھی اپنی ضرورتوں کے لئے قرض لیتے ہو گے۔ پانچ سو روپے کا میں انتظام کروں اور پانچ سو کا تم انتظام کرو اور بھی انشاء اللہ انتظام ہو جائے گا۔ اگر تمہاری رائے ہو تو میں بھائی سلیم کو مکہ مکرمہ خط لکھ دوں کہ وہ علی میاں کو رقم دے دیں، یہاں سے ادا کر دی جائے گی۔ اور تم لکھنو پہنچ کر ڈاکٹر صاحب سے علی میاں کو تار دلوادو کہ وہ ابھی آنے کا ارادہ نہ کریں، خط کا انتظار کریں اور ان کو خط لکھ دیا جائے کہ انشاء اللہ انتظام ہو جائے گا وہ سفر کا پروگرام بنالیں۔

میں اسی دن سہارنپور سے روانہ ہو کر لکھنو آ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوری بات عرض کی اور حضرت شیخ کا پیغام پہنچایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی دن تار دلوادیا اور خط بھی لکھ دیا گیا۔

اس کے بعد جو ہوا اس سے اللہ کی قدرت، اس کے غیبی نظام اور اہل یقین و توکل کی فکر و دعا کے اثر کا بڑا غیر معمولی اور میرے لئے خارق عادت تجربہ ہوا۔ صرف ایک دو دن کے اندر تقریباً پندرہ سو روپے کا انتظام اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے کرایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ’میسر زقہ میںن معیث لا یحتسب و من‘

(۱) بھائی سلیم سے مراد ہیں مولانا محمد سلیم صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ۔

(۲) ڈاکٹر صاحب سے مراد ہیں مولانا علی میاں صاحب کے برادرِ معظم اور سرپرست مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

یو کل علی اللہ فہو حسبہ“ کی واقعاتی تفسیر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ بہر حال میں نے اس کو حضرت شیخ کی توجہ الی اللہ اور دعائی کا نتیجہ سمجھا۔ اس کے بعد میں نے جلدی ہی سہارنپور کا سفر کیا اور حضرت شیخ کی خدمت میں یہ رقم پہنچائی پھر حضرت رائے پوری قدس سرہ کی زیارت و ملاقات کے لئے رائے پور حاضر ہوا۔ حضرت نے مولانا علی میاں کے بارے میں دریافت فرمایا تو میں نے مولانا کے آخری خط کا اور اسی کے بعد جو کچھ اب تک ہوا تھا اس سب کا تذکرہ کیا، حضرت کو بڑی خوشی ہوئی اور اسی وقت بھائی راؤ فضل الرحمن سے فرمایا۔ (جو حاضر خدمت تھے) کہ ہم نے تمہارے پاس نو سو روپے امانت رکھوائے تھے، میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ ان کو دے دیجو، وہ علی میاں کو بھیجنے ہی کی نیت سے رکھوائے تھے۔ بھائی فضل الرحمن صاحب نے سو روپے اپنی طرف سے شامل کر کے پورے ایک ہزار کی رقم میرے حوالہ کی وہ بھی میں نے سہارنپور آ کر شیخ کی خدمت میں پیش کر دی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے جب اللہ تعالیٰ کی اس غیبی مدد کا واقعہ حضرت رائے پوری کو سنایا تھا، تو میرے لہجہ میں خوشی کے ساتھ تعجب اور حیرت کی بھی آمیزش تھی، حضرت نے اسے محسوس فرمایا تھا اور ایک خاص انداز میں فرمایا تھا ”اچھا تو کیا یہ تجربہ آپ کو پہلی بار ہوا ہے؟“

اس کے بعد ہی مولانا علی میاں نے مصر، سوڈان، شام اور اردن کا سفر فرمایا۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، اس سفر میں مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب بھی مولانا کے ساتھ تھے۔

غالباً ۱۳۶۲ء کے اواخر میں اس عاجز راقم سطور نے ارادہ کیا کہ اپنی مرحومہ اہلیہ کو ساتھ لے کر سہارنپور کا سفر کروں، مجھے معلوم تھا کہ حضرت شیخ کی اہلیہ مکرمہ اور صاحبزادیاں پوری شرعی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں۔ اور دینی حیثیت سے اس گھرانہ کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ میں نے چاہا کہ اہلیہ کا چند روز حضرت شیخ کے گھر پر قیام رہے تاکہ وہ صحیح دینی زندگی کا نقشہ آنکھوں سے دیکھیں اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔ میں نے حضرت شیخ کو خط لکھ کر اجازت طلب کی، حضرت کی اجازت آ جانے کے بعد یہ سفر ہوا۔ چند روز اہلیہ کا قیام حضرت کے یہاں رہا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور بعد میں مجھ کو بتلایا اس میں سے چند باتیں جو یاد رہ گئی ہیں، نذر ناظرین کرام ہیں۔

- (۱) کوئی عزیز قریب بھی زنان خانہ میں نہیں آتے۔
- (۲) کوئی داماد اگر اپنی اہلیہ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں تو دروازہ ہی پر ان کو بلا کر بات کر

لیتے ہیں۔

(۳) غیر معمولی تعجب کے ساتھ انہوں نے ذکر کیا کہ جو کھانا ہم اپنے گھر گھنٹوں میں پکاتے ہیں، وہ حضرت شیخ کے یہاں منٹوں میں تیار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے ذکر کیا کہ ایک دن جب کہ کھانے کے وقت میں قریباً صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا، حضرت شیخ نے بالا خانہ کے اپنے کمرے سے اطلاع دی کہ فلاں مہمان آگئے ہیں، ان کے لئے کچھ اہتمام کر لو، تو صرف آدھ گھنٹہ میں یا اس سے بھی کم وقت میں صاحبزادیوں نے پلاؤ تیار کر لیا اور ایک دو طرح کے سالن بھی۔ میں حیرت سے دیکھتی رہی وہ پتیلی چولہے پر رکھتی تھیں اور جو کچھ پکانا ہوتا تھا اس میں ڈال دیتی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد اتار لیتی تھیں اور کھانا تیار ہوتا تھا۔

اس سفر کی ایک خاص قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس سفر کا پروگرام میں نے اس طرح بنایا تھا کہ چند روز سہارنپور حضرت شیخ کے ہاں قیام کر کے ہم دونوں دہلی تبلیغی مرکز نظام الدین جائیں گے اور چند روز مرکز میں بھی میرا اور اہلیہ کا قیام رہے گا۔ چنانچہ سہارنپور سے ہم نے دہلی کا سفر کیا۔ وہاں بھی زنان خانہ کا نقشہ غیر معمولی تھا۔ اماں جی (حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ مرحومہ) حیات تھیں، جو زیادہ تر عبادت اور ذکر و تلاوت ہی میں مصروف رہتی تھیں۔ حضرت شیخ الحدیث کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت مولانا محمد یوسف کی اہلیہ محترمہ مرحومہ دق کی مریض تھیں، ضعف انتہائی درجہ کو پہنچ چکا تھا، اس کے باوجود صرف نمازی کا اہتمام نہیں تھا بلکہ اکثر کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔ ان کا حال دیکھ کر اہلیہ نے بتلایا کہ حیرت ہوتی تھی۔ بالآخر کافی عرصہ کے بعد اسی مرض میں نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں انتقال فرمایا۔ (راقم سطور ان کی اس علالت کے بارہ میں اپنے اس مضمون میں لکھ چکا ہے جو حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان سے متعلق الفرقان کی خاص اشاعت میں شائع ہوا تھا اور بعد میں الفرقان کی وہ خاص اشاعت کچھ اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں تذکرہ حضرت مولانا یوسفؒ کے نام سے شائع ہوئی۔)

سہارنپور اور دہلی کے اس سفر کے بارہ میں یہ بات بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جب میں سہارنپور سے حضرت شیخ سے رخصت ہو کر دہلی جانے لگا تو حضرت نے ہدیہ کے طور پر مجھے رقم عنایت فرمائی، جس کی مقدار اب یاد نہیں لیکن اتنی بات حافظہ میں ہے کہ وہ اس پورے سفر کے مصارف کے برابر تھی۔



حدیث شریف میں ہے ”مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ“ (جو بندہ اللہ پر

اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کا یہ حال ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرنے (اس حدیث پاک پر عمل کا اہتمام جیسا حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں دیکھا دوسری کسی جگہ کہیں دیکھنا یا نہیں۔ جب سے حضرت سے خاص تعارف اور تعلق ہوا اور آمد و رفت شروع ہوئی، کبھی نہیں دیکھا کہ دسترخوان پر دو چار بیرونی مہمان نہ ہوں، ان کے لئے کھانے کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ اگر معلوم ہوتا کہ فلاں مہمان کو فلاں چیز مرغوب ہے تو اس کے لئے اس کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا۔ میرے متعلق حضرت کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے ٹٹھے سے رغبت ہے۔ تو جب حاضر ہوتا میرے لئے خاص طور سے ٹٹھے کا اہتمام ہوتا، کبھی بازار سے بہترین قسم کی مٹھائی منگوائی جاتی۔ مجھے بڑی ندامت ہوتی اور دل پر بہت بوجھ پڑتا! لیکن معلوم تھا کہ حضرت شیخ کو اسی سے خوشی ہوتی ہے اس لئے تکلف کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

ایک زمانے میں ایک طبیب صاحب کے مشورہ کی بنا پر میں کھانے کے بعد قریباً دو تو لے کر کھاتا تھا۔ حضرت شیخ کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تھا تو پھر جب حاضر ہوتا تو پھر کھانے میں میرے لئے لازمی طور پر گھر میں سے گڑ بھی آتا اور اُس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا دیسی کھی بھی۔

ایک دفعہ جب کہ حضرت شیخ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا وہاں حاضری ہوئی۔ مدینہ طیبہ کے پورے زمانہ قیام میں حضرت کا معمول رہتا تھا کہ صرف رات کو عشاء کے بعد کھانا تناول فرماتے تھے، دن میں کچھ نہیں، غالباً اس کی وجہ سے یہ بھی تھی کہ وہاں کے زمانہ قیام میں روزہ رکھنے کا زیادہ معمول تھا۔ بہر حال ایک دفعہ میں مدینہ منورہ ایسے زمانہ میں حاضر ہوا جب حضرت شیخ کا وہاں قیام تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ جب تک یہاں قیام ہے رات کا کھانا تمہیں میرے ہی ساتھ کھانا ہوگا، دن میں تمہیں اختیار ہے۔ میں رات کو بعد عشاء حسب الحکم کھانے کے وقت حاضر ہوا۔ ایک خادم خاص کو بلا کر فرمایا دیکھو پاکستان کے ایک صاحب ہدیہ میں گڑ دے گئے تھے وہ میں نے رکھوا دیا تھا۔ میرا نام لے کر فرمایا کہ یہ آگئے، میں نے انہی کی نیت سے رکھوا دیا تھا۔ چنانچہ وہ پاکستانی گڑ آیا اور جب تک مدینہ منورہ اس عاجز کا قیام رہا، کھانے میں روزانہ میرے لئے گڑ بھی آتا رہا۔



سہارنپور کے زمانہ قیام میں کھانے کے معاملہ میں مدینہ منورہ کے قیام کے برعکس حضرت کا عمومی معمول یہ رہتا تھا کہ صرف دن کو مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، رات کو کھانے کا معمول نہیں تھا، کبھی کوئی غیر معمولی اہمیت والے مہمان ہوتے تو ان کے اکرام میں رات کے دسترخوان پر بھی ان کے ساتھ بیٹھ

جاتے اور اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر کرتے کہ وہ بھی کھانے میں شریک ہیں۔ اب سے قریباً چالیس سال پہلے جب حضرت شیخ کی خدمت میں عقیدہ مندانہ اور نیاز مندانہ حاضری کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو ان کے دسترخوان پر مہمانوں اور روزمرہ ساتھ کھانے والوں کی تعداد جہاں تک اب یاد ہے بیس کے لگ بھگ ہوتی تھی، اس کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہا، آخری سالوں میں کبھی کبھی مہمانوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ حضرت کے خاص خادم (بلکہ کہنا چاہئے کہ مدارالمہام) مولوی نصیر الدین صاحب مرحوم و مغفور سب کے کھانے کھلانے کا انتظام کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا۔ دسترخوان پر ایک تو گوشت کا عام سالن ہوتا تھا، جو بالکل سادہ اور پتلا شوربہ ہونے کے باوجود بہت لذیذ ہوتا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ کوئی دال بھی ہوتی تھی، یہ دونوں چیزیں سب کے سامنے ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ خاص مہمانوں کے لئے (جن میں ہم جیسے نیاز مند بھی شامل تھے) دو چیزیں لازماً ہوتی تھیں۔ ایک بہت عمدہ قسم کا پلاؤ، اور ایک خاص طریقہ پر پکا ہوا گوشت جس کو وہاں کی خاص اصطلاح میں ”زقیہ“ کہا جاتا ہے (اُس کو ایک قسم کا اسٹو سمجھنا چاہئے) یہ نہایت ہی لذیذ ہوتا تھا (حضرت شیخ کے دسترخوان کے علاوہ کہیں ایسا لذیذ کھانا یا نہیں)۔ یہ دونوں چیزیں اکثر خاص مہمانوں ہی کے لئے ہوتی تھیں، ضروری نہیں تھا کہ سب مہمانوں کے سامنے رکھی جائیں۔ اس طرز عمل کے سلسلہ میں شیخ کبھی کبھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا وہ واقعہ بھی بیان فرماتے جو حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ: ام المومنین کے ہاں ایک سائل آیا جو کھانے کا طالب تھا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے لئے بھیج دیا، پھر ایک اور شخص آیا جو اپنی بیٹ اور لباس وغیرہ سے شریف آدمی معلوم ہوتا تھا، لیکن کھانے کا طالب اور ضرورت مند تھا، تو ام المومنین نے اس کے لئے پورا کھانا بھیجا اور اس کو بٹھا کر کھانا کھلوا دیا۔ اس پر کسی صاحب نے اس تفریق طرز عمل کے بارے میں حضرت ام المومنین سے سوال کیا، تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ہدایت فرمائی ہے کہ ”ان نازل الناس منازلہم“ (یعنی یہ کہ ہم آدمیوں کے ساتھ ان کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق معاملہ کیا کریں۔)

﴿۹﴾

مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ علیل تھے، بسلسلہ علاج سہارنپور میں شاہ مسعود صاحب مرحوم کی کوٹھی ”ہیٹ ہاؤس“ میں حضرت کا قیام تھا، زیارت اور عیادت کے سلسلہ سے روزانہ بڑی تعداد میں مہمان آتے اور جاتے تھے۔ سب مہمانوں کے کھانے کا اہتمام خود حضرت قدس سرہ کی طرف سے تھا۔ اس انتظام

کے ذمہ دار حضرت کے خاص خادم ہمارے لکھنؤ ہی کے قاری شبیر صاحب مرحوم تھے۔ یہ کھانا بالکل سادہ خانقاہی لنگر کا سا ہی ہوتا تھا۔ یہ عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں بھی حضرت قدس سرہ کی زیارت و عیادت کے لئے سہارنپور گئے ہوئے تھے اور بیٹ ہاؤس ہی میں قیام تھا۔ حضرت شیخ نے ہم دونوں کو حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ دوپہر کا کھانا میرے ہی ساتھ کھایا کرو، ہم ایسا ہی کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ہمارے لکھنؤ کے ایک رئیس جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بڑے دیندار اور صاحب خیر بھی تھے اور ہم دونوں سے بھی ان کا خاص تعلق تھا غالباً حضرت رائے پوری قدس سرہ اور حضرت شیخ کی بھی زیارت و ملاقات ہی کے مقصد سے سہارنپور تشریف لائے، حضرت شیخ نے ان سے بھی فرمادیا کہ دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھالیں اور کھانے کا وقت بھی بتا دیا۔ وہ مقررہ وقت پر شیخ کے ہاں تشریف لے آئے، ہم دونوں بھی موجود تھے، حسب معمول دسترخوان بچھا، حضرت شیخ نے لکھنؤ کے ان صاحب کو بھی ہم دونوں کے ساتھ ہی بٹھایا۔ اب کھانا آنا شروع ہوا، معمول کے مطابق پلاؤ اور زیتہ بھی آیا (غالباً اس دن اور بھی کئی قسم کے سالن تھے) ان صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس امید پر آیا تھا کہ بزرگوں کے دسترخوان پر جو کی روٹی چٹنی یا دال ملے گی۔ حضرت شیخ نے فرمایا یہاں تو اللہ تعالیٰ ہی کھلاتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر یہاں کھاؤ، اللہ کے فضل سے وہ نمونہ بھی موجود ہے، شام کو بیٹ ہاؤس میں مہمانوں کے ساتھ کھا لچو۔ ہم دونوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ دونوں بھی شام کو وہیں ہوں گے۔

﴿۱۰﴾

ان ہی دنوں میں جب حضرت قدس سرہ کا قیام بسلسلہ علاج سہارنپور بیٹ ہاؤس میں تھا اور راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں بھی وہاں مقیم تھے، ایک دن اس عاجز نے حضرت سے اجازت لے کر مہمانوں کی ضیافت کا ارادہ کیا، لنگر خانہ کے منتظم اور مہتمم قاری شبیر صاحب مرحوم سے کہہ دیا کہ جہاں تک ہو سکے مہمانوں کے لئے اچھا کھانا تیار کرانے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ قاری صاحب کی قبر پر بے حساب رحمتیں نازل فرمائے انہوں نے اس دن بہت اچھا کھانا تیار کرایا۔ ان دنوں حضرت شیخ کا مستقل معمول تھا کہ بخاری شریف کا سبق پڑھا کر بیٹ ہاؤس تشریف لے آتے اور اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے کا جو وقت مقرر تھا اس سے پہلے واپس تشریف لے جاتے اور ان کے ساتھ کھانا تناول فرماتے۔ اس دن حضرت شیخ جب بیٹ ہاؤس تشریف لائے تو کسی نے اس کا ذکر کر دیا کہ آج یہاں کے مہمانوں کے کھانے

لے لکھنؤ کے مشہور و معروف صاحب خیر رئیس مرحوم و مغفور شیخ مستنصر اللہ صاحب تھے

کی دعوت میری طرف سے ہے۔ میں نے حضرت شیخ سے اس کا ذکر کرنے اور کھانے پر حضرت کو بھی مدعو کرنے کی جرأت اس لئے نہیں کی تھی کہ حضرت کا معمول اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرمانے کا ہے اور حضرت اس کا اہتمام فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی حضرت کو مدعو کرنے سے مانع ہوا کہ حضرت کے کھانے کا (اور ہر کام کا) گھنٹوں، منٹوں کے حساب سے وقت مقرر ہے اور مجھے امید نہیں کہ بیٹھاؤں میں کھانا حضرت شیخ کے مقررہ وقت تک تیار ہو سکے گا۔ لیکن مجھے بڑی ندامت ہوئی جب حضرت شیخ نے خود ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب! میں تمہاری دعوت کھا کے جاؤں گا! چنانچہ حضرت نے کھانا تناول فرمایا اور اُس کے بعد تشریف لے گئے۔

﴿۱۱﴾

قریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم و مغفور، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث تھے، وہ صرف صحیح بخاری صحیح مسلم کا درس دیتے تھے اور یہ دونوں کتابیں دو سال بھی ختم ہوتی تھیں۔ موصوف پر فالج کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے درس کا سلسلہ معطل رہا۔ دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ جب تک شاہ صاحب صحت یاب ہوں اور درس کے لائق ہو سکیں میں دو گھنٹے کے لئے دارالعلوم آ کر یہ دو سبق پڑھا دیا کروں، اس کے لئے مشاہرہ کی بھی پیش کش کی گئی۔ اتفاق سے اس سال ان دونوں کتابوں کی پڑھنے والی جماعت میں بعض ایسے طلبہ بھی تھے جو اس عاجز سے گہرا غلصہ تعلق رکھتے تھے، اور میرے دل میں ان کی قدر تھی، انہوں نے بھی اس کے لئے اصرار کیا اور خود مجھے بھی ان کے تعلیمی نقصان کا احساس تھا۔ میں نے اپنے مستقل ضروری مشاغل اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات سے عرض کیا کہ روزانہ دو گھنٹے تو نہیں دے سکتا، اتنا کر سکتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے لئے آ کر صرف صحیح مسلم کا سبق پڑھا دیا کروں، شاہ صاحب جب صحت یاب ہو جائیں گے تو وہ بخاری شریف پڑھا دیں گے، اس طرح اس جماعت کا تعلیمی نصاب بھی پورا ہو جائے گا۔ میں اس ایک گھنٹہ کا کوئی مشاہرہ اور معاوضہ نہیں لوں گا، البتہ میری آمد و رفت رکشہ سے ہوگی، اس کا کرایہ دارالعلوم کی طرف سے ادا کر دیا جائیگا۔ یہی طے ہو گیا اور میں ایک گھنٹہ کے لئے دارالعلوم آ کر صحیح مسلم کا درس دینے لگا۔ شاہ صاحب کا علاج جاری تھا، امید تھی کہ انشاء اللہ کچھ عرصہ میں شفا یاب ہو کر وہ درس کا سلسلہ جاری کر سکیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ چند مہینے کے بعد مرض کا اختتام اُن کے سفر آخرت پر ہوا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین)

میں جو مسلم شریف پڑھا رہا تھا بفضلہ تعالیٰ تعلیمی سال کے اختتام تک وہ ختم ہو گئی۔

اس کے بعد جب دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا تو دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے پھر مجھ سے کہا گیا کہ اب میں مستقل دو گھنٹے دے دیا کروں اور حدیث کے دوستی پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لوں۔ میں اپنے دوسرے مستقل مشاغل کی وجہ سے اس وقت بھی اپنے کو اس کے لئے آمادہ نہیں کر سکا، میں نے عرض کیا کہ جب تک شاہ صاحب مرحوم کی جگہ کسی استاذ حدیث کا انتظام ہو میں ایک گھنٹہ جس طرح اب تک دیتا رہا ہوں انشاء اللہ دیتا رہوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد بھی روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے دارالعلوم آتا رہا، اور ایک سبق پڑھاتا رہا۔ دو تین سال اسی طرح گزر گئے اور شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم و مغفور کی جگہ کسی استاذ حدیث کا انتظام نہیں ہو سکا تو پھر دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے اصرار کے ساتھ فرمائش کی گئی کہ میں دارالعلوم کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس ذمہ داری کو بہر حال قبول کر لوں اور روزانہ صرف دو گھنٹے کے لئے دارالعلوم آ کر حدیث شریف کے دوستی پڑھا دیا کروں۔ اور اس کے لئے معقول مشاہرہ کی پیش کش بھی کی گئی۔

میں نے اگرچہ طالب علمی سے رسی فراغت کے بعد ۳-۴ سال تک باخواہ مدرس کی حیثیت سے تدریس کی خدمت بھی انجام دی تھی لیکن اس کے بعد کسی مدرسہ سے ملازمت کا تعلق نہیں رکھا۔ طبیعت آزادہ کر ہی حسب توفیق کام کرنے کی عادی ہو گئی اور اسی کو اپنے لئے بہتر سمجھا (بعض تجاربے بھی اس کا سبب بنے تھے) اس وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اس پیش کش کو قبول کرنے پر بھی طبیعت آمادہ ہو گئی۔ دوسری طرف یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ حدیث شریف اور صرف حدیث شریف کی مستقل تدریسی خدمت کا موقع مل رہا ہے، اس سے انشاء اللہ خود مجھے بھی علمی اور دینی نفع ہوگا اور مشاہرہ کی شکل میں دنیوی منفعت بھی ہے، وہ بھی اللہ کی نعمت ہے اور طبیعت کا انکار شاید نفس کے استکبار اور استغنا کی وجہ سے ہے جو باخواہ ملازمت کو اپنے لئے گھٹیا درجہ کی بات سمجھنے لگا ہے، اور اگر ایسا ہے تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کافی غور و فکر کے بعد بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو مشورہ کے لئے سہارنپور حضرت شیخ المہدیث کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری بات عرض کی۔ حضرت نے فرمایا مولوی صاحب ضرور قبول کر لو اور مشاہرہ بھی قبول کر دو اور نیت کر لو کہ چار چھ مہینے وصول کرنے کے بعد چھوڑ دو گے اور پھر بغیر مشاہرہ ہی کے پڑھاؤ گے، یہ بھی فرمایا کہ اگر شروع ہی سے مشاہرہ نہ لو گے تو طلبہ بھی قدر سے تمہاری بات نہیں سنیں گے اور مدرسہ والے سمجھیں گے کہ ہم نے اس پر احسان کیا ہے کہ مدرسہ میں حدیث

حدیث کی سند پر اس کو ٹھادیا ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ شروع میں چند مہینے مشاہرہ ضرور وصول کرو، بعد میں چھوڑ دو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ بات میزے بس کی نہیں ہے۔ میں جب دو گھنٹے پڑھانے کی ذمہ داری لے لوں گا اس کے لئے ۳-۴ گھنٹے تیاری کرنی ہوگی اور پھر میں اپنے وہ کام پوری طرح نہیں کر سکوں گا جو اب کر لیتا ہوں اور اس عالم اسباب میں اُسی سے میری ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس صورت میں وہ کی مشاہرہ سے پوری ہوتی رہے گی، اس لئے پھر یہ مشاہرہ میری ضرورت بن جائے گا اور میں اسے چھوڑ نہیں سکوں گا۔

میزی یہ بات سن کر حضرت شیخ نے میری اصلاح و تربیت کے لئے خود اپنے کچھ واقعات سنائے جن کا سبق یہ تھا کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اخلاص کے ساتھ دین کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے اور ”ومن يتوكل على الله فهو حسبه“ کا کس کس طرح ظہور ہوتا ہے۔ یہ واقعات بہت غیر معمولی قسم کے تھے اور ان میں میرے لئے اور میرے جیسوں کے لئے بڑا قیمتی سبق تھا۔

حضرت شیخ سے یہ ساری گفتگو ان کے ”کچے گھر“ میں تنہائی میں ہوئی، اس کے بعد جب میں حضرت کے پاس سے اٹھ کر قیام گاہ والے کمرے میں آیا تو خیال ہوا کہ حضرت شیخ نے اس وقت اپنے جو واقعات بیان فرمائے ہیں ان کو میں ابھی قلم بند کر لوں اور ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر کے ”الفرقان“ میں شائع کر دیا جائے، امید ہے کہ اللہ کے بندوں کو انشاء اللہ ان سے بہت نفع ہوگا اور وہ ان سے وہ سبق حاصل کر سکیں گے جو اپنی کم بختی کی وجہ سے خود میں حاصل نہیں کر سکا۔ (حدیث شریف میں ہے رُبُّ مُبْلَغٍ أَوْ عُمِ مُنْ سَامِعٍ)۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُس وقت تک میرا حافظہ جہت اچھا تھا میں نے اسی وقت وہ واقعات ممکن حد تک حضرت شیخ ہی کے الفاظ میں قلمبند کر لئے۔ اور لکھنؤ واپس آ کر ایک تمہید کے ساتھ مضمون کی شکل میں مرتب کر کے الفرقان کے لئے ان کی کتابت بھی کرائی۔ اس کے بعد بس طباعت کے لئے پریس کو دینے کا مرحلہ ہی باقی تھا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ حضرت شیخ نے اپنے یہ واقعات میری اصلاح اور میرے مرض کے علاج کے لئے تنہائی میں راز دارانہ طور پر بیان فرمائے تھے۔ ممکن ہے ان کی اشاعت حضرت کی ناگواری کا باعث ہو۔ یہ خیال آنے کے بعد میں نے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا اور اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر الفرقان میں ان کی اشاعت کی اجازت چاہی۔ جواب میں حضرت کا مفصل گرامی نامہ آیا جس میں سختی سے منع فرمایا گیا تھا۔ وہ میرے لئے خود اپنے باطن کو دیکھنے کا آئینہ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ جو سبق اس سے ملا وہ ہمیشہ یاد رہے۔

آج بڑے ہی رنج و قلق کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میری بہت بری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے اکابر کے مکاتیب گرامی بھی محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا، نہایت ہی افسوس ہے کہ حضرت شیخ کا یہ مکتوب گرامی بھی محفوظ نہیں رکھا۔ اگر محفوظ ہوتا تو بلفظ نقل کیا جاتا اب اپنی یادداشت سے اس کا مضمون اور حاصل ہی نذر ناظرین کر رہا ہوں۔

(حضرت شیخ نے اس عاجز راقم سطور کو مخاطب کر کے جو کچھ تحریر فرمایا تھا، جہاں تک یاد ہے اس کا حاصل یہ تھا کہ)

”تمہارا میرے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی تو گمان ہوگا کہ میں بفضل اللہ تعالیٰ معاصی

حیوانیہ سے محفوظ ہوں، لیکن تم یہ اندازہ کیسے کر سکتے ہو کہ میں معاصی شیطانیہ سے بھی محفوظ ہوں،

معاصی شیطانیہ کبر، اور ادا و حسد وغیرہ باطنی کیا کر ہیں، اور یہ معاصی حیوانیہ زنا اور چوری وغیرہ سے

بھی اشد ہیں۔ میرے والد ماجد (حضرت مولانا محمد نجی صاحبؒ) فرمایا کرتے تھے کہ اس

کی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ جس بندہ نے صدق دل سے کلمہ اسلام پڑھ لیا (یعنی دل سے ایمان لے آیا) وہ

جنت میں ضرور جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ ”و ان زنی“ و ان

سرق“ (اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو) حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اگرچہ اس نے

زنا اور چوری کا گناہ کیا ہو پھر بھی وہ بخش دیا جائے گا۔ اور (بالآخر) جنت میں چلا جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس کے بعد بھی تعجب سے اپنا سوال دہرایا۔ حضورؐ نے پھر وہی جواب

ارشاد فرمایا پھر حضرت ابوذر کے تیسری دفعہ سوال کرنے پر بھی وہی جواب ارشاد فرمایا اور مزید

تاکید کے طور پر ارشاد فرمایا، ”و ان رغم انف ابی ذر“۔ تو زنا اور چوری جو معاصی حیوانیہ میں

سے ہیں ان کے بارے میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا اور کبر جو معاصی شیطانیہ

میں سے ہے اس کے بارے میں صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ جس شخص

کے دل میں رائی کے دانے کے برابر اور ذرہ برابر بھی کبر ہوگا وہ ہرگز جنت میں نہ جاسکے گا۔

حضرت شیخ نے آخر میں تحریر فرمایا تھا کہ میں اپنا حال جانتا ہوں، اپنے کو میں معاصی

شیطانیہ سے محفوظ نہیں سمجھتا، ایسی حالت میں میرے متعلق ہرگز وہ باتیں شائع نہ کی جائیں جو تم

شائع کرنا چاہتے ہو۔ میں بھی دعا کرتا ہوں تم بھی دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے معاصی سے

۱۔ شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ جس شخص کے دل میں کبر ہوگا وہ کبر کی سزا پائے بغیر جنت میں نہ جاسکے گا۔ واللہ اعلم

پاک فرمادے۔

حضرت شیخ کا یہ مکتوب گرامی خاصا طویل اور مفصل تھا، یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا وہ صرف اس کا وہ حاصل اور خلاصہ ہے جو یاد رہ گیا ہے۔

یہاں راقم سطور اللہ تعالیٰ کے اس انعام اور حضرت شیخ کے اس احسان کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہے کہ اس مکتوب گرامی کے مطالعہ سے اپنی حقیقت معلوم ہو گئی، اپنے اندر کے وہ شیطانی معاصی گویا آنکھوں کے سامنے آ گئے جن سے غفلت تھی اور ان کے بارے میں فکر نصیب ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجا ہے کہ جن ظاہری و باطنی اور حیوانی و شیطانی معاصی میں اب تک مبتلا رہا ان کو اپنے کرم سے معاف فرمادے اور اپنی خاص رحمت سے ظاہر و باطن کو پاک فرمادے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ.

☆☆☆

اللہ کا ایک بندہ

حضرت حاجی عبدالغفور جودھپوریؒ

۲۵-۲۶ سال پہلے کی بات ہے سلمہ الفرقان کی عمر کا غالباً دوسرا سال تھا، ریاست جودھپور کے بعض حضرات کی دعوت پر وہاں میرا جانا ہوا، اس وقت ان داعیوں سے اس ناچیز کا تعلق بس اتنا ہی تھا کہ وہ الفرقان کے خریدار اور اس کے قدر دان تھے اور ہمارے علمی اور دینی اکابر خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانوی (نور اللہ مرقدہ) سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

جہاں تک یاد ہے جودھپور میں میرے خاص داعی حکیم محمد صدیق صاحب غوری تھے، خط کتابت سنے میں انہی کو جانتا تھا، انہی کے مکان پر میرا قیام ہوا تھا۔ اسی قیام کے دوران حکیم صاحب موصوف کے والد ماجد حضرت حاجی عبدالغفور صاحب مدظلہ سے واقفیت ہوئی، اس وقت وہ ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے اور اپنے کام میں کافی مشغول رہتے تھے۔ دو ہی چار دن کے اس قیام میں اُن کی جو باتیں سنیں اور زندگی کا جو طرز دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ اللہ کا یہ بندہ اگرچہ بقول خود ”بے پڑھا“ ہے، اردو کی بس کچھ مُد بد ہے، ایک خط بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا ہے، لیکن دین کا فہم سیکڑوں پڑھے لکھوں بلکہ بہت سے فارغ التحصیل عالموں سے بھی اچھا ہے اور عملی زندگی بھی ہم جیسوں کے لئے بڑی سبق آموز ہے۔ بہر حال جودھپور کے اس پہلے سفر ہی میں حضرت حاجی صاحب سے میں واقف ہوا، لیکن یہ واقفیت بہت سرسری اور بالکل اجمالی تھی۔ اس کے ایک دو سال بعد پھر ایک دفعہ جودھپور جانا ہوا، حضرت حاجی صاحب ہی کے دولت کدہ پر اس مرتبہ بھی دو تین دن قیام رہا اور حضرت موصوف سے عقیدت اور تاثر میں اور کچھ اضافہ ہوا۔

۱۔ ملحوظ رہے کہ حضرت حاجی عبدالغفور سے متعلق یہ مقالہ ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ میں لکھا گیا تھا۔

پھر اب سے کوئی دوڑھائی برس پہلے حضرت حاجی صاحب ہی کے ارشاد پر چند ہی مہینوں کے فاصلہ سے پی پاڑ اور جو دھور کے دو سفر ہوئے، جن میں سے ایک میں رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی بھی ساتھ تھے، ان دونوں سفروں میں قریباً ایک ایک ہفتہ حضرت حاجی صاحب کا برابر ساتھ رہا اور یہ اندازہ ہوا کہ حضرت موصوف کے بارے میں جو کچھ ۲۰ برس پہلے جانا اور سمجھا تھا وہ اصلیت کے لحاظ سے بہت کم تھا، ان دونوں سفروں میں میں سوالات کر کے زندگی کے واقعات اور حالات حضرت حاجی سے پوچھتا بھی رہا اور وہ بڑی شفقت اور بڑے نشاط کے ساتھ بیان فرماتے رہے، کچھ عرصہ کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ چیزیں کم از کم اپنی ہی تذکیر کے لئے قلم بند کر لینی چاہئیں، چنانچہ کاغذ کے ایک ورق پر مختصر اشاروں میں حافظہ کی مدد سے وہ چیزیں نوٹ کر لیں۔ پھر حضرت حاجی صاحب ازراہ شفقت و عنایت دوبار لکھنؤ بھی تشریف لائے اور دونوں دفعہ قریباً ایک ایک ہفتہ قیام فرمایا، آخری تشریف آوری اسی مہینہ ذیقعدہ (مطابق مئی ۱۹۶۰ء) میں ہوئی تھی، حضرت موصوف کے جو حالات میں نے پہلے حافظہ سے نوٹ کئے تھے اس دفعہ میں نے ایک صحبت میں سوالات کر کے ان کے بارے میں مزید اطمینان حاصل کیا اور کچھ اضافہ بھی ہوا۔

غور و فکر کے بعد میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ ان حالات کو ترتیب دے کر اللہ کے بندوں کی سبق آموزی اور نصیحت پذیری کے لئے شائع کر دیا جائے۔ میں اپنے اس عمل سے اللہ کے بندوں کے دینی نفع کی ادراپنے لئے اجر اخروی کی قوی امید رکھتا ہوں۔

یہ حضرت موصوف کی کوئی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ زندگی کے جستہ جستہ کچھ حالات اور واقعات ہیں جو مختلف صحبتوں میں سنے گئے تھے اور کچھ اپنے مشاہدات اور تاثرات ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصر لفظوں میں ناظرین سے حضرت حاجی صاحب کا کچھ تعارف کرا دیا جائے۔

حضرت حاجی صاحب کی عمر اس وقت ۸۱ سال ہے، خاص شہر جو دھور کے ایک نہایت غریب تیلی گھرانے میں پیدا ہوئے، جس میں دین یا علم دین کا کوئی ذکر بھی نہ تھا، ایسے غریب اور پست گھرانوں کے بچے جس طرح پلتے بڑھتے ہیں اسی طرح حاجی صاحب بھی پلے بڑھے۔ جب مزدوری کے قابل ہوئے مزدوری کرنے لگے، اسی زمانہ میں اللہ کی توفیق سے کچھ دینی باتیں کان میں پڑیں اور دین سے لگاؤ پیدا ہوا، اب دین و دنیا کی دنوں تر قیاں ساتھ ساتھ شروع ہوئیں۔ مزدوری کرتے کرتے ٹھیکداری تک پہنچے

۱۔ پی پاڑ جو دھور کا گویا ایک قصبہ ہے۔ دہلی یا آگرہ سے جو دھور پور جاتے ہوئے قریباً ۲۰ میل پہلے پڑتا ہے۔

اور اس لائن میں اللہ نے ایسا کامیاب اور نیک نام کیا کہ لوگ اپنی بلذلتیں بنوانے کے لئے ان کی فرصت اور فراغت کا انتظار کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے کمائی میں ایسی برکت دی کہ لاکھوں کمائے اور بے دریغ مصارف خیر میں صرف بھی کرتے رہے آخر میں شہر کے ایک مناسب مقام پر ایک بڑا پلاٹ خرید کے قلعہ نما گویا ایک چھوٹا سا محلہ بنایا جو اشرف منزل کے نام سے موسوم ہے جس میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ کے علاوہ ۷ امکانات اور چند دوکانیں۔ پھر اس سب کو ٹھکانے لگا کے (جس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی) ایسے بے نوا ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

دینی ترقی کرتے ہوئے اس مقام پر پہونچے کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مجازِ تلقین بنایا، لکھنے پڑھنے میں حال یہ ہے کہ اردو پڑھ لیتے اور سمجھ لیتے ہیں، لیکن غالباً خط نہیں لکھ سکتے ہیں، تعلیم کی اس کمی کی وجہ سے تلفظ بھی پورا صحیح نہیں ہے، لیکن دینی فہم جس کو قرآن مجید میں ”حکمت“ کہا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُس سے ایسا دافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ بعض باتیں سن کے ہم جیسے کتاب خوانوں کو حیرت ہوتی ہے۔ اپنے مرشد علیہ الرحمہ سے بے انتہا تعلق ہے، لیکن غلو کا نام و نشان نہیں۔ دعا ان کا ہر وقت کا وظیفہ اور حال ہے، سنت و شریعت کا اتباع گویا ان کا مزاج بن گیا ہے، دیکھنے میں ایسے سادے اور لباس اتنا معمولی کہ اگر کوئی ناواقف ان کو ”اشرف منزل“ کے بڑے دروازے کے پاس بیٹھا دیکھے، جہاں وہ کبھی کبھی بیٹھتے ہیں، تو زیادہ سے زیادہ ان کو وہاں کا دربان سمجھے۔ اور اگر کوئی ان کو اشرف منزل کی مسجد میں دیکھے جس کا چھوٹا سا ایک حجرہ ان کی اب قیام گاہ ہے تو مسجد کا خادم اور جاروب کش تصور کرے۔ لباس کے علاوہ بھی ان کے کسی ڈھنگ سے کوئی آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دنیا دین کسی لحاظ سے بھی یہ شخص کوئی بڑا آدمی ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد میں مدوح کے وہ حالات لکھتا ہوں، جو میں نے مختلف صحبتوں میں سُن سُن کے نوٹ کئے تھے یا ذاتی مشاہدہ سے مجھے معلوم ہوئے ہیں۔

جو حالات حضرت مدوح سے سنے ہوئے ہیں میں کوشش کروں گا کہ حضرت کے جو الفاظ یاد ہیں حتیٰ الوسع ان ہی الفاظ میں قلمبند کروں۔

بچپن

ناچیز راقم سطور کے ایک سوال کے جواب میں حضرت حاجی صاحب نے اپنے بچپن کا حال بیان فرماتے ہوئے بتلایا۔

گھر میں گھانی کا (یعنی کولہو سے تیل نکالنے کا) کام ہوتا تھا، چونکہ غربت بہت تھی اس لئے جب میں

کلبہو کے تیل کے پیچھے چلنے کے لائق ہوا، اسی وقت سے گھر کے اس کام میں لگ گیا۔ جب کچھ اور بڑا ہوا تو گوبر بینے کا کام بھی کرنے لگا، دادی میرے سر پر ٹوکری رکھ دیتی تھیں اور میں چرائی کے لئے جنگل جانے والے جانوروں کے پیچھے پیچھے اُن کا گوبر بینے کے لئے چلا جاتا تھا، جب وہ ٹوکری بھر جاتی تو میں گھر واپس آ جاتا، اور دادی کے ساتھ اُپلے بھی پاتھتا۔

بچپن میں مجھے سیپارہ پڑھنے کے لئے ایک مکتب میں بٹھایا گیا تھا، بس عم یتساء لون کی چند سورتیں پڑھی تھیں کہ پڑھانے والے صاحب نے ایک دن اتنا مارا کہ میرا پاجامہ خراب ہو گیا، گھر آیا، دادی نے نہلایا دھلایا اور بس اسی پر پڑھائی ختم ہو گئی۔

یتی

میری عمر کا گیارہواں سال تھا کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے گھر میں دو پیسے بھی نہیں چھوڑے بلکہ کچھ قرض چھوڑا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ہی ادا کرایا۔

مزدوری کا آغاز

چونکہ گھر کے کام گھانی میں پورا نہیں پڑتا تھا، بڑی تنگی سے گزارہ ہوتا تھا اس لئے جب میں باہر نکل کے مزدوری کرنے کے لائق ہوا تو مکانوں کی تعمیر میں مزدوری کرنے لگا، مجھے یاد ہے کہ پانچ پیسے یومیہ مجھے ملا کرتے تھے۔

دین سے لگاؤ کا آغاز

شہر میں کچھ اہل حدیث حضرات تھے ان میں بعض بڑے نیک اور صالح تھے، اُن کے ہاں مزدوری کرنے کا اتفاق ہوا، ان کی دینی باتیں سُن کے دین سے لگاؤ پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے وہ برابر بڑھتا رہا، شہر میں ایک دو صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور تھانہ بھون کے کچھ باشندے بھی ریاست میں ملازم تھے، دینی رجحان پیدا ہونے کے بعد ان حضرات سے بھی رابطہ قائم ہو گیا۔

میں ان دنوں میں مزدوری سے پیسے بچا بچا کے ان حضرات کے مشورے سے دینی کتابیں منگواتا تھا اور پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ اس اثناء میں میں نے خود بھی اُردو کی کچھ شد بد حاصل کر لی اور مناسبت کی وجہ سے چند ہی روز میں دینی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ دیانت دی تھی اور ذہانت بھی اس لئے مزدوری کی لائن میں بھی برابر ترقی کرتا رہا اور بات یہاں تک پہنچی کہ عمارتی کاموں والے خود مجھے تلاش کرنے لگے اور مزدوری کے ساتھ اپنے کاموں کی نگرانی کا کام بھی مجھ سے لینے لگے، اور اس سے میری آمدنی بھی بڑھ گئی، اس کے علاوہ گھر پر گھانی کا کام بھی کچھ چالور ہا۔

حضرت تھانویؒ کی زیارت اور بیعت

حضرتؒ کی کتابوں کے ذریعہ اور تھانہ بھون کے حضرات سے حالات سُن سُن کے حضرتؒ سے عقیدت ہو چکی تھی، ایک دفعہ سنا کہ فلاں دن حضرت پی پاڑ تشریف لارہے ہیں، وہاں وعظ بھی ہوگا۔ میں زیارت اور وعظ سننے کے شوق میں پیدل چل کے پی پاڑ پہنچا، حضرت کی زیارت پہلی بار وہیں ہوئی، وعظ بھی سنا اور الحمد للہ دل پر بہت اثر ہوا۔ موقع پا کر میں نے حضرت کے قریب جا کر عرض کیا میں جو دھوڑ کارہنے والا ہوں، محنت مزدوری کرتا ہوں، حضرت سے بیعت ہونا چاہتا ہوں، حضرت نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اچھا فلاں وقت میرے پاس آ جانا، میں اس وقت حاضر ہوا، حضرت نے میرے کچھ حالات دریافت فرمائے اور بیعت فرمالیا، اور اس کے بعد سے حضرت سے تعلق قائم ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ مناسبت ”مناجات مقبول“ کی دعاؤں سے تھی، اس کے اردو اشعار کا کافی حصہ حفظ ہو گیا تھا، گھانی کرتے ہوئے بھی خوب مزے سے پڑھا کرتا تھا۔ (فرمایا) مجھے تو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔

”تارک الدنیا“ بننے کا غلط شوق اور داعیہ

فرمایا: کچھ عرصہ کے بعد شدت سے یہ داعیہ طبیعت میں پیدا ہوا کہ دنیا اور اس کے سارے بکھیر وں کو چھوڑ چھاڑ کے بس ”فقیر“ بن جائیں۔ بیوی تھی، کئی بچے بھی پیدا ہو چکے تھے، دادی اور ماں بھی موجود تھیں، اس لئے دل میں خود سوال پیدا ہوتا تھا، ان سب کا کیا ہوگا؟ ایک دن یہ جواب دل میں آیا کہ روزی دینے والا اور پرورش کرنے والا تو تھوڑا ہی ہے اللہ تعالیٰ ہے، وہی اب پرورش کر رہا ہے، وہی ان کی روزی کا کوئی انتظام کرے گا، اگر آج تو مر جائے تو کیا ہوگا، یہ بات دل میں جم گئی اور سب کو چھوڑ چھاڑ کے تھانہ بھون بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔

ایک دن سحر کے وقت گھانی کرتے کرتے (یعنی کولہو چلاتے چلاتے) سب کو سوتا چھوڑ کے بس ایک چادر اور ایک دو کتابیں ساتھ میں لے کے چل دیا، گھر میں چالیس روپے رکھے تھے، کرایہ وغیرہ کے لئے ان میں سے بس ۷ یا ۸ روپے لئے، اور دلی کا راستہ لیا، اس خیال سے کہ جو دھوڑ میں اگر کسی نے ریل پر سوار ہوتا

دیکھ لیا تو گھروالوں کو پتہ چل جائے گا اور تعاقب کیا جائے گا، ۴۰ میل پیدل چل کر پی پاڑ سے ریل میں بیٹھا، یاد ہے کہ دہلی تک راستہ میں (گویا ۲۴ گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ میں) بس ایک پیسہ کی مولی خرید کے کھائی تھی۔ دہلی پہنچ کر رات کو پہاڑ گنج میں ٹھہرا، صبح کو شاہدرہ آیا، جہاں سے تھانہ بھون کوٹرین چلتی تھی، معلوم ہوا کہ اب شام کوٹرین ملے گی، دن گزارنے کے لئے وہاں ایک مسجد میں پڑ گیا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی 'کلیات امدادیہ' جو ساتھ میں تھی اُسی کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس میں ایک "تارک الدنیا" درویش کا یہ قصہ پڑھا کہ میرے ہی جیسے کسی صاحب کو "ترک دنیا" کا شوق ہوا، پیاری بیوی کو طلاق دے کے اور بچوں کو چھوڑ کے نکل گئے اور درویشی اختیار کر لی، بیوی نے مجبور ہو کر کہیں نکاح کر لیا، عرصہ کے بعد یہ درویش صاحب کہیں گھومتے پھرتے اس کے گھر کی طرف سے نکلے اور اپنی کسی ضرورت سے گھر پر صدادی، گھر والی (جو ان کی مطلقہ بیوی تھی) نکلی، انہوں نے تو اُس کو نہیں پہچانا لیکن اس نے ان کو پہچان لیا اور کہا میاں صاحب یہیں ٹھہر جاؤ آرام کر لو، انہوں نے قبول کر لیا اور اپنی جھولی وہیں رکھ کے بیٹھ گئے، اس نے ان سے اجازت لے کے ان کی جھولی کھولی، اس میں عام ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں، مثلاً سوئی، دھاگہ، قینچی، نمک مرچ، آٹا، کچھ پیسے۔ اس نے ایک ایک کو پوچھا کہ یہ کیا ہے اور کس لئے ہے یہ میاں صاحب بتاتے رہے کہ یہ یہ ہے اور اس لئے ہے، آخر میں اس نے ایک دھول رسید کی اور کہا کہ بس دنیا میرا ہی نام تھا اور یہ سب جو جھولی میں لئے پھرتے ہو یہ دنیا نہیں ہے۔ (حاجی صاحب نے فرمایا) یہ قصہ پڑھ کے عقل کام کرنے لگی۔ پھر یہ بھی سوچا کہ جب کل کو تھانہ بھون پہنچوں گا تو سب سے پہلا سوال وہاں یہ ہوگا کہ کیوں آئے ہو؟ اور اگر گھر سے کوئی تار وار پہنچا تو یہ بھی ممکن ہے کہ خوب ڈانٹ پڑے اور کل ہی واپسی کا حکم ہو۔ بس یہ سوچ سمجھ کے واپسی کا فیصلہ کر لیا اور وہیں سے سیدھے جو دھوپور چلے آئے۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ بیوی نے تین دن سے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ بس رونا ہے اور اللہ سے دعا ہے، اس وقت اندازہ ہوا کہ سب اس کی دعاؤں کا کرشمہ تھا۔

بھی کی شادی میں رسوم سے انکار اور

اس کی بنا پر مقاطعہ اور برادری سے اخراج

فرمایا۔ میری بڑی بیٹی زینت کا رشتہ ایک جگہ ملے ہو گیا تھا، میں نے اس کے نکاح کا ارادہ کیا، اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ برادری کی رسوں کی پابندی بالکل نہیں کروں گا، بس شریعت و سنت کے مطابق سیدھا سادہ نکاح کروں گا اور بچی کو رخصت کر دوں گا، جو لوگ برادری میں بڑے تھے پہلے ان سے بات چیت کی

تا کہ کوئی ہنگامہ اور ناگواری پیش نہ آئے، انہوں نے کہا کہ ناکاج باجے کے لئے تو ہم تجھے مجبور نہیں کرتے لیکن برادری کی فلاں فلاں رسمیں تو تجھے ضرور ہی کرنی پڑیں گی۔ میں نے بہت سمجھایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانے، اب میں نے لڑکے والوں سے بات چیت کی کہ میرا ارادہ ہے، اگر تم چٹنگی سے اس کے لئے تیار ہو تو فلاں دن بعد مغرب نکاح ہوگا اور اگر تم بھی اس کیلئے تیار نہ ہو تو پھر خوشی سے اپنے لڑکے کے لئے کوئی دوسری لڑکی تجویز کر لو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی، انہوں نے آپادگی اور استقامت ظاہر کی، اور میں نے دن مقرر کر دیا، یہ بھی کہہ دیا کہ آپ حضرات مغرب کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ کے آئیں اور نکاح اور رخصتی سے فارغ ہو کے عشاء اپنی مسجد میں جا کے پڑھ لیں۔ بس اتنا ہی وقت نکاح اور رخصتی میں لگے گا۔

برادری والوں نے پچائیت بلائی اور خود میرے بھائی کی زبان سے میرے مقاطعہ کا اور برادری سے خارج کئے جانے کا اعلان کرایا۔

مقررہ دن آجانے پر میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آج بعد مغرب زینت کا نکاح اور رخصتی ہے، جو کچھ ضرورت ہو تیار اور ضروری سامان کر دو، والدہ کو میری اس بات سے تعجب بھی ہوا اور اس وقت رنج بھی ہوا لیکن پھر میرے کہنے سننے سے وہ راضی اور آمادہ ہو گئیں، بعد مغرب لڑکے والے آئے اور میں نے نکاح کر کے اسی وقت بچی کو رخصت کر دیا۔

پھر اللہ نے برادری والوں کا وہ سارا مقاطعہ بھی ختم کر دیا اور سب سیدھے ہو گئے۔

پہلا بچہ

فرمایا: ۱۱ھ میں میں نے والدہ کو ساتھ لے کر حج کا ارادہ کیا، کئی بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کی وجہ سے گھر پر کسی کارہنا ضروری تھا، اس لئے اہلیہ کے متعلق طے کیا کہ وہ ساتھ نہ چلیں، بلکہ گھر پر رہیں۔ محمد عمر کی بیوی صرف ۸-۱۰ دن پہلے آئی تھی، اس لئے گھر اس بیچاری پر چھوڑا نہیں جاسکتا تھا، لیکن اہلیہ نے (جو دین میں بھی حضرت حاجی صاحب کی رفیقہ اور بڑی صالحہ عابدہ تھیں) ساتھ چلنے کے لئے اتنا سخت اصرار کیا کہ مجبوراً میں نے طے کر لیا کہ اچھا اب اس سال نہیں جاتے، انشاء اللہ اگلے سال جب محمد عمر کی بیوی گھر سنبھالنے کے قابل ہو جائے گی تو والدہ اور اہلیہ دونوں کو ساتھ لے چلیں گے۔ بندہ ہانڈھایا سامان بھی کھل گیا، شہر کے کئی آدمی جو ساتھ جانے والے تھے جب میں نے انہیں اپنی مجبوری بتائی تو ان اللہ کے بندوں نے بھی ارادہ فسخ کر دیا۔ میں نے ہر چند سمجھایا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔ میں نے بیوی سے کہا کہ دیکھو

۱۔ حاجی صاحب مدظلہ کے بڑے صاحبزادے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے والد ماجد کی بہت سی خوبیوں کا وارث بنایا ہے۔ ۱۲۔

تمہاری وجہ سے یہ سب بھی رہے جارہے ہیں، اس نیک بندی کے دل پر اس کا بہت اثر پڑا اور وہ اس پر راضی ہو گئی کہ میں والدہ کو ساتھ لے کے چلا جاؤں، اب شہر کے وہ سب ساتھی بھی تیار ہو گئے، اور ہم روانہ ہو گئے۔ مناسک حج کے متعلق حضرت مولانا عاشق الہی صاحبؒ کی کتاب ”زیارۃ الحرمین“ میں نے بہت پہلے سے دیکھنی شروع کر دی تھی۔ اس کی باتیں خوب یاد ہو گئی تھیں۔ اس کے مطالعہ سے اور تجربہ کاروں کے بتانے سے یہ بات دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اس سفر میں دو چیزیں مشکل ہیں۔ ایک نفس پر ایسا قابو کہ کسی سے لڑائی جھگڑانہ ہو اور دوسرے یہ کہ ہر نماز وقت پر اور جماعت سے ادا ہو۔ لڑائی جھگڑے کے بارے میں تو مجھے اطمینان تھا کہ انشاء اللہ میں اس سے محفوظ رہوں گا، اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ساری عمر میں کسی سے نہ لڑائی کی بلکہ تیز کلامی کی بھی نوبت نہیں آئی اور نماز کے بارے میں نے عزم کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اس مالک کا فضل ہے کہ اُس دن سے آج تک بغیر عذر شرعی کے جماعت بلکہ تکبیر تحریرہ بھی فوت نہیں ہوئی ہے۔

دوسرا حج اور اہلیہ کی دردناک موت

۱۹۷۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحب کو اتنی وسعت عطا فرمادی کہ اہلیہ محترمہ سے انہوں نے فرمایا کہ تم اپنے سب بچوں کے ساتھ لے جا کر حج کر آؤ۔ انہوں نے اس پر سخت اصرار کیا کہ حاجی صاحب خود بھی ساتھ چلیں چنانچہ کراچی تک حضرت موصوف کو ساتھ جانا پڑا وہاں پہونچ کر بڑی مشکل سے وہ اہلیہ کو اس پر راضی کر سکے کہ وہ ان کے بغیر اپنے بچوں کے ساتھ ہی چلی جائیں۔ جہاز کے ساڑھے چھ گھنٹے خریدے گئے اور حاجی صاحب اپنے گھر کے اس قافلہ کو رخصت کر کے کراچی ہی سے واپس تشریف لے آئے۔ یہ پورا قافلہ حج ادا کر کے بخیر و عافیت واپس آ گیا۔

اگلے سال ۱۹۸۰ھ میں حضرت حاجی صاحب نے تنہا حج کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا اہلیہ نے اب پھر ساتھ چلنے کے لئے شدید اصرار کیا، ان کو حجاز مقدس سے ایسا عشق ہو گیا تھا کہ وہ حاجی صاحب سے اصرار کرتی تھیں کہ ہجرت کر کے وہیں جا پڑیں، بہر حال جب ۱۹۸۰ھ میں حاجی صاحب نے حج کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے بھی ساتھ چلنے کے لئے بے انتہا اصرار کیا، بلکہ کراچی تک ساتھ گئیں بھی، لیکن حاجی صاحب چونکہ حج تنہا ہی کرنا چاہتے تھے اس لئے کسی طرح سمجھا بجا کر انہیں واپسی پر راضی کر لیا اور وہ کراچی ہی سے واپس آ گئیں اور حضرت حاجی صاحب اپنے پروگرام کے مطابق تنہا ہی تشریف لے گئے، ماہ محرم میں حاجی صاحب کی واپسی ہونے والی تھی، اہلیہ محترمہ نے صاحبزادوں سے تقاضا کر کے مکان کے بالائی حصہ میں ایک

عمارت حاجی صاحب ہی کے آرام کی نیت سے بنوائی اور اس کی پوری کوشش کی کہ حضرت موصوف کی تشریف آوری سے پہلے عمارت بن کے تیار ہو جائے۔ نویں محرم کی شام کو عمارت مکمل ہوئی مزدوروں کے جانے کے بعد اہلیہ محترمہ نے لگ لپٹ کے اسی وقت اس کی صفائی کرائی تاکہ آج کی مبارک رات شبِ عاشورہ میں نمازیں اسی نئی عمارت میں پڑھی جائیں، چنانچہ مغرب کی نماز اسی نئی چھت کے نیچے مصلیٰ بچھا کر پڑھی جسے مزدوروں نے آج ہی پامنا تھا پھر وہیں اذانیں کے نوافل پڑھے وہیں عشاء پڑھی۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر وہیں معمول کے مطابق تسبیح پڑھتی رہیں، اسی حال میں مصلیٰ پر لیٹ گئیں۔ ہزار دانہ تسبیح ہاتھ میں تھی اور ہاتھ سینے پر تھا۔ رات کو سخت آندھی چلی چھت کا ایک پتھر جو مزدوروں نے غالباً سمجھ نہیں لگایا تھا اس آندھی سے گر کر اور حضرت حاجی صاحب کی اہلیہ محترمہ کے ٹھیک سر پر پڑا اور وہ وہیں اپنے مصلیٰ پر جا بحق ہو گئیں۔ یہ عاشورہ ۱۵۵۷ھ کی رات تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہم اغفر لہا و ارحمہا و ابلغہا منازل الشهداء۔

چند ہی دن کے بعد حاجی صاحب پہنچے اور اس سانحہ کی تفصیل معلوم ہوئی۔ دل پر جو گزرنی چاہئے وہ سب گزری اور خوب گزری۔ لیکن حضرت موصوف کو یہ سن کر اور دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ سب گھر والوں نے یعنی صاحبزادوں اور صاحبزادیوں نے اتنے عظیم سانحہ کو انکے پیچھے بھی صبر سے برداشت کیا۔ سب کے دل روئے سب کی آنکھوں نے آنسو گرائے لیکن زبان کسی کی نہیں بہکی۔ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اہلیہ محترمہ کی شہادت کا یہ واقعہ میں نے حضرت حاجی صاحب کی زبان سے مختلف صحبتوں میں کئی بار سنا ہے اس کے سناتے وقت حضرت کی جو خاص کیفیت ہوتی ہے اور چہرہ پر قلبی حزن و سرور کے جو ملے جلے آثار ہوتے ہیں ان سے میرا اندازہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی دینی ترقیات میں اس واقعہ کو بھی خاص دخل ہے۔ اب سے کوئی تین سال پہلے حضرت موصوف کے ایک صاحبزادہ محمد عثمان مرحوم کی موت بھی بڑے دردناک طریقہ پر واقع ہوئی اور اتفاق سے اس وقت بھی حضرت موصوف حج ہی کے سفر میں تھے۔ راقم سطور کا اندازہ ہے کہ ان جانکسل حادثوں کو آپ نے جس تسلیم و رضا کی صفت کے ساتھ جھيلا اور صبر و احتساب کی نبوی ہدایت پر جس طرح عمل کیا اس نے موصوف کو وہاں پہونچا دیا جہاں شاید برسہا برس کے اختیاری مجاہدوں سے بھی نہ پہنچا جاسکتا۔

ناظرین معاف فرمائیں! میں نے حضرت حاجی صاحب کے حالات حتی الوسع انہیں کی زبان سے بیان کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن درمیان میں یہ میں نے اپنا ایک تاثر اور خیال بھی بیان کر دیا۔ اس کے آگے حضرت موصوف کے حالات خود انہیں کی زبان سے سنئے۔

اہلیہ محترمہ کی شہادت کا مذکورہ بالا واقعہ بیان فرماتے ہوئے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ میں نے سوچ سمجھ کے دوسرا نکاح نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے مخلص دوستوں نے نگاہ اور نفس کی خرابی سے بہت ڈرایا اور نکاح کر لینے کا مشورہ دیا۔ ان حضرات کا مشورہ مخلصانہ تھا اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے قوی امید تھی کہ انشاء اللہ میں ایسے کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوں گا۔ اس لئے میں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ میرے ہا ایک نے ایسی حفاظت فرمائی کہ آج تک قلب میں کبھی وسوسہ بھی نہیں آیا۔ کسی اور کا کیا ذکر جو ان ہونے کے بعد اپنے کسی بیٹی، پوتی یا نواسی کو بھی میں نے نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا ہے۔

اشرف منزل

ذکر فرمایا۔ کہ دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ایسا کر دیتے کہ سب بچوں کے لئے الگ الگ مکان ہوتا، کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ اتنا طویل و عریض فلاں پلاٹ فروخت ہو رہا ہے، اس کی خرید کے لئے نقد روپیہ اپنے پاس نہیں تھا، سب گھر والے خوشی سے زیور فروخت کرنے پر راضی ہو گئے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے وہ پلاٹ دلادیا۔ اب تعمیر کے لئے کچھ نہیں تھا، میرے ایک عزیز نے کہا کہ میرے پاس اتنی رقم رکھی ہے اُسے لے کر تعمیر شروع کروادیتجئے۔ اور جب کبھی واپس کرنا آپ کے لئے آسان ہو میری رقم واپس کر دیتجئے گا۔ چنانچہ وہ رقم لے کر تعمیر شروع کر دی گئی۔ اور ٹھیکیداری میں دوسروں کے کام بھی کرانا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں ایسی غیر معمولی برکت دی کہ اپنی ہی آمدنی سے تعمیر بھی مکمل ہو گئی، اور قرضہ والی رقم بھی ادا کر دی گئی۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اسی عمارت کا نام ”اشرف منزل“ ہے۔ یہ پوری عمارت سرخ پتھر سے بنی ہوئی ہے (اس علاقہ میں عام طور سے عمارتیں بجائے اینٹ کے پتھر ہی سے بنتی ہیں) بالکل سادہ مگر بہت مضبوط عمارت ہے۔ اس میں سترہ مکانات، چند دوکانیں، ایک مسجد اور ایک مدرسہ ہے۔ گویا قلعہ نما ایک چھوٹا سا محلہ ہے، حضرت حاجی صاحب کی مہارت فنی کا یہ کرشمہ ہے یا کہئے کہ ان کی کرامت ہے کہ اتنی وسیع اور ایسی مضبوط عمارت جس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر پر کئی لاکھ روپے صرف ہوئے ہوں گے۔ بہت تھوڑی لاگت سے تیار ہوئی، اشرف منزل کی مسجد جس کی لاگت کا تخمینہ کوئی دیکھنے والا کسی طرح بھی ۳-۴ ہزار سے کم نہ لگائے گا۔ حضرت حاجی صاب نے بتایا کہ اس پر صرف پندرہ سو روپے صرف ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی اس لئے کہ زمین پتھر لی ہونے کی وجہ سے قریباً چار سو روپے صرف کنویں کی تیاری میں لگ گئے۔ گویا کنویں کی رقم اگر الگ کر دی جائے تو مسجد پر صرف گیارہ سو روپے

صرف ہوئے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب نے بیان فرمایا کہ ”اشراف منزل“ تیار ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد دل میں یہ داعیہ پیدا ہو گیا کہ میں ابھی سے اس کی ملکیت ان بچوں کی طرف منتقل کر دوں جن کے خیال میں یہ بنائی گئی ہے اور اپنے کو بے ملک بنالوں۔ اس کے بارے میں میں نے اپنے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھ کر مشورہ چاہا، حضرت کا جواب آیا جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر کوئی شرعی مسئلہ پوچھا جائے اور معلوم ہو تو اس کا بتانا تو ضروری ہے، لیکن ہر معاملے میں مشورہ دینا ضروری نہیں، آپ خود ہی غور کر لیں کہ اس زمانہ میں سب کچھ دوسروں کے حوالے کر کے خود خالی ہاتھ ہو جانا کہاں تک مناسب ہوگا۔

حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت کی رائے نہیں ہے اس لئے میں نے اپنا وہ ارادہ اس وقت فسخ کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی داعیہ شدت سے دل میں پیدا ہوا، اب میں نے سوچا کہ حضرت نے صاف منع تو فرمایا نہیں ہے، اس لئے مشورہ کے واسطے اپنے کسی اور بزرگ کی طرف رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر وہ انتقال ملک کا مشورہ دے دیں تو میں اس پر عمل کر لوں۔ چنانچہ میں نے حضرت مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور اپنی بات اس میں زیادہ تفصیل سے لکھی، وہاں سے صاف جواب میری رائے کے خلاف آیا۔ میں نے پھر ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ ایک دن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی سیرت پڑھ رہا تھا، اس کے مطالعہ سے اپنے کو بے ملک بنا لینے کا وہی داعیہ اور زیادہ شدت سے پیدا ہوا، اب میں نے سوچا کہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، میرے اکابر میرے ضعف کی وجہ سے ازراہ شفقت و خیر خواہی مجھے اس کا مشورہ نہیں دیتے ہیں، اگر میں توکل علی اللہ عزم کر لوں اور ایسا کر گزروں تو انشاء اللہ میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے ایک دن فیصلہ کر لیا اور لڑکوں کے سامنے اپنا یہ منصوبہ رکھا کہ میں نے یہ سوچا ہے، ان سب نے بھی یہی کہا کہ جب تک آپ ہیں یہ سب آپ ہی کی ملک میں رہنا چاہئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں خوب سوچ سمجھ کے عزم کر چکا ہوں اور اس کام کو اب کر دینا ہی چاہتا ہوں۔

پھر میں نے انتقال ملک کی اس کارروائی کو قانونی طور پر بھی مکمل کر دیا اور بھگت اللہ اب میری ملکیت میں کچھ بھی نہیں ہے۔

حاجی صاحب نے بیان فرمایا کہ میں ابتدائی دور میں بکثرت خواب میں اپنے کو برہنہ دیکھ کر ریتا تھا

اور اس سے طبیعت متاثر ہوتی تھی، میں نے حضرت مرحوم کو لکھا کہ میں بکثرت خواب دیکھتا ہوں، حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ خوابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت تجر داور ماسوائے سے انقطاع نصیب فرمادے اور ان خوابوں کی تعبیر اس طرح ظاہر ہو۔

ناچیز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی موجودہ زندگی ان خوابوں کی ظاہر باہر تعبیر و تفسیر ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی موجودہ زندگی

اب حاجی صاحب کی قیام گاہ، اشرف منزل کی مسجد کا ایک بہت چھوٹا سا حجرہ ہے جو شاید اسی نیت سے بنایا ہو۔ اب وہ اس لحاظ سے کہ اُن کی ملک میں اب کچھ بھی نہیں ہے گویا ”فقیر“ ہیں اور دعائے نبوی ”اللہم احییٰ مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرة المساکین“ (جوان کی خاص محبوب دعاؤں میں سے ہے) کی قبولیت کا زندہ نمونہ ہیں، لیکن ساری اولاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سعادت مند بلکہ حضرت حاجی صاحب کی دل سے معتقد بھی ہے اس لئے کچھ نہ ہونے کے باوجود گویا سب کچھ ہے۔ خیر کے مصارف میں حسب سابق اب بھی وہ خوب صرف فرماتے ہیں، لیکن ہر پیسہ سوچ سمجھ کے بہتر سے بہتر مصرف میں صرف فرمانے کا اہتمام کرتے ہیں، اپنی ذات پر بہت ہی کم خرچ کرتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ ۸۱ سال کی عمر ہے اب تو خدا کے فضل سے تین لڑکوں کے دوا خانے ہیں اور وہ طرح طرح کی دوائیں بنا کر مجھے خود ہی دیتے رہتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ اپنی دوا دارو میں میں نے کبھی ایک روپیہ بھی صرف نہیں کیا ہے۔ کسی حکیم ڈاکٹر کو اپنے حساب میں کبھی فیس نہیں دی۔ چونکہ ہمیشہ سے کم کھانے کی عادت ڈالی ہے اس لئے خدا کے فضل سے بیمار ہی بہت کم ہوتا ہوں، اور اگر کبھی کچھ طبیعت خراب ہوئی تو بس ۲-۳ دن لوٹ پوٹ کے کھڑا ہو جاتا ہوں، لباس اتنا معمولی اور کم قیمت پہنتے ہیں کہ کپڑے کی اس شدید گرانی کے زمانہ میں پورے لباس (کرتے، پاجامے اور ٹوپی) کی لاگت غالباً ۲-۳ روپے سے زیادہ نہیں ہوتی، اسی طرح کھانا بھی نہایت سادہ اور معمولی کھاتے ہیں۔ جفاکشی اور کفایت شکاری زندگی کا مستقل اصول ہے، اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید و تلقین فرماتے رہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے جفاکشی اور کفایت شکاری کو اپنا اصول بنائیں اور اپنے ذاتی مصارف سے پیسے بچا بچا کر دینی ضرورتوں میں لگائیں اور اللہ کے حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کریں۔

چند ایمانی صفات

اخلاص و للہیت

کسی انسان کی نیت اور اس کے باطن کا صحیح علم تو بس اللہ ہی کو ہوتا ہے لیکن آثار اور علامات سے کسی حد تک اندازہ بندوں کو بھی ہو جاتا ہے، حضرت حاجی صاحب سے بے تکلف تعلق کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ غائبان کا ہر کام اور کسی کے ساتھ ان کا ہر معاملہ اور ہر برتاؤ، کھانا، کھانا، پینا، پلانا، لینا، دینا، حتیٰ کہ بات کرنا سب صرف اللہ کے لئے اور ثواب ہی کی نیت سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتنی قابل رشک نعمت ہے۔
وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَفَّسْ الْمُتَنَفِّسُونَ۔

دعا اور شکر کا غلبہ

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام احوال و اوقات میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور آپ کی یہ یاد زیادہ تر دعا اور شکر کی شکل میں ہوتی تھی، حضرت حاجی صاحب پر بھی ان دو چیزوں کا خاص غلبہ ہے، اکثر اوقات زبان دعا اور شکر میں مصروف رہتی ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں، اپنی ہی سیدھی سادی زبان میں عرض کرتے ہیں اور اس طرح عرض کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہر کلمہ قلب کی گہرائی سے نکل رہا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ بندہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں رسوم کا پابند نہیں ہے، بلکہ بس مغز اور حقیقت ہی سے واسطہ ہے۔

بے نفسی

حاجی صاحب کی زندگی میں جو ایمانی صفت میری نگاہ میں بہت ہی زیادہ نمایاں ہے وہ ان کی بے نفسی ہے، اگر ان کو کسی ایسے کام میں جو عرف عام میں بہت ہی پست اور گھٹیا سمجھا جاتا ہو اور جس کے کرنے سے لوگوں کی نظروں میں آدمی بے وقعت ہو جاتا ہو اجراء خردی اور دینی نفع کا کوئی پہلو نظر آئے تو وہ اس کو بڑی بے تکلفی بلکہ ذوق و شوق سے کرتے ہیں اور اس کی بالکل پروا نہیں کرتے کہ کوئی کیا سمجھے گا اور کیا کہے گا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ جس سے مجھے بڑا سبق ملا اور جس کا میرے دل پر آج تک اثر ہے۔ یہاں بھی ذکر کرتا ہوں۔

یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ حاجی صاحب نے خیر کے جو مختلف سلسلے قائم کر رکھے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ مفید دینی اور اصلاحی کتابیں کافی مقدار میں کتب خانوں سے منگوا کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کو پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ پھر جب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس کتاب سے فائدہ اٹھائے گا تو اگر مناسب سمجھتے ہیں تو اس کو وہ کتاب بلا قیمت ہدیہ کر دیتے ہیں ورنہ اس کو خریدنے کی ترغیب دے کر اس اصل قیمت پر دے دیتے ہیں، جس پر وہ کتب خانہ سے آئی ہوئی ہے اور کبھی مزید نقصان برداشت کر کے اس سے بھی کم قیمت پر دے دیتے ہیں یہ سلسلہ حضرت حاجی صاحب کے ہاں غالباً ۳۰-۴۰ سال سے قائم ہے۔ میرے نزدیک تو یہی بڑی بے نفسی کی بات ہے کہ کسی شخص کو کتاب خریدنے کی ترغیب دے کر خود ہی اس کے ہاتھ کتاب فروخت کی جائے، لیکن اس سلسلہ میں اب سے ۳ سال پہلے مجھے ایک بڑا ہی حیرت انگیز اور بہت ہی سبق آموز تجربہ ہوا، حاجی صاحب نے مجھے جو دھپور آنے کے لئے لکھا۔ میں نے ارادہ کر لیا اور ان ہی کے مشورہ سے سفر کا پروگرام اس طرح بنا کہ پہلے میں پی پاڑا تروں اور دودن وہاں قیام کر کے جو دھپور جاؤں، حاجی صاحب نے مجھے لکھا کہ میں ان کے لئے ڈیڑھ دو سو روپے ٹکٹ کی مفید اور عام فہم دینی اور اصلاحی کتابیں بھی کتب خانہ الفرقان سے لیتا آؤں۔ چنانچہ میں نے یہ کتابیں ساتھ لے لیں۔ پروگرام کے مطابق میں پی پاڑا پہنچا تو دیکھا کہ حاجی صاحب وہیں تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کیا کتابیں ساتھ آئی ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں لایا ہوں، فرمایا تو مجھے ابھی دے دیجئے! میں نے عرض کیا کہ کتابیں جو دھپور ہی تو جانی ہیں۔ اسی طرح میرے کس میں چلی جائیں گی، فرمایا نہیں، مجھے یہاں ہی دیدیجئے، میں نے ساری کتابیں حوالہ کر دیں۔ فرمایا جو کمیشن دیا گیا ہو وہ منہا کر کے ہر کتاب کی قیمت مجھے بتادی جائے۔ میرے ایک رفیق سفر نے حساب لگا کر ہر ایک کتاب کی قیمت بعد منہائی کمیشن لکھ دی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، اس کے بعد جب میں جمعہ کی نماز کے لئے مسجد گیا تو دیکھا کہ مسجد کے احاطہ ہی میں ایک درخت کے نیچے بچھی ہوئی چادر پر وہی کتابیں اس طرح لگی ہوئی ہیں جس طرح بعض غریب کتب فروش زمین پر چادر بچھا کر اپنا کتب خانہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں، میں نے سمجھا کہ حاجی صاحب نے یہ کتابیں کسی صاحب کے سپرد کر دی ہیں۔ اور وہ بیچارے اس طرح ان کو فروخت کر رہے ہیں۔ اگلے دن حاجی صاحب نے دریافت فرمایا کیا ان کے علاوہ اور کتابیں بھی ساتھ ہیں؟ میں نے عرض کیا جی بس یہی تھیں، فرمایا وہ تو یہیں ختم ہو گئیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دوکان حاجی صاحب نے خود ہی لگائی تھی اور خود ہی بیٹھ کر ”کتب فروشی“ فرمائی اور طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر پڑھے لکھے شخص کو خود بلاتے اور ایک دو کتابیں اس کو دے کر فرماتے

کہ ان کو دیکھو، جی چاہے گھر لے جاؤ، اگر مفید سمجھو اور خرید سکو تو قیمت ادا کر دینا اور اگر خریدنے کی استطاعت نہ ہو اور رکھنا چاہو تو یوں ہی رکھ لینا، مگر مجھے آکر بتا جانا۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ حاجی صاحب نے خود ہی بیٹھ کے کتب فروشی کی ہے اور اس طرح کی ہے تو میری طبیعت پر ایک تو اس کا بوجھ پڑا کہ میری کتابوں کی وجہ سے انہوں نے اتنی زیر باری اٹھائی اور دوسرا دوسرے دل میں یہ آیا کہ شاید بہت سے لوگوں نے سمجھا ہو کہ بیچنے کے لئے میں اپنی کتابیں سفروں میں بھی ساتھ لئے پھرتا ہوں اور یہاں میں نے حضرت حاجی صاحب سے یہ بیجا کام لیا ہے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ اس بارہ میں میں نے حاجی صاحب سے کچھ عرض کیا اور موصوف نے اس کے جواب میں فرمایا یا از خود مجھ سے فرمایا، کہ حضرت! میرے پاس اتنا علم تو ہے نہیں کہ میں ایسی کتابیں لکھ کر اللہ کے بندوں کو نفع پہنچا سکوں اور اس کا ثواب حاصل کر سکوں، لیکن یہ کر سکتا ہوں کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے ان کی اشاعت میں اور اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندوں تک ان کے پہنچانے میں کوشش کروں اور اس طرح اس کے ثواب میں شریک ہو جاؤں، میں بس اس لالچ میں ایسا کرتا ہوں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت حاجی صاحب نے جس پل پاز میں اس شان سے یہ ”کتب فروشی“ کا عمل کیا، وہاں کے لوگ عموماً حضرت موصوف کو ایک شیخ و مرشد اور جود چہور کی ایک معزز اور باوقار شخصیت کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں، دراصل ایسا نفس کش عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نفس بالکل کٹ چکا ہو اور جس کی نظر ہر طرف سے ہٹ کے بس اللہ تعالیٰ کی رضا اور اجر آخرت پر جم گئی ہو۔

دین کا صحیح فہم اور اعتدال

یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حاجی صاحب ”تعلیم یافتہ“ نہیں ہیں، دینی ذوق اور دینی شعور پیدا ہونے کے بعد بس قرآن مجید پڑھ لیا ہے اور اردو کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے، خط و کتابت کا دائرہ اگرچہ بہت وسیع ہے، لیکن اپنے خطوط عموماً دوسروں سے لکھاتے ہیں خود غالباً دو سطریں بھی نہیں لکھ سکتے ہیں لیکن اس ”تعلیم یافتہ“ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فہم دین کی ایسی دولت نصیب فرمائی ہے کہ بس اللہ کی شان نظر آتی ہے۔ ایک دفعہ ایک عملی اور دینی موضوع پر ناچیز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی نے ایک عرصہ تک غور کیا اور ایک نتیجہ پر پہنچے، کچھ دنوں بعد میرا جود چہور جانا ہوا، میں نے ایک سلسلہ گفتگو میں حاجی صاحب سے اس موضوع کا ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے اپنی سیدھی سادی بالکل غیر علمی زبان میں وہی بات فرمائی جس پر ہم دونوں کافی غور کے بعد پہنچ سکے تھے، ایسے ہی حضرات کے بارہ میں عارف رومی

نے فرمایا ہے ۔

بنی اندر خود علوم انبیاء

بے کتاب و بے معید وادستا

اس صحیح فہم دین ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صادق عشق اور نہایت عمیق عقیدت کے باوجود اس طرح کا غلو بالکل نہیں ہے کہ جو اس تعلق میں اکثر پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ اس طرح کے غلو کی اصلاح ان کا خاص موضوع ہے، حاجی صاحب کی گفتگو کا خاصا حصہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ہوتا ہے لیکن بڑے سادے انداز میں بس مرحوم یا زیادہ سے زیادہ حضرت مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ذکر کے ساتھ برابر دعائے مغفرت کرتے جاتے ہیں۔ خود ہی سنایا کہ ایک دفعہ حضرت سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے میری زبان سے حضرت کے لئے بار بار دعائے مغفرت سن کر فرمایا کہ مغفرت میں کیا شبہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ خدا کے بندے اللہ تعالیٰ مالک الملک اور احکم الحاکمین ہے، جس کے لئے جو چاہے فیصلہ کرے، پیغمبر تک اُس کے جلال کے سامنے لرزتے اور اس سے مغفرت کی دعا کرتے تھے، ہم سب اور ہمارے سب بڑے بھی دعائے مغفرت کے محتاج ہیں۔

اسی طرح سنایا کہ ایک دفعہ حجاز مقدس میں ہمارے فلاں پیر بھائی نے بڑی ناگواری کے ساتھ میرے سامنے شکایت کی کہ فلاں بزرگ کے مریدین و متعلقین اپنے شیخ کو ہمارے حضرت سے بھی بڑا سمجھتے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ اسی وقت ان سے اس بارہ میں کچھ کہوں، لیکن میں نے سمجھا کہ اس وقت یہ بحث کرنے لگیں گے اس لئے اس وقت میں نے اُن سے کچھ عرض نہیں کیا، دوسرے کسی وقت میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے مجھ سے فلاں وقت یہ بات کہی تھی، آپ نے سوچا ہے کہ اس بات سے آپ کی ناگواری اور غصہ کی وجہ اور اس کا منشاء کیا ہے؟ میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ یہ بات آپ کے جذبات کے خلاف ہے۔ میرا حال تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اُمت کے ایک ایک کلمہ کو کا درجہ ایمان و عمل میں اور دین میں ہمارے حضرت سے بڑھا دے اور سب کو حضرت سے اونچے درجہ کا بلکہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی اونچے درجہ کا دلی بنادے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میرے اس کہنے سے حضرت کا درجہ گھٹ نہیں جاتا ہے حضرت کا جو مقام اللہ کے یہاں ہے وہ ہے۔

یہ بھی خود ہی سنایا کہ تحریک خلافت کے زمانہ میں جب ہمارے اکابر میں اختلاف ہو گیا تھا تو میں

حضرت مرحوم (یعنی حضرت تھانویؒ) کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر دعا کیا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور اس زمانہ میں مجھ پر اس چیز کا اتنا غلبہ تھا کہ میں یہ دعا گویا مضطر ہو کر کیا کرتا تھا۔ ایک صحبت میں حاجی صاحب جس وقت یہ بیان فرما رہے تھے اتفاق سے اس وقت حضرت حکیم الامتؒ کے ایک مجاز بزرگ بھی تشریف فرما تھے۔ ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، حضرت میرا یہ دعا کرنا ادب کے خلاف تو نہیں تھا؟ پھر خود ہی فرمایا کہ انشاء اللہ بالکل نہیں یہ دعا تو اس وقت میرے قلب پر وارد کی جاتی تھی۔

حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے اجازت

حاجی صاحب نے بیان فرمایا کہ بالکل اچانک حضرت کا والا نامہ آیا جس میں مجھے تلقین بلا بیعت کی اجازت دی گئی تھی۔ مجھ پر اس کا ایسا اثر پڑا کہ خلاف عادت چیخ نکل گئی، پھر میں نے حضرت کو لکھایا کہ میرا حال یہ ہے کہ میں پڑھا لکھا کچھ نہیں ہوں، میں نے ذکر شغل بھی نہیں کیا ہے پھر میں ایک چھوٹی ذات کا آدمی ہوں یعنی تیلی، البتہ ظاہر صوم و صلوة کی پابندی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی ہے، ریا، عجب، کبر، حسد وغیرہ کے بارہ میں بھی کچھ موٹی موٹی معلومات ہیں۔ ایسی حالت میں بھی اگر یہی مناسب خیال فرمادیں تو خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

حضرت نے حسب معمول اسی پر جواب دیا، پڑھا لکھا نہ ہونے کے بارہ میں اور ذکر شغل نہ کرنے کے بارہ میں میں نے جو لکھا تھا اس کے متعلق حضرت نے کچھ تحریر نہیں فرمایا، اور اپنے تیلی ہونے کا میں نے جو ذکر کیا تھا اس پر تحریر فرمایا ”کیا حرج ہے بعض تیل کھی سے بھی زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں۔“

ظاہر صوم و صلوة کی پابندی نصیب ہونے کا میں نے جو ذکر کیا تھا اس پر حضرت نے تحریر فرمایا کہ ”کیا یہ تھوڑی نعمت ہے“ ریا اور عجب وغیرہ کے بارہ میں جو میں نے لکھا تھا کہ اس کے متعلق بھی موٹی موٹی معلومات ہیں، اس پر تحریر فرمایا ”پھر تو نور علی نور۔“

اور آخر میں جو میں نے لکھا تھا کہ ایسی حالت میں بھی اگر یہی مناسب خیال فرمادیں تو خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اس پر تحریر فرمایا کہ ”ہاں ضرور، انشاء اللہ برکت ہوگی۔“

حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی مجددیؒ

اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم اور ہفتہ وار ”النجم“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حضرت مولانا کا تذکرہ تو میں اپنے بچپن سے سنتا تھا، لیکن زیارت کا اتفاق سب سے پہلے اب سے تقریباً ۳۸-۳۹ سال قبل (غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۵ء) جمعیت علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں ہوا تھا، چونکہ مولانا کی شہرت ایک مقرر و مناظر اور ایک مفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی، اس لئے دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ روشن خیال اور فیشن ایبل قسم کے مولانا ہوں گے۔ مثلاً شیردانی وغیرہ پہنتے ہوں گے، شوقیہ چشمہ لگاتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ، لیکن مراد آباد کی ایک سڑک پر راستہ چلتے ہوئے کسی واقف نے جب مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب جو پیدل چلے جا رہے ہیں یہی النجم کے ایڈیٹر مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ہیں، تو اپنے تصور کے بالکل خلاف مولانا کی ہیئت اور وضع قطع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، بالکل پرانے قسم کے سیدھے سادے علماء کی وضع تھی، سر پر وہی پرانے علماء کا سا عمامہ، جسم پر عبا، ہاتھ میں لاٹھی نما عصا۔ جمعیت کے اجلاس عام میں مولانا کی بھی تقریر کا وقت رکھا گیا تھا، آپ نے بجائے اس کے کہ جمعیت کے پلیٹ فارم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے مناسب کوئی سیاسی یا نیم سیاسی یا کم از کم متکلمانہ و فلسفیانہ قسم کی کوئی علمی تقریر فرماتے، بس وعظ فرمایا، جس کا بڑا حصہ نماز سے متعلق تھا، قدرتی طور پر بہت سوں کو تعجب ہوا کہ جمعیت کے پلیٹ فارم پر ایسے وعظ کا کیا موقع تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عرصہ سے مولانا کا یہ التزام ہے کہ وہ ہر تقریر میں نماز کی خاص طور سے تلقین و تاکید فرماتے ہیں اور گویا یہ ان پر طاری ہے۔ پھر اسی سال کچھ عرصہ کے بعد ایک ضرورت سے امر وہ میرا جانا ہوا، میں ان دنوں منطق

۱۔ حضرت مولانا بھی ان اکابر میں تھے جن کا تذکرہ ”تحدیثِ نعت“ کے ذیل میں حضرت صاحب سوانح کے پیش نظر تھا مگر یہ لکھنا جاسکا۔ پس حضرت مولانا کی وفات پر جو تاثرات آپ نے قلمبند فرمائے تھے آپ کے ارشاد پر انہیں تاثرات کو اس سلسلہ تحدیثِ نعت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ مرتب

فلسفہ اور اصول فقہ و علم کلام کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مولانا آج کل مدرسہ اسلامیہ چلہ (امروہہ) میں صدر مدرس ہیں، میں مولانا کی زیارت کے ارادے سے، نیز اس نیت سے کہ موقع ملے گا تو کسی سبق میں بھی شریک ہو کر استفادہ کروں گا۔ مدرسہ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے طب کی مشہور کتاب نفیسی کا آپ کے یہاں درس ہو رہا تھا، میں بیٹھا تو پورے سبق میں رہا، لیکن وہ میری دلچسپی کی چیز نہیں تھی، البتہ یہ بات اسی دن معلوم ہوئی کہ مولانا فن طب کے بھی فاضل ہیں۔ بعد میں جب حالات سے زیادہ واقف ہونے کا موقع ملا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شروع میں کچھ عرصہ مطب بھی کیا تھا لیکن بعد میں اس سے بالکل ہی کنارہ کش ہو کر اُن خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے جو اللہ کو آپ سے لینے تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اتفاق سے تین سال میں اسی مدرسہ اسلامیہ میں مدرس رہا جس سے مولانا کا تعلق رہا تھا، اس مدرسہ کے اکثر کارپرداز اور ارباب انتظام چونکہ حضرت مولانا سے عقیدت و ارادت کا خاص تعلق رکھتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے مولانا نے اپنے سخیلے صاحبزادے مولوی عبدالمومن صاحب فاروقی کو تعلیم کے لئے وہاں بھیج دیا تھا، اس لئے سال میں دو چار مرتبہ ضرور مولانا کی تشریف آوری امر وہہ میں ہوتی تھی، اور میری طبیعت کو چونکہ مولانا سے خاص مناسبت تھی اور مذاہب باطلہ اور فرقہ ہائے ضالہ کی تردید سے اس زمانہ میں راقم سطور کو بھی گہری دلچسپی تھی اور مولانا بھی انہیں وجوہ سے ناچیز پر خاص الخاص عنایت و شفقت فرماتے تھے، اس لئے ہر ملاقات میں ربط و تعلق بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا..... کچھ عرصہ کے بعد (غالباً ۱۳۵۰ھ میں) حضرت مولانا کے ساتھ رنگون اور برما کے بعض دوسرے مقامات کا ایک طویل سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ سفر (جیسا کہ ایک سابق مقالہ میں گزر چکا ہے) اہل رنگون کی دعوت پر وہاں ایک مذہبی فتنہ کے سر اٹھانے کی وجہ سے کرنا پڑا تھا، اس سفر میں قریباً ایک مہینہ شب و روز مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اور مدد و کواہم جو کچھ جانا اور سمجھا تھا، اس سفر میں اس سے بہت زیادہ جانا اور سمجھا، پھر برما کے اس سفر کے غالباً ایک ہی سال بعد مولانا نے دارالبلغین قائم فرمایا اور اس میں کام کرنے کے لئے اس عاجز کو بھی بلایا، اس موقع پر بھی چند مہینے ایک نیاز مند رفیق کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد بھی بار بار سفر و حضر میں مولانا کے قریب بلکہ ساتھ رہنے کا اس قدر اتفاق ہوا کہ دو بار طالب علمی کے بعد اپنے مخصوص اساتذہ کے ساتھ بھی اتار رہنے کا اتفاق غالباً نہ ہوا ہوگا۔

قریباً ۲۵ سال کے اس تعلق میں مولانا کی زندگی کے جن علمی، عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے میں واقف اور متاثر ہوا، کسی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر ان میں سے چند حوالہ قلم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کے بارے میں اپنی معلومات اور تاثرات کو میں دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہوں، ایک

وہ جن کا تعلق علم و تحقیق اور تصنیف و مناظرہ کی لائن کے امتیازات سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق عبادت گزاری اور پرہیزگاری جیسی درویشانہ صفات سے ہے۔

علمی رسوخ

ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہلسنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لئے یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ مدوح صرف مناظر و مصنف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے، نامور اصحاب درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا، اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں۔ سلامتی فہم

۱۔ جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں انہیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات و احادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں کی کتب حدیث و اسماء الرجال اور بعد کے ان کے مصنفین کی کتابوں کی بھی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاہ نامہ اور حملہ حیدری کے صفحے کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ مولانا کی اس آخری بیماری ہی کا واقعہ ہے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ فردوسی نے شاہ نامہ میں اپنے آتش پرست نسل اکابر کا تذکرہ جس فخریہ انداز میں کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں صحابہ کرام کو جس طرح اس نے حقیر و بے حیثیت دکھانے کی کوشش کی ہے اس کے خلاف ایرانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی آواز اس وقت اٹھی تھی یا نہیں؟ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی آواز اٹھی ہوگی تو مولانا کو اس کا ضرور علم ہوگا۔ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیماری اور اس کے پیدا کردہ ضعف و نقاہت کے علاوہ برسوں پہلے سے مولانا کے لئے بڑھاپے کا وہ وقت آچکا تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ ”لکیلا یعلم بعد علم شیئاً“۔ ضعف کی وجہ سے مولانا کے لئے اس وقت بات کرنا بھی مشکل تھا، اس کے باوجود میں نے یہ بات دریافت کی تو فرمایا کہ ”صحیح العقیدہ ایرانی مسلمانوں کی طرف سے شاہ نامہ کے خلاف بڑے زور کے ساتھ آواز اٹھی ”صولت فاروقی“، ایک مستقل کتاب لکھی گئی، یہ منظوم ہے اور گویا شاہ نامہ کا جواب ہے، چھپ بھی چکی ہے میں نے اس کا مطبوعہ نسخہ ہی کبھی دیکھا تھا، پہلے تو اس کا خاصا حصہ یاد تھا، اب کچھ یاد نہیں رہا، پھر فرمایا ہاں ایک شعر یاد آگیا اور شاید وہی آپ کے مقصد کے لئے کافی ہوگا۔ وہ شعر یہ ہے فردوسی کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔

دلش گبر و جاں گبر و گبری زباں ز گبر اں بکمر دی زباں قصہ خواں

بہر حال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔

۲۔ مطلب یہ ہے کہ انسان جب زیادہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو حاضر علم بھی غائب ہو جاتا ہے۔

کے ساتھ ذہانت و ذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصہ وافر عطا فرمایا تھا، ان سب چیزوں کے جمع ہوجانے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا۔ علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے علم قرآن سے خاص شغف تھا، آپ کا سلسلہ تفسیر آیات آپ کے تدریسی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

تحریر و تقریر کا امتیاز

تحریر و تقریر بہت سادہ، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری، حشو و زائد سے پاک اور عبارت آرائی سے خالی مگر نہایت دلنشین ہوتی تھی، میں نے کسی صاحب قلم عالم کو نہیں دیکھا جس کی تحریر و تقریر میں اتنی یکسانی اور مطابقت ہو، اگر کوئی شخص مولانا کی تقریر لفظ بلفظ لکھتا تو اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کے لئے کسی لفظی ترمیم کی بھی غالباً ضرورت نہ ہوتی، تقریر میں اثر و زور پیدا کرنے کے لئے مولانا اُس مبالغہ کے بھی روادار اور عادی نہیں تھے جس کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح کمزور روایتیں (اگرچہ وہ علمی حلقوں میں بھی کتنی ہی مشہور ہو گئی ہوں) مولانا ان کے ذکر سے احتیاط فرماتے تھے۔ ہماری اسی صدی کے بہت بڑے حقانی عالم حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب محدث امرہ ہوئی (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا) میں نے ایک مجلس میں اُن سے خود سنا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں اُن کی اس بات کا بہت ہی معتقد ہوں اور اس کو ان کی کرامت سمجھتا ہوں کہ وعظ میں بھی کوئی بات غیر تحقیقی بیان نہیں فرماتے۔

مناظرہ کا امتیاز

قوت استدلال اور متانت و بنجیدگی آپ کے مناظرہ کا خاص امتیاز تھا، آپ کے متعدد مناظرے چھپے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے کبھی آپ کا مناظرہ سنا ہے، وہ ان کتابی مناظروں کے مطالعہ کے وقت بالکل ایسا محسوس کریں گے کہ حضرت مولانا بول رہے ہیں۔ محقق مناظرہ کبھی غلط بحث نہیں کرتا بلکہ اپنی پوری قوت اس پر صرف کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ روشنی میں آجائے، مولانا بالکل یہی طرز تھا، اسی لئے وہ فریق مخالف کی غلط بحث کی کوششوں کو چلنے بھی نہیں دیتے تھے، اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود غلط بحث میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، بحث کے مرکزی نقطہ کو مولانا ہر تقریر میں ضرور دہرا دیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام سامعین کو بھی وہ خاص بات حفظ ہو جاتی تھی، فن کے لحاظ سے یہ مناظرہ کا کمال ہے اور احقاق حق کے مقصد کے لئے بھی یہ ضروری اور ناگزیر ہے۔

خاص موضوع

اگرچہ حسب ضرورت مولانا نے مناظرے عیسائیوں سے بھی کئے آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے بھی، اور ان کے علاوہ دوسرے فرقہ ہائے ضالہ سے بھی، لیکن مولانا کا خاص موضوع شیعہ حملوں سے صحابہ کرامؓ اور مسلک اہلسنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب تشیع کی ضلالتوں کو واضح کر کے حجت حق قائم کرنا تھا، اور یہ وہ موضوع ہے جو ہندوستان کے خاص تاریخی حالات کی وجہ سے اس ملک کے اکابر علماء و مصلحین کی علمی اور دینی کوششوں کا صدیوں سے خاص موضوع رہا ہے۔ اب سے قریب ساڑھے تین سو سال پہلے گیارہویں صدی ہجری میں تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد امام ربانی شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے معاصرین ہی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، الغرض اپنے اپنے زمانہ میں ان سب ہی حضرات کی دینی اور اصلاحی کوششوں کا خاص موضوع اور ہدف (ان خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) یہی مسئلہ رہا ہے۔۔۔ جس شخص نے اس موضوع سے متعلق ان اکابر کی کتابیں دیکھی ہیں اور حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے، اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا نے اس موضوع کو اپنے ان پیش رو اکابر سے کئی گنا زیادہ نکھارا، اور ایک سعادتمند پیروکار کی طرح ان کے کام کی تکمیل کر کے ان کی روحوں کو شاد اور مطمئن کیا۔۔۔ اس ناچیز کا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا کی تحقیق و تنقیح نے اس دائرے کے کئی بنیادی مسئلوں کو جو علمی اور نظری تھے اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے ایسا بدیہی بنادیا کہ عامیوں کے لئے بھی ان کا سمجھنا آسان ہو گیا۔

رد شیعہ میں مولانا کی نیت اور اس موضوع سے

ان کے غیر معمولی شغف کا اصل باعث!

مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے ناموس کی حفاظت اور ان کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈے کی تردید بجائے خود بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے، لیکن میں جو اس کام کو درجہ اول کی اہمیت دیتا ہوں اور اس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدیؐ سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابہ کرامؓ ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگر اس سلسلے کی پہلی کڑی اور دین کے ناقلوں کی پہلی صف ہی ناقابل اعتبار ہوگئی تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا اور ہمارے پاس اُن کے بارے میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی۔ بہر حال میں صحابہ کرامؓ کی یہ حمایت اور مدافعت اور اُن کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نیت ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ امید اپنے اسی عمل سے ہے۔

غیر معمولی اعتدال

مناظرہ کے میدان میں رہنے کے بعد راہ اعتدال پر قائم رہنا بڑی مشکل بات ہے، اللہ ہی اگر توفیق دے اور دستگیری فرمائے تو آدمی اعتدال پر قائم رہ سکتا ہے ورنہ اس میدان میں قدم رکھنے والے کا افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جانا ایک عام بات اور اکثر تجربہ ہے، ناچیز نے اس پہلو سے حضرت مولانا کو بہت ہی ممتاز اور باتوفیق پایا۔ صرف ایک مقولہ نقل کرتا ہوں جو مولانا سے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقین اولین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰ سے ان کو کیا نسبت؟ ان کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہ گوجہ مل جائے تو ان کے لئے سعادت اور باعثِ فخر ہے۔

یہاں تک جن خصوصیات کا میں نے ذکر کیا ان کا براہِ راست تعلق مولانا کی عالمانہ یا مناظرانہ حیثیت سے ہے، اگرچہ ان کی عارفانہ اور درویشانہ حیثیت کا بھی اُن میں خاصا حصہ ہے، اب دو چار باتیں میں وہ عرض کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور سے اس دوسری حیثیت سے ہے۔

نماز کے ساتھ قلبی تعلق اور نسبتِ نبویؐ

نماز اس حیثیت سے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس گئی گزری حالت میں بھی ہر وہ مسلمان اس کا پابند ہے جس کو خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہے۔ بہر حال اس حیثیت سے نماز ایک عوامی چیز ہے، لیکن نماز کے ساتھ دل کا لگاؤ، اس کا مکامہ، اہتمام اور فکرِ مندی اور لوگوں میں نماز کی طرف سے

بے اعتنائی اور بے پروائی دیکھ کر دل کڑھنا اور بے چین ہونا بلاشبہ یہ کیفیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے بھی پہلے جد امجد سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص نسبت اور وراثت ہے، انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو دادی غیر ذی زرع میں بسا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا:

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرَّتِیْ بُوَادٍ غَیْرِ ذِی
ذُرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا
الصلوة
اے میرے پروردگار میں نے اپنی نسل کو تیرے مقدس
و محترم گھر کے پاس بن بھیتی والی دادی میں بسا دیا ہے
اے میرے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

اور عرض و معروض اور مناجات کے اسی سلسلے کے آخر میں دعا کی تھی:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوَةِ وَ مِنْ ذُرَّتِیْ رَبَّنَا
وَ تَقْبَلْ دُعَاءَ
میرے رب مجھے بنادے نماز کا قائم کرنے والا اور
میری نسل کو بھی یہ چیز نصیب فرما، پروردگار میری دعا
قبول فرما۔

اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری وصیت امت کو فرمائی تھی اس میں سب سے پہلے نماز ہی کی تاکید تھی۔ بہر حال نماز کے ساتھ فکر مندی کا یہ تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اس کے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وراثت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک مدت تک مولانا کا یہ التزام رہا کہ ہر وعظ میں نماز کی تلقین و تاکید ضرور فرماتے تھے۔ بلکہ اس دور میں نماز ہی ان کے مواظب کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ اس عاجز نے خود بھی نماز کے بارے میں مولانا کا وعظ سنا ہے، صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ فرما رہے ہیں بے چین دل کی گہرائی سے فرما رہے ہیں۔ حضرت مولانا نے غالباً اسی زمانہ میں نماز کے موضوع پر ایک بڑی موثر مستقل کتاب بھی کتاب الصلوٰۃ کے نام سے لکھی تھی اس میں مولانا نے قرآن مجید کی ایک سو ایک آیات نماز سے متعلق جمع فرمائی ہیں۔ اس عاجز کو اعتراف ہے کہ مولانا کی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کن کن عنوانات سے نماز کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ اس کتاب میں آیات کے علاوہ نماز سے متعلق تاکیدیں اور ترغیبیں و ترہیبیں حدیثیں بھی اور آخر میں ائمہ امت کے ارشادات بھی ذکر فرمائے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کتاب نہایت موثر ہے اور علمی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے۔ مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب کی یا اس کے کسی حصہ کی کتابت بھی خود فرمائی تھی۔ (حضرت مولانا نے نہایت جمیل الخط تھے اور بد خط تحریر سے گرائی ہوتی تھی) لکھنؤ کے متعدد

واقف حضرات سے میں نے سنا ہے کہ یہاں نماز کا رواج بہت کم تھا، بہت سی مسجدیں غیر آباد تھیں، الحمد للہ اب یہ بات نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس میں سب سے بڑا دخل حضرت مولانا مرحوم کے مواعظ کا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق

اس سے ملتی جلتی دوسری قابل ذکر خصوصیت قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا کا خاص شغف اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے چھ صاحبزادے عطا فرمائے تھے (جن میں سے دو کا سامنے انتقال ہو چکا ہے) مولانا نے ان سب کو قرآن مجید حفظ کرایا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا وہی کریگا جس کو اللہ کی کتاب پاک کے ساتھ غیر معمولی شغف ہو، مولانا پہلے خود حافظ قرآن نہیں تھے، لیکن اب سے چند ہی سال قبل بالکل بڑھاپے کے دور میں خود محنت کر کے حفظ کیا اور زندگی کے ان چند اخیر سالوں میں تو بس تلاوت قرآن ہی ان کا دن رات کا شغل اور وظیفہ تھا، گزشتہ آٹھ دس سال میں صبح یا شام جس وقت بھی حاضری کا اتفاق ہوا یہی دیکھا کہ قرآن مجید سامنے ہے اور اس کی تلاوت میں مشغول ہیں، حالت یہ ہو گئی تھی کہ اپنے خاص اہل محبت اور نیاز مندوں تک کا زیادہ آنا اور دو چار منٹ سے زیادہ بیٹھنا باعث گرانی ہونے لگا تھا، اس گرانی کا اظہار زبان سے تو میں نے کبھی نہیں سنا، لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد چہرے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ انہیں شغل تلاوت کا یہ انقطاع شاق ہو رہا ہے اور وہ منتظر ہیں کہ آنے والا رخصت ہو تو وہ اپنے شغل میں مشغول ہوں۔

اہل و عیال سے محبت اور ان کی جدائی پر صبر والی نبوی وراثت

اپنے اہل و عیال سے محبت بھی انسانی فطرت کا تقاضہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے۔ حدیث و سیرت پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال اور مقام تھا۔ کتب حدیث میں مذکور ہے کہ کونو اسوں اور نو اسیوں میں سے کوئی بچہ منبر پر خطبہ دیتے وقت قریب آ گیا تو آپ نے اسی حالت میں اسے گود میں اٹھالیا بلکہ کبھی کبھی تو انہیں گود میں لے کر آپ نے نماز بھی پڑھی ہے اسی طرح ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی ملاطفت اور حسن معاشرت مثالی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وراثت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اولاد اور اولاد کی اولاد کے ساتھ آپ کے دل کا لگاؤ بھی مثالی تھا لیکن دو جوان صاحبزادوں (مولانا حافظ عبدالغفور صاحب

۱۔ بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو بھائی اپنی بیماری وغیرہ کی وجہ سے پورا قرآن مجید حفظ نہیں کر سکے تھے، اگرچہ مولانا نے اس کے لئے پوری کوشش فرمائی۔

مرحوم اور مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مرحوم) اور جوان العمر اکلوتی جہیتی صاحبزادی اور ان سے پہلے ان کی والدہ مرحومہ کے انتقال کے وقت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال اور ارشاد کا کامل نمونہ دیکھا گیا جو عہد نبوت کے اکلوتے صاحبزادے سیدنا ابراہیم (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات کے وقت آپ نے فرمایا تھا:

العین تدمع والقلب يحزن ولا نقول الا ما
یرضی بہ ربنا، انا لله وانا الیہ راجعون
آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل کو رنج اور صدمہ ہے اور
زبان وہی بولے گی جس سے میرا مالک راضی ہو
’انا لله وانا الیہ راجعون‘

آخر میں اس دور کے ایک مسلم عارف بلکہ یقین و معرفت کے امام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ارشاد پر تاثرات کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا اپنے وصال سے ٹھیک ایک سال پہلے رجب ۱۳۶۲ھ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور قریباً ایک ہفتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا تھا، ایک روز دارالعلوم کی مسجد کے وضو خانہ میں وضو فرما رہے تھے، دارالعلوم کے دو تین اساتذہ بھی ساتھ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی (موجودہ ناظم شعبہ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ حضرت مولانا کی ان پر شفقت و عنایت کی خاص نظر تھی، ان سے مخاطب ہو کر فرمایا ”میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا، ہاں حضرت جانتا ہوں، زیارت بھی کی ہے فرمایا ”نہیں تم نہیں جانتے“ پھر فرمایا ”وہ امام وقت ہیں“۔

لکھنؤ کے اسی سفر میں ناچیز راقم سطور بھی حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ تھا، ایک محبت میں (اب یاد نہیں کس سلسلہ میں) خود مجھ سے فرمایا کہ ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ (حکیم الامتہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال چند ہی روز پہلے ہو چکا تھا)۔ آخر میں ناچیز راقم سطور اپنے ناظرین سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ حضرت مولانا کے لئے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور تمام محبین و متعلقین کے لئے صبر و اجر اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی خاص طور پر دعا فرمائیں، یہ اُن کا اس ناچیز پر ذاتی احسان ہوگا۔

آپ کے مضامین الفرقان کا اشاریہ

| عنوانات | جلد نمبر | شمارہ نمبر | صفحہ | کل نمبر از تا صفحات |
|---|----------|------------|--------|---------------------|
| دعا (آغاز الفرقان) | ۱ | محرم ۱۳۵۳ھ | ۲ | ۱ |
| شذرات | ۱ | ۱ | ۶۳ | ۷ |
| قرآن اور زمانہ حال کے مسلمان | ۱ | ۱ | ۲۱-۱۵ | ۷ |
| ہماری مظلومیت کی تاریخ کا ایک ورق | ۱ | ۱ | ۳۲-۲۹ | ۴ |
| معرکہ اقلیم ملقبہ فیہ فیصلہ کن مناظرہ (متعدد اقساط) | ۱ | ۱ | دستیاب | |
| شذرات | ۱ | ۲ | ۳-۲ | ۲ |
| نظروا انتقاد | ۱ | ۲ | ۲۳ | ۱ |
| دین فطرت کی کشش کا ایک حیرت انگیز نظارہ | ۱ | ۲ | ۵۰-۴۱ | ۱۰ |
| معروضات | ۱ | ۳ | ۴-۲ | ۳ |
| ربیع الاول کے چار چاند | ۱ | ۳ | ۱۳-۵ | ۱۰ |
| دشمنانِ توحید کا انجام | ۱ | ۳ | ۳۲-۳۱ | ۲ |
| نگاہِ اولیں | ۱ | ۴ | ۲ | ۱ |
| ہماری گیارہویں | ۱ | ۴ | ۱۱-۳ | ۹ |
| ساجی دنیا کو ہمارا انعامی چیلنج | ۱ | ۴ | ۴۴-۴۱ | ۴ |
| نظروا انتقاد | ۱ | ۴ | ۵۳ | ۱ |
| نگاہِ اولیں | ۱ | ۵ | ۵-۲ | ۴ |
| فتنہ قبور | ۱ | ۵ | ۳۱-۳۲ | ۵ |
| مساوات | ۱ | ۵ | ۴۱-۳۱ | ۱۱ |
| نگاہِ اولیں | ۱ | ۶ | ۴-۲ | ۳ |
| سیدہ زہراؑ (متعدد اقساط) | ۱ | ۶ | ۴۵-۴۴ | ۲ |
| مناظرہ منظور | ۱ | ۶ | ۴۸-۴۷ | ۲ |
| نظروا انتقاد | ۱ | ۶ | ۴۸-۴۷ | ۲ |
| نگاہِ اولیں | ۱ | ۷ | ۴-۲ | ۲ |

| | | | | |
|----|-------|-------------------|------------|---|
| ۵ | ۱۳-۹ | ۷ | ۱ | ناموس رسول |
| ۶ | ۴۶-۴۱ | ۷ | ۱ | ماہ رجب اور امت کی بد نصیبی |
| ۲ | ۴-۳ | ۸ | ۱ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۱۶-۹ | ۸ | ۱ | روزہ کا اثر |
| ۱ | ۴۹ | ۸ | ۱ | دردناک حادثہ (صاحبزادہ مولانا کریم بخش کا انتقال) |
| ۳ | ۶-۴ | ۱۰۰۹ | ۱ | مسئلہ بقاء الفرقان |
| ۴ | ۱۲-۹ | ۱۰۰۹ | ۱ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۱۶-۱۳ | ۱۰۰۹ | ۱ | واعیان حق کی دعوت |
| ۵ | ۸۵-۸۱ | ۱۰۰۹ | ۱ | ادری حلیع اعظم گڑھ کا مناظرہ |
| ۱ | ۸۶ | ۱۰۰۹ | ۱ | مبارک پور کا مناظرہ اور اعتذار تاخیر |
| ۱ | ۸۷ | ۱۰۰۹ | ۱ | نظر و انتقاد |
| ۳ | ۵-۲ | ۱۱ | ۱ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۱۰-۹ | ۱۱ | ۱ | عشرہ ذی الحجہ |
| ۱ | ۷ | ۱۱ | ۱ | مناظرہ مبارک پور |
| ۱۶ | ۲۴-۹ | ۱۱ | ۱ | اسوۂ ابراہیمی |
| ۱ | ۵۵ | ۱۱ | ۱ | نظر و انتقاد |
| ۵ | ۶-۲ | ۱۲ | ۱ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۲ | محرم الحرام ۱۳۵۵ھ | جلد نمبر ۲ | اسوۂ حسین اور ہم |
| ۳ | ۸-۶ | ۱ | ۲ | بوارق الغیب کا تعارف |
| ۳ | ۵۶-۵۴ | ۱ | ۲ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۳-۲ | ۴۲ | ۲ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۵-۱ | ۴ | ۲ | انسانی غرور اور غفلت |
| ۳ | ۸-۶ | ۴ | ۲ | آخری اتمام حجت |
| ۳ | ۵۶-۵۴ | ۴ | ۲ | |

| | | | |
|---|---------------------------|-----|-------|
| نگاہ اولیں | ۲ | ۵ | ۲۳-۲۴ |
| بوارق الغیب | (کتابی شکل میں دستیاب ہے) | | |
| شعبۃ تبلیغ مجلس احرار اسلام | ۲ | ۵ | ۳۱ |
| نظر و انتقاد | ۲ | ۵ | ۵۶ |
| نگاہ اولیں | ۲ | ۶ | ۵-۲ |
| نبوت اور بشریت | ۲ | ۶ | ۳۳-۳۹ |
| نظر و انتقاد | ۲ | ۶ | ۵۶-۵۵ |
| نگاہ اولیں | ۲ | ۷ | ۲ |
| عبارت حفظ الایمان میں ایک اور ترمیم | ۲ | ۷ | ۶-۲ |
| نبوت و بشریت (قسط ۲) | ۲ | ۷ | ۳۱-۳۲ |
| کسی مفکر المسلمین کی امارت ملت کے ساتھ خطرناک کھیل ہے | ۲ | ۷ | ۵۳-۴۸ |
| نظر و انتقاد | ۲ | ۷ | ۵۶-۵۵ |
| عرض حال | ۲ | ۹.۸ | ۳-۲ |
| نگاہ اولیں | ۲ | ۹.۸ | ۱۳-۵ |
| حساب دوستان | ۲ | ۹.۸ | ۱۶-۱۵ |
| نگاہ اولیں | ۲ | ۱۰ | ۷-۶ |
| عرسوں کے نام پر اسلام کی توہین | ۲ | ۱۰ | ۵۱-۵۰ |
| نگاہ اولیں | ۲ | ۱۱ | ۵-۳ |
| علی پوری امارت کی عبرتناک تاریخ | ۲ | ۱۱ | ۴۸-۱۷ |
| نگاہ اولیں | ۲ | ۱۲ | ۹-۶ |
| مکہ اور مدینہ کے مسافر | ۲ | ۱۲ | ۲۰-۱۰ |
| مناظرہ گیا | ۲ | ۱۲ | ۳۹-۳۸ |
| نگاہ اولیں (افتتاح جلد سوم) | | | ۶-۳ |
| موعظہ و ذکرئی (متعدد اقساط) | | | |

التوحید فی القرآن

۳ ۲۱ ۳۰-۳۳ ۸۱

عالمگیر مذہب

۳ ۲۱ ۶۹-۶۸ ۲

نظروانتقاد

۳ ۲۱ ۱۵۹-۱۵۷ ۳

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۲-۱ ۳۰

میلاد کی ترقی کا ایک اور زینہ

۳ ۳ ۱۰-۹ ۲

معذرت

۳ ۳ ۵۴-۵۳ ۲

مناظرہ بمبئی اور میراچا ایک سفر

۳ ۳ ۵۶-۵۵ ۲

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۲-۱ ۳

تمام اقوام عالم پر بغیر اسلام علیہ السلام کا احسان

۳ ۳ ۸-۵ ۲

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۲ ۱

تمام اقوام عالم پر بغیر اسلام کا احسان (قسط ۲)

۳ ۳ ۸-۴ ۵

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۶-۲ ۵

کچھ ضروری باتیں

۳ ۳ ۱۱-۷ ۵

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۸-۲ ۷

عرض حال

۳ ۳ ۸-۴ ۵

نگاہ اولیں (بابت شہید نمبر)

۳ ۳ ۱۳-۹ ۵

الشہید فی القرآن

۳ ۳ ۱۵ ۱

اکمالات شہید

۳ ۳ ۱۰۱-۸۱ ۲۱

اسباب کفالت

۳ ۳ ۱۰۵-۱۰۳ ۳

حضرت شہیدؒ پر اہلسنۃ انفرآت (متعدد اقساط)

۳ ۳ ۱۲۹-۱۱۳ ۱۷

حضرت شہیدؒ کے متعلق شہداء اللہ فی الارض کی شہادتیں

۳ ۳ ۱۳۳-۱۳۱ ۳

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۲ ۱

رضا خانی خصوصیات کا ارتقاء

۳ ۳ ۸-۶ ۳

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۲ ۱

مدیر الفرقان کا پیغام

۳ ۳ ۳-۲ ۲

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۸-۴ ۵

نگاہ اولیں

۳ ۳ ۱۲ ۵

جلد نمبر ۴

محرم ۱۳۵۶ھ

۱-۲

| | | | | |
|----|-------|-----|------------|---|
| ۶ | ۷-۲ | ۲۲ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۱۸ | ۶۶-۳۹ | ۲۲ | ۴ | خصائص محمدی |
| ۱ | ۲ | ۴ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۱۵-۱۲ | ۴ | ۴ | مدیر الفرقان کا ایک خط |
| ۷ | ۸-۲ | ۵ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۳۵-۳۸ | ۵ | ۴ | مناظرہ سلاوالی اور مولانا ظہور احمد بگٹی مدیر شمس الاسلام |
| ۳ | ۳۸-۳۶ | ۵ | ۴ | استفسار و جواب متعلق قوالی |
| | | ۵ | ۴ | امعان النظر فی اذان القمر |
| ۵ | ۶-۲ | ۶ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۳۲-۳۶ | ۶ | ۴ | نماز اور خطبہ کی زبان (کتابی شکل میں دستیاب ہے) |
| | | ۶ | ۴ | امعان النظر فی اذان القمر |
| ۱۲ | ۲ | ۷ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۴ | ۹.۸ | ۴ | نگاہ اولیں |
| | | | | مسلمانان ہند اور متعین راہ کی کشش (متعدد اقساط) |
| ۸ | ۵۶-۳۹ | ۹.۸ | ۴ | حاضر ناظر |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۰ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۱ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۵۳-۳۹ | ۱۱ | ۴ | مسئلہ شفاعت اور حضرت شہیدؒ |
| ۵ | ۶-۲ | ۱۲ | ۴ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۳۰-۲۵ | ۱۲ | ۴ | ہماری جماعت کے لئے ایک سنگین خطرہ |
| ۶ | ۳۷-۳۲ | ۱۲ | ۴ | مسئلہ شفاعت اور حضرت شہیدؒ (دوسری قسط) |
| ۱ | ۱۳۵ | | جلد نمبر ۵ | اختلافات |
| ۱ | ۲ | ۱ | ۵ | نگاہ اولیں (افتتاح جلد پنجم) |
| ۱ | ۳۳ | ۱ | ۵ | وقت کا اہم ترین فرض |
| ۵ | ۶-۲ | ۳۲ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۳۰-۱۳ | ۳۲ | ۵ | وقت کی پکار اور ہماری غفلت و بے راہ روی |
| ۷ | ۳۳-۳۱ | ۳۲ | ۵ | ایک ضروری انتباہ |
| ۲ | ۳۲ | ۴ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۹-۳ | ۴ | ۵ | جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اصلاح |

| | | | | |
|----|---------|------------|------------|--|
| ۴ | ۵۶-۵۳ | ۴ | ۵ | نگاہ نکل تیرہ |
| ۲۰ | ۳۲ | ۵ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۵-۳ | ۵ | ۵ | عبرت کی باتیں |
| ۵ | ۱۰-۶ | ۵ | ۵ | مولانا ابوالاعلیٰ کوسر |
| ۲ | ۳۲ | ۶ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۹ | ۱۲-۴ | ۶ | ۵ | مولانا مودودی - اکابر جمعیت العلماء اور میں |
| ۵ | ۶-۲ | ۷ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۸-۷ | ۷ | ۵ | عبرت کی باتیں |
| ۳ | ۲۰-۱۷ | ۷ | ۵ | تیجہ |
| ۱۱ | ۵۱-۴۱ | ۷ | ۵ | مسلم لیگ اور القرآن |
| ۱ | ۲۰-۱۷ | ۱۰۰۹۰۸ | ۵ | نذر (مجدد الف ثانی نمبر) |
| ۱۰ | ۱۵-۶ | ۱۰۰۹۰۸ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۳۳ | ۲۸۰-۲۳۷ | ۱۰۰۹۰۸ | ۵ | حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد اور تجدید |
| ۲ | ۳۲ | ۱۲۱۱ | ۵ | نامگاہی آفت کی تفصیل |
| ۵ | ۸-۳ | ۱۲۱۱ | ۵ | نگاہ اولیں |
| ۱۷ | ۳۲-۱۶ | ۱۲۱۱ | ۵ | ہمارا نصب العین اور طریقہ کار |
| ۱ | ۲ | محرم ۱۳۵۵ھ | جلد نمبر ۶ | نگاہ اولیں |
| ۳۰ | ۷۰-۳۱ | محرم ۱ | ۶ | فتنہ رفس و تفصیلیات اور مجدد الف ثانی |
| ۲ | ۳۲ | مفر ۲ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۶۰-۵۷ | مفر ۲ | ۶ | پختہ قبروں سے متعلق ایک استفسار اور اس کا جواب |
| ۳ | ۳۲ | ۳ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۱۸-۱۷ | ۳ | ۶ | سیرت سید احمد شہید رائے بریلوی |
| ۳ | ۵-۲ | ۳ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۳۲ | ۵ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۵۶-۵۳ | ۵ | ۶ | مسئلہ حیات النبیؐ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ |
| ۳ | ۳۲ | ۵ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۱۲-۵۹ | ۶ | ۶ | تعارف بر "النبی الخاتم" |
| ۸ | ۸-۱ | ۹۰۸۰۷ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۸-۱ | ۹۰۸۰۷ | ۶ | خاکسار تحریک - مذہب و سیاست کی روشنی میں |

| | | | |
|-----|------------|------------|--|
| ۶۳ | ۱۱۱۰ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۶۳ | ۱۲ | ۶ | نگاہ اولیں |
| ۹۵ | ۱۲ | ۶ | منہائے گفتنی |
| ۶۱۰ | ۱۲ | ۶ | امیرناطق کا مفہوم۔ جو مشرقی نے سمجھا |
| ۱ | محرم ۱۳۵۹ھ | جلد نمبر ۷ | نگاہ اولیں |
| ۸۲ | ۳۲ | ۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۲ | ۳۲ | ۷ | پاکستانی اسکیم کے چند قابل غور پہلو |
| ۲ | ۴ | ۷ | نگاہ اولیں |
| ۸۲ | ۴ | ۷ | حکومت پنجاب اور خاکساروں کی موجودہ آویزش |
| ۳۲ | ۵ | ۷ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۵ | ۷ | قوم کی خدمت اور مذہب سے بغاوت |
| ۵۵ | ۵ | ۷ | خاکسار تحریک، مذہب و سیاست کی روشنی میں |
| ۴ | ۶ | ۷ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۶ | ۷ | بے دین کی بزدلانہ جانبازی |
| ۸۲ | ۶ | ۷ | دو گراہیاں |
| ۱ | ۷ | ۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۶ | ۷ | ۷ | قرآن کس معنی میں کلام خدا ہے؟ (نیا زنجیری کو جواب) |
| ۱۲ | ۸ | ۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۱۲۶۹ | ۷ | نگاہ اولیں (شاہ ولی اللہ نمبر) |
| ۳۵ | ۱۲۶۹ | ۷ | شاہ صاحب اور ان کے کام کا مختصر تعارف |
| ۲ | محرم ۱۳۶۰ھ | جلد نمبر ۸ | انتخاب جلد ہفتم |
| ۲ | ۸ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۸ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۲ | ۸ | ۸ | گفتگو کا ۱۲ رोज الاول والا جلوس |
| ۸ | ۸ | ۸ | ایک ہفتہ بیسی میں |
| ۲ | ۸ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۸ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۳ | ۸ | ۸ | ولی الہی افادات و ہدایات |
| ۸ | ۸ | ۸ | مطبوعات جدیدہ |

| | | | | |
|----|-------|-----------------|------------|---|
| ۴ | ۵۲ | ۴ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۶ | ۴ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۲ | بیہج | ۶.۵ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۵ | ۶.۵ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۹۶ | ۹۶.۱ | ۶.۵ | ۸ | خطبات یحییٰ (سات خطبے) |
| ۱ | ۲ | ۷ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۲۳.۱۷ | ۷ | ۸ | خطبات یحییٰ (آٹھواں خطبہ) |
| ۷ | ۵۲.۴۶ | ۷ | ۸ | مطبوعات جدیدہ |
| ۲ | ۳.۲ | ۸ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۶.۴ | ۸ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۲ | ۵۰.۴۹ | ۸ | ۸ | کلمہ آخرہ |
| ۳ | ۴.۲ | ۹ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۸.۶ | ۹ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۳ | ۸.۶ | ۹ | ۸ | رمضان مبارک کے بعد عید کا دن - یہ تمام پروگرام |
| ۱ | ۲ | ۱۰ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۴.۳ | ۱۰ | ۸ | یادِ رفتگان (حضرت مولانا حسین علی شاہ، مولانا جہانگیر علی صاحبزادہ) |
| ۳ | ۷.۵ | ۱۰ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۳۸ | ۵۲.۱۷ | ۱۰ | ۸ | ایک دینی تحریک کا تعارف (دستور جماعت اسلامی) |
| ۴ | ۵.۲ | ۱۲.۱۱ | ۸ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۷.۶ | ۱۲.۱۱ | ۸ | عبرت کی باتیں |
| ۴ | ۱۱.۸ | ۱۲.۱۱ | ۸ | منتجات |
| ۱۱ | ۲۳.۱۳ | ۱۲.۱۱ | ۸ | کچھ جماعت اسلامی کے متعلق |
| | ۷.۸۸ | ۱۲.۱۱ | ۸ | اشتراک اور اس کا پس منظر |
| ۱ | ۲ | محرم، مفر ۱۳۱۱ھ | جلد نمبر ۹ | نگاہ اولیں (افتتاح جلد نمبر) |
| ۵ | ۷.۳ | ۵.۴۲۳ | ۹ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۹.۸ | ۵.۴۲۳ | ۹ | خبرائے گفتنی |
| ۶ | ۱۵.۱۰ | ۵.۴۲۳ | ۹ | تذکرہ مولانا شکر اللہ مرحوم |
| | | ۵.۴۲۳ | ۹ | عبرت کی باتیں |
| ۲ | ۲۲.۲۱ | ۵.۴۲۳ | ۹ | بصیرت کی باتیں |

دوستوں کو ایک ضروری اطلاع

نگاہ اولیں

جماعت اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت

نگاہ اولیں

عبرت کی باتیں

بصیرت کی باتیں

مقاصد اور حقائق سے روگردانی اور زوائد یا ادہام میں..

منتجات

نخبائے گفتنی

معارف الحدیث

چینی اور بڑو غیرہ کی گزریوں اور موروثوں کا شرعی حکم

نگاہ اولیں (دو بزرگوں دو دین کے بڑے عالموں کی وفات)

۱۔ حضرت مولانا شاہ ولایت حسین گبادی

۲۔ استاذی حضرت مولانا کریم بخش شنبلی

حکمت اور بصیرت کی باتیں

عبرت کی باتیں

عیداضے کے متعلق چند نکات

نگاہ اولیں

نگاہ اولیں

عبرت کی باتیں

موعظۃ المقمرہ (حاجی محمود حسین مرحوم کی تدفین پر تقریر)

نگاہ اولیں

فرض کیجئے اگر رسول اللہ اس زمانہ میں ہوتے

اسلامی قلعے یا ہمارے دینی مدارس

نگاہ اولیں

راجپال کا نیا جنم شیعوں میں

نیک ارادہ کے ساتھ سنیابی

تھوڑے وقت میں عربی تعلیم کے چند اصول

اس وقت کا ایک خاص فریضہ

رفیقہ حیات کی مفارقت کا صدمہ

نگاہ اولیں

| | | | |
|----|-------|--------------------------|-------------|
| ۱ | ۲ | ۶ | ۹ |
| ۶ | ۸-۳ | ۶ | ۹ |
| ۱۵ | ۳۱-۱۷ | ۶ | ۹ |
| ۴ | ۵-۲ | ۷ | ۹ |
| ۱ | ۶ | ۷ | ۹ |
| ۲ | ۸-۷ | ۷ | ۹ |
| ۸ | ۱۶-۹ | ۷ | ۹ |
| ۸ | ۲۳-۱۷ | ۷ | ۹ |
| ۱ | ۳ | شعبان ۸ | ۹ |
| | | میں مکمل ہو کر دستیاب ہے | (۸ جلدوں) |
| ۴ | ۴۷-۴۴ | ۸ | ۹ |
| ۶ | ۷-۲ | ۱۰۰۹ | ۹ |
| ۶ | ۱۰-۵ | ۱۰۰۹ | ۹ |
| ۱ | ۱۱ | ۱۰۰۹ | ۹ |
| ۳ | ۱۴-۱۲ | ۱۰۰۹ | ۹ |
| ۷ | ۸-۲ | ۱۲۰۱۱ | ۹ |
| ۳ | ۴-۲ | محرم ۱۳۶۲ھ | جلد نمبر ۱۰ |
| ۳ | ۷-۵ | ۱ | ۱۰ |
| ۱۰ | ۱۸-۹ | ۱ | ۱۰ |
| ۷ | ۸-۲ | ۴۰۲ | ۱۰ |
| ۸ | ۱۶-۹ | ۴۰۲ | ۱۰ |
| ۱۶ | ۳۲-۱۷ | ۴۰۲ | ۱۰ |
| ۲ | ۳-۲ | ۶۰۵ | ۱۰ |
| ۲ | ۵-۳ | ۶۰۵ | ۱۰ |
| ۱۱ | ۱۶-۶ | ۶۰۵ | ۱۰ |
| ۸ | ۲۳-۱۷ | ۶۰۵ | ۱۰ |
| ۱۲ | ۴۰-۲۹ | ۶۰۵ | ۱۰ |
| ۲ | الف-ب | ۸۰۷ | ۱۰ |
| ۲ | ۴-۲ | ۸۰۷ | ۱۰ |

ماہ مبارک کی آمد
نگاہ اولیں

عام الحزن یا سالِ غم
اکابر و احباب کا شکر یہ

صبر کی برکات اور صابروں کے لئے بشارت
خاتمہ جلد دہم

افتتاح جلد یازدہم
عبرت کی باتیں

نگاہ اولیں

نصرت دین و اصلاح المسلمین کی ایک کوشش

نگاہ اولیں (اللہ کے لئے جینے مرنے والا اللہ کا ایک بندہ)

کیا زندوں کے اعمال سے مردوں کو نفع و ثواب پہنچ سکتا ہے؟
تبلیغ دین اور اصلاح امت کا اخروی اجر

حضرات انبیاء کا کام و پیغام اور خیر امت کی ذمہ داری
نگاہ اولیں

میری زندگی کے تجربے مع ضمیر مقبول دعائیں

شمارہ دستیاب نہیں

شمارے دستیاب نہیں

نگاہ اولیں

برکاتِ رمضان (کتابی شکل میں دستیاب ہے)

نگاہ اولیں

دینی انقلاب کی ایک جدوجہد

شمارہ دستیاب نہیں

شمارہ دستیاب نہیں

افتتاح سیزدہم

نگاہ اولیں

عبرت کی باتیں

انبیاء علیہم السلام کا کام و پیغام اور ہمارے موجودہ مشاغل

ارشادات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

| | | | |
|----|-------|-------------------|-------------|
| ۹ | ۳۸-۴۰ | ۸۰۷ | ۱۰ |
| ۱ | ۲ | ۹ | ۱۰ |
| ۳ | ۲۴-۲۱ | ۹ | ۱۰ |
| ۱ | ۱۱ | ۱۰ | ۱۰ |
| ۲ | ۱۳-۱۲ | ۱۰ | ۱۰ |
| ۳ | ۴-۲ | ۱۲:۱۱ | ۱۰ |
| ۱ | ۲ | محرم، صفر ۱۳۶۳ھ | جلد نمبر ۱۱ |
| | | ۶۰۳ | ۱۱ |
| ۲ | ۶-۵ | ۶۰۵ | ۱۱ |
| ۳۹ | ۷۹-۴۱ | ۶۰۵ | ۱۱ |
| ۷ | ۸-۲ | ۸۰۷ | ۱۱ |
| ۴۸ | ۸۸-۴۱ | ۸۰۷ | ۱۱ |
| ۲ | ۸-۷ | ۱۰۰۹ | ۱۱ |
| ۸ | ۱۶-۹ | ۱۰۰۹ | ۱۱ |
| ۱ | ۲ | ۱۲:۱۱ | ۱۱ |
| ۳۸ | ۴۰-۳ | ۱۲:۱۱ | ۱۱ |
| | | محرم ۱۳۶۳ھ | جلد نمبر ۱۲ |
| | | ۶۵۲ | ۱۲ |
| ۴ | ۵-۲ | ۸۰۷ | ۱۲ |
| | | | |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۰۰۹ | ۱۲ |
| ۲۴ | ۴۰-۱۷ | ۱۰۰۹ | ۱۲ |
| | | ۱۱ | ۱۲ |
| | | ۱۲ | ۱۲ |
| ۱ | ۲ | محرم الحرام ۱۳۶۵ھ | جلد نمبر ۱۳ |
| ۳ | ۵-۳ | ۱ | ۱۳ |
| ۲ | ۷-۶ | ۱ | ۱۳ |
| ۹ | ۱۶-۸ | ۱ | ۱۳ |
| ۵ | ۲۶-۲۲ | ۱ | ۱۳ |

| | | | | |
|----|-------|-------------------|-------------|--|
| ۳ | ۴۲ | ۲ | ۱۳ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۶۵ | ۲ | ۱۳ | عبرت کی باتیں |
| ۶ | ۱۲۷ | ۲ | ۱۳ | تبلیغی تحریک اور موجودہ سیاسی کشمکش |
| ۴ | ۱۶-۱۳ | ۲ | ۱۳ | تبلیغی تحریک اور موجودہ علماء کرام |
| ۲ | ۲ | ۴۳ | ۱۳ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۸۳ | ۴۳ | ۱۳ | ہمارے دینی اقتصادات اور قومی مفادات کی کشمکش |
| ۴ | ۱۶-۱۳ | ۴۳ | ۱۳ | جماعت تبلیغ کے متعلق چند خاص تصریحات |
| ۸ | ۳۳-۱۷ | ۴۳ | ۱۳ | ارشادات مولانا محمد الیاسؒ |
| ۲۳ | ۲۸-۲۵ | ۴۳ | ۱۳ | نبی اُمی کی تعلیم (کلمہ طیبہ کی تشریح) |
| ۱۲ | ۷۲-۶۱ | ۴۳ | ۱۳ | ایک گمراہ کن مغالطہ |
| ۸ | ۸۰-۷۳ | ۴۳ | ۱۳ | کلمہ طیبہ کی تشریح کا بقیہ |
| ۱ | ۲ | ۶۵ | ۱۳ | خنہائے گفنی |
| ۱۱ | ۱۳-۳ | ۶۵ | ۱۳ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۱۹-۱۶ | ۶۵ | ۱۳ | انتخابی جنگ میں دین و اخلاق کی پامالی پر الفرقان کا احتساب |
| ۶ | ۴۰-۳۵ | ۶۵ | ۱۳ | ارشادات مولانا محمد الیاسؒ |
| ۲۳ | ۶۲-۴۱ | ۶۵ | ۱۳ | نماز کی فضیلت و اہمیت اور اس کی حقیقت |
| ۵ | ۶۲ | ۸۷ | ۱۳ | نگاہ اولیں |
| ۳۲ | ۵۶-۲۵ | ۸۷ | ۱۳ | نماز کی فضیلت و اہمیت اور اس کی حقیقت |
| ۳ | ۴۲ | ۱۰۹ | ۱۳ | خنہائے گفنی |
| ۸ | ۱۲۵ | ۱۰۹ | ۱۳ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۳۲-۲۵ | ۱۰۹ | ۱۳ | نماز کی فضیلت و اہمیت اور اس کی حقیقت |
| ۱۱ | ۱۲۲ | ۱۲۱ | ۱۳ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۲ | محرم الحرام ۱۳۶۶ھ | جلد نمبر ۱۴ | افتتاح جلد چہارم |
| ۶ | ۸۳ | ۱ | ۱۴ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۴۲ | ۲ | ۱۴ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۱۰۵ | ۲ | ۱۴ | دین کا ایک مظلوم شعبہ |
| ۱ | ۲ | ۴۳ | ۱۴ | خنہائے گفنی |
| ۶ | ۱۶-۱۱ | ۴۳ | ۱۴ | ارشادات مولانا محمد الیاسؒ |
| ۲ | ۳۲ | ۶۵ | ۱۴ | نگاہ اولیں |

| | | | | |
|----|-----------|-------------------|-------------|---|
| ۱۹ | ۲۲-۳ | ۶۰۵ | ۱۴ | کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان اپنے طریق کار پر غور کریں |
| ۱۶ | ۳۹-۲۳ | ۶۰۵ | ۱۴ | ارشادات حضرت مولانا محمد الیاسؒ |
| ۱۰ | ۱۳-۴ | ۷ | ۱۴ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۲۴-۱۸ | ۷ | ۱۴ | مسلمانوں میں اصلاح تبلیغ کا کام اور مولانا الیاسؒ کا طریق کار |
| ۸ | ۶۴-۵۷ | ۹۰۸ | ۱۴ | حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے بعض مکاتیب |
| ۳ | ۴-۲ | ۱۰ | ۱۴ | تقریرت (تقسیم کے وقت پنجاب میں مسلمانوں کے نقل عام پر) |
| ۵ | ۹-۵ | ۱۰ | ۱۴ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۱۴-۱۰ | ۱۰ | ۱۴ | پاکستان میں اسلامی نظام کی ذمہ داری |
| ۳ | ۱۷-۱۵ | ۱۰ | ۱۴ | پاکستان کی دینی حالت |
| ۵ | ۵۳-۴۹ | ۱۰ | ۱۴ | ضمیمہ (موجودہ حالات میں مسلمانوں کو چند مشورے) |
| ۴ | ۷-۴ | ۱۲۰۱۱ | ۱۴ | نگاہ اولیں |
| ۱۱ | ۲۸-۱۸ | ۱۲۰۱۱ | ۱۴ | مسلمانوں کی کمزوری اور مغلوبی کا بنیادی سبب |
| ۴ | ۸۰-۷۷ | ۱۲۰۱۱ | ۱۴ | مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے |
| ۳ | ۴-۲ | محرم الحرام ۱۳۶۷ھ | جلد نمبر ۱۵ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۱۰-۵ | ۱ | ۱۵ | مسلمانوں کی کمزوری کا بنیادی سبب |
| ۲ | ۵-۲ | ۴۰۳۰۲ | ۱۵ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۳۲-۲۵ | ۴۰۳۰۲ | ۱۵ | مسلمانوں کی کمزوری کے بنیادی اسباب |
| ۳۲ | ۶۴-۳۳ | ۴۰۳۰۲ | ۱۵ | اسلام کیا ہے؟ (متعدد اقسام - کتابی شکل میں دستیاب ہے) |
| ۴ | ضمیمہ ۱-۴ | ۴۰۳۰۲ | ۱۵ | مسلمان قوم کا سب سے اہم مسئلہ (بخدمت رہنمایان قوم) |
| ۴ | ضمیمہ ۵-۸ | ۴۰۳۰۲ | ۱۵ | مستقبل میں مسلمان کس طرح اسلام پر قائم رہ سکتے ہیں؟ |
| ۲ | ۵-۴ | ۶۰۵ | ۱۵ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۲۸-۱۹ | ۶۰۵ | ۱۵ | پاکستان میں دینی و اصلاحی کام کی ضرورت |
| ۳ | ۴-۲ | ۷ | ۱۵ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۶-۴ | ۷ | ۱۵ | گانڈھی جی کے متعلق افراط و تفریط |
| ۶ | ۸-۳ | ۸ | ۱۵ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۱۱-۲ | ۹ | ۱۵ | نگاہ اولیں (والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ) |
| ۳ | ۱۴-۱۲ | ۹ | ۱۵ | عازمین حج کو چند دینی مشورے |
| ۱۳ | ۳۸-۲۶ | ۹ | ۱۵ | ارشادات حضرت مولانا محمد الیاسؒ |
| | | ۱۳۴۱۰ | ۱۵ | شمارے دستیاب نہیں |

| | | | | |
|----|---------|-------------------|-------------|--|
| ۲ | ۴۳ | محرم و صفر ۱۳۶۵ھ | جلد نمبر ۱۶ | افتتاح جلد شانزدہم |
| ۲ | ۱۰-۹ | ۲۱ | ۱۶ | ایک خط کا اقتباس (ادارہ) |
| ۶ | ۱۶-۱۱ | ۲۱ | ۱۶ | اسلام اور نظریہ وحدت ادیان |
| ۱ | ۳ | ۳ | ۱۶ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۱۵-۱۰ | ۳ | ۱۶ | مسلمانان ہند کے لئے دوراستے (ادارہ) |
| ۲ | ۴-۳ | ۴ | ۱۶ | اپنے ناظرین سے |
| ۲ | ۱۰-۹ | ۴ | ۱۶ | عبرت کی باتیں |
| ۶ | ۱۶-۱۱ | ۴ | ۱۶ | اسلام کے تین بنیادی عقیدے اور موجودہ مسلمان (ادارہ) |
| ۱ | ۴۸ | ۴ | ۱۶ | ایک مصرف خیر کی اطلاع (مرکز والی مسجد کی تعمیر) |
| ۳ | ۴-۲ | ۵ | ۱۶ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۶-۲ | ۶ | ۱۶ | نگاہ اولیں |
| ۱۱ | ۱۷-۷ | ۶ | ۱۶ | ہندوستانی مسلمانوں کا دینی مستقبل (۱) |
| ۶ | ۲۳-۱۸ | ۶ | ۱۶ | دعوت اصلاح و تبلیغ اور اس کے محرکات |
| ۲ | ۸-۷ | ۷ | ۱۶ | عبرت کی باتیں |
| ۴ | ۶-۳ | ۸ | ۱۶ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۱۶-۷ | ۸ | ۱۶ | ہندوستانی مسلمانوں کا دینی مستقبل (۲) |
| ۱۴ | ۵۲-۴۹ | ۸ | ۱۶ | عازمین حج کو چند مشورے |
| ۶ | ۱۰-۵ | ۱۰-۹ | ۱۶ | نگاہ اولیں (پہلا جج نمبر) |
| ۶ | ۱۶-۱۱ | ۱۰-۹ | ۱۶ | مکہ، مدینہ اور حج و زیارت |
| ۵ | ۱۴۲-۱۳۸ | ۱۰-۹ | ۱۶ | حج میں اصلاحی و تبلیغی کام کی ضرورت اور اس کا طریقہ |
| ۶ | ۸-۳ | ۱۱ | ۱۶ | نگاہ اولیں |
| ۱۲ | ۲۰-۹ | ۱۱ | ۱۶ | اکابر جمعیتہ العلماء اور الفرقان |
| ۱۱ | ۱۷-۷ | ۱۲ | ۱۶ | ہندوستانی مسلمانوں کا دینی مستقبل (۳) |
| ۱۲ | ۲۰-۹ | محرم الحرام ۱۳۶۹ھ | جلد نمبر ۱۷ | مکتوب حرم (مکتوبات مدیر بنام مولانا ابوالحسن علی ندوی) |
| ۱۳ | ۱۹-۷ | ۳ | ۱۷ | اصلی اسلامی زندگی اور اس کا مثالی نمونہ (۱) |
| ۶ | ۲۳-۱۹ | ۳ | ۱۷ | سفر حجاز کے بعض تجربات اور تاثرات (۱) |
| ۱۰ | ۱۶-۷ | ۴ | ۱۷ | اصلی اسلامی زندگی... پھر سے پیدا کرنے کی ضرورت (۲) |
| ۱۰ | ۴۰-۳۱ | ۴ | ۱۷ | ذکر اللہ |
| ۹ | ۵۱-۴۳ | ۴ | ۱۷ | سفر حجاز کے بعض تجربات اور تاثرات (۲) |

| | | | | |
|----|--------|-------------------|----|--|
| ۹ | ۱۵-۷ | ۵ | ۱۷ | مسلمان کے معنی اور دنیا میں اس کا امتیاز |
| ۹ | ۳۸-۳۰ | ۵ | ۱۷ | سفر حجاز کے بعض تجربات اور تاثرات (۳) |
| ۶ | ۸-۳ | ۶ | ۱۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۲ | ۲۰-۹ | ۶ | ۱۷ | ہماری دینی دعوت |
| ۵ | ۸-۳ | ۷ | ۱۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۶ | ۲۳-۹ | ۷ | ۱۷ | ہماری موجودہ مشکلات کا ایک یقینی حل |
| ۲ | ۳-۳ | ۱۰۰۹، ۸ | ۱۷ | نخبائے گفتمنی (دوسرا ج نمبر) |
| ۵۹ | ۱۳۳-۸۵ | ۱۰۰۹، ۸ | ۱۷ | آپ حج کس طرح کریں؟ |
| ۳ | ۳-۲ | ۱۱ | ۱۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۱ | ۱۵-۵ | ۱۱ | ۱۷ | تصوف اور اس کے اعمال و اشغال (۱) |
| ۸ | ۱۶-۹ | ۱۲ | ۱۷ | تصوف اور اس کے اعمال و اشغال (۲) |
| ۱ | ۲ | محرم الحرام ۱۳۷۰ھ | ۱۸ | افتتاح جلد ہیز دہم |
| ۷ | ۱۳-۸ | ۱ | ۱۸ | تصوف اور اس کے اعمال و اشغال (۳) |
| ۶ | ۱۵-۱۰ | ۲ | ۱۸ | تصوف اور اس کے اعمال و اشغال (۴) |
| ۸ | ۳۹-۳۲ | ۲ | ۱۸ | مکتوبات امام ربانی |
| ۵ | ۵۰-۳۶ | ۲ | ۱۸ | ایک مسئلہ کی وضاحت (بابت ٹوتھ برش) |
| ۳ | ۵-۳ | ۳ | ۱۸ | نگاہ اولیں |
| ۱۱ | ۱۶-۶ | ۳ | ۱۸ | ایمانی زندگی اور اس کے لئے جدوجہد (۱) |
| ۴ | ۶-۳ | ۴ | ۱۸ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۱۶-۷ | ۴ | ۱۸ | ایمانی زندگی اور اس کے لئے جدوجہد (۲) |
| ۲ | ۳۵-۳۳ | ۴ | ۱۸ | ایک ستم رسیدہ اور مظلوم کے نام مدیر الفرقان کا مکتوب |
| ۶ | ۱۰-۵ | ۷ | ۱۸ | تصوف کے طالبوں کو چند مشورے |
| ۹ | ۳۲-۲۳ | ۷ | ۱۸ | انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ |
| ۲۶ | ۵۹-۳۳ | ۱۰۰۹ | ۱۸ | آسان حج (تیسرا ج نمبر) |
| ۲۳ | ۲۸-۵ | ۱۱ | ۱۸ | جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے |
| ۱ | ۵۲ | ۱۱ | ۱۸ | ناظرین الفرقان کی خدمت میں ایک مکتوب، حج کو جاتے وقت |
| ۱ | ۲ | محرم الحرام ۱۳۷۱ھ | ۱۹ | افتتاح جلد نو زدہم |
| ۳ | ۶-۳ | ۱ | ۱۹ | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۸-۷ | ۱ | ۱۹ | جماعت اسلامی سے متعلق مضمون کا کملہ |

امام ابن تیمیہ وابن القیم، ولی الہی کب خیل کی نظر میں

۱۹ ۱ ۲۲-۲۹ ۴

مکتوب حرمین

۱۹ ۱ ۲۵-۲۳ ۱۳

مکہ معظمہ سے لکھنؤ تک

۱۹ ۱ ۵۵-۳۶ ۱۰

نگاہ اولیں

۱۹ ۲۲ ۲-۲ ۳

نیا ایمان کیا ہے اور کس طرح وہ پیدا ہوتا ہے؟

۱۹ ۲۲ ۲۶-۵۷ ۱۰

دعوت اصلاح و تبلیغ کے رنقاء سے خاص خطاب

۱۹ ۲۲ ۸۳-۷۵ ۹

میری غلطیاں

۱۹ ۲۲ ۹۳-۸۵ ۱۰

نگاہ اولیں

۱۹ ۳ ۲-۲ ۳

ہماری دعوت اور اس کا طریقہ کار

۱۹ ۳ ۲۹-۲۹ ۱۱

حیوانی زندگی اور ایمانی زندگی

۱۹ ۵ ۱۷-۱۰ ۸

نگاہ اولیں

۱۹ ۶ ۲-۲ ۳

انبیاء کی دعوت اور ہماری حالت

۱۹ ۶ ۱۸-۱۱ ۸

نگاہ اولیں

۱۹ ۷ ۲-۲ ۳۰

ڈیڑھ مہینے پاکستان میں

۱۹ ۷ ۲۱-۲۷ ۱۵

نگاہ اولیں

۱۹ ۸ ۲-۲ ۲

ماہ رحمت

۱۹ ۸ ۲۳-۲۶ ۱۸

ملاوت قرآن سے متعلق ایک مسئلہ کی وضاحت

۱۹ ۱۰۹ ۲۴-۵۷ ۸

حجائ منزل جہدہ اور اس کی جامع مسجد

۱۹ ۱۰۹ ۲۹-۲۵ ۵

استدراک (بلسلہ مضمون "ڈیڑھ مہینے پاکستان میں")

۱۹ ۱۰۹ ۷۲-۷۰ ۳

خاتمہ جلد نو ذہم

۱۹ ۱۲ ۲-۲ ۲

نگاہ اولیں

۱۹ ۱۲ ۵۰-۳۱۰ ۱۰

جرم عظیم

۱۹ ۱۲ ۵۰-۳۱۰ ۱۰

افتتاح جلد ہفتم

۱۹ ۱۲ ۵۰-۳۱۰ ۱۰

نگاہ اولیں

۲۰ ۱ ۲۳-۲۳ ۲۰

قرآنی دعوت (کتابی شکل میں قرآن آپ سے کیا کہتا ہے کے نام سے دستیاب ہے)

۲۰ ۱ ۵۱-۳۵ ۷

قادیانیوں کا معاملہ

۲۰ ۲ ۱۵-۶ ۱۰

نگاہ اولیں

۲۰ ۲ ۵۶-۲۱ ۱۶

ختم نبوت اور قادیانی فتنہ

۲۰ ۵۰۴۳ ۸-۳ ۶

نگاہ اولیں

| | | | | دین و شریعت | (کتابی شکل میں دستیاب ہے) |
|-----|---------|-------------------|-------------|---|---------------------------|
| | | | | ہماری دعوت کا مقصد اور اس کے اصول | |
| ۱۵ | ۱۱۷-۱۰۲ | ۵۰۴۳ | ۲۰ | قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ | (کتابی شکل میں دستیاب ہے) |
| | | | | نگاہ اولیں | |
| ۳ | ۵-۳ | رجع الثانی ۱۳۷۳ھ | جلد نمبر ۲۱ | حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ (۱) | |
| ۱۱ | ۵۰-۴۰ | ۲ | ۲۱ | حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ (۲) | |
| ۱۱ | ۳۳-۳۳ | ۵ | ۲۱ | انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ (تقریر) | |
| ۲۵ | ۷۲-۴۶ | ۱۰۰۹ | ۲۱ | بریلی کا کٹھیری فقہ۔ ماضی اور حال | |
| ۱۶ | ۳۲-۱۷ | ۱۱ | ۲۱ | نگاہ اولیں | |
| ۲ | ۳-۲ | رجع الاول ۱۳۷۴ھ | جلد نمبر ۲۲ | شفیق ترین استاذ کی یاد | |
| ۴ | ۶۰-۵۷ | ۷ | ۲۲ | ہماری موجودہ زندگی کے خطرناک نتائج (تقریر) | |
| ۱۱ | ۵۷-۴۷ | ۹۰۸ | ۲۲ | مسلمانوں کی موجودہ زندگی اور اس کے اثرات و نتائج | |
| ۱۲ | ۳۲-۳۱ | ۱۰ | ۲۲ | خطبہ عید | (تقریر) |
| ۹ | ۲۲-۱۶ | محرم الحرام ۱۳۷۵ھ | جلد نمبر ۲۳ | مسئلہ نزول مسیح۔ چند شبہات کا جواب | |
| ۱۷ | ۲۹-۱۳ | ۲ | ۲۳ | دنیا اور آخرت کے بارے میں ہمارا رویہ (تقریر) | |
| ۱۳ | ۳۵-۳۳ | ۵ | ۲۳ | عبادت نبوی | |
| ۱۴ | ۱۸-۵ | ۶ | ۲۳ | مسلمانوں کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ (تقریر) | |
| ۹ | ۶۰-۵۲ | ۱۰۰۹ | ۲۳ | تبلیغی کام کے متعلق بعض توضیحات | |
| ۹ | ۵۳-۴۵ | ۱۱ | ۲۳ | نگاہ اولیں | |
| ۳ | ۲-۲ | صفر ۱۳۷۶ھ | جلد نمبر ۲۴ | دنیا کا سب سے بڑا خلا اور مسلمانوں کا فرض (تقریر) | |
| ۸ | ۳۲-۲۷ | ۶ | ۲۴ | ماہ مبارک کا استقبال | (تقریر) |
| ۲۱ | ۷۷-۵۷ | ۸۰۷ | ۲۴ | مولانا گیلانی اور الفرقان | (اقادات گیلانی نمبر) |
| ۶ | ۳۳-۳۹ | ۱۲۱۱، ۱۰ | ۲۴ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کے چند گوشے | |
| ۱۶ | ۳۰-۵۲ | صفر المظفر ۱۳۷۷ھ | جلد نمبر ۲۵ | نگاہ اولیں | |
| ۳ | ۲-۲ | ۲ | ۲۵ | نامہ غم (مکتوب مولانا نعمانی از پاکستان بر رحلت حضرت مدنی) | |
| ۲ | ۵۰-۳۹ | ۵ | ۲۵ | حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے میری واقفیت اور تاثرات | |
| ۱۵ | ۳۲-۱۸ | ۶ | ۲۵ | مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے میرا تعلق | |
| | | | | اور میری رائے کے مختلف دور | |
| ۴۵۰ | ۹۹-۵۵ | ۹۰۸ | ۲۵ | چند توضیحات | |
| ۵ | ۳۹-۳۵ | ۱۰ | ۲۵ | | |

| | | | | |
|----|-------|-----------|----|---|
| ۵ | ۵۴-۵۰ | ۱۰ | ۲۵ | ایک خط اور اس کا جواب |
| ۹ | ۴۴-۲۶ | ۱۱ | ۲۵ | دین کی خدمت و نصرت (۱) |
| ۹ | ۴۹-۴۱ | ۱۱ | ۲۵ | دوسوالوں کا جواب |
| ۱۴ | ۲۶-۱۳ | ۱۲ | ۲۵ | دین کی خدمت و نصرت (۲) |
| ۷ | ۸-۲ | ۱۳ | ۲۶ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵-۲ | ۳ | ۲۶ | نگاہ اولیں |
| ۱۲ | ۳۸-۲۷ | ۴ | ۲۶ | مسئلہ حیات النبیؐ |
| ۱۵ | ۲۳-۹ | ۶ | ۲۶ | امت مسلمہ کا مقصد اور تبلیغی جدوجہد (تقریر) |
| ۸ | ۱۳-۶ | ۷ | ۲۶ | نگاہ اولیں |
| ۹ | ۳۱-۲۳ | ۷ | ۲۶ | مجددیت کی حقیقت |
| ۱۳ | ۳۸-۳۶ | ۸ | ۲۶ | خطبہ رمضان (تقریر) |
| ۶ | ۴۵-۴۰ | ۱۲ | ۲۶ | غیر اسلامی حکومت کی شرکت اور ملازمت |
| ۹ | ۳۲-۲۴ | ۱۳ | ۲۶ | حقیقت ایمان |
| ۶ | ۸۸-۸۳ | ۱۱، ۱۰، ۹ | ۲۷ | چند دینی سوالات و جوابات |
| ۵ | ۹۴-۹۰ | ۱۱، ۱۰، ۹ | ۲۷ | ایک بیش بہا علمی تحفہ ”الاتحاف“ |
| ۶ | ۳۳-۲۸ | ۱۲ | ۲۷ | اللہ کا ایک بندہ (حاجی عبدالغفور صاحب جوہرپوری) (۱) |
| ۶ | ۴۵-۴۰ | ۱۲ | ۲۷ | تبلیغی جماعت اور بعض شکایات |
| ۱۲ | ۳۸-۲۷ | ۱۳ | ۲۸ | اللہ کا ایک بندہ (حاجی عبدالغفور صاحب جوہرپوری) (۲) |
| ۳ | ۴۷-۴۵ | ۳ | ۲۸ | صحیحہ بااولیاء |
| ۷ | ۷۰-۶۴ | ۶، ۵ | ۲۸ | دینی تعلیمی تحریک کا پس منظر |
| ۱۱ | ۵۳-۴۳ | ۱۳ | ۲۹ | جلد نمبر ۲۹ رجب الاول ۱۳۸۱ھ |
| ۱ | ۶۵-۴ | ۳ | ۲۹ | مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری |
| ۷ | ۶۸-۴ | ۴ | ۲۹ | صحیحہ بااولیاء |
| ۵ | ۴۶-۴۲ | ۴ | ۲۹ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۴۹ | ۹ | ۲۹ | صحیحہ بااولیاء |
| ۱۰ | ۴۹-۴۰ | ۱۱ | ۲۹ | ساعتی بااولیاء |
| ۶ | ۷۰-۶۴ | ۱۲ | ۲۹ | حضرت مولانا عبدالغفور فاروقی |
| ۱۱ | ۱۲-۲ | ۱۳ | ۲۹ | نگاہ اولیں |
| ۱۱ | ۴۵-۳۵ | ۳ | ۳۰ | نگاہ اولیں (مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ) (تقریر) |
| ۱۱ | ۴۵-۳۵ | ۳ | ۳۰ | پیغام |

| | | | | |
|----|---------|-------------------|-------------|---|
| ۵ | ۶-۲ | ۵ | ۳۰ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۶-۲ | ۶ | ۳۰ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۸-۲ | ۷ | ۳۰ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۶-۲ | ۸ | ۳۰ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۱۱۳-۱۱۱ | ۱۱، ۱۰، ۹ | ۳۰ | فن حدیث کا پیش بہاتحہ "مسند حمیدی" |
| ۴ | ۴۶-۴۳ | ۱۲ | ۳۰ | ایک عظیم سامعہ (مولانا محمد میاں بن موسیٰ میاں سورتی) |
| ۱ | ۲ | محرم الحرام ۱۳۸۳ھ | جلد نمبر ۳۱ | افتتاحیہ جلدی ویکم |
| ۲ | ۴-۳ | ۱ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۱۳ | ۴۷-۳۵ | ۱ | ۳۱ | حرمین شریفین کی حاضری۔ بعض واقعات و تاثرات (۱) |
| ۲ | ۵-۲ | ۳، ۲ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۱۵ | ۱۰۷-۹۳ | ۳، ۲ | ۳۱ | حرمین شریفین کی حاضری (قط-۲) |
| ۵ | ۶-۲ | ۴ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۱۳ | ۵۳-۴۱ | ۴ | ۳۱ | حرمین شریفین کی حاضری (قط-۳) |
| ۱ | ۵۴- | ۴ | ۳۱ | مسند حمیدی۔ جلد ثانی |
| ۴ | ۵-۲ | ۵ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۱۱ | ۵۶-۴۶ | ۵ | ۳۱ | حرمین شریفین کی حاضری (قط-۴) |
| ۳ | ۴-۲ | ۷ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵۵-۵۲ | ۷ | ۳۱ | ایک خط |
| ۱۳ | ۷۱-۵۹ | ۸ | ۳۱ | ہندوستانی حجاج کے لئے میقات |
| ۴ | ۴-۲ | ۱۰، ۹ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۴-۲ | ۱۲، ۱۱ | ۳۱ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۴-۲ | محرم الحرام ۱۳۸۴ھ | جلد نمبر ۳۲ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۶-۲ | ۳ | ۳۲ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۴-۲ | ۴ | ۳۲ | نگاہ اولیں |
| ۱۳ | ۴۹-۲۷ | ۵ | ۳۲ | جب خدا کا کنبہ قحط سے دوچار ہو؟ |
| ۴ | ۱۶-۱۴ | ۸ | ۳۲ | ایک مرد مومن کی شہادت (جناب ارشد صاحب، جدہ) |
| ۱۰ | ۱۵-۶ | ۱۰ | ۳۲ | دعوت اصلاح |
| ۴ | ۸-۵ | محرم الحرام ۱۳۸۵ھ | جلد نمبر ۳۳ | مکتوب حجاز |
| ۸ | ۱۲-۵ | ۲ | ۳۳ | حرمین پاک کی حاضری |

| | | | | |
|----|--------|--------|-------------|--|
| ۱۵ | ۳۳-۱۹ | ۵۰۴۳ | ۳۳ | حضرت مولانا محمد یوسفؒ۔ چند تجربے اور مشاہدے (خاص نمبر) |
| ۱۴ | ۵۴-۴۱ | ۵۰۴۳ | ۳۳ | مولانا کا طرز فکر |
| ۲ | ۵۶-۵۵ | ۷ | ۳۳ | حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی کی وفات |
| ۳ | ۴-۲ | ۱۰ | ۳۳ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۲ | ۳۳ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۵۳-۴۹ | ۱۳۸۶ | جلد نمبر ۳۴ | اللہ کے دو بندے (مولانا عبدالرحمن کامپوڑیؒ و مولانا شیر محمدؒ) |
| ۴ | ۵-۲ | ۴ | ۳۴ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۹-۷ | ۵ | ۳۴ | تبلیغی جماعت پر بعض بے بنیاد تنقیدیں |
| ۱۵ | ۴۴-۳۰ | ۵ | ۳۴ | بعض اہل قبور کا تنظیم |
| ۷ | ۸-۲ | ۷ | ۳۴ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۳۸۷ | جلد نمبر ۳۵ | مفرا منظر |
| ۹ | ۱۰-۲ | ۸ | ۳۵ | نگاہ اولیں (اذا وقعت الواقعة: بروفات حضرت شاہ وحی اللہؒ) |
| ۲۱ | ۴۴-۴۳ | ۸ | ۳۵ | ہندوستانی حجاج کے لئے میقات |
| ۳ | ۴-۲ | ۹ | ۳۵ | نگاہ اولیں (برحلت مولانا ابراہیم بلیاویؒ) |
| ۱۱ | ۴۴-۴۳ | ۹ | ۳۵ | عید کا پیغام |
| ۱۷ | ۵۶-۴۰ | ۹ | ۳۵ | جنوب مشرقی افریقہ اور حجاز مقدس کا تازہ سفر (۱) |
| ۲۶ | ۱۱۴-۸۹ | ۱۲۱۱۱۰ | ۳۵ | حجاز مقدس کا تازہ سفر (۲) |
| ۸ | ۹-۲ | ۱۳۸۸ | جلد نمبر ۳۶ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۷-۲ | ۵ | ۳۶ | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۴۷-۴۲ | ۸ | ۳۶ | خدا کی ہستی (تقریر) |
| ۶ | ۴۳-۴۸ | ۸ | ۳۶ | عقیدہ آخرت (تقریر) |
| ۴ | ۵۶-۵۳ | ۸ | ۳۶ | رمضان کا آخری عشرہ |
| ۳ | ۱۰۶-۹ | ۱۰۶-۹ | ۳۶ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۱۰۶-۵۳ | ۱۰۶-۹ | ۳۶ | عید کا خطاب (تقریر) |
| ۱ | ۱۲-۱۱ | ۱۲-۱۱ | ۳۶ | سنبھائے گفتنی |
| ۳ | ۱۵-۱۰ | ۱۲-۱۱ | ۳۶ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۷۰-۶۳ | ۱۲-۱۱ | ۳۶ | روضہ اقدس پر عرض سلام کے ساتھ طلب شفاعت |
| ۳ | ۵۵-۵۳ | ۱۳۸۹ | جلد نمبر ۳۷ | ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم۔ ایک یادگار واقعہ |
| ۱۲ | ۱۳-۲ | ۵ | ۳۷ | (۱) نگاہ اولیں۔ دارالعلوم دیوبند کا سانحہ |

نگاہ اولیں۔ دارالعلوم دیوبند کا سانچہ

(۲)

نگاہ اولیں

نگاہ اولیں

نگاہ اولیں

حرمین پاک کی حاضری

دو باتوں کی وضاحت

نگاہ اولیں

جلد نمبر ۳۸

صفر المظفر ۱۳۹۰ھ

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کا وصال

حضرت حاجی عبدالغفور جو دھوری کا وصال

میری طالب علمی

(تقریر)

رفیقہ حیات کے انتقال پر

اعتراف ذنب اور معصومیت

نگاہ اولیں

یاد رفتگان (شفاء الملک حکیم عبداللطیف، قاری محمد شبیر)

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری و مولانا مفتی نعیم لدھیانوی

شیعت راستقامت

حضرت رائے پوری کی تدفین کا قضیہ اور مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بیان

رمضان وعید وغیرہ کے بارے میں ایک اہم سوال

حضرت رائے پوری کی تدفین کا واقعہ

نگاہ اولیں

صاحب قرآن اور قرآن

نگاہ اولیں

نگاہ اولیں

نگاہ اولیں

ایک چالیس سالہ رفیق کی رحلت (مولانا عبدالحمید بلایاوی)

جناح کرام سے خطاب

(تقریر)

نگاہ اولیں

نگاہ اولیں

شاہ نعمت اللہ اور ان کا قصیدہ

شاہ نعمت اللہ کے تین قصیدے اور پیشین گوئیاں

مولانا نسیم احمد فریدی کے نام مکتوب (مکہ معظمہ سے)

نگاہ اولیں

جلد نمبر ۴۰

محرم الحرام ۱۳۹۲ھ

جلد نمبر ۴۰

محرم الحرام ۱۳۹۲ھ

جلد نمبر ۴۰

محرم الحرام ۱۳۹۲ھ

جلد نمبر ۴۰

محرم الحرام ۱۳۹۲ھ

جلد نمبر ۴۰

محرم الحرام ۱۳۹۲ھ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم، شاہ ولی اللہ اور

| | | | | | |
|----|-------|--------|------------|---------|--|
| ۱۸ | ۳۶-۱۹ | ۷۰۶ | ۴۰ | (۱) | اکابر علماء دیوبند کی نظر میں |
| ۲۲ | ۷۰-۴۹ | ۷۰۶ | ۴۰ | (تقریر) | دینی مدارس کے طلباء سے خطاب |
| ۱۸ | ۸۸-۷۱ | ۷۰۶ | ۴۰ | | جنوبی افریقہ۔ مشاہدات و تاثرات |
| ۸ | ۲۷-۲۰ | ۸ | ۴۰ | (۲) | شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم..... |
| ۸ | ۱۰-۳ | ۱۰ | ۴۰ | | نہجہ حرم |
| ۵ | ۶-۲ | ۱۲۱۱ | ۴۰ | | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۵۸-۵۱ | ۱۲۱۱ | ۴۰ | | تحفظ مسلم پرسن لاکنوشن بمبئی |
| ۵ | ۶۹-۶۵ | ۱۲۱۱ | ۴۰ | | یاد رفتگان (مولانا عبداللطیف صاحب رحمانی) |
| ۴ | ۶۰-۵۷ | ۴ | جلد نمبر ۴ | | سونے کے دانوں کا شرعی حکم |
| ۲ | ۳-۲ | ۸۰۷ | ۴۱ | | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۶۰ | ۸۰۷ | ۴۱ | | اپنی مخلصانہ رائے سے مطلع فرمائیں |
| ۳ | ۴-۲ | ۹ | ۴۱ | | نگاہ اولیں |
| ۶ | ۱۰-۵ | ۹ | ۴۱ | | مسئلہ بقائے الفرقان |
| ۳ | ۴-۲ | ۱۰ | ۴۱ | | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۴-۲ | ۱۱ | ۴۰ | | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۳-۲ | ۱۲ | ۴۱ | | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۳۹۴ | جلد نمبر ۴ | | حرم صفر ۱۳۹۴ھ |
| ۲ | ۷۸-۷۷ | ۲۱ | ۴۲ | | ایک مخلص کا انتقال (بریلی کے محمد حسین صاحب) |
| ۳ | ۶۳-۵۰ | ۵۰، ۴۳ | ۴۲ | | نگاہ اولیں (انتخاب نمبر ۱) |
| ۴ | ۵۰-۴۰ | ۸ | ۴۲ | | نگاہ اولیں |
| ۲ | ۳-۲ | ۹ | ۴۲ | | نگاہ اولیں |
| ۱۷ | ۴۷-۳۱ | ۹ | ۴۲ | | قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ |
| ۱۷ | ۱۹-۲ | ۱۱ | ۴۲ | | نگاہ اولیں (قادیانی، فارقلیط صاحب اور ایک دانشور طبقہ) |
| ۸ | ۱۰-۳ | ۱۹۷۵ء | جلد نمبر ۴ | | نگاہ اولیں (مع نوٹ: شاہ معین الدین احمد مرحوم) |
| ۲ | ۴۳ | ۳۰۲ | ۴۳ | | نگاہ اولیں (جناب عثمان فارقلیط صاحب سے متعلق) |
| ۱۳ | ۱۸-۵ | ۳۰۲ | ۴۳ | | نزول مسیح |
| ۵ | ۷۹-۷۵ | ۳۰۲ | ۴۳ | | ایک مرد مومن کی وفات (حضرت صوفی سید عبدالرب) |
| ۳ | ۶-۳ | ۳۰۲ | ۴۳ | | خجہائے گفنی (انتخاب نمبر ۲) |
| ۴ | ۵-۲ | ۷ | ۴۳ | | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۶-۲ | ۱۰ | ۴۳ | | نگاہ اولیں (برائے انتقال برادر مکرم مولانا محمد حسن بدیع سنبھلی) |
| ۱۳ | ۲۸-۳۳ | ۱۰ | ۴۳ | | رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی حاضری (۱) |

| | | | | |
|----|-------|-------------|-------------|--|
| ۵ | ۵۴-۵۰ | ۱۱ | ۴۳ | نگاہ اولیں |
| ۱۲ | ۸۶-۷۵ | ۱۱ | ۴۳ | رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی حاضری (۲) |
| ۵۵ | ۵۶-۲ | ۱۲ | ۴۳ | تذکرہ صوفی سید عبدالرب علیہ الرحمہ (خصوصی شمارہ) |
| ۱ | ۲ | جنوری ۱۹۷۶ء | جلد نمبر ۴۳ | افتتاح جلد چہل و چہارم |
| ۹ | ۱۰-۲ | ۲ | ۴۴ | نگاہ اولیں یاد رفتگان - مولانا اسطیغیل سنبھلی، مولوی محمود حسن |
| ۴ | ۴۱-۳۸ | ۳ | ۴۴ | وکیل، ماسٹر محمود الحسن کاندھلوی، ڈاکٹر میر ولی الدین رحمہم اللہ |
| ۵ | ۱۱-۷ | ۶، ۵، ۴ | ۴۴ | یاد رفتگان: حضرت مولانا عبدالباری ولیمہ اللہ تقسیم صاحبہ |
| ۱۰ | ۱۱-۲ | ۷ | ۴۴ | نگاہ اولیں (تیسرا انتخاب نمبر) |
| ۸ | ۹-۲ | ۹ | ۴۴ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۶-۲ | ۱۱، ۱۰ | ۴۴ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۵-۲ | ۱۲ | ۴۴ | نگاہ اولیں (حضرت مولانا مفتی شفیع و مولانا احمد سعید راندیری) |
| ۴ | ۵-۲ | جنوری ۱۹۷۷ء | جلد نمبر ۴۵ | نگاہ اولیں (مولانا عبدالماجد دریا بادی علیہ الرحمہ) |
| ۵ | ۸-۲ | ۳، ۲ | ۴۵ | نگاہ اولیں |
| ۹ | ۱۳-۶ | ۶، ۵، ۴ | ۴۵ | نگاہ اولیں (وفیات نمبر) |
| ۱۲ | ۱۳-۲ | ۷ | ۴۵ | نگاہ اولیں (مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید دہلوی، |
| ۱۷ | ۳۳-۱۷ | ۷ | ۴۵ | مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا اکرام الحسن کاندھلوی، |
| ۴ | ۵-۲ | ۸ | ۴۵ | مولانا مفتی مہدی حسن، خواجہ حکیم شمس الدین، حافظ خیراتی مرحوم |
| ۵ | ۴۸-۴۴ | ۸ | ۴۵ | مجاہد ملت مولانا حافظ الرحمن سید ہاروی |
| ۹ | ۱۰-۲ | ۹ | ۴۵ | نگاہ اولیں |
| ۱۶ | ۱۸-۳ | ۱۱، ۱۰ | ۴۵ | یاد رفتگان (مولانا شریف الحسن، مولانا سراج الحق مچلی شہری |
| ۷ | ۷۹-۷۳ | ۱۱، ۱۰ | ۴۵ | حکیم سید مشتاق کشوروی مرحوم |
| ۱۳ | ۱۵-۲ | ۱۲ | ۴۵ | نگاہ اولیں |
| ۸۶ | ۵۶-۴۹ | ۱۲ | ۴۵ | نگاہ اولیں - روح کا غسل اور روح کا لباس (تقریر) |
| ۱۰ | ۱۲-۳ | جنوری ۱۹۷۸ء | جلد نمبر ۴۶ | تبلیغی جماعت کے خلاف بریلوی یلغار |
| ۸ | ۹-۲ | ۲ | ۴۶ | نگاہ اولیں |
| ۱۶ | ۱۷-۲ | ۳ | ۴۶ | یاد رفتگان (مولانا یوسف بنوری علیہ الرحمہ) |
| ۷ | ۸-۲ | ۴ | ۴۶ | نگاہ اولیں |
| ۱۲ | ۱۳-۲ | ۵ | ۴۶ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۸-۲ | ۶ | ۴۶ | نگاہ اولیں |

| | | | | |
|-----|-------|-------------|-------------|--|
| ۴ | ۴۳-۴۰ | ۶ | ۴۶ | یاد رفتگان (ماہر القادری الی رحمۃ اللہ) |
| ۶ | ۷-۲ | ۷ | ۴۶ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۱۰-۸ | ۷ | ۴۶ | حضرت شیخ الحدیث کا ایک پیغام رمضان مبارک سے متعلق |
| ۲۵ | ۲۶-۲ | ۸ | ۴۶ | نگاہ اولیں (ایشیائی اسلامی کانفرنس، کراچی) |
| ۳ | ۵-۳ | ۱۰، ۹ | ۴۶ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۴-۲ | ۱۲ | ۴۶ | ۴۶ ویں جلد کا اختتام اور کچھ ضروری باتیں |
| ۴ | ۸-۵ | ۱۲ | ۴۶ | نگاہ اولیں |
| ۴ | ۴۸-۴۵ | ۱۲ | ۴۶ | یاد رفتگان: شیخ الازہر علامہ ڈاکٹر عبدالخلیم محمود، علامہ شام شیخ محمد حسن حیکمہ، الحاج شیخ عبدالقادر نورولی الی رحمۃ اللہ |
| ۶ | ۷-۲ | جنوری ۱۹۷۹ء | جلد نمبر ۴۷ | نگاہ اولیں: مرد زمانہ کے ساتھ قیمتیوں میں ناقابل یقین فرق |
| ۱۰ | ۴۸-۳۹ | ۱ | ۴۷ | باب ارتق الہندی (۱) |
| ۹ | ۴۸-۴۰ | ۲ | ۴۷ | باب ارتق الہندی (۲) |
| ۴ | ۵-۲ | ۳ | ۴۷ | نگاہ اولیں |
| ۷ | ۸-۲ | ۴ | ۴۷ | نگاہ اولیں |
| ۵ | ۴۸-۴۳ | ۵ | ۴۷ | یاد رفتگان: سید محبوب رضوی دیوبند، شاہ مسعود احمد بیٹ، عبدالکریم عرف بچو بھائی سمیٹی الی رحمۃ اللہ |
| ۷ | ۸-۲ | ۵ | ۴۷ | نگاہ اولیں (ذبیحہ گاو، ونوباجی اور مرارجی ڈیپائی - حادثہ بمبٹو) |
| ۵ | ۴۸-۴۳ | ۵ | ۴۷ | مرحوم مغفور شاہ مسعود حسن |
| ۳ | ۴-۲ | ۶ | ۴۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۱۱-۲ | ۷ | ۴۷ | نگاہ اولیں: دو عظیم سانحے (مولانا اسعد اللہ و مولانا محمد الحسنی) |
| ۵ | ۶-۲ | ۸ | ۴۷ | نگاہ اولیں: ایک اور عظیم سانحہ (مولانا اسحق جلیس) |
| ۱۵ | ۱۶-۲ | ۹ | ۴۷ | نگاہ اولیں، الی رحمۃ اللہ: مولانا انعام کریم مدنی، الہیہ حاجی داؤد انکار، مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا عبداللہ اسماعیلی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی |
| ۴ | ۶-۳ | ۱۰ | ۴۷ | نگاہ اولیں |
| ۱۴ | ۲۰-۷ | ۱۰ | ۴۷ | عید الفطر کا خطاب |
| ۱۶۴ | ۵-۲ | ۱۲، ۱۱ | ۴۷ | نگاہ اولیں |
| ۹ | ۱۰-۲ | ۱۲، ۱۱ | ۴۷ | مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت، اور اب میرا موقف |
| ۲ | ۳-۲ | ۱۲، ۱۱ | ۴۷ | نگاہ اولیں (حرم شریف کا المناک المیہ - اصل حقیقت دارالعلوم دیوبند کا اجلاس صد سالہ) |

نگاہ اولیں

یادرفنگاں: (اہلیہ مولانا فتح محمد میواتی، غلام قادر چغتائی مرحوم
ومولانا ابولوفاشا جہانپوری)

۲۸ ۳۰۲ ۱۲-۴ ۹

۲۸ ۳۰۲ ۵-۲ ۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ - چند یادیں

۲۸ ۴ ۳۹-۳۲ ۸

مرحوم و مغفور قاضی محمد عدیل عباسی

۲۸ ۴ ۴۰ ۱

نگاہ اولیں

۲۸ ۵ ۸-۲ ۷

دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس

۲۸ ۵ ۱۰-۹ ۲

نگاہ اولیں

۲۸ ۶ ۴-۲ ۳

وفیات: مولانا مفتی محمد حسنؒ (مدراس) و حضرت مولانا

سعد اللہ (پاکستان)

۲۸ ۶ ۴۰ ۱

نگاہ اولیں

۲۸ ۷ ۴-۲ ۲

وفیات: مولانا احتشام الحق تھانویؒ و مولانا غلام اللہ (پاکستان)

۲۸ ۷ ۴۰ ۱

نگاہ اولیں

۲۸ ۹، ۸ ۸-۲ ۷

نگاہ اولیں

۲۸ ۱۱، ۱۰ ۸-۲ ۷

وفیات: محترم ظفر احمد صدیقی، مولانا مفتی محمود (پاکستان)

۲۸ ۱۱، ۱۰ ۷-۲، ۹ ۴

نگاہ اولیں

۲۸ ۱۲ ۵-۳ ۳

ڈاکٹر مولانا مصطفیٰ حسن علوی الی رحمۃ اللہ

۲۸ ۱۲ ۴۰ ۱

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی سوانح علمی کا ایک ورق (۱)

۲۸ ۲ ۲۸-۱۹ ۱۰

نگاہ اولیں پستی کا کوئی حد سے گزرنادیکھیے

۲۹ ۲ ۵-۲ ۴

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی سوانح علمی کا ایک ورق (۲)

۲۹ ۲ ۲۲-۱۵ ۸

نگاہ اولیں

۲۹ ۳ ۶-۲ ۵

اللہ کی ایک بندی

۲۹ ۳ ۴۰-۳۹ ۲

نگاہ اولیں: دینی مدارس کے ذمہ داروں کی خدمت میں،

مولانا نصیر الدین کی رحلت

۲۹ ۵ ۵-۲ ۴

ایک سفر سعادت (مرکز نظام الدین دہلی، علی گڑھ و سنبھل)

۲۹ ۶ ۳۶-۲۸ ۹

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے چند اہم فیصلے

۲۹ ۶ ۶ ۲

ناظرین کرام کی خدمت میں

۲۹ ۷ ۳-۲ ۲

نگاہ اولیں (دارالعلوم دیوبند، اس کا دستور اور مجلس شوریٰ)

۲۹ ۷ ۷-۴ ۴

نگاہ اولیں

۲۹ ۹، ۸ ۴-۲ ۳

خطاب عید

۲۹ ۹، ۸ ۲۶-۱۵ ۱۲

دارالعلوم دیوبند سے متعلق بعد کی تشویشناک اطلاعات

۲۹ ۹، ۸ ۸۰ ۱

| | | | | |
|----|-------|-------------|-------------|---|
| ۳ | ۴۲ | ۱۰ | ۴۹ | نگاہ اولیں |
| | | | | دارالعلوم دیوبند سے میرا تعلق، موجودہ اختلافات کی اصل بنیاد |
| ۲۲ | ۲۶-۵ | ۱۰ | ۴۹ | دقائق، واقعات کی روشنی میں |
| ۹ | ۱۰-۲ | ۱۱ | ۴۹ | نگاہ اولیں |
| ۳ | ۴۲ | ۱۲ | ۴۹ | نگاہ اولیں |
| ۱ | ۲ | جلد نمبر ۵۰ | جلد نمبر ۵۰ | نگاہ اولیں |
| | | | | یاد رفتگان: مولانا فضل محمد (پاکستان) مولانا محمد سلیم لدھیانوی |
| ۳ | ۵-۳ | ۱ | ۵۰ | ہمارے مولوی سلیم صاحب، ہماری مرحومہ بھانجی صاحبہ |
| ۲۱ | ۲۲-۲ | ۲ | ۵۰ | نگاہ اولیں (دارالعلوم دیوبند کا المیہ۔ مصالحت کی ایک کوشش |
| ۵ | ۶-۲ | ۳ | ۵۰ | نگاہ اولیں |
| | | | | یاد رفتگان: سید صباح الدین نقوی مرحوم، شیخ مستنصر اللہ مرحوم |
| ۵ | ۳۹-۳۵ | ۳ | ۵۰ | مولانا محمد ثانی حسینی، والدہ کلیم اللہ خاں صاحب |
| ۷ | ۸-۲ | ۴ | ۵۰ | نگاہ اولیں: دارالعلوم اور وراثت، امام کشمیری کی فراست ایمانی |
| ۷ | ۱۰-۴ | ۵ | ۵۰ | نگاہ اولیں: دارالعلوم دیوبند کی صورت حال، شوریٰ کا حالیہ اجلاس |
| ۹ | ۱۳-۶ | ۸، ۷ | ۵۰ | نگاہ اولیں: قضیہ دارالعلوم کا خاتمہ بالخیر |
| ۱۳ | ۳۲-۱۹ | ۸، ۷ | ۵۰ | خطاب عید الفطر |
| ۱ | ۶۳ | ۸، ۷ | ۵۰ | ایک مخلص بندہ (حاجی محمد یعقوب صاحب: بہشتی) |
| ۷ | ۱۱-۵ | ۱۳۵۹ | ۵۰ | افتتاحیہ (شیخ الحدیث نمبر اول) |
| | | | | حضرت شیخ الحدیث کی آپ بیتی۔ انتخاب و تلخیص |
| | | | | دارالعلوم دیوبند اور مولانا محمد طیب صاحب |
| ۱۱ | ۳۰-۲۹ | جلد نمبر ۵۱ | جلد نمبر ۵۱ | میری وصیت اور کچھ معروضات |
| ۸۰ | ۱۷-۹۱ | ۲ | ۵۱ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۹-۲ | ۵ | ۵۱ | حج بدل سے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب |
| ۵ | ۳۰-۳۶ | ۶ | ۵۱ | نگاہ اولیں |
| ۸ | ۹-۲ | ۷، ۶ | ۵۱ | نگاہ اولیں: (حضرت مولانا قادی طیب صاحب الی رحمۃ اللہ) |
| ۱۱ | ۱۲-۲ | ۸ | ۵۱ | خطاب عید الفطر |
| ۱۰ | ۲۸-۱۹ | ۹ | ۵۱ | ایک مکتوب (بنام مولانا محمد یوسف لدھیانوی) |
| ۳ | ۳۰-۳۸ | ۱۲ | ۵۱ | یاد رفتگان: مولانا فتح محمد دہلوی، حضرت مولانا کلیل عباسی، |
| | | | | عبدالرحمن عبدالقادر نورولی مرحوم، حافظ محمد صدیق انیسوی، الحاج |
| ۵ | ۳۷-۳۳ | جلد نمبر ۵۲ | جلد نمبر ۵۲ | محمد میاں صاحب |

| | | | | |
|-----------------------------------|-------|-------|-------------|---|
| کتابی شکل شائع ہو کر مقبول عام ہے | | | | ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت |
| ۷ | ۸-۲ | ۷۰۶ | ۵۲ | نگاہ اولیں: (مولانا مفتی تقی الرحمن عثمانی الی رحمۃ اللہ) |
| ۸ | ۶-۲ | ۸۵ | جلد نمبر ۵۳ | نگاہ اولیں: (مولانا سلیمان مارشس، الی رحمۃ اللہ) |
| ۱۵ | ۲۱-۷ | ۳۰۲ | ۵۳ | حرمین شریفین کی حاضری (۱) |
| ۱۱ | ۱۸-۸ | ۳ | ۵۳ | حرمین شریفین کی حاضری (۱) |
| ۲ | ۳۹-۳۸ | ۳ | ۵۳ | قابل رشک موت: بھائی محمد صاحب ڈربن الی رحمۃ اللہ |
| | | | | شیعہ اثنا عشریہ کے بارے میں قریباً ۶۰ سال پہلے کا علماء کرام کا متفقہ فتویٰ |
| ۱۲ | ۳۶-۲۵ | ۵ | ۵۳ | مرحوم و مغفور مولانا محمد عثمان نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند |
| ۲ | ۳۸-۳۷ | ۵ | ۵۳ | اثنا عشریہ سے متعلق علماء کرام کا فتویٰ |
| ۲۳ | ۳۹-۲۷ | ۷۰۶ | ۵۳ | الی رحمۃ اللہ: مولانا سعید اکبر آبادی و حاجی محمد عمر الہ آبادی |
| ۱۱ | ۶۰-۵۰ | ۷۰۶ | ۵۳ | اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا فتویٰ، علماء کرام کی خدمت میں |
| ۲۹ | ۳۵-۱۷ | ۸ | ۵۳ | گزارشات (شیخ الحدیث نمبر دوم) |
| ۲ | ۳-۳ | ۱۳۷۹ | ۵۳ | حضرت شیخ الحدیث - کچھ یادیں کچھ باتیں |
| ۲۳ | ۹۳-۷۱ | ۱۳۷۹ | ۵۳ | حضرت شیخ کی آپ بیتی - انتخاب و تلخیص |
| | | | | ایرانی انقلاب، خمینی صاحب اور اتحاد اسلامی کی دعوت |
| ۱۰ | ۲۹-۲۰ | ۱۹۸۶ء | جلد نمبر ۵۳ | یاد رفتگان: مرحوم بھائی فضل اللہ صاحب، حاجی ابراہیم بیٹیل صاحب، مولانا محمود الحسن صاحب ناظم دینی تعلیمی کونسل اہلیہ مکرہ حضرت شیخ الحدیث |
| ۷ | ۳۰-۳۳ | ۱ | ۵۳ | الی رحمۃ اللہ: عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی عارفی، الحاج غلام رسول صاحب گلگتہ، حاجی عبدالواحد صاحب ایم اے، |
| ۷ | ۷۶-۷۰ | ۳۰۲ | ۵۳ | مولانا منور حسین صاحب پورنیہ |
| ۵ | ۱۶-۱۲ | ۵ | ۵۳ | رمضان المبارک سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات |
| ۳ | ۳-۲ | ۷۰۶ | ۵۳ | نگاہ اولیں |
| ۱۰ | ۱۸-۹ | ۷۰۶ | ۵۳ | خطاب عید الفطر: ہماری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ |
| ۵ | ۶-۲ | ۸ | ۵۳ | نگاہ اولیں: یوسف بھائی مرحوم و مغفور |
| ۱۲ | ۵۲-۴۱ | ۱۲۱۱ | ۵۳ | ختم نبوت کی حقیقت |
| ۲ | ۹-۸ | ۱۹۸۷ء | جلد نمبر ۵۵ | ہمارا ایک مہلک مرض |

یاد رفتگان: مولانا عمران خاں ندوی ازہری، بھائی
محمد عمر جو دھوری

آپ خود فیصلہ کریں کیا یہ مسلمان ہیں؟

نگاہ اولیں

رمضان المبارک سے متعلق رسول اللہ صلعم کی ہدایات

یاد رفتگان: مولانا مغیر حسین گیلادی، مولانا حفیظ الرحمن واصف

خطاب عید الفطر: ہم پر یہ حالات کیوں آرہے ہیں؟

یاد رفتگان: مولانا حافظ شبیر انگار، والدہ سید شاہنفس صاحب

الی رحمۃ اللہ: عارف باللہ حضرت قاری فتح محمد مہاجر مدنی

غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے مسائل کا حل

یاد رفتگان: جناب محمد یوسف پلپوری، مولوی شبیر کاندھلوی

مقدمہ: ضمنی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ

استفتاء

یاد رفتگان: مولانا مفتی عبدالغنی کاوی، مولانا ظفر الدین، سید

صباح الدین عبدالرحمن، مولانا عبدالباری قاسمی مبارکپوری

الی رحمۃ اللہ: مولانا قاری فخر الدین قاسمی گیلادی، ڈاکٹر وحید

الزماں حید رآبادی، قاری محمد سلیمان کٹی، اہلیہ مکرمہ حضرت

مولانا انعام الحسن کاندھلوی

اپنا کچھ حال اور ناظرین سے استدعا

مقدمہ: (متفقہ فیصلہ دوم)

الی رحمۃ اللہ: حاجی علاؤ الدین بمبئی، حاجی احمد سرنگ راندیری

حاجی شمس الدین لکھنوی

نگاہ اولیں: مولانا نسیم فریدی الی رحمۃ اللہ (۱)

نگاہ اولیں: مولانا فریدی (۲) حضرت مولانا عبدالحق

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی علیہ الرحمہ مشاہدات و تاثرات

ایک قابل رشک دوست، ایک بے مثال رفیق (فریدی نمبر)

تکملہ (فریدی نمبر)

مولانا ابوالحسن زید فاروقی اور شاہ اسماعیل شہید تقویۃ الایمان

ضروری گذارشات اور وصیت

| | | | |
|----|------------|-------|----|
| ۵۵ | ۱ | ۴۰-۳۳ | ۸ |
| ۵۵ | ۲ | ۴۰-۳۳ | ۷ |
| ۵۵ | ۳ | ۶-۲ | ۵ |
| ۵۵ | ۴ | ۱۱-۷ | ۵ |
| ۵۵ | ۵ | ۴۰-۳۹ | ۲ |
| ۵۵ | ۷ | ۲۲-۱۱ | ۱۲ |
| ۵۵ | ۷ | ۴۰-۳۷ | ۳ |
| ۵۵ | ۸ | ۴۰-۳۰ | ۱۱ |
| ۵۵ | ۹ | ۳۰-۲۱ | ۱۰ |
| ۵۵ | ۹ | ۴۰-۳۸ | ۳ |
| ۵۵ | ۱۲، ۱۱، ۱۰ | ۳۶-۳ | ۳۳ |
| ۵۵ | ۱۲، ۱۱، ۱۰ | ۹۶-۳۷ | ۶۰ |

جلد نمبر ۵۶ فروری ۱۹۸۸ء ۴۰-۳۶ ۵

۵۶ ۳ ۴۰-۳۸ ۳

۵۶ ۷، ۶، ۵ ۴۰-۳ ۲

۵۶ ۷، ۶، ۵ ۶۰-۱۵ ۳۶

۵۶ ۸ ۳۹-۳۱ ۹

۵۶ ۱۱ ۵-۲ ۴

۵۶ ۱۲ ۸-۲ ۷

جلد نمبر ۵۷ اپریل ۱۹۸۹ء ۱۵-۱۴ ۱۲

۵۷ ۸۵۵ ۲۲، ۱۵ ۸

۵۷ ۸۵۵ ۲۵۰-۲۱۷ ۳۳

۵۷ ۹ ۳۱-۱۰ ۲۲

جلد نمبر ۵۸ فروری ۱۹۹۰ء ۴۷-۳۸ ۱۰



مصنف کی ایک دوسری نہایت اہم کتاب

”محفل قرآن“

اردو کے تفسیری کتب خانہ میں ایک بیش قیمت اضافہ

(دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی: سورة الفاتحہ والبقرة دوسری: ال عمران۔ تا۔ المائدہ)

کتاب کی پہلی جلد (الفاتحہ والبقرة) کے حوالہ سے اہل نظر نے لکھا کہ: — ”حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کی بڑی موثر، دلکش اور مستند ترجمانی اس طرح کی گئی ہے کہ قاری کے ذہن میں اگر کوئی سوال ہو تو خود بخود اس کا جواب مل جاتا ہے۔ اور ایک خوبی صاف سادہ اور خوبصورت زبان ہے جس نے بیان کو اور زینت بخشی ہے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گلڈھ)

یہ تفسیری سلسلہ بالکل ایک نئے طرز پر استوار ہوا ہے۔ کسی سورت کی جتنی آیتیں کسی ایک مرکزی مضمون کی حامل نظر آتی ہیں ان کو ان کے مناسب عنوانات کے ماتحت قسطوں میں تقسیم کر کے ایک مضمون کا انداز دیدیا گیا ہے۔ عنوانات سے آیتوں کا مرکزی پیغام اور ان کی روح صاف ذہن نشیں ہو جانے پر آیات الہیہ بالکل ایک ہار میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح نظر آنے لگتی ہیں۔ تشریح کے ضمن میں آیتوں کا مفہوم اچھی طرح واضح کرنے کے لئے مزید ذیلی عنوانات کا بھی التزام۔ زمانہ کی مصروف زندگی کی رعایت میں غیر ضروری طویل بیان سے گریز، بقدر ضرورت پر اکتفا۔ ولقد یسرنا القرآن للذکر کی ایک دلاویز تفسیر!

قرآن فہمی کی کوشش کرنے والوں کے لئے جو چیز عام طور پر زیادہ دقت کا باعث ہوتی ہے وہ آیتوں کا باہم ربط ہے، ”محفل قرآن“ نے آیات کے باہم ربط کو جیسے دلنشین طریقہ سے نمایاں کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھنے والی چیز اور اس کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اور اس لحاظ سے قرآن کے طالب علموں کے لئے ایک تحفہ!

جلد اول: صفحات ۵۱۲۔ قیمت: 200/- جلد دوم: صفحات ۶۳۴۔ قیمت: 300/-
خصوصی پیشکش: صرف 550/- روپے بھیج کر ”حیات نعمانی“ اور محفل قرآن کے دونوں حصے گھر بیٹھے رجسٹری سے حاصل کریں۔

رقم کی ترسیل کا طریقہ معلوم کرنے کے لئے دفتری اوقات میں فون نمبر 0522-6535664 پر رابطہ قائم کریں۔

ناشر: الفرقان بکڈ پو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ 226 018

”حیات نعمانی“ میری نظر میں

[راقم سطور کی خواہش کی تھی کہ الفرقان کے صفحات میں برادر گرامی مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی تازہ تصنیف ”حیات نعمانی“ کے بارے میں کسی صاحب نظر کے تاثرات محفوظ ہو جائیں، چنانچہ اس کے لئے محترم مولانا عتیق احمد بستوی سے گزارش کی، یہ راقم بے حد ممنون ہے کہ انھوں نے اپنی گونا گوں علمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود یہ گراں قدر مضمون تحریر فرمادیا، ملاحظہ فرمائیے — مدیر]

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی بیسویں صدی عیسوی کی ان بلند قامت اثر انگیز شخصیات میں سے تھے جن کی حیات و خدمات کا تذکرہ کئے بغیر بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کی علمی و دینی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، خصوصاً تقسیم ملک کے بعد پیدا ہونے والے سنگین حالات میں انہوں نے جس فکر مندی، سیما و شہ و جہد و مجاہدہ کے ساتھ مسلمانان ہند کی دینی و ملی رہنمائی کی، مسلمانوں کی نئی نسل کو دین و ایمان پر باقی رکھنے اور عصری تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کو فکری اور ذہنی ارتداد سے بچانے کی جو ان تھک کوششیں کیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان کی متعدد کتابوں خصوصاً ”اسلام کیا ہے؟“ نے مقبولیت اور کثرت اشاعت کے ریکارڈ توڑ دیئے، عام فہم اور سادہ انداز میں ان کی تصنیفات نئی نسلوں کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط کرنے اور صحیح دینی شعور و فہم پیدا کرنے میں انتہائی کامیاب ثابت ہوئیں۔ ان کا جاری کردہ رسالہ ”ماہنامہ الفرقان“ (جو الحمد للہ اب بھی جاری ہے) ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک بھی تھا، ماہنامہ الفرقان نے اپنے قارئین کی ذہن سازی، دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کی سرکوبی اور ہر نازک موڑ پر ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی میں بڑا اہم کردار ادا کیا، اس کی بزم تحقیق و صحافت سے کتنے اہل قلم متعارف اور معروف ہوئے۔

نوے سال سے زائد عمر گزار کر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۷ء میں جانِ آفریں کے سپرد کی۔ ان کی جہد مسلسل اور عملِ پیہم سے بھری با مقصد زندگی نئی نسل کے لئے روشنی کا عظیم مینار ہے۔ دین و ملت کے لئے ان کا درد و کرب، اصلاحِ امت کے لئے انکی تڑپ، مسلمانوں کو سر بلند اور با عزت دیکھنے کے لئے انکی تدبیریں اور فکر مندیاں اس ملت کا عظیم سرمایہ ہیں، ان کا حق اور قرض تھا کہ ان کی مکمل سوانحِ حیات پوری احتیاط اور تحقیق کے ساتھ لکھی جائے، اس عظیم کام کے لئے اکثر اہل علم کی نگاہیں حضرت مولانا نعمانی کے فرزند اکبر حضرت مولانا عتیق الرحمن سنہلی دامت برکاتہم (مقیم لندن) کی طرف بار بار اٹھتی تھیں۔ اور مولانا موصوف سے اہل علم کا مسلسل تقاضا تھا کہ وہ حیاتِ نعمانی کی تصنیف فرمائیں۔ اللہ جل شانہ کا بے پایاں شکر و احسان ہے کہ ”حیاتِ نعمانی“۔ جس کا اہل علم کو مدت سے انتظار تھا، پایہ تکمیل کو پہنچی اور ۱۷ مارچ ۲۰۱۳ء کو لکھنؤ میں ایک بڑی پروقتار تقریب میں چوٹی کے اہل علم و فکر کی موجودگی میں اس کتاب کا اجراء عمل میں آیا۔

کتاب کا تعارف

حیاتِ نعمانی الفرقان بکڈ پوز، نظیر آباد لکھنؤ سے ۶۹۲ صفحات میں شائع ہوئی ہے، کمپوزنگ، کاغذ اور طباعت ہر چیز معیاری ہے، ٹائٹل دیدہ زیب ہے، مصنف نے کتاب کا انتساب ملت اسلامیہ کے نام کیا ہے، جس سے کتاب کی معنویت آشکارا ہوتی ہے، صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۴ تک فہرست مضامین ہے، مصنف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، فہرست کتاب کے بعد مصنف کتاب کے قلم سے آٹھ صفحات (۲۲ تا ۱۵) واقع مقدمہ ہے، مقدمہ کے بعد ”ہدیہ تبریک“ کے عنوان سے حضرت مولانا نعمانی کے فرزند اصغر مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی کے قلم سے چھ صفحات (۲۸ تا ۲۳) کی پُر مغز تحریر ہے، کتاب کے حصہ اول کو مصنف نے ۱۴ ابواب پر تقسیم کیا ہے، وہ ابواب اس طرح ہیں:

پہلا باب: وطنِ سنبھل، خاندان، پیدائش، تعلیم (۶۲ تا ۲۹)

دوسرا باب: درس و تدریس اور دین حق کا دفاع (یعنی مناظرانہ معرکوں کی جھلکیاں) (۹۸ تا ۶۳)

تیسرا باب: الفرقان: اخلاص و استقامت کی یادگار (۹۹ تا ۱۲۰)

چوتھا باب: مولانا مودودی سے جماعت اسلامی تک (۱۲۱ تا ۱۴۸)

پانچواں باب: خانقاہ رائے پور سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ تک (۱۴۹ تا ۱۶۲)

چھٹا باب: مادرِ علمی دیوبند کی خدمت کا دور۔ اور ایک منفرد کردار (۱۶۳ تا ۱۷۸)

ساتواں باب: آزادی کے بعد ملے مسائل و تقاضے اور آپ کا فکری و عملی کردار (۱۷۹ تا ۲۰۰)

آٹھواں باب: معذوری کا ۲۰ سالہ دور اور اس کے سبق آموز احوال (۲۰۱ تا ۲۱۲)

نواں باب: تصنیفات و تالیفات (۲۱۳ تا ۲۳۸)

دسواں باب: بیرون ہند کے اسفار و افادات (۲۳۹ تا ۳۳۴)

گیارہواں باب: ملفوظات، مکتوبات اور خطابات (۳۳۵ تا ۳۹۰)

بارہواں باب: مذاق و مزاج، عادات و معمولات، ازواج و اولاد (۳۹۱ تا ۴۳۴)

تیرہواں باب: بندہ اپنے رب کے بلاوے پر (۴۳۵ تا ۴۵۸)

چودھواں باب: کچھ خاص رشتوں کے معاصرین (۴۵۹ تا ۴۹۸)۔ اس باب میں آٹھ شخصیات

کا تذکرہ ہے، جن میں سے بعض مولانا مرحوم کے خورد اور بعض ان کے بزرگ اور بعض انکی ہم پایہ شخصیتیں ہیں، انکے اسماء گرامی یہ ہیں۔

مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ۔ مولانا ابوالوفاشا جہانپوریؒ۔ مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ۔ مولانا نسیم احمد

فریدیؒ۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ سید صوفی عبدالرب صاحب اور مولانا

ابوالحسن محمد سجاد۔

کتاب کا حصہ دوم ”بندگان حق کی یافت“ کے عنوان سے ہے، جو صفحہ ۴۹۹ سے شروع ہو کر

۶۶۴ پر ختم ہوتا ہے، اس حصہ سے متعلق مرتب کتاب نے بطور تمہید درج ذیل سطریں لکھی ہیں۔

”یہ حصہ خود حضرت صاحب سوانح کے قلم سے الفرقان میں نکلے ہوئے ۱۴ مضامین پر

مشتمل ہے، اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ اللہ کے ان بندگان خاص کے مناقب و اوصاف

کے بیان میں ہے جن سے ربط و استفادہ کا، یا کم سے کم زیارت کا موقع آپ کو حاصل ہوا، کہا

جاسکتا ہے کہ یہ آپ کی نظر میں ”حاصل زندگی“ تھا، کہ ان خاصان خدا کی بارگاہ میں نہ صرف

حاضری، نہ صرف استفادہ بلکہ نگاہ کرم و التفات کی عزت بھی میسر آئی۔“ صفحہ ۵۰۰

حصہ دوم میں چودہ بلند پایہ شخصیات کا اثر انگیز تذکرہ ہے جنہوں نے حضرت مولانا نعمانیؒ کی شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے وہ شخصیات درج ذیل ہیں:

- (۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ (۵۰۳ تا ۵۶۳)۔ (۲) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ (۵۰۷ تا ۵۹۳)۔ (۳) حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ (۵۱۰ تا ۵۱۴)۔
- (۴) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۵۱۵ تا ۵۴۴)۔ (۵) حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (۵۴۵ تا ۵۶۴)۔ (۶) حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ (۵۶۵ تا ۵۷۶)۔ (۷) حضرت مولانا محمد الیاسؒ (۵۷۷ تا ۵۸۴)۔ (۸) حاجی عبد الرحمن صاحب نو مسلمؒ (۵۸۵ تا ۵۹۰)۔ (۹) حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددیؒ (۵۹۱ تا ۵۹۶)۔ (۱۰) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۵۹۷ تا ۶۱۰)۔
- (۱۱) حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ (۶۱۱ تا ۶۲۰)۔ (۱۲) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ (۶۲۱ تا ۶۳۸)۔ (۱۳) حضرت حاجی عبد الغفور جوڈھپوریؒ (۶۳۹ تا ۶۵۵)۔
- (۱۴) حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقیؒ (۶۵۶ تا ۶۶۴)۔

کتاب کے اخیر میں الفرقان میں شائع شدہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مضامین کا اشاریہ ہے جسے حضرت مولانا نعمانیؒ سے خصوصی تعلق رکھنے والے (اور ان کے خلیفہ مجاز) جناب قطب الدین ملا مرحوم نے بہت محنت سے تیار کیا ہے، یہ اشاریہ صفحہ ۶۶۵ سے شروع ہو کر ۶۹۲ پر ختم ہوتا ہے، یہ بھی بہت ہی مفید چیز ہے، اور آئندہ حضرت مولانا نعمانیؒ پر تحقیق کرنے والوں کیلئے انتہائی کام کی چیز ہے، اس اشاریہ کو پڑھنے سے اندازہ لگتا ہے کہ اگرچہ حضرت مولانا نعمانیؒ کی اکثر تحریریں کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کے مضامین کی بہت بڑی تعداد اب بھی کتابی صورت اختیار نہیں کر سکی؛ بلکہ الفرقان کی فائلوں میں بہت سے بیحد قیمتی مضامین موجود ہیں، اس کی ضرورت ہے کہ مولانا مرحوم کے ان مضامین کو جواب تک کتابی صورت میں نہیں آسکے موضوعات کے اعتبار سے کتابی صورت میں مرتب کر دیا جائے، نگاہ اولیں کے عنوان سے الفرقان کے ادارے بیحد فکر انگیز اور معلومات افزا ہیں، یاد رفتگان کے عنوان سے وفاقی مضامین بھی بڑے قیمتی ہیں، اسی طرح دینی اور ملی مسائل پر مولانا کی سلجھی ہوئی تجزیاتی تحریریں اپنے اندر کافی سامان بصیرت رکھتی ہیں۔ ان سب کو کتابی شکل میں مرتب اور شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کی چند خصوصیات

حیات نعمانی اردو کے سوانحی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے، اردو زبان میں سوانح کی مختصر سے مختصر فہرست میں بھی یہ کتاب شامل کی جائیگی، زبان و بیان، اسلوب ادا، معلومات و مشتملات ہر جہت سے یہ ایک کامیاب سوانح ہے، اس کتاب سے نہ صرف صاحب سوانح کی حیات و خدمات کے تابندہ نقوش اجاگر ہوتے ہیں، بلکہ بیسویں صدی عیسویں کی دینی، دعوتی اور ملی تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں بازیاب ہوتی ہیں، آئندہ نسلوں کے لئے فکر و عمل کی بہت سی قدیلیں روشن ہوتی ہیں، میرے نزدیک کتاب کی چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) اس کتاب کا کم و بیش ستر فیصد مواد خود صاحب سوانح کے قلم سے ہے، یا ان کی تحریرات سے ماخوذ ہے کسی بھی شخصیت کے سوانحی خاکہ کے کیلئے سب سے قابل اعتماد ذریعہ خود اس شخصیت کے بیانات و تحریرات ہیں، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اپنی حیات اور سیرت کے بارے میں مختلف مناسبتوں سے الفرقان کے شماروں میں بہت کچھ لکھا تھا، مرتب کتاب حضرت مولانا عتیق الرحمنؒ سنبھلی صاحب نے الفرقان کی فائلوں اور مولانا مرحوم کی تحریرات و بیانات کو کھنگال کر یہ سارا مواد اکٹھا کیا، اور اسے بڑی سلیقہ مندی اور مہارت سے اس کتاب میں سجایا، باقی بیس تیس فیصد معلومات خود مرتب کتاب کے مشاہدات یا صاحب سوانح سے انتہائی قریبی تعلق رکھنے والوں کے مشاہدات و بیانات پر مبنی ہیں، اس لئے کتاب کی معلومات کے استناد پر زیادہ گفتگو نہیں کی جاسکتی۔

(۲) مرتب کتاب صاحب سوانحؒ کے فرزند اکبر ہیں، انہیں بچپن سے صاحب سوانح کا قرب و اعتماد حاصل رہا اور صاحب سوانح کے علمی اور فکری کاموں میں شریک و معاون رہے، ایک طویل عرصہ تک الفرقان کی ادارت انہی کے ذمہ رہی، صحت کی خرابی کی وجہ سے لندن منتقل ہونے کے بعد بھی اپنے والد ماجدؒ سے انکا مسلسل رابطہ رہا، اور ماہنامہ الفرقان انکی نگارشات سے فیضیاب ہوتا رہا، صاحب سوانحؒ سے انہیں ذوق و مذاق کی بھی حد درجہ مناسبت ہے، مبالغہ، مدح آرائی اور خود ستائی سے وہ کوسوں دور ہیں، اسلئے سوانح پر اختصار، احتیاط اور اعتدال کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے معتقدین و متوسلین یہ شکوہ تو کر سکتے ہیں کہ مرتب کتاب نے صاحب سوانح کے محامد و کمالات اور کارناموں کو پورے طور پر اجاگر نہیں کیا

(خصوصاً وہ حضرات جو بزرگوں کی سوانح میں ایک خاص قسم کی زبان، اصطلاحات اور القاب کے عادی ہیں) لیکن حیاتِ نعمانی کے بارے میں کسی ناقد کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ مصنف چونکہ صاحبِ سوانح کے فرزند ہیں اسلئے انہوں نے انکے حالات و کمالات کو بڑھا چڑھا کر لکھ دیا ہے اور مبالغہ اور غلو سے کام لیا ہے۔

(۳) حیاتِ نعمانی ماضی کے واقعات کی صرف کھٹونی نہیں ہے، یہ کتاب ماضی میں اپنے بزرگوں کی خدمات، جدو جہد اور فکر مند یوں پر روشنی ڈالتی ہے، حال کا آئینہ دکھاتی ہے اور مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کے لئے اہم بنیادیں فراہم کرتی ہے، ویسے تو پوری کتاب اہل علم کے لئے سرمایہ بصیرت ہے؛ لیکن بارہویں باب میں مرتب کتاب نے حضرت مولانا نعمانیؒ کی شخصیت کا عطر کشید کر دیا ہے۔ بارہویں باب میں ” مذاق و مزاج، عادات و معمولات“ کے تحت مرتب نے جو کچھ لکھا ہے، یہ انہی کا حصہ ہے؛ مولانا نعمانیؒ کی شخصیت کا اتنا خوبصورت اور کامل تجزیہ وہی کر سکتے تھے، اسی طرح کتاب کے حصہ دوم ”بندگانِ حق کی یافت“ کے عنوان سے حضرت مولانا نعمانیؒ کی تحریریں تاثیر و تاثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، مولانا نعمانیؒ مرحوم نے اپنے اساتذہ و مشائخ اور بزرگوں کا تذکرہ بہت ڈوب کر لکھا ہے اور ان شخصیات کی خصوصیات اور امتیازات پر بڑی بلاغت اور جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، ہر شخصیت پر انکی مختصر تحریر کا مکمل سوانح کی قائم مقامی کرتی ہے، اس وجہ سے کتاب کا یہ حصہ دوم اردو کے سوانحی ادب میں بیش قیمت اضافہ ہے۔

(۴) اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مرتب کتاب نے حیاتِ نعمانی کے ان گوشوں پر جو کافی نازک اور کسی حد تک نزاعی ہیں، کافی احتیاط اور اعتدال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ان نازک مقامات سے وہ بہت سلامت روی کے ساتھ گزرے ہیں، ان مقامات پر ایک قاری کو تشنگی اور اجمال کا احساس ہو سکتا ہے؛ لیکن یہ اجمال اس تفصیل سے بہتر ہے جس سے اختلافات کو ہوا ملے اور قارئین نزاعی بحثوں میں الجھ کر کتاب کی اصل روح اور پیغام سے غافل ہو جائیں۔

جماعتِ اسلامی میں حضرت مولانا نعمانیؒ کی شمولیت پھر اس سے علاحدگی مولانا مرحوم کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے ہیں، ظاہر ہے کہ مولانا مرحوم کی سوانح میں انکی زندگی کے اس گوشہ پر روشنی ڈالنا ناگزیر تھا، کتاب کا چوتھا باب اسی موضوع پر ہے؛ مرتب کتاب نے بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس موضوع کے گوشوں کو روشن کیا ہے اس باب میں انصاف و اعتدال کے کئی اچھے نمونے موجود ہیں، مرتب کتاب کا درج ذیل تجزیہ بھی امت مسلمہ کے ذہین اور حوصلہ مند نوجوانوں کے لئے بڑا چشم کشا اور

بصیرت افروز ہے:

”اس سے ایک رہنما مثال ہم بعد والوں کے لئے یہ قائم کرنا تھی کہ جب سر پہ بڑے، بلکہ انکا ایک پورا خاندان موجود ہو اور اسکے ساتھ اعتماد و احترام کا تعلق بھی ہو تو محض اپنے فہم و فکر کی رہنمائی میں کوئی جدا دینی راہ عمل اختیار کرنا ایک پرخطر طرز عمل ہے، اپنے بڑوں کے وسیع خاندان کے ساتھ جس احترام کا تعلق آپ کا، روز اول سے، رہتا تھا اور ان بزرگوں کی طرف سے شفقت و اعتماد کا جو ایک قابل فخر معاملہ آپ کے ساتھ تھا اسکے شواہد کی کوئی گنتی نہیں ہے، (ان میں سے بعض اوپر آ بھی چکے ہیں، اور الفرقان کے صفحات میں تو پھیلے پڑے ہیں ”تحدیث نعمت“ میں ان کا ایک خاص حصہ جمع ہو چکا ہے۔“

اور آگے اس سوانح کا جز بھی وہ انشاء اللہ بنے گا) اس صورت حال میں آپ کے ساتھ ایک تربیتی معاملہ اس موقع پر پیش آنا کچھ بعید از قیاس نہیں رہتا، تربیت غالباً مکمل ہو چکی تھی کہ ایک خضر وقت کے دل کو آپ کی طرف متوجہ فرمایا گیا اور پھر دل بول اٹھا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔ ص ۱۴۲“

مرتب کتاب حضرت مولانا عتیق الرحمن سنہجلی دامت برکاتہم سے زیادہ صراحت و وضاحت کے ساتھ خود صاحب سوانح نے الفرقان کے وفیات نمبر ۷۷ء میں اپنے بارے میں یہ بات تحریر فرمائی ہے:

”اپنی رائے اور اپنے فہم و فکر پر زیادہ اعتماد اور اس کے ساتھ فیصلہ اور اقدام میں جلد بازی بھی میری بری عادتوں میں سے رہی ہے، اور اس نے زندگی میں بڑی بڑی غلطیاں کرائی ہیں، لیکن احساس ہو جانے پر اللہ تعالیٰ نے رجوع اور اصلاح کی بھی توفیق دی، اللہ الحمد ولہ الشکر۔ اگر میں نے کبھی کوئی ایسی بات لکھی یا کہی ہے، یا کوئی ایسا اقدام کیا ہے جو علماء راہنہین و رہبانہین کی عام رائے کے خلاف ہے تو اس کو غلط اور مرجوع منہ سمجھا جائے“

ص ۴۵۴“

(۵) کتاب کا تعارف اور اس پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین الفرقان کو شریک مطالعہ کرنے کے لئے کتاب کے ایک دو اقتباسات نقل کر دیئے جائیں جو مولانا مرحوم کی بعض اہم خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں اور قارئین کے لئے اسمیں عبرت و بصیرت کے بعض پہلو ہیں۔ بارہویں

باب کے شروع میں مرتب کتاب تحریر فرماتے ہیں:

”آپ کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت سراپا مقصدیت اور اسکے مطابق مشغولیت تھی، عمر کا کوئی لمحہ انہیں ضائع کرتے اور کسی ایسے کام میں صرف کرتے نہ پایا جس کے بارے میں خیال ہو سکے کہ آخرت میں کام آنے والا نہیں ہے، متعدد اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت سے ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ حشر میں آدمی کو چار سوالوں کا سامنا کئے بغیر چھٹکارا نہیں ملے گا، (۱) عمر کا ہے میں خرچ کی؟ (۲) اللہ کی دی ہوئی قوتوں (خاص کر جوانی کی قوتوں) کا کیا مصرف رہا؟ (۳) جو علم پایا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ (۴) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ مال کے بارے میں تو انکے والد ماجد کی دعا تھی کہ اے اللہ دولت تو اس کے پاس کبھی نہ ہو، پر اس کا کام بھی کبھی نہ رکے، اور یہ دعاء جو انہوں نے اپنے اس بیٹے کے لئے جو انہیں بہت ہی عزیز تھا، عزیز تر ہونے ہی کے بنا پر بیت اللہ الحرام کے روبرو مانگی تھی، وہ زندگی بھر ان پر سایہ کئے رہی، اسلئے مال کے بارے میں تو بظاہر ایسا کوئی خاص سوال ہونے کی نوبت نہیں آتی، والعلہ عند اللہ، البتہ عمر انہیں بھرپور عطا ہوئی (۳۲۳ھ تا ۳۷۱ھ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۹۷ء) جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی وہ سوائے آخری دس پندرہ سال کے نہایت خوش نصیب لوگوں میں تھے، اور علم کے باب میں تو ان پر اللہ کا احسان عظیم تھا، مگر انکی زندگی کی جس نمایاں خصوصیت سے بات شروع ہوئی وہ جیسے اللہ نے انہیں ان ہی تینوں سوالوں سے سرخ رو ہو کر نکلنے کے لئے بخشی تھی۔“

ص ۳۹۱

مرتب کتاب ”مردکار“ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

”وہ اپنی جبلت کے اعتبار سے مردکار تھے، ہر مشغلہ کو افادیت کی ترازو میں تولنا ان کا طبعی مزاق تھا، جہاں ٹھوس اور کھری افادیت نہ ہو ادھر کو انکی طبیعت راغب ہی نہ ہوتی تھی، راقم السطور نے جب سے ہوش سنبھالا بندوق کے شکار کو اپنے گھرانے (دادا جان کی اولاد) کا ایک عمومی شوق پایا، مگر معلوم ہوتا ہے والد ماجد نے اس میں کبھی دل چسپی نہ لی ورنہ ہم کبھی تو دیکھتے کہ سنبھل آئے تو ایک آدھ دن اس تفریح کے لئے بھی چلے گئے، ہمارے لئے تو سنبھل پہنچ کر ممکن نہ رہتا تھا کہ اس شوق کا شکار نہ ہوں۔ ص ۳۹۲“

مرتب کتاب حضرت مولانا نعمانیؒ کی ایک اور اہم ترین خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہم تن کام ہی کے اس مزاج نے انہیں وقت کے معاملے میں بیحد حساس بنادیا تھا، طبیعت طبعاً خشک نہ تھی، اس کو تمام قریبی تعلق والے جانتے تھے، لیکن بے ضرورت ایک منٹ بھی کسی کو دینا انہیں اپنے وقت کا ضیاع معلوم ہوتا تھا، چنانچہ انکے یہاں مجلس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی کہ اس میں نشست اور گفتگو کو انکے ”معیار“ ضرورت کا پابند بنایا جانا مشکل؛ البتہ بعد عصر کے لئے دروازہ پر لکھوادیا تھا کہ کوئی ملنے آنا چاہے تو اس وقت آجائے کہ یہ وقت عام طور پر کسی خاص مصروفیت کا نہیں ہوتا تھا اور اہل تعلق اس وقت کو بہت غنیمت جان کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے، خاص طور سے ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ اور انکی وجہ سے ایک غیر رسمی قسم کی مجلس اس وقت میں ہوجاتی۔ ص ۹۴“



برائے کرم

جن حضرات کے پاس حیاتِ نعمانی کا پہلا ایڈیشن ہے

وہ ”صفحہ ۳۲۵“ سطر ۵ میں جو عبارت چھوٹ گئی ہے اسے بڑھالیں، یہ سطریوں شروع ہوتی ہے: نائب کی حیثیت سے انقلاب کے عنوان

اس کے آگے جو عبارت چھوٹ گئی ہے وہ یہ ہے:

نائب کی حیثیت سے انقلاب کے عنوان سے ”جو جہاد شروع کر رکھا ہے، اس کا خاص ہدف عراق کے عقباتِ عالیہ (شیعہ حضرات کے اماکن مقدسہ کربلا، نجف اشرف، مشہد امیر المؤمنین وغیرہ کے بعد حرمین شریفین ہیں.....“

حیات نعمانی

ایک سراپا جہد و عمل اور بابرکت زندگی کے تابندہ نقوش کی تاریخ، جن میں ہمارے لئے اور ہماری نسلوں کے لئے رہنمائی ہے، اور علم میں رسوخ، عمل میں اخلاص اور مزاج میں عبدیت و فنایت کا پیغام۔

۹۲ سال پر پھیلی ایک زندگی جس نے دین و ملت کی فکر و خدمت کا ایک یادگار نمونہ چھوڑا، جس میں مثالی خلوص ہی نہیں، جذبہ صادق ہی نہیں، جرأت و استقامت ہی نہیں، حکمت و تدبیر ہے، زمانہ فہمی ہے، ملت کی واقعی قوت و صلاحیت پر نظر ہے اور حقیقت پسندی۔

گذشتہ بیسویں صدی قوموں کے لئے بڑے چیلنج لیکر آئی، برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کو کن کن حالات و مسائل کا سامنا اس صدی میں ہوا؟ ان سے عہدہ براء ہونے کے لئے کیا کیا قابل ذکر کاوشیں تاریخ کا حصہ بنیں، ان میں سے بیشتر مناظر اس زندگی کی کہانی میں لپٹے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ یہ اسی تاریخ کا ایک بیش قیمت روشن باب ہے۔

ناشر

افستان بکڈپو ۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ